۷۸۶
۹۲

تاریخ آغاز تالیف

داستانِ تاریخِ اُردو

۱۹۳۸ء

یعنی

ابتدا سے بیسویں صدی کے شروع تک اُردو زبان و ادب کے نشو و نما کی تاریخ، مصنفینِ نثرِ اُردو کے حالات اور تصنیفات کے نمونے

مؤلفہ

حامد حسن قادری

ناشر:- لکشمی نراین اگروال تاجر کتب۔ آگرہ

دوسرا ایڈیشن

۱۹۵۷ء میں

باہتمام عبدالرؤف خاں ہاتف

عزیزی پریس آگرہ میں چھاپا گیا

قیمت فی جلد تیرہ روپیہ پچاس پیسے (۱۳/۵۰)

۷۸۶
۹۲

بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْم
۱۳۷۶ھ

(سورۃ الحاقہ۔ پارہ ۲۹)

دوسرا دیباچہ

"بِنِعْمَتِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ"
۱۳۷۶ھ

"داستانِ تاریخ اُردو" پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ چھپتے ہی میں نے بہت سے ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں، ایڈیٹروں کو کتاب بھجوائی۔ سب سے پہلے ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے دہلی سے ریڈیو پر اسکے متعلق تقریر نشر کی، پھر دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد دکن سے دوسرے نقادوں نے بھی ریڈیو پر تبصرہ کیا۔ بعض نے مجھے خطوط میں رائیں لکھیں، بعض نے رسائل میں ریویو شائع کرائے۔ چند مہینوں میں کتاب کی اتنی شہرت اور اتنی قدر ہوئی کہ مجھے اسکا تصوّر بھی نہ تھا۔
بات صرف اتنی تھی کہ کسی نے اردو زبان و ادب کی تاریخ اس تفصیل

اس تجزیہ، اس موازنہ، اس محاکمہ کے ساتھ نہ لکھی تھی۔ اسی کی ضرورت تھی اور اسی کو لوگوں نے سراہا۔ ورنہ یہ کتاب تمام پہلوؤں سے مکمل نہ تھی، بلکہ خود میری نظر میں اسکے اندر خامیاں اور کوتاہیاں موجود تھیں۔ اور بعد کو تبصروں سے اندازہ ہوا کہ غلطیاں بھی واقع ہوگئی تھیں جن کا مجھے لکھتے وقت علم نہ تھا۔

مجھے بڑا اطمینان اس بات سے ہوا کہ تبصرہ نگاروں نے میری رعایت و مروّت سے کام نہ لیا تھا۔ اور میں اُنہی حضرات کا زیادہ شکرگذار ہوں جنھوں نے میرے "ہنر" کے ساتھ میرے "عیب" بھی گنائے۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الٰہ آباد یونیورسٹی) نے میرے لئے زحمت گوارا فرمائی اور تبصرے میں کتاب کی کتاب لکھکر روانہ فرمائی۔ جس میں اغلاط کتابت سے لے کر زبان و محاورہ، موضوع و مضمون، بحث و تنقید، مواد و معلومات، سب ہی پر نظر ڈالی، مشورے دئیے، تلافی مافات کی راہ بتائی، معلومات فراہم کیں۔ اسی طرح دوسروں نے بھی میرے بعض اغلاط و نقائص بتائے۔ میں سب کا ممنون ہوں۔ سب کی ہدایات پر میں نے نظرثانی میں عمل کیا ہے۔

لیکن "پسند اپنی اپنی" کا عجیب معاملہ ہے۔ بعض متضاد رائیں بڑی دلچسپ تھیں۔ بعض حضرات میرے سخت تبصروں پر ناراض ہوگئے۔ بعض نے میری نرم تنقیدوں کو ناپسند کیا۔ ایک نے غیر مشہور مصنّفوں کو شامل کرنے پر اعتراض کیا۔ دوسرے نے اسی کو کتاب کی بڑی خوبی بتایا۔ کسی نے نمونوں کے طویل ہونے کی شکایت کی۔ کسی نے اسی بات کی تعریف کی اور لکھا کہ ــــــ

"مصنّفین کی کتابوں سے کافی اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ اور ان کا انتخاب اس سلیقہ سے کیا گیا ہے کہ مصنّف کے طرزِ تحریر کی کُل خصوصیات واضح ہوجاتی ہیں۔ اور اکثر ایک ٹکڑے سے پوری کتاب کا

مضمون ذہن میں آجاتا ہے۔"

بعض نے طویل حاشیوں اور ان کے مختلف علمی وادبی معلومات کو غیر ضروری قرار دیا۔ بعض نے ان کی بنا پر کتاب کو زیادہ مفید و قابل قدر بتایا۔

ایک نقاد نے فرمایا کہ ——— "انداز بیان بھی سادہ اور بے مزہ ہے" ———

دوسرے نے ریویو کیا کہ ——— "ساری کتاب کی عبارت شگفتہ اور دلکش ہے۔"

میں نے ان تمام تبصروں کو اپنے پاس محفوظ رکھا اور اب سولہ [16] سال کے بعد دوسرے ایڈیشن کو مرتب کرتے وقت ان سے کام لیا۔ چنانچہ میں نے اپنی بعض رائیں بدل دیں، بعض غیر مشہور مصنفوں کو حذف کر دیا۔ بعض اقتباسات کو گھٹا دیا، بعض غیر ضروری حواشی کو حذف کر دیا۔

میں چاہتا تھا کہ دوسرے ایڈیشن میں صرف نظر ثانی اور ترمیم و درستی ہی نہ ہو بلکہ کتاب کو دوبارہ لکھدوں لیکن یہ بڑا کام تھا۔ سوچتا اور ارادہ ہی کرتا رہا، حتیٰ کہ پاکستان چلا آیا۔ اور کراچی میں آکر بس گیا۔ یہاں آکر اس کتاب کی اس قدر مانگ دیکھی کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے آنے کی خبر سنکر طلبہ واساتذہ نے طلب کیا، "مطالبہ" کا ہنگامہ شروع کر دیا۔ میرے پاس جو کتاب تھی اس پر حملے رہے۔ اساتذہ نے کتاب کی مانگ اور مقبولیت کے قصے سنائے کہ پچیس ۲۵ روپیہ تک ایک کتاب فروخت ہوئی ہے۔ اور آخری نسخہ تو ایک دکاندار نے ۳۸ روپیہ کو دیا اور لینے والے نے لے لیا۔ اس وقت بھی جن داموں کو مل جائے لوگ خریدنے کو تیار ہیں۔

بہر حال، اُدھر آگرہ کے پبلشر کا اصرار، اِدھر یہ مانگ۔ میرے ارادے کتاب کو از سر نو لکھنے کے متعلق سب رہ گئے اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ کتاب جیسی کچھ ہے، دوبارہ چھپوا دی جائے۔ چنانچہ نظر ثانی میں درستی و ترمیم اور حذف و اضافہ کرتا گیا اور پچاس پچاس ۵۰ سو سو صفحے چھپنے کے لئے

بھیجا گیا۔ آخر کتاب دوبارہ چھپ گئی۔ الحمد للہ!

کتاب کا نام —— "داستان تاریخ اردو" (=۱۹۴۸) میں نے تاریخگوئی کے شوق میں رکھدیا تھا۔ بعضوں نے اس پر اعتراض کیا اور سوال اُٹھایا کہ یہ "داستان" زیادہ ہے یا "تاریخ" زیادہ۔ لیکن اب اشاعت ثانی میں نام بدل دیا جائے تو کتاب پہچانی نہ جائے گی۔ نام بہت مشہور ہوچکا ہے۔ اسلئے اس "چیستاں" کو باقی ہی رہنے دیا۔

تاریخگوئی کے شوق کا "مظاہرہ" میں نے کتاب کے اندر بھی جا بجا اور "جا و بیجا" کیا ہے۔ اور اس پر بھی نقادوں نے رائے زنی کی تھی۔ ایک صاحب کا مشورہ تھا کہ —— "یہ اگر ایک چھوٹی سی کتاب میں الگ اِکجا ہوتیں تو بہتر تھا۔" دوسرے کی رائے تھی کہ —— "تاہم اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔" میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ اِس لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور اس دوسرے ایڈیشن کی تاریخ پیش کرتا ہوں ۔

سالِ طبع جدید و نشرِ کتاب

"شیشے میں اب دو آتشہ ہے شراب"

۱۹۵۷ء

حامد حسن قادری

کراچی۔ ناظم آباد۔ بڑا میدان

یکم رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

۲ر اپریل ۱۹۵۷ء

بسم اللہ العلی العظیم
۱۳۶۰ھ

"بذکرِ خدائے بیاں آفریں"
۱۹۴۱ء

پہلا دیباچہ

اُردو کی خدمت "تذکرہ" نویسی کی صورت میں دو سو برس سے ہو رہی ہے. سب سے قدیم تین تذکرے ہیں جو ایک ہی سال (۱۱۶۵ھ) میں مرتب ہوئے یعنی، "گلشن گفتار" (خواجہ خان حمید اورنگ آبادی)، "نکات الشعراء" (میر تقی) اور "تذکرہ ریختہ گویاں" (فتح علی گردیزی) پھر اُسی بارھویں صدی کے آخر تک تین تذکرے: "مخزن نکات" (قائم چاندپوری) ۱۱۶۸ھ میں، "چمنستان شعرا" (لچھمی نراین شفیق) ۱۱۷۵ھ میں اور "گلزار ابراہیم" (نواب علی ابراہیم خاں خلیل) ۱۱۹۸ھ میں لکھے گئے. اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری میں دہلی، دکن، گجرات وغیرہ مقامات پر آزاد کے "آب حیات" سے پہلے ایک درجن کے قریب تذکرے تالیف کیے گئے (یورپین مصنفوں کے لکھے ہوئے تذکرے ان پر مزید اضافہ ہیں). لیکن یہ سب (مع آب حیات) شاعری اور شاعروں کے تذکرے تھے کسی نے مصنفینِ نثر

کی طرف توجہ نہ کی۔

اُنیسویں صدی عیسوی میں غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے اردو نثر اتنی اور ایسی نہ لکھی گئی تھی کہ مفصل و مسلسل تاریخ و تذکرہ کے قابل سمجھی جاتی، اور ایسے تذکرہ سے عام دلچسپی کی بھی امید مشکل تھی۔ لیکن آخر صدی تک تصانیف نثر اور انشا پردازی نے اتنے مدارجِ ارتقا طے کر لئے تھے کہ کسی تاریخ کا مرتب نہ ہونا اہلِ قلم کے "تغافلِ علمی" کا ثبوت تھا۔

اس طرف غالباً سب سے پہلے مولوی محمد یحییٰ تنہا (بی اے، ایل ایل بی، وکیل غازی آباد) کو توجہ ہوئی اور انھوں نے ۱۹۱۴ء میں "سیر المصنفین" کی پہلی جلد، اور ۱۹۲۴ء میں دوسری جلد شائع کی۔ دونوں میں مصنفوں کے حالات اور طرزِ تحریر کے ساتھ تصانیف کے نمونے بھی درج کئے۔ لیکن پہلی جلد میں اردوے قدیم کو روا روی میں لکھا اور تشنہ چھوڑ دیا، اور دوسری جلد کے لئے صرف چوٹی کے سات آٹھ مشہور مصنفوں کو چن لیا۔ اور سرسری تبصرہ پر کتاب کو ختم کر دیا۔ بہر حال تقدّم کی فضیلت میں وہ "تنہا" ہیں۔ تنہا سے پہلے کسی نے نثر اردو کا تذکرہ نہیں لکھا تھا۔

اس کے بعد اردو نثر و نظم دونوں کی یکجا تاریخیں متعدد لکھی گئیں، جن میں سب سے بڑی اور اچھی مسٹر رام بابو سکسینہ کی انگریزی تالیف، اور اس سے بڑا اور اچھا، اس کا اردو ترجمہ "تاریخ ادب اردو" (مترجمہ مرزا محمد عسکری بی اے لکھنوی) ہے۔ اسی عرصے میں ڈاکٹر گراہم بیلی (پروفیسر اردو لندن یونیورسٹی) نے انگریزی میں مختصر تاریخ ادب اردو مرتب کی (اس کا تذکرہ "داستان تاریخ اردو" میں آ چکا ہے) پروفیسر اعجاز حسین (الہ آباد یونیورسٹی) کی تالیف مختصر تاریخوں میں بہتر ہے۔

لیکن یہ سب صرف زبان و ادب کی تاریخیں اور مصنفوں کے حالات ہیں۔ تصانیف و تحریرات کے نمونے کسی میں نہیں۔ گویا "زبانی باتیں" ہیں۔ اس کمی کو ایک فاضل بزرگ مولانا احسن مارہروی مرحوم (متوفی ۱۹۴۰ء) نے ایک اور

صورت سے پورا کیا۔ یعنی "**نمونۂ منثورات**" کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی، جس میں نثر اردو کے صنف وار نمونۂ تحریر ہیں، مثلاً تصنیف و تالیف، تقریظ، عدالتی تحریر، اخبار، خطوط وغیرہ۔ چونکہ یہ نمونے صدی وار مرتب کئے ہیں، اس لئے گویا "تاریخ نثر اردو" بھی ہے اور اپنی نوع کی منفرد تالیف ہے۔ ان دو کے درمیان میں مولوی سید محمد ایم۔ اے حیدرآبادی نے "فورٹ ولیم" کالج کے مصنفوں کے حالات اور نمونے "ارباب نثر اردو" کے نام سے مرتب کئے۔ اور حق یہ ہے کہ تاریخ اردو کے اس دور کا حق ادا کردیا۔ ان کے علاوہ کوئی قابل ذکر کتاب ایسی نہیں ہے جس میں تاریخ کے ساتھ نمونے بھی ہوں۔

کسی مصنّف کے طرز تحریر اور اس کے تجزیہ و خصوصیات کا بیان تشنہ رہتا ہے جب تک ہر قسم کی تحریر کے نمونے اور مثالیں پیش نظر نہ ہوں، اور ان کا تبصرہ و انتقاد مطالعہ کی رہنمائی کرنے کے لئے ساتھ نہ ہو۔ میں اس ضرورت کو ایک مدت سے محسوس کررہا تھا۔ جب وقت میں نے مرزا عسکری صاحب کا ترجمہ دیکھا جو حُسنِ ظاہر میں بھی **مطبع نولکشور** کی مشاطگی کا دلفریب نمونہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ مرزا صاحب نے جہاں اتنی محنت کی کہ ۹۰۰ صفحوں کا ترجمہ تیار کردیا اتنی زحمت اور گوارا فرماتے کہ ہر مصنّف و شاعر کے جملہ تصنیفات و کلام کے نمونے بھی اضافہ کردیتے۔ کتاب دو ہزار، تین ہزار صفحے کی ہوجاتی، اور اچھا ہوتا، مرزا صاحب اس کے اہل تھے، اور مطبع نولکشور کے لئے پانچ ہزار صفحے شائع کردینا بھی کوئی بات نہ تھی۔

بہر حال میں نے "**داستانِ تاریخ اردو**" میں اس کمی کو پورا کرنا چاہا ہے، تاریخ وارتقاے اردو کے ساتھ ہر تذکرے کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور

لیکن ممتاز مصنّفوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کئے ہیں،
اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

بے لاگ اور بے باک تنقید کرنا نہ صرف تصنیف پر، بلکہ ذاتِ مصنّف پر
بھی (مصنّف کی حیثیت سے) ابتک "پل صراط" پر گذرنے سے کم نہیں ہے۔ لیکن میں
نے اس کی "جسارت" کی ہے۔ میں نے تصنیفوں اور مصنّفوں پر اعتراضات کئے ہیں،
دوسروں کے اعتراضات نقل کرکے حسب موقع ان کی تائید یا تردید کی ہے۔
میری تنقیدیں شاید تلخ و بیباک نظر آئیں، لیکن بے لاگ اور بے لوث بھی ثابت
ہوں گی۔ میں نے صحیح تعریف اور جائز حمایت بھی ایسی کی ہے کہ کسی دوسرے
مورّخ و تذکرہ نویس نے نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ سب ایک تاریخ و تذکرے
کے ضروری اجزا تھے۔ بغیر اس روشنی کے، کسی تصنیف و مصنّف کے مطالعہ
کا صحیح راستہ نظر نہیں آتا۔

مجھے اس تالیف کے مکمّل ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض حصّوں
کے نامکمّل رہ جانے کا اعتراف ہے۔ جس وقت ۱۹۳۰ء میں اس کی تالیف و
طباعت ساتھ ساتھ شروع ہوئی تھی، یہ ارادہ نہ تھا کہ اس قدر طویل و مفصل لکھی
جائے۔ یہ ارادہ بعد کو مواقع تفصیل پیش آنے پر قائم ہوا۔ اس لئے
ابتدائی حصّہ مختصر رہ گیا۔ پہلے سے پوری تاریخ نثر کے لئے ۱۵۰۰ صفحے تجویز
ہوئے ہوتے، تو ابتدائی حالات اور پہلے دو دَور بھی زیادہ تفصیل سے
لکھے جاسکتے تھے۔ اور حصّوں میں بھی، باوجود تحقیق و تفصیل کے، ترقی و اضافہ
کی گنجائش باقی ہے۔

میں نے اس کتاب میں بے شمار تصانیف اور دوسری مطبوعات سے
مدد لی ہے، اور متن یا حواشی میں ان کا حوالہ دیدیا ہے۔ اگر کہیں حوالہ
رہ گیا ہے تو وہ میری عجلت یا غفلت کا نتیجہ ہے۔ قصد وارادہ شامل

نہیں ہے۔ اُردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق فاضل مصنفینِ حیدر آباد نے بہترین معلومات فراہم کردی ہیں۔ ہر مولف کے لئے ان کی تصانیف سے استفادہ ناگزیر ہے۔ میں نے بھی "اردوے قدیم" (مولفہ حکیم شمس اللہ قادری) "دکن میں اردو" (مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی)، "اردو شہپارے" (مولفہ ڈاکٹر محی الدین زور) "ارباب نثر اردو" (مولفہ مولوی سید محمد ایم۔اے) سے اپنی تالیف میں جابجا مدد لی ہے۔ ان کے علاوہ جن مفصل و مختصر تاریخوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب میرے پیشِ نظر تھیں۔ "سیر المصنفین" سب سے زیادہ کام کی تالیف ہے۔ میں نے اس سے کام لیا ہے، اور ہر جگہ حوالے دئے ہیں۔ مولوی عبد الحق صاحب کی بعض تالیفات مثلاً "چند ہم عصر" اور مجلّہ "اردو" سے بھی میں نے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور بہت سے رسالے خصوصاً "مخزن" اور "زمانہ" کے قدیم و جدید فائل بہت کام آئے۔ اہلِ دکن کی سی "علیکھیات" لکھوں تو بہت طولِ امل ہو جائے۔

احباب میں اتفاق سے مجھے ایک ہی صاحب کا ممنون ہونے کا موقع ملا۔ یعنی مفتی انتظام اللہ صاحب صدیقی گوپاموی ثمّ اکبرآبادی کا۔ آگرہ میں مفتی صاحب اپنے علمی و تصنیفی ذوق و شوق میں انفرادی مرتبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کتب خانہ سے مجھے مطبوعہ و قلمی کتابیں اور مصنفوں کے حالات اور نمونے مرحمت فرمائے۔ اور سب کے ساتھ مفتی صاحب کا بھی شکر گذار ہوں۔

اس "**داستان تاریخ اردو**" کی تعریف (مدح نہیں صورتِ حال) اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو اس کو "**عجیب**" کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں تاریخ و تذکرہ کی کتاب عجیب نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن یہ تالیف اپنی "ہیئت کذائی" میں کچھ ایسی ہی بن گئی ہے۔ بہر حال میں اس نوعیت کے لئے کوئی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اپنی اس کوشش کو میں کوئی "کارنامہ"

نہیں سمجھتا، اس لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "کارے کردم" ہاں، کام کرنے کی ایک نئی راہ نکال دی ہے۔

دیگراں آیند و "کارے" ہم کنند

علی پور سیداں (ضلع سیالکوٹ)
یکم رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ
۲۳ ستمبر ۱۹۴۱ء

حامد حسن قادری
پروفیسر سینٹ جانس کالج
آگرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین داستان تاریخ اردو

نثر کا تیسرا دور

۷۸۶
۹۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بذکر خدائے زباں آفریں"
۱۹۳۸ء

داستانِ تاریخ اردو
۱۹۳۸ء

آغازِ اردو سے پہلے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صدہا سال قبل، گوتم بدھ بانیٔ بدھ مذہب اور مہابیر بانی جین مذہب سے سیکڑوں برس پہلے، آریہ قوم کے ورودِ ہندوستان کے وقت ہندوستان کے قدیم اور اصلی باشندے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں بولتے تھے۔ آریا لوگوں نے اپنی زبان سنسکرت کو رواج دیا۔ سنسکرت میں وسعت و تکمیل کے جوہر تھے۔ ہندوستان میں اس زبان کو اس قدر ترقی ہوئی کہ لسانی و ادبی و علمی حیثیت سے دنیا کی بہترین زبانوں میں اس کا شمار ہے۔ لیکن گردشِ زمانہ سے صدہا سال حکومت کرنے کے بعد سنسکرت کو زوال شروع ہوا، اور مختلف صوبہ وار زبانیں جن کو پراکرت کہتے ہیں، سنسکرت کی جگہ لینے لگیں۔

ان پراکرت زبانوں میں ایک سورسینی پراکرت تھی جو برج یعنی متھرا کے علاقے سے شروع ہوکر پنجاب، سندھ، بہار، مالوہ تک شائع و عام تھی۔ اسی کی ایک شاخ کو برج بھاشا کہتے ہیں یعنی متھرا کی زبان۔ یہ سب سے زیادہ وسیع تھی اور حضرت عیسیٰ کے زمانے سے قبل علمی زبان بن چکی تھی، یعنی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔

حضرت عیسیٰ سے نصف صدی قبل اُجین کا مشہور راجہ وکرماجیت گزرا ہے جس کے دربار کا جوہر بے بہا کالیداس شاعر تھا۔ اسی راجہ کے دربار کے ایک پنڈت وراروچی نے برج بھاشا کے قواعد صرف و نحو مرتب کئے تھے۔ یہ کتاب اب تک موجود ہے۔ اور پراکرت پرکاش کے نام سے ۱۸۶۸ء میں لندن میں شائع ہوئی ہے۔ اس دوہزار سال قبل کی کتاب میں برج بھاشا کے ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں جو ہماری موجودہ اُردو زبان میں شامل ہیں۔

سکندر اعظم نے حضرت عیسیٰ سے ۳۲۵ سال قبل ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت بھی برج بھاشا اور دیگر پراکرتیں ہندوستان میں رائج تھیں۔ راجہ اشوک حضرت عیسیٰ سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے تھا۔ اس کی زبان بھی یہی برج بھاشا تھی، اور اس کے مشہور کتبوں پر یہی زبان پتھر کی لکیر بنی ہوئی ہے۔

عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلہ تجارت اسلام ۵۶۹ء میں شروع ہوا ہے۔ زمانۂ اسلام سے بہت پہلے عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلۂ تجارت قائم تھا۔ عرب سواحل ہند پر تجارت کی غرض سے آتے تھے، اپنا مال فروخت کرکے ہندوستان کا مال خرید کر لیجاتے تھے۔ لیکن یہ لین دین صرف مال و متاع تک محدود نہ تھا۔ بلکہ الفاظ کا ادل بدل بھی ہوتا تھا، یعنی اشیاء خرید و فروخت کے عربی نام ہندوستان میں رہ کر ہندی تاجروں کی زبان میں مل جاتے تھے اور ہندوستانی نام عرب میں پہنچکر عربی زبان میں شامل ہوتے تھے۔

مسلمانوں کے ابتدائی حملے ہندوستان پر سنہ ۱۶ ہجری (مطابق ۶۳۷ء) میں جس سال حضرت عمر فاروقؓ نے

بیت المقدس کو فتح کیا، اسی سال مسلمانوں نے ہندوستان کے ساحل سندھ پر حملہ کیا۔ لیکن ملک کو فتح نہ کرسکے۔ اس کے بعد دو مرتبہ پھر حملہ آور ہوئے اور پھر ناکام رہے۔ آخر خلافتِ بنی اُمیہ کے آغاز میں ۴۴ھ ۶۶۴ء میں کابل کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کیا اور کابل سے ملتان تک قبضے میں کرلیا۔ اب حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سواحل و سرحد کا بہت سا حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ سندھ پر بھی چند بار حملے کئے اور ناکام رہے۔ پھر ۸۶ھ ۷۰۵ء میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ پر حملہ کامیاب ہوا۔ اس کے بعد ۹۶ھ ۷۱۴ء تک مسلسل فتوحات کرکے ملتان تک قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے مسلمانوں کی سلطنت سندھ پر صدیوں قائم رہی۔ اسلامی سلطنت بنی اُمیہ سے بنی عباس میں منتقل ہوگئی تو سندھ کی اسلامی حکومت بھی خلافتِ عباسیہ کے زیرِ اثر آگئی اور خلیفہ واثق باللہ (زمانہ خلافت ۲۲۷ھ ۸۴۱ء تا ۲۳۲ھ ۸۴۷ء) کے زمانے تک دربار خلافت سے سندھ کے حاکم و والی (گورنر) مقرر ہوکر آتے رہے۔ لیکن اس کے بعد خلافتِ بغداد کے ضعف کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی حکومت ہند و سندھ بھی کمزور ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ مسلمان اپنے مفتوحہ ممالک سے باہر نہ پھیل سکے۔ اگرچہ سندھ میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب و معاشرت اور رسوم و زبان سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ابن حوقل اور مسعودی جو دسویں صدی عیسوی (مطابق چوتھی صدی ہجری) میں ہندوستان آئے۔ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی وضع اور معاشرت اس قدر یکساں ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے دونوں قوموں میں نہایت اتفاق و ارتباط قائم ہے۔ عربی و سندھی دونوں زبانیں رائج ہیں اور ملتان میں ملتانی کے ساتھ فارسی زبان بولی جاتی ہے۔

تاہم اس زمانہ تک دیسی اور بدیسی یعنی برج بھاشا اور عربی و فارسی زبانوں کی ایسی آمیزش نہ ہوئی تھی جو ایک مخلوط زبان کا سنگِ بنیاد ہوسکتی۔

سبکتگین کا پنجاب پر حملہ ۳۷۶ھ ۹۸۶ء

سبکتگین غزنی کا بادشاہ تھا۔ اس نے پنجاب کے راجہ جیپال پر فوج کشی کی راجہ صلح کرنے پر مجبور ہوا، لیکن صلح توڑ دی۔ اس نے

سبکتگین نے دوبارہ حملہ کیا اور پنجاب سے پشاور تک اس کے قبضے میں آگیا۔ مسلمان ان ممالک مفتوحہ میں رہنے لگے۔

محمود غزنوی کے حملے ۳۹۲ھ ۱۰۰۱ء تا ۴۱۸ھ ۱۰۲۷ء | سبکتگین کے بعد اس کے جانشین سلطان محمود غزنوی نے ۲۶ سال میں ۱۷ حملے کر کے پشاور، ملتان، کالنجر، قنوج، متھرا، گجرات پر قبضہ کر لیا۔

خاندان غزنوی کی حکومت (پنجاب میں اُردو کا آغاز) ۳۹۲ھ ۱۰۰۱ء تا ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء | محمود کے بعد سب ممالک مفتوحہ ہاتھ سے نکل گئے، لیکن پنجاب پر قبضہ رہا اور دو سو برس کے قریب خاندان غزنوی نے پنجاب میں حکومت کی۔ لاہور دارالحکومت رہا۔ مختلف اقوام و ممالک کے مسلمان (عرب، ترک، مغل، ایرانی، افغانی) پنجاب میں مقیم رہے اور اہل ہند کے ساتھ تمدن و معاشرت، لین دین، شادی بیاہ ہر قسم کے تعلقات پیدا کیے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے برج بھاشا کے الفاظ اپنی زبانوں میں ملانے شروع کیے اور اہل ہند نے عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کیے۔ اس طرح اُردو زبان بننی شروع ہوئی۔ دو سو برس کی مدت اس زبان کی عمومیت و اشاعت کے لئے کافی تھی۔ اس عرصہ میں یہ نئی زبان بول چال سے بڑھ کر شاعری میں بھی داخل ہو گئی۔

اُردو زبان

لفظ "اردو" کی تحقیق | یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اس زبان کے لئے اُردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔ یہ قیاس درست نظر آتا ہے کہ مغلوں کے زمانے سے ہندوستان میں اُردو کا لفظ لشکر و لشکرگاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ بابر، اکبر، جہانگیر کے فرمانوں اور سکوں میں اردو کا لفظ لشکر کے معنی میں درج ہے۔ بابر اپنے لشکر کو اردوے نصرت شعار کہتا ہے۔ جہانگیر نے سفر کشمیر کے راستے میں جو سکہ بنوایا ہے۔ اس پر یہ شعر کندہ ہے۔

سکہ اردوے جہانگیر شاہ   باد رواں تا کہ بود مہر و ماہ

شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں شاہی لشکر و لشکرگاہ کو اردوے معلّیٰ کہتے تھے اور بازارِ لشکر کو بازارِ اردو یا اردو بازار۔

اردو زبان کا نام "زبان ہندی"

لیکن اس زمانے تک زبانِ لشکر کے لئے اردو کا لفظ مستعمل نہ ہوا تھا۔ سب سے قدیم تحریر حضرت امیر خسرو دہلوی (۶۵۳ھ ۱۲۵۵ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) کی ملتی ہے۔ وہ اپنے دیباچہ دیوان میں اپنے اردو کلام کو کلام ہندوی فرماتے ہیں۔ دوسری قدیم کتاب سیر الاولیا ہے جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے ایک خاص مرید حضرت سید مبارک معروف بہ میر خورد کی تالیف ہے اس میں حضرت بابا فرید شکر گنج کے ایک قول کے متعلق لکھا ہے فرمود بزبان ہندی اور بھی بعض قدیم تحریروں میں اردو زبان کو زبان ہندی کہا گیا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امیر خسرو کی تصانیف سے اکبر و جہانگیر کے زمانے کی تصانیف تک یعنی تیرہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک جہاں جہاں ہندوستانی زبان کا ذکر آیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ پنجاب کے کسی بزرگ کے قول کو زبان پنجابی و زبان ملتانی کہا گیا ہے۔ اہل گجرات کی زبان کو زبان گجراتی، اہل دکن کی زبان کو دکنی، نیز بلا امتیاز ان زبانوں کو زبان ہندی بھی کہدیا گیا ہے۔ لیکن اہل دہلی و نواحِ دہلی کی زبان کو زبان ہندی ہی کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا نے جس کی اصلی ٹکسال متھرا و نواح متھرا تھی، قدیم زمانے ہی سے مختلف صوبوں میں مختلف شکلیں پیدا کر لی تھیں جو امتیاز کے لئے مقامی ناموں سے معروف تھیں۔ اردو زبان اگرچہ ان سب بولیوں سے ملکر بنی ہے، پھر بھی اس کا اصلی سانچا متھرا و دہلی کی زبان ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسرے صوبوں کی مخصوص زبانیں اب بھی الگ الگ رائج ہیں لیکن موجودہ صوبجات متحدہ کی زبان وہی زبان ہندی ہے جس نے اب اردو کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اردو زبان کا نام "زبان ریختہ"

بہرحال شہنشاہ جہانگیر کے زمانے تک زبان کے لئے اردو کے لفظ کا رواج ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن زبان ہندی کے ساتھ ساتھ زبان ریختہ

کا استعمال پایا جاتا ہے۔ خصوصاً نظم اُردو کو نظم ریختہ کہتے تھے"۔ "ریختہ" کے معنی گری پڑی چیز کے ہیں۔ اور فارسی شعرا اس نظم کو بھی ریختہ کہتے تھے جو مختلف زمانوں سے مرکب ہو۔ قدیم شعرائے اُردو کے کلام میں فارسی و ہندی ملی جلی ہوتی تھیں اس لئے اس کو ریختہ کہنے لگے۔ نیز اس لئے کہ اُردو زبان فارسی، عربی، ترکی، ہندی وغیرہ سب زبانوں سے ملکر بنی ہے۔

شیخ مخدوم سعدی کاکوروی (متوفی ۱۰۰۱ھ ۱۵۹۲ء) اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ ان کی ایک مخلوط غزل ملتی ہے۔ انھوں نے مقطع میں غزل کی زبان کو ریختہ فرمایا ہے:۔

سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ دُر ریختہ شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اس کے بعد عام نظم اُردو کو ریختہ کہنے لگے۔ اور یہ نام اُنیسویں صدی عیسوی تک مستعمل رہا۔ مثلاً

(۱) قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی (قائم چاندپوری)

(۲) خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا (میر تقی میر دہلوی)

میر کے شعر سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ریختہ گوئی کا عام رواج دہلی سے پہلے دکن میں ہوا تھا۔

(۳) مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں:۔

"مرزا محمد رفیع سودا اور ریختہ پایۂ ملا ظہوری دارد"[۵]

(۴) مرزا غالب دہلوی تک ریختہ کا لفظ مستعمل ہے:۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب (غالب) کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

---

۵ منقول:۔ آبِ حیات۔

زبان کے لئے لفظ اُردو کا استعمال

غالباً شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں یعنی سترہویں صدی سے اُردو کا لفظ زبان کے لئے استعمال ہوا۔ لیکن شاہجہاں و اورنگ زیب کے زمانے تک اس کا استعمال بہت محدود تھا۔ خود شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اپنے ایک رقعہ میں زبان ہندی ہی لکھتے ہیں۔ شاہجہاں نے کوئی تحریر اپنے زمانے کی اُردو زبان میں اپنے قلم سے لکھی ہے۔ اس کے متعلق عالمگیر شاہجہاں کو لکھتے ہیں:۔

"آں فرمان عالی کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقمی فرمودہ شاہد ایں معانی است"

عالمگیر کے بعد اٹھارہویں صدی میں جتنے تذکرے شعرائے اُردو کے لکھے گئے، ان میں اردو کو ہندی یا ریختہ کہا گیا ہے۔ تاہم اس زمانے میں اس نام کا استعمال ثبوت سے خالی نہیں ہے۔ ۱۷۹۱ء ۱۲۰۶ھ میں مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری دکنی نے چند اخلاقی و مذہبی نظمیں دکنی اُردو میں لکھی ہیں۔ ان کی وجہ تصنیف نثر میں بیان کی ہے اس میں لکھتے ہیں:۔

"ان سب رسالوں میں شاعری نہیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اردو کے بھاکے میں نہیں کہا ہوں۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔ اے بھائی یہ رسالے دکنی زبان میں ہیں۔"

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اس زمانے میں غیر صوبوں کے لوگ اُردو دہلی کی زبان کو کہتے تھے۔ اس کی تصدیق اَور شہادتوں سے بھی ہوتی ہے۔ جب ولی دکھنی دہلی آئے اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے اور اپنی دکھنی زبان کی غزلیں سُنائیں تو بقول قدرت اللہ صاحبِ تذکرۃ الشعرا کے شاہ صاحب نے ولی کو یہ مشورہ دیا:۔

"شما زبان دکھنی را گذاشتہ موافق اردوے معلّٰی شاہ جہاں آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد۔"

شاہجہاں نے دہلی کا لال قلعہ بنایا، دہلی کا نام شاہجہاں آباد رکھا۔ قلعہ کو قلعۂ معلّٰی اور شاہی لشکر گاہ کو اردوے معلّٰی کہتے تھے۔ جب اردو زبان قلعہ معلّٰی میں داخل ہوئی تو اردوے معلّٰی کا خطاب پایا

آغاز اُردو

پنجاب میں مسلمانوں کے مستقل قیام، مختلف ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں اور ان کی زبانوں کے اجتماع، اہلِ ہند سے تعلقات نے ایک مخلوط زبان کی ضرورت اور صورت پیدا کر دی۔ اہلِ ہند برج بھاشا بولتے تھے، مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ ضرورت پیدا ہوتے ہی ایک نے دوسرے کی زبان سیکھنی شروع کر دی ہوگی۔ لیکن گیارہویں صدیِ عیسوی کی یہ بول چال کتب تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔ البتہ اُس زمانے کی نظم سے تصدیق ہوتی ہے۔

فارسی شاعری میں ہندی الفاظ بزمانۂ مسعود غزنوی ۱۰۳۰ء ۴۲۱ھ تا ۱۰۴۰ء ۴۳۲ھ

سلطان محمود غزنوی کے فرزند و جانشین سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ میں ایران کا مشہور شاعر منوچہری ہندوستان آیا، اس نے اپنے فارسی کلام میں ہندی زبان کے بعض الفاظ بجنسہٖ نظم کیے ہیں۔ مثلاً

الا تا مومناں دارند روزہ الا تا ہندواں گیرند لنگھن

اس سے زیادہ دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایران کے ممتاز صوفی شاعر حکیم سنائی (جن کا انتقال بارہویں صدی کے وسط میں ہوا ہے) کبھی ہندوستان نہیں آئے۔ لیکن بعض ہندی الفاظ کو اپنی نظم میں لکھا ہے مثلاً

نہ دراں معدہ جز حسد زندہ نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی

فارسی شاعروں کا ہندی کلام بزمانۂ ابراہیم غزنوی ۱۰۵۹ء ۴۵۱ھ تا ۱۰۹۸ء ۴۹۲ھ

مسعود سعد سلمان اور ابو عبداللہ النکتی ہندوستان میں پیدا ہوئے، فارسی کے شاعر تھے، لیکن ہندی زبان میں بھی شعر کہے اور اپنے ہندی دیوان مرتب کیے۔ یہ کلام اب موجود نہیں ہے لیکن محمد عوفی اور امیر خسرو دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

ہندی شاعری میں عربی الفاظ بزمانۂ پرتھی راج — ولادت ۱۱۵۹ء ۵۵۴ھ تا وفات ۱۱۹۲ء ۵۸۸ھ

پرتھی راج راجہ اجمیر و دہلی کے وزیر و درباری شاعر چاند بردائی نے ایک طویل ہندی نظم

پرتھی راج راسو کے نام سے لکھی ہے جس میں پرتھی راج اور اس کے زمانے کے تمام حالات تاریخ و معاشرت، رسم و رواج، رزم بزم وغیرہ کے متعلق لکھے ہیں۔ اس نظم میں بہت سے عربی و فارسی الفاظ پائے ہیں۔ مثلاً سلام، بادشاہ، پروردگار، دینا، مست، کھلک (خلق) بگام (پیغام) پھرمان (فرمان) ایک شعر یہ ہے ؎

بارہ بانس بنیس میں چار انگل پھرمان　　اتنے گھر بادشاہ ہے متے جو کے چوہان

محمد غوری کے حملے اور اردو کی وسعت ۱۱۷۵ء تا ۱۱۹۲ء / ۵۷۰ھ تا ۵۸۸ھ

(۱) ۱۱۷۵ء / ۵۷۰ھ میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ملتان اور اوچ فتح کیا۔ (۲) ۱۱۷۸ء / ۵۷۳ھ میں گجرات پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ (۳) ۱۱۸۶ء / ۵۸۲ھ میں خسرو ملک غزنوی حکمراں پنجاب پر حملہ کر کے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ (۴) ۱۱۹۱ء / ۵۸۷ھ میں پرتھی راج اور محمد غوری میں بمقام نراین (علاقہ کرنال) جنگ ہوئی، مسلمانوں نے شکست پائی (۵) ۱۱۹۲ء / ۵۸۸ھ میں دوبارہ محمد غوری نے راجپوتوں پر حملہ کیا اور پرتھی راج کو شکست دی۔ اس لڑائی میں پرتھی راج اور اس کا درباری شاعر چاند بردائی دونوں مارے گئے۔ اس جنگ سے اجمیر، دہلی، کول (علیگڈھ) ہانسی، سرستی سب مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ محمد غوری نے پرتھی راج کے بیٹے گوبند راج کو تاج و تخت دیکر اجمیر کا راجہ بنا دیا اور دہلی میں اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام کر کے غزنی کو واپس چلا گیا۔

مسلمانوں کے ساتھ ان کی مادری زبان بھی ہر جگہ پہنچتی رہی اور نئی مخلوط زبان (اردو) کو ترقی ہوتی رہی۔ مسلمان اب تک اپنی بول چال، خط و کتابت وغیرہ کے لئے فارسی زبان ہی سے کام لیتے تھے لیکن بوقت ضرورت اہلِ ہند کے ساتھ نئی مخلوط زبان (اردو) میں معاملہ کرتے تھے۔

دہلی میں اردو کا رواج ۱۱۹۲ء / ۵۸۸ھ

اب تک پنجاب و گجرات وغیرہ پر مسلمانوں کا تسلط ہوا تھا اور انہی علاقوں میں اردو کی اشاعت ہوتی رہی۔ دہلی پر سب سے پہلے ۱۱۹۲ء / ۵۸۸ھ میں قبضہ ہوا۔ قطب الدین ایبک ۱۲۰۶ء / ۶۰۲ھ میں دہلی کا

پہلا بادشاہ بنا۔ اسی زمانہ سے اہلِ دہلی فارسی زبان سے مانوس ہوئے۔ محمد غوری کے جس لشکر نے قطب الدین کی سپہ سالاری میں دہلی پر قبضہ کیا اس میں کثیر تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو سالہا سال سے پنجاب میں رہتے تھے۔ اور پنجاب کی مقامی زبان (جو برج بھاشا کی ایک صورت تھی) بولتے یا بول سکتے تھے۔ دہلی کی مقامی زبان بھی برج بھاشا ہی کی ایک شکل تھی اور پنجاب کی زبان سے اسی قدر مختلف تھی جتنی بُعدِ مسافت امتدادِ زمانہ، اور لب ولہجہ کے اختلاف سے ہر زبان ہوجاتی ہے۔

اب دہلی کی فضا میں دہلوی لب ولہجہ کو غلبہ ہوا اور دہلی کی بھاشا، پنجاب کی بھاشا، عربی، فارسی سب زبانیں ملنی شروع ہوئیں اور دہلوی اُردو کی ابتدا ہوئی۔

اُردو پر اولیاء اللہ کا فیضان اُردو زبان کی ترویج واشاعت میں اولیاء اللہ کے فیض و کرامت کو بھی بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائے قیام ہند سے ہی صوفیائے کرام ہندوستان تشریف لائے اور اپنے نورِ باطن سے اہلِ ہند کے دل وجان کو روشن کرنا شروع کیا۔ ان بزرگوں کی نظر میں ملک وقوم، مذہب وملت کی کوئی قید نہ تھی۔ ان کا فیضان مسلم وہندو سب پر یکساں تھا، کتنے ہندو مسلمان ہوئے اور اولیاء اللہ سے فیض حاصل کیا۔ اسی فیض یابی کی خاطر اگرچہ اہلِ ہند نے فارسی کی مشق بہم پونہچائی، لیکن فیض رسانی کے لئے اولیاء اللہ کی زبان فیض ترجمان پر بھی اکثر ہندی الفاظ جاری ہوئے۔

۱۔ حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ (متوفی ۱۰۶۳ء ۴۵۶ھ) حکومت غزنویہ کے زمانے میں لاہور تشریف لائے، مزار پاک بھی وہیں ہے۔

۲۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (۱۱۴۲ء ۵۳۷ھ تا ۱۲۳۵ء ۶۳۳ھ) راجہ پرتھی راج کے زمانے میں اجمیر تشریف لائے۔ داتا صاحب اور خواجہ صاحب کا کوئی قول ہندی زبان کا نہیں ملتا۔ تاہم خواجہ اجمیریؒ کے تکلم زبان ہندی کے متعلق شہادت ملتی ہے یعنی ملک محمد جائسی کی نظم اکھروٹی کا شارح تمہید شرح میں لکھتا ہے۔[۵]

۵ "اُردو زبان کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

"گراں نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبان ہندی تکلم نکردہ زیرا کہ اوّل از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس اللہ سرہ بدیں زباں سخن فرمودہ۔"

(۳) حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء تا ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء) قطب الدین ایبک کے زمانے میں دہلی تشریف لائے۔ خواجہ اجمیریؒ کے خلیفہ اور بابا شکر گنج کے پیر و مرشد تھے۔

(۴) حضرت بابا فرید شکر گنجؒ (۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء تا ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) نے غلام خاندان کی حکومت کے زمانے میں پاک پٹن (پنجاب) میں سکونت اختیار فرمائی، خواجہ بختیار کاکیؒ سے فیض باطن پایا، پنجاب بلکہ تمام ہندوستان کو اپنے نورِ باطن سے منور فرمایا۔ بابا صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کے فتح پنجاب و حکومت ہند کو دو سو برس کے قریب گزر چکے تھے۔ اردو زبان کی تشکیل ہو چکی تھی اور رواج بہت بڑھ گیا تھا۔ پھر خود بابا صاحب کثیر الاولاد تھے۔ ان کے صدہا خلفاء اور ہزارہا مرید پنجاب اور تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اہل ہند کی تعلیم و تلقین کے لئے بابا صاحب ہندی زبان سے بھی کام لیتے تھے۔ چونکہ نہایت مقبول اور کثیر الفیضان بزرگ تھے۔ اس لئے سب اولیاء اللہ سے زیادہ ان کے اقوال و اشعار مشہور ہیں۔ مثلاً:۔

---

۵ حضرت بابا شکر گنج کی تواریخ ولادت و وفات میں مورخوں کا بڑا اختلاف ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے سال ولادت ۵۶۹ھ لکھا ہے اور شاہجہاں بادشاہ کے زمانے کے ایک مصنف صاحب سیر الاقطاب نے تاریخ وفات لفظ "مخدوم" سے نکالی ہے۔ جس سے ۶۹۰ھ نکلتا ہے۔ اگر ولادت و وفات کے یہ دونوں سال صحیح مانے جائیں تو بابا صاحب کی عمر ۱۲۱ سال کی ہوتی ہے۔ لیکن کسی تذکرے سے یہ عمر ثابت نہیں ہوتی۔ ہمارے سنہ خزینۃ الاصفیاء سے ماخوذ ہیں۔

(۱) سیر الاولیاء مؤلفہ مولانا سید مبارک معروف بہ میر خورد میں درج ہے:۔

شیخ شیوخ العالم قدس سرہ العزیز (یعنی بابا گنج شکر) فرمود بزبان ہندی "پونوں کا چاند بھی بالا ہے" یعنی ماہ شب چہار دہم در اول شب خوردمی باشد کہ بتدریج بکمال می رسد۔[۱]

(ب) ایک مرتبہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ جسم میں عقل کا مقام کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا "بیچ سر کے"۔

(ج) ایک پرانی بیاض میں بابا صاحب کی یہ نظم دستیاب ہوئی:۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک — پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش بلت سے گر بڑے ہوتے — بوکڑ واں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں — گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
عشق کا رموز نیارا ہے — جز مد دپیر کے نہ چارہ ہے[۲]

(د) بابا فرید شکر گنج کی ایک غزل ریختہ بھی ملی ہے:۔

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با تن تنہا چہ روی در زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بدل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے[۳]

ان کے علاوہ بہت سے پنجابی زبان کے اشعار پنجاب میں زبان زد خلائق ہیں۔ بعض اشعار و اقوال میں ذکر کے طریقے تعلیم فرمائے ہیں بابا صاحب کے بعض اعمال محفوظ ہیں۔ خاکسار راقم بھی بابا شکر گنج کی اولاد میں ہے۔ راقم کے خاندان میں بابا صاحب کا ایک خاص عمل رائج ہے جو اس زمانے کی اردو زبان میں ہے

---

[۱] و [۲] و [۳] یہ سب اقوال مولوی عبدالحق صاحب کی تالیف مذکورہ بالا سے ماخوذ ہیں۔

۵۔ حضرت شاہ بو علی قلندر پانی پتی (متوفی ۷۲۴ھ ۱۳۲۴ء) سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں تھے۔ ایک مرتبہ حضرت امیر خسرو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں گئے اور کچھ گانا سُنایا۔ شاہ صاحب خوش ہوئے اور اپنا کلام امیر صاحب کو سُنایا۔ امیر اس کو سُن کر آبدیدہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا ترکا کچھ سمجھ دار ہے۔ امیر خسرو نے کہا اسی لئے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھا۔

حضرت شاہ بو علی قلندر کی زبان مبارک سے مبارز خاں کے ارادۂ سفر کے موقع پر یہ دوہا نکلا تھا:۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نا ہوے

اسی مضمون کو آپ نے فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے:۔

من شنیدم یار من فردا رود دراہِ شتاب　　یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب[۵۱]

۶۔ حضرت نظام الدین اولیا (۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) خلیفہ حضرت بابا فرید شکر گنج و پیر و مرشد حضرت امیر خسرو سے کوئی قول ہندی زبان کا منقول نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ آپ نے فرمایا تھا:۔

"کلام حق را در روز میثاق بآہنگ پوربی شنیدم"[۵۲]

۷۔ حضرت امیر خسرو (۶۵۳ھ ۱۲۵۵ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) پٹیالی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین محبوب الٰہی سے تربیت باطن حاصل کی۔ سلطان غیاث الدین بلبن (خاندان غلامان) سے سلطان محمد تغلق تک گیارہ شاہان دہلی کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت کی، اس زمانے میں پنجاب و بنگال کا سفر کیا، جنگوں میں شریک ہوئے۔ امیر خسرو ان باکمال و منتخب ہستیوں

---

۵۱ یہ اقوال بھی مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب مذکور سے ماخوذ ہیں۔

۵۲ از مضمون افتخار عالم صاحب مارہروی مطبوعہ رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۱ء۔

میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صدہا سال کے بعد کبھی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سپاہی بھی تھے اور عالم بھی، دُنیا دار بھی تھے اور ولی کامل بھی، شاعر بھی تھے اور ماہر موسیقی بھی، عاشق بھی تھے اور زندہ دل بھی، ہندوستان کے فنِ موسیقی میں جدّتیں پیدا کیں، فارسی زبان کے تین دیوان مرتب کئے، اور آٹھ مثنویاں لکھیں۔ ہندی زبان میں بہت کچھ کہا جس کا ذکر اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے۔ لیکن وہ ہندی کلام اب محفوظ نہیں ہے۔ بعض گیت، دوہے، پہیلیاں، انملیاں، کہہ مکرنیاں ان کے نام سے مشہور ہیں لیکن کسی تاریخی سند سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہی کی تصنیف ہیں، زبان ریختہ کی بعض غزلیں اور قطعے البتہ انہی کے ہیں یہ تو یقینی ہے کہ امیر صاحب ہندی زبان بے تکلف بول سکتے تھے، لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندی زبان سے خاص محبت تھی اس لئے کہ ہندی الفاظ اپنی فارسی نظموں میں کثرت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً

(ا) اے دہلی والے بتانِ سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

(ب) یک گل بیل و دہ دیگر دروں
گل زگل و گل زگل آید بروں

(ج) صفتِ بیڑہ تنبول کہ نزد ہمہ خلق
بہ ازاں نیست سنہلتے بہمہ ہندستاں

(د) تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے — از دست وزباں چراغ وا ویلے
خالے بلبش دیدم و گفتم کہ تل است — گفتا کہ برو نیست درین تل تیلے

(ہ) گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی — آں دیگ دہی بر سرِ تو چتر شہی
از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد — ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی

ه دہی لو دہی

(و) زرگر پسرے چو ماہ پارا　　کچھ گھڑ لے سنوار لے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست　　پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

(ز) خوار شدم زار شدم لُٹ[1] گیا　　در غم ہجر تو کمر ٹوٹتہ[2] ہے

یار نہیں دیکھتا ہے سوے من　　بے گنہ ہم ساتھ عجب رُوٹتہ[3] ہے

روے تو رونق شکن آفتاب　　سرو بہ پیش قد تو بُوٹتہ[4] ہے

گاہ ز خسرو تو نہ گفتی کہ بیٹھ[5]　　وہ چہ کند بھاگ مرا پھوٹتہ[6] ہے

(ح) شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں

کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

(ط) پہیلی:-

بالا تھا جب سب کو بھایا　　بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا

خسرو کہہ دیا اس کا ناوں　　بوجھ نہیں تو چھوڑ دو گاوں

یہ پہیلی اس طرح بنائی ہے کہ اسی میں اس کی بوجھ موجود ہے لیکن بظاہر نظر نہیں آتی۔ امیر خسرو نے اس طرح کی بہت سی پہیلیاں کہی ہیں اور ان کو بڑی ذہانت کیساتھ موزوں کیا ہے۔ اس کے بوجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ چراغ جلانے کو دیا بالنا کہتے ہیں، اور چراغ بجھنے کے لئے دیا بڑا ہونا بولتے ہیں۔ اب پہلے شعر کے یہ معنی ہوئے کہ جب دیا بالا تھا (یعنی چراغ جلایا تھا) تو سب کو بھایا۔ جب دیا بڑا ہوا (یعنی چراغ بجھ گیا) تو کچھ کام نہ آیا۔ تیسرے مصرع کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں:- "خسرو کہہ کہ اس کا نام دیا ہے" اس طرح بوجھ بھی بتا دی۔

اگرچہ ان پہیلیوں کا امیر خسرو کی تصنیف سے ہونا کسی معتبر ذریعہ سے تحقیق

---

[1] لُٹ گیا [2] ٹوٹا [3] روٹھا [4] بوٹا [5] بیٹھ [6] پھوٹا

نہیں ہوا۔ لیکن امیر خسرو نے اپنی تصنیف اعجاز خسروی میں زبان و محاورہ، ادب و بلاغت کے جو لطائف و نوادر پیدا کئے ہیں ان پر قیاس کر کے ان پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، انملیوں، دوہوں، گیتوں، نقلوں کو ظن غالب کے ساتھ امیر خسرو سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

(سی) یہی حال امیر خسرو کی مشہور تصنیف **خالق باری** کا ہے کہ اس کے لئے بھی کوئی معتبر شہادت تاریخی نہیں ہے لیکن اس کا ان کی تصنیف ہونا تعجب بھی نہیں۔ "خالق باری" منظوم نعت کی کتاب ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

خالق باری سرجن ہار   واحد ایک بدا کرتار

۸۔ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر (متوفی ۱۲۶۵ء ۶۶۴ھ) حضرت بابا فرید شکر گنج کے بھانجے اور داماد تھے۔ پیران کلیر شریف میں مزار مبارک ہے۔ "سیر الاقطاب" (مصنفہ ۱۶۴۶ء ۱۰۵۶ھ بعہد شاہجہاں) سے منقول ہے کہ حضرت مخدوم صابر صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی میں احمد اور ہندی میں صابر تخلص فرماتے تھے۔ مصنف سیر الاقطاب نے "زبان ہندی" کا صرف یہ شعر درج کیا ہے:۔

اس طرح اس پیٹ وب اے صابر   کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے

اس سات سو برس پہلے کے شعر کی زبان وہی ہے جو آج صحیح و فصیح اردو کی ہے۔ اس لئے اس شعر کا انتساب مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

(۹) حضرت شیخ سراج الدین عثمان معروف بہ اخی سراج (متوفی ۱۳۵۷ء ۷۵۸ھ) حضرت سلطان الاولیا کے مرید تھے۔ ان کے وصال کے بعد بنگالہ سے دہلی آئے اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی سے خلافت حاصل کی۔ خواجہ صاحب نے حکم دیا "بنگالہ جاؤ" شیخ صاحب نے عذر کیا کہ وہاں شیخ علاء الدین قل پہلے سے موجود ہیں۔ میری کیا ضرورت ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "تم اوپر دے تل"

۱۰۔ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (متوفی ۱۳۸۰ء ۷۸۲ھ) ملک بہار کا ایک قصبہ

منیر آپ کا وطن مبارک ہے۔ پوربی اور ہندی شاعر تھے۔ ان کے کچھ منتر دفع زہر و امراض کے لئے مشہور ہیں۔ خاکسار راقم کے خاندان میں بھی ایک منتر رائج ہے جس کی بڑی لمبی عبارت ہے۔ اس کے آخر میں یہ دُہرا ہے:۔

کالا ہنسا نرملے بسے سمندر تیر　　پنکھ پسارے بس ہرے نرمل کرے شریر[۱]

ہمیں تحقیق نہ تھی کہ یہ منتر اور شعر کس کا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب مذکور سے معلوم ہوا کہ یہ شعر حضرت یحییٰ منیری کا ہے۔ مولوی صاحب نے حضرت کا ایک یہ دُہرا بھی نقل کیا ہے:۔

شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے　　گردچھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

اُردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء

خواجہ سیّد اشرف جہانگیر سمنانی نے (جن کا مزار کچھوچھا شریف علاقہ اودھ میں ہے) اُردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوّف پر ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء میں تصنیف کیا۔

میر نذر علی درد کاکوروی رسالہ نگار لکھنؤ بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ ـــ سید اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو اُردو زبان میں (جسکو اس زمانے میں "زبان ہندی" کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے۔ اس کے ص ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے:۔

"اے طالب آسمان و زمین سب خدا میں ہے، ہو اسب میں خدا ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرّہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔"

نثر اُردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے۔ سید اشرف صاحب ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ سال کی عمر کو (بحساب قمری) پہنچکر ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں وفات پائی۔ خالق باری کا سال تصنیف معلوم نہیں۔ لیکن چونکہ امیر خسرو سید اشرف سے عمر میں ۳۵ سال

---

[۱] میں نے یہ شعر اپنے خاندان کی روایت کے مطابق لکھا ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق کے منقول شعر سے ایک آدھ لفظ میں اختلاف ہے۔

بڑے ہیں اس لئے خالق باری کو مقدم رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے سید اشرف صاحب کی کتاب پہلے لکھی گئی ہو اور اردو زبان میں تصنیف اوّلین یہی ہو بہر حال اوّلیت انہی دونوں میں دائر ہے۔ بعض محققین کی نظر میں "خالق باری" کا انتخاب حضرت امیر خسرو سے مشتبہ ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر اگر خالق باری کسی بعد کے مصنف کا کارنامہ ہے تو پھر سید اشرف جہانگیر کا رسالہ تصوّف ہی اردو کی پہلی کتاب ہے۔

اب تک ارباب تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیف نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اُردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہانگیر کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔

فتح دکن (دکن میں اُردو کا آغاز) ۱۳۱۲ء / ۷۱۲ھ | علاء الدین خلجی بادشاہ دہلی کے غلام سردار ملک کافور نے ۱۳۰۶ء / ۷۰۶ھ میں دکن پر حملے شروع کئے اور ۶ سال میں ۱۳۱۲ء / ۷۱۲ھ تک تمام مہاراشٹر (ملک دکن) کو سلطنت دہلی میں شامل کر لیا اور مسلمانوں کی حکومت راس کماری تک وسیع ہو گئی۔

یہ اسلامی لشکر جو دہلی سے دکن گیا اُردو زبان ساتھ لے کر گیا۔ ان لوگوں کے دکن میں رہنے کی وجہ سے دکن میں اُردو کا آغاز ہوا۔ اسی نے اہل دکن کو اُردو سکھائی۔ اس زمانہ سے پہلے وہاں اُردو کا رواج شروع نہ ہوا تھا اور واقعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس وقت تک پنجاب دہلی اور تمام شمالی ہند میں اُردو کا آغاز ہو چکا تھا اور تصنیف و شاعری بھی شروع ہو چکی تھی۔

گجرات میں اردو کا آغاز ۱۲۹۷ء / ۶۹۶ھ | اس سال میں علاء الدین خلجی نے گجرات کو فتح کیا۔ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد حکومت میں گجرات سلطنت دہلی کا صوبہ رہا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۴۴ء / ۷۴۴ھ میں گجرات میں بغاوت ہوئی اور بادشاہ سے فرو نہ ہو سکی

گجرات میں خود مختاری کی کوشش جاری رہی۔ آخر فیروز تغلق کے بعد ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں
ظفر خاں حاکم گجرات بنا کر بھیجا گیا۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد خود مختار بن بیٹھا اور اس کی
اولاد نے تقریباً دو سو برس یعنی ۹۸۰ھ/۱۵۷۳ء تک حکومت کی۔

مسلم فاتحوں کے ساتھ ہمیشہ ہر ملک میں مسلمان علماء، وزراء اور اولیاء اللہ
بھی پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح ہر مقام پر ہر زمانے میں اسلامی تمدن و معاشرت، اور
اسلامی حکومت و شریعت کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم ظاہر و باطن بھی رائج و شائع ہوتے
رہتے تھے۔ چنانچہ گجرات میں بھی ابتدائے فتح گجرات سے ہی ارباب علم و اہل دل کا
اجتماع شروع ہو گیا تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ شیخ گنج العلم تحصیل علم کے لئے گجرات گئے
تھے۔ گجرات میں مسلمانوں کے سبب سے اردو کی ابتدا ہوئی اور آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہی۔

(۱) ۸۰۲ھ/۱۴۰۰ء میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے سید برہان الدین
عبداللہ بن محمود آغاز شباب میں پٹن (گجرات) میں تشریف لائے۔ پھر جب سلطان احمد
بادشاہ گجرات (۸۱۴ھ/۱۴۱۱ء تا ۸۴۵ھ/۱۴۴۲ء) نے احمد آباد آباد کیا تو سید صاحب پٹن سے
احمد آباد آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ گجرات میں آپ کا لقب قطب عالم اور آپ کے فرزند
اکبر سید سراج الدین محمد بن عبداللہ کا لقب شاہ عالم مشہور رہے۔ حضرت قطب عالم
کے متعلق مذکور ہے کہ ایک روز آپ پچھلی رات کو اٹھ کر باہر نکلے تو کسی چیز سے ٹھوکر
لگی آپ نے فرمایا۔ لوہ ہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے۔ قطب عالم کا وصال ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں ہوا۔

(۲) جب شاہ بارک اللہ چشتی احمد آبادی نے بشارت نبوی کی تعمیل میں قطب عالم
کے فرزند اکبر کو "شاہ عالم" کا لقب دیا اور قطب عالم نے بشارت خواب اور لقب کا
واقعہ سنا تو فرمایا کہ "چشتیوں نے پکائی اور بخاریوں نے کھائی" شاہ عالم نے ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء
میں وصال فرمایا۔

(۳) شیخ وجیہہ الدین گجراتی (عالم درویش کامل) کے چند مقولے بحر الحقائق میں
درج ہیں۔ مثلاً (الف) "اس سیس ہور کیا خوب ہے۔ اس دنیا میں کہ دل خدا سوں
مشغول ہو وے۔" (ب) "عارف اسے کہویں جو خدا سوں بھریا ہو وے۔"

اُردو کی اہمیت و مقبولیت

۱۳۳۳ء / ۷۳۴ھ (۱) ابن بطوطہ طنجہ (افریقہ) کا رہنے والا تھا۔ اس کی مادری زبان عربی تھی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۳۳ء میں ہندوستان آیا اور عربی زبان میں اپنا سفرنامہ لکھا۔ اس نے پردہ، پروانہ، بارگہ، سراچہ، ناخدا وغیرہ فارسی الفاظ کے ساتھ بہت سے اُردو کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ٹوامنڈی، ڈولہ، کہار، کنگھی، ان الفاظ کے ہندی حروف کو عربی حرف سے بدل لیا ہے۔ بعض جگہ الفاظ میں تغیر بھی کر لیا ہے۔ مثلاً کِشری (کھچڑی)، جوتری (چودھری)، جوکیہ (جوگی) قطارہ (کٹارہ)۔

۱۴۱۹ء / ۸۲۲ھ (۱) مُلّا بدر محمد دہلوی معروف بہ "قاضی خاں" نے ۱۴۱۹ء میں فارسی زبان کی کتاب لغت ادات الفضلا لکھی۔

۱۴۴۸ء / ۸۵۲ھ (۲) قوام الدین ابراہیم فاروقی نے بنگال میں سلطان رکن الدین باربک حاکم بنگالہ کے زمانے میں ایک لغت فارسی ۱۴۴۸ء میں مرتب کیا اور شرف نامہ اس کا نام رکھا۔

۱۵۱۸ء / ۹۲۴ھ (۳) شیخ لاد دہلوی (متوفی ۱۵۱۹ء / ۹۲۵ھ) نے سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں مؤید الفضلاء کے نام سے فارسی لغت مدون کیا۔

ان تینوں لغات میں اور خصوصاً مؤید الفضلاء میں صدہا فارسی الفاظ کے معنی اُردو میں بیان کئے ہیں۔ اس طرح مؤید الفضلاء میں تقریباً آٹھ سو اُردو کے الفاظ آگئے ہیں۔ اُردو زبان کی اہمیت و ضرورت کی یہ کچھ کم دلیل نہیں ہے۔

۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء / ۸۴۳ھ تا ۹۲۴ھ (۴) کبیر داس بنارس کے مسلمان جولاہے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ کسی برہمن کے لاوارث بچے تھے۔ ایک مسلمان جولاہے اور اس کی بیوی نے بیٹا بنا کر عالم شیر خوارگی سے پرورش کی۔ بڑے ہو کر گرو راما نند کے چیلے ہو گئے اور پھر اپنا الگ مذہب کبیر پنتھ نکالا۔ ان کے پند آمیز دوہے کثرت سے مشہور ہیں۔ جن میں عربی و فارسی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً

کبیر شرر پر سر آسے ہے کیوں سوئے سکھ چین

کوتج نقارآ سانس کا باجت ہے دن رین
کا نگر پاتھر جوڑ کے مسجد لئے چنائے
تا چڑھ ملّا بانگ دے، کیا بہرا ہوا خدائے
دین گوایو دُنی (دُنیا) سے، دنی نہ آیو ہاتھ   پیر کہاڑی مار لو گا پھل (غافل) اپنے ہاتھ

کبیر سے چند غزلیں بھی منسوب ہیں لیکن ان کی تاریخی سند مشتبہ ہے۔ اگر یہ غزلیں کبیر داس کی ہیں تو پھر دکن کی اولیت شعر و غزل کے سب نظریے باطل ہیں۔ ایک غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:-

ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ میں، ہمن دنیا سے یاری کیا
کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے، ہمن کو بوجھ بھاری کیا

۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء
۸۷۴ھ — ۹۴۵ھ
(۵) گرو نانک سکھ مذہب کے بانی کبیر کے ہم عصر تھے۔ کبیر کی تعلیم اور مذہب اور شاعری سے متاثر ہوئے۔ ان کے دوہوں یا ہندی اشعار میں بھی عربی فارسی کی آمیزش اُردو کی رفتار ترقی و مقبولیت کو ثابت کر رہی ہے۔ مثلاً

سانس ماس سب جیو تمھارا   تو ہے اکھرا پیارا
نانک شاعر یوں کہت ہے   سچے پروردگارا

۱۵۲۶ء
۹۳۲ھ
(۶) تاریخ داؤدی میں منقول ہے کہ جب جنگ پانی پت (۱۵۲۶ء) میں بابر نے سلطان ابراہیم لودی پر فتح پائی اور اس کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے لایا گیا تو حاضرین میں سے کسی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے:-

نو سے اوپر تھا بتیسا   پانی پت میں بھارت دیسا
اٹھیسیں رجب (جمعہ) سکروارا   بابر جیتا براہیم ہارا

(یعنی ۸ رجب ۹۳۲ھ روز جمعہ)

۱۴۸۳ء تا ۱۵۳۰ء / ۸۸۸ھ تا ۹۳۷ھ | (۷) سلطنت مغلیہ کے پہلے بادشاہ بابر نے ۱۵۱۹ء / ۹۲۵ھ میں پہلا کامیاب حملہ سندھ پر کیا اور تیسرا حملہ ۱۵۲۶ء / ۹۳۲ھ میں کر کے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ بابر صاحبِ سیف و قلم تھا۔ ترکی اور فارسی زبان کا شاعر تھا۔ دونوں زبانوں کا دیوان یک جا طبع ہو گیا ہے۔ ترکی زبان میں اپنے سوانح حیات ایک ضخیم کتاب تزک بابری میں مرتب کئے ہیں۔ قیام ہندوستان کے دوران میں اُردو زبان سے بھی مناسبت پیدا کی۔ اپنی تصنیف میں کثرت سے اُردو الفاظ لایا ہے۔ مثلاً ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، کیوڑا، کروندا، چرونجی، گلہری، مور، دوپہر وغیرہ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک ترکی شعر میں بھی اُردو الفاظ اور اُردو فعل استعمال کیا ہے۔ لکھا ہے:-

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی   فقرا ہلیغہ بس بولغوسیدر پانی و روتی

۱۵۳۵ء / ۹۴۲ھ | (۸) اُردو کے رواج اور عام بول چال کا ایک عجیب و دلچسپ ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ۱۵۳۵ء میں ہمایوں بادشاہ نے بادشاہ مالوہ و گجرات بہادر شاہ پر حملہ کیا۔ اس کا سپہ سالار رومی خاں مغلوں سے خفیہ طور پر مل گیا تھا۔ رومی خاں کی غدّاری و بیوفائی سے بہادر شاہ کو شکست ہو گئی۔ ہمایوں کو اسباب غارت میں بہادر شاہ کا ایک طوطا بھی ہاتھ آیا۔ طوطا انسان کی طرح باتیں کرتا تھا۔ فتح کے بعد ہمایوں کے دربار میں طوطے کا پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ رومی خاں دربار میں حاضر ہوا تو طوطا اس کو دیکھتے ہی چلا اٹھا:-

"پھٹ پاپی رومی خان نمک حرام، پھٹ پاپی نمک حرام"

۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۴ء / ۹۳۸ھ تا ۱۰۳۲ھ | (۹) تلسی داس مصنف رامائن اکبر و جہانگیر کے زمانے میں تھا۔ رامائن ہندی کی نظم ہے۔ خالص ہندوؤں کے قصص و حکایات، تہذیب و معاشرت، رزم و بزم اس کا موضوع ہے لیکن عربی و فارسی الفاظ اس قدر عام و مقبول تھے کہ تلسی داس رامائن میں بھی کہیں کہیں بیساختہ لکھ گیا ہے۔ تلسی داس نے اخلاقی دوہے بھی کہے ہیں ان میں تو کثرت سے عربی فارسی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً

جو مینا میں نا کہے، بیٹھی شکر کھائے   جو بکری میں میں کہے سہج ہی ماری جائے

تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر   فرزیں شاہ نہ ہو سکے، گت ٹیڑھی تاثیر

(۱۰) سورداس بھی اسی زمانہ کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں بھی عربی فارسی کی کثرت ہے۔ مثلاً

کھیت بہت کا ہے تم تانے، سین سی آواج

دیونہ جات پار اتر آوے، چاہت چڑھیں جہاج

اسی میں ایک قافیہ گریب نواج (غریب نواز) ہے۔

۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء / ۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ | (۱۱) ایک مرتبہ اکبر بادشاہ کے سامنے کسی اشتعال طبع پر ادہم خاں نے خان اتکہ کو قتل کر دیا تو اکبر نے بیساختہ ادہم خاں سے کہا:-

"اے ملیچھ گاؤدی تو کیوں اتکہ مارا از جان بیجان کردی"[۵۱]

(۱۲) جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی اور اکبر و جہانگیر دُلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لے چلے تو راجہ نے کہا:-

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ہم باندگلام رہے

اکبر نے برجستہ جواب دیا:-

تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار رہے[۵۲]

۱۵۶۷ء تا ۱۵۹۲ء / ۹۷۵ھ تا ۱۰۰۱ھ | (۱۳) شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف زاد المتقین (مصنفہ ۱۵۹۴ء) میں مذکور ہے کہ ان کے استاد و مرشد شیخ عبدالوہاب متقی متوطن مالوہ دکن سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ وہاں ۱۵۶۷ء / ۹۷۵ھ سے وقت وفات ۱۵۹۲ء / ۱۰۰۱ھ تک ۲۶ سال طلبہ کو درس دیتے رہے جس کی صورت یہ تھی کہ عرب طالب علموں کو عربی زبان میں سمجھاتے تھے۔ اہلِ عجم کو فارسی میں اور ہندوستانیوں کو اُردو میں۔

---

۵۱ یہ فقرہ شمس العلماء مولانا محمد عبدالغنی ایم۔اے۔ ایم لٹ پروفیسر ناگپور یونیورسٹی نے "تاریخ ہمایونی" قلمی سے اپنی تصنیف تاریخ ادب فارسی در عہد سلاطین مغلیہ جلد سوم میں درج کیا ہے۔

۵۲ یہ واقعہ بھی پروفیسر محمد عبدالغنی صاحب کی اسی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے۔

یہ سب واقعات اردو زبان کے رواج عام کثرت اشاعت، مقبولیت واہمیت کے ثبوت ہیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق (متوفی ۱۳۵۱ء) کے زمانے سے اُردو مستقل زبان بن کر بول چال، لین دین کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اگرچہ شاہی زبان، دفتری زبان، کتابی زبان، مدت تک فارسی رہی لیکن کاروباری زبان اور رعایا کی زبان عام طور پر اُردو ہی تھی۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا دورِ قدیم | اب تک جو نمونے درج کئے گئے وہ بول چال کی اُردو کے تھے یا ہندی شاعری میں فارسی وعربی الفاظ کی آمیزش کے۔ کبیرداس، گرو نانک، تلسی داس، سورداس کے دوہوں میں عربی وفارسی زبانوں کے شامل ہونے سے اُردو زبان کی شان بے شک پیدا ہوگئی اور اس کو یقیناً اردو شاعری کا سنگ بنیاد کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اُردو شاعری جس چیز سے عبارت ہے اس میں فارسی بحریں بھی شامل ہیں۔ اس اعتبار سے بھی اردو شاعری کا آغاز قدیم زمانہ میں ہو چکا تھا جس کا ثبوت امیر خسرو اور کبیرداس کی غزلیں اور امیر خسرو کی خالق باری ہے۔ اگرچہ ان کی سند تاریخی مشتبہ اور مختلف فیہ ہے۔ تاہم ان کا وجود خارج از قیاس نہیں ہے۔ خاص کر جبکہ کبیرداس ہی کے زمانے میں ایسے شاعر اور بھی موجود تھے۔ جنھوں نے اردو و فارسی کی مخلوط غزلیں کہی ہیں اور اس کے بعد سے شاعری وغزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

۱۵۵۶ء / ۹۶۳ھ | (۱) نوری اعظم پوری اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھا فیضی کا دوست تھا اس کا یہ شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرا میں درج کیا ہے:-

ہرکس کہ خیانت کند البتہ بترسد بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

۱۵۹۳ء / ۱۰۰۲ھ | (۲) حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کاکوروی بھی اکبر کے زمانہ کے بزرگ ہیں۔ اکبر کی زندگی میں ۱۵۹۳ء / ۱۰۰۲ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ ان کی ایک غزل مشہور ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:-

ہم تم کو دل دیا، تم دل لیا اور دُکھ دیا ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ ریت ہے

۱۶۲۵ء / ۱۰۳۴ھ (۳) محمد افضل ساکن جھنجھانہ ضلع میرٹھ تلسی داس کا ہم عصر ہے۔ اکبر و جہانگیر کا زمانہ دیکھا ہے۔ کسی ہندو عورت پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ اپنی داستان محبت عجیب والہانہ انداز سے نہایت درد انگیز اُردو مثنوی میں بیان کی ہے۔ مثنوی کافی طویل ہے ایک نظم بارہ ماسہ بھی لکھی ہے۔ ۱۶۲۵ء میں انتقال کیا۔

۱۶۶۲ء / ۱۰۷۳ھ (۴) پنڈت چندر بھان برہمن تخلص بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں عمر گذاری۔ شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں منشی تھے۔ پھر شاہزادہ دارا شکوہ کے میر منشی رہے۔ ۱۶۶۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:۔

خدانے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے

پنڈت چندر بھان برہمن کے انتقال کے بعد ولی[۵] احمد آبادی پیدا ہوئے ہیں اور تقریباً ۱۷۰۰ء / ۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے ہیں۔ لیکن اس وقت ان کے کلام کی شہرت دہلی میں نہیں ہوئی بلکہ ۱۷۲۱ء / ۱۱۳۳ھ میں ولی کا دیوان دکن سے دہلی میں آیا ہے۔

۵۔ ولی کو اکثر اہل تذکرہ نے دکنی یا اورنگ آبادی لکھا ہے۔ لیکن ابو احمد میاں اختر جوناگڈھی نے طویل بحث کے بعد بدلائل ثابت کردیا ہے کہ ولی احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے، اورنگ آباد (دکن) ہرگز ان کا وطن نہ تھا۔ گجرات سے لیکر مدراس تک کے حصہ کو قدیم زمانے میں دکن کے لفظ سے تعبیر کردیا کرتے تھے۔ اس لئے بھی بعض اہل تذکرہ نے ولی کو دکنی لکھدیا ہے۔ گجرات اور دکن کی زبانوں میں اشتراک بھی ہے لیکن ولی کے کلام میں ایسے الفاظ و محاورت موجود ہیں جو خاص گجرات میں رائج ہیں۔ دکن میں کوئی ان کو جانتا بھی نہیں۔ ولی کے خاندانی حالات اور انکے زمانے کے بعض لوگوں کے اقوال سے بھی ولی کا گجراتی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اختر جوناگڈھی صاحب نے اس طرح کی بہت سی دلیلیں قائم کی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی یہاں ولی کو احمد آبادی لکھدیا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ ولی کے دہلی میں آنے سے پہلے اور انکے دیوان غزلیات اُردو کی دہلی میں شہرت ہونے سے پہلے دہلی اور شمالی ہند میں اُردو غزل گوئی شروع نہ ہوئی تھی۔ ہم نے اسی مضمون میں مختلف غزل گو شاعروں کے نمونوں سے اسکی تردید کی ہے۔

۱۶۹۰ء / ۱۱۰۱ھ | (۵) معزالدین موسوی خاں فطرت مشہد (ایران) کے رہنے والے تھے۔
۱۶۷۰ء / ۱۰۸۲ھ میں ہندوستان آئے دربار عالمگیر میں اعزاز پایا۔ فارسی کے شاعر تھے۔
اُردو میں شعر گوئی کا چرچا دیکھکر کبھی کبھی اُردو میں بھی کہتے تھے۔ ایک شعر ان سے یادگار رہ گیا ہے۔ جس میں اردو اور فارسی مخلوط ہیں:-

از زلف سیاہ تو بدل دوم پری[۱] ہے — در گلشن آئینہ گھٹا جوم پری[۲] ہے

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اردو شاعری کو رواج ہو چلا تھا۔ حالانکہ ولی احمد آبادی کا دیوان ابھی دہلی میں نہیں آیا تھا۔

۱۷۲۱ء / ۱۱۳۳ھ | (۶) مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ شہزادہ محمد اعظم بن شہنشاہ عالمگیر کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ کسی نے شاہزادہ کے سامنے میرزا کی تعریف کی۔ شہزادہ نے کہا ہماری شان میں قصیدہ کہہ کر لائیں تو استعداد دیکھ کر اضافہ منصب و تقرب سے سرفراز کریں گے۔ میرزا نے یہ سُنا تو نوکری سے استعفا دیدیا۔ دوستوں نے ہر چند اصرار کیا کہ قصیدہ مدحیہ لکھیں لیکن انھوں نے انکار کیا۔ گوشہ عزلت اختیار کر لیا اور باقی عمر فقر و توکل میں گذار دی ۱۷۲۱ء / ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا۔ فارسی کے بڑے اعلیٰ شاعر تھے۔ اُردو کے دو شعر قائم و میر وغیرہ کے تذکروں میں ملتے ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

دیکھو ان اشعار کی زبان کس قدر صاف و صحیح ہے۔ یاد رہے کہ بیدل کے زمانے میں ولی کی شاعری کا چرچا دہلی میں شروع نہ ہوا تھا۔

---

[۱] یعنی دھوم پڑی ہے۔ [۲] یعنی گھٹا جھوم پڑی ہے۔

(۷) جعفر زٹلّی — ۱۶۵۹ء / ۱۰۶۹ھ تا ۱۷۱۳ء / ۱۱۲۵ھ

جعفر زٹلّی شاہجہاں کے زمانے میں ۱۶۵۹ء (۱۰۶۹ھ) میں پیدا ہوا۔ اور عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۷۱۳ء (۱۱۲۵ھ) میں انتقال کیا۔ مشہور مسخرا گزرا ہے۔ بہرحال شاعر تھا اور اس حیثیت میں اپنے ہم عصروں سے کم نہ تھا۔ اس کی ہزلیات میں کہیں کہیں مہذب ظرافت بھی موجود ہے۔ ایک مطبوعہ مجموعۂ کلام اس کی طرف منسوب ہے وہ سب اس کا نہ ہو پھر بھی اس نے بہت کچھ کہا ہے۔ جعفر عمر میں ولی احمد آبادی سے بڑا ہے۔ ولی جب دہلی آئے، جعفر کی عمر ۴۰ سال سے زیادہ تھی۔ اس نے ولی کے دہلی آنے سے پہلے شاعری شروع کر دی تھی۔

میر جعفر زٹلّی عالمگیر بادشاہ کے شہزادوں (محمد سلطان، محمد اعظم اور محمد معظم) کے درباروں سے توسل رکھتا تھا۔ اعظم و معظم کی لڑائیوں سے پریشان ہو کر عالمگیر کے زمانے کو یاد کرتا ہے اور ان بھائیوں کی خانہ جنگی کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

کہاں اب پائیے ایسا شہنشاہ — مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
الگت کے آنجواں دل لسوتا ہے — نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے
دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے — بچہ در گور سر کھٹیا کھڑی ہے
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم — زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
بیا جعفر زباں کو مختصر کر — ز دور مختلف دل میں حذر کر

شہر آشوب

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے!
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
بھلا دی بات سب ہر کی عجب یہ دَور آیا ہے

جعفر زٹل کے ہم عصر سید عبدالجلیل اٹل ہیں۔ نارنول سے دکن کو زٹل کے نام خط لکھتے ہیں:۔

پانا دِ ٹرالی وچوٹرالی میر جعفر بڑے بھائی ہر روز از یاد حق سکھی باشد......

زٹل تیری جعفر جہانگیر شد زٹل گفتن اندر تونئی[۵] میر شد

سید اٹل کی ایک غزل یہ ہے:۔

غزل اٹل

رخسار پر بہار سجن رونق چمن یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن
یا حقۂ جواہر و یا دُرج دُر کہوں یا غنچۂ گلاب کہوں یا کہوں دہن
گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھجنگ یا زلف مشک ناب ہے یا نافۂ ختن
یا قد خوش خرام چلے جب لٹک اٹک شمشاد اور صنوبر خم کھاویں در چمن
بر توسنِ کرشمہ سوار است نازنیں
سید اٹل ز بادۂ دیدار آوگن!

سنہ ۱۷۲۲ء / ۱۱۳۴ھ | (۸) میر عبدالجلیل بلگرامی علامۂ جلیل و شاعر بے عدیل گزرے ہیں ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں وفات پائی۔ علامہ مرحوم نے ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں نواب نظام الملک آصف جاہ وزیر فرخ سیر بادشاہ دہلی کی شان میں ایک قصیدہ فارسی لکھا ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں میں تاریخیں کہہ کر شامل کی ہیں۔ اُردو کی تاریخ کا شعر یہ ہے:۔

اسیس دیکے کہی ہندوی موں یوں بنت
"رہے جگت موں اچل باس یہ وزیر سدا"
۱۱۳۴ھ

---

۵ تعجب ہے کہ سید اٹل بجائے "تو میر شدی" کے "تونئی میر شد" لکھتے ہیں۔

۱۷۲۶ء / ۱۱۳۹ھ | (۹) میرزا عبدالغنی قبول کشمیری دہلی میں سکونت گزیں تھے۔ ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں وفات پائی۔ فارسی کے شاعر تھے اردو کا ایک شعر ان سے یادگار ہے:-

دل یوں خیال زلف میں پھرتا ہے نعرہ زن تاریک شب میں جیسے کوئی پاسبان پھرے

۱۷۴۶ء / ۱۱۵۹ھ | (۱۰) میرزا محمد رضا قزلباش خان ہمدانی امید تخلص شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ سید حسین علی "بادشاہ گر" کے دورِ سیادت میں برہان پور کرناٹک وغیرہ میں ملازم رہے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے قزلباش خان خطاب پایا۔ آخر دہلی میں اقامت اختیار کی اور وہیں ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں رحلت کی۔ ہندوستان آنے کے شروع زمانے میں جو شعر اردو کا کہا اس میں فارسیت بھی غالب ہے اور وکنیت بھی کہتے ہیں:-

باسن کی میٹھی آج مری آنکھ مو پڑی غصہ کیا و گالی دیا و دگر لڑی

پھر دہلی میں رہ کر یہ شعر ہے:-

درو دیوار سے اب صحبت ہے یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

نثر اردو کا دورِ اول

دکن میں اردو | یہ بات قابل غور ہے کہ پنجاب، دہلی اور تمام شمالی ہند میں اردو زبان کی ابتدا یعنی گیارھویں صدی عیسوی سے اٹھارھویں صدی کے آغاز تک کسی مستقل و مکمل تصنیف نثر یا نظم، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ، موجود یا مفقود کا پتہ نہیں ملتا بجز امیر خسرو کی خالق باری اور سید اشرف جہانگیری سمنانی کے رسالہ نثر اور افضل جھنجھانوی کی مثنوی کے۔ یہ کتابیں تبرکات ادبی سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان کی ایجاد کا سہرا پنجاب کے سر ہے۔ اور شاعری و تصنیف کا طرۂ شمالی ہند کے سر پر۔ لیکن یہ کارنامے امتیاز و اعزاز سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ برخلاف دکن کے، کہ اردو زبان کے رواج میں دکن پنجاب سے تین سو برس پیچھے ہے اور دہلی سے تقریباً سوا سو برس۔ اس پر بھی دکن نے اردو کی اتنی قدر کی کہ چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارھویں صدی تک نظم نثر کی صدہا کتابیں

تیار کردیں، جن میں شعر وسخن اور علم وفن کی مختلف اصناف شامل ہیں۔

اس کا سبب | ترقی زبان وادب کے معاملے میں دہلی کی تاخیر اور دکن کی تقدیم کا سبب یہ ہے کہ اس تمام مدت میں شاہی زبان اور دفتری وعدالتی زبان فارسی رہی مخلوط زبان (اُردو) بننے اور بڑھنے لگی تھی لیکن اس کو شاہی سرپرستی حاصل نہ ہوئی۔ اس لئے اس عرصے میں جتنی شاعری اور تصنیف وتالیف ہوئی فارسی زبان میں ہوئی۔ مسلمان اہلِ قلم نے اردو نوازی کی طرف توجہ نہ کی، ہندو اہلِ ذوق اَلنَّاسُ عَلیٰ دِیْنِ مُلُوکِھِمْ[۱] کے اصول پر فارسی علم وادب حاصل کرتے رہے۔

برخلاف دکن کے کہ فتح دکن (۱۳۱۲ء) کے چند سال بعد حسن بہمنی[۲] نے (جو محمد تغلق بادشاہ کا امیر دربار اور دکن میں بادشاہ کی طرف سے متعین تھا) حکومت سے بغاوت کرکے دکن میں شاہی اختیارات غصب کرلئے اور ۱۳۴۷ء میں سلطنت بہمنیہ قائم کرلی۔ یہ دکن میں پہلی خود مختار سلطنت تھی جو تقریباً دو سو برس (۱۵۲۶ء) تک قائم رہی۔ اس طویل مدت کے اکثر حصے میں ملک دکن پُرامن رہا۔ حسن بہمنی نے بادشاہ بنتے ہی اہل ملک وہندوان دکن کو فوج ودربار میں اعلیٰ عہدے دیئے۔ ایک برہمن کو وزیر مال بنایا۔ اس کے بعد بھی تمام شاہان بہمنی نے ہندوؤں کے ساتھ ہر طرح کے تعلقات تمدنی ومعیشتی قائم رکھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حسن بہمنی نے سلطنت کی دفتری وکاروباری زبان کے لئے بجائے فارسی کے ہندی کو پسند کیا۔ اس حسن انتخاب اور سیاسی تدبّر نے انتظام سلطنت کی آسانیوں کے ساتھ اُردو زبان میں شعر وادب کی بنیاد بھی ڈالدی۔

---

[۱] رعایا بادشاہوں کا طریقہ اختیار کرلیتی ہے۔

[۲] تاریخ فرشتہ کی غلط بیانی سے عوام میں حسن بہمنی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہوگیا ہے کہ وہ کانگو نام برہمن کا ملازم تھا۔ ایک دن کھیت میں کوئی دفینہ نکلا حسن نے اپنے آقا برہمن کو اطلاع کی وہ اس دیانت داری سے خوش ہوا اور سلطان محمد تغلق سے حسن کی سفارش کرکے اس کو دربار میں نوکر کرادیا۔ حسن نے دکن میں سلطنت قائم کی تو شکر واحسان کے طور پر برہمن کا نام شامل کرکے سلطنت بہمنیہ نام رکھا۔ فرشتہ کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی۔ حسن ایران کے بہمن شاہ کی نسل سے تھا اس لئے اپنے آپ کو بہمنی کہتا تھا۔

سلطنت بہمنی

۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۶ء
۷۴۸ھ — ۹۳۲ھ

دکن کا سب سے پہلا اردو مصنف شیخ گنج العلم (وفات ۱۳۹۳ء / ۷۹۵ھ)

شیخ عین الدین گنج العلم حکومت علاء الدین خلجی کے زمانے میں بمقام دہلی ۱۳۰۶ء (۷۰۶ھ) پیدا ہوئے۔ آغاز شباب میں تحصیل علم کے لئے گجرات کا سفر کیا۔ اس عرصے میں حکومت دہلی خلجی خاندان سے تغلق خاندان میں منتقل ہوگئی۔ ۱۳۲۵ء (۷۲۵ھ) میں محمد تغلق تخت دہلی پر بیٹھا اور ۱۳۲۶ء (۷۲۶ھ) میں اس نے مرکز حکومت دکن کو منتقل کرکے دیوگیر (دولت آباد) کو پایۂ تخت بنایا اور ۱۳۵۱ء (۷۵۲ھ) تک دکن میں اس کی حکومت رہی۔ اسی زمانے میں شیخ گنج العلم دہلی سے گجرات ہوتے ہوئے دولت آباد آئے۔ وہاں سے بیجاپور آکر قیام کیا اور بیجاپور ہی میں ۱۳۹۳ء (۷۹۵ھ) میں وفات پائی۔ شیخ صاحب کثیر التعداد فارسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دکنی اردو میں بھی چند مختصر رسالے مسائل شرعیہ کے متعلق تصنیف فرمائے۔ دکن میں اردو زبان کی سب سے پہلی کتابیں یہی ہیں۔ لیکن یہ رسائل اب ناپید ہیں۔

اردو کی سب سے قدیم کتاب جو شائع ہوئی

معراج العاشقین مصنفہ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ سب سے قدیم کتاب ہے جو حال میں شائع ہوئی ہے (باستثنائے "خالق باری") خواجہ گیسو دراز ۱۳۲۰ء (۷۲۰ھ) میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے فیض باطن اور اجازت وخلافت پائی۔ فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت (۱۴۱۲ء / ۸۱۵ھ) میں دہلی سے حسن آباد (گلبرگہ) آئے۔ احمد شاہ اول بہمنی کے زمانے میں ۱۴۲۲ء (۸۲۵ھ) میں وصال فرمایا۔ عربی وفارسی کے بڑے اعلیٰ پایہ کے مصنف تھے۔ اپنے مریدوں اور عام طلبۂ علم کو درس بھی دیا کرتے تھے اور عوام کی آسانی کے لئے کبھی کبھی دکنی اردو میں بھی سمجھاتے تھے۔ آپ کے چند مقولے اور اشعار کتابوں اور بیاضوں میں پائے گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) "ھوکوں موے سوں کچھ اپڑتیا ہے، خداکوں اپڑنے کی استعداد ہو رہے"۔

(۲) او معشوق بے مثال نور نبیؐ نہ پایا اور نور بنی رسولؐ کا یرے جیو میں بھلایا

اپیس اپیں دیکھاونے کیسی آرسی لایا

(۳) گھوڑے کوں بھیتر کھوڑہے اس کوں نہ حکت ہوئے

ہر دم ذکر سوں توڑ ہے غافل نہ ہو ہشیاتوں

کرو سکادل گیان کا انام دسے خوش دھیان کا

چارا کھلا ایمان کا رکھ باند اپنے دارتوں

خوگیر شریعت نعل بند زین ہے طریقت زیر بند

حق ہے حقیقت پیش بند تنگھ معرفت اختیار توں

تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائے گا

تب عشق جھگڑا پائے گا خدمارے تردار توں

شہباز حسینی کھوے کر ہر دو جہاں دل دھوے کر

اللہ آپے یک ہوئے کر تب پاوے گا دیدار توں

ان کے علاوہ خواجہ صاحب کے بعض رسائل دکنی اردو کے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن میں سے معراج العاشقین کو انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"اے عزیز، اللہ بندہ پنا یہاں پہچان کو جانا، یَں تو شرع جانا ہے۔ اول اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا۔"

"انسان کے بوجنے کوں پانچ تن، ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں، ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب لوجود، مقام اس کا شیطانی، نفس اس کا امّارہ، یعنی واجب الوجود کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ حسد تک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نکرنا سو۔ کینا کی شہوت کوں غیر جاگا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پہچان دوا دینا۔"[۵]

۵ یہ عبارت اور اشعار مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

معراج نامہ اور رسالہ سہ بارہ[۵] بھی حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف سے دریافت ہوئے ہیں ان کے نمونے یہ ہیں :-

"تحقیق خدا کے میانے ستر ہزار پردے او جیلے کے ہور اندھارے کے۔ اگر اس میں تے پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچہ یتے میں جلوں" (معراج نامہ)

سوال - ایمان کے جھاڑاں کیا اور ایمان کی ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات کیا اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا ایمان کا سکھ اور ایمان کا جیو کیا۔

جواب - ایمان کا جیو قرآن۔ ایمان کی جڑ توبہ۔ ایمان کی ڈالیاں سو بندگی۔ ایمان کی پات پرہیزگاری۔ ایمان کا تخم سو علم۔ ایمان کا پوست سو شرم۔ ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے" (رسالہ سہ بارہ)

سلطنت عادل شاہی

۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۶ء
۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ

بہمنی سلطنت کے چودہویں حکمراں محمود شاہ کی غفلت و کمزوری سے سلطنت کا زوال شروع ہوا تو بیجا پور (جو سلطنت بہمنیہ کا ایک صوبہ تھا) کے گورنر یوسف عادل شاہ نے ۱۴۹۰ء / ۸۹۵ھ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بیجا پور میں عادل شاہی حکومت قائم کر دی۔ دو سو سال تک قائم رہی آخر ۱۶۸۶ء / ۱۰۹۷ھ میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بیجا پور کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

اکثر شاہان بیجا پور خود عالم و شاعر اور قدر دان تھے۔ سلاطین بہمنی نے اردو کو دفتری زبان بنا دیا تھا۔ عہد عادل شاہی کے پہلے اور دوسرے بادشاہ نے پھر اردو کی

---

[۵] ماخوذ از اردو شہ پارے مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔

جگہ فارسی کو رواج دیا۔ اور تقریباً پچاس سال تک دفتر پر فارسی کی حکومت رہی لیکن ابراہیم عادل شاہ اول (۹۴۱ھ ۱۵۳۴ء تا ۹۶۵ھ ۱۵۵۸ء) نے مصالح ملکی کے لئے اردو ہی کو موزوں سمجھا اور بجائے فارسی کے دوبارہ اُردو کو رائج کر دیا۔ اس کے بعد پھر سلطنت کے ساتھ زبان کی قسمت پلٹی۔ یعنی ابراہیم کے جانشین علی عادل شاہ نے پھر فارسی کو ترجیح دی لیکن پھر اس کے جانشین ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اُردو کو فارسی کی مسند پر بٹھادیا۔ اس عرصہ میں اردو زبان دکن میں عام ہو گئی تھی لیکن اہل تصانیف میں شعرا کی تعداد زیادہ تھی۔ تاہم مصنفین نثر بھی موجود تھے۔ مثلاً

شمس العشاق شاہ میراں جی | حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے دکن آکر حضرت خواجہ گیسو دراز کے خلیفہ کے خلیفہ سے بیعت کی۔ بیجاپور میں ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء میں وفات پائی۔ دکن نے شاہ صاحب سے بڑا فیض پایا ہے۔ دکن کے بڑے علماء وصوفیا میں ان کا شمار ہے۔ ان کی تمام تصانیف اُردو نثر یا نظم میں ہیں۔ تصانیف نثر میں سے شرح مرغوب القلوب۔ جل ترنگ اور گل باس قلمی موجود ہیں۔ پہلے رسالہ کا نمونہ یہ ہے:۔

"خدا کہیا، تحقیق مال اور پنگڑے[۱] تمہارے دشمن ہیں۔ چھوڑ دیو دشمناں کوں۔ اے کیا غفلت ہے جو تجھے اندھلا[۲] کیا موت کی یاد تھے[۳] تجھے بسرا کر[۴]۔"

سب رس نام کا ایک رسالہ شاہ میراں جی نے ملا وجہی کی سب رس سے پہلے لکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"اول تجھے جو کوئی سکھلاتا ہے اسے پوچھ، توں منجیں سکلاتا سو تجھ پر کھلا ہے۔ اس کا کام اس پر نہیں کھلیا، سو تجھ پر کیا کھلے گا۔ توں کیا بجھ کر بھولیا ہے۔ بھو سکتا تو ادھر ادھر کیاں چار حکایتاں۔ اس حکایتاں سو کیا حاصل۔"

شاہ برہان الدین جانم | شاہ میراں جی کے فرزند ہیں۔ اولیاء کبار میں ہیں۔ ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء کے بعد وفات پائی ہے۔ نثر میں ایک رسالہ کلمۃ الحقائق ان کی تصنیف سے ہے۔ اس میں

---

۱ پنگڑے = اولاد ۲ اندھلا = اندھا ۳ تھے = سے ۴ بسرا کر = بھلا کر

تصوف کے مسائل سوال و جواب کے طور بیان کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:۔

"یہ تن الادھا[۵] دستا۔ ولیکن جیتا بکار، ٹوٹنے نہیں بلکہ سنتر بکار روپ دستا ہے۔
یک تل قرار نہیں، جیوں مرکٹ روپ"۔

شاہ امین الدین اعلیٰ | شاہ برہان الدین جانم کے فرزند و جانشین ہیں۔ تاریخ وفات "ختم ولی" سے ۱۰۸۶ھ نکلتی ہے (مطابق ۱۶۷۵ء) نثر میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ ایک رسالہ گنج مخفی کا نمونہ یہ ہے:۔

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی، سو اس سے امین دیکھ ہوا، امین شاہد کہتے ہیں، یو دونوں ذات کے دو طور ہیں ذات نے اپس کو دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اُسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں"۔

ان کی عبارت ان کے پدر بزرگوار اور جد امجد کی تصانیف کے مقابلے میں صاف و آسان ہے۔

سلطنت قطب شاہی

۱۵۱۰ء تا ۱۶۸۷ء
۹۱۶ھ　۱۰۹۸ھ

گولکنڈہ جو قطب شاہی بادشاہوں کا پایۂ تخت تھا بہمنی سلطنت ہی کا صوبہ تھا۔ مرکزی حکومت کے ضعف و زوال کا نتیجہ تھا کہ سلطنت قلی قطب الملک نے اعلان خود مختاری کر کے گولکنڈہ کو دارالسلطنت بنایا اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ ڈیڑھ سو برس سے زیادہ قائم رہنے کے بعد اس کی تباہی بھی شہنشاہ اورنگ زیب کے

---

[۵] الادھا= علیحدہ۔ دستا= نظر آتا۔ بکار= متحرک۔ سنتر= بدلنے والا۔ روپ= بھیس، حالت۔ مرکٹ= بندر۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے "یہ جسم علیحدہ نظر آتا ہے لیکن زندہ متحرک ہے۔ ٹوٹتا نہیں بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ متحرک حالت میں نظر آتا ہے۔ ذرا سی دیر کو قرار نہیں۔ گویا بندر ہے"۔

ہاتھوں عمل میں آئی۔

شاہان گولکنڈہ بھی اردو کے بڑے قدر دان تھے۔ تین بادشاہ اُردو کے شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ (ان کا ذکر حصۂ نظم میں آئے گا۔ اس دَور میں نثر کی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ اور گزشتہ دونوں عہدوں سے بہتر لکھی گئیں۔

شاہ میراں جی خدا نما | سید میراں حسینی نام ہے۔ حیدر آباد وطن تھا، بیجاپور جاکر شاہ امین الدین اعلیٰ سے بیعت کی بادشاہ گولکنڈہ عبداللہ شاہ (۱۰۳۵ھ ۱۶۲۵ء تا ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء) کے زمانے میں تھے۔ گراہم بیلی نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے ملازم بھی رہے ہیں۔ انھوں نے "تمہیدات عین القضات" مصنفہ عین القضات ہمدانی کا ترجمہ اردو میں کیا ہے جس کا نام شرح تمہید ہمدانی ہے۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ ۱۰۱۲ھ ۱۶۰۳ء میں لکھا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے پاس جو نسخہ ہے اس پر سنہ کتابت ۱۰۶۷ھ درج ہے گراہم بیلی نے سید صاحب کا سال وفات ۱۶۵۹ء (مطابق ۱۰۷۰ھ لکھا ہے اور مولوی عبدالحق صاحب نے ۱۰۷۴ھ (مطابق ۱۶۶۳ء)۔ بہرحال یہ کتاب دکن کی قدیم تصانیف اردو میں ضخیم ہونے کے سبب سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

> "اے عزیزاں، اسے بات نہیں سنیاں۔ بادشاہ گھوڑا مستعد کئے بانج[1] نہیں سوار ہوتے۔ ہور گھوڑے میں کچھ[2] کھوڑا[3] پچھے[4] تو بھی قبول نہیں کرتے یعنی پیر کے عشق میں پختا ہوئے باج خدا کے عشق میں نا آسکسی[5] ہور[6] دیکھ ناسکسی۔ اگر عشق خالق مدارہی بارے عشق مخلوق نے دیا کن۔ اس کا معنا، خدا کی پہچان کابل نہیں تو اول اپنی پہچانت کر۔"

مولانا عبداللہ | عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں تھے۔ ۱۰۳۲ھ ۱۶۲۲ء میں احکام الصلوٰۃ کے نام سے ایک رسالہ دکنی اُردو میں لکھا ہے جس میں فقہ حنفی کے مطابق احکام شریعت بیان کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:۔

[1] بغیر [2] کچھ [3] عیب [4] ہو [5] نہیں آسکتا ہے [6] اور

"روح قبض ہوا اسی وقت اس کیاں انکھیاں موچنا ہور پاؤں دراز کرنا ہور ہاتھ دراز کرنا دونوں پہلو کی طرف ولیکن سینے پر نا رکھنا۔ ہور اس کی ٹھڈی ہور سر کوں ملا کر بندنا۔ یو سب سنت ہے۔ ہور مرنے تے اول اس کے سر کوں قطب کی طرف سلانا ہور موے بعد از غسل دینا اسی طریق سوں"۔

ملا وجہی | عہد قطب شاہی کا نہایت ممتاز شاعر و مصنف تھا۔ اس نے چار بادشاہوں ابراہیم قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۵ھ ۱۶۳۵ء میں ایک کتاب سب رس نثر میں لکھی۔ یہ کتاب چند سال ہوئے عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمہ اور فرہنگ لغات قدیم کے ساتھ شائع کر دی ہے۔ اصل کتاب ٹائپ کے تین سو صفحوں پر چھپی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب دکن کی قدیم اردو کتابوں میں سب سے بڑی ہے۔ سب رس کا دوسرا نام "قصہ حسن و دل" ہے۔ فرضی قصے کی صورت میں عشق و عقل اور حسن و دل کے معرکے بیان کئے ہیں۔ افراد قصہ کے نام مہر، وفا، ناز، غمزہ، ناموس، زہد، توبہ، وغیرہ رکھے ہیں اور اس پیرایہ میں ان جذبات و واردات کے حقائق بیان کئے ہیں۔

اگرچہ وجہی نے اس کتاب میں کہیں اس امر کا اظہار نہیں کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اصل قصہ اس کے دماغ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ سب سے پہلے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری (متوفی ۸۵۲ھ ۱۴۴۸ء) نے فارسی نظم میں لکھا تھا۔ اس کا نام دستور عشاق ہے فتاحی نے اسی قصے کو مختصر طور پر فارسی نثر میں بھی لکھا تھا اور اس کا نام حسن و دل رکھا تھا۔

[1] فتاحی کا یہ قصہ نثر بہت مشہور و مقبول ہوا۔ چار ترکی مصنفوں نے اس کو اپنی زبان میں لکھا لامعی اور آہی نے نثر میں۔ اور والی و صدقی نے نظم میں۔ دو انگریزوں اور ایک جرمن ڈاکٹر نے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اصل کے ساتھ چھاپا۔ ہندوستان میں صلاح الدین صرفی نے اور داؤد اپلچی نے ۱۰۵۴ھ ۱۶۴۴ء میں اس کو فارسی مثنوی میں لکھا۔ پھر شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں ملا جامی بیخود (متوفی ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء) نے نظم کیا اور خواجہ محمد بیدل نے ۱۰۹۵ھ ۱۶۸۳ء میں پر تکلف فارسی نثر میں لکھا۔ یہ فتاحی کی تصنیف کی قدر شناسی تھی۔ وجہی کے سب رس کو بھی دکن کے دو شاعروں ذوقی اور مجرمی نے اردو نظم میں لکھا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کو مثنوی دستور عشاق دستیاب نہیں ہوئی بلکہ قصہ نثر "حسن و دل" مل گیا۔ اس میں ادنیٰ سا تصرف کر کے وجہی نے اردو میں لکھ دیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حسن و دل کی فارسی نثر مقفی و مسجع ہے۔ وجہی نے بھی سب رس میں ایسی ہی اردو نثر لکھی ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

(آغاز کتاب) "تمام مصحف کا معنی الحمد للہ میں ہے مستقیم، ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم، ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھیا ہے کریم۔ سمج دیکھ خاطر لیا انال، حدیث بھی یوں آئی ہے کہ العلم نقطۃ د کثرھا الجھال، یعنی علم یک نقطہ ہے جاہلاں اسے بڈھاے جہالت کو اس حد لگن لیائے۔"

(آغاز داستان) "نقل۔ ایک شہر تھا۔ اس شہر کا ناؤں سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کے ناؤں عقل، دین و دنیا کا تمام اس تے چلتا۔ اس کے حکم باج ذرا کیں نیں ہلتا۔ اس کے فرمائے پر جنو چلے، ہر دو جہاں میں ہوے بھلے۔ دنیا میں خوب کہوائے، چار لوگوں میں عزت پائے۔"

(ختم داستان) "الحمد للہ دونوں کوں ہوا وصال، اپنا دل خوش تو سب عالم خوش حال دل کوں ملیا جیو کا جانی، یو وصال مبارک یو خوشی ارزانی۔ ایتی جفا دل پڑی، تو میسر ہوئی یو وصال کی گھڑی۔ مرداں نے مشقت سوں امید کے دروازے کھولے ہیں، مَنْ طَلَبَ شَیْئًا وَجَدَّ وَجَدَ کر بولے ہیں یعنی جو کوئی جس کام جدھریا ان نے وو کام کریا۔"

میراں یعقوب ایک ضخیم کتاب "شمائل الاتقیا" مصنفہ شیخ برہان الدین اورنگ آبادی کو میراں یعقوب نے ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء کے بعد اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں تصوف کے مسائل ہیں۔ مضامین کتاب کو چار قسموں میں بیان کیا ہے۔ ان اقسام کی شروع میں تفصیل کر دی ہے۔ اس طرح۔

پہلا قسم۔ طریقت کے لوگوں کے افعال ہور سالکاں کے مقاماں ہور مریداں ہور

طالباں کے طلباں ہور اس کے عجائبات ہور باریکیاں کی شرح میں بیان کیا گیا ہے۔

سببِ ترجمہ۔ اپنی حیات کے وقت منجے[1] اشارت کئے تھی جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوے تا یو کسی کو سمجھا جاوے۔ اس وقت منجے بیا نہیں تا کہ یک ہزار ستر یو آٹھوں سال کوں رحلت کئے پر ان کے بھانجے عارف حق رسیدہ سے عارفوں کے نور دیدے مصطفےٰ کے کلیجے ہو مرتضیٰ کے نیں شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زمانے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا۔ جی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا۔

ذکر معجزہ و کرامت۔ ہور[2] ولیاں کیں کرامت ہے کہ اینو[3] پورا علم دھرتے ہیں شرع کے مغلوب ہور بیخود رہیں۔ جیکچھ[4] اینو تھے[5] ظاہر ہوتا ہے سو اسے کرامت کہتے ہیں۔ اما معونت او ہے[6] جو بعضے دیوانے جو پورا علم و معرفت نہیں دھرتے ہیں انو[7] تھے کچھ خرق عادت یعنی کدھن[8] نہیں ہوتا ہے سو چیز ظاہر ہوتا ہے۔ ہور منذ[؟] استدراج اسے کہتے ہیں جو بعضے بے ایمان لوگوں کچھ سحر ہور منتر ہور اس وزاں[9] کے چیزاں ظاہر کرتے ہیں[10]۔

دکن بعہد مغلیہ

۱۰۹۸ھ تا ۱۱۴۲ھ
۱۶۸۷ء تا ۱۷۳۰ء

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۸۶ء میں بیجا پور پر اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ پر قبضہ کرکے پھر دکن میں مغلیہ سلطنت قائم کردی۔ اس زمانے میں بھی دکن میں اردو کی

---

[1] منجے = مجھے [2] ہور = اور [3] اینو = یہ لوگ۔ [4] جیکچھ = جو کچھ [5] تھے = سے [6] او ہے = وہ ہے [7] انو = اُن [8] کدھن = کبھی [9] وزاں = وضع [10] ماخوذ از دکن میں اُردو۔

ترقی اور تصانیف نثر و نظم کا سلسلہ جاری رہا لیکن ہر عہد میں نثر کی تصانیف نظم کے مقابلے میں بہت کم ہوئی ہیں۔ اس عہد کا بھی یہی حال ہے تاہم بعض کتابوں کے نام اور بعض کے نمونے ملتے ہیں۔

۱۔ سید شاہ محمد قادری اورنگ زیب کے زمانے میں تھے۔ رائچور کے خاندان "نور دریا" کے بزرگ تھے اور شیخ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ۔ چند رسائل تصوف اردو نثر میں لکھے ہیں۔

۲۔ شاہ ولی اللہ قادری خلف شاہ حبیب اللہ قادری نے ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۴ء میں "معرفت السلوک" (مصنفہ شیخ محمود) کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء میں انتقال ہوا۔ اس کتاب کا موضوع تصوف ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

"بولتا ہے کمترین مرید ہور واپس ترین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی ہور بارگاہ ابالی عاجز فقیر الحقیر محمد ولی اللہ حکم کئے منجکوں حضرت شہباز ولایت معدنِ ہدایت آفتاب عالمتاب بزرگ اولیا کے بڑے اتقیا کے ہور صدر نشیں محمد مصطفےٰ کے، صاحب شریعت ہور طریقت کے، دربار حقیقت اور معرفت کے وارث محمدؐ رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری باقی رکھے اللہ انوکوں۔"

"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کے بیان میں بیان کروں۔ ہور اس کی شرطاں کی شرح کوں عیاں کروں۔ کیا واسطا کہ سِرّ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے نکیس کے تحقیق کرنا بہوت مشکل ہے۔ کیا واسطا کہ یو کلام صاحب دل کا ہے نہ ہر ایک بے دل کا ہے۔ ہور عارفاں نے اس بات میں بہوت کتاباں کئی ہیں۔"

۳۔ سید شاہ میر بھی اسی زمانے کے بزرگ ہیں۔ قصبہ راجوتی وطن تھا۔ اُردو نثر میں رسالہ "اسرار توحید" لکھا ہے۔ ایک اور رسالہ حقائق بھی شاہ میر کی تصنیف سے ہے جس کا ایک نسخہ ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء کا لکھا ہوا۔ نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دیکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" جو خدائے تعالیٰ فرمایا یعنی میں معبود نیں[1] بلکہ تمہارے سا
عبد ہوں خدا کی نسبت۔ ہور[2] خدا نیں بلکہ بندہ ہوں خدا کا رسول ہوں۔ تمہیں[3] مج سوں
ہے۔ ہور میں خدا سوں ہوں۔ یعنی تیں میرے نور ہیں۔ ہور میں خدا کا نور ہوں۔
اپس[4] سوں مجکوں جدا مت جانو۔ ہور مجھے اپس میں دیکھو۔ ہور سمجھو کہ خدائے تعالیٰ
منّت رکھیا[5] ہے تمنا[6] پر اس بات کا کہ نقد من اللہ"۔

۴۔ مترجم طوطی نامہ قادری۔ اس شخص کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ طوطی نامہ ان کتابوں میں ہے جو الف لیلہ اور کلیلہ دمنہ کی طرح نہایت مقبول ہوئیں اور بہت سی زبانوں میں ان کے ترجمے اور خلاصے لکھے گئے۔ کلیلہ دمنہ کی طرح طوطی نامہ بھی دراصل سنسکرت میں لکھا گیا تھا جس میں طوطے کی زبانی ستر کہانیاں کہی گئی تھیں۔ مولانا ضیاء الدین بخشی بدایونی (متوفی ۱۳۵۰ء / ۷۵۱ھ) نے اُن ستر کہانیوں میں سے باون (۵۲) کہانیوں کا انتخاب کر کے ۱۳۳۰ء / ۷۳۰ھ میں فارسی میں لکھا اور طوطی[7] نامہ نام رکھا۔ لیکن زبان مشکل تھی۔ عام طور پر اس سے لطف اندوز ہونا دشوار تھا۔ اس لئے ملا سید محمد قادری نے گیارہویں صدی ہجری میں اُن ۵۲ کہانیوں میں سے ۲۵ کہانیوں کو عمدہ بامحاورہ فارسی میں لکھا

[1] نیں = نہیں [2] ہور = اور [3] تمہیں مج سوں ہے = تم مجھ سے ہو [4] اپس = آپ - خود
[5] رکھیا۔ رکھا۔ رکھی [6] تمنا = تم۔

[7] بخشی کے طوطی نامہ کو یہ قبول عام حاصل ہوا کہ فارسی میں ابوالفضل (عہد شہنشاہ اکبر) نے خلاصہ لکھا پھر سید محمد قادری نے خلاصہ کیا۔ ترکی میں عبداللہ صابری نے ترجمہ کیا۔ دکنی اردو میں غواصی نے ۱۶۳۹ء / ۱۰۴۹ھ میں اس کو نظم میں لکھا پھر ابن نشاطی نے ۱۶۶۵ء / ۱۰۷۶ھ میں نظم کیا۔ انگریزی میں جیرانس نے ترجمہ کیا مطبوعہ ۱۷۹۲ء۔ ملا محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ایک ترجمہ اردو میں ۱۷۲۹ء میں ہوا۔ دوسرا ترجمہ اردو حیدر بخش حیدری نے ۱۸۰۱ء میں کیا اور اس کا نام "طوطا کہانی" رکھا۔ انگریزی میں گلیڈون نے ترجمہ کیا۔ جو فارسی کے ساتھ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ میں چھپا۔ جرمنی زبان میں ۱۸۲۲ء میں ترجمہ ہوا۔ ہندی میں حیدر بخش کے اردو ترجمہ کا ترجمہ ۱۸۸۶ء میں ہوا۔

اور طوطی نامہ ہی نام رکھا۔ ہمارے زیر نظر "محمد قادری" کے اسی طوطی نامہ کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں لکھا گیا ہے اور جس کا مترجم ابتک پردۂ خفا میں ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے :-

"پچھے[۵] سیں طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کی کیفیت و حقیقت یو ہے کہ داستان قصہ ہا و حکایات حضرت نخشبی رحمۃ اللہ علیہ کوں بیچ طوطے نامے کے، ساتھ عبارت سخت و دقیق کے لکھے ہیں۔ اس کے تئیں مفصل و بیان وار واسطے معلوم ہونے تمام لوگوں کوں محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبہ انوکا بیچ عبارت سلیس اور آسان کے کہ ملی ہوئی اوپر عبارت خطاں کے

۵ یہ عبارت نہایت عجیب و دلچسپ ہے جس نے لوگوں کو دھوکا دے رکھا ہے کہ محمد قادری کو اس کا مترجم قرار دیں یا کسی اور کو۔ مولانا احسن مارہروی بالکل درست استدلال کرتے ہیں کہ "اول تو پرانے طریقہ بیان میں اپنے نام کے ساتھ مترجم و مؤلف انکسار آمیز الفاظ ضرور لکھتے تھے، دوم یہ کہ اپنے لئے تعظیمی ضمائر جمع کا استعمال نہ ہوتا تھا۔ یہ دونوں پابندیاں اس ترجمے میں نہیں ہیں"۔ اور اس بنا پر فیصلہ کرتے ہیں کہ "یہ ترجمہ محمد قادری کا نہیں ہے"۔ تاہم مولانا اس عبارت کے اس طرح واقع ہونے کے متعلق کوئی قیاس قائم نہیں کرتے اور اس کا مصنف محمد قادری ہی کو مان لیتے ہیں۔ اس عبارت کے مفہوم سے یہ خیال ہوتا ہے کہ طوطی نامہ کے مترجم نے (وہ جو کوئی ہو) یہ عبارت بطور دیباچہ کے اپنی طرف سے لکھی ہے۔ اسی لئے مصنف کا نام تعظیم سے لیا ہے :- "محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبہ انوکا"۔ لیکن جب عبارت کے الفاظ پر غور کیا جاتا ہے تو وہ فارسی کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں :-

پچھے سیں طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسماں کی کیفیت و حقیقت یو ہے
بعد از گوناگوں صفت و ثنائے خالق زمین و آسماں کیفیت و حقیقت آں است

اور وہ قیاس باطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر لکھنے والا اپنی طرف سے لکھتا تو ایسی عبارت نہ لکھتا۔ اٹھارہویں صدی میں زبان بہت کچھ صاف اور باقاعدہ ہو گئی تھی۔ ترجمہ کی یہ حالت البتہ اسکے بعد تک رہی ہے۔ اس لئے یہ عبارت ضرور ترجمہ ہے۔ اب ان مشکلات کا حل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مترجم ترجمہ کرتے کرتے جب نام پر پہنچا تو اس کا جی نہ چاہا کہ محمد قادری نے جس طرح اپنا نام لکھا تھا اس کا بجنسہ ترجمہ کر دیتا اس لئے تعظیمی طریقہ سے نام لکھا۔ نہ یہ کتاب ایسی تھی نہ یہ مقام ایسا کہ اپنی طرف سے کوئی تصرف جائز نہ ہو۔

ہوئے ور روزمرہ جواب سول کہ دولت منداں کے تئیں لائق ہوئے لکھے ہیں۔"

۵۔ مترجم طوطی نامہ ابوالفضل۔ مترجم کا نام اور ترجمہ کا سنہ معلوم نہیں۔ نخشبی کے طوطی نامہ کا خلاصہ ابوالفضل نے بھی اکبر بادشاہ کے حکم سے کیا تھا۔ اس کا خوشخط قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اور اس کے بین السطور میں اردو ترجمہ لکھا ہوا ہے لیکن ترجمہ پوری کتاب کا نہیں ہے۔ اگر مترجم ترجمہ کو ختم کر دیتا تو آخر میں اپنا نام اور سنہ ضرور لکھتا۔ اب ہم ان معلومات سے محروم ہیں لیکن طرز عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی تقریباً اسی زمانہ کا ترجمہ ہے جس کا محمد قادری کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری اور مولوی نصیر الدین ہاشمی دونوں نے اس کا قلمی نسخہ لندن میں دیکھا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنی تالیف (یورپ میں دکھنی مخطوطات) میں ابتدائی چند فقرے ابوالفضل اور مترجم اردو کے درج کئے ہیں:۔

فارسی	اردو
بعد سپاس خداوند زماں و زمیں و ستایش داور جان و تن آفریں کہ طوطیان باغ قابلیت را شیریں گفتار کرامت فرمودہ و بلبلان چمن کاملیت را عاشق گلشن قدرت خویش گردانیدہ۔	پچھیں تعریف صاحب زمانہ کے اور زمین کے یعنی خدائے کی تعریف کے بعد اور پچھیں تعریف صاحب جان اور تن پیدا کرنے ہارے کے وہ صاحب کہ طوطیاں باغ قابلیت کتیں یعنی منشاں کتیں مٹھاس باتوں کی بخشیا یعنی میٹھے باتاں منشیاں کو خدا نے سکایا۔ اور بلبلان چمن کامل پنے کتیں یعنی شاعراں کتیں عاشق باغ قدرت اپنے کا کیا یعنی اپنی قدرت دکھا کر عاشق کیا۔

اس سے آگے یہ مضمون آتا ہے:۔

چلنے ہارے برے راہ بندگی کو یعنی بندگی رکھنے ہارے کو۔ وہ کون؟ ابوالفضل بیٹا شیخ مبارک کا اس کے تیں پاک حکم جاری ہونے کے پایا یعنی بادشاہ حکم فرمایا

کہ یہ کتاب کتیں یعنی طوطی نامہ کو سات عبارت تازی کے سات روشن تھوری عبارت کے نقش ترتیب کا دیوے۔ یعنی مختصر عبارت بس بناوے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری نے اپنی تالیف (اردو شہ پارے) میں اس طوطی نامہ کی طویل عبارتیں نقل کی ہیں۔ ایک کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"بڑائی اور سنار اور درزی اور پرہیزگار مسافری کو نکلے۔ اور ایک رات بیچ جنگل دہشت بھرے ہوئے کے کہ پتا باگاں کا ڈر سیں اس جنگل کے پانی ہوتا تھا۔ یکایک اپنا اس جاگا میں پڑا یعنی ہوا۔ وہ چار دیار مصلحت کرے کہ ہم ہر ایک موافق باری کے یک ایک پہر نگہبانی کرے۔ اول بڑائی جاگتا تھا۔ کرٹی یک بیچ نہایت بہتری صورت کے چھلیا یعنی اچھی صورت بنایا۔ اور پھر دو گھڑی سنار اس صورت کے تیں زیور سیں سنوار یا۔ تیسری پہری میں درزی اس کے تیں سات لباس کے زینت دار کیا چوتھی پہری میں زاہد موں عاجزی کا طرف قبلہ کے لایا۔ دعا کیا اور جان بیچ بدن اس کے پھوکے گیا"[۱]

دکن میں عہد مغلیہ کے بعد کا دور

۱۔ محمد باقر آگاہ۔ ویلور (صوبہ مدراس) کے رہنے والے تھے ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں انتقال کیا۔ انھوں نے ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں اور اس کے بعد متعدد کتابیں عقائد و فقہ کے متعلق اردو میں لکھیں۔ یہ زمانہ دکن میں مغلیہ تسلط کے بعد کا ہے۔ اس زمانہ میں شمالی ہند (دہلی، آگرہ وغیرہ)

فرہنگ[۱]

ریچھے	پیچھے	جاگا	جگہ
سیں	سے	پڑیا	پڑا
کرنے ہارے	کرنے والے	چھلیا	پتلا
کیتیں	کو	موں	منھ
بڑائی	بڑھئی	پھوکے گیا	پھونکے گیا
باگاں	باگ (شیر) کی جمع		

میں اُردو شاعری اور تصانیف نظم کا سلسلہ جاری ہے لیکن اُردو نثر کی کوئی مستقل تصنیف نہیں پائی جاتی۔ فضلی کی دہ مجلس (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کا شمالی ہند کی ملکیت ہونا مشتبہ ہے۔ اور مرزا سودا دہلوی کا دیباچہ دیوان متفرقات میں شامل ہے۔ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے تراجم قرآن مجید بعد کی چیزیں ہیں۔

باقرآگاہ کی مندرجہ ذیل عبارت ان کے منظوم رسائل کے دیباچہ کا اقتباس[۵۱] ہے۔

"بعض علمار متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ان سے فائدہ پاویں۔ لیکن اکثر عورتاں اور تمام اُمّیان فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اس لئے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہے۔ اور ہر رسالہ کے وزن علیحدہ ہونے سے خواہش و آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہوئے۔ چھ رسالہ اول کے مع رسالہ عقائد سنہ ایک ہزار ایک سو اور استی اور پانچ میں اور ایک ہزار ویک سو اور استی اور چھ میں (۱۱۸۵ھ و ۱۱۸۶ھ) بنے ہیں...... اور ان سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اُردو کے بھاکے میں نہیں کہا۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔ اے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں"۔

اس کے بعد دہلی وغیرہ میں تصانیف نثر کا عام رواج شروع ہو جاتا ہے۔ اور بہ تھوڑے عرصہ میں اس کثرت سے اور اس قدر اعلیٰ تصانیف پیدا ہو جاتی ہیں کہ اس کے ساتھ کی دکن کی تصانیف کا پلّہ جھک جاتا ہے۔ تاہم دکن میں بھی اُردو نثر کی تصانیف جاری رہتی ہیں اور ایسی ہیں کہ تاریخ نثر میں نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

۲۔ ارکاٹ کی اسلامی سلطنت کے زمانے میں شرف الملک مولانا محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ نے جو دربار ارکاٹ کے مدارالمہام اور اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے کیدانی فقہ حنفی کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان کا انتقال ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں ہوا۔ انکی تحریر کا نمونہ یہ ہے[۵۲]:-

[۵۱] و [۵۲] ماخوذ از (دکن میں اُردو)

"بوج کے تحقیق بندہ آزمائی جاتی ہے۔ درمیان اس کے کہ بندگی کرے خدا کی

اور ثواب پاوے اور درمیان اس کے کہ گناہ کرے خدا کی اور عذاب کیا جاوے

اور آزمائش تعلق رکھتی ہے سات شرعی چیزوں کے کہ کرے اوسے وسات

خلاف شرع چیزوں کے کہ چھوڑ دیوے اسے۔ اس واسطے ضرور ہوا بیان کرنا

شرعی چیزوں کا و خلاف شرع چیزوں کا۔"

اس عبارت کو دیکھ کر اس پر غور کرنا چاہئے کہ شرف الملک باقر آگاہ کے ہم عصر ہیں۔ لیکن ان کی نثر آگاہ کی نثر سے زیادہ بے محاورہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ باقر آگاہ کی اپنی اصلی عبارت ہے۔ اس لئے اس زمانہ کے محاورہ و روزمرہ کے مطابق ہے۔ لیکن شرف الملک کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ لفظی ترجمہ کا رواج اس کے بعد تک ہندو دکن دونوں میں رہا ہے۔

۳۔ قاضی بدر الدولہ خلف شرف الملک، ۱۷۹۳ء ۱۲۰۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۳ء ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا۔ دربار ارکاٹ میں قاضی تھے۔ کئی درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں ۱۳ کتابیں اردو کی ہیں۔ فقہ شافعی۔ سیرت نبی کریمؐ۔ سیرت صدیق اکبرؓ۔ سیرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ ترجمہ و حواشی حدیث، تفسیر قرآن مجید وغیرہ بڑی ضخیم اور قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔

فوائد بدریہ (سیرت النبیؐ) کے دیباچہ کا اقتباس یہ ہے:۔

" دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہو گیا ہے اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے۔ اب

کوئی کتاب زبان عربی یا فارسی میں تصنیف کئے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں جن کو

ان زبانوں کی معرفت حاصل ہے ان کے لئے بہت سے کتب موجود ہیں اور کسی کو

خواہشمند بھی نہیں پایا۔ تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا تا عوام مومنوں کو

اس سے فائدہ حاصل ہووے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے احوال سے

واقف ہو کہ ان کی پیروی خوبی کے ساتھ کریں۔"

۵؎ از دکن میں اردو۔

فیض الکریم (تفسیر قرآن مجید) کا نمونہ یہ ہے :-

"واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسّی سب مل کر۔ اللہ کی رسّی سے مراد اللہ کا دین ہے۔ یعنی دین اسلام اختیار کرو۔ اس کو رسّی سے تعبیر کیا کیونکہ باریک تنگ راہ میں گزرنا چاہے اور پیر پھسلنے کا اندیشہ ہووے تو رسّی جس کی دونوں طرف راہ کے دو جانب سے باندھے ہوں پکڑے تو اس کو خوف نہیں۔ سو حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگوں کے پیر اس پر لغزش پاتے ہیں جس نے دین اسلام مضبوط پکڑا تو بڑے خوف سے نجات پایا۔"

دہلی کے علمائے کرام شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ و تفسیر قرآن بدر الدولہ کی فیض الکریم سے پہلے کے ہیں۔ (ان کے نمونے آگے آتے ہیں)۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں کہ ان کی عبارتیں فیض الکریم کی عبارت سے زیادہ خلاف محاورہ و قدامت آمیز ہیں۔

اس زمانے میں اور اس کے بعد دکن کا اردو لٹریچر دہلی و شمالی ہند کے مقابلے میں زیادہ ممتاز نہیں ہے۔

نثر کا دوسرا دَور

شمالی ہند میں: ۱۷۳۲ء ۱۱۴۵ھ تا ۱۷۹۹ء ۱۲۱۵ھ

شمالی ہند یعنی دہلی اور موجودہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں تصانیف نثر کا اصلی اور مستقل دَور محمد شاہ بادشاہ دہلی (زمانۂ حکومت ۱۷۱۹ء ۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء ۱۱۶۱ھ) کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ سے قبل جو رفتار تھی اس کا خاکہ پہلے دکھایا جا چکا ہے۔ اس دوسرے دَور کی رفتار یہ تھی :-

فضل علی فضلی | فضلی تخلص کے ایک شخص کی اردو تصنیف دہ مجلس یا کربل کتھا (کربلا کی کہانی) کا نام اور پتہ ملتا ہے۔ جو ملّا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب (روضۃ الشہدا) کا ترجمہ ہے۔ لیکن فضلی کا نہ صحیح نام دریافت ہوتا ہے نہ پوری کتاب ملتی ہے۔

تذکرہ نویسوں نے اس کے نام و حالات میں بڑا اختلاف کیا ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے نے اپنی بے نظیر تالیف (نمونہ منثورات) میں (جو اپنی قسم کی اردو میں پہلی کتاب ہے) فضلی کے متعلق تحقیقات کا خلاصہ اور نتیجہ بیان کر دیا ہے۔[۵]

فضل علی فضلی محمد شاہی عہد میں تھا۔ اس نے یہ کتاب ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۱ء میں لکھی اور پھر ۱۱۶۰ھ ۱۷۴۷ء میں اس کی اصلاح و نظر ثانی کی۔ اس کتاب کا صرف دیباچہ تذکرہ شعرائے ہند (مولفہ و مترجمہ مسٹر فیلن و مولوی کریم الدین) میں منقول ہے۔ اور کافی طویل اور نہایت دلچسپ ہے۔ مختلف مقامات سے اس کا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

"لیکن معنی اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پُرسوز و گداز اس کتاب مذکورہ کے بسبب لغات فارسی ان کو نہ رُلاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خوانی سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھاوے اور ہم سی بے سمجھوں کو سمجھا کر رُلاوے۔ مجھ احقر الفقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینی عبارات اور حسن استعارات ہندی قریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجئے تو بموجب اس کلام بانظام کے مَنْ بکیٰ علی الحُسینِ اَوْ تبا کا وَجَبَتْ لَهُ الجَنَّة بڑا ثواب لیجئے۔۔۔۔۔۔۔"

"لہذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع۔ اور اب تک ترجمہ فارسی بزبان ہندی نثر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا، اور بیان

---

[۵] ہم کو مولانا سے یہ اختلاف ہے کہ جب مسٹر فیلن یا مولوی کریم الدین اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کو تمام میں نے دیکھا وہ میرے پاس موجود تھی" اور انھوں نے فضل علی نام لکھا ہے تو مولانا نے فضل اللہ نام کو کیوں ترجیح دی۔ دوسرے یہ کہ جب اس فضلی کا شیعہ ہونا ظاہر ہے تو مولانا نے اس کو حنفی و نقشبندی کیوں تسلیم کر لیا۔ تذکرہ محبوب الزمن میں جن بزرگ شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی حنفی نقشبندی کا ذکر ہے وہ یقیناً یہ فضلی نہیں، کوئی اور ہیں۔

تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی
گلشن انکار پُر اہتزار میں آ، یہ بات آئینہ خاطر میں منھ دکھلائی کہ یہ فکر عظم بغیر امداد
ارواحِ مقدس حسنین علیہما السلام حسب خواہش محبوں کے سرانجام نہ پاوے۔ ۔ "

یہ رسالہ مسعود دادیر بارہ مجلس اور ایک خاتمہ کے ہے۔ اس کی تصنیف کی تاریخ یوں لکھی ہے:-

یہ جو نسخہ ہوا ہے اب تصنیف | بہر کسب ثواب و فیض بشر
چاہا تاریخ اسکی بولے سروش | شیعوں کی نجات کا مظہر
۱۱۴۵

اور اب نظر ثانی کر، کیت وکیفیت مضامین ہندی اصطلاحات و استعارات
رنگین اصلاح دیا۔ اس تاریخ نے صفحہ دل پر جلوہ دیا۔

"ہر کس از من کند بہ نیکی یاد" | بجہاں نامش ہم بہ نیکی یاد

اس دیباچہ کی تمام عبارت میں صرف دو فقرے قابلِ غور ہیں۔ ایک فقرہ اوپر منقول وخط کشیدہ ہے۔ دوسرا فقرہ جو نقل نہیں کیا گیا یہ ہے:- تب آپ زبان اعجاز بیان سے فرمائے۔ یہ دونوں محاورے خاص دکن کے ہیں اور اس زمانے سے دوسو برس بعد آج بھی دکن میں اسی طرح بولتے ہیں۔ دہلی و شمالی ہند میں یہ انداز بیان نہ جب تھا نہ اب ہے۔ یہ محاورے خصوصاً دوسرا محاورہ (آپ فرمائے) اس طرح کا ہے کہ جس کی بول چال میں شامل ہو اس سے چھوٹ نہیں سکتا جیسا کہ حیدرآباد وغیرہ مقامات دکن کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی آج تک بولتے ہیں اور جس شخص کا یہ روزمرہ نہو اس کی زبان وقلم سے کبھی نہ نکلے گا۔ اس سے قریب زمانہ کے مصنفین دہلی حضرتِ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی نثر میں یہ انداز بیان نہیں پایا جاتا اور دکن کی تصانیف میں اس کے بہت بعد تک موجود ہے۔ دکن میں مولوی قادر علی[۵] نے ایک کتاب (مصباح الصلوٰۃ) کے نام سے ۱۸۱۷ء ۱۲۳۲ھ میں ترجمہ کی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:-

"صاحب مفتاح الصلوٰۃ معتبر کتابوں سے لکھا ہے جو شخص کہ فرائض اور واجبات

---

۵ دکن میں اُردو۔

نماز کی نہیں جانتا ہے۔ نماز اس کی روا نہیں۔ شیخ ابو حفص کبیر فرماے کافر ہوے۔ نعوذ باللہ منہا

اس بنا پر فضلی کا دکنی الاصل ہونا لازم ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ فضلی دکن میں نہیں رہے۔ شمالی ہند میں رہ کر انھوں نے علم حاصل کیا۔ انشا پردازی سیکھی اور تصنیف و تالیف کی۔ ان کے دیباچہ کی تمام نثر میں اور کہیں دکنی الفاظ۔ روزمرہ اور اسلوب بیان نہیں پایا جاتا جبکہ دکن میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک الفاظ و زبان کی قدامت موجود ہے۔ چنانچہ محمد شفیع عثمان مبین کی کتاب (لازم الاسلام) مرتبہ ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء کا ایک فقرہ یہ ہے :۔

"پس جان تو پیدا کرنے ہار اسب عالم کا شاید کوئی دوسرا ہے۔"

اور اسی زمانہ کے مصنف مولانا غوثی اپنی تفسیر غوثی میں لکھتے ہیں :۔

"اور بعضے کافراں بولتے ہیں کہ حشر برحق ہے کہ ہمارے بتاں حشر کے روز ہم کو چھوڑائیں گے۔"

اس کے علاوہ فضلی کے دکن میں نہ رہنے کے متعلق مولانا احسن مارہروی کا یہ استدلال بھی بالکل درست ہے کہ فضلی نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔ (لہذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع، اور اب تک ترجمۂ فارسی بزبان ہندی نثر نہیں ہوا مستمع) حالانکہ دکن میں فضلی کے زمانہ میں اور اس سے پہلے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں) فضلی دکن میں ہوتے تو ان ترجموں کا ان کو ضرور علم ہوتا اور ایسا نہ لکھتے۔

فضلی کی "کربل کتھا" کا ایک قلمی نسخہ مفتیان گوپامئو کے قدیم کتب خانے میں تھا۔ کتاب نقل در نقل تھی اور نا تمام تھی۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس نے کب کہاں سے نقل کی۔ اگرچہ کسی بے نام و نشان نقل پر اعتماد کرنا تصنیف و تحقیق کی ذمہ داری کے خلاف ہے لیکن اسقدر محقق ہے کہ یہ کتاب واعظ کاشفی ہی کی "روضۃ الشہدا" کا اردو ترجمہ ہے اور اسکا کوئی دوسرا قدیم اردو ترجمہ بجز "کربل کتھا" کے معلوم و مشہور نہیں۔ اس لئے ہم اس امر میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کہ اس نسخے کو فضلی کی کربل کتھا مان لیں اور اس کا اقتباس داستان تاریخ اردو میں شامل کر دیں۔ اس کتاب کا کوئی ٹکڑا بجز دیباچہ کتاب

۱؎ دکن میں اردو۔

کے، کسی تاریخ و تذکرہ میں نہیں ملتا تو کم از کم یہی فائدہ ہوگا کہ اگر آئندہ کبھی فضلی کی کتاب دستیاب ہو جائے تو اس انتخاب سے مقابلہ کر کے فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اس اقتباس کی عبارت، زبان، اسلوب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اسکو فضلی کا ترجمہ سمجھنے سے مانع ہو۔ نمونہ یہ ہے :-

"جو کہ حضرت امام حسن نے از بسکہ بیوفائی کوفیوں کی دیکھی، بہت ناراض و ناخوش ہوئے۔ لاچار حاکم شام سے صلح کی، اور کئی آدمی ساتھ لیکر مدینہ میں جا رہے پھر بعد مدت کئی برس کے حاکم شام نے از راہ دشمنی کے مصلحت کی کہ حضرت امام حسن کو قتل کیا چاہیے تو یہ مطلب حاصل ہو۔ چنانچہ کچھ آدمی بصرہ میں حضرت امام حسن کے رہتے تھے۔ از بسکہ آدمیوں کو شب خون مارا، اور جو باقی رہے سب بھاگ کر حضرت امام حسن پاس آئے۔ تب حضرت امام حسن عبداللہ بن فضل کو ساتھ لیکر حاکم شام پاس پھر آئے۔ جو کہ باتیں کہنا تھیں شام کے حاکم سے کہہ سُن کر پھر مدینہ کو آتے ــــ راہ میں ایک شہر تھا موصل اس شہر کے حاکم کا نام تھا کہ اس سے اور حاکم شام سے برادری تھی کہ حضرت امام حسن اسکے گھر اترے۔ پہلے اترنے سے سے حضرت کے۔ حاکم شام نے موصل کو بہت سا روپیہ اور مال زر بہت سے بھیجا تھا اور شیشا زہر ہلاہل کا اس قاتل کے پاس بھیج دیا تھا کہ وقت فرصت کے حضرت امام حسن کو یہ زہر کھلا دینا کہ اس بدبخت نے لالچ سے روپے کے ظاہر میں حضرت کی بہت سی خدمت کی اور باطن میں تین دفعہ اس زہر کو کھانے میں حضرت کے دیا۔ تینوں بار حضرت اس بیماری زہر سے بچ گئے۔ تب اس لعین نے شام کے حاکم کو خط لکھا کہ ہم نے تین بار زہر دیا۔ لیکن حضرت امام حسن کو کچھ اثر نہ کیا۔ تب اس نے پھر زہر ہلاہل بھیجا اور لکھا ایکے حضرت امام حسن کو کھلاؤ۔ قاصد حاکم شام کا شیشا اور خط لے کر چلا اور کسی شخص نے جنگل میں اس قاصد کو مار ڈالا کہ ایک نوکروں سے حضرت امام حسن کے اسی جاگہ آ پہنچا۔ یہ حال دیکھ کر خط اور شیشا زہر ہلاہل کا جناب امام حسن کے پاس لے آیا۔ آپ نے خط کو پڑھ کر نیچے جانماز کے رکھ لیا اور

کسی سے کچھ کہا نہیں۔ سعد موصلی کہ جچا مختار دوست حیدر کرار کے تھے۔ آہستہ ہاتھ بڑھا کر جانماز کے تلے سے خط کو لے کر پڑھا اور کانپے دو قدم جناب امام حسن کا چوما۔ اور عرض کیا اے فرزند رسولؐ واے نور چشم مظلوم بتولؑ ہم کو حکم دو اس بے ایمان کے کہ جس کے گھر میں آپ اُترے ہیں اس سے احوال کہیں۔ حضرت امام نے فرمایا کہ ہمارا کام نہیں ہے کہ کسی کو بے حرمت کریں اور نہیں چاہتے ہیں کہ ہماری طرف سے اس کو شرمندگی حاصل ہووے۔ حکم خدا کا جو کہ جاری ہوا ہے وہ ہوگا۔ سعد موصلی نے بغیر حکم حضرت امام کے اس کو بلا کر کہا کہ اے ملعون تیرے حق میں حضرت پیغمبرؐ نے کیا ظلم کیا ہے۔ جواب دیا کہ کچھ ظلم نہ پونہچا ہے۔ پھر پوچھا کہ حضرت امیرالمومنین نے تجھ پر کچھ ظلم کیا ہے؟ کہا کہ خدا کی قسم ہے مدت تک حضرت علی کے نوکر رہے تھے۔ ہم پر ہمیشہ شفقت اور کرم کرتے تھے۔ تب سعد موصلی نے کہا کہ پس کس واسطے فرزندوں کے ساتھ مرتضیٰ علی کے دشمنی کرتے ہو۔ خط اور شیشا آگے اسکے رکھدیا اور کہا لعنت خدا کی تجھ پر ہو! اس نے انکار کیا کہ ہم کو اس خط و زہر سے کچھ خبر نہیں ہے۔ سعد موصلی نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خوب سا اسکو مارو۔ چنانچہ اسی وقت مرگیا۔"

یہ عبارت "کربل کتھا" کی مجلس چہارم سے لی گئی ہے۔

مرزا رفیع سودا دہلوی | مرزا سودا دہلوی ۱۷۱۳ء ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۸۱ء ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اُردو میں لکھا ہے۔ پیچدار مقفیٰ عبارت ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

انسان کہ جس فن سے آپ کو کمالیت ظاہر نہ کرے، چاہئے کہ اس میں اپنی حد سے سخن باہر نہ کرے۔ گفتگو سے جاہل پہلوے عالم، مورد انفعال۔ بلکہ خموشی ہے اسکی برابر صد فضل و کمال ؎

بات گر آوے تو چپ رہ کہ گماں کے نزدیک — سو طرح کا ہے سخن پردہ خاموشی میں

اگر ناآگاہ جس فن کا، آگاہ سے اس فن کے، بولی بولے۔ گویا ہر دو لب اسکے

دروازۂ رسوائی کے پاٹ ہیں کہ عمداً اپنے مُنھ پر کھولے۔ بیت

طرفہ میوہ ہے یہ سخن اے دوست　　　　مغز شیریں و تلخ جس کا پوست

مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہرِ سخنِ عاصی زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے۔ اس مدت میں مشکل گوئی دقیقہ سنجی کا نام رہا ہے اور سدا مرغ معنی عرش آشیاں گرفتار دام رہا ہے۔

قافیہ پیمائی اس زمانے کا عام انداز تھا۔ سودا کی خصوصیت نہیں، سو برس بعد تک مقفیٰ نثریں لکھی گئی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے سلیس و بامحاورہ مصنفین (میرامن وغیرہ) نے بھی قافیہ آرائی کی ہے، اور لکھنؤ کے اہل تصنیف (مرزا سرور وغیرہ) نے بھی۔ یہاں تک کہ مرزا غالب دہلوی نے اپنے رُقعات کی سہل ممتنع نثر میں بھی جا بجا قافیہ آرائی کی ہے اور منشی امیر مینائی نے اپنی تصنیف انتخاب یادگار (مصنفہ ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء) بھی اسی طرز میں لکھی ہے۔ اس کے برخلاف دکن کی تصانیف میں اس زمانہ میں اور اس سے پہلے اور بعد مقفیٰ نثریں شاذ و نادر ہیں۔ طرز نگارش کے اس اختلاف کا سبب اصل میں کتابوں کے مضامین و مقاصد کی نوعیت ہے۔ دکن میں سب رس اور طوطی نامہ وغیرہ چند داستانوں کے علاوہ سب کتابیں فقہ، سیرت، تفسیر، اخلاق، تصوف پر لکھی گئی ہیں۔ علوم و فنون کے بیان میں قافیہ پیمائی اور خیال آرائی کا کیا موقع تھا۔ وجہی کی ضخیم داستان سب رس تمام و کمال مقفیٰ ہے۔ فقہ و تصوف کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے۔ یہی طرح شمالی ہند میں بھی تفریح طبع کی کتابیں مقفیٰ لکھی گئی ہیں۔ علوم و فنون کی تصانیف سادہ ہیں۔

مولانا شاہ رفیع الدینؒ (ترجمہ قرآن) سودا کے دیباچہ تک شمالی ہند کی کوئی مستقل و مکمل تصنیفِ نثر معلوم و متعارف نہیں ہے۔ اس حساب سے سب سے پہلی نثر کی کتاب مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اُردو ترجمۂ قرآن ہے۔ شاہ صاحب حضرت ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ ان سے بڑے شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور ان سے چھوٹے دو بھائی تھے۔ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

شاہ ولی اللہ صاحب ان خاص الخاص علماء میں تھے جو صدیوں بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں احکام و اعمال شریعت کے جو اسرار و مواقف بیان کئے ہیں وہ دنیائے اسلام میں ان سے پہلے کسی نے نہیں بیان کئے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا مرتبہ امام رازی اور امام غزالی سے بڑھا ہوا ہے۔ شاہ صاحب کے سب صاحبزادے خصوصاً پہلے تین صاحبزادے بھی ایسے ہی عالم فاضل اور ولی کامل تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے علاوہ اور تصانیف کے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۷ء میں کیا تھا۔ ان کے دوسرے صاحبزادہ شاہ رفیع الدین صاحب نے اردو کا ترجمہ ۱۲۰۰ھ ۱۷۸۶ء کے قریب مرتب کیا۔ ترجمہ اس قدر لفظی اور بے محاورہ اور دشوار فہم ہے کہ ہمارے زمانے میں کیا، اس زمانے میں بھی بول چال کی زبان ایسی نہ تھی لیکن اصل یہ ہے کہ عربی زبان کی وسعت و بلاغت اور قرآن مجید کی معجز نما عبارت ترجمہ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور شاہ صاحب جیسے محتاط بزرگ کو آیت آیت اور لفظ لفظ پر یہ خیال تھا کہ ہماری طرف سے کوئی ایسی کمی و بیشی نہ ہو جائے جس سے مطلب کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس لئے انکے نزدیک بہترین صورت یہ تھی کہ ہر لفظ اور ہر حرف کا ترجمہ عربی کی ترتیب کے مطابق اسی موقع پر لکھ دیا جائے۔ خواہ اردو عبارت محاورہ کے خلاف ہو جائے۔ ہم دو مقام سے مختصر نمونے درج کرتے ہیں:۔

"اے رب ہمارے مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے۔ اے رب ہمارے اور مت رکھ اوپر ہمارے بوجھ جیسا رکھا تو نے اس کو اوپر ان لوگوں کے کہ پہلے ہم سے تھے۔ اے رب ہمارے اور مت اٹھوا ہم سے وہ چیز کہ نہیں طاقت واسطے ہمارے ساتھ اس کے۔ اور معاف کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم کو۔ تو ہے دوستدار ہمارا پس مدد دے ہم کو اوپر قوم کافروں کے۔" (سورہ بقرہ کی آخری آیت دعا)

"اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے بیان کرتے تھے اوپر تمہارے نشانیاں میری اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمہارے

کی سے۔ کہا انھوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے اور فریب دیا ان کو
زندگانی دنیا نے۔ اور گواہی دی انھوں نے اوپر جانوں اپنی کے یہ کہ وہ تھے کافر"
(پارہ ۸ ولو اننا سورہ انعام رکوع ۱۶)

شاہ عبدالقادر صاحب ترجمۂ قرآن اسی زمانہ میں دو تین سال بعد ۱۷۹۰ء ۱۲۰۵ھ میں شاہ عبدالقادر صاحب نے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی سلیس و بامحاورہ نہیں ہے۔
تاہم شاہ صاحب نے لفظ لفظ اور حرف حرف کا ترجمہ کرنے کے مقابلے میں ادائے مفہوم اور وضاحت مطلب کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس لئے ان کا ترجمہ پہلے ترجمہ کی نسبت مختصر اور صاف ہو گیا ہے۔ اسی لئے نہایت مقبول ہوا اور کثرت سے چھاپا اور پڑھا گیا۔
ہم ان کے ترجمہ میں سے بھی سورۂ انعام کی انہی آیتوں کا ترجمہ درج کرتے ہیں:-

"اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمہارے اندر کے،
سناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے
اپنے گناہ۔ اور ان کو بہکایا دنیا کی زندگانی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ
وہ تھے منکر"

یہ ترجمہ پہلے ترجمہ سے بقدر ایک سطر کے مختصر ہے اور زیادہ صاف و سلیس ہے لیکن دونوں ترجموں کے الفاظ خط کشیدہ ہیں۔ پہلا ترجمہ دوسرے سے زیادہ صاف ہے حالانکہ عربی الفاظ کا لفظی ترجمہ ہے۔ نہیں پہنچے تھے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ آئے تھے بالکل صاف تھا۔ منکم کا ترجمہ (تمہارے اندر کے) اس قدر واضح نہیں ہے جتنا (تم میں سے) لیکن اس سے آگے پہلے ترجمہ میں (ملاقات اس دن تمہارے کی سے) بالکل لفظی ترجمہ ہے اور بول چال کے خلاف۔ اس کے مقابلہ میں شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ (اس دن کے سامنے آنے سے) ایسا صحیح، بامحاورہ اور خوبصورت ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب بھی اس سے بہتر اسلوب پیدا نہ کر سکے۔ صرف (دن) کی جگہ (روز) اور (سامنے) کی جگہ (پیش) رکھدیا، یعنی (اس روز کے پیش آنے سے)۔
شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے ترجمہ پر تفسیری حاشیے بھی لکھے اور اس کا نام

موضح القرآن رکھا۔ یہ ان کی اپنی عبارت ہے۔ اگرچہ الفاظ کی بے ترتیبی اس میں بھی ہے جیسا کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے دیباچہ کی عبارت سے ثابت کیا ہے۔ مثلاً ان فقروں میں:۔

"الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان کو گویا کی اپنے نام کو اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کو۔"

لیکن اکثر جگہ اس سے زیادہ صاف بھی ہے۔ مثلاً پارہ ۲۴ سورہ حٰم سجدہ کے دوسرے رکوع کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

"دو دن میں زمین بنائی اور دو دن میں پہاڑ اور درخت سبزہ جو خلق کی خوراک ہے۔ پھر آسمان سارا ایک تھا دھواں سا۔ اس کو بانٹ کر سات کئے، اور ہر ایک کا کارخانہ جدا ٹھہرایا۔ پھر آسمان زمین کو بلایا۔ خوشی سے آؤ یا زور سے، یعنی ارادہ کیا کہ ان دونوں کے ملاپ سے دنیا بسا دے۔ اپنی طبیعت سے ملیں تو، اور زور سے ملیں تو، وہ دونوں آ ملے طبیعت سے۔ آسمان کی شعاع سے گرمی پڑے تو بادیں اٹھیں، ان سے گرد اور بھاپ اوپر چڑھے، پانی ہو کر برسے، چار عنصر زمین پر جمع ہوں، مخلوقات پیدا ہوں۔ اور پہلے زمین میں رکھیں تھیں خوبیاں یعنی اس میں قابلیت تھی ان چیزوں کے نکلنے کی۔ اور ہر آسمان کا حکم جدا۔ یہ رب کو معلوم ہے کہ وہاں کون خلق بستے ہیں ان کا کیا اسلوب ہے۔ اتنی زمین میں ہزاروں ہزار کارخانے ہیں، اس قدر آسمان کب خالی پڑے ہوں گے۔"

شاہ عبد القادر صاحب کا انتقال ۱۸۱۵ء ۱۲۳۰ھ میں ہوا۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ۱۸۱۸ء ۱۲۳۳ھ میں۔ اور شاہ عبد العزیز صاحب کا ۱۸۲۴ء ۱۲۳۹ھ میں، یعنی ترتیب ولادت کے برعکس۔

میر عطا حسین تحسین (نوطرز مرصع)

ان مقدس ترجموں کے بعد اس زمانہ کی مستقل تصنیف نوطرز مرصع ہے جس میں میر محمد عطا حسین خاں تحسین ساکن اٹاوہ نے قصہ چہار درویش کو رنگین و دقیق اردو میں لکھا ہے۔ مشہور ہے کہ چہار درویش کا قصہ حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی

خدمت میں سنانے کے لئے لکھا تھا۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ امیر صاحب کی فہرست تصانیف میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ میر تحسین محمد باقر خاں شوق کے بیٹے تھے۔ جنرل اسمتھ سالار فوج انگریزی کے میر منشی ہو کر ان کے ساتھ کلکتہ گئے۔ جب جنرل صاحب ولایت چلے گئے تو تحسین پٹنہ آ گئے اور پھر وہاں سے فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کے دربار سے متعلق ہو گئے۔ نو طرز مرصع کی تصنیف جنرل اسمتھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع کر دی تھی۔ لیکن شجاع الدولہ کے دربار میں آ کر ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۸ء میں ختم کی۔ تحسین خوشنویس بھی تھے اور مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے۔ اس لئے کتاب کے نام میں مرصع کا لفظ طرز عبارت کے علاوہ مصنف کے نام کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ تحسین نے فارسی میں بھی انشائے تحسین۔ تواریخ فارسی اور ضوابط انگریزی لکھی ہیں۔

نو طرز مرصع میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کی اتنی کثرت ہے کہ بعض فقرے دشوار فہم ہونے کے علاوہ مذاق سلیم کے لئے نہایت ثقیل و مکروہ ہیں۔ مثلاً یہ عبارت:۔

"بعد ایک لمحہ کے وہ ماہ شب چہاردہم رونق افزا حدیقۂ فردوس نما کے ہو کر اوپر مسند زربفت نقرئی کے جلوہ آرا ہوئی واہ جی واہ، جس وقت وہ قمر طلعت داخل باغچہ نمونہ جنت کی ہوئی عطر گلاب رخسارہ زلیخائے شب مہتاب کا تقویت بخش دماغ تماشائیوں کا ہو کے زینت آرا بزم کامرانی کا ہوا، یوسف عکس بیاض نگینہ ہائے الماس انجم کا اوپر خاتم مینا رنگ سبزہ زمین خلد آئین کے زیب افزا دیدۂ نورانی کا ہوا"۔

آخری دو فقرے فارسی کی مشہور تصنیف شبنم شاداب کو یاد دلاتے ہیں لیکن نو طرز مرصع تمام کی تمام ایسے ہی فقروں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ اس سے کچھ سہل اور بہتر طرز بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً

"بہ سبب ماندگی و کسل، عصا گیمن داران خواب کے اوپر قافلہ بیداری کے تاخت لائے، اور متاع گراں بہائے ہوشیاری کے لوٹ لے گئے۔ بعد ایک لمحہ کے آواز گریہ و زاری کی پیچ گوش پیر سرے کے مستمع ہوئی، آنکھ کھول کر کیا دیکھتا ہوں کہ تن تنہا

پلنگ پر لیٹا ہوں و صاحب خانہ سے مکان خالی ہے، آگے دالان کے ایک پردہ پڑا ہے"

بعض مقامات اس سے بھی صاف و سلیس ہیں مثلاً

"اور معتمدان ہمراہ کے تئیں بیچ خدمت گذاری اس نازنین کے تعین کر کے آپ واسطے تحقیقات مکان جراح کے حویلی سے باہر آیا، چنانچہ زبانی ایک شخص کے معلوم ہوا کہ عیسیٰ نامی جراح بکمال کسب طبابت و جراحی کے کہ اگر مردے کے تئیں چاہے تو عنایات و فضل الٰہی سے زندہ کرے۔ فلانے محلے میں رہتا ہے۔ فقیر اس گلبانگ بشارت افروز سے بسان گل کے شگفتہ و خنداں ہو کر پوچھتے پوچھتے اوپر دروازے جراح کے کہ مثال دل بیدار دوں کے کشادہ تھا جا پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ متبرک ذات خضر صفات بیچ دہلیز گھر کے رونق افروز ہے"

بہرحال ہر جگہ دو چار فقروں کے بعد چند عربی و فارسی ترکیبیں اور صنعتیں ضرور آجاتی ہیں۔

یوروپین مصنفین اردو

اہل یورپ کے اردو سیکھنے اور اس زبان میں تصنیف و تالیف کرنے کے حالات سے پہلے ان کے ہندوستان میں آنے اور حکومت کرنے کے اسباب و واقعات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

قدیم اہل یورپ اور ہندوستان یورپ اور ہندوستان کے درمیانی تجارتی تعلقات بہت قدیم زمانے سے قائم تھے۔ ۳۲۷ سال قبل مسیح سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن یہاں اپنی حکومت قائم نہ کرسکا۔ صرف کبھی کبھی تجارت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ تجارتی آمد و رفت بحر احمر کے راستے سے ہوتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے اسلام کا آغاز ہوا۔ اور مسلمانوں نے پہلی ہی صدی میں مصر کو فتح کر لیا۔ اس وقت سے بحر احمر کا راستہ یورپ والوں کے لئے بند ہوگیا۔ اور پندرہویں صدی عیسوی کے آخر تک اہل یورپ ہندوستان میں نہ آسکے۔ بلکہ اس عرصے میں مسلمانوں کے

ہندوستان پر حملے ہوتے رہے اور سلطنتیں قائم ہوتی رہیں۔

اہل یورپ کی آمد (پرتگالی) ۱۴۹۸ء ۹۰۴ھ میں اسپین کے ایک شخص کولمبس نے امریکہ کا ملک دریافت کیا، اور اسی سال جب دہلی میں سکندر لودی کی حکومت تھی، پرتگال کا ایک سیاح واسکوڈی گاما ایک نئے اور لمبے راستے سے ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ میں پہنچا۔ یہ شخص تمام افریقہ کا چکر لگاتا ہوا راس امید (کیپ گڈ ہوپ) کی طرف سے ہوکر موجودہ شہر میسور سے تقریباً ایک سو میل دور ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا۔

پرتگالیوں نے ہندوستان میں تجارتی حقوق حاصل کر لئے۔ سمندر کے ساحلوں پر قلعے بنائے اور چند سال میں ۱۵۱۵ء تک مشرقی ساحل کے تمام بندرگاہوں پر قبضہ کرلیا۔ لیکن ۱۵۶۵ء سے ان کی تجارت میں زوال شروع ہوا۔ یورپ میں ہالینڈ اور انگلستان ان لوگوں کے دشمن ہوگئے اور اہل پرتگال کی تجارت کو نقصان پہنچانے اور اپنی تجارت قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ۱۵۸۰ء میں اسپین نے پرتگال کو زیر کرکے اپنا ماتحت بنالیا۔ اس کے بعد تھوڑے عرصے میں بجز دو تین مقامات کے سب مقبوضات ہند اہل پرتگال کے ہاتھ سے نکل گئے۔

انگریز ہندوستان میں اسپین کا زور توڑنے کے لئے انگریزوں نے یورپ میں اسپین والوں سے جنگ چھیڑ دی۔ ۱۵۸۸ء میں جنگ عظیم برپا ہوئی جس میں اہل اسپین کو شکست اٹھانی پڑی۔ لڑائی سے نمٹ کر انگلستان کے تاجروں نے ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبیتھ سے ہندوستان میں تجارت کرنے کا فرمان حاصل کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کردی۔

اہل ہالینڈ ہندوستان میں لیکن یورپ میں انگلستان کا سب سے بڑا مدِ مقابل ہالینڈ تھا اس نے بھی ۱۶۰۲ء میں تجارتی کمپنی بنالی اور ڈچ قوم (ہالینڈ کے لوگ) نے بھی انگریزوں کے پہلو بہ پہلو تجارت کرنی شروع کردی۔ اس زمانے میں ہالینڈ والے یورپ کے سب ممالک کے مقابلے میں فن جہاز رانی و جہاز سازی میں بڑے ماہر تھے، اس لئے

انگریزوں کے لئے ان کا مغلوب کرنا آسان نہ تھا۔ ان لوگوں نے چند سال میں اکثر جزیروں سے اہل پرتگال کو نکال کر مصالحہ کی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ہالینڈ والوں کی زیادہ توجہ جزائر کے قبضہ کی جانب اور مصالحہ کی تجارت کی طرف رہی اور مشرقی حصوں میں اپنی نو آبادیاں قائم کرتے رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ان کے برخلاف انگریزوں نے ہندوستان کی طرف توجہ کی، اور اندرون ملک میں تجارت اور اقتدار پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۶۰۸ء میں کپتان ہاکنس بندرگاہ سورت میں آیا، اور شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہو کر سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کی۔ پھر ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو بادشاہ انگلستان کے سفیر کی حیثیت سے دربار جہانگیری میں حاضر ہوا اور تجارتی کوٹھی بنانے کی اجازت لے لی۔ سورت کے علاوہ ایک کوٹھی مچھلی پٹن (موسولی پٹم) میں مشرقی ساحل پر ۱۶۳۳ء میں قائم کی۔ پھر ۱۶۴۰ء میں مدراس آباد کر کے وہاں قلعہ سینٹ جارج تعمیر کیا۔ انگلستان کے بادشاہ چارلس اول کے پھانسی پانے کے بعد اس کے جانشین چارلس دوم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو نئے فرمان شاہی کے ذریعہ سے اجازت دیدی کہ کمپنی اپنا سکہ جاری کرکے۔ حفاظت کے لئے قلعے بنائے اور غیر عیسائی مذہب والوں سے حسب ضرورت جنگ و صلح جو چاہے کرے۔ ۱۶۶۱ء چارلس دوم کی شادی پرتگال کی شہزادی سے ہوئی اور اس کے جہیز میں بمبئی (جو اس وقت گاؤں یا قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا) انگلستان کو ملا۔ بادشاہ نے ۱۶۶۸ء میں بمبئی کمپنی کو دیدیا۔ اس عرصہ میں نئے فرمان شاہی کے ذریعہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشرقی ساحل پر بالاسور کی کوٹھی اور ہگلی کی نو آبادی قائم کر لی۔ پٹنہ، قاسم بازار اور روزیگا پٹم میں بھی تجارتی کوٹھیاں بنالیں۔

انگریزوں کے حکمرانی کے منصوبے شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں مغلیہ سلطنت کمزور ہو گئی اور مرہٹوں کا زور بڑھ گیا۔ اسی زمانے میں ۱۶۸۶ء میں جوشیا چائلڈ سورت کی کوٹھی کا پریسیڈنٹ مقرر ہو کر آیا۔ اس نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی

صوبجاتی شورش اور مرکزی سلطنت کی کمزوری کا اندازہ کرکے طے کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمپنی مغلوں اور مرہٹوں پر قابو پائے اور اپنی حکومت قائم کرے۔ چنانچہ جاب چارنک نے بنگال میں ہگلی کے قریب بغیر شاہی اجازت کے کوٹھی تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ بنگال کے صوبہ دار شائستہ خاں نے مزاحمت کی۔ انگریز لڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کو اس گستاخی کا علم ہوا۔ انھوں نے کمپنی پر حملہ کرنے کا فرمان صادر کردیا۔ چنانچہ شائستہ خاں نے انگریزوں سے وزیگاپٹم، مچھلی پٹن، قاسم بازار اور پٹنہ کی کوٹھیاں چھین لیں اور جوشیا چائلڈ کو بنگال سے نکال دیا وہ مدراس چلا گیا۔ اُدھر مغربی ساحل پر بھی جنگ شروع ہوگئی اور مغلیہ فوج نے بمبئی کا محاصرہ کرلیا۔ انگریزوں نے مغربی ساحل پر جس قدر مغلیہ جہاز تھے سب پر قبضہ کرلیا اور اس زمانے میں جو مسلمان حج کے لئے مکہ شریف جارہے تھے ان کو گرفتار کرنا شروع کردیا۔ یہ بڑا نازک معاملہ تھا۔ شہنشاہ حج اور حاجیوں کی خاطر سے مجبور ہوگئے اور صلح کرنے کی اجازت دیدی ۱۶۹۰ء میں کمپنی نے بادشاہ سے معافی مانگ لی اور تجارت کے لئے نیا فرمان حاصل کرلیا۔ اب جاب چارنک بھی مدراس سے ہگلی واپس آگیا اور وہاں ایک چھوٹی سی بستی بسالی جو بعد کو کلکتہ بن گئی۔

اہل یورپ کی تجارتی جنگ ہندوستان میں — یورپ میں فرانس اور ہالینڈ کے درمیان جنگ چھڑ گئی، اس کا اثر ان کی ہندوستانی تجارتی کمپنیوں پر بھی پڑا۔ اور ہندوستان میں ان میں لڑائی شروع ہوگئی۔ ۱۶۹۳ء میں اہل ہالینڈ نے فرانس والوں سے پانڈی چری کو چھین لیا لیکن یورپ میں صلح ہوجانے کے بعد پھر فرانسیسیوں کو دیدیا گیا۔ اس کے بعد پرتگال، ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس میں باہمی مقابلہ شروع ہوگیا۔ ہر ملک کی یہی کوشش تھی کہ ہندوستان کی تجارت کا تنہا مالک بن جائے۔ یہ مقابلہ سالہا سال جاری رہا۔ اور آخر انگریزوں کو کامیابی ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اہل پرتگال اگرچہ حکومت کرنے کی قابلیت رکھتے تھے لیکن انھوں نے یہ اصولی غلطی کی کہ حکومت کی بنیاد مذہبی تعصب پر رکھنی چاہی۔ ہندوستان کی سب سے دُکھتی رگ مذہب ہے۔

اس کی ٹھیس بھی ان کو برداشت نہیں ہوتی۔ چنانچہ اہل ہند پرتگالیوں کے دشمن ہوگئے اور وہ ساحل کے مقبوضات کے علاوہ نہ اندرون ملک میں تجارت کو وسعت دے سکے نہ حکومت میں حصہ لے سکے۔

ڈچ لوگ (اہل ہالینڈ) نہایت دلیر اور باہمت تھے لیکن ان کے پاس جنگی بیڑا انگریزوں کے مقابلے کا نہ تھا۔ اس سبب سے وہ بھی ہمت ہارنے پر مجبور ہوگئے۔ اب ہالینڈ والوں کا ہندوستان کے کسی حصے پر کوئی قبضہ نہیں ہے۔

فرنچ (اہل فرانس) کی ناکامی کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کو اپنی گورنمنٹ سے کچھ مدد نہ ملی۔ بلکہ حکومت کمپنی کی مخالفت کرتی رہی۔ آخر فرانس والے بھی بیٹھ رہے۔ اور میدان تجارت انگریزوں کے ہاتھ رہا۔

فرانس اور انگلستان کی جنگ حکومت ہند کے لئے

اہلِ فرانس نے جب اندازہ کرلیا کہ انگریزوں کے مقابلے میں ان کی تجارت کامیاب نہیں ہوسکتی تو انھوں نے تجارت کا خیال چھوڑ کر حکمرانی کی طرف توجہ کی۔ ۱۷۳۵ء میں ڈیوما فرانسیسی نوآبادیوں کا گورنر ہوکر آیا۔ اس نے دیکھا کہ ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں ہے اور جو برائے نام ہے وہ کافی طاقتور نہیں ہے۔ صوبے صوبے اور قوم قوم آپس میں برسر پرخاش ہیں۔ اور انگریزوں کی بڑی توجہ تجارت کی طرف ہے۔ ڈیوما نے تہیہ کرلیا کہ فرانسیسی حکومت قائم کردی جائے۔ ڈیوما کے بعد ۱۷۴۱ء میں ڈوپلے فرنچ گورنر ہوا۔ یہ شخص بڑا مدبر، باخبر، حوصلہ مند اور شجاع تھا۔ اس نے ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کے باہمی تنازع اور ملکی شورش میں حصہ لینا شروع کردیا۔

اتنے میں ۱۷۴۶ء میں فرانس وانگلستان کے درمیان یورپ میں جنگ شروع ہوگئی۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی یہ دونوں لڑنے لگے۔ اور وہاں کی صلح کے ساتھ یہاں بھی صلح ہوگئی۔ اس سے دس سال بعد ۱۷۵۶ء میں پھر یورپ میں یہ دونوں ملک باہم جنگ آزما ہوئے۔ پھر ہندوستان میں جنگ کے ساتھ جنگ اور صلح کے ساتھ صلح ہوئی۔ اب انگریز وفرانسیسی ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے تھے۔

ہندو اور مسلمان ریاستوں اور صوبہ داروں میں باہمی مخالفت اور جنگ و جدل جاری تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ان کی حمایت شروع کر دی۔ کسی کے طرفدار انگریز ہو گئے، کسی کے فرانسیسی۔ اور اس طرح حکومت حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے داؤں لگانے لگے۔ آخر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت نے اہل فرانس کو ہمیشہ کے لئے مایوس اور انگریزوں کو کامیاب بنا دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت بالکل لڑکھڑانے لگی۔ بارہ برس کے عرصہ میں تین بادشاہ تخت نشین اور معزول ہوئے، محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے عہد میں نادر شاہ (۱۷۳۹ء) اور احمد شاہ ابدالی (۱۷۴۷ء) کے حملے ہوئے۔ مرہٹے زور پکڑ گئے۔ اور پنجاب پر قابض ہو گئے۔ اودھ، بنگال، دکن کے صوبے آزاد ہو گئے۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس حالت سے فائدہ اٹھایا۔ کمپنی کی خوش قسمتی سے اس کا ایک معمولی کلرک کلائو (جو ۱۷۴۴ء میں ملازم ہو کر آیا تھا) غیر معمولی دل و دماغ کا آدمی نکلا۔ ۲۳ سال کے عرصہ میں وہ خود لارڈ اور گورنر اور سپہ سالار بن گیا اور کمپنی کو دہلی و شمالی ہند کا حکمراں بنا دیا۔ اگرچہ شاہانِ مغلیہ کی اولاد کٹ پتلی کی طرح تخت پر بیٹھتی رہی لیکن حکومت دراصل انگریزوں کی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے کا نعرہ ہی یہ ہو گیا تھا: "ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا"۔

کمپنی کا بڑھتا ہوا اقتدار دیکھ کر انگلینڈ کی حکومت نے کمپنی کی براہ راست نگرانی شروع کر دی۔ اور ۱۷۷۳ء میں اس کے متعلق قانون بنا دیا۔ جس کو ریگولیٹنگ ایکٹ کہتے ہیں۔ بنگال پایۂ تخت مقرر ہوا اور وہاں کا گورنر گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ پہلا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز تھا۔ اس کی مدد کے لئے ایک کونسل بنائی گئی۔ کلکتہ میں عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) قائم ہوئی۔ اور تمام انگریزی مقبوضات کا حاکمِ اعلیٰ گورنر جنرل ہو گیا۔ اور اس کے ماتحت تین پریسیڈنسیاں قائم ہو گئیں:-

(۱) بنگال پریسیڈنسی۔ بنگال پر انگریزوں کا اثر شروع ہی سے تھا۔ جنگ پلاسی

(۱۷۵۷ء) کے بعد تقریباً تمام بنگال انگریزوں کے زیر اثر آگیا تھا۔ کلکتہ کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم کی بنیاد اس سے پہلے پڑ گئی تھی، لیکن موجودہ قلعہ ۱۷۵۷ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا۔ اور ۱۷۷۳ء میں مکمل ہو گیا۔

(۲) مدراس پریسیڈنسی۔ مدراس کی آبادی بنگال سے بھی پہلے ۱۶۴۰ء میں شروع ہو گئی تھی۔ اور وہاں قلعہ کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد نواب کرناٹک اور نظام حیدرآباد کی ریاستوں کے کچھ اضلاع اس میں شامل کئے گئے۔ پھر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی سلطنت شامل ہو جانے سے یہ پریسیڈنسی بہت وسیع ہو گئی۔

(۳) بمبئی پریسیڈنسی۔ ۱۶۶۸ء میں بمبئی کمپنی کی ملکیت میں شامل ہو گیا تھا۔ گورنر جنرل ہیسٹنگز نے (۱۷۷۵ء تا ۱۷۸۴ء) اور گورنر جنرل ویلزلی نے (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء)، اور پھر ہیسٹنگز نے (دوبارہ ۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء) مرہٹوں سے چار مرتبہ جنگ کر کے اور شکست دیکر ان کا بہت سا ملک بمبئی کے احاطہ میں شامل کر لیا۔ پھر ۱۸۴۳ء میں سندھ اسی خطے میں شامل ہو گیا۔ اور بمبئی پریسیڈنسی میں موجودہ وسعت پیدا ہو گئی۔

انگریزوں کی شہنشاہی ہندوستان میں یورپ کی متعدد قومیں تجارت کرنے آئیں اور ان میں سے بعض بعض نے حکومت ہند کی باگ بھی ہاتھ میں لینی چاہی، لیکن کسی کو انگریزوں کے مقابلے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ انگریزوں کی حکومت انگلستان اور تمام قوم انگریزی کمپنی کی طرفدار، مددگار، مشیر کار اور نگراں تھی۔ یہ بات پرتگال اور ہالینڈ والوں کو کیا فرانس والوں کو بھی نصیب نہ تھی۔ سلطنت برطانیہ حسب موقع روپیہ کی امداد بھی دیتی رہی، اور قابل سے قابل حکمرانوں کو بھی بھیجتی رہی، اور نئے نئے فرمان بھی جاری کرتی رہی۔ اس طرح ہندوستان اگرچہ بظاہر کمپنی کے زیر اثر تھا، لیکن حقیقت میں اس کی مالک و مختار خود برٹش گورنمنٹ تھی۔ اسی لئے ۱۸۵۷ء کے غدر عظیم کے بعد انگلستان کو حکومت ہند کی باگ کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے الہ آباد کے دربار میں ہندوستان پر برطانیہ کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ یہ کمپنی کا

آخری گورنر جنرل وائسرائے (نائب شاہی) بنادیا۔ اور اب دونوں عہدے ایک ذات میں جمع ہوگئے۔

گورنمنٹ کی طرف سے اشاعت تعلیم | ۱۸۱۳ء ۱۲۲۸ھ سب سے پہلی مرتبہ گورنمنٹ نے ایک لاکھ روپیہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے منظور کیا۔ ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہیر نے راجہ رام موہن رائے کی مدد سے کلکتہ ہندو کالج قائم کیا۔ اسی زمانے میں چند پادریوں نے سیرامپور میں میں ایک کالج کھولا۔

۱۸۱۸ء میں انہی پادریوں نے سماچار درپن کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔

۱۸۳۰ء میں الگزینڈر ڈف نے کلکتہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج کھولا۔ ان کالجوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ انگریزی علم و ادب اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن ابتک سرکاری طور پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا طے نہ ہوا تھا۔

۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار دی گئی۔

۱۸۳۶ء میں سر چارلس مٹکاف (سابق گورنر صوبہ آگرہ) نے گورنر جنرل ہونے کے بعد پریس کو آزادی دیدی۔ یعنی اہلِ ہند بغیر لائسنس کے اخبارات جاری کرنے لگے۔ اور نامہ نگاروں کو آزادانہ واقعات نگاری و رائے زنی کا اختیار مل گیا۔

۱۸۵۴ء ۱۲۷۰ھ میں سر چارلس وڈ نے ولایت سے ہندوستان اپنی تعلیمی رپورٹ بھیجی۔ جس میں حکومت ہند کو مشورہ دیا تھا کہ تمام رعایا کے لئے تعلیم کو عام کردینا چاہیے۔ چنانچہ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے محکمہ تعلیم قائم کردیا اور دیہاتی مدرسے جاری کردیے۔

۱۸۶۱ء میں اعلیٰ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے کلکتہ بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔

۱۸۷۷ء میں سر سید احمد خاں نے علیگڈھ میں محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج قائم کیا۔ اور وائسرائے لارڈ لٹن نے خود اس کی رسم افتتاح ادا کی۔

۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔

۱۸۸۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی کا افتتاح ہوا۔

۱۹۰۴ء ۱۳۲۲ھ میں لارڈ کرزن نے یونیورسٹیز ایکٹ کے نام سے اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کے

نے ایک قانون پاس کیا۔ اس کے ذریعہ سے نظام تعلیم میں حکومت کا عنصر بڑھایا گیا۔ اسی بنا پر اہلِ ہند نے اس قانون کی مخالفت کی۔

اس کے بعد بنارس، علی گڈھ، لکھنو، دہلی، آگرہ، ڈھاکہ، پٹنہ، ناگپور، رنگون وغیرہ مقامات پر الگ الگ یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں۔ ابتدائی و درمیانی تعلیم کے لئے محکمے قائم ہوئے مکاتب و مدارس جاری ہوئے۔ ذات پات کا فرق مٹ کر تعلیم سب کے لئے عام ہوگئی۔

اہلِ یورپ اور اُردو اس تاریخ کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں یورپ کی جو جو قومیں آئیں ان کے رسوخ و اثر کا اندازہ ذہن نشیں کرایا جائے۔ اور اردو سے ان کا تعلق بیان کیا جائے۔ خصوصاً انگریزوں اور انگریزی کا اثر اردو پر دکھایا جائے۔

(۱) پرتگال والے سب سے پہلے آئے، تجارت سے ترقی کر کے حکومت میں حصہ لیا ساحلوں پر قبضہ جمایا، تجارتی کوٹھیاں بنائیں، جائدادیں خریدیں، اپنا مذہب پھیلایا، ہندوستانیوں کو عیسائی بنایا۔ ان سب مشاغل اور مصروفیتوں کے لئے اہلِ ہند سے میل جول کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اہلِ پرتگال نے سواحل ہند کی زبانیں سیکھیں اور اپنی زبان سکھائی۔

(۲) اہل پرتگال بہت سی چیزیں اپنے ساتھ لائے جو ہندوستان میں نہ تھیں ان کے نام ہندوستان میں باقی رہ گئے۔ مثلاً الماری، بالٹی، پیپا۔ پستول، صابون، کارتوس، میز، تولیا وغیرہ۔

(۳) پرتگالیوں کا اثر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جنوبی ہند کی زبانوں پر پڑا۔ مرہٹی، بنگالی، اڑیا وغیرہ زبانوں میں صدہا پرتگالی لفظ مل گئے، اور پھر اندرون ملک میں پہنچکر اردو میں شامل ہوئے۔

(۴) اہل پرتگال کے بعد جب ہالینڈ، فرانس، اور انگلستان والے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ تمام بندرگاہوں اور ساحلی مقامات پر پرتگالی یا ہندوستانی یا ہندوستانی نما پرتگالی زبان پھیلی ہوئی ہے، اور اہلِ ہند سے میل جول کے لئے یہ زبان سیکھنا آسان اور مفید ہے، اس لئے ان لوگوں نے اسی زبان کو حاصل کیا۔

(۵) کپتان ہملٹن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہندوستان کے ساحلوں پر اہلِ پرتگال کی زبان کا اس قدر اثر موجود ہے کہ اہلِ یورپ باہمی گفتگو اور اہلِ ہند سے میل جول کے لئے یہی زبان حاصل کرتے ہیں۔ لاکیر اپنی کتاب (اشاعت ۱۷۱۱ء) میں ذکر کرتا ہے کہ اہلِ پرتگال کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی زبان نے سواحل ہند پر ایک مشترک زبان پیدا کر دی ہے جو تمام اہلِ یورپ کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔

(۶) ہالینڈ اور فرانس والے بھی ہندوستان میں آئے۔ تجارت و حکومت کی کوشش کرتے رہے۔ آخر ہالینڈ کو ہند میں رہنا اور اپنے مقبوضات قائم رکھنا نصیب نہ ہوا، ہندوستان سے جلد واپس جانا پڑا۔ اہلِ فرانس برسوں رہے۔ بعض مقامات پر قبضہ کیا اور ابتک قابض ہیں۔ لیکن ان دونوں قوموں کی زبانوں کا کوئی اثر ہندوستان میں نہ ہوا اور ان کی کوئی نمایاں یادگار باقی نہیں ہے۔ یورپ سے جو نئی چیزیں اور ان کے نام آئے اور رائج ہوئے وہ اکثر پرتگیز کے لائے ہوئے تھے۔ ہالینڈ اور فرانس سے کچھ اور نئی چیزیں نہیں آئیں جن کی یادگار باقی رہتی۔ صرف بعض الفاظ ہندوستان میں موجود ہیں۔

(۷) پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کا جو کچھ اثر اردو پر ہوا وہ صرف الفاظ کی شکل میں ہوا۔ اردو انشا پردازی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ خود ان لوگوں نے ہندوستانی زبانیں سیکھیں، اردو حاصل کی، اردو میں کتابیں لکھیں۔ اردو میں شاعری کی۔

(۸) خصوصاً اہلِ فرانس میں سے بعض بعض پرائیویٹ طور پر ہندوستان میں اقامت پذیر ہو گئے۔ مختلف شہروں میں جاگیریں لیں، مکانات بنائے، ہندوستانی لباس و معاشرت اختیار کی، چنانچہ آگرہ میں ایک فرانسیسی مسٹر مارٹن کی یادگار مکانات ابتک موجود ہیں۔ اور مارٹن محل کے نام سے مشہور ہیں۔ فرانسیسی اردو شاعروں کی یادگاریں بھی تذکروں میں باقی ہیں۔

(۹) انگریز پرتگالیوں سے سو برس بعد تجارت کرنے آئے۔ لیکن ایسا سودا کیا کہ ہندوستان ہی کو مول لے لیا۔ انگریزوں کو ہندوستان میں قدم رکھے تین سو برس سے

زیادہ ہوگئے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو دو سو برس کے قریب ہوئے (از عہد لارڈ کلایو)۔ اور انگریزوں کی شہنشاہی کو ایک صدی کے قریب گزر گئی۔ انگریز والوں نے اردو زبان کی رفتار ترقی اور قبول عام کو دیکھ کر اس کی طرف توجہ کی۔ ان سے پہلے ہالینڈ اور پرتگال والے اردو کی قواعد صرف و نحو پر کتابیں لکھ چکے تھے۔ انگریزوں نے بھی اٹھارہویں صدی میں اردو گرامر اور لغت کی متعدد کتابیں لکھیں، انیسویں صدی میں مشن کے پادریوں نے مذہبی کتابیں اردو زبان میں شائع کیں، اردو اخبار اور رسالے جاری کئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز ملازموں کے لئے اردو زبان کا سیکھنا اور پھر اس میں امتحان پاس کرنا لازم کر دیا۔ ۱۸۳۲ء میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ قانون کی کتابیں انگریزوں نے لکھیں، انگریزی حکام عدالت کی کارروائیاں اردو میں لکھنے لگے۔ کمپنی کے ملازموں کے لئے ہر قسم کا لٹریچر مہیا کیا گیا۔ مختلف زبانوں سے ترجمے کرائے گئے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ انگریز حکام نے درباروں میں اردو زبان میں تقریریں کیں۔ چنانچہ گارسن دتاسی[۵] کا بیان ہے کہ:۔

"۷ جنوری ۱۸۶۵ء کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے لاہور میں اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا۔ لفٹنٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں بلکہ ہندستانی (اردو) زبان میں حاضرین جلسہ کو مخاطب کیا۔"

"فروری کے مہینے میں لکھنؤ میں چیف کمشنر کے زیر صدارت ایک جلسہ ہوا جس میں

---

۵ گارسن دتاسی فرانسیسی عالم و مستشرق تھا۔ اس کو اردو زبان سے اس قدر عشق تھا کہ فرانس میں بیٹھا بیٹھا اردو زبان کی رفتار و ترقی کا مطالعہ کرتا تھا۔ اپنے دوستوں اور انگریز حکام کی معرفت اردو کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرتا تھا۔ اور ہر سال کے آخر میں اپنی یونیورسٹی میں اردو کی اس سال کی ترقی پر لکچر دیتا تھا جس میں اردو کی ادبیات، شاعری، مصنفین شعرا، اخبارات وغیرہ سب کا ذکر ہوتا تھا۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک ۱۹ لکچر دیئے۔ جن کا ترجمہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے ۸۰۰ صفحوں کی مجلد کتاب میں شائع کر دیا ہے۔ اسی سے یہ اقتباسات ماخوذ ہیں۔ ان لکچروں کے علاوہ گارسن دتاسی نے اردو زبان کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اردو کتابوں کے ترجمے کئے ہیں اور بعض اردو کتابوں کو اپنی ادارت میں شائع کیا ہے۔

اس نے اودھ کے تعلقہ داروں کے روبرو ہندوستانی میں طول طویل تقریر کی۔"

انگریزوں نے اُردو زبان میں شاعری کی۔ اور بعض صاحب دیوان ہوئے، مثلاً الگزنڈر ہیڈلے اور جارج پیش شور۔ پہلے کا تخلص آزاد تھا، دوسرے کا شور۔ اُردو کے بعض مشہور مصنفوں کو ان کی تصانیف کے صلے میں ڈاکٹر کی ڈگری (ایل ایل ڈی) دی، مثلاً سر سید احمد خاں اور مولوی نذیر احمد دہلوی کو۔ ملکہ وکٹوریا نے اُردو زبان سیکھی اور منشی عبدالکریم کو آگرہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن بلایا۔ اُردو لکھنے پڑھنے لگیں۔ ملکہ کے اُردو میں دستخط بھی شائع ہوئے۔

(۱۰) انگریزی زبان کا اُردو پر بھی اثر پڑا۔ صدہا انگریزی لفظ اُردو میں شامل ہو گئے، جن میں سے بعض کے تلفظ ہندوستانی لب ولہجہ کے مطابق کر لئے گئے، مثلاً لالٹین، بوتل، رپٹ، سنتری، جرنیل، لاٹ صاحب۔ انگریزی محاورے، انگریزی اسلوب بیان اُردو میں ڈھال لئے گئے، انگریزی کہاوتوں مثلوں کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا، انگریزی رموز اوقاف (کاما، علامت سوال وغیرہ) کو اُردو تحریروں میں استعمال کرنے لگے۔ اور ان میں سے علامت سوال کا رُخ اُردو تحریر کی مناسبت سے داہنی طرف کو پھیر دیا، یعنی انگریزی علامت (?) کو اُردو میں (؟) لکھنے لگے۔ اُردو تحریروں میں پیراگراف قائم ہونے لگے۔ اُردو زبان میں بچوں کے قاعدے اور ریڈریں انگریزی کے اصول پر لکھی گئیں۔ مغربی علوم وفنون کے اُردو میں ترجمے ہوئے۔ نئی نئی اصطلاحیں بنائی گئیں۔ اخبارات ورسائل جاری ہوئے۔ مقالات علمی وادبی، مختصر افسانے، ناول، ڈراما، تنقید، سیرت، تذکرہ، تاریخ، وغیرہ ہر قسم کی انشا پردازی انگریزی کے اصول پر اُردو میں شروع ہو گئی۔ اُردو شاعری پر بھی انگریزی کا بہت بڑا اثر ہوا۔ جدید شاعری کی ایک مستقل صنف اُردو میں پیدا ہو گئی، جو قدیم اُردو شاعری میں خال خال پائی جاتی تھی۔ انگریزی کی تقلید میں مختلف موضوعات، جذبات، مناظرِ قدرت، معارف و حقائق، اخلاق، سیاست وغیرہ کے متعلق نظمیں لکھی جانے لگیں، نظم کی ظاہری صورتوں میں اضافہ ہو گیا، یعنی قدیم مثلث، مخمس وغیرہ کے علاوہ قافیوں اور مصرعوں کی ترتیب

انگریزی کی اتباع میں اور دوسری شکلوں سے بھی ہونے لگی۔ غزل کی روش بدل گئی، بلند خیالی، مشکل پسندی، باریک بینی، متانت و شائستگی پہلے سے بڑھ گئی۔ لیکن انگریزی تعلیم، اور مغربی تہذیب و معاشرت کے اثر سے قصیدہ مفقود ہوگیا۔ مرثیہ متروک ہوگیا، مثنوی ختم ہوگئی۔

ان سب چیزوں کا تفصیلی ذکر تاریخ میں موقع و محل پر کیا جائے گا۔ اس وقت اُردو زبان پر انگریزی اور انگریزوں کے اثر کا خاکہ کھینچنا تھا۔

پہلا یوروپین مصنف جان جوشوا کیٹلر (ڈچ)

اہلِ یورپ میں پہلا شخص جس کی اُردو زبان کے متعلق کوئی کتاب اور کوئی تحریر ملتی ہے غالباً ہالینڈ کا رہنے والا (ڈچ) جان جوشوا کیٹلر ہے۔ یہ شخص ۱۷۱۱ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر مقرر ہوا اور تین سال سورت میں رہا۔ شاہ عالم بادشاہ (۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء تا ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) اور جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء) کے دربار میں بھی ڈچ سفیر کے طور پر حاضر ہوا۔ لاہور، دہلی، آگرہ کی سیر کی۔ اس زمانے میں آگرہ میں ڈچ تاجروں کا ایک کارخانہ سورت کے ماتحت تھا۔ اس شخص نے صرف و نحو ہندوستانی کے نام سے اُردو زبان کی گرامر غالباً ۱۷۱۵ء میں لکھی جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب لیٹن (لاطینی) زبان میں ہے۔ ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں ہیں۔ اس کتاب میں حضرت عیسیٰ کی مشہور دُعا کا اُردو ترجمہ بھی درج ہے۔ اس کو بطور نمونہ لکھا جاتا ہے:۔

> "ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے، پاک ہوئے تیرے نام، آوے ہم کوں ملک تیرا، ہووے راج تیرا جوں آسمان تو جمین (زمین) میں روٹی ہمارے نت کی، ہم کو آج دے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کوں، جوں معاف کرتے اپرے (اپنے) قرض داروں کو، نہ ڈال ہم کو اس وسوسے میں، بلکہ ہم کوں گھس کر اس بُرائی سے، تیری مسیحی سواری
>
> عالمگیری حمایت میں، آمین۔"

اس کے بعد مختلف اہلِ یورپ نے اُردو زبان کی کتب لُغات لکھیں، قواعد صرف و نحو پر کتابیں تالیف کیں، بائبل کے اُردو میں ترجمے کئے۔ ان میں سے چند کتابوں کا ذکر

کیا جاتا ہے:۔

(۱) پادری بنجمن شلز نے لیٹن زبان میں اردو کی قواعد لکھی جو ۱۷۴۴ء میں طبع ہوئی۔ اس میں اردو کے الفاظ فارسی خط میں لکھے ہیں۔

(۲) اسی شخص نے ۱۷۴۸ء میں بائبل کا اردو میں ترجمہ کیا۔

(۳) ل نے ۱۷۴۴ء میں ہندوستانی حروف تہجی پر ایک مختصر کتاب تصنیف کی۔

(۴) جی اے فرٹز نے ۱۷۴۸ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اردو کے حروف تہجی کا دیگر ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا۔

(۵) ملک اٹلی کے ایک پادری کیسا نو بیلی گاٹی نے ۱۷۶۱ء میں حروف تہجی پر ایک رسالہ الفابیٹم برہمانکم کے نام سے لکھا۔

(۶) ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں اردو کی گرامر (صرف و نحو) لکھی۔

(۷) پرتگالی زبان میں ایک اردو کی قواعد ۱۷۷۸ء میں گرمیٹیکا اندوستانا کے نام سے شائع ہوئی۔

(۸) ڈف نے قیام ہندوستان کے زمانے میں ایک ہندوستانی گرامر لکھی اور لندن میں شائع کی۔ یہ شخص ۱۷۸۵ء میں ہندوستان آیا۔ کلکتہ میں اس نے سنسکرت، بنگالی اور ہندوستانی (اردو) زبانیں سیکھیں۔ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کی رائے ہے کہ اس نے اردو قواعد میں بہت غلطیاں کی ہیں۔

(۹) ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۳ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی۔

(۱۰) ہندوستانی گرامر ۱۷۹۶ء۔

(۱۱) اورنٹل لنگوئسٹ (مشرقی زباندان) مطبوعہ ۱۷۹۸ء۔

یہ اٹھارویں صدی کی چند کتابیں ہیں۔ انیسویں صدی میں بے شمار اہل یورپ (جرمن، فرنچ، انگریزوں) نے علمی و ادبی و قانونی کتابیں اردو زبان میں اور اردو زبان کے متعلق دوسری زبانوں میں لکھیں۔ بعض کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ | اہلِ یورپ میں اُردو زبان پر سب سے بڑا احسان ڈاکٹر گلکرائسٹ کا ہے۔ انھوں نے ۱۷۸۳ء سے اُردو کی خدمت شروع کی اور بیس برس تک اُردو زبان میں اور اُردو کے متعلق انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر گلکرائسٹ مقرر ہوئے۔ یہاں ایک محکمہ اُردو کے ترجمہ و تالیف کا انھوں نے قائم کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اُردو کی کتابیں لغات، قواعد، تاریخ وغیرہ کے متعلق خود بھی لکھیں اور ہندوستان کے لائق اہلِ قلم مسلمانوں اور ہندوؤں کو جمع کر کے ان سے کتابیں اُردو میں ترجمہ و تالیف کرائیں۔ ان کی سرپرستی اور کوشش سے اس زمانے میں ایسا اُردو لٹریچر پیدا ہو گیا جو آج تک اُردو میں اپنی نوعیت کا بے نظیر اور یادگار ہے۔ میر امّن دہلوی، میر شیر علی افسوس دہلوی، میر بہادر علی حسینی، سیّد حیدر بخش حیدری، مرزا کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، للّو لال جی، بینی نرائن، مظہر علی خان ولا، مرزا علی لطف وغیرہ اہلِ فن اور اربابِ ادب نے ڈاکٹر گلکرائسٹ ہی کی سرپرستی میں کام کیا اور باغ و بہار، باغِ اُردو، آرائشِ محفل، طوطا کہانی، سنگھاسن بتیسی، گلشنِ ہند وغیرہ اُردو کی کتابیں جو اِن لوگوں نے لکھیں ڈاکٹر گلکرائسٹ ہی کی اُردو نوازی کا نتیجہ ہیں۔ (ان مصنفین و تصانیف کا تذکرہ آگے اپنے موقع پر آئے گا)۔

خود ڈاکٹر گلکرائسٹ کی تصانیف کی فہرست بھی کافی طویل اور نہایت وقیع و قابلِ قدر ہے۔ مثلاً

(۱) و (۲) و (۳) کا ذکر اوپر اٹھارویں صدی کی کتابوں میں ۹ و ۱۰ و ۱۱ پر آچکا ہے۔

(۴) مشرقی زباندان کا خلاصہ مع اضافۂ جدید مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۰ء۔

(۵) فارسی فعل کا نظریۂ جدید مع مترادفات ہندوستانی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۱ء۔

(۶) قصص مشرقی (انگریزی سے اُردو میں ترجمہ) مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۲ء۔

(۷) رہنمائے زبانِ اُردو مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۴ء۔

(۸) ہندی عربی کا آئینہ (عربی الفاظ کے نقشے جو اُردو زبان سے خاص تعلق رکھتے ہیں) مطبوعہ ۱۸۰۴ء۔

(۹) قواعدِ اُردو مطبوعہ ۱۸۰۹ء۔

(۱۰) اُردو رسالہ گلکرائسٹ مطبوعہ ۱۸۲۰ء۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی قواعدِ اُردو کا خلاصہ ہے۔

(۱۱) انگریزی ہندوستانی بول چال مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ ۱۸۰۴ء میں ہندوستان سے پنشن لے کر ولایت چلے گئے اور ایڈنبرا میں قیام کیا۔ پھر ۱۸۱۶ء میں لندن آگئے اور انڈین سول سروس کے امیدواروں کو پرائیویٹ طور پر مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۱۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۵ء میں یہ درسگاہ بند کردی گئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے طور پر لوگوں کو اُردو پڑھاتے رہے۔ ۱۸۴۱ء میں بمقام پیرس ڈاکٹر صاحب نے ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

گلکرائسٹ کی قواعدِ اُردو (مطبوعہ ۱۸۰۹ء) کا نمونہ[۵] یہ ہے:-

"یاد رکھنا چاہئے کہ مصدر دلالت کرتا ہے صادر ہونے پر فعل کے فاعل سے، یا قائم ہونے پر فعل کے فاعل میں۔ اور اس صدور اور قیام کے بعد ایک کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کیفیت پر جو اسم دلالت کرے وہ حاصل بالمصدر ہے۔ پس اگر مصادر کی علامت کے حذف کرنے سے جس قدر باقی رہے وہ حاصل بالمصدر ہے۔"

گلکرائسٹ کے علاوہ انیسویں صدی کے یورپین مصنفینِ اردو اور بھی بہت ہیں مثلاً:-

(۱) کپتان جوزف ٹیلر نے اردو انگریزی لغت لکھی، جس میں ڈاکٹر ولیم ہنٹر بھی شریکِ کار رہے۔ پہلی بار ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی، پھر ۱۸۲۰ء میں ولیم کارمیکائل اسمتھ نے اس پر نظرِ ثانی کرکے مختصر ایڈیشن شائع کیا۔

(۲) گلیڈون نے فارسی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۹ء)۔

۵ ماخوذ از نمونۂ منثورات مولفہ مولانا احسن مارہروی۔

(۳) کپتان ٹامس رویک نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کو "ہندوستانی لغت" تیار کرنے میں مدد دی۔ اور خود لغت جہازرانی لکھی، جس میں جہازرانی کے متعلق اصطلاحات اُردو انگریزی میں جمع کیں، اور ایسے الفاظ اور فقرے بھی جمع کر دیئے جو میدانِ جنگ میں اور فوجی بارکوں میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں کام آئیں۔ اسی میں اُردو۔ قواعد کے متعلق بھی ایک ضمیمہ شامل کر دیا۔ یہ کتاب کلکتہ میں ۱۸۱۱ء میں چھپی۔

(۴) کپتان رویک نے ایک اور کتاب "ترجمان ہندوستانی" کے نام سے لکھی۔ جس میں زبان اُردو کے قواعد درج ہیں۔ یہ پہلی بار لندن میں ۱۸۲۴ء میں چھپی، پھر ۱۸۴۱ء میں لندن و پیرس دونوں جگہ شائع ہوئی۔

(۵) جان شیکسپیر نے اُردو لغت لکھی (مطبوعہ ۱۸۱۳ء) اور "منتخبات ہندی" دو[2] جلدوں میں مرتب کی۔ لندن میں ۱۸۰۸ء میں چھپی۔ اسکی پہلی جلد میں میر شیر علی افسوس کی تاریخ ہند (آرائش محفل) کے دس باب کا انگریزی ترجمہ شامل ہے اور دوسری جلد میں اُردو نثر و نظم کا انتخاب ۲۰۰ صفحہ کا اور ہندی نثر کا انتخاب ۸۴ صفحے کا ہے۔ ہندی انتخاب میں کہانیاں ہیں جو اکثر سنگھاسن بتیسی سے لی گئی ہیں اور اُردو انتخاب میں مختلف شہروں کا مفصل حال ہے۔ مثلاً دہلی۔ آگرہ۔ الہ آباد۔ اجودھیا۔ ڈھاکہ۔ کشمیر۔ کابل وغیرہ۔ نظم میں میر حسن۔ سودا۔ میر کی مثنویوں کا انتخاب ہے۔ انگریزوں کی تعلیم کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

(۶) ولیم ٹیٹ نے ایک کتاب مقدمہ زبان ہندوستانی لکھی۔ جس کے تین حصے ہیں قواعد[1]، لغت[2]، زباندانی[3]۔ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۷ء)

(۷) ایس ڈبلیو بریٹن نے قواعد زبان ہندوستانی لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۳۰ء)

(۸) اسٹیم فورڈ ارناٹ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی جو برٹش انڈیا کی نہایت کارآمد اور عام زبان ہے۔ (مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء) یہ کتاب رومن اور فارسی خط میں لکھی ہے۔ اور اس کے ساتھ بطور ضمیمہ لغت اور اسباق زباندانی بھی شامل کئے گئے ہیں۔

(۹) اسی مصنف (ارناٹ) کی دوسری کتاب قواعد فارسی عربی اور دیوناگری حروف میں ہے۔ اس پر ڈنکن فاربس نے حواشی کا اضافہ کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۴۴ء)

(۱۰) جیمس آر بالنٹائن نے ہندوستانی گرامر لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۴ء)

(۱۱) ڈنکن فاربس نے ہندوستانی لغت لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء)

(۱۲) ایف۔ فیلن نے مولوی کریم الدین دہلوی کی شرکت میں شاعروں کا تذکرہ شعرائے ہند کے نام سے مرتب کیا (مطبوعہ ۱۸۴۸ء)

(۱۳) ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے اردو لغت لکھی (مطبوعہ پیرس ۱۸۵۸ء)

(۱۴) ریورنڈ جی اسمال نے ہندوستانی گرامر لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء)

(۱۵) ایک جرمنی کے عالم جی دت و براخنو نے ہندوستانی گرامر لکھی (مطبوعہ برلن ۱۸۵۲ء)

(۱۶) ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن نے چار کتب لغات لکھیں۔ ہندوستانی انگلش ڈکشنری۔ انگلش ہندوستانی ڈکشنری۔ ہندوستانی انگلش قانونی ڈکشنری۔ انگلش ہندوستانی قانونی ڈکشنری۔ دوسرے نمبر کی کتاب سب سے آخری ہے۔ ۱۸۷۹ء میں اس کو مرتب کرنا شروع کیا۔ ۱۸۸۰ء میں انتقال ہوگیا۔ باقی کام ڈاکٹر صاحب کے مددگاروں (یعنی لالہ فقیر چند۔ لالہ چرنجی لال۔ لالہ ٹھاکر داس۔ لالہ جگن ناتھ اور مسٹر واٹلنگ) نے پورا کیا۔ اور ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔

(۱۷) ان سب سے بڑا اردو زبان کا عاشق اور مصنف و مولف فرانسیسی عالم پروفیسر گارسن دتاسی ہے۔ (جس کا ذکر ہم اس سے پہلے کسی فٹ نوٹ میں کر چکے ہیں)۔ اس نے اپنے وطن پیرس میں بیٹھ کر اردو کے متعلق لکچر بھی دئے اور بہت سی کتابیں اور مضامین لکھ کر اور مرتب کر کے شائع کئے۔ اس شخص نے فارسی، عربی، سنسکرت، اردو، ہندی کی خدمت کی ہے اور مذہب، فلسفہ، تصوف، تاریخ، سیرت، قصص، شاعری، تذکرہ شعرا وغیرہ علوم وفنون کے متعلق تصنیفات و تالیفات کی ہیں۔ ہم اس کی صرف ان کتابوں کے نام گناتے ہیں جو اردو کے متعلق ہیں:۔

(۱) پند آموز حکایات کا ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۱۲ء)

(۲) انتخاب کلام میر تقی میر مع ترجمہ زبان فرنچ۔ (مطبوعہ ۱۸۲۶ء)

(۳) قصہ کامروپ مصنفہ تحسین الدین کا فرنچ ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۲۴ء)

(۴) انتخاب کلام وؔلی اورنگ آبادی۔ (مطبوعہ ۱۸۳۶ء)

(۵) کتبہ جات عربی فارسی اُردو (مطبوعہ ۱۸۲۸ء)

(۶) ذکر تذکرہ جات مشتمل بر حالات شعرا و مصنفین ہندی اردو (مطبوعہ ۱۸۳۸ء)

(۷) مسلمانان مشرق کا علم عروض عربی و فارسی و اُردو (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۸) ہندوؤں کے کھانے جن کا ذکر اُردو کتابوں میں ہے۔ (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۹) انتخاب قصہ گل بکاؤلی مع ترجمہ زبان فرانسیسی۔ (مطبوعہ ۱۸۳۵ء)

(۱۰) اُردو زبان کا ابتدائی رسالہ (مطبوعہ ۱۸۳۳ء)

(۱۱) سعدی[۵] دکھنی ہندوستان کا ایک مشہور شاعر (مطبوعہ ۱۸۴۳ء)

(۱۲) تذکرہ شعرائے اُردو (دو جلدوں میں) (مطبوعہ ۱۸۴۷ء)

(۱۳) انتخاب اردو ہندی۔ (مطبوعہ ۱۸۵۳ء)

(۱۴) تذکرہ مصنفین و تصانیف اردو۔ (مطبوعہ ۱۸۶۸ء)

(۱۵) خطبات متعلق زبان اُردو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک (مطبوعہ ۱۸۷۴ء)

(۱۶) خطبات متعلق زبان اُردو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک

(۱۷) تذکرہ شعرائے اُردو (تین جلدوں میں) پہلے تذکرہ مذکورہ ۱۲ کا ترمیم شدہ اڈیشن مع اضافہ مقدمہ مشتمل بر تاریخ زبان و اصناف شاعری۔ اس میں تین ہزار اُردو ہندی شعرا و مصنفین کا تذکرہ ہے۔ (مطبوعہ ۱۸۷۰ء)

اس قسم کے یورپین مصنفین اُردو انیسوی صدی میں نہایت کثرت سے ہیں۔ بعض کا تذکرہ اور نمونہ تحریر درج کیا جاتا ہے۔

---

[۵] اس سعدی کو دکھنی ماننے میں گارسن دتاسی نے غلطی کی۔ یہ شاعر مخدوم کمال الدین سعدی ہیں اور کاکوری کے رہنے والے ہیں۔ ہم اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں ان کا ذکر اور نمونہ کلام درج کر چکے ہیں۔ (قادری)

مسٹر ایف، فیلن — طبقات شعراے ہند

مسٹر فیلن[۵۱] اور مولوی کریم الدین دہلوی نے باہمی شرکت و معاونت سے تذکرہ طبقات شعرائے ہند کے نام سے مرتب کیا۔ کتاب کے بعض حصے ایک کے لکھے ہوئے ہیں، بعض دوسرے کے۔ ۱۸۴۵ء ۱۲۶۲ھ میں یہ تالیف ختم ہوئی اور ۱۸۴۸ء ۱۲۶۴ھ میں مطبع العلوم دہلی میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان مولفوں نے اس تذکرہ میں گارسن دتاسی کے تذکرہ سے بھی مدد لی، بلکہ اس کا ترجمہ کر دیا۔ اور دیگر تذکروں سے بھی اس میں اخذ و اقتباس کیا۔ اس لئے یہ فیلن کا تذکرہ ایک نئی تالیف ہے اور زیادہ مفصل و معتبر ہے۔ اس میں فیلن کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"اگرچہ میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ بہت تذکرے جمع کر کے اس تذکرے کو فراہم کروں لیکن مجھ سے پہلے چونکہ ڈی تاسی نے زبان فرنچ میں درمیان ملک فرانس کے ایک تذکرہ ان تذکروں مفصلہ ذیل سے بہت اچھی طرح تالیف کر دیا تھا اس لئے اور دوسرے تذکروں سے جو اس کو دستیاب نہیں ہوئے اور اس تذکرہ سے مدد لیکر یہ تذکرہ میں نے فراہم کیا۔"

ولیم میکفرسن — "دستور العمل عدالت"

۱۸۵۱ء ۱۲۶۸ھ میں ولیم میکفرسن نے ایک قانونی کتاب دستور العمل عدالت دیوانی حکومت فورٹ ولیم کے نام سے مرتب کی۔ اس کی تالیف میں دو اور شخص بھی شریک ہیں یعنی ماسٹر ایکو لی مس اور جارج اسولٹ فیگن مجسٹریٹ کلکتہ۔ مسٹر فیگن نے "مجموعہ قوانین تعزیرات ہند" بھی اردو میں مرتب کیا ہے۔ دستور العمل کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"جس ضلع میں جو زبان مروج ہے۔ اس زبان کے خط و عبارت میں نوشت و خواند و سوال و جواب وہاں کی عدالتوں میں اور ان کے سررشتوں میں کہ جہاں امورات عدالت قلم بند ہوتے ہیں، عمل میں آتے ہیں۔ یعنی دیار مغربی کے اور صوبہ بہار کے محکموں میں بزبان اردو اور اضلاع دیار بنگالے کی عدالتوں میں بنگلہ زبان میں اور ضلع کٹک اور اس کے متعلق پرگنوں کی کچہریوں میں اڑیا زبان میں نوشت خواند و سوال و جواب کرنا معمول ہے۔"

جان ولیم پیل "رسالہ آلات طبعی"

مسٹر پیل[۵۲] آگرہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ علم طبعیات

---

۵۱ فیلن و میکفرسن کے نمونے مولانا احسن مارہروی کی کتاب "نمونۂ منثورات" سے ماخوذ ہیں۔

۵۲ ماخوذ از "یو۔پی میں اردو" مصنفہ مفتی انتظام اللہ الشہابی اکبرآبادی۔

(فزکس) کے ماہر اور فن کیمیا (کیمسٹری) کے عالم تھے۔ مولوی کریم الدین مدرس اول اردو کی مدد سے آلات طبعی کا نقشہ تیار کیا، اور ان کے استعمال کے متعلق ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۹ء میں ایک رسالہ اردو میں تحریر کیا، جو مطبع مصوّر آگرہ میں ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء میں طبع ہوا۔ دیباچہ کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"یہ کتاب واسطے مددان طلباء کے جو علم طبعی کے لیکچروں یعنی درسوں میں حاضر ہوا کرتے ہیں بموجب حکم جناب معلی القاب جیمس طامسن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربیہ کے طیار کی گئی تھی، اور چونکہ اس حکم نے ان کی وفات تاسفی کے چند روز پیشتر نفاذ پایا تھا اور یہ طلباء کی ترقی کے بڑے مشتاق رہتے تھے ......"

ان کے علاوہ آگرہ ہی میں ایک اور انگریز جان پارکس لیڈلی تھا۔ سرکاری مترجم کا عہدہ اس کے سپرد تھا۔ اس نے ایک اپنا مطبع قائم کیا تھا۔ علمی دلچسپی اور اردو زبان کا شوق رکھتا تھا۔ ایک ۹۰ صفحے کا رسالہ علم المعیشت (اکنامکس) پر انگریزی سے ترجمہ کرکے اردو میں لکھا اور اپنے مطبع میں ۱۲۶۹ھ ۱۸۵۳ء میں طبع کیا۔

عیسائی مشنری | اہل یورپ نے ہندوستان میں تجارت و حکومت کی کوشش کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ کا کام بھی بڑے زور شور سے کیا۔ اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں انجیل کے ترجمے کئے۔ اس طرح بالواسطہ اردو زبان کی وسعت اور اردو لٹریچر کی کثرت میں سعی کی۔ اٹھارہویں صدی ہی میں چند ترجمے ہو گئے تھے۔ اُنیسویں صدی میں اردو کے ٹائپ اور لیتھو کے چھاپے خانے جاری ہونے سے بائبل کی اشاعت بڑی کثرت سے ہونے لگی۔ سرسید احمد خاں مرحوم نے اپنی تفسیر انجیل میں اور گارساں دتاسی نے اپنے خطبوں میں انجیل کے ترجموں کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ہم انیسویں صدی کے ایک ترجمہ کا مختصر اقتباس بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔ اس کا ٹائٹل پیج یہ ہے "کتاب مقدس یعنی پرانا اور نیا عہدنامہ، پہلی جلد، جس میں سب کتابیں پیدائش سے لیکے زبور کی کتاب تک مندرج ہیں، نارتھ انڈیا، بائبل سوسائٹی کی طرف سے مرزاپور کے آرفن اسکول پریس میں ڈاکٹر میتھر صاحب کے اہتمام سے ۱۸۶۷ء میں چھاپی گئی" نمونہ یہ ہے:-

"پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا، اور اسے اپنے بھائیوں سے بیان کیا، اور کہا کہ دیکھو،

میں نے ایک خواب دیکھا، کہ سورج، اور چاند، اور گیارہ ستاروں نے مجھے سجدہ کیا۔ اور اس نے یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بیان کیا (تب اس کے باپ نے اُسے ڈانٹا اور اس سے کہا، کہ یہ کیا خواب ہے، جو تو نے دیکھا ہے؟ کیا میں اور تیری ما، اور تیرے بھائی سچ مُچ تیرے آگے زمین پر جھک کے تجھے سجدہ کریں گے؟ اور اس سے بھائیوں کو رشک آیا، لیکن اس کے باپ نے اس بات کو یاد رکھا"

اُنیسویں صدی میں یہ سلسلہ جاری رہا کہ انگریز حکّام اور اہلِ قلم اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ چونکہ عدالتی زبان اُردو ہوگئی تھی۔ اس لئے شمالی ہند کی کچہریوں کی کارروائیاں اُردو میں ہوتی تھیں۔ خود انگریز حکّام تجویزیں اور فیصلے اردو میں لکھتے لکھواتے تھے۔ لیکن جب انگریزی تعلیم عام ہوگئی اور حکومت کو انگریزی داں ملازم ملنے لگے تو اُردو کی ضرورت نہ رہی اور سرکاری زبان انگریزی ہی ہوگئی۔ اس وقت سے انگریزوں نے بھی اُردو کی تصانیف سے توجہ ہٹالی۔ انگریز اب بھی اُردو سیکھتے ہیں۔ لیکن بولنے کے لئے زیادہ، پڑھنے کے لئے کم۔ اور لکھنے کے لئے بہت کم۔ بیسویں صدی میں انگریزوں کی اُردو تحریروں کا سلسلہ بالکل ختم ہوگیا لیکن اردو زبان سے دلچسپی اور اس کے متعلق تالیفات اب بھی ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں گراہم بیلی نے ایک مختصر تذکرہ ہسٹری آف اردو لٹریچر کے نام سے انگریزی میں لکھا ہے اور لندن سے شائع کیا ہے۔ سَو صفحے کی کتاب ہے۔ ابتدائے زبان اردو اور دکن کی تصانیف اُردو سے لیکر عصر حاضر تک کے مشہور اور خاص خاص شاعروں اور مصنفوں کا مختصر حال اور ذکر تصانیف درج کیا ہے۔ نمونہ نثر و نظم کچھ نہیں ہے۔ بعض جگہ غلطیاں بھی کی ہیں۔ لیکن کتاب کی ترتیب واضح و دلچسپ ہے۔ اردو کی رفتار و ترقی کا مجمل اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ مصنف نے اپنی تصنیف کے زمانہ (۱۹۳۲ء) کے زندہ و موجود مصنفین نثر میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا۔ راشد الخیری اور پریم چند تک کو چھوڑ دیا ہے۔ شاعروں میں سے صرف ڈاکٹر اقبال کو لیا ہے۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کا بھی نام نہیں لیا۔ گراہم بیلی کے مطالعہ شاعری اور نقد و نظر کی ایک دلچسپ مثال درج کی جاتی ہے۔۔ اس نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں مختلف صورتوں سے اُردو شاعروں کے درجے

قائم کئے ہیں اور بہتری و برتری کے اعتبار سے ان کے ناموں کو مرتب کیا ہے۔ لکھا ہے:۔

(۱) سب سے بڑے شاعر۔ ان مجموعوں کی ترتیب مرتبہ کے لحاظ سے ہے اور مجموعوں کے اندر ناموں کی ترتیب زمانے کے اعتبار سے۔

(الف) میر۔ غالب۔ انیس۔

(ب) ولی۔ سودا۔ نظیر اکبر آبادی۔ اقبال۔

(ج) درد۔ میر حسن۔ داغ۔ حالی۔ اکبر۔

(۲) بہترین غزل گو شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) میر۔ ولی۔ درد۔ غالب۔ مصحفی۔ آتش۔ داغ۔ امیر مینائی۔

(۳) بہترین قصیدہ نویس شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) سودا۔ ذوق۔ نصرتی دکنی۔

(۴) بہترین مرثیہ گو شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) انیس۔ دبیر۔ مونس۔ خلیق۔ ضمیر اور دکن کے شعرائے مرثیہ ہاشم علی۔ مرزا۔

(۵) بہترین مثنوی گو شعرا۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) میر حسن۔ اثر۔ میر۔ نسیم۔ مومن۔ اور دکن کے شعرا۔ غواصی۔ نصرتی۔ طبعی۔ وجہی۔

(۶) عام شاعری کے اعلیٰ شعرا۔ (بہ ترتیب زمانہ) قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ۔ نظیر اکبر آبادی۔ حالی۔ اکبر۔ کیفی حیدر آبادی۔ اقبال۔

(۷) گزشتہ ۵۰ برس کے بہترین شعرا (علاوہ مذکورہ بالا شعرا کے) آزاد۔ جلال۔ تسلیم۔ اسمٰعیل۔ شاد۔

(۸) گزشتہ ۱۰۰ برس میں بہترین نظم مسدس حالی ہے، بشرطیکہ انیس کے مرثیوں کو ایک نظم نہ مانا جائے۔

ہم کو ان ترتیبوں سے بعض جگہ اختلاف ہے لیکن یہ رائے گراہم بیلی کے وسیع مطالعہ اور غائر نگاہ کا ثبوت ہے۔ چونکہ اہلِ یورپ کی اردو زبان میں انشا پردازی کا سلسلہ ختم ہے۔ اس لئے ہم نے یورپین مصنفین نثر کا ذکر یہیں ختم کردیا ہے۔ کہ نثر کے متعلق ان کی کارگذاریاں ایک جگہ نظر آجائیں۔

نثر کا تیسرا دور

(۱) مصنفین فورٹ ولیم کالج

۱۸۰۰ء تا ۱۸۲۰ء

۴ مئی ۱۸۰۰ء (۷ ذی الحجہ ۱۲۱۴ھ) کو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ اس سے پہلے کمپنی کے انگریز ملازموں کے لئے اردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اول نے دیسی کالج کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا جس میں انگریز ملازم اور ہندوستانی طلباء فارسی پڑھتے تھے۔ لیکن یہاں اردو یا کوئی ملکی زبان نہ پڑھائی جاتی تھی۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کمپنی کی طرف سے ہر انگریز ملازم کو تیس روپیہ فی کس دئے جاتے تھے۔ وہ لوگ اردو اپنے طور پر پڑھ لیتے تھے یا انگریز حکام اپنے ماتحتوں کے لئے اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مغلیہ سلطنت کی زبان فارسی تھی۔ فارسی ہی میں تمام عدالتی و ملکی کاروبار انجام پاتے تھے۔ سلطنت کے اثر سے شمالی ہند میں کثرت سے اور عام طور پر اور کم و بیش تمام ہندوستان میں فارسی تعلیم کا رواج تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی پہلا اور بڑا تعلق سلطنت مغلیہ ہی سے پیدا کرنا تھا۔ اس لئے انگریز بھی فارسی کی تحصیل پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ لیکن مغلیہ سلطنت اور فارسی زبان کا تنزل اور اردو زبان کی ترقی اس سرعت کے ساتھ جاری تھی کہ لارڈ ویلزلی نے انگریزوں کے لئے اردو کی ضرورت کو محسوس کر لیا۔ اور اس کی باضابطہ تعلیم کا انتظام کر دیا۔ اس ضرورت کے ساتھ ہی گورنر جنرل کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ جو انگریز کمپنی میں ملازم ہو کر آتے ہیں وہ ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نہیں آتے اور کاروانی و حکمرانی کے لئے علوم و فنون کی مہارت ضروری ہے۔ اس لئے اس نے یہ چاہا تھا کہ یہ فورٹ ولیم کالج علوم و فنون کی اعلیٰ درسگاہ ہو۔ جس میں علمی زبانیں عربی و فارسی و سنسکرت بھی

پڑھائی جائیں، اور ملکی زبانیں اُردو، بنگالی، مرہٹی وغیرہ بھی، اور یورپین زبانیں انگریزی، لاطینی، یونانی بھی۔ اور علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جائے۔ جن میں تاریخ عالم، تاریخ ہند، جغرافیہ، اصول قانون، شرح اسلام، دھرم شاستر وغیرہ شامل ہوں۔ لیکن کمپنی نے ایسے عظیم الشان کالج کے مصارف کثیر برداشت کرنے سے قطعاً انکار کردیا۔ اس لئے کالج کو صرف زباندانی کا کالج بنانا پڑا۔

ڈاکٹر گل کرائسٹ اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، اُردو کے بڑے حامی و ماہر تھے، اور کئی سال پہلے سے اُردو کی خدمت کررہے تھے۔ کمپنی کے ملازموں کو بھی اپنے طور پر اُردو پڑھایا کرتے تھے۔ اب کالج میں باقاعدہ اُردو کی تعلیم شروع کردی۔ اور اپنی مدد کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی مدرس مقرر کیا۔ اس تعلیم کے ساتھ ہی انھوں نے اُردو کی تالیف و تصنیف کا محکمہ بھی قائم کردیا۔ اور ہندوستانی اہلِ زبان اور ماہران فن سے اُردو زبان میں ترجمہ و تصنیف کا کام بھی لینا شروع کیا۔ اور ان کتابوں کے چھاپنے کے لئے اُردو ٹائپ کا مطبع بھی قائم کردیا۔ یہی ہندوستان میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ تھا[5]۔

---

۵ فورٹ ولیم کے چھاپہ خانہ کے بعد انگریز پادریوں نے سیرامپور میں مطبع قائم کیا۔ پادری مارٹن نے انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ ۱۸۱۴ء میں یونانی زبان سے اُردو زبان میں کیا۔ سیرامپور کے مشنریوں نے پوری بائبل کا ترجمہ پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک شائع کیا۔ لکھنؤ میں نواب غازی الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۱۴ء ۱۲۲۹ھ) کے زمانے میں ٹائپ کا مطبع قائم ہوا۔ اس میں سب سے پہلی کتاب ہفت قلزم (فارسی لغت) طبع ہوئی۔ لیتھو کا سنگی مطبع سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے کانپور میں جاری کیا۔ ۱۸۳۵ء میں دہلی میں سنگی مطبع قائم ہوا۔ اور ۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے والد) نے دہلی اردو اخبار جاری کیا۔ یہ اُردو زبان کا دوسرا اخبار تھا۔ پہلا اُردو اخبار مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔ نواب نصیر الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۲۷ء ۱۲۴۳ھ) نے مسٹر آرچر کو کانپور سے بُلا کر لکھنؤ میں سنگی مطبع قائم کیا۔ جس میں سب سے پہلی کتاب شرح انفیہ چھپی۔ ۱۸۳۰ء میں دہلی میں
(ماخوذ از ...)

اس وقت تمام ملک میں اُردو کی ایک کتاب نثر بھی ایسی نہ تھی جس کو فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شامل کیا جاتا۔ مطبوعہ کتاب کا تو اس سے پہلے امکان ہی نہ تھا۔ قلمی کتابوں میں فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا اور شاہ صاحبان دہلوی کے تراجم قرآن مجید مذہبی کتابیں تھیں۔ انگریزوں کے کام کی نہ تھیں۔ تحسین کی نوطرز مرصع مشکل و ادق تھی۔ اور جو کتابیں متفرق لوگوں نے لکھیں وہ قلمی ہونے کے سبب سے اور غیر مشہور اشخاص کی

(بقیہ صفحہ ۸۲) ٹائپ کا مطبع بھی قائم ہوگیا۔ اس سال کے بعد تمام ہندوستان میں لیتھو کے چھاپے خانے کھُلنے لگے اور اخبارات نکلنے لگے۔ آگرہ، میرٹھ، بنارس، بریلی، پنجاب، بمبئی، مدراس وغیرہ میں بڑی کثرت سے مطابع واخبارات جاری ہوگئے۔ ۱۸۴۹ء میں صرف ممالک مغربی شمالی (یعنی موجودہ یو۔ پی، دہلی اور پنجاب) میں ۲۳ مطبع تھے۔ جن میں سے بارہ مطبع صرف لکھنؤ میں تھے۔ اور ان مقامات پر ۲۳ اخبار اُردو سے نکلتے تھے۔ اُس سال تمام ہندوستان کے اُردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ اور صرف ممالک مغربی شمالی میں ۱۴ کتابیں طبع ہوئی تھیں۔ غدر کے اگلے سال ۱۸۵۸ء میں مطبع نولکشور قائم ہوا، اور اسی سال اس مطبع سے اودھ اخبار جاری ہوا۔ یہ اخبار آئندہ چل کر روزانہ ہوگیا اور ملک کے ممتاز اخباروں میں شمار ہونے لگا۔ اور مطبع نولکشور کو اس قدر ترقی ہوئی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک مشرقی میں اس سے بڑا مطبع نہ تھا۔ لیکن صحت کتابت اور حسن طباعت کے اعتبار سے منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی کانپور نے نام پیدا کیا جو انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوا تھا اور بیس سال سے زیادہ ملک کی خدمت کرکے اپنے مالک کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس کی مطبوعات حسن و خوبی کے لحاظ سے ایشیا بھر میں بے نظیر تھیں۔ قدیم مطابع میں مطبع نولکشور کے علاوہ صوفی قادر علیخاں کے مطبع مفیدِ عام آگرہ کو بھی فن طباعت میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی میں متعدد اعلیٰ مطابع جاری ہوئے۔ کامیاب رہے اور قائم ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں بلاک کی چھپائی اس قدر عام اور ارزاں ہوگئی ہے کہ تمام سنگی مطابع کی خوشنمائی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ عمومیت اس قدر کہ جنتریاں اور دواخانوں کی فہرستیں پوری بلاک سے چھاپی جاتی ہیں اور ارزانی اتنی کہ بلاک کا چھپا ہوا پورا قرآن مجید ایک روپیہ میں اور حمائل شریف آٹھ آنے میں دستیاب ہوسکتی ہے۔ یہ مطابع کی مختصر تاریخ ہے۔ اسکی تفصیلات موقع بموقع کتاب کے اندر آئیں گی۔

تصانیف ہونے وجہ سے گمنام تھیں۔ اور اب ان کا پتہ چلا ہے تو مشکل سے کوئی کتاب مذہبی تعلیم سے علیحدہ عام لٹریچر (تاریخ، سیرت، فسانہ وغیرہ) کے متعلق تھی۔ اس لئے ڈاکٹر گل کرائسٹ کا اردو زبان پر کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اردو کا سب سے پہلا لٹریچر گویا ایجاد کر دیا۔ ہندوستان کے ذی علم و اہل زبان لوگوں کو جمع کیا۔ اور کتابیں لکھوائیں۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ صرف چار سال اس کالج میں رہے۔ لیکن ان کا شروع کیا ہوا کام جاری رہا، ان کے قائم مقام انگریز پرنسپل اور منتظم اس محکمہ تالیف و تصنیف کی نگرانی و سرپرستی کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد کپتان ٹامس روبک کالج کے پرنسپل ہوئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کی تالیفات میں مدد دی۔ اور خود بھی لغت جہازرانی وغیرہ کتابیں لکھیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر بھی فورٹ ولیم کالج کے اردو پروفیسر تھے۔ ان کی تصنیفات اردو کا ذکر بھی پہلے کیا جاچکا ہے۔ اب کالج کے ہندوستانی مصنفوں کا تذکرہ لکھا جاتا ہے۔

میرامن دہلوی | میرامن کا نام میر امان تھا، اور امن تخلص، لیکن میرامن کے نام سے مشہور ہیں۔ میرامن فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں پہلے نہیں ہیں۔ ان سے پہلے میر بہادر علی حسینی وہاں میر منشی تھے۔ میرامن کے دوست تھے۔ انہی کے ذریعہ سے میرامن ملازم ہوئے۔ میرامن نے کتابیں بھی اوروں سے کم لکھیں یعنی صرف دو، باغ و بہار اور گنج خوبی۔ ان میں سے بھی صرف باغ و بہار ہی مشہور ہے۔ دوسری کا نام بھی کم لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اکیلی باغ و بہار نے ان کے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے۔

دلی کی زبان، اردوئے معلّٰی کے روزمرہ اور محاورے، بیان کی دلکشی، فقروں کی شگفتگی، مکالموں کی دلفریبی، حسب موقع اختصار و تطویل، مناظر کی تصویر، یہ سب خوبیاں اس زمانے کے کسی مصنف میں ایسے کمال کے ساتھ یکجا نہیں ہیں۔

میرامن کے ذاتی حالات کسی تذکرے میں اتنے بھی نہیں ہیں جتنے انھوں نے خود "باغ و بہار" کے دیباچہ میں لکھ دیئے ہیں۔ ہم انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ یہ ان کے نمونہ تحریر کا بھی کام دیں گے:۔

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجالاتے رہے، اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہئے فرماتے رہے، جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کرکر مالا مال اور نہال کردیا، اور "خانہ زادِ موروثی و منصبدارِ قدیمی" زبان مبارک سے فرمایا، چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اسی گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پونہچی کہ ظاہر ہے۔ عیاں را چہ بیاں، تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کرلیا۔ احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھاکر ایسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن ہوا، اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا، غارت ہوا۔ میں بےکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے، کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا، کچھ بنی، کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی، عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا، اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آ پونہچا۔ چندے بیکاری میں گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا، تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلہ سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں، نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پاکر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔"

باغ و بہار کے قصہ کا ماخذ اور طرزِ تحریر بھی خود میرامن کی زبانی یہ ہے:-

"قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جو ان کے پیر تھے (اور درگاہ ان کی قلعہ میں تین کوس

لال دروازے کے باہر ٹیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے) ان کی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصّہ ہمیشہ کہتے اور بیمار داری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انھوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصّے کو سُنے گا، خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔ اب خداوند نعمت صاحب مروّت، نجیبوں کے قدر دان، جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصّے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام، آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

باغ و بہار ۱۸۰۱ء ۱۲۱۵ھ میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں ختم کیا۔ ۱۸۰۳ء میں پہلی بار طبع ہوا۔ باغ و بہار تاریخی نام ہے (۱۲۱۷ھ نکلتا ہے)۔ میرامن نے فارسی کے قصہ کو اپنی کتاب کی اصل بتایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے اپنے مقدمہ باغ و بہار میں ثابت کیا ہے کہ میرامن نے باغ و بہار کو چہار درویش سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ تحسین کی نوطرز مرصع کو دیکھ کر لکھا ہے۔ لیکن تحسین کی ثقیل عبارت کو سلیس کر دیا ہے۔ غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیا ہے، ضروری باتوں کا اضافہ کیا ہے۔ حسب ضرورت مختصر بیان کو مفصل اور مفصل کو مختصر کر دیا ہے اور بہ حیثیت مجموعی کتاب کو اپنا بنا لیا ہے۔ میرامن نے قواعد زبان کی پابندی سے زیادہ روزمرّہ اور محاورہ اور بول چال کا خیال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ اُردو کے مقابلے میں میرامن کی زبان میں تذکیر و تانیث کا اختلاف، قدیم محاورے، ہندی کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اب متروک ہیں۔

اسی قصے کو اسی سال (۱۲۱۷ھ) میں ایک اور شخص محمد عوض زرّیں نے لکھا ہے۔ اس نے "قصّہ چار درویش" کو پہلے فارسی میں لکھ کر راجہ رام دین برادر راجہ سیتل پرشاد

کو دکھایا، اور راجہ کی فرمایش سے پھر اس کو اردو میں لکھا۔ عجیب بات ہے کہ زرّیں نے تحسین کی کتاب کے دیکھنے کا ذکر نہیں، لیکن نام وہی تحسین والا رکھا ہے یعنی نوطرز مرصع اور عجیب تر یہ کہ زرّیں کو میرامّن کی کتاب کی خبر نہیں، لیکن اس نے تاریخ تصنیف وہی میرامّن والی نکالی ہے، یعنی باغ و بہار۔ دیباچہ میں لکھا ہے :-

بنا کر یہ گلدستۂ روزگار لکھی اس کی تاریخ باغ و بہار

محمد عوض زرّیں نے وہی چار درویشوں کے قصّے لکھے ہیں، لیکن بہت مختصر۔ قافیہ پیمائی کی ہے۔ لیکن عبارت بالکل سادہ ہے۔ کوئی لطف اور کوئی خصوصیت ان دونوں کتابوں کے مقابلے میں نہیں ہے۔ البتہ کتاب کے اندر جا بجا، بلکہ اکثر صفحوں پر کہیں کہیں جگہ دو دو چار شعر لکھے ہیں جو مثنوی کی طرز میں ایک ہی بحر کے ہیں اور بیان داستان کا جزو ہیں۔ یہ نظم نثر سے زیادہ دلچسپ ہے۔

میرامّن کی باغ و بہار اس قدر مقبول ہوئی کہ انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، لاطینی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ اردو میں متعدد شاعروں نے نظم کیا۔ میرامّن کی زبان و بیان کو ہر ہندوستانی اور یوروپین نے سراہا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی نے اپنے خطبات میں بار بار باغ و بہار کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی خوبیاں گنائی ہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے :- "اس کتاب[۵] کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کارآمد باتیں یہ پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوں گی"۔ دوسرے خطبہ میں باغ و بہار کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کرتا ہے اور اس کو اعتراض کے طور پر بیان کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ گارسن دتاسی عیسائی ہے، اس کو اسلام کی اشاعت و تبلیغ پسند نہیں اور اس بات کو قصّے میں عجیب سمجھتا ہے۔ لیکن میرامّن مسلمان ہیں، قصّے کے کسی مسلمان شخص کو مسلمان دکھانا، یا بقولِ دتاسی اسلام کی تبلیغ کرنا ان کے لئے بالکل درست بلکہ فطری بات ہے۔

۵ خطباتِ گارسن دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

ہم گارسن دتاسی کی تنقید درج کرتے ہیں، اور اس نے باغ و بہار کے جن فقروں کا حوالہ دیا ہے۔ ان کو میر امّن کے الفاظ میں باریک قلم سے نقل کرتے ہیں۔ یہ مختصر ٹکڑا باغ و بہار کے مکالمات کی بھی چھوٹی سی دلچسپ مثال ہے۔

گارسن دتاسی کہتا ہے "باغ و بہار کی نسبت میں اپنے ۱۸۵۳ء کے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس جگہ پھر ایک امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی قصوں میں آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے۔ اور عنائی شاعری تصوّف، عشق مجازی، اور ہمہ اوست کے مسائل سے آگے نہیں بڑھتی۔ قصوں میں اسلامی عقائد اثباتی نوعیت کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں، اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت موثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے۔ مثلاً باغ و بہار میں جہاں بخارا کے تاجر کا ذکر ہے کہ اسے کیونکر دختر وزیر کی وساطت سے مصائب سے نجات ملتی ہے، تو وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تاجر دوگانہ شکرانے کا رُو بقبلہ ہو کر پڑھنے لگا۔ وزیر کی لڑکی یہ حرکات و سکنات دیکھ کر متعجب ہوتی ہے اور اس تاجر سے دریافت کرتی ہے کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے؟ تاجر جواب دیتا ہے:۔

"جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور زنداں سے خلاص کروایا، اس کی ذات لاشریک ہے اس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجالایا۔ اور اسے شکر کیا۔ یہ بات سُن کر کہنے لگی، تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا، شکر الحمد للہ۔ بولی میرا دل تمہاری باتوں سے خوش ہوا، میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ، میں نے دل میں کہا الحمد للہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی۔ غرض میں نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا، اور اس سے پڑھوایا۔"
(باغ و بہار)

باغ و بہار اُس زمانے کے تمدّن و معاشرت کا آئینہ ہے۔ اسلامی عقائد اور

۵؎ یہ عبارت بھی مع باغ و بہار کے اقتباس کے خطبات گارسن دتاسی سے ماخوذ ہے۔

ضعیف الاعتقادیاں، رسم ورواج، طعام ولباس، مشاغل ومعمولات، آدابِ اخلاق، غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ میر امّن شاعر بھی تھے، لیکن پیشہ ور نہیں۔ صرف تفریحی واتفاقی۔ امّن اور لطف دونوں تخلص تھے۔

میر امّن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی ہے۔ یہ مُلّا حسین واعظ کاشفی (مصنف انوارِ سہیلی) کی اخلاقِ محسنی کا ترجمہ ہے۔ اس کے متعلق میر امّن خود لکھتے ہیں:۔

"لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا، اس لئے اس کا مطلب لیکر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا۔" (گنج خوبی)

یہ کتاب بھی ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے باغ وبہار کے بعد ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں لکھی تھی، لیکن اس کو شہرت ومقبولیت نصیب نہوئی۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کو چھپوایا بھی نہیں۔ مدتوں بعد ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ میں مطبع محبوب بمبئی میں چھپی۔ اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مولوی سید محمد صاحب بی۔اے (عثمانیہ) کو کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں ملا ہے۔ جس سے انھوں نے ایک حکایت بطور نمونہ اپنی تالیف (اربابِ نثر اردو) میں نقل کی ہے۔ کتاب کے نادر ونایاب ہونے کے سبب سے ہم بھی اس حکایت کو درج کرتے ہیں۔ کمیاب چیز کا جس قدر حصہ جتنا مشتہر ہو جائے غنیمت ہے:۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے جب اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزل باقی میں پہنچایا، کسو شخص نے انھیں خواب میں دیکھا، اور پوچھا، کہ مرنے کے بعد تم پر کیا کیا واردات گذری، اور اب کیا حال ہے۔ جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب کے عقاب کے پنجے میں سختی کے شاہین کے جنگل میں گرفتار تھا، ایک بارگی کریم کے کرم سے اس حالت سے چھٹکارا ہوا، اور سارے گناہ معاف ہو گئے۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کا کیا سبب ہے اور باعث ہے، کچھ تمھیں معلوم ہو تو بیان کرو کہ کس کے وسیلہ سے نجات پائی۔ بولے کہ ایک میدان میں مسافر خانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا جیٹھ کے دنوں دوپہر کی دھوپ میں تونسا ہوا اس کے سایہ میں آکر بیٹھا، اس نے کوئی دم آرام پایا، جب

ٹھنڈی ہوا اور راہ کی ماندگی سے ہرا ہوا، خوش ہو کر نہایت عاجزی سے بدِل دعا کی کہ اے بارِ الٰہا، اس مکان کی بنا کرنے والے کے گناہ بخش، اور اس کی روح کو فردوس کی چھاؤں میں جگہ دے۔ وہ ہیں اس کی دُعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر درست بیٹھا۔ میری آمرزش ہوئی، اور جہنّم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفے میں رہنے کا حکم ہوا۔ بیت

ہر چند کہ سب کاموں میں مَیں غور کر دیکھوں ہوں
نیکی ہی بھلی سب میں ہے اور باقی ہے سب پوچ ۲۲

سید حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں حیدری نے سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، لیکن نہ سب کی سب شائع ہوئیں، نہ سب کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔ حیدری کے آبا و اجداد نجف اشرف سے ہندوستان آئے، دہلی میں سکونت اختیار کی۔ ان کے والد کا نام سید ابوالحسن ہے۔ معاش سے پریشان ہو کر ان کے والد لالہ سکھدیو رائے کے ساتھ دہلی سے بنارس چلے گئے۔ اور وہیں رہنے لگے۔ بنارس میں نواب علی ابراہیم خاں خلیل (مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم) عدالت کے جج تھے۔ حیدری کی تعلیم و تربیت نواب صاحب کی صحبت میں ہوئی۔ جب فورٹ ولیم کالج کا افتتاح ہوا اور وہاں ہندوستانی منشیوں کی ضرورت ہوئی تو حیدری نے اُردو میں قصہ مہر و ماہ لکھا اور اس کو لیکر کلکتہ پہنچے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے اپنی تصنیف پیش کی۔ انھوں نے بہت پسند کی اور حیدری کو ملازم رکھ لیا۔ حیدری ۱۸۱۴ء؁ / ۱۲۲۹ھ؁ سے پہلے اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر بنارس واپس آ گئے۔ اور ۱۸۲۳ء؁ / ۱۲۳۸ھ؁ میں انتقال کیا۔ حیدری کی تصنیفات کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) قصہ مہر و ماہ۔ حیدری کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اوائل ۱۲۱۴ھ؁ (وسط ۱۷۹۹ء؁) میں لکھی۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

(۲) قصہ لیلیٰ و مجنوں۔ امیر خسرو کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا اُردو ترجمہ ہے۔ ۱۸۰۰ء؁ / ۱۲۱۴ھ؁ میں تمام ہوا۔ یہ بھی مفقود ہے۔

(۳) ہفت پیکر، حیدری کی تصنیف منظوم ہے۔ نظامی گنجوی کی اسی نام کی مثنوی کے جواب میں مثنوی ہے ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں لکھی گئی۔ مرزا کاظم علی جواں نے اس کی تاریخ تصنیف کہی تھی۔ "جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوی"۔ (۱۲۲۰ھ) یہ بھی اب ناپید ہے۔

(۴) تاریخ نادری، فارسی تصنیف تاریخ جہاں کشائے[۵] نادری مصنفہ مرزا محمد مہدی استر آبادی کا اُردو ترجمہ ہے۔ مہدی نادر شاہ کا مصاحب تھا۔ اپنے آقا کے حالات (تا وفات نادر شاہ ۱۷۴۷ء/۱۱۶۰ھ) لکھے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ نادری کے نام سے مشہور ہے۔ یہی نام حیدری نے اپنے ترجمہ کا رکھا۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ میں ختم ہوا۔ یہ بھی نایاب ہے۔

(۵) گلزار دانش شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا سنہ دریافت نہ ہوا۔ فارسی کی تصنیف ۱۶۵۱ء/۱۰۶۱ھ میں ہوئی ہے۔ جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کا قصہ ہے۔ عنایت اللہ نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ قصہ فرضی نہیں سچا واقعہ ہے۔ بہرحال حیدری کی گلزار دانش بھی اب گم ہے۔

(۶) گلدستہ حیدری، میں حیدری کی متفرق تالیفات جمع ہیں۔ یعنی مجموعۂ مراثی، حکایات و لطائف، دیباچۂ مہر و ماہ، دیباچۂ لیلیٰ مجنوں، غزلیات و قصائد وغیرہ۔ یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی اور کمیاب ہے۔

(۷) گلشن ہند، شعرائے اردو کا تذکرہ ہے جو حیدری نے ۱۸۰۰ء/۱۲۱۴ھ میں ختم کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ فورٹ ولیم کالج ہی کے ایک اور متوسل میرزا علی لطف نے اسی زمانے میں شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا ہے اور اس کا نام بھی گلشن ہند رکھا ہے۔ لطف کا تذکرہ ۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ میں تمام ہوا ہے۔ دونوں نے اختتام تالیف کی جو تاریخیں

۵ "تاریخ جہاں کشا" کے نام سے فارسی کی ایک اور تاریخ بھی مشہور ہے۔ ان دونوں کو خلط ملط نہ کر لیا جائے۔ وہ فارسی تاریخ اس فارسی تاریخ سے پانسو برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ ابن عطا ملک جوینی نے چنگیز و ہلاکو کے حالات ۱۲۶۰ء/۶۵۸ھ میں لکھے ہیں۔ جوینی بھی ہلاکو خاں کا ملازم و مصاحب تھا۔ جیسے مہدی نادر شاہ کا۔

نکالی ہیں ان سے یہی سنہ نکلتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدری نے اپنی تالیف لطف سے ایک سال پہلے پوری کی۔ حیدری نے یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے:۔

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں — زروئے حق یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب — "اسے کہنا ہے ہر ایک گلشن ہند"

۱۲۰۶
۸
۱۲۱۴ھ

اور میرزا علی لطف کا قطعہ یہ ہے:۔

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا — کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پشت ہے[1]
حیران پھرے ہیں بے سر و پا بہمن اور دے — تاریخ اس کی جب سے کہ "رشک بہشت" ہے[2]

۱۲۲۷
۱۲
۱۲۱۵ھ

حیدری کا یہ تذکرہ کمیاب ہے۔ انگلستان میں اس کی دو کاپیاں ہیں۔ ان میں سے برٹش میوزیم کے نامکمل نسخہ سے تھوڑا سا اقتباس ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) نے مولوی سید محمد صاحب کو بھیجا تھا، جو انھوں نے

[1] پشت۔ ذلیل و زبوں۔

[2] مولف "ارباب نثر اردو" کو (جن کی تالیف سے یہ حالات اور اقتباسات ماخوذ ہیں) "رشک بہشت" سے تاریخ نکالنے میں غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "جب" کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو سنہ ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔ "رشک بہشت" کے اعداد ۱۲۲۷ ہیں۔ "جب" کے ۵ عدد گھٹائے جائیں گے تو ۱۲۲۲ بچیں گے۔ اس کے علاوہ قطعہ کے چوتھے مصرع میں (جب سے) کا اشارہ جمع کرنے کی طرف ہو سکتا ہے۔ تفریق کی طرف نہیں۔ انھوں نے قطعہ کے تیسرے مصرع پر غور نہیں کیا۔ بہمن اور دے کے بے سر و پا ہونے سے یہ مقصد ہے کہ بہمن کا سر (ب) اور (دے) کا پاؤں (ے) لیکر ان کے ۱۲ عدد تفریق کئے جائیں گے۔ قادری

"ارباب نثر اردو" میں درج کیا ہے۔ اس میں سے صرف مولف (حیدری) کا حال ہم نقل کرتے ہیں:—

"احوال مؤلف۔ اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے کہ دو جز حرف شین سے ی کہ حرف ی تک خدا جانے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پونہچی۔ انشاءاللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سر سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے، اور یہ جلد دو چار جز کی جو کلام و ابیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہ کی وہ دستگیر درماندگاں اور حامی بے کساں ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے بہ حق محمد و آلہ الامجاد۔"

حیدری نے اپنے تذکرہ میں میر شیر علی افسوس کا حال دو سطروں میں لکھا ہے، اور میرزا سودا دہلوی کا ایک سطر میں۔ اس حساب سے بیشک شین سے ی تک دو جز ہوئے ہونگے اور الف سے سین تک بھی دو جز وسے زیادہ کیا ہوں گے۔ گویا پورا تذکرہ چار پانچ جزو کا ہوا۔ حالانکہ لطف کا تذکرہ باوجود پبلشر کی قطع و برید کے دو سو صفحوں پر طبع ہوا ہے۔ البتہ حیدری کی عبارت سادہ و سلیس ہے اور لطف کی مقفیٰ اور پیچدار (جیسا کہ آگے نمونہ سے معلوم ہوگا)۔

(۸) **طوطا کہانی**۔ حیدری کی شہرت ان کی دس تالیفات میں سے دو کتابوں کے سبب سے ہے، جن میں سے ایک "طوطا کہانی" ہے اس کے متعلق خود حیدری کا بیان ہے:—

"بموجب فرمائش صاحب موصوف (یعنی گل کرسٹ) کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین نخشبی ہے۔ زبان ہندی میں موافق محاورے اردوے معلّی کے عبارت سلیس و خوب الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا

طوطی کہانی رکھا۔"

ہم نے طوطی نامہ اور اس کے تراجم کا ذکر اسی تاریخ اُردو کے صفحہ ۴۲ و ۴۳ پر متن و حاشیہ میں کر دیا ہے۔ حیدری کی طوطا کہانی ۱۸۰۱ء ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی اور ۱۸۰۴ء میں شائع ہو کر کالج کے نصاب میں شامل کی گئی۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی اور بار بار مختلف مطابع میں چھپی۔ ۱۸۵۳ء میں ڈنکن فاربس نے لندن سے اس کا نہایت خوبصورت ایڈیشن شایع کیا۔ جی اسمال نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ باسینۂ پُرسوز چشم گریاں آہیں بھرتی ہوئی طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی اے سبز پوش طوطے میں عشق کے غم سے موئی جاتی ہوں اور تو ہر ایک شب میری نصیحت اور گفتگو میں کھو دیتا ہے۔ فرد

نصیحت کی باتیں نہ مجھ کو سُنا — میں عاشق ہوں، مجھ کو نصیحت سے کیا

طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہے۔ دوستوں کی بات ماننا چاہئے، کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا ہے اور پشیمانی کھینچتی ہے۔"

(۹) **آرایش محفل**، حیدری کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ داستان حاتم طائی کی سات سیروں کا فسانہ ہے۔ اِس لئے عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرۂ "سخن شعرا" میں حیدری کی اس کتاب کا نام ہفت سیر حاتم لکھا ہے۔ حیدری نے ۱۸۰۲ء ۱۲۱۶ھ میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمایش کے مطابق فارسی کی داستان کو اُردو میں لکھا۔ محض ترجمہ نہیں کیا بلکہ کمی و بیشی کر کے نئی اور زیادہ دلچسپ بنا دی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

"........ زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی ترجمہ نثر میں کیا، اور اس کا نام آرایش محفل رکھا، مگر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں جہاں موقع اور مناسب پایا وہاں زیادتیاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آئے۔"

اسی نام سے ایک کتاب میر شیر علی افسوس نے لکھی ہے۔ وہ بالکل الگ چیز ہے، اور حیدری کی کتاب کے کئی سال بعد ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس زمانے کے

لوگوں کی یہ عجیب عادت ہے کہ کسی مشہور کتاب کے نام پر اپنی کتاب کا نام رکھ دیتے ہیں، خواہ کتنا ہی ناموزوں، بے محل اور بے ضرورت ہو۔ محمد عوض زریں نے تحسین کی کتاب نوطرز مرصع کا نام لے لیا، لطف و حیدری دونوں نے اپنے تذکروں کا نام گلشن ہند ہی رکھا، خواہ کسی نے کسی سے لیا ہو۔ افسوس نے بھی حیدری والا نام آرایش محفل ہی پسند کیا۔ حالانکہ افسوس کی کتاب "مملکت ہندوستان کی تاریخ" ہے۔ "آرایش محفل" کا نام تاریخ سے زیادہ قصہ کہانی کے لئے موزوں تھا۔ زریں کی عبارت میں سجع و ترصیع نہیں ہے، پھر اس کو "نوطرز مرصع" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔[۵] گلشن ہند کا لفظ تذکرہ شعراء کا مترادف یا مُشعر نہیں ہے کہ خواہ مخواہ یہی نام ذہن میں آئے یا موزوں معلوم ہو۔

حیدری کی آرایش محفل نہایت دلچسپ، خوبصورت، سلیس روزمرہ میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے بہت مقبول ہوئی اور کثرت سے شائع ہوئی۔ نمونہ یہ ہے:-

"چند روز بعد جب وہ لڑکی شعوردار ہوئی تو اپنے ذہن کی رسائی اور نیک بختی کے باعث سے دائی سے کہا کہ اے مادر مہربان، دنیا مانند حباب ہے، اس کا مٹنا کچھ بڑی بات نہیں، اس قدر دولت تنہا لیکر میں کیا کروں گی مصلحت یہی ہے کہ اس کو خدا کی راہ میں لٹا دوں اور آپ کو آلایش دنیاوی سے پاک رکھوں اور شادی نہ کروں، بلکہ یاد خدا میں مصروف رہوں، اس واسطے تم سے پوچھتی ہوں کہ اس سے کس طرح چھٹکارا پاؤں، جو مناسب جانو کہو۔ دائی نے کہا، اے جان پدر تو ان سات سوالوں کا اشتہار لکھ کر دروازے پر چپکا دے اور یہ کہہ کر جو کوئی میرے ساتوں سوال پورے کرے گا۔ میں اس کو قبول کروں گی اور وہ سوال یہ ہیں، پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے جو ایکبار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال

---

[۵] اگر مولانا عبدالحق دہلوی کے قیاس کے مطابق محمد عوض زریں نے خود اپنی کتاب کا یہ نام نہ رکھا بلکہ مطبع نولکشور والوں نے کتاب چھاپتے وقت نوطرز مرصع نام تجویز کر دیا ہو تو اہل مطبع بھی اسی زمانے کے لوگ ہیں۔ اور ہمارے اعتراض کی زد میں ہیں۔ قادری

تیسرا سوال یہ ہے کہ کسی سے بدی نہ کر، اگر کرے گا تو وہی پاوے گا۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ کوہ ندا کی خبر لاوے۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ وہ موتی جو مرغابی کے انڈے کی برابر بالفعل موجود ہے۔ اس کی جوڑی پیدا کرے۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ حمام بادگرد کی خبر لاوے۔ حسن بانو نے دائی کی اس بات کو پسند کیا اور خوش ہوکر دل میں کہا وہ ایسا کون ہے جو ان ساتوں کو بہم پہنچائے گا۔"

(۱۰) **گل مغفرت**، زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے حیدری کی کتابوں میں آخری کتاب ہے۔ اور فورٹ ولیم کالج کے لئے نہیں لکھی گئی۔ ملا حسین واعظ کاشفی (مصنف انوار سہیلی و اخلاق محسنی و تفسیر حسینی) کی تصنیف روضتہ الشہدا نہایت مشہور اور اپنے موضوع کی بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں شہدائے اسلام اور خصوصاً شہدائے کربلا کے حالات ہیں۔ جن کو دس ابواب میں لکھا ہے اس کو دہ مجلس بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب سے اردو میں مختلف ترجمے اور تالیفیں ہوئی ہیں۔ اور وہ بھی اکثر دہ مجلس کے نام سے مشہور ہوئی ہیں۔ فضلی کی کربل کتھا بھی کاشفی کی کتاب سے ماخوذ ہے، اور وہ بھی دہ مجلس کہلائی جاتی ہے۔ حیدری کی گل مغفرت میں بھی روضتہ الشہدا سے شہدائے کربلا کے حالات لئے گئے ہیں۔ جیسا کہ خود حیدری کہتے ہیں:۔

"صاحبان درد و غم و مبتلایان رنج و الم پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری کی کتاب گلشن شہیداں ہے جس کو پہلے روضتہ الشہدا سے زبان ریختہ میں ترجمہ کر چکا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب گل گلزار معانی شمع بزم نکتہ دانی، بحر سیادت و امانت، سرو جویبار گلشن شرافت و نجابت، مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری زاد الطافہ کے ارشاد کرنے سے جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچ مداں کو ایک رسوخ دلی و نیاز باطنی ہے۔ اس نسخہ دہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا گل مغفرت رکھا اس لئے ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے، مقبول خاطر ہووے۔ بحق محمد و آلہ الامجاد۔"

گل مغفرت ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں لکھی گئی۔ اور اسی سال کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ۱۸۴۵ء میں کسی فرانسیسی نے فرنچ زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا تھا۔ گل مغفرت اب کہیں نہیں ملتی۔ مولف ارباب نثر اردو کو ایک نسخہ مطبوعہ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء ملا ہے اور انھوں نے اس کا اقتباس درج کیا ہے۔ ہم بھی اس کو اس خیال سے نقل کرتے ہیں کہ اس کتاب کا اتنا نمونہ بھی اور کہیں دستیاب نہ ہوا۔

"کتاب ایوان الرضا میں یوں لکھا ہے کہ اے اہل بیت رسالت کے ہوا خواہو، وائے آل عبا کے ماتم دارو، ماہ محرم میں گریہ وزاری کرو۔ خوشی و خرمی کو دل میں راہ نہ دو، حق تعالی اس رونے اور غم کرنے کا اجر عظیم دے گا۔ بہشت بریں سا مکان عطا فرمائے گا۔ کہتے ہیں کہ عمرو بن لیث خراساں کے بادشاہ کا ہمیشہ سے یہ معمول دستور تھا کہ جب کوئی امیر نئو سوار کمل و مسلح اپنے ساتھ لاکر موجودات دیتا، ایک گرز طلائی سے سرفراز ہوتا۔ ایک دن اس کے لشکر کی نظر ثانی ہوئی۔ ایک سو چوبیس سردار صاحب گرز شناسے گئے عمرو بن لیث اس فوج کو دیکھ کر یہاں تک رویا کہ غش کھا گیا۔ جب ہوش میں آیا، ایک وزیر نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا، اے بادشاہ تجھے کیا ہو گیا، ایسا کیا حادثہ تجھ پر پڑا؟ اس نے کہا کہ اے وزیر نیک تدبیر، یہ فوج دریا موج دیکھ کر میں نے جناب امام حسین علیہ السلام کو یاد کیا، اور جی میں یہ گزرا کہ اگر اس لشکر فتح پیکر سے جناب سید الشہداؓ کے ساتھ کربلا معلی میں ہوتا تو ان کا فروں بد نہادوں کو مارتا، آپ کے ساتھ فتح و نصرت سے پھرتا۔ حاصل کلام، وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مرگیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اسے خواب میں دیکھا کہ ایک تاج مرصع سر پر دھرے خلعت شاہانہ پہنے کا رچوبی پٹکا کمر میں باندھے ہوئے، حور و غلماں اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک اسپ خوش خرام پر سوار ہے اور بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ پوچھا۔ اس نے کہا کہ اے شخص، پہلے میں غضب الٰہی میں گرفتار ہوا تھا، بعد اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم و الم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے کے صدقہ سے بخشا گیا۔ یقین ہے کہ جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہو گا۔ اور آپ کے

رنج والم کو یاد کر کے روئے گا۔ یہ گریہ و زاری حشر کے دن اس کے کام آوے گی موجب نجات کا ہوگا۔"

حیدری کا طرز تحریر بھی سادہ ہے۔ مقفّٰی عبارت نہیں، لیکن عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں، محاورے کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔ میر امّن چھوٹے جملے، ہندی کے الفاظ، روزمرّہ و محاورہ اس طرح برتتے ہیں کہ ان کی عبارت نہایت دلکش ہو جاتی ہے۔ میر شیر علی افسوس حیدری سے بھی زیادہ عربی و فارسی الفاظ لکھتے ہیں۔ (جیسا کہ افسوس کے نمونوں سے معلوم ہوگا)۔

میر شیر علی افسوس ان کے والد کا نام سیّد علی مظفر خاں ہے۔ آبا و اجداد ہندوستان آئے اور قصبہ نارنول (صوبہ آگرہ) میں سکونت اختیار کی۔ افسوس کے دادا محمد شاہ بادشاہ کے زمانے (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء) میں دہلی آئے۔ یہیں افسوس پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد نواب عمدۃ الملک کے ملازم تھے۔ ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء میں عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ افسوس کے چچا سید غلام علی خاں الہ آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ محمد شاہ کے بعد سلطنت کا نظام ابتر ہو گیا اور غلام علی خاں نے بھی وفات پائی۔ تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے اور میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغہ توپ خانہ ہو گئے۔ میر قاسم کے بعد اس کے بیٹے میر جعفر کے ہاں ۱۷۶۰ء تک ملازم رہے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے اور نواب شجاع الدولہ بادشاہ اودھ کے ہاں تین سو روپیہ پر ملازم ہو گئے۔ افسوس بنگال میں باپ کے ساتھ تھے اور لڑکپن کا زمانہ تھا۔ گیارہ برس کا سن تھا۔ اسی وقت سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ لکھنؤ آئے تو یہاں میر و سودا، جرأت و انشا کی سخن سنجیوں کی دھوم تھی۔ افسوس نے بھی شاعری کی مشق کی اور اساتذہ سے داد سخن لی۔ میر حیدر علی حیران دہلوی کے شاگرد تھے۔ شہزادہ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ (ولی عہد سلطنت مغلیہ) اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھے۔ انھوں نے افسوس کا کلام پسند کیا اور اپنا مصاحب و شاعر بنا لیا۔ شہزادہ کے لکھنؤ سے واپس دہلی جانے کے بعد بھی افسوس لکھنؤ میں رہے۔ سرفراز الدولہ ان کی سرپرستی

کرتے لے ۔ جب فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت ہوئی تو سرفراز الدولہ نے لکھنؤ کے رزیڈنٹ کرنل اسکاٹ سے افسوس کی سفارش کر کے کلکتہ بھجوا دیا ۔ وہاں ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء میں پہنچے ۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھ لیا ۔ ۱۸۰۹ء میں افسوس نے انتقال کیا ۔

باغ اردو ، افسوس نے فورٹ ولیم پہنچکر پہلی کتاب "باغ اردو" مرتب کی ۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"لیکن تعلق میرا جو مدرسہ ہندی (یعنی فورٹ ولیم کالج) سے ہوا ۔ بنا بر اس کے بسا اوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت والا فطنت مدرس ہندی مسٹر گل کرائسٹ صاحب دام ثروتہ کے ، کہ جامع قوانین اس زبان کے ہیں ، حاضر ہونے لگا ۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر ، میں نے دیکھا کیا کہ عبارت اس کی صاف و بباطن پیچیدہ ہے ۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور ابتدا میں قوت تالیف اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی ۔ مصرع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

... بارے فضل ایزدی اور لطف سرمدی سے تمام کتاب زبان اردو میں لکھی اور وہ مقبول خاص و عام ہوئی ، نام اس کا باغ اردو رکھا ، چنانچہ اس کی شروع کی تاریخ بھی اسی میں نکلتی ہے ۔ قطعہ

میں تاریخ اس کی جو چاہا رکھوں نام   کھوں دل کھول با آئین نیسکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا   کہ ہے آغاز اردو کی ~~باغ اردو~~

۱۲۱۴
۱
۱۲۱۵

کتاب کے خاتمہ پر لکھتے ہیں :-

سن ہجری بارہ سے سولہ (۱۲۱۶ھ) اور عیسوی اٹھارہ سے دو (۱۸۰۲ء) میں ترجمہ کرمسمی بہ باغ اردو ہے تمام ہوا ۔

قطعہ

عون توفیق رب سبحاں سے   ترجمہ یہ کیا تمام میں جب
ختم کی اس کے پیر عقل سے کی   میں نے تاریخ عیسوی جو طلب

ابتدائے بہار سے یہ کہا "باغ اردو ہوئی گلستاں اب[۵]"

۱۷۹۹
۲
۱۸۰۱

افسوس نے باغ اردو کے دیباچہ میں جو حمد و نعت لکھی ہے اس کی عبارت رنگین و مقفّٰی ہے، لکھتے ہیں:۔

"طنازگی گلستانِ سخن کی، حمد باغبانِ حقیقی کی ہے کہ اس نے بوستانِ عالم کو طرح طرح

---

۵ اس مصرعِ تاریخ میں ۱۷۹۹ء نکلتے ہیں اور لفظ بہار کی ابتدا ب کے دو عدد بڑھانے سے ۱۸۰۱ء ہوتے ہیں۔ حالانکہ قطعہ سے اوپر افسوس نے سن ہجری و عیسوی دونوں لفظوں میں لکھے ہیں۔ اور ختم کتاب کا سال ۱۸۰۲ء بتایا ہے۔ اس لئے تطابق مشکل ہوگیا۔ اسی طرح کی الجھن افسوس کے کلکتہ جانے کے زمانے کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ سیر المصنفین میں افسوس کے پہلے دیباچہ کی جو عبارت نقل کی گئی ہے۔ اس میں یہ فقرہ ہے "ستائیسویں تاریخ روز جمعہ کو دہی سترھویں ماہ اکتوبر کی تھی سن ہجری بارہ سے پندرہ تھے اور ۱۸۰۱ء کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوا بھیجا اور کلام میرا سنا، پھر الطاف نوازش سے فرمایا کہ تو سرکار کمپنی بہادر دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا، بدل جمعی تمام کلکتہ کو روانہ ہو کہ صاحب عالی شان دام ظلہم زبان اردو کا محاورہ اور صحت دریافت کیا چاہتے ہیں، بنا بر اس کے تجھے طلب کیا ہے" حالانکہ سیر المصنفین کے مولف نے اس سے اوپر افسوس کے حالات میں لکھا ہے کہ "آپ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے" ارباب نثر اردو میں غالباً افسوس کے اس بیان کی بنا پر لکھا ہے کہ "اس موقع پر حسن رضا خاں نے اکتوبر ۱۸۰۱ء میں کرنل اسکاٹ سے افسوس کا تعارف کرایا" اب دشواری یہ ہے کہ اکتوبر ۱۸۰۱ء سنہ ۱۲۱۶ھ میں واقع ہوتا ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ ۱۲۱۶ہجری آغاز محرم سے آخر ذی الحجہ تک ۱۴ مئی ۱۸۰۱ء تا ۳ مئی ۱۸۰۲ء کے مطابق ہے۔ اس لئے افسوس کے کلکتہ پہنچنے کا عیسوی سن (۱۸۰۱) غلط معلوم ہوتا ہے۔ ہجری سن (۱۲۱۵) صحیح ہے۔ اس ہجری سال میں اکتوبر ۱۸۰۰ء واقع ہوگا۔ لہٰذا ۱۸۰۰ء ۱۲۱۵ھ میں افسوس کلکتہ گئے۔ اسی سال باغ اردو لکھنی شروع کی۔ اور اگلے سال ۱۸۰۱ء ۱۲۱۶ھ میں تمام کی۔ اس طرح آغاز کتاب کی تاریخ ۱۲۱۵ھ اور اختتام کتاب کی تاریخ ۱۸۰۱ء درست ہو جائے گی۔ قادری۔

درختوں سے آرائش دی، اور رنگ برنگ کے پھولوں سے زینت بخشی، اور اس کے
ابر رحمت کی بارش سے ہر ایک گل تر و تازہ، نسیم فیض سے اس کے ہر ایک درخت
ہرا بھرا، ہر گل کی زبان وا ہے اس کے ذکر میں، جو غنچہ سر بجیب ہے اسی کے فکر میں
قمری اسی کے طوق بندگی میں اسیر، تدرو اسی کے بند عشق سے پابہ زنجیر...."

لیکن اس کے بعد اسی دیباچہ میں جو اپنا حال اور باغ اردو کے ترجمہ کا ذکر لکھا ہے، جس کا اقتباس اوپر درج کیا گیا، اس کی عبارت سادہ ہے۔ تاہم حیدر بخش حیدری کے مقابلے میں زیادہ، اور میر امّن کے مقابلے میں بہت زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ، اضافتیں بندشیں افسوس کے قلم سے نکلتی ہیں۔ لفظوں کی تقدیم و تاخیر اوروں سے زیادہ نہیں ہے۔

گلستان سعدی کا ترجمہ افسوس نے اکثر لفظی کیا ہے، اور لفظی ترجمہ کی کوشش میں کہیں کہیں اپنی بول چال اور روزمرہ سے بھی ہٹ گئے ہیں۔ بعض مقامات پر گلستاں ہی کے الفاظ بجنسہ اپنے ترجمہ میں اختیار کر لئے ہیں۔ حالانکہ ان کا بدل سہل تر الفاظ سے ممکن تھا۔ مثلاً ایک ترجمہ یہ ہے:۔

"ایک بزرگ سے طینت صاحبان صفا کی پوچھی، کہا، ان سے ادنیٰ فعل ان کا مقدم رکھنا ہے یاروں کے دل کی مراد کو اپنے مقصدوں پر، اور حکیموں نے کہا ہے۔ وہ بھائی کہ اپنے ہی بند و بست میں رہے، نہ وہ بھائی ہے اپنا۔"

لیکن یہ دانشمندی کی ہے کہ سعدی کے وہ مقولے اور مصرع جو ضرب المثل بن گئے ہیں، بجنسہ لے لئے ہیں۔ مثلاً

ہر کسے را کہ پارسا بینی،		پارسا دان و مرد نیک انگار
ور ندانی کہ در نہانش چیست		محتسب را درون خانہ چہ کار
جس کو ظاہر میں متقی دیکھے	(ترجمہ)	اس کے تقوے کا تو نہ کر انکار
کھوج مت کر کسی کے باطن کی		محتسب را درون خانہ چہ کار

باغ اردو میں ایک حکایت کا ترجمہ یہ ہے:۔

حکایت۔ کہتے ہیں کہ نوشیرواں عادل کے واسطے شکار گاہ میں ایک شکار کے کباب بھوننے تھے۔ نمک موجود نہ تھا۔ لوگوں نے زمیندار پاس آدمی بھیجا کہ نمک لے آوے۔ نوشیرواں بولا کہ نمک قیمت دیکر بھیجو تاکہ رسم نہ بگڑ جاوے اور

گائوں خراب نہ ہو۔ لوگ بولے اے بادشاہ اتنی سی بات سے کیا خلل پیدا ہوگا۔
نوشیرواں نے کہا، اولاً ظلم کی بنیاد تھوڑی سی تھی، جو آیا اسپر بڑھاتا گیا، حتیٰ کہ اس درجہ کو پہنچ گئی۔ **بیت**

یہیں رہتا ہے ظالم بدشعار ــــ سدا اسپہ لعنت رہے پائدار

قطعہ

جو کھاوے شاہ رعیت کے باغ سے اک سیب ــــ غلام اسکے درختوں کو ڈالیں جڑ سے اکھاڑ
جو آدھے انڈے پہ سلطان ستم روا رکھے ــــ سپاہی سیخ پہ بھونیں ہزار مرغ پچھاڑ

افسوس کی دوسری کتاب آرایش محفل ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ کتاب حیدری کی کتاب کی ہمنام ہے، لیکن ہم مضمون نہیں۔ یہ آرایش محفل ہندوستان کی تاریخ ہے، اور اردو لٹریچر میں پہلی چیز ہے۔ فورٹ ولیم میں بھی اکثر کتابیں قصہ، اخلاق، تذکرہ، صرف و نحو، لغت وغیرہ موضوعات پر لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئیں وہ اب مفقود ہیں۔ مثلاً حیدری کی تاریخ نادری اور حسینی کی تاریخ آسام۔ اس کے بعد ایک کتاب ولا کی تاریخ شیر شاہی البتہ قلمی موجود ہے۔

۱۶۹۵ء ۱۱۰۷ھ میں منشی سبحان رائے ساکن پٹیالہ نے فارسی میں عہد ہنود و عہد اسلام کی مکمل تاریخ لکھی تھی۔ جس میں اس زمانے کی تمام موجودہ تواریخ سے مدد لی تھی اور ان سب کا خلاصہ کر دیا تھا۔ اسی لئے اس کا نام خلاصۃ التواریخ رکھا تھا۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کے فورٹ ولیم سے جانے کے بعد افسوس نے ۱۸۰۴ء ۱۲۱۹ھ میں مسٹر جے، ایچ ہارنگٹن کی فرمائش سے اس فارسی تاریخ کا ترجمہ شروع کیا اور ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں عہد ہنود کی تاریخ تمام کر کے آرایش محفل نام رکھا۔ جو ۱۸۰۸ء ۱۲۲۳ھ میں شائع ہوئی، اور انگریزوں کے امتحان اردو کے نصاب تعلیم میں شامل کی گئی۔ اس کے بعد کلکتہ، لکھنؤ، لاہور کے مطابع سے چند بار شائع ہوئی۔ میجر ہنری کورٹ نے پوری کتاب کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ جان شیکسپیر نے اس کے دس باب کا انگریزی ترجمہ کر کے اپنی کتاب منتخبات ہندی میں شامل کیا۔

آرایش محفل کی عبارت مقفیٰ ہے، لیکن قافیہ پیمائی سے روانی و بے تکلفی میں

فرق نہیں آیا۔ نمونہ یہ ہے :-

"جب سے یہ مرکز خاکی آرام گاہ حیوانات ہوا، سیکڑوں لاکھوں شہر قصبے بسے اور بستے جاتے ہیں، کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ، لیکن ہندوستان کی سرزمین کا عالم سب سے نرالا ہے، کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہنچتی، اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی، یہاں کی ہر ایک بستی میں جھاگھم، جابجا ایک نئی طرح کا عالم، ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ پختہ متعدد سرائیں، مسافر کے واسطے ہر قسم کے اوڑھنے بچھونے اور اقسام کی نعمتیں، اکثر بیسیوں مسجدیں خانقاہیں، مدرسے، باغات، غریبوں بے کسوں مسافروں کے لئے متعدد مکانات، قلعے بڑے بڑے مضبوط وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں گاؤں ان میں بسیں اور رفعت میں اس قدر کہ بادل ان کے نیچے برسیں، ندی نالے تالاب کوئیں لطیف و پاکیزہ ہزارہا، پانی ان میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا بھرا ہوا، بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں نواڑے بجرے وغیرہ بے شمار، شاہ راہ کے ندی نالوں پر بیشتر مقاموں پر پل بندھے ہوئے تیار، اکثر راستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دو طرفہ قطار، ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار، ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں مہیا۔ سودے والوں کی دکانیں جابجا، مسافر خوش و خرم کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے جاتے ہیں اور شام کو منزل پر بھی سب طرح آرام پاتے ہیں۔

جہاں دیکھئے تیر ہی خیر ہے　　سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے"

افسوس نے ان دو کتابوں کے علاوہ کوئی نثر کی کتاب تالیف نہیں کی۔ اپنا دیوان البتہ مرتب کیا۔ فورٹ ولیم کے لئے مرزا سودا دہلوی کے دیوان کا افسوس نے انتخاب کیا۔ جس میں سودا کے قصائد و غزلیات، مثنوی و مرثیہ کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ افسوس نے میر بہادر علی حسینی کی کتاب نثر بے نظیر کی نظر ثانی کی، اور نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کی تصحیح کی۔

میرزا علی لطف یہ بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں ہیں، لیکن صرف ایک کتاب "تذکرہ گلشن ہند" لکھی ہے، معلوم ہوتا ہے وہاں

مستقل ملازم نہ تھے۔ تھوڑے دنوں رہے۔ میرزا علی نام تھا، لطف تخلص، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآبادی ۱۱۵۴ھ ۱۷۴۱ء میں نادر شاہ کے ساتھ دہلی آئے۔ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ (نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے دادا) کے ذریعہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے دربار سے تعلق ہوا۔ ہجری تخلص کرتے تھے، فارسی کے شاعر تھے۔ میرزا علی لطف فارسی میں باپ کے شاگرد تھے۔ دہلی میں پرورش ہوئی، یہیں تعلیم پائی اور فارسی و اردو دونوں میں شاعری شروع کی۔ مختلف تذکروں میں لطف کو میر تقی اور مرزا سودا کا شاگرد بتایا ہے، لیکن لطف اس تذکرہ میں اپنے حال میں لکھتے ہیں کہ "مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے"۔

دہلی کی تباہی کے بعد میرزا لطف باہر نکلے، اور حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا، اوّل لکھنؤ پہنچے۔ وہاں استادوں کا مجمع تھا۔ شہزادہ مرزا جواں بخت لکھنؤ میں مقیم تھے اور شعرا کے قدردان تھے۔ انھوں نے لطف کا کلام بھی سنا اور پسند کیا۔ لیکن لطف کو اساتذۂ سخن کے مقابلے میں اپنے نباہ کی صورت لکھنؤ میں نظر نہ آئی۔ پٹنہ پہنچے، وہاں سے کلکتہ کی سیر کر کے دکن کا قصد تھا کہ ڈاکٹر گل کرائسٹ سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے لطف سے یہ تذکرہ لکھنے کی فرمایش کی۔ لطف نے دیباچہ میں اسی تذکرہ کا ماخذ اور تالیف کا حال اور زمانۂ تالیف بیان کیا ہے۔ ہم درمیان میں سے کچھ حذف کر کے لطف ہی کے بیان کو مسلسل کیے دیتے ہیں۔ یہی نمونہ کتاب کا کام دے گا۔ لکھتے ہیں:۔

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعراے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے۔ ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی (۱۷۸۴ء) میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سرحلقہ بزم نکتہ دانی، رونق افزاے محفل معانی، سخن کی جان، اور سخندانوں کے قدردان، صاحب والامناقب مسٹر گل کرائسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا، از بسکہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا

تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو، اور ہر ایک
شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کے مرغوب ہو، مبتدی
اس سے بڑا مزہ پائیں گے، اور نومشق کیفیت بہت اٹھائیں گے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی، میرزا علی کو کہ لطف تخلص کرتا ہے، نہایت
محبت اور اخلاق سے فرمایا کہ تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرے
کو اپنی طرز پر لکھیں، اگرچہ یہ پابند الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدر آباد کی سیر کا
رکھتا تھا، لیکن اس خلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت
اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ
جان سے حاضر ہوں، اور ایک سرمو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔......

الحمد للہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک
مطابق عیسوی کے ہیں...... موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام
نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا، اور
نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے گلشن ہند رکھا۔"

یہ طرز تحریر دیباچہ سے مخصوص نہیں ہے، تمام تذکرہ کی عبارت اسی نمونہ کی ہے
یہی قافیہ پیمائی یہی خیال آرائی جا بجا عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں ہیں۔ مقفیٰ
عبارت کے شوق میں تعقید کی بھی پروا نہیں کی۔ مثلاً میر تقی میر کے حال میں لکھتے ہیں:-

" ناقدر دانی سے اغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ
کاسد ہے، اور ہوائے شہرستان معنی طراز اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر
کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے
مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی
آج ہے۔"

حیراں کا حال اس طرح شروع کرتے ہیں:-

"حیراں تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہاں آباد کے، شاگرد رائے سرب سنگھ

دیوانہ تخلص استاد کے۔"

دوسرے فقرے پر مولانا شبلی نے نوٹ لکھا ہے، تعقید کی شکایت کرتے ہیں:۔"اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے، اور جو استاد فن ہیں، حیرانؔ ان کے شاگرد ہیں۔"

لطفؔ اس تذکرہ کی ترتیب کے بعد حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں اعظم الامرا ارسطو جاہ مدار المہام تھے۔ انھوں نے قدر دانی کی اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ لطفؔ کے دو بھائی اور بھی ان کے ساتھ تھے اور شہر میں سوز خوانی کیا کرتے تھے۔ لطفؔ نے ۱۸۲۲ء / ۱۲۳۸ھ میں وہیں انتقال کیا۔

تذکرہ گلشن ہند نایاب و ناپید تھا۔ اتفاق سے ۱۹۰۲ء / ۱۳۲۰ھ میں حیدر آباد کی موسیٰ ندی میں عظیم الشان سیلاب آیا، صدہا گھر ویران ہو گئے اور اسباب بہہ گیا۔ اسی میں یہ تذکرہ کسی کے ہاتھ آ گیا۔ مولانا شبلی حیدر آباد میں تھے، ان کو دکھایا، انھوں نے بہت پسند کیا، اور خود اس پر تشریحی حواشی لکھے۔ مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے مفصل عالمانہ مقدمہ لکھا۔ ۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اب دوبارہ انجمن نے اپنی طرف سے گلشن ہند اور اس کے ماخذ و اصل گلزار ابراہیم دونوں کو یک جا شائع کر دیا ہے۔

میر بہادر علی حسینی

ان کے والد کا نام سید عبد اللہ کاظم ہے۔ دہلی میں قیام تھا، حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اردو ترجمہ قرآن مجید حسینی کے والد کے اہتمام سے پہلی مرتبہ دہلی میں چھپا تھا۔ میر امنؔ حسینی کے خاص دوست تھے۔ حسینی پہلے فورٹ ولیم کالج میں پہنچ گئے تھے، اور وہاں میر منشی تھے۔ انھی کی سفارش سے میر امنؔ کا تقرر ہوا تھا۔

حسینی نے چار کتابیں مرتب کیں:۔

(۱) نثر بے نظیر۔ اس کا سبب تالیف اور طرز تحریر خود حسینی بیان کرتے ہیں:۔

"قصہ بے نظیر و بدر منیر کہ نظم میں تصنیف کیا ہوا شاعر بے ہمتا، ادا بند یکتا،

رونق بزم سخن، میر حسن مرحوم متخلص بہ حسن، سعید ازلی خلف الرشید میر غلام حسین ضاحک دہلوی کا تھا، فی الواقع ہر ایک مصرع اس کا فصاحت و بلاغت میں بے نظیر ہے اور ہر ایک شعر حسن و خوبی میں مثل بدر منیر۔ جو سخندان منصف مزاج عاشق پیشہ ہیں، وہی اس کی طرز بخوبی پہچانتے ہیں۔ مقابل اس کے نظم کس سے ہو سکے، بلکہ کوئی موزوں کر پا تو سکے؟ قاصر ہے زبان اس کی توصیف میں، ہر کہ و مہ مشغول ہے اس کی تعریف میں۔ اب اس کو عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور ریاست امیر سراپا تدبیر...... مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کے، حکم سے صاحب خداوند نعمت...... جان گل کرائسٹ صاحب بہادر دام حشمتہ کے، عاصی میر بہادر علی حسینی نے نثر نزع قصہ سے موافق محاورہ خاص کے نثر میں لکھا ہے۔ پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرز سہل واسطے صاحبان نو آموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستان شیریں کو (کہ فی الحقیقت قصہ شیریں سے شیریں تر ہے) اس روپ سے نثر کروں کہ ہر ایک زبان دان و شاعر اس کو سن کر عش عش کرے، اور اس ہیچمداں کی ایک یادگار اس دنیا میں رہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس تالیف کا یہ دیباچہ ہے اس سے پہلے کالج کے نو آموز انگریزوں ("صاحبان نو آموز") کے واسطے "اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بطرز سہل" تحریر کر چکے تھے۔ پھر دوبارہ یہ تالیف کی جو اس وقت زیر نظر ہے۔

حسینی کی یہ نثر اصل مثنوی کے سامنے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی، لیکن حسینی نے اس کو دلچسپ بنانے کی یہ تدبیر کی ہے کہ اپنی نثر کے درمیان میں موقع بموقع مثنوی کے اشعار لکھ دیے ہیں۔ مثنوی میر حسن فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شامل تھی، ڈاکٹر گل کرائسٹ نے نثر بے نظیر کو بھی مثنوی کے ساتھ چھپوا دیا۔ دوسری طباعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے اس پر نظر ثانی کی۔ متعدد بار مختلف مطابع سے شائع ہوئی۔ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ۱۸۷۱ء میں ایم۔ اتنی کورٹ نے شائع کیا۔ اب

اس کے نسخے نہیں ملتے۔ مولف ارباب نثر اُردو کو بڑی سعی و تلاش کے بعد ایک نسخہ حاصل ہوا ہے "یہ کالج پریس کا مطبوعہ ۱۸۰۶ء ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۵۲ صفحات پر مشتمل اور ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔" اس میں سے "داستان سواری کی تیاری" کا نمونہ درج کیا جاتا ہے :۔

"جب گیارہ برس خیریت سے گزرے، بارہواں برس آیا، الحمد للہ جس دن کی آرزو تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں چاروں طرف مچ گئی، مبارکبادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔ نظم

پڑی جب گرہ بارہویں سال کی کھلی گلجھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے عرض بیگی کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کہ میں شہزادے کو لیکر سوار ہوں گا، تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہو، اور بستی ان کے دل کی بھی آباد، تم نقیبوں کو تقیدٌ کرو گھر گھر یہ حکم پہنچا دیں اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتادیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگمگاتا ہو۔ خبردار ایک سوار میلا اور ایک گھوڑے کا زین پُرانا نظر نہ آوے۔ ایسا نہ کسی کو اس وقت اگر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ ابد دولت کی مرضی اور خوشی اسی میں ہے۔ نظم

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند سواری کا ہو نور جس سے دوچند

اتنے میں شام پڑی، آفتاب والشمس پڑھ کے سجدۂ شکر میں گیا، مہتاب سورہ نور پڑھتا ہوا نکلا، حضرت محل میں تشریف لے گئے۔ تمام رات ناچ راگ رہا، مارے خوشی کے محل میں کوئی نہ سویا۔ نظم

عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید عجب روز تھا مثل روز امید

القصہ رات آخر ہوئی، چاند نے بالیں استراحت پر اپنا سر رکھا، اور سورج بڑی چمک سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ نظم

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

(۲) **اخلاقِ ہندی**۔ یہ بہادر علی حسینی کی دوسری کتاب ہے، اور پہلی سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ اخلاقی کہانیاں پہلے سنسکرت میں لکھی گئی تھیں۔ سنسکرت سے اس کے دو ترجمے فارسی میں ہوئے، نگارِ دانش اور مفرح القلوب۔ مفرح القلوب کا سبب تالیف حسینی نے اخلاقِ ہندی کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے:-

"یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے جس کی تخت گاہ صوبۂ بہار تھی، پہنچی، جب انھوں نے جو سُنا، اس میں قصے ازبسکہ دلچسپ ہیں اور نصیحت میں نہایت مرغوب اور باتیں خوب، اور حکایتیں اکثر مفید، تب اپنے ملازموں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو تو میں اپنے مطالعہ میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں، تب ان میں سے ایک شخص (مفتی تاج الدین) حکم بجا لایا، اور نام اس کا مفرح القلوب رکھا۔"

اس مفرح القلوب کا حسینی نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں ترجمہ کیا اور اخلاقِ ہندی نام رکھا۔ ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی ایڈیشن نکلے۔ اس کی عبارت سادہ و سلیس ہے، لیکن کوئی خاص دلکشی نہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

"سانپ ہر روز دو تین مینڈک کھانے لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا، اکیلا بادشاہ رہا۔ سانپ نے پوچھا اے بادشاہ آج میں کیا کھاؤں، مجھے بھوک لگی ہے۔ مینڈک نے کہا اے سانپ کسی جھیل کے کنارے چل کر اپنا پیٹ بھرئے۔ تب اُس نے کہا تمھارے لشکر نے میرے پیٹ میں چھاؤنی کی ہے، بادشاہ کا لشکر سے جدا رہنا خوب نہیں، اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اسی چھاؤنی میں داخل ہوں تو بہتر ہے۔ تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپ ہو رہا۔ سانپ نے اپنے شہوار کو زمین پر پٹک کر کوڑے دم کے مارے اور کھا گیا، جیسا کہ کسو شاعر نے کہا ہے۔ فرد

گردنِ بندگی نت خم ہے در فرماں پر	گو سے سر اپنا فدا کیوں نہ کرے چوگاں پر

(۳) **تاریخ آسام** - شہاب الدین طالش ابن ولی محمد نے فارسی میں تاریخ آسام لکھی تھی۔ جس میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے سپہ سالار میر جملہ کی مہم آسام (۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء) کا حال لکھا تھا۔ میر بہادر علی حسینی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ منشی کریم الدین نے اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں ذکر کیا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں ختم ہوا۔ اور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ لیکن حسینی کا ترجمہ نایاب ہے۔

(۴) **رسالہ گل کرسٹ** - حسینی کی یہ چوتھی تالیف ہے۔ جو اصل میں حسینی کے دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ ڈاکٹر گل کرائسٹ کی مفصل کتاب صرف و نحو ہندوستانی کا خلاصہ ہے۔ اصل کتاب ضخیم تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے انگریز طالب علموں کو امتحان کے لئے اس سے تیار کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ اس لئے حسینی نے اسکو مختصر کر دیا۔ یہ رسالہ ۱۸۱۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۶۲ء میں چھپا لیکن زیادہ اشاعت نہیں ہوئی۔ اور اب کمیاب ہے۔

مظہر علی خاں وِلا دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام مرزا لطف علی تھا۔ لیکن مظہر علیخاں کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد سلیمان علی خاں وداد فارسی کے شاعر تھے، اور دادا محمد حسین علی قلی خاں کے خطاب سے مشہور تھے۔ مظہر علی خاں وِلا فارسی، سنسکرت، ہندی کے اچھے عالم تھے، شاعری میں ممنون، مصحفی اور طپش سے مشورہ کیا ہے لیکن وِلا کا دیوان مفقود ہے۔ بعض تذکروں میں دو ایک شعر ملتے ہیں۔ وِلا نے ۱۸۰۲ء سے ۱۸۰۵ء تک فورٹ ولیم کالج میں چند کتابیں لکھیں۔ ان کے ہم عمر و ہم پیشہ منشی بینی نراین جہاں نے اپنے تذکرۂ شعرا دیوان جہاں میں جو ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں مرتب ہوا ہے، ان کو بقید حیات اور کلکتہ میں مقیم بتایا ہے۔ اس سے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہوتے۔

وِلاؔ کی تالیفات یہ ہیں۔(۱) مادھونل اور کام کندلا۔ (۲) ترجمہ کریما۔ (۳) ہفت گلشن۔ (۴) تالیق ہندی۔ (۵) بیتال پچیسی۔ (۶) تاریخ شیر شاہی۔ ان میں سے شیخ سعدی کے کریما کا ترجمہ نظم میں ہے۔ اس لئے اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔ اس داستان تاریخ اردو کے حصّہ نظم میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور تالیق ہندی فارسی کی کتاب ہے۔ اس کا تذکرہ بھی ترک کیا جاتا ہے۔

(۱) مادھونل اور کام کندلا۔ قدیم ہندی زبان کے قصّہ (مصنفہ موتی رام کبیشر) کا اُردو ترجمہ ہے۔ وِلاؔ نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء میں مرتب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے انتخاب بیاض ہندی میں اس کا ایک حصہ چھاپا تھا۔ پوری کتاب نہیں چھپی۔ صرف برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ دریافت ہوا ہے۔ ارباب نثر اردو سے معلوم ہوا کہ وِلاؔ نے اس کتاب کے آخر میں دو قطعہ تاریخ لکھے ہیں۔ ایک سے ہجری سال ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے، دوسرے سے ۱۸۰۲ء نکلتا ہے[۵]۔ اسی تذکرہ سے وِلاؔ کی کتاب کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

---

[۵] یہ دونوں سال ہجری و عیسوی باہم مطابق نہیں ہیں۔ اس لئے ہجری سال آغاز تالیف کا ہوگا، اور عیسوی اختتام کا۔ اسی طرح اس سے اوپر تذکرہ "دیوان جہاں" کے جو سال ترتیب درج کئے گئے ہیں۔ وہ "ارباب نثر اردو" میں ۱۸۱۴ء مطابق ۱۲۲۷ھ بتائے گئے تھے۔ ان میں سے بھی کسی سال کا کوئی حصّہ دوسرے سال میں واقع نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم نے سال عیسوی کو درست مان کر سال ہجری بجائے ۱۲۲۷ھ کے ۱۲۲۹ھ کر دیا ہے۔ اسی طرح کے عدم مطابقت کا ذکر میر شیر علی افسوس کے ذکر میں حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ یہ عدم تطابق کا مسئلہ نہایت عجیب ہے۔ قدیم مصنفین اپنے زمانے کے ہجری و عیسوی سن لکھنے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ یقیناً ناقلانِ کتب کی بے پروائی سے یا بعد کے مولفینِ تذکرہ و تاریخ کی بے احتیاطی سے یا مطابع کی غلطیوں سے ہم تک پہنچتے پہنچتے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت مطابقت ہجری و عیسوی کی دو فہرستیں ہیں (ان دونوں سے بھی مذکورہ کی مطابقت نہیں ہوتی) ایک[۱] موجودہ زمانے کی مطبوعہ ایران ہے۔ دوسری[۲] سر سید احمد خاں نے اپنی تالیف "تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام" حصّہ اوّل مطبوعہ ۱۸۶۲ء کے آخر میں

"بلند بلند مکانوں کے بالا خانوں کا عالم دیکھ کر آسمان زمین کا عالم تہ و بالا، نئے نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پر سنہری کلسیوں کے چمکنے سے عجیب اُجالا، صاحب علم و ہنر، نیک افعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے۔ وہ یہ پادشاہی نگری مشہور تھی، اور راجہ گوبند چند دانش و بخشش میں یکتا، نیک افعال، خجستہ خصال، مہر سے معمور، علم و حیا سے مشہور، صورت و سیرت میں خوب، خلق طالب وہ مطلوب، دوست اس کے لطف سے شاد، دشمن اس کے قہر سے برباد، جابجا اس کی دھاک، غرض وہاں راج راجہ اندر کی طرح کرتا تھا۔"

(بقیہ صفحہ ۱۱۱) درج کی ہے۔ سر سید نے اپنی فہرست میں ۱۵۸۲ء کے بعد سے مطابقت کی دو[۲] جدولیں قائم کی ہیں: (۱) بموجب نئے حساب کے، اور (۲) بموجب قدیم حساب کے۔ ایرانی فہرست اس قدیم حساب کے مطابق ہے۔ قدیم و جدید حساب میں گیارہ دن کا فرق ہے۔ مثلاً یکم محرم ۹۹۰ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۵۸۲ء تھی تو یکم محرم ۹۹۱ھ مطابق ۱۵ جنوری ۱۵۸۳ء ہونی چاہئے، لیکن اسکو ۲۶ جنوری ۱۵۸۳ء کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ یعنی گیارہ دن چھوڑ دیے گئے۔ اس انقلاب تقویم کی تاریخ یہ ہے:۔

تاریخ ترمیم تقویم۔ ۱۵۸۲ء میں پوپ گریگری نے مشہور ہیئت داں کلیوس کے مشورہ سے حکم دیا کہ ۴ اکتوبر ۱۵۸۲ء کو ۱۵ اکتوبر مانا جائے۔ اور صدی کے وہ سال سال کبیسہ مانے جائیں جو ۴۰۰ پر پورے تقسیم ہو جائیں۔ یہ ترمیم تمام کیتھولک ممالک میں اختیار کر لی گئی۔ لیکن کلیسائے یونان اور اکثر پروٹسٹنٹ اقوام نے پوپ کے تعمیل حکم سے انکار کیا۔ پھر تقریباً دو صدی بعد ۱۷۵۱ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے اس ترمیم کو تسلیم کیا اور حکم جاری کر دیا کہ ۳ ستمبر ۱۷۵۲ء کو ۱۴ ستمبر مانا جائے۔ یعنی گیارہ دن چھوڑ دیے جائیں اور آئندہ یہی حساب جاری رہے۔ یہ حساب قدیم کہلاتا ہے۔ ہر چوتھے سال کو، جو چار پر پورا تقسیم ہو جائے، سال کبیسہ ماننا اور اس کے ایک مہینہ (فروری) میں ایک دن کا اضافہ کرنا، ۴۵ قبل مسیح میں جولیس سیزر نے جاری کیا تھا۔ ان سالہائے کبیسہ میں سے ایسے سال کو خارج رکھنا جو ۴۰۰ پر تقسیم نہ ہوں (مثلاً ۱۷۰۰۔ ۱۸۰۰۔ ۱۹۰۰) گریگری کی ترمیم تھی۔

(۲) ہفت گلشن۔ ناصر علی خاں واسطی بلگرامی نے کوئی اخلاقی کتاب فارسی میں تصنیف کی تھی، اس کا مظہر علی وِلاؔ نے یہ اُردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمایش سے ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۲ء میں مرتب ہوئی۔ اس میں اخلاقی مضامین کی جابجا حکایتوں سے دلچسپ و موثر بنایا ہے۔ اس کا بھی قلمی نسخہ برٹش میوزیم ہی میں پایا جاتا ہے۔ اور ہم اس کا نمونہ بھی ارباب نثر اُردو ہی سے درج کرتے ہیں:۔

"حکایت چوتھی مرغی اور مور کی ہے کہ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی اور ہر طرف دانہ چگنے لگی کہ ناگاہ ایک سوراخ پاس انڈے کتنے ایک مار سیاہ کے پائے، تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے ان انڈوں کو اکٹھا کر کے اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی........"

(۳) بیتال پچیسی۔ یہ اصل میں سنسکرت زبان کی کتاب تھی، اس میں بیتال نامی ایک شخص کی کہی ہوئی ۲۵ کہانیاں ہیں۔ محمد شاہ کے زمانے میں اس کا ترجمہ "برج بھاشا" میں ہوا۔ اس ترجمہ سے وِلاؔ نے ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۳ء میں اردو ترجمہ مرتب کیا۔ اس کی تیاری میں فورٹ ولیم کے ایک اور منشی للّو لال جی نے وِلاؔ کو مدد دی۔ بیتال پچیسی کلکتہ میں اور ہندوستان کے مختلف مطابع میں متعدد بار چھپی اور مقبول ہوئی۔ اس میں جابجا برج بھاشا کے الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:۔

"اسی عرصہ میں کسو راجہ کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لئے ہوئے اسی تالاب کے دوسرے کنارے پر اشنان کرنے آئی، سو اشنان دھیان پوجا کر سہیلیوں کو ساتھ لے درختوں کی چھاؤں میں ٹہلنے لگی۔ اُدھر دیوان کا بیٹا بیٹھا، اور راجہ کا بیٹا پھرتا تھا کہ اچانک اس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں۔ دیکھتے ہی اس کے روپ کو راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا، اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اسے چنڈال کام دیو مجھ کو کیوں ستاتا ہے۔ اور اس راج پتری نے اس کنور کو دیکھ سر میں جو کنول کا پھول پوجا کر کے رکھا تھا وہی پھول ہاتھ میں لے، کان سے لگا، دانت سے کتر، پاؤں تلے دیا، پھر اُٹھا چھاتی سے لگا لیا، اور سہیلیوں کو ساتھ لے، سوار ہو، اپنے مکان کو

گئی، اور یہ راج پتر نہایت نراس ہو بہ رہ میں ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اس کے آگے حقیقت کہنے لگا۔"

(۴) تاریخ شیر شاہی۔ اکبر بادشاہ کے حکم سے عباس خاں شروانی نے شیر شاہ سوری بادشاہ دہلی کے عہد کی تاریخ فارسی میں لکھی تھی۔ اس کو ولا نے کپتان جیمس موئٹ کے حکم سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں ترجمہ ختم ہوا لیکن کہیں شائع نہیں ہوا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۵ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا تھا۔ ولا کا ترجمہ قلمی صورت میں انڈیا آفس لندن میں ہے۔ ارباب نثر اردو سے اس کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے:-

"اس نے کہا اپنے بھائی میرداد کو شیر خاں کے پاس بھیجے تا وہ اس سے یہ قرارداد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط سے کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بدبخت نے اپنے باپ کو مارا ہے اس کی ناک اور کان کاٹے تا اوروں کو کان ہوں۔ جب میرداد شیر خاں کے پاس گیا، اس سے بہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ لاڈ ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی نوع کی مخالفت نہ کروں گا، اور جہانداری کی رسم بخوبی بجا لایا، کوئی فرو گذاشت نہ کی اور اس کے آنے سے نہایت خوش ہوا۔ محبت و اخلاص حد سے زیادہ کیا، اور کہا کہ اگر لاڈ ملکہ میرے تیں قلعہ دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہوں گا۔ مرغ دل کا شکار کرنا احسان سے خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے۔"

(۵) جہانگیر نامہ۔ ولا کی اس تالیف کا حال بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ تزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ مظہر علی خاں ولا نے کیا تھا۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

مرزا کاظم علی جواں دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ کے رزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر

گل کرائسٹ کی فرمایش سے سکنتلا ڈراما کا ترجمہ کیا۔ یہ ڈراما کالیداس نے سنسکرت میں لکھا تھا، اس کو نواز کبیشر نے برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ اس ہندی کے ترجمے سے جوان نے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے دیباچہ میں یہ حال لکھا ہے:۔

"دوسرے ہی دن انھوں نے (ڈاکٹر گل کرائسٹ نے) نہایت مہربانی دالطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکونتولا کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر، اور للولال جی کب کو حکم کیا کہ بلاناغہ لکھا کرے، اگرچہ کبھی سو انظم کے نثر کی مشق نہ تھی، لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سُنا پسند کیا اور اچھا کہا، بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر تفاقات سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ ۱۸۰۱ء ہے اور راقم قرآن شریف کے ہندی ترجمہ کا محاورہ درست کرتا ہے، صاحب ممدوح نے فرمایا ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو چھپوا دیں، نظر ثانی لازم ہے اور اس کب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو نہ رہے، چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجا لائے۔

پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا۔"

اس کے بعد یہ کتاب لندن، بمبئی اور لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی۔ نواز کبیشر نے یہ قصہ کبت اور دُھروں میں لکھا تھا۔ کاظم علی نے نثر میں لکھا اور موقع موقع پر ہندی اشعار کی جگہ اپنے اردو کے شعر لکھ دیئے۔ اگرچہ شاعری کے اعتبار سے ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے، تاہم ایک لطف پیدا ہوگیا ہے۔ ہندی کے الفاظ بھی جا بجا استعمال کئے ہیں، اور وہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ عبارت مقفّیٰ لکھی ہے لیکن صاف وسلیس ہے۔ اس لئے لطف کی تحریر کی طرح بے لطف نہیں ہے۔ ارباب نثر اردو سے اس کا مختصر نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

غرض اس تپسوی کا یہی حال تھا، آٹھویں پہر تپ جپ کا خیال تھا، چونسٹھ برس تک وہ بیابان نورد تھا، سر سے لگا کر پاؤں تک گرد گرد تھا، بناس پتی کھاتا رہتا بھوک پیاس کی ایذائیں سہتا اور رو بہ آفتاب ہوکر

گرمیوں میں وہ جگر تفتہ جلا کر گرد آگ　　　بیٹھا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر

اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں ہو کر کھڑا جپ کیا کرتا تھا شوق دل سے ہر شام و سحر

ایسی باتیں سُن کر راجہ اندر کو بہت سوچ پڑا، ڈر دل میں ہوا۔ اس کے اس جوگ کو توڑنے کے لئے منوکا پری کو بلا کر بہت سی آؤ بھگت کی، اور یہ احوال ظاہر کیا۔ وہ راجہ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی اور اس مطلب کے سُنتے ہی یوں بولی کہ میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا سایہ برہما بشنو مہادیو پر پڑے دیوانے ہو جاویں۔

جو وے ہو دیں وحشی تو کر لوں میں رام مری یاد میں بھولیں سب اپنے کام

لیے ایسی ہیں جادو بھری انکھڑیاں رہے دیکھ کر ان کو سُدھ بُدھ کہاں

یہ احوال جب ایسے لوگوں کا ہو رکھوں پاک دامن میں کب اور کو

دسوامتر کو ایک پل میں اپنے پر دیوانہ کر لوں، تمام عمر کو قشقہ کی جا کہ یہ کلنک کا ٹیکا ماتھے پر دھروں ....

وہ ایک ایسا ستارہ تھی کہ تمام عالم کو جس نے روشن کر دیا، تس پر سولہ سنگار بارہ ابھرن جو اس نے سر سے پاؤں تلک کئے دن کو سورج اس کا جلوہ دیکھ کر رشک کی آگ سے جلا، اور رات کو چاند غیرت سے داغ ہو کر ستاروں کے انگاروں پر لوٹا۔"

کاظم علی جواں کی یہ شکنتلا اردو میں پہلا ناٹک یا ڈراما ہے۔ یہ صنف ادب بھی لٹریچر کا ضروری جزو ہے۔ اور اس کے آغاز کا بھی اسی کالج کے سر سہرا ہے۔

شکنتلا ناٹک کے علاوہ جواں نے ایک طویل نظم بارہ ماسہ یا "دستور ہند" لکھی جس میں ہندو مسلمانوں کے تہواروں کی تفصیل بیان کی۔ اور تاریخ فرشتہ کے ایک حصہ کا بھی اردو میں ترجمہ کیا، لیکن یہ دونوں کتابیں اب ناپید ہیں۔
ان تصانیف کے علاوہ جواں نے للّولال جی کو سنگھاسن بتیسی لکھنے میں مدد دی، قرآن مجید کے اردو ترجمہ کو درست کیا اور شعرا کے کلیات کے انتخاب میں اعانت کی۔ مولوی حفیظ الدین کی کتاب خرد افروز کی ۱۸۱۵ء میں نظر ثانی کی۔

مولوی امانت اللہ شیدا ان کا وطن، حالات، سنین ولادت و وفات وغیرہ بالکل نامعلوم ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کے اچھے عالم تھے۔ کالج میں کام کرنے سے پہلے بطور خود انھوں نے فقہ اسلام کے متعلق ایک ضخیم کتاب عربی زبان میں ہدایت الاسلام کے نام سے لکھی تھی۔ پھر اس کے فائدے کو عام اور وسیع کرنے کے خیال سے اسی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور وہی نام رکھا۔ پہلی جلد ترجمہ کرکے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے پیش کی۔ ڈاکٹر پر ان کے فضل و کمال کا بڑا اثر ہوا، اور ان کو عربی و فارسی کی مشکل کتابوں کے ترجمہ کے لئے ملازم رکھ لیا۔ ان کی تالیفات یہ ہیں:۔

(۱) اردو ترجمہ ہدایت الاسلام دو جلدوں میں۔ (۲) اردو ترجمہ اخلاق جلالی۔ (۳) اردو ترجمہ قرآن مجید۔ (۴) صرف اردو منظوم۔

(۱) **ہدایت الاسلام** کی پہلی جلد ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئی اور ڈاکٹر گل کرائسٹ نے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا۔ نمونہ یہ ہے:۔

"فصل کعبے کے درمیان نماز پڑھنے میں۔ فرض کی یا نفل کی نماز کعبہ کے اندر صحیح ہے اگرچہ مقتدی کا منہ امام کے منہ کی طرف ہو، اور جو مقتدی کی پیٹھ اس کے منہ کی طرف ہو تو نماز اس کی صحیح نہیں ہوتی ہے۔ اور کعبہ کے اوپر مکروہ ہے۔ اور کعبہ کے چاروں طرف اقتدا کرنا گو بعضے مقتدی امام کی نسبت سے اس کی طرف نزدیک ہوں صحیح ہے، پر امام جس جانب میں ہے اگر مقتدی اسی طرف کو امام کی نسبت سے کعبہ کی طرف نزدیک ہو تو اس کی نماز درست نہیں کیونکہ اس تقدیر میں وہ امام کے آگے ہو جاوے گا، اور مقتدی کو اس کے آگے کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔"

(۲) **ترجمہ قرآن مجید**۔ ہدایت الاسلام کی دوسری جلد کا ترجمہ ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر گل کرائسٹ کے حکم کے مطابق میر بہادر علی حسینی کے ساتھ مل کر قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا۔ لیکن اسی دوران میں ڈاکٹر صاحب بسبب علالت پنشن لیکر ۱۸۰۴ء میں ولایت چلے گئے۔ ان کے بعد کپتان جیمس مونٹ مقرر ہوئے

انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ موقوف کرا دیا۔ اور جتنا ترجمہ مرتب ہوا تھا اس کو بھی شائع کرنا گوارا نہ کیا۔ لیکن بعد کو کسی نے مولوی امانت اللہ کا مترجم حصہ شائع کر دیا۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"اور نہیں کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں مگر خدا ہی پر ہے اس کی روزی، اور جانتا ہے وہ اس کے ٹھراؤ کو اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو۔ سب کچھ روشن کتاب میں ہے۔ اور وہی تو وہ خدا ہے۔ جس نے بناڈالا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں، اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ آزمائے ہمیں کہ کون ہے تم میں سے بہتر چال چلن کی راہ سے۔ اور اگر کہتا ہے تو کہ ضرور تم اٹھائے جاؤ گے مرنے کے بعد تو کہنے لگتے ہیں وہ لوگ کہ جو کافر ہوگئے کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو" (بارھویں پارہ کا شروع)

(۳) **جامع الاخلاق**۔ یعنی اُردو ترجمہ اخلاق جلالی کپتان جیمس مونٹ کی فرمایش سے مرتب کیا۔ خاتمۂ کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"جولائی کی بیسویں دوشنبہ کے دن ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ کے بہت محنت و جانفشانی اور فضل یزدانی کی مدد اور صاحبان عالی شان کے اقبال کی برکت سے اس ہیچداں نے کتاب لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی کے ترجمہ سے فراغت کی ولیکن داناؤں کے نزدیک پوشیدہ نہ رہے کہ اس کے لآلی مطالب کو جو فارسی عبارت کے صدف میں پنہاں تھے غواص طبیعت نے دریائے فکر میں کس کس طرح سے غوطے مار کر نکالا اور ان آبدار موتیوں کو رشتۂ تحریر میں پرو کر ریختہ زبان کے اُردو بازار میں لا حاضر کیا۔"

مولوی امانت اللہ کا نام اسی ترجمہ کے سبب سے مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اخلاق جلالی جیسی علمی مشکل اور ضخیم کتاب کا ترجمہ کر لینا ہی ایک کارنامہ تھا، لیکن حقیقت میں مولوی امانت اللہ کا ترجمہ کوئی بڑا کارنامہ ثابت نہ ہوسکا۔ انھوں نے لفظی ترجمہ کا اہتمام کیا ہے اور بہت سے عربی و فارسی الفاظ بے ضرورت بجنسہ

رہنے دیئے ہیں۔ عبارت میں سلاست نہیں رہی، اکثر تعقید اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے، مثلاً

"لیکن بہ مقتضائے اس کے کہ معانی اس کے اسرار حکمت پر مشتمل اور احکام مصلحت کو شامل تھے، بہ تشبیہ اس خیال سے کہ شاہد متناسب الاعضا اور عروس خود زیبا کو کیا پرنیاں اور کیا دیبا، ہر لباس میں ہے وہ خوشنما، اس کی زلف مطالب کی عقدہ کشائی ناخن فکر کو تیز کر کے عقل حکمت شناس کی مشاطگی سے آراستہ کیا۔"

لیکن اس سے صاف وسلیس عبارت بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"عدالت پہلے شخص اور اس کے خصائل سے علاقہ رکھتی ہے جیسے اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، پھر اس کے شریکوں کے ساتھ اہل خانہ یا شہر کے رہنے والوں میں سے ہوں، اس واسطے پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ہر ایک تم میں سے اپنے اعضائے جسمانی اور قوائے نفسانی کا نگہبان ہے، وہ قیامت میں پوچھا جائے گا ان کے احوال سے، اور جب فرمایا کہ عادل لوگ منبر کے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے نور کی شمالی میں۔ صحابیوں نے پوچھا، وے کون آدمی ہیں، فرمایا وے جو پہلے اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں عدالت کریں، پھر ان کے حق میں جو ان کے ملک میں اور ان کے تابع فرمان رہیں۔"

جامع الاخلاق کالج کی طرف سے شائع نہ کی گئی۔ مدت تک مسودہ کی صورت میں رہی۔ پھر کہیں طبع ہونے کی نوبت آئی۔ لوہے کے نستعلیق ٹائپ میں چھپی ہے۔ شائع کرنے والا لکھتا ہے کہ "اب ۱۲۶۴ھ ہجری میں موافق ۱۸۴۸ء کے ..... خادم الطلبا، احقر غلام حیدر ساکن ہوگلی نے اس ترجمے کو کلکتے کے بیچ مطبع احمدی میں چھاپا تاکہ طالب علموں کو اس سے فائدہ پونہچے اور عاصی کو ثواب ملے۔" اس فقرہ کے بعد غلام حیدر نے کتاب کی تعریف میں ایک قطعہ بہت خوبصورت لکھا ہے:۔

قطعہ

ہر ایک حکایت ہے حدیث لب شیریں — ہر ایک ورق اسکا نقاب رُخ لیلٰی
گر خوان پہ تحسین کے سخن کی ہو مدارات — مہماں ہو یہ ادیب ہوں سب اسکے طفیلی

(۴) **صرف اردو منظوم**۔ مولوی امانت اللہ نے صرفِ اردو کے قواعد مثنوی کی صورت نظم کئے ہیں۔ اس کا نمونہ اس تاریخ کے حصہ نظم میں دکھایا جائے گا۔

شیخ حفیظ الدین ان کے اسلاف خاندان عرب سے دکن آئے، اور پھر دکن سے بنگال چلے گئے۔ جب کلکتہ میں وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ایک مدرسہ (جس کو نیٹو کالج کہتے تھے) قائم کیا، تو اس میں شیخ حفیظ الدین احمد کے والد شیخ بلال الدین مدرس مقرر ہوئے۔ شیخ حفیظ الدین نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ پھر فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ان کو مدرس مقرر کرلیا۔ اور ڈاکٹر صاحب ہی کی فرمائش سے تصنیف و ترجمہ کا کام بھی کیا۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ریزیڈنٹ دہلی کے میر منشی ہوگئے۔ ان کے علمی کارنامے یہ ہیں:-

خرد افروز۔ شیخ ابوالفضل علامی کی کتاب عیارِ دانش کا اُردو ترجمہ کیا۔ یہ وہی کلیلہ دمنہ کی داستان ہے جس کا شمار دنیا کے مشہور فسانوں میں ہے۔ اصل میں سنسکرت زبان میں تصنیف ہوا تھا۔ ہندوستان سے ایران پہنچا۔ قدیم فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا، فارسی سے عربی میں لکھا گیا۔ اسی کا بہترین پیرایہ انوار سہیلی ہے جس سے ملا حسین واعظ کاشفی کا نام روشن ہے۔ اسی کو ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے مرتب کیا، لیکن علامی کی تالیف کاشفی کا چربہ نہیں ہے۔ دونوں میں اختلاف ہے۔ اردو میں یہ قصہ پہلی مرتبہ حفیظ الدین نے عیار دانش سے لکھا ہے۔ ان کے بعد اوروں نے بھی اُردو میں لکھا۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک کم سے کم سات مختلف لوگوں کے اُردو قصوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے جان بہاری لال راضی کا فسانہ ارژنگ راضی منظوم ہے۔ جو ۱۸۸۵ء میں

شائع ہوا ہے۔ اور سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویا کا بستان حکمت ہے جو ۱۸۳۵ء ۱۲۵۱ھ میں مرتب ہوا۔ (اس کا ذکر و نمونہ آگے درج کیا جائے گا)۔

حفیظ الدین احمد نے اپنے والد کی مدد سے عیار دانش کا ترجمہ کر کے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے اس کے طرزِ بیان کو بہت پسند کیا۔ عبارت صاف و سادہ ہے۔ اگرچہ میر امّن کی سی شگفتگی نہیں ہے۔ لیکن با قاعدہ و بامحاورہ نثر ہے، تکلفات سے خالی ہے اور فورٹ ولیم کالج کے اکثر مصنفین سے بہتر ہے۔ اس لئے مترجم اور کالج دونوں کی طرف سے اُردو زبان کی قابلِ قدر خدمت ہے۔ اسی لئے بہت مقبول ہوئی۔

خرد افروز کالج کی طرف سے ۱۸۰۵ء میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد ۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین کی ترکِ ملازمت کے بعد، کپتان ٹامس روبک نے میر کاظم علی جواں وغیرہ سے نظرِ ثانی کرانے کے بعد شائع کی۔ پھر ۱۸۵۷ء میں انگلستان سے اس کا نہایت عمدہ ایڈیشن نکلا۔ انگریزی میں بھی خرد افروز کا پورا ترجمہ شائع ہوا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"چاروں دوست ایک دل خوشی سے منزل طے کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ حال رہتے تھے۔ دور دراز منزل کو طے کر کے شہر نسطور میں پہنچے اور شہر کے ایک کنارے اچھی جگہ اترے، کسی کے پاس کچھ خرچ کو نہ رہا تھا۔ ان یاروں میں سے ایک نے کہا، اب وقت ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا ہنر دکھلاوے اور زورِ بازو سے کچھ بہم پہنچاوے، تو چین سے چند روز اس شہر میں رہیں۔ بادشاہ زادے نے کہا، سب کام خدا کی تقدیر پر موقوف ہیں، آدمی کی کوشش سے سرانجام نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ دانا ہیں اس کی تلاش میں نہیں دوڑتے۔ خوبصورت نوجوان نے کہا، حُسن دولت کے حاصل کرنے میں بڑا ایک وسیلہ ہے، جہاں اس کی نمود ہو دولت تابع ہو گی۔ سوداگر بچہ نے بھی حال اپنا ظاہر کر کے کہا کہ حُسن کی پونجی معاملہ کے بازار میں ایک متاعِ

بے بہا ہے اور تھوڑے سے عرصہ میں اس سے کچھ منفعت نہیں ہوتی ہے۔ رائے صواب و تدبیر درست اور کارروائی و معاملہ فہمی کا فائدہ سب چیزوں سے زیادہ ہے جو بے ساماں اس کو اختیار کرے جلد اپنے مطلب کو پونہچے۔ دہقاں بچے نے کہا کہ معاملہ فہمی و کاروائی سب وقت کام نہیں آتی۔ اکثر میں نے دانا کو حیران اور نادان کو کامیاب دیکھا ہے۔ بہت سے کسب اور کوششیں ہیں جو آدمی کو کامیاب مقصود بناتی ہیں۔ اور ہنر و حرفہ عقلمند کے سامان و دولت کا وسیلہ ہوتا ہے۔"

خلیل علیخاں اشک | ان کے ذاتی حالات دریافت نہیں ہوئے۔ ۱۸۰۱ء ۱۲۱۵ھ میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے داستان امیر حمزہ اردو میں لکھی۔ اس کے متعلق اشک کا بیان یہ ہے:۔

"مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک داستان حضور میں سُناتے تھے۔ انعام و اکرام پاتے تھے۔ اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ بارہ سو پندرہ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علیخاں نے جو متخلص بہ اشک ہے حسب خواہش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنابر آموزان زبان ہندی اس قصہ کو اردوے معلٰی میں لکھا تاکہ صاحبان مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہووے۔"

خلیل علی خاں کے بعد داستان امیر حمزہ کو منشی نول کشور نے حافظ سید عبداللہ بلگرامی سے مرتب کراکے شائع کیا۔ پھر مطبع نول کشور کے مشہور مصنّف و مصحح سید تصدق حسین نے اس کو اپنے طرز پر لکھا۔ اس زمانے میں فسانہ عجائب کی بڑی دھوم تھی اور اس کی رنگین عبارت آرائی نہایت مقبول تھی۔ سید تصدق حسین نے قصہ امیر حمزہ کو شاعرانہ

صنعت گری کا عجائب خانہ بنا دیا، اور اپنے نزدیک فسانہ عجائب کا جواب لکھ دیا۔ اس کے مقابلے میں خلیل علی خاں کا طرز بیان سادہ وسلیس ہے۔ انھوں نے بھی کہیں کہیں رنگین ومقفّیٰ فقرے لکھے ہیں اور خیال آرائی کی ہے۔ لیکن اس قدر نہیں کہ ناظرین پر بار گزرے۔ صنائع واستعارات وتشبیہات بھی معتدل ہیں۔ فارسی ترکیبیں بھی معقول حد تک ہیں۔ خلیل علی خاں نے اگرچہ فارسی زبان کے قصہ سے اپنی داستان مرتب کی ہے۔ لیکن اس میں ہندوستانی رسم درواج اور مناظر کو داخل کر کے ہندوستانی مذاق کے مطابق بنا دیا ہے۔

بعد کے لوگوں نے اسی ایک قصہ کو طول دیکر بڑی ضخیم کتابیں طلسم ہوش ربا، طلسم ہفت پیکر وغیرہ تیار کر دیں۔ سید تصدق حسین اپنی تالیف میں ایک قصہ کو اس طرح شروع کرتے ہیں :۔

"نخل بندان بوستان اخبار، چمن پیرایان گلستان اظہار، تختۂ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ موقع بموقع نصب فرماتے ہیں، صحن شفاف قرطاس کو گل و ریاحین مضامین رنگا رنگ سے یوں رشک تختۂ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیداد تیار رہا نمونہ بہشت شداد نمودار ہوا النقش خوشی سے پھول گیا، فکر دارین بھول گیا۔"

خلیل علی خاں اسی داستان کو اس طرح لکھتے ہیں :۔

یہاں سے دو کلمہ داستان ملک النقش کے ملاحظہ فرمائیے، جبکہ وہ باغ تیار ہوا ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظلِ سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمچہ آش نوش جان فرمائیں کہ باعث عزت ازدیاد خانہ زاد ہے۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

اس کے علاوہ خلیل علی خاں نے کپتان ولیم ٹیلر کی فرمائش سے ابوالفضل کے اکبر نامہ کا ۱۸۰۹ء میں ترجمہ کیا اور واقعات اکبر نام رکھا۔ لیکن شائع نہیں ہوا۔

اکرام علی | ان کے حالات بھی معلوم نہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں رہ کر صرف ایک کتاب اخوان الصفا ہندی لکھی ہے۔ اخوان الصفا کے نام سے بصرہ میں ایک انجمن تھی۔ اس کے ارکین نے متعدد رسالے مختلف علمی مباحث کے متعلق لکھے ہیں۔ یہ "رسائل اخوان الصفا" عربی زبان کی مشہور و مقبول تصنیف ہے۔ ان میں سے پہلے رسالے میں مخلوقات کی فضیلت کے دعوے پر انسان اور حیوانات میں مباحثہ ہے، جنوں کا بادشاہ ان کا حَکَم و منصف ہے۔ آخر میں انسان کا فضل و شرف اس بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جملہ مخلوقات میں صرف انسان خلافت الٰہی کا اہل اور بار امانت کا حامل ہے۔ اس رسالہ کو مولوی اکرام علی نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"جب میں بہ موجب حُسنِ ایما، جناب صاحب نامدار...... خداوند نعمت مسٹر ابراہم لاکٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے اور موافق طلب اخی و استاذی جناب بھائی صاحب مولوی تراب علی صاحب دام ظلہم کے شہر کلکتہ میں آیا، اور رہنموئی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت مورد عنایت و مرحمت ہوا۔ ازبسکہ صاحب موصوف کو کمال پرورش منظور تھی، سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کر لیا۔ بعد چند روز کے باستصواب جناب عالی شان...... مدرس ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہ نے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اُردو میں ترجمہ کر، لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اس کے کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں، قلم انداز کر، صرف خلاصہ مضمون مناظرہ کا ہونا چاہئے۔ راقم نے بموجب فرمانے کے فقط حاصل مطلب کو محاورۂ اُردو میں لکھا، خطبوں کو نکال ڈالا اور اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظرہ سے ان کو علاقہ نہ تھا ترک کیں، مگر بعضے خطبے اور اصطلاحات ہندی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے باقی رکھے۔"

یہ رسالہ ۱۸۱۰ء (۱۲۲۵ھ) میں اکرام علی نے لکھا، ۱۸۱۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اس کے

بعد بمبئی وغیرہ میں چھپا۔ انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

"بادشاہ نے کہا یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم۔ یعنی انسان کو ہم نے نہایت سڈول بنایا ہے۔ اس کا کیا جواب دیتے ہو۔ اُس نے عرض کیا جہاں پناہ، کلام ربانی میں ظاہری معنوں کے سوا بہت سی تاویلیں ہیں کہ بغیر اہل علوم کے کوئی نہیں جانتا، تفسیر اس کی عالموں سے پوچھا چاہئے۔ چنانچہ ایک حکیم دانشمند نے بموجب حکم بادشاہ کے مطلب اس آیت کا یوں ظاہر کیا، جس دن اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا اُس گھڑی، نیک ساعت تھی۔ ستارے اپنے اپنے برج شرف میں جلوہ گر اور ہیولیٰ عناصر کے، واسطے قبول کرنے صورتوں کے آمادہ و مستعد تر تھے، اس لئے صورتیں اچھی، قد سیدھے، ہاتھ پاؤں درست بنے، اور احسن تقویم کے ایک معنی اور بھی اس آیت سے ظاہر ہوتے ہیں، فَعَدَلَکَ فِیْ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو حد اعتدال پر پیدا کیا ہے، نہ بہت لمبا بنایا، نہ چھوٹا۔ بادشاہ نے کہا اس قدر اعتدال اور مناسبت اعضا کی واسطے فضیلت کے کفایت کرتی ہے۔ حیوانوں نے عرض کیا کہ ہمارا بھی یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھی ساتھ اعتدال کے جو مناسب تھا ہر ایک عضو بخشا۔ اس فضیلت میں ہم اور وے برابر ہیں۔ انسان نے جواب دیا کہ تمہارے لیے مناسبت اعضا کی کہاں ہے، صورتیں بنٹ کردہ، ڈربے موقع، ہاتھ پاؤں بھدّے سے، کیونکہ تم میں سے ایک اونٹ ہے۔ ڈیل بڑا، گردن لمبی، دُم چھوٹی۔ اور ہاتھی ہے جس کا ڈیل ڈول بہت بڑا اور بھاری، دو دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے۔ کان چوڑے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔"

ایک اور فصل کا اقتباس یہ ہے:-

"بادشاہ نے کہا جنوں کی قوم میں نیک و بد اور مسلمان و کافر ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانوں میں، جو کہ نیک ہیں وہ اپنے رئیس کی اطاعت و فرماں برداری اس قدر کرتے ہیں کہ آدمیوں سے بھی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ اطاعت و فرماں برداری

جنات کی مثل ستاروں کے ہے۔ آفتاب ان میں بمنزلہ بادشاہ ہے اور سب ستارے بجائے فوج و رعیت کے ہیں۔ چنانچہ مریخ سپہ سالار، مشتری قاضی زحل خزانچی، عطارد وزیر، زہرہ حرم، ماہتاب ولی عہد ہے اور ستارے گویا فوج و رعیت ہیں۔ اس واسطے کہ سب آفتاب کے تابع ہیں، اسی کی حرکت سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ جو ٹھہر رہتا ہے، سب متوقف ہو جاتے ہیں، اپنے معمول و حدسے تجاوز نہیں کرتے۔ یعسوب نے پوچھا کہ ستاروں نے یہ خوبی اطاعت و انتظام کی کہاں سے حاصل کی۔ بادشاہ نے کہا یہ فیض ان کو فرشتوں سے حاصل ہے۔ کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں، اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔"

تمام کتاب میں اس طرح کے مکالمات اور مباحثات نہایت دلچسپ ہیں۔ مختلف مسائل و موضوعات کے متعلق معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ مولوی اکرام علی نے نہایت خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ متروک الفاظ، قدیم محاورے، قواعد زبان سے اختلاف بہت کم ہے۔ تمثیل نگاری کا (جس کو انگریزی میں "ایلیگری" کہتے ہیں) نہایت نادر نمونہ ہے۔ انوار سہیلی پر فسانہ کا رنگ غالب ہے، اخوان الصفا میں علمی شان بھی ہے۔ اور دلچسپی بھی ہر جگہ قائم رہتی ہے۔

نہال چند لاہوری

دہلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے پنجاب چلے گئے، لاہور کو وطن بنا لیا اور لاہوری مشہور ہوئے ایک انگریز کپتان ولورٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے اور ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۳ء ۱۲۱۷ھ میں گل بکاؤلی کا قصہ فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ فارسی میں عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ نہال چند نے مذہب عشق تاریخی نام رکھا۔ کتاب کے آخر میں ہجری و عیسوی تاریخیں نکالی ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

غرض جس طرح سے کیا ان کو شاد ہماری بھی دے یا الٰہی مراد

یہ قصّہ ہوا جب بخوبی تمام　　تو پھر فکر تاریخ تھی صبح و شام
یکایک سُنی میں نے آوازِ غیب　　کہ ہے "مذہب عشق" تاریخ و نام
۱۲۱۷ھ

ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلکِ زباں　　کریں عیسوی سال کو بھی عیاں
تو پھر ہاتف غیب نے دی ندا　　کہ اس "مذہب عشق" میں کوئی آ
۱۲۱۷ھ
کرے "مشرب جام" گر اختیار　　تو راز نہاں اس پہ ہو آشکار
۵۸۶

یعنی مذہب عشق میں مشرب جام کو ملایا جائے تو ۱۸۰۳ء حاصل ہو جائیں گے۔

لالہ نہال چند نے نہایت سلیس، صحیح، بامحاورہ، باقاعدہ زبان لکھی ہے۔ متروک الفاظ اور محاورے سے خال خال ہیں۔ پہلی مرتبہ مذہب عشق ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ اشاعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے نظر ثانی کی۔ اس کے بعد بھی ہندوستان کے مختلف مطابع میں بار بار شائع ہوا۔ اسی قصہ کو پنڈت دیا شنکر نسیم نے نظم کر کے گلزارِ نسیم نام رکھا۔ ۱۸۳۸ء ۱۲۵۴ھ میں یہ مثنوی لکھی گئی۔ اس نظم کی خوبی و لطف نے نہال چند کے قصّہ کی شہرت و مقبولیت کو کم کر دیا۔ مذہب عشق کا نمونہ یہ ہے:-

"اس نے کہا کہ آج تم یہ گٹھے میرے آقا کے باورچی خانہ میں لے چلو، دولت خانہ اس کا نزدیک ہے، اس نے اس ویرانہ میں ایک شہر آباد کیا ہے، واجبی قیمت ملے گی، بلکہ ایسا انعام پاؤ گے کہ پھر کہیں اور لکڑیاں بیچنے نہ جاؤ گے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری تمام عمر اسی کام میں اور اسی بیابان سے لکڑیاں لیجاتے گزری ہے، لیکن آبادی کا یہاں نشان نہ دیکھا نہ سُنا۔ ساعد نے کہا ذرا تم آگے بڑھ کر دیکھو، اگر میرے کہنے کا کچھ اثر ظاہر ہو تو بہتر، نہیں تو تمہارے پھر آنے کا کوئی مانع نہ ہوگا۔ لکڑہارے انعام کے لالچ سے ساعد کے آگے ہو لئے، پھر تھوڑی دُور جا کر سب یکبارگی پکار اُٹھے کہ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم! اے میاں، تم ہمیں آگ میں جھونکنے کو لئے جاتے ہو، چولھے میں جائے انعام اور بھاڑ میں پڑے اکرام،

بس ہمیں معاف کرو، ہم نے بھر پایا۔ ساعد نے کہا یہ شعلۂ آتش نہیں، حویلی کے
جواہرات چمک رہے ہیں۔ تم ہرگز اندیشہ نہ کرو اور میرے ساتھ چلے آؤ۔ وہ اسکے
کہنے سے کچھ اور بھی بڑھے، آگے ساری زمین سونے کی نظر آئی، سب نے اس کی
بات سچی پائی، قدم اُٹھائے بیدھڑک چلے۔"

بینی نراین جہاں لاہور کے رہنے والے تھے، ان کے والد مہاراجہ لکشمی نراین بڑے رئیس تھے۔ ان کے بھائی رائے کھم نراین عالم و شاعر تھے، رند تخلص کرتے تھے۔ بینی نراین گردش روزگار تباہ ہوکر کلکتہ پونہچے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر گل کرائسٹ فورٹ ولیم کالج سے رخصت ہوکر ولایت چلے گئے تھے۔ بینی نراین ایک عرصہ تک کلکتہ میں بیکار اور پریشان رہے پھر حیدر بخش حیدری کے وسیلہ سے کالج میں ملازم ہوئے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں۔
(۱) چار گلشن۔ (۲) دیوان جہاں۔ (۳) ترجمہ تنبیہ الغافلین۔ یہ کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں ان کے مسودے محفوظ ہیں۔ "ارباب نثر اردو" سے ان کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) چار گلشن عشقیہ قصہ ہے۔ بینی نراین نے ۱۸۱۱ء ۱۲۲۵ھ میں یہ قصہ امام بخش صہبائی کو زبانی سُنایا تھا۔ انھوں نے پسند کیا اور لکھنے کی رائے دی۔ ان کے مشورے کے مطابق بینی نراین نے لکھا تھا۔ کلکتہ میں کپتان روبک اور کپتان ٹیلر کے سامنے پیش کیا۔ دونوں نے پسند کیا۔ اور معقول صلہ دیا۔ نمونہ یہ ہے:۔

زمانہ گزشتہ کے نقل بیان کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنے ہاروں نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتۂ بیان میں اس طرح منسلک کیا ہے کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں سے کسی شہر میں ایک بادشاہ جم جاہ، نہایت عالیشان والا دودمان تھا۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے شان و شوکت اور جاہ و حشمت اس کو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانے میں

کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا اور اس کے داب و رعب کے آگے

پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا بیت

فلک مرتبت تھا وہ کیوان شاہ دو مشعل فروز اس کے تھے مہر و ماہ

(۲) **دیوانِ جہاں**۔ یہ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے جو بینی نراین جہاں نے کپتان روبک کی فرمائش سے ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء میں مرتب کیا۔ اس میں ۲۵ا شاعروں کا مختصر حال ہے جن میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کا اور کہیں ذکر نہیں ملتا۔ بینی نراین نے اپنا کلام تقریباً سب کا سب درج کر دیا ہے، گویا یہی تذکرہ "دیوانِ جہاں" بھی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں ہر سال ۲۵ جولائی کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا، جس میں کالج و بیرون کالج کے شعرا شریک ہوتے تھے۔ دیوانِ جہاں میں ایک مشاعرہ کی غزلیں بھی آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ تذکرہ کا نمونہ یہ ہے:۔

"محبت تخلص، نام نواب محبت خاں، نواب حافظ رحمت خاں کے بیٹے۔ بریلی کے رہنے والے۔ اس کمترین پر نہایت مہربانی فرماتے تھے، اور ہفتہ میں ایک بار چہار شنبہ کے دن اس خاکسار کے غریب خانہ میں تشریف لاتے تھے۔"

(۳) **تنبیہ الغافلین**۔ اس نام سے ایک کتاب مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (مترجم قرآن مجید) نے مولوی سید احمد بریلوی کی فرمائش سے فارسی میں لکھی تھی۔ بینی نراین جہاں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جہاں کے مسلمان ہو جانے اور مولوی سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اطلاع کا ذمہ دار فرانسیسی مستشرق پروفیسر گارسن دتاسی ہے۔ اس نے اپنے تذکرہ شعرا میں بھی جہاں کا حال لکھا ہے اور اپنے پانچویں خطبہ (۱۸۵۴ء) میں جہاں کی تصانیف کے سلسلے میں لکھا ہے:۔

"تیسری ایک کتاب "تنبیہ الغافلین" کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک مذہبی کتاب ہے۔ جو فارسی زبان میں مشہور مسلمان مصلح اور فرقۂ وہابی کے بانی سید احمد کی فرمائش سے تالیف ہوئی تھی۔ اس کتاب کے اور ترجمے بھی ہندوستانی زبان میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں فرقۂ وہابی سے تعلق رکھتا تھا، یا کم سے کم مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ وہ اس کتاب

کے دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے جیسے سچ مچ کا مسلمان۔"

خطبات گارسن دتاسی صفحہ ۹ و ۹۱ مطبوعہ انجمن ترقی اردو

تنبیہ الغافلین کے جو ترجمے مطبوعہ ملتے ہیں وہ بینی نراین کے نہیں ہیں، دوسرے مصنفوں کے ہیں۔ ان میں ۲۵ باب ہیں۔ اور بینی نراین کے ترجمہ میں (جو مسودے کی صورت میں انڈیا آفس میں موجود ہے) ۲۰ باب کا ترجمہ ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:-

"بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے، ان میں ایک بڑا دانا تھا، اُس نے اپنے بھائیوں سے کہا اے بھائیو، ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجا لاویں، بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملے گی، تم دونوں ہی بانٹ لیجیو۔ یہ بات سُن کر وہ بہت خوش ہوئے، اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا خدمت ان کی کرنے لگا۔ جب ماں باپ ان کے مر گئے، یہ دونوں بھائی ورثہ ان کا پاکر خوش گذران کرنے لگے، اور بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا اے بھائیو، جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ویسا ہی اب مجھ کو دو، میں اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔ اس کی رنڈی یہ بات سُن کے تضیہ کرنے لگی۔ ایک رات اس بیچارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے کہ فلانی جگہ سو دینار سونے کے گڑے ہیں، تو نکال لے۔ اس نے اعتبار نہ کیا۔ آخر یہی بات تین رات پیہم خواب میں دیکھا کیا، بعد اس کے جو اس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے۔"

للو لال جی گجرات کے برہمن تھے، لیکن اوائل عمر میں شمالی ہند میں آ بسے تھے۔ یہ بھی فورٹ ولیم کالج میں شروع زمانہ ہی میں ملازم ہو گئے تھے۔ اس کالج میں اردو کے ساتھ ہندی کی تصنیف و ترجمہ کا کام بھی جاری کیا گیا تھا۔ ہندی میں سب سے زیادہ کارنامہ للو لال کا ہے، اور ان کے بعد ان کے رفیق کار سدل مسر کا۔ مسر جی نے صرف ایک قصہ ہندی زبان میں لکھا ہے۔ للو لال نے سب سے پہلے پریم ساگر لکھی جو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے ایک اور شخص پنڈت چتر بھوج مسر نے اس کو برج بھاشا

میں لکھا تھا۔ لیکن اس زمانے کی دیگر تصانیف کی طرح اس میں کثرت سے سنسکرت الفاظ، تراکیب، محاورات تھے، گویا برج بھاشا سے زیادہ سنسکرت کی کتاب تھی، اس لئے عام فہم نہ تھی۔ للو لال نے سنسکرت زبان کا عنصر کم کرکے آسان زبان میں ترتیب دی۔ اس کی عبارت مقفّٰی ہے اور جا بجا اشعار بھی حسب موقع ہیں۔ یہ پریم ساگر موجودہ ہندی لٹریچر کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس سے پہلے اس سے زیادہ صاف کھڑی بولی اور عام فہم شمالی ہند کی بھاشا میں کوئی نثر ہندی کی کتاب موجود نہیں ہے۔

۵ ہندی زبان کی تاریخ

اردو اور ہندی دونوں زبانیں ایک ہی پراکرت یعنی "برج بھاشا" کی دو صورتیں ہیں، اور اپنی تقویم و ترقی میں ایک دوسری سے متاثر ہیں، نیز اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ سے ہندی زبان کی موجودہ ادبیات کا آغاز ہوا ہے، اس لئے ادبیاتِ ہندی کی مختصر تاریخ ناظرینِ تاریخِ اُردو کے لئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگی۔ ہندوستان کی تمام زبانیں **انڈو آرین زبان** کی شاخیں ہیں۔ اس زبان کی علمی صورت سنسکرت ہے۔ سنسکرت نہایت مکمل، وسیع، باقاعدہ زبان ہے لیکن صرف علمی و کتابی زبان ہے۔ پہلے بھی سنسکرت کبھی عام بول چال میں داخل نہیں ہوئی۔ عام بول چال کی زبان کو سنسکرت کے مقابلے میں پراکرت کہتے ہیں۔ اکثر صوبے صوبے میں مختلف ہیں۔ کہیں زیادہ فرق ہے کہیں کم۔ ہندوستان کے نصفِ شمالی کی پراکرتوں کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے:—

(۱) راجستھانی، اس میں میواتی، مارواڑی، جیپوری اور مالوی زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے مارواڑی علمی زبان ہے۔ اس حصۂ ملک میں برج بھاشا بھی شاعری کے لئے مستعمل ہے۔ (۲) پچھمی بھاشا اس میں پنجابی، برج بھاشا، قنوجی، بندیلی زبانیں شامل ہیں (۳) پوربی بھاشا اس میں بگھیلی، چھتیسی، گڑھی، بیسواڑی (اجودھیا کی زبان) شامل ہیں۔ ان میں سے اودھ یعنی اجودھیا کی زبان علمی شان رکھتی ہے۔ (۴) بہاری جو بنگالی کی ایک صورت خاص ہے۔

ان بولیوں میں برج بھاشا کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ باوجودیکہ پنجاب، بہار، اودھ راجپوتانہ وغیرہ میں الگ الگ بولیاں موجود تھیں، لیکن شاعری کی زبان کے لئے برج بھاشا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

پریم ساگر کے علاوہ للّو لال نے راج نیتی ہندی میں لکھی، اس میں کہانیوں کے ذریعہ سے اخلاق و حکومت کے آداب بتائے ہیں۔ ایک مجموعہ ہندوستانی لطیفوں کا لطائف ہندی کے نام سے لکھا۔ ایک منظوم فسانہ مادھو بلاس مرتب کیا، سبھا بلاس کے نام سے ہندی کی دلچسپ نظموں کا انتخاب تیار کیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۳۱) سب سے زیادہ موزوں سمجھی گئی تھی۔ اسی برج بھاشا سے آگے چل کر دو صورتیں دو رسم خط میں اردو اور ہندی کے نام سے رائج ہوئیں۔ یہ فرق اور یہ نام مسلمانوں کے تسخیر دہلی کے بعد پیدا ہوا۔ اس سے پہلے برج بھاشا کی علمی و ادبی شان صرف شاعری میں محدود تھی۔ اردو زبان کی ساخت اور رواج سے دو سو برس تک برج بھاشا میں کوئی نثر کی کتاب موجود نہ تھی۔ نظم کا لکھنا اس قدر آسان اور پسندیدہ تھا کہ فن عروض، قواعد صرف و نحو، علم نجوم، شرح و تفسیر، فسانہ ڈراما جس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں سب نظم میں لکھی گئیں۔ پھر بھی بعض نثر کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ نثر ہندی کی ایک تصنیف گورکھ ناتھ سے منسوب ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں تھا۔ اس کتاب کی اس مصنف سے نسبت مشتبہ ہے، لیکن اگر درست ہو تو یہ سب سے پہلی تصنیف نثر ہے۔ اس سے قبل کسی کتاب کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد سولھویں صدی میں وٹھل ناتھ کی کتاب منڈن اور گوکل ناتھ کی تصنیف چوراسی وارتا ہیں۔ پھر سترھویں صدی میں دامودر داس نے مارکنڈے پران کا ترجمہ نثر میں کیا۔ اس کے بعد بھی تھوڑا بہت نثر کا لٹریچر پایا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں چتر بھوج مسرا نے بھگوت گیتا کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا، جس کو للّو لال نے پریم ساگر کے نام سے سہل تر زبان میں لکھا۔ چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک تمام تصانیف نثر کا یہ طرز ہے کہ سنسکرت کا غلبہ ہے لیکن جملوں کی ساخت برج بھاشا کے قواعد کے مطابق ہے، افعال و ضمائر برج بھاشا کے ہیں، اس لئے یہ زبان سنسکرت سے آسان ہے، تاہم عام فہم نہیں ہے۔ للّو لال پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی تصانیف میں روزمرہ کی بول چال اور اسلوب بیان اختیار کیا اور سنسکرت کے نامانوس و مشکل الفاظ کی جگہ برج بھاشا کے سہل تر الفاظ استعمال کئے۔ للّو لال کی عبارت چند الفاظ بدلنے سے اُردو کی متعارف عبارت بن جاتی ہے۔ مثلاً للّو لال کی پریم ساگر سے چند سطریں ناگری رسم خط سے اُردو میں لکھی جاتی ہیں:-

"یہ سنتے ہی کنس ڈر کر کانپ اُٹھا اور کرودھ کر (غصہ ہو کر) دیوکی کو جھونٹے پکڑ کر رتھ سے

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

یہ سب ہندی کی کتابیں ہیں، لیکن ایک کتاب سنگھاسن بتیسی للو لال نے اُردو میں بھی لکھی ہے۔ اس میں ہندی کے الفاظ بھی بکثرت ہیں عربی فارسی کے الفاظ بھی ہیں اور طرز ادا، اور اسلوب بیان بھی اُردو کے مطابق ہے۔ یہ کتاب اُردو اور ہندی دونوں رسم خط میں شائع ہوئی، بار بار چھپی اور مقبول ہوئی۔ نمونہ یہ ہے:-

"برہمن کہنے لگا، جب تلا لگن آوے جو اس میں مندر اٹھاوے، جب تک وہ لگن رہے تب تک کام اس میں جاری رکھے، اور جب تلا لگن ہو چکے تب اس کا کام موقوف کر دے"

(بقیہ صفحہ گذشتہ) نیچے کھینچ لایا، کھڑگ (تلوار) ہاتھ میں لے، دانت پیس پیس، لگا کہنے، جس پیڑ کو جڑ ہی سے اکھاڑیے تس میں پھول پھل کاہے کو لگے گا، اب اسی کو ماروں تو نردے (بے فکر) راج کروں، یہ دیکھ سن، باسن دیو من میں کہنے لگے، اس مورکھ (بے وقوف) نے دیا سنتاپ (رنج) جانا نہیں ہے پن اور پاپ، جو میں اب کرودھ (غصہ) کرتا ہوں تو کاج بگڑے گا، تس سے اس سمے (وقت) چھما (درگذر) کرنی یوگ (بھلی) ہے۔"

فورٹ ولیم کالج میں ہندی کا آسان لٹریچر پیدا کرنے کی کوششیں جاری تھیں کہ ان سے علیحدہ بلکہ ان سے پہلے، ایک اُردو کے شاعر سید انشاء اللہ خاں دہلوی (متوفی ۱۸۱۷ء) کو لکھنؤ میں "ایک انوکھی بات" سوجھی اور انھوں نے ایک طویل کہانی ایسی روزمرہ کی بول چال میں لکھدی جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ یہ کہانی ناگری حروف میں چھپ کر ہندی کتابوں میں شامل ہے اور فارسی خط میں چھپی ہوئی اردو کے کتب خانہ میں داخل ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ آئندہ صفحات میں عنقریب آتا ہے۔ یہاں اس کی چند سطریں ہندی تحریر کی مثال کے طور پر درج کی جاتی ہیں:-

"ہم اپنی گھڑی شبھ مہورت سوچ کے تمہارے سسرال میں کسی باہمن کو بھیجتے ہیں جو بات چیت چاہی ٹھیک کر لاوے۔ باہمن جو شبھ گھڑی دیکھ کر ہر بڑی سے گیا تھا، اس پر کڑی پڑی۔ سنتے ہی رانی کیتکی کے باپ نے کہا ان کے ہمارے ناتا نہیں ہونے کا، ان کے باپ دادا ہمارے باپ دادوں کے آگے سدا ہاتھ جوڑ کے باتیں کرتے تھے اور جو ٹک تیوری چڑھی دیکھتے تھے تو بہت ڈرتے تھے کیا ہوا جواب دے بڑھ گئے اور اونچے پر چڑھ گئے۔ جن کے ماتھے ہم بائیں پاؤں کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اسی طرح تُلاگن میں ہی وہ سارا مکان تیاری پر لادے، اس کا آٹوٹ بھنڈارہ ہو۔ اور کبھی اس کے یہاں سے کبھی نہ جاوے۔ یہ بات سُن کر راجہ من میں خوش ہوا، دیوان کو بُلایا اور مندر اُٹھانے کی اجازت دی کہ تم اچھی جگہ ڈھونڈھ کر محل بناؤ۔ اتنے میں تُلاگن بھی آن پونہچی، اس مندر کی نیو دی۔ دیس دیس میں یہ آوازہ ہوئی کہ راجہ تُلاگن میں محل بنواتا ہے۔ جتنے کاریگر اس میں کام کرتے تھے، وے اُٹھ کر تلاگن میں بناتے تھے۔ کہیں کام اس میں سونے کا اور کہیں روپے کا اور کہیں لوہے کا اور کہیں کاٹھ کا نئی نئی طرح سے بنتا تھا۔"

(بقیہ صفحہ ۱۳۳) کے انگوٹھے سے ٹیکا لگادیں وہ چاراجوں کا راجہ ہوجائے، کس کا مُنہ جو یہ بات ہمارے مُنہ پر لاوے۔"

فورٹ ولیم کالج میں ہندی تصانیف کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کالج کے بعد اور کالج سے باہر بھی جاری رہا۔ تمام علوم و فنون کی کتابیں ہندی میں ترجمہ و تالیف ہونے لگیں۔ اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔ اور ہندی تحریر کے مختلف اسلوب پیدا ہوگئے۔

۱۸۳۷ء میں لیتھو کا ہندی مطبع دہلی میں قائم ہوا۔ ہندی کا سب سے پہلا اخبار گوبند رگھوناتھ کی اڈیٹری میں بنارس اخبار کے نام سے ۱۸۴۵ء میں جاری ہوا۔ لیتھو میں چھپتا تھا (یہی اخبار اسی نام سے اُردو میں بھی شائع ہوتا تھا، لیکن اُردو کا پہلا اخبار نہ تھا۔ اس سے پہلے اُردو کے اور اخبار نکل رہے تھے) دوسرا ہندی کا اخبار بنارس ہی سے سدھاکر کے نام سے تارا موہن متر کی اڈیٹری میں ۱۸۴۹ء میں جاری ہوا۔ یہ پرچہ پہلے اردو میں نکلا تھا، پھر اُردو کی جگہ ہندی میں چھپنے لگا۔ ہندی کا سب سے پہلا ڈراما گوپال چند نے نہوسا کے نام سے ۱۸۵۰ء میں مرتب کیا۔ مقالہ نگاری سب سے پہلے بال کرشن بھٹ نے ۱۸۴۵ء میں شروع کی۔ ہندی لکھنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اُردو نہیں جانتے تھے۔ صرف ہندی میں لکھتے تھے، ان لوگوں نے اپنی تحریر میں سنسکرت کا عنصر بڑھادیا اور عربی و فارسی کے مانوس و مروج الفاظ سے پرہیز کیا۔ ایسے مصنفوں میں پنڈت شیام سندر داس بہت ممتاز ہیں۔ انکی نسبتہً سادہ تحریر کا نمونہ یہ ہے:۔

"آجکل کی سبتھا (زمانہ) میں دن پر دن اپ بیہ (فضول خرچی) کرنے کا دوش بڑھتا جاتا ہے، کیوں بڑے بڑے رئیس اور دھن وان (دولت مند) ہی (بقیہ صفحہ آیندہ)

ان تصنیفات کے علاوہ للّولال نے مظہر علی ولا کو بیتال پچیسی ترجمہ کرنے میں مدد دی۔
فورٹ ولیم کالج میں مذکورۂ بالا منشیوں اور مصنفوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ملازم و متوسل تھے۔ لیکن ان کے ادبی کارنامے نہ زیادہ ہیں، نہ اعلیٰ، نہ مشہور، اس لئے یہ اہلِ قلم شہرت نہ پاسکے۔ مثلاً **حمید الدین بہاری** نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے کھانے اور مٹھائیاں تیار کرنے کی ترکیبیں لکھیں اور اس کتاب کا نام **خوانِ الوان** رکھا۔ **مرزا محمد فطرت** نے انجیل کے ایک حصّہ کا ترجمہ کیا۔ **محی الدین فیض** نے **پندنامہ عطار** کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان میں سے ایک مصنف البتہ امتیاز کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مرزا جان طپش ان کا نام مرزا محمد اسمٰعیل ہے۔ مرزا جان کے لقب سے مشہور ہیں۔ دہلی میں ~~۱۱۸۲ھ~~ ۱۷۶۸ء میں پیدا ہوئے عربی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ لڑکپن سے شاعری کا شوق ہوا۔ خواجہ میر درد دہلوی کے شاگرد تھے۔ ~~۱۱۹۸ھ~~ ۱۷۸۴ء میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ وہاں سے بنگال چلے گئے اور ڈھاکہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اپ بیائی (فضول خرچ) نہیں ہوتے بلکہ مدھم اور اُتّم سٹر پرش (متوسط اور اعلیٰ درجہ) کے لوگ بھی خرچ کرنے میں بڑنی (ادارتا (شان) دکھلاتے ہیں، اس کا کارن (نتیجہ) یہی ہے کہ لوگ اپنی بات بک دشا (اصلی حالت) کو چھپاتے اور لوگوں کو اپنی جھوٹی سمپنتا دکھانے کے لئے اوپری ترلک بھڑلک ادھک رکھتے ہیں۔"

لیکن ان میں جو لوگ اُردو ہندی دونوں میں لکھتے ہیں۔ وہ زیادہ عام فہم لکھتے، اور عربی و فارسی کے آسان الفاظ بھی بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان میں منشی پریم چند کا خاص درجہ ہے۔ انھوں نے بعض فسانے اُردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھے ہیں۔ ان کا فرق ذیل کے نمونوں سے واضح ہوگا۔ ایک فسانہ (بڑے گھر کی بیٹی) ہندی میں اس طرح شروع کرتے ہیں :-

"بینی مادھو سنگھ گوری پور گاؤں میں زمیندار اور نمبردار تھے، ان کے پتا ماکسی سمے بڑے دھن دھانیہ سمپن تھے۔ گاؤں کا پکا تالاب اور مندر جن کی اب مرمت بھی مشکل تھی انھیں کی کیت استھم تھے، کہتے ہیں اس دروازے پر (بقیہ صفحہ آئندہ)

میں نواب شمس الدولہ سید احمد علی خاں کے دربار میں توسّل اختیار کیا۔ نواب صاحب کے حکم سے اُردو محاورات کی لُغت لکھی اور اس کا نام نواب صاحب کے خطاب کی مناسبت سے **شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان** رکھا۔ یہ لُغت ۱۲۰۷ھ ۱۷۹۳ء میں مرتب ہوا ہے اور فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اس لئے فورٹ ولیم کالج سے باہر کے تصانیف میں اس کا ذکر موزوں تھا لیکن چونکہ مرزا جان طپش بعد کو کالج میں چلے گئے تھے، اور وہاں اگرچہ خود کوئی تصنیف نہیں کی، تاہم دوسروں کو مدد دی، اس لئے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ہاتھی جھومتا تھا، اب اس کی جگہ ایک بوڑھی بھینس تھی۔ جس کے فربہ میں ست پنجر کے سوا اور کچھ شیش نہ رہا تھا، پر دودھ شاید بہت دیتی تھی، کیونکہ ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پر سوار ہی رہتا تھا۔"

اسی قصہ کو اُردو میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"سینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے۔ اُن کے بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی، کہتے ہیں اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کا موجود، نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔"

علمی مضامین اور تصانیف کی زبان اور اسلوب بیان تو دشوار ہونا ہی چاہئے لیکن عام لٹریچر، اخبار، رسائل، فسانہ، تاریخ وغیرہ میں بھی یہ اختلاف تھا کہ کسی کی زبان آسان، کسی کی مشکل ہوتی تھی، یعنی کوئی شخص سنسکرت اور برج بھاشا کے نامانوس الفاظ زیادہ استعمال کرتا تھا، کوئی فارسی عربی کے عام فہم الفاظ لکھتا تھا لیکن ۱۹۳۵ء سے ہندی زبان کے مقرر، نامہ نگار، مصنف کھڑی بولی اور عام فہم بھاشا کو دقیق و دشوار اور سنسکرت سے مشابہ بنانے لگے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ایک یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ تو استعمال کئے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ سنسکرت اور بھاشا کے مشکل اور غیر متعارف الفاظ بھی برتے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

(بقیہ صفحہ آیندہ)

کا ذکر ہی کے سلسلے میں اس لغت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ایک مرتبہ مرشدآباد سے ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اُردو محاوروں کے معنی فارسی زبان میں لکھے ہیں لیکن ان کی مثالیں شعرائے اُردو کے کلام سے درج کی ہیں۔ اس زمانے کی تصانیف کی اکثر یہی روش ہے کہ اُردو زبان کے متعلق کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھتے تھے۔ جیسے انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت، کہ اس کا موضوع اُردو زبان کے قواعد و متعلقات شعر و ادب ہیں لیکن فارسی عبارت میں تصنیف کی گئی ہے (اس کا ذکر آیندہ آتا ہے)۔ شمس البیان کا نمونہ یہ ہے:-

انگاروں پر لوٹنا: کنایہ از بیقراری کہ در عالم رشک لاحق گردد۔ ولی دکنی گوید ؎

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں　　　تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولی

رفو چکر میں آنا: حیراں ماندن بہ مشاہدہ امر عجیب عوام[۵] بازاری استعمال کنند۔ سراج الدین سراج دکنی گوید ؎

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے
اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجاوے

[۵] اس محاورہ (رفو چکر میں آنا) کو عام بازاری کا محاورہ اس لئے کہا گیا ہے کہ رفو چکر ہونا اور چکر میں آنا دو الگ الگ محاورے ہیں۔ مثلاً

جس طرف دیکھتی تھی بھر کے نظر　　　ہوش ہو جاتے تھے رفو چکر

قیامت تک یہی گردش رہے گی رات دن ان کو
مہ و خورشید حسن یار سے آئے ہیں چکر میں

جاہل آدمیوں نے دوسرے محاورے میں رفو کا لفظ بھی ملا لیا اور حیران ہونے کے لئے رفو چکر میں آنا بولنے لگے۔ لیکن پرانے زمانے سے لوگ بولتے ہوں گے۔ اب سننے میں نہیں آتا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

"بچوں کے سبھاؤ سے مائیں ادھک پرچیت ہوتی ہیں، بچے ماؤں سے ادھک پریم کرتے ہیں، پریم پورک کہی ہوئی باتوں کا دل پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔"

نیز مشہور و مروج الفاظ، مدرسہ، استاد، استانی، کتاب، امتحان وغیرہ کو صرف ادبی تصانیف سے نہیں بلکہ عام بول چال سے بھی خارج کر کے ان کی جگہ سنسکرت اور بھاشا کی دشوار اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً اسمبلی کا ایک ریزولیشن ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:-　　　(بقیہ بصفحہ آیندہ)

فورٹ ولیم کالج میں رہکر طپش نے ایک مثنوی میر حسن کی تقلید میں لکھی اور بہار دانش نام رکھا، اپنا دیوان بھی مرتب کیا اور کالج نے اس کو خرید کر شائع کیا۔

بقیہ صفحہ ۱۴۷) :-

"یہ اسمبلی سرکار سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈوں تتھا میونسپل بورڈوں کو ادیش کرے کہ وہ لوور پرائمری تتھا پرائمری میں اب سے بجائے پرش ادھیاپکوں کے استری ادھیاپکائیں نیوکت کریں، پرنتو یدی دنمان سمے میں ضرورت کے مطابق استری ادھیاپکائیں نہ ملیں تو عارضی طور سے پرش ادھیاپک رکھ لئے جائیں، لیکن جیسے ہی یوگیہ ادھیاپک ملیں فوراً عارضی ادھیاپکوں کو ہٹا کر استری ادھیاپکائیں مقرر کی جائیں۔"

ڈاکٹر تارا چند سابق سکریٹری ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ہندی کے مشہور ادیب ہیں۔ سہ ماہی رسالہ ہندستانی (ہندی اڈیشن) بابت جولائی ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے نام سمبندھی غلط فہمیاں (نام کے متعلق غلط فہمیاں)۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"پرشن کے ببکش پکش میں بچار کرنے اور دونوں وردھی دلوں کے پرتھک
مسئلہ دونوں رخ غور مخالف گروہوں الگ

پرتھک درشٹی کوں سمجھنے کے پہلے مجھے یہ آوشیک معلوم ہوتا ہے کہ جن ناموں کا ہم
الگ زاویۂ نگاہ ضروری

پریوگ کریں ان کی ٹھیک ٹھیک پریبھاشا دیدیں، کیونکہ اس سمبندھ میں بہت کچھ
استعمال تعریف تعلق

غلط فہمی اس کارن ہوتی ہے کہ ان ناموں کے ارتھ کے بارے میں لوگوں کو بھرم
سبب مفہوم دھوکا

ہے۔ اس وشے میں بہت سے ناموں کا پریوگ ہوا ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:- بھاشا، ہندی
بارے استعمال

(بقیہ بصفحہ آئندہ)

فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر مختصر تبصرہ

(۱) فورٹ ولیم کالج کے قائم ہونے سے پہلے اور جاری رہنے کے زمانے میں کالج و کلکتہ سے باہر بھی اردو تصانیف نثر کا سلسلہ جاری تھا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اور آیندہ لکھا جائے گا، لیکن کوئی باقاعدہ اور متحدہ کوشش نہ تھی، بلکہ متفرق طور پر

(بقیہ صفحہ ۱۳۸) :-

ہندوستانی، زبان ہندوستان، دہلوی، کھڑی بولی، مدھیادیس کی بولی، ریختہ، زبان
صوبجات متحدہ

اردوے معلّی، اردو۔ ان سب ناموں میں ہندی، ہندوستانی اور اردو کا پریوگ
استعمال

ادھک ہوتا ہے، اور واستب میں واد ودا د بھی اب ان تینوں ناموں کے پریوگ
بہت		حقیقت		مباحثہ		استعمال

کے ہی سمبندھ میں ہے۔"
تعلق

یہ ہندی کے مختلف اسالیب بیان کی مثالیں تحریر و تقریر کی پیش کی گئی ہیں۔ بہر حال ہندی لٹریچر نے ان سوا سو (۱۲۵) برس میں نہایت کثرت و وسعت پیدا کر لی ہے۔ تمام علوم و ادبیات میں اعلیٰ پایہ کی تصانیف ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اخبارات و رسائل، مطابع و ادارت ہندی زبان و ادب کی وسعت و اشاعت میں بہتر سے بہتر کوشش کر رہے ہیں۔

ہندی شاعری کی تاریخ نثر کی تاریخ سے زیادہ دلچسپ ہے، اور زیادہ قدیم بھی، اس لئے کہ برج بھاشا اصل میں شاعری ہی زبان ہے۔ اور اس زبان کا آغاز ہی شاعری کے ساتھ ہے۔ نثر ہندی کی تصنیف چودھویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ملتی، لیکن نظم ہندی کا وجود بارھویں صدی سے بھی پہلے پایا جاتا ہے۔ نثر ہندی میں کوئی عجیب خصوصیت نثر اردو کے مقابلے میں نہیں ہے، (بقیہ صفحہ ۱۴۰)

لوگ کچھ کچھ لکھ رہے تھے۔ کالج کے منتظموں نے سلیس نثر نگاری کا مقصد متعین کر کے کام شروع کیا۔ یہ گویا پہلا علمی اور ادبی ادارہ یا ندوہ تھا۔

(۲) اُردو ٹائپ کا پہلا مطبع اسی کالج کی طرف سے قائم کیا گیا، اور بعض کتابیں خاص حسن و خوبی کے ساتھ شائع کی گئیں۔

(۳) کالج کی یہ خدمات کم و بیش بیس برس جاری رہیں۔ اس عرصہ میں اٹھارہ مصنفوں نے پچاس کتابیں اُردو میں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں۔ اس زمانے میں (۱۸۰۱ء سے ۱۸۲۰ء تک) فورٹ ولیم کالج سے باہر تمام ہندوستان میں اتنی کتابیں نثر اُردو کی مشکل سے لکھی گئی ہوں گی۔ اور جتنی لکھی گئیں ان میں سے اکثر کو آج تک چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

(۴) بیرونِ کالج کی کوئی تصنیف زبان و محاورہ کی سلاست اور اسلوب بیان

(بقیہ صفحہ گذشتہ) لیکن نظم ہندی دنیا بھر کی شاعری سے نرالی ادا رکھتی ہے۔ اور ایسی انفرادی حیثیت کی مالک ہے جس میں کوئی ملک اور کوئی زبان اور کوئی شاعری شریک نہیں۔ ہندی شاعری کے مختلف موضوعات و اجزاء، و عناصر پر اُردو میں بھی بعض کتابیں لکھی گئی ہیں۔ غالباً سب سے پہلے جناب نیاز فتحپوری نے جذبات بھاشا کے نام سے نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے اپنے رسالہ نگار لکھنؤ کی ایک اشاعت (جنوری ۱۹۲۶ء) ہندی شاعری کے لئے مخصوص کر دی تھی۔ اس میں نیاز صاحب نے ایک انگریز مصنف مسٹر ایف ای کی کی تاریخ ادب ہندی کا ترجمہ شائع کر دیا ہے۔ لیکن اصل کتاب اور ترجمہ دونوں میں نمونے نہیں ہیں، نمونے اسی رسالے کے دوسرے مضامین میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر اعظم کریوی وغیرہ نے بھی ہندی شاعری پر کتابیں لکھی ہیں۔

اس حاشیہ میں زبان ہندی کی تقسیم اور بعض معلومات اسی انگریز مصنف کی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ نمونے اس کتاب میں نثر کے بھی نہیں ہیں۔

کی دلکشی میں میر امن، حیدری، اکرام علی وغیرہ کی کتابوں سے بہتر، اور داستان امیر حمزہ و اخوان الصفا سے زیادہ ضخیم نہیں ہے۔

(۵) کالج کی تالیفات میں مختلف ضروری، مفید اور دلچسپ موضوع کتابیں شامل ہیں، یعنی فسانہ، تذکرہ، صرف و نحو، تاریخ، اخلاق، فقہ اسلام، ترجمہ قرآن مجید، ترجمہ انجیل مقدس۔

(۶) سب سے بڑی خدمت اس کالج کی یہ ہے کہ سلیس نثر نگاری کی شاہراہ قائم کر دی۔ اگر یہ محکمہ جاری نہ ہوتا تو بھی ارباب علم و ادب اس رستے پر آتے، لیکن دیر لگتی۔ ان کتابوں کا نمونہ موجود ہونے پر بھی لوگوں نے اس طرف کم توجہ کی اور بہت آہستہ آہستہ اس راہ پر آئے۔

---

(۲) مصنّفین بیرونِ کالج

۱۸۰۱ء تا ۱۸۳۰ء
۱۲۱۵ھ　　۱۲۴۵ھ

اسی زمانے میں جبکہ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا محکمہ جاری تھا، ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اصحاب علم و ادب انفرادی طور پر نثر اردو کی کتابیں لکھنے میں مصروف تھے۔ دکن کے اسی عہد کے بعض مصنفین نثر (شرف الدولہ، بدر الدولہ وغیرہ) کا ذکر "دکن میں عہد مغلیہ کے بعد کے دور" میں آ چکا ہے، دہلی، لکھنؤ، آگرہ وغیرہ مقامات میں بھی ارباب قلم رفتار اردو کی ترقی میں سعی پیہم کر رہے تھے۔ لیکن کالج سے باہر کے مصنفوں کو مطبع و اشاعت کی آسانیاں میسر نہ تھیں۔ کالج میں دار الترجمہ کے ساتھ مطبع قائم ہو گیا، اور ۱۸۰۳ء سے کتابیں چھپنی شروع ہو گئیں، لیکن فورٹ ولیم کالج سے باہر ۱۸۳۷ء میں دہلی میں مطبع کھلا۔ اس کے بعد کتابوں کو طباعت و اشاعت نصیب ہوئی۔ اس سبب سے

دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں قیام کالج سے پہلے، اور زمانہ کالج، بلکہ اس سے کچھ عرصہ بعد تک جو کتابیں لکھی گئیں وہ مشہور و عام نہ ہوسکیں۔ یہ بات ثابت کرنے کے لئے کہ ترقی اردو اُنیسویں صدی کے شروع میں بھی تنہا فورٹ ولیم کالج ہی کی احسان مند نہیں ہے، بلکہ بیرون کالج بھی اُردو کی رفتار کو تیز کرنے کی کوششیں جاری تھیں، چند نام اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے گنائے جاتے ہیں[۵]:—

(۱) ہری ہر پرشاد سنبھلی مصنف بدائع الفنون (۱۷۳۳ء ۔ ۱۱۴۶ھ)

(۲) بندرابن متھراوی (متوفی ۱۷۵۷ء ۔ ۱۱۷۰ھ) مصنف تذکرۂ معاصرین

(۳) محمد حسین کلیم دہلوی (۱۷۵۴ء ۔ ۱۱۶۷ھ میں زندہ تھے) مترجم فصوص الحکم

(۴) نادر علی شاہ قادری مصنف رسالۂ تصوف (۱۷۷۶ء ۔ ۱۱۹۰ھ)

(۵) مولوی قدرعالم بن مولوی بدرعالم مصنف فقہ محفوظ خانی (۱۷۸۵ء ۔ ۱۱۹۹ھ)

(۶) حکیم محمد شریف خاں دہلوی (متوفی ۱۸۰۷ء ۔ ۱۲۲۲ھ) مترجم قرآن مجید

(۷) محمد جعفر مصنف روح الایمان و اسلام (۱۷۸۹ء ۔ ۱۲۰۳ھ)

(۸) مولوی کریم الدین دہلوی مترجم تاریخ ابی الفداء (۱۸۰۰ء ۔ ۱۲۱۵ھ)

(۹) مولوی حافظ احمد مصنف سراج ایمان (۱۸۰۰ء ۔ ۱۲۱۵ھ)

(۱۰) مولوی محمد صفا مصنف زاد آخرت (۱۸۰۲ء ۔ ۱۲۱۷ھ)

(۱۱) مولوی حافظ محمد علی مصنف زاد نجات (۱۸۰۳ء ۔ ۱۲۱۸ھ)

(۱۲) مولوی محمد حیات مصنف سراج الحیات (۱۸۰۶ء ۔ ۱۲۲۱ھ)

(۱۳) مولوی عبدالقادر مصنف گلشن دین (۱۸۱۲ء ۔ ۱۲۲۷ھ)

(۱۴) مولوی محمد خالق اکبرآبادی مصنف مخزن القواعد (۱۸۱۳ء ۔ ۱۲۲۸ھ)

(۱۵) مولوی ولی محمد مصنف میخانۂ وحدت (۱۸۲۰ء ۔ ۱۲۳۶ھ)

(۱۶) مولوی قادر بخش پانی پتی مصنف مختصر التجوید (۱۸۲۶ء ۔ ۱۲۴۲ھ)

---

۵ یہ فہرست مفتی انتظام اللہ صاحب صدیقی اکبرآبادی کی تصنیف یو۔پی میں اردو سے ماخوذ ہے اور ان میں سے چند مصنفوں کے حالات اور نمونے بھی جو آگے آتے ہیں۔

یہ سب فورٹ ولیم کالج سے پہلے اور ساتھ کے مصنفین ہیں۔ ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں اور ان سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض متقدمین کے حالات اور نمونۂ تصانیف درج کئے جاتے ہیں۔

محمد حسین کلیم دہلوی

شاعر و مصنف دونوں تھے۔ میر حسن دہلوی (مصنف مثنوی سحر البیان) نے اپنے تذکرۂ شعراء میں کلیم کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے فصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا۔ میر حسن کے الفاظ یہ ہیں :- "در ہندی نثر کتابے ایجاد کردہ"۔ اس "ایجاد کردہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کو اس سے پہلے کی کسی اردو کتاب کا علم نہ تھا، اور اس کا کچھ تعجب نہیں۔ دکن کی اردو تصانیف کا شمالی ہند و دہلی میں پونہچنا اور مشہور ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔ میر حسن اور محمد حسین کلیم ہم عصر تھے۔ میر حسن کا انتقال ۱۲۰۰ھ ۱۷۸۶ء میں ہوا ہے اور کلیم ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء میں زندہ تھے جس سال احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ دہلی کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ اس عہد کی صرف ایک کتاب فضلی کی کربل کتھا ہے۔ جو ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی اور ۱۱۶۰ھ ۱۷۴۷ء میں مصنف نے اس پر نظر ثانی کی (جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے)۔ اس زمانہ میں کلیم و میر حسن دونوں زندہ تھے۔ اگر فضلی کی کتاب شمالی ہند یا دہلی کی ہو تو میر حسن کو اگرچہ اس کا علم ہونا لازم نہ تھا، لیکن ممکن و متوقع ضرور تھا۔ اس لئے کہ یہ کربل کتھا بازدہ مجلس مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی، اور میر حسن شیعہ تھے۔ یہ قیاسات میر حسن کے فقرے کے لفظ "ایجاد" پر قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن اگر میر حسن کی مراد (ایجاد کرد) سے (بوجود آورد) ہو، یعنی "تصنیف کی"، تو بات صاف ہے۔ میر حسن نے کلیم کا صرف ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہی فقرہ تبرک کی طرح تمام مصنفین "آب حیات" "سیر المصنفین" و "یو۔ پی میں اردو" وغیرہ میں دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے۔ ہم بھی اسی کا لہو لگا کر شہیدوں میں ملے جاتے ہیں۔ کلیم کا فقرہ یہ ہے :-

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر، آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر[۵]،

ایسی دولت سے زنہار زنہار، فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

کلیم کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری نثر میں ایسی ہی قافیہ پیمائی ہوگی جیسی اس زمانے کی کربل کتھا اور نوطرز مرصع میں ہے۔

حکیم شریف خاں دہلوی

حکیم محمد شریف خاں، مُلّا علی داؤ برادر مُلّا علی قاری کی اولاد سے تھے۔ اس لئے سلسلہ نسب حضرت خواجہ عبیداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب کے اجداد میں سے ایک بزرگ بابر بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ اور حیدرآباد میں قیام کیا۔ حکیم شریف خاں کے دادا حکیم محمد واصل خاں آگرہ آکر سکونت پذیر ہوئے۔ پھر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں شاہی طبیب مقرر ہوئے حکیم واصل خاں شاہ علم اللہ کے خلیفہ بھی تھے۔ ان کے بیٹے حکیم محمد اکمل خاں محمد شاہ بادشاہ دہلی (عہد سلطنت ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے طبیب خاص ہوئے، اور "حاذق الملک" خطاب پایا۔ ان کے بیٹے حکیم شریف خاں تھے جو ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تحصیل علوم کی، بڑے مشہور و مستند عالم تھے، فن طب میں "ثانی بوعلی سینا" کہے جاتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ (۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء تا ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) کے عہد میں شاہی طبیب تھے، "اشرف الحکما" خطاب تھا۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتے تھے۔ ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں حدیث شریف کی کتاب مشکوٰۃ کا فارسی ترجمہ کاشف المشکوٰۃ کے نام سے کیا۔ حاشیہ نفیسی، حاشیۂ شرح اسباب، آثار نبوت، شرح حمداللہ وغیرہ متعدد عربی و فارسی

---

۵ یہ محاورہ کی بوالعجبی ہے کہ بصیر کے معنی دیکھنے والے کے ہیں لیکن پاس خاطر و دلجوئی کے لئے اندھے کو بھی بصیر کہہ دیتے ہیں۔ گویا چشم ظاہر بند ہے تو کیا، دیدۂ باطن کھلا ہوا ہے۔ اسی غرض سے اندھے کو حافظ کہتے ہیں چاہے اس کو الحمد اور قل ہو اللہ بھی یاد نہ ہو۔ اسی طرح سقّے کو بہشتی، حجام کو خلیفہ، خاکروب کو مہتر کہتے ہیں۔

کی تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۷ء میں انتقال کیا۔ رفتارِ اُردو کے سلسلے میں حکیم شریف خاں کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اُردو ترجمہ ہے، جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ اُردو سے تقریباً بیس سال پہلے کا ہے لیکن آج تک قلمی و گمنام ہے۔ حکیم محمد احمد خاں دہلوی مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) کے پاس یہ پورا ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا۔ اس ترجمہ میں سے سورۂ فاتحہ کی صرف پہلی آیت کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے، لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کا، بخشنے والا وجود کا آخرت میں۔"

یہ صرف اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن کا ترجمہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے باوجود ترتیب لفظی کے تشریحی ترجمہ کیا ہے۔ لفظ الحمد کا ترجمہ اور مترجم "سب تعریف" یا "تمام تعریفیں" کرتے ہیں، لیکن حکیم صاحب نے لکھا ہے:۔ "جو تعریف کہ اول سے آخر تلک موجود ہے"۔ اسی طرح رب العٰلمین کے ترجمہ میں "پالنے والا" کے آگے "بخشنے والا وجود کا آخرت میں" بھی بڑھا دیا ہے: تاکہ رب کا مفہوم واضح ہو جائے، یعنی اس عالم میں روح کی تکمیل تربیت کے بعد آخرت میں باقی مراتب روحانی کا طے کرانا بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شامل ہے۔

اب زمانہ فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اور بعد کے بعض مشہور مصنفوں کا ذکر لکھا جاتا ہے۔

سید انشاء اللہ خاں دہلوی

ان لوگوں میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا کارنامہ کثیر و ضخیم نہیں، لیکن نوعیت میں طرفہ و عجیب ہے۔ ان کے والد کا نام حکیم ماشاء اللہ خاں ہے۔ آبا و اجداد ایران سے کشمیر آئے، وہاں سے دہلی میں آبسے۔ حکیم ماشاء اللہ خاں شاہی طبیب تھے، دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد چلے گئے، وہیں انشاء اللہ خاں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر، تعلیم سے فارغ ہو کر دہلی آئے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار کا وسیلہ پکڑا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد لکھنؤ چلے گئے اور نواب سعادت علی خاں کے

مصاحب ہوگئے۔ انشا عالم، شاعر، زباندان، نکتہ سنج، لطیفہ گو، مسخرے، نقال سبھی کچھ تھے۔ نواب کی ناک کا بال ہوگئے۔ لیکن کچھ زمانے کے بعد بگڑ گئی تو نواب نے آٹے کے بال کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ لکھنؤ میں ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔ (ان کے حالات آب حیات میں پڑھنے کے قابل ہیں) ان کے کلیات میں غزلیات، قصائد، مثنویات، قطعات، رباعیات، ریختی، چیستاں، پہیلیاں، سبھی کچھ ہے۔ ان کا ذکر موقع و محل پر آئے گا۔ نثر کی تصانیف کا انشا کے گرد و پیش کوئی رواج نہ تھا۔ لیکن انھوں نے زبان اردو اور نثر اردو کی دو عجیب خدمتیں کی ہیں۔

(۱) رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی

یہ انشا کی ذہانت کی عجیب و نادر کارستانی ہے، ایک داستان لکھی ہے جس میں عربی فارسی وغیرہ کسی ہندوستان باہر کی زبان کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ کوئی چھوٹی سی حکایت نہیں، پچاس صفحوں کی مکمل داستان ہے۔ قصہ بھی دلچسپ اور اندازِ بیان بھی دلکش۔ جا بجا رباعیاں ہیں، ان کو "چوتکا" لکھا ہے، اشعار کو دوہے اور کبت لکھا ہے، بعض اشعار ہندی اسلوب میں لکھے ہیں، مثنوی کے طرز پر چھوٹی بحر میں جو شعر لکھے ہیں ان میں عجیب روانی اور لطافت ہے۔ انشا بڑے زندہ دل اور شوخ مزاج تھے۔ اس کہانی کی ایجاد ہی ان کی شوخیِ طبیعت کی دلیل ہے، سارے قصے میں یہی شوخی جلوہ گر ہے۔ شروع میں سبب تالیف بیان کرتے ہیں:-

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی سے پُٹ نہ ملے، تب جاکے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی پڑھے لکھے پُرانے دُھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے، سر ہلا کر منہ بنا کر ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر لگے کہنے، یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھوس جائے۔ جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے

آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں کا توں وہی ڈول رہے، اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے، یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے اُن کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا، میں کچھ ایسا بڑبولا نہیں، جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کے انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی اُلجھی سلجھی باتیں سجاؤں، جو مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا یہ بات منہ سے کیوں نکالتا، جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ دھنا ہاتھ منہ پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں، جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا بجلی سے بھی بہت چنچل، اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے، اپنی چوکڑی بھول جائے ؎

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں | کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی | کہتا جو کچھ ہوں، کر دکھاتا ہوں میں

آگے کہانی کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بھلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا، گرو جی گسائیں مہندر گر نے جو بھبوت باپ کو دیا تھا، وہ کہاں رکھا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا میں تیری واری تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی کہنے لگی، آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں، جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا، وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے، ایسے لٹکے کسی بُرے دن کے سنبھال لینے کو ڈال رکھتے ہیں، کیا جانے کوئی گھڑی کیسی ہے، کیسی نہیں، رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منہ تھتھا کے اُٹھ گئی اور دن بھر بن کھائے پیے پڑی رہی۔ مہاراج نے جو بلایا تو کہا مجھے رُچ؎ نہیں ہے تب رانی کام لتا بول اٹھیں، اجی کچھ تم نے سنا بھی، بیٹی تمہاری آنکھ مچولی

؎ بھوک۔

کھیلنے کے لئے وہ بھبوت گروجی کا دیا ہوا مانگتی تھی، میں نے نہ دیا اور کہا، بیٹی یہ لڑکپن کی باتیں اچھی نہیں، کسی بُرے دن کے لئے گروجی دے گئے ہیں، اسی پر مجھ سے روٹھی ہے۔ بہتیرا بہلاتی پھسلاتی ہوں، مانتی نہیں۔ مہاراج نے کہا، بھبوت تو کیا، مجھے تو اپنا جی بھی اس سے پیارا نہیں، اس کی ایک گھڑی بھر کے بہل جانے پر ایک جی تو کیا، لاکھ جی ہوں تو دے ڈالیے، رانی کیتکی کو ڈبیا میں سے تھوڑا سا بھبوت دیا، کئی دن تلک آنکھ مچولی اپنے ماں باپ کے سامنے سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی سب کو ہنساتی رہتی، جو سو سو تھال موتیوں کے نچھاور ہوا کئے، کیا کہوں ایک چہل تھی جو کہنے و کرو ڑوں پوتھیوں میں جیوں کی تیوں نہ آسکے۔"

(۲) دریائے لطافت۔ یہ تصنیف اردو زبان و قواعد ادب کے متعلق سید انشا کا نہایت قابل قدر کارنامہ اور غیر فانی یادگار ہے۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے، لیکن مضمون و موضوع اردو زبان ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا[۱] حصہ اردو کی قواعد و محاورہ کے متعلق ہے اور انشا کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا[۲] حصہ منطق و معانی و عروض پر ہے، اور محمد حسن قتیل کی تصنیف ہے۔ دریائے لطافت ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں مرتب ہوئی، اور پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں مطبع آفتاب عالمتاب مرشد آباد میں چھپی اس کے بعد مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے مع اپنے عالمانہ مقدمہ کے ۱۹۱۶ء میں شائع کی، اس جدید اشاعت میں کچھ اختصار و ترمیم بھی کی گئی ہے۔ انشا نے جا بجا فحش کلمات بے تکلف استعمال کئے تھے ان کو خارج کر دیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق اس کتاب کی خوبیاں بیان کرتے ہیں:۔ "کتاب کی جان پہلا ہی حصہ ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بعض اہل یورپ نے متعدد کتابیں اردو قواعد پر لکھی تھیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے، اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرہ کے متعلق اسے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی کوئی کتاب اس پایہ کی نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ

اردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، یا اس کی صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔"

سید انشا نے الگ الگ باب باندھ کر حروف تہجی کی بحث، دہلی کے مختلف محلوں کی زبان کا فرق، بعض شعرا و فصحا کا ذکر، دہلی و لکھنؤ کی فصاحت و فوقیت کا موازنہ، دہلی کی اصطلاحیں، عورتوں کی خاص گفتگو اور اصطلاحات، صرف و نحو کے مجتہدانہ اصول بیان کئے ہیں۔ اور ہر جگہ عجیب ظرافت سے کام لیا ہے۔

دریائے لطافت کے تیسرے باب کے متعلق عبدالحق صاحب لکھتے ہیں: "اسی باب میں نواب عمادالملک، بھاڑ امل، مرزا صدرالدین صفاہانی اور ملا عبدالفرقان کی دلچسپ تقریریں ہیں، خاص کر بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں نہایت پرلطف ہیں۔ بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں ایسی پاک صاف شستہ ہیں کہ آج کل کی بول چال بھی اس سے زیادہ فصیح نہیں ہو سکتی۔ اس سے سید انشا کی زباندانی اور فصاحت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ باوجود اس قدر زمانہ گزرنے کے، اور زبان کے منجھنے اور ترقی پانے کے جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں، اس میں کہیں حرف گیری کا موقع نہیں، بلکہ ویسی فصیح اور پاک صاف اردو اب بھی ہر شخص نہیں لکھ سکتا، اور اس میں شعرائے عصر کے کلام پر جو تنقید کی ہے وہ ظریفانہ ہے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا۔"

ہم اسی کا نمونہ ذیل میں درج کرتے ہیں :-

کلام بی نورن کسبی باشندۂ کوچۂ بلاقی بیگم با میر غفر غینی ویانی :-

اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے، دلی میں آتے تھے، دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے، لکھنؤ میں تمہیں کیا ہوگا کہ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو، کہیں آٹھوں[۵] میں بھی نہ چلو، تمہیں علیؑ کی قسم، آٹھوں

---

۵ آٹھوں کا میلا لکھنؤ کا مشہور تہوار ہے۔

میں مقرر چلیو۔

جواب از میر غفر غینی دیانیؒ:۔

اجی بی نورن، یہ کیا بات فرماتی ہو، تم تو اپنے جیوڑے کی چین ہو، پر کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے، اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سُنئے، ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے، ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی، پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم، پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور میر تقی صاحب، پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب برّد اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی استاد تھے، وہ لوگ تو سب مرگئے، اور ان کی قدر دانی کرنے والے بھی جان بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں، اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے، تخم تاثیر صحبت کا اثر، سبحان اللہ! یہ کون میاں جراءت بڑے شاعر۔ پوچھو تو تمھارا اخانماں کس دن شعر کہتا تھا؟ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے؟ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے، اگر پوچھئے کہ حَسَرَ بَ نَرَ یَئِ عُمَرُ وًا کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لیکر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو اپنا عرق بادیان اور شربت انار بن چھوڑ کے شاعری میں آکے قدم رکھا ہے، اور میر انشاء اللہ خاں بیچارے میر ماشا اللہ خاں کے بیٹے، آگے پریزاد تھے، ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے، اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں، مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روز مرہ کو نام رکھتے ہیں، اور سب سے زیادہ ایک اور سُنئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے، رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے، اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے، رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے

۵۰ میر غفر کو غینی دیانی اس لئے کہا ہے کہ میر صاحب لام اور رے کو اکثر غین اور کمتر ی بولتے ہیں۔ انشا نے ان کی ساری تقریر غین اور ی کے ساتھ لکھی ہے، جس کو مولانا عبدالحق نے دریائے لطافت کے حاشیہ میں درست کر کے لکھ دیا ہے۔ یہ بھی انشا کی لاجواب ظرافت تھی۔

میر حسن پر زہر کھایا ہے، ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا. بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی، گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں. بھلا اس شعر کو کیونکر کہیے. سارے دلّی لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی　　کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سوا اس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے، کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم، لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا، تیغ کا چلانے والا تھا، تو ایسا قابل کہاں سے ہوا، اور کراہی پن (یا کلاہی پن) جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی[۱] ایجاد کی ہے، اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں، اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے. بھلا یہ کلام کیا ہے کہ

یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

اور نچوڑی اُنگیا، اور نگوڑی اُنگیا، اور مُرڈڑی اُنگیا. اور مرد ہو کے یوں کہے ع

کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں

اور ایک کتاب بنائی ہے، اس میں رنڈیوں[۲] کی بولی لکھی ہے. اوپر والیاں چیلیں. اوپر والا، چاند. اجلی دھوبن. اندر والا، دل. اور سہ گانا، دوگانا، یگانا، زنانخی الاچی (بمعنی) دوست.

۱؎ ریختی شاعری کی ایک قسم نکالی گئی ہے. جس میں عورت کی زبان سے بے حیائی کے عشقیہ جذبات و معاملات بیان کرتے ہیں، ریختی سعادت یار خاں رنگیں کی ایجاد نہیں ہے. جیسا انشا نے بیان کیا، بلکہ رنگین سے پہلے ہاشمی دکنی نے سب سے پہلے ریختی کہی ہے. رنگین کی اس غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:-

جو ہونی تھی وہ بات ہولی کہارو　　چلو لے چلو میری ڈولی کہارو

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو　　یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

۲؎ رنڈی لکھنؤ میں عورت کے لئے بولا جاتا تھا. طوائف کے معنوں میں بعد کو استعمال ہوا ہے. اُس زمانے میں طوائف کو کسبی کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں.

مرزا قتیل فریدآباد (دہلی) کے رہنے والے، قوم کے کھتری تھے۔ دیوالی سنگھ نام تھا۔ مسلمان ہوگئے، محمد حسن نام رکھا گیا۔ مرزا قتیل کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۲۳۳ھ ۱۸۲۴ء میں انتقال کیا۔ فارسی کے شاعر و ادیب تھے۔ مولوی غلام شہید آپ کے شاگرد ہیں۔ دربار اودھ کے متوسل تھے۔ نہر الفصاحت، چار شربت، دیوان وغیرہ فارسی کی تصنیفات ان سے یادگار ہیں۔ سید انشا سے بڑا یارانہ تھا۔ قتیل کا اردو زبان کے متعلق یہی کارنامہ ہے کہ دریائے لطافت انشا کی شرکت میں مرتب کی۔ اس کا دوسرا حصہ، جیسا کہ پہلے لکھا گیا، منطق، عروض، قافیہ، معانی، بیان کے متعلق قتیل نے لکھا ہے۔ قتیل نے بھی انشا کی طرح ظرافت سے کام لیا ہے، لیکن ان سے بڑھے نہیں۔ مثلاً فن عروض میں اوزانِ بحر کے مشہور الفاظ کی جگہ نئے الفاظ تراشے ہیں، جیسے۔

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کی جگہ بی جان پری خانم بی جان پری خانم

فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن کی جگہ چت لگن پری خانم چت لگن پری خانم

منطق میں بھی ایک جدت پیدا کی ہے۔ اپنے نزدیک تو اس میں ظرافت و شوخی کا پہلو نکالا ہے، لیکن وہ ایک علمی تجویز بھی ہے جو وضع اصطلاحات اور ترجمۂ علوم و فنون کے ماہرین کے لئے قابلِ غور ہے۔ یعنی منطق کی اصطلاحوں کے لئے اردو کے الفاظ تلاش کئے ہیں مثلاً

تصور	دھیان	تصدیق	جوں کا توں
موضوع	بول	دَوَر	ہیر پھیر
محمول	بھرپور	مطابقت	ٹھیک ٹھیک
نسبت	ملاپ	التزامی	اوپری لگاؤ
قضیہ	بات	مثلث	تکڑا
تسلسل	اُلجھاسوت	مربع	چوکڑا

مرزا قتیل نے علم بیان و بدیع کا حصہ بھی خوب لکھا ہے۔ یہ علوم اردو میں غالباً سب سے پہلے اسی کتاب میں مرزا قتیل کے قلم سے مرتب ہوئے ہیں۔ امام بخش صہبائی

کا ترجمہ حدائق البلاغت اس سے بعد کا ہے۔ قتیل نے تمام صنائع لفظی و معنوی کی مثالیں اپنی طبع زاد نظم یا نثر میں لکھی ہیں۔ مشہور و معروف صنعتوں کے علاوہ اور نئی نئی کاریگریاں نکالی ہیں۔ تعریف و تشریح فارسی زبان میں ہے اور مثالیں اُردو میں لکھی ہیں۔ تحریر کا انداز یہ ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

سوائے ضلع مناسبت درمیان دو چیز مخالف یکدیگر۔ یک لفظ بیان کنند و آں را نسبت نام نہند، مثلاً اگر کسے بپرسد کہ کنوئے اور آتشبازی میں کیا نسبت ہے؟ باید گفت کہ "چرخی"۔ یا بپرسد کہ بندوق اور دھاجن اور فرنگی میں کیا نسبت؟ باید گفت کہ "کوٹھی" یا ایں کہ شمشیر و پلٹن باہم چہ نسبت دارند؟ باید گفت "باڑھ" یا میانہ چوپڑ و دو پٹہ چہ نسبت است؟ باید گفت کہ "گوٹ"

ضلع کی مثال میں دریا کے مناسب چیزیں بیان کرنے کے لئے دو صفحے میں اُردو کی عبارتیں لکھی ہیں۔ جن میں پانی کے اقسام، دریاؤں کے نام، دریائی جانور، کشتی اور تیراکی کے الفاظ ضلع یا ایہام کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ شروع کے فقرے یہ ہیں:-

"آپ کا تحرہ کچھ آج کھل گیا ہے، واللہ تمھاری بات پانی بہت مشکل ہے، ہمیں کل سوتا چھوڑ گئے، ہر چند ضعف نالی کی، تو بھی رتھ میں جگہ نہ دی، ایک باؤلی رنڈی کے کہنے سے ہماری چاہ دل سے اٹھا دی۔"

ایک عبارت مرتب کی ہے جس میں حرف نون کہیں نہیں آنے دیا۔ لکھتے ہیں:-

"جس کا جی چاہے پاس آئے، گھر ہے اس کا، اور جو کوئی آتا آتا یکبارگی رہ جائے تو ہم کو کیا غرض، اگر یہ چاہے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی کبھی آیا کرے تو یہ بات بہت مشکل ہے، اس واسطے کہ عاصی پُر از معاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس گوشہ ہی کے بیچ اسی طرح جا رہے کہ اگر ہزار بار دورہ کامل فلک ہشتم کا کہ جس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے سر پر گذر جائے تو بھی اس جگہ سے اٹھ کر جو بہت جائے تو اس دوسرے حجرے تک جاوے سو بھی دیکھا چاہیئے، یہ بھی اس وقت کا ایک ذٹل قافیہ ہے۔"

ایک عبارت موصل دو حرفی کی صنعت میں لکھی ہے، یعنی دو دو حرف ملے ہوئے ہیں،

نہ کوئی حرف الگ ہے نہ دو سے زیادہ ملے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

"چوٹی کو کاجی کی لڑکی کی گویا کالی ناگن ہے، پر جب جی چاہے تب کاٹے ہے، جو

خوبی حق نے کو کا صاحب کی لڑکی کو دی ہے، شاید نوشابہ کو دی ہو تو دی ہو۔"

اس عبارت کے ضمن میں اس زمانے کی سوسائٹی کے اخلاق بھی قابل ذکر و توجہ ہیں۔ انشا، قتیل اور رنگین تینوں گہرے اور بے تکلف دوست ہیں، تینوں کو کسبی عورتوں سے بڑی دلچسپی ہے، انشا کی زبانی بی نورن کا ذکر بیان کیا جا چکا ہے۔ انشا نے رنگین کی بھی اس دلچسپی کا ذکر کیا ہے، قتیل نے ان دونوں سے کم اپنی دلچسپی و وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے حصۂ تالیف میں جتنی مثالیں دی ہیں، اکثر میں رنڈیوں اور کسبیوں کا ذکر ہے۔ صنعت توشیح میں انہی عورتوں کے نام نکالے ہیں۔ معمے انہی کے نام کے بنائے ہیں۔ اشعار اور عبارتوں میں انہی کا ذکر ہے۔ اور اوزانِ بحر میں انہی کے نام رکھے ہیں۔ شاید اس زمانے کے لکھنؤ کی سبھی رنڈیوں اور کنچنیوں کے نام لکھ دیئے ہیں۔ اس عہد کے لکھنؤ پر عیش و عشرت کے بادل چھائے ہوئے تھے، تاہم یہ بات قابل داد ہے کہ وہ بزرگ بیبا کی یا بے تکلفی و صاف دلی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں ممکن ہے، بلکہ یقین ہے کہ اس زمانے میں یہ ذکر اذکار سب کرتے تھے، حال دکردار سب کے ایسے نہ تھے۔ لیکن ہمارے زمانے میں حال وہی ہے، قال وہ نہیں۔

دریائے لطافت کے علاوہ مرزا قتیل کی اردو نثر کی تحریر مرزا کے مجموعۂ مکتوبات میں بھی پائی جاتی ہے۔ مرزا کے شاگرد خواجہ امداد الدین نے ان کے خطوط جمع کر کے ۱۸۱۷ء (۱۲۳۲ھ) میں معدن الفوائد کے نام سے شائع کئے تھے۔ اس میں مرزا قتیل نے حمد و نعت عربی، فارسی، ترکی، اردو میں لکھی ہے۔ اردو کا نمونہ یہ ہے :-

"بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغمبرؐ کیا اور تمام فاضلوں اور عالموں اور آدمیوں کو اس کی اُمت کیا، سبحان اللہ اس بزرگ درگاہ کا دیکھنے والا ہوں کہ میری ہدایت کی راہ کا دکھلانے والا ہے، اور سعادت کی منزل کا خضر ہے۔"

اس عبارت کے اسلوب پر فارسی کا اثر ہے، دریائے لطافت کے اقتباسات سلیس و فصیح روزمرّہ میں ہیں۔ بہر حال مرزا قتیل بھی ترقی اُردو کے کارپردازوں میں شامل ہیں۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی

شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے پوتے تھے۔ ۱۷۹۶ء ۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ ان کے چچا شاہ عبدالعزیز صاحب نے تربیت کی، آغاز جوانی میں علوم معقول و منقول کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ جوان ہو کر مولوی سید احمد بریلوی کے مرید ہو گئے جو ہندوستان میں فرقہ وہابیہ کے بانی ہوئے ہیں۔ مولوی سید احمد ۱۷۸۲ء ۱۱۹۱ھ میں پیدا ہوئے تھے، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم پائی تھی۔ لیکن بعد کو وہابیت کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ نہایت خوش بیان مقرر تھے۔ اس لئے لوگ کثرت سے ان کے معتقد و مرید ہو جاتے تھے۔ ہندوستان میں اپنے عقائد کی اشاعت کرنے کے بعد ۱۸۲۲ء ۱۲۳۷ھ میں حج کو گئے۔ مکّہ معظمہ سے قسطنطنیہ گئے۔ چھ سال تک ترکی اور ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کر کے اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے رہے۔ پھر دہلی واپس آ کر پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اشاعت عقائد شروع کر دی، اور آخر انتہائے جوش میں سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۲۸ء ۱۲۴۴ھ میں مولوی اسمٰعیل کو ساتھ لیکر عظیم الشان لشکر کی قیادت کرتے ہوئے سکھوں سے جنگ کرنے کے لئے پشاور کو روانہ ہو گئے۔ ان کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے مشاہیر ملک اور اہل دولت ان کے معاون و مددگار تھے۔ ۱۸۲۹ء میں انھوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا، لیکن ان کے عقائد و اصول کی سخت گیری سے تنگ آ کر سرحدی افغانوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور یہ پشاور چھوڑ کر دریائے اٹک کے پار پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ آخر ۱۸۳۱ء ۱۲۴۶ھ میں قلعہ بالاکوٹ

کے قریب سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے مولوی سید احمد و مولوی اسمٰعیل دونوں نے اثنائے سفر پنجاب میں سفر آخرت اختیار کیا اور شہید مشہور ہوئے۔

جب اس شکست کی خبر دہلی پہنچی تو مشہور شاعر شاہ نصیر نے ظرافت و تمسخر کے انداز میں طویل قصیدہ کہا، اس کے دو شعر یہ ہیں:-

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ ۔۔۔ نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی

ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے ۔۔۔ اگرچہ تھے دُمِ شملہ سے وہ شیر نیستانی

یہ قصیدہ دہلی میں مشہور ہوا تو اُن کے مرید پیر کی یہ توہین سُن کر برافروختہ ہوگئے، اور کثیر تعداد میں شاہ نصیر کے مکان پر چڑھ آئے۔ قریب تھا کہ شاہ صاحب دشمنوں کی زد میں آجائیں۔ لیکن کوتوال شہر میرزا خانی کو اطلاع مل گئی، وہ موقع پر پونہچ گئے اور شاہ نصیر کی جان بچالی۔ شاہ صاحب نے قصیدہ میں شکریہ کا اضافہ کیا! یہ شعر بھی کہا:-

نصیرالدین بیچارہ تو رستہ طوس[۵] کا لیتا ۔۔۔ نہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

مولوی سید احمد بریلوی نے اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ فارسی میں تنبیہ الغافلین لکھی ہے جس کا اردو میں ترجمہ مولوی عبداللہ نے ۱۸۳۰ء میں ہگلی (کلکتہ) سے شائع کیا تھا۔ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے کئی کتابیں اپنے عقائد کے متعلق اردو میں لکھیں، جن میں سے تقویت الایمان بہت مشہور ہے۔ اُس زمانے میں مولوی سید احمد کے اور مریدوں نے بھی بہت سی کتابیں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے لکھیں مثلاً ترغیب جہاد ہدایۃ المومنین، نصیحۃ المومنین وغیرہ۔ یہ کتابیں بھی اُردو کی ترقی کے سلسلے میں شامل ہیں۔ مولوی اسمٰعیل کی تقویت الایمان بہت صاف و سلیس زبان میں ہے۔ صرف کہیں کہیں ترتیب الفاظ اور انداز بیان میں قدامت ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

"ہر خاص و عام کو چاہئے کہ اللہ و رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اسی کو سمجھیں اور اسی پر چلیں، اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو سننا چاہئے کہ ایمان

---

۵ طوس کے لفظ سے شاہ نصیر نے اپنے ہمنام خواجہ نصیرالدین طوسی کی طرف اشارہ کیا ہے، ورنہ رستہ تو ملک عدم کا لیتے۔

دو جز ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا اور خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسول کا رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے۔ اس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو شرک، اور دوسری بات کو اتباع سنّت کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو بدعت۔ سو ہر کسی کو چاہئے کہ توحید اور اتباع سنّت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے، کہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں اور باقی گناہ ان سے پیچھے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں۔"

تقویت الایمان کثرت سے شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصہ کا انگریزی ترجمہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔

سید اعظم علی اکبرآبادی

آگرہ کے رہنے والے، مولوی بر علی کے بیٹے تھے۔ ان کے نانا آگرہ کے مشہور بے نظیر عالم و صاحبدل بزرگ مولوی ولی محمد (شارح مثنوی مولانا روم تھے) ان کے سایہ میں مولوی اعظم علی نے پرورش پائی تھی۔ تحصیل علوم کے بعد مین پوری میں محصّلِ لگان رہے۔ پھر آگرہ کالج میں فارسی کے مدرس ہو گئے۔ علمی مذاق رکھتے تھے، صاحب تصانیف ہیں۔ ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں سکندر نامہ کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۲۴ء ۱۲۴۰ھ میں فسانہ سرور افزا اردو میں لکھا۔ ۱۸۴۵ء ۱۲۶۱ھ میں ایک فارسی مثنوی "اکسیر اعظم" لکھی۔ یہ آخری تصنیف ہے۔ مرزا غالب سے مولوی اعظم علی کے مراسم خط و کتابت تھے۔ غالب کے پنج آہنگ میں مولوی صاحب کے نام بھی ایک فارسی کا رقعہ ہے۔ فسانۂ سرور افزا کا نمونہ یہ ہے، حمد باری تعالیٰ لکھتے ہیں:-

"احسان ایسے بادشاہ عادل اور شہنشاہ باذل کا کہ جس نے واسطے عبادت و معرفت اپنی ذات کے انسان ضعیف بنیان کے تئیں تہ خانۂ ظلمات عدم سے نکال کر خلعت جواہر نگار حیات ابدی کا عنایت فرمایا، مقدور کس بشر کا ہے کہ زبان بیان

سے ادا کر سکے، اور شکر ایسے ہادی برحق و کریم مطلق کا کہ ایسے مشتِ خاک سراسر ناپاک کے تئیں تمامی مخلوقات و موجودات سے ممتاز و سرفراز کر کے نورِ عقل و شمعِ ایمان سے منوّر کیا، طاقت کس کی ہے جو ایک حرف اس دفترِ بے پایاں سے بیان کرے۔ ایسا خداوند حقیقی ہے کہ ہر ذی حیات کو بے رعایت سلسلۂ طاعت و عبادت کے، شام و صباح وظیفہ خوارِ نعمتوں بے قیاس کا رکھتا ہے، اور عجب رزاقِ مطلق ہے کہ مور سے مار تلک کسی جاندار کو اپنے مائدۂ فضل و نوال سے محروم و مایوس نہیں کرتا ہے۔"

یہ عبارت ترجمہ نہیں ہے، مصنف کی طبع زاد تحریر ہے، لیکن اسلوب ترجمہ کا سا معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں فارسی پڑھنے لکھنے کے سبب درسیات وادبیات فارسی کا طرزِ بیان ذہن نشین ہوتا تھا، وہی انداز اپنی آزادانہ نگارش میں بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کو بدلنا اور سلاست و روانی پیدا کرنا اپنی اپنی افتادِ طبیعت اور اقتضائے حال کے مطابق ہو سکتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کا مقصد ہی سادہ و آسان اردو لکھنا تھا۔ اس لئے اکثر ایسی ہی لکھی گئیں، پھر بھی سب کا طرز ایک سا نہیں ہے۔ میرامن اور حیدری نے ترجموں کو بھی اپنا کر لیا ہے، افسوس پورے کامیاب نہ ہو سکے، امانت اللہ بالکل ناکام رہے۔ لطف نے سلاست و سادگی کے جھگڑے ہی میں پڑنا پسند نہ کیا۔ اپنی وہی قدامت کی آن قائم رکھی۔ جب کالج کے متعین مقصد اور متحدہ کوشش کا یہ حال ہے، تو کالج سے باہر تو کوئی پابندی تھی ہی نہیں۔ انشا اور قتیل ذہین، طبّاع، جدّت پسند تھے، بہتر سے بہتر اردو لکھ گئے، اور لوگ اپنی اپنی روش پر چلتے رہے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

لکھنؤ کے سب سے پہلے مصنفِ نثر ہیں۔ مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے ہیں۔ غالباً ۱۷۸۶ء ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ (مرزا غالب سے دس برس پہلے)۔ فنِ خوشنویسی کے بڑے

ماہر و استاد تھے۔ موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم بھی کافی پائی تھی۔ شاعری میں آغا نوازش حسین کے شاگرد تھے۔ نہایت ظریف، زندہ دل، خوش رو، خوش خو آدمی تھے۔ نواب غازی الدین حیدر شاہ اودھ (عہد وزارت و سلطنت ۱۸۱۴ء ۱۲۲۹ھ تا ۱۸۳۷ء ۱۲۴۳ھ) کے حکم سے جلاوطن ہو کر لکھنؤ سے کانپور چلے گئے، کانپور میں حکیم سید اسد علی کے مشورے سے اپنی مشہور تصنیف فسانۂ عجائب لکھنی شروع کی۔ جب ۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے سرور کو درباری شاعر مقرر کیا اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی۔ ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ ختم ہو گئی اور بادشاہ معزول ہو گئے، پھر ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں غدر کی تباہی آئی۔ سرور اسی عرصہ میں

۵ مختصر تاریخ وزارت و شاہی اودھ

(۱) شاہان اودھ کا مورث اعلیٰ خراسان کا تاجر محمد امین تھا جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ اس کا باپ محمد نصیر بہادر شاہ (بن اورنگ زیب عالمگیر) بادشاہ دہلی (۱۷۰۷ء ۱۱۱۹ھ تا ۱۷۱۲ء ۱۱۲۴ھ) کے عہد سلطنت میں ہندوستان آیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد محمد امین ہندوستان میں آیا اور نواب سربلند خاں صوبہ دار گجرات کے دربار میں ملازم ہوا۔ پھر صوبہ دار سے ناراض ہو کر دہلی آگیا، اور فرخ سیر بادشاہ دہلی (۱۷۱۳ء ۱۱۲۵ھ تا ۱۷۱۹ء ۱۱۳۱ھ) اور محمد شاہ (۱۷۱۹ء ۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں ہنڈون و بیانہ کا فوجدار رہا۔ ایک موقع پر سادات بارہہ کے مقابلے میں محمد شاہ کی مدد کی۔ بادشاہ نے سعادت خاں بہادر کا خطاب دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا اور برہان الملک کا خطاب عنایت کیا۔ جب ۱۷۳۹ء ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کابل و پشاور و پنجاب فتح کرتا ہوا حملۂ دہلی کے ارادے سے پانی پت تک آگیا تو برہان الملک سعادت خاں نے اودھ سے آکر محمد شاہ کی مدد کی اور پانی پت پر بادشاہ کے ساتھ نادر شاہ سے جنگ کی۔ اتفاق سے برہان الملک اور نظام الملک آصف جاہ دونوں نادر شاہ کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ نادر شاہ نے محمد شاہ کو بھی بارادۂ صلح اپنے خیمہ میں بلا لیا اور جنگ ختم کر کے ان سب کو ساتھ لیکر نادر شاہ دہلی آگیا۔ نظام الملک برہان الملک کا دشمن تھا اور اس کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہا تھا۔ جس صبح کو نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کیا اس سے پہلی رات کو نظام الملک، برہان الملک (باقی بصفحۂ آیندہ)

سخت پریشان رہے۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ بنارس نے اپنے پاس بُلالیا، پھر مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ نے بھی مہمان بُلالیا، مہاراجہ پٹیالہ نے طلائی کڑے نذر کئے۔ سرور نے ایک خط میں اپنے سفر دہلی ومیرٹھ و راجپوتانہ کے مصائب کا حال لکھا ہے۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لئے کلکتہ گئے اور واجد علی شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے جو مٹیابرج میں نظر بند تھے۔ وہاں سے واپس آکر بنارس چلے گئے اور وہیں سنہ ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ سرور کی تصنیفات یہ ہیں:-

---

(بقیہ صفحہ ۱۵۹) کے پاس آیا اور کہا کہ نادر شاہ کہتا ہے اگر پچاس کروڑ روپیہ مجھے دیدو تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔ اتنا روپیہ کہاں ہے۔ لیکن یہ دن آج میرے لئے ہے کل تمہارے لئے۔ اس بے آبروئی سے موت بہتر، اس لئے ہم تم دونوں زہر کے پیالے پی کر اپنا کام آپ تمام کرلیں۔ برہان الملک سادہ دل آدمی تھا۔ کہنے میں آگیا۔ اور زہر پی کر جان دیدی۔ نظام الملک آرام سے اپنے گھر آکر سورہا۔ برہان الملک کے بعد محمد شاہ نے اس کے بھانجے صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ دار بنادیا۔

(۲) **منصور علی خاں صفدر جنگ** (۱۷۲۹ء / ۱۱۵۱ھ تا ۱۷۵۴ء / ۱۱۶۷ھ) اس عہد میں روہیلہ افغانوں نے اودھ پر حملہ کیا اور صفدر جنگ نے ان کو شکست دی۔ مقبرۂ صفدر جنگ دہلی کی مشہور عمارت ہے جس سے روضہ تاج آگرہ کا نقشہ لیا گیا ہے۔ صفدر جنگ کا باپ جعفر خاں جس سے سعادت خاں کی بہن منسوب تھی سادات میں سے نہ تھا بلکہ آرمینیا کی مشہور ترکمان قوم قرا قویونلو سے تھا۔ صفدر جنگ کی ماں سیدانی تھی۔

(۳) **شجاع الدولہ** (۱۷۵۴ء / ۱۱۶۷ھ تا ۱۷۷۵ء / ۱۱۸۸ھ) صفدر جنگ کا بیٹا تھا۔ تاریخ ہندوستان کا بڑا نامور اور ہنگامہ پرور آدمی ہے۔ انگریزوں سے جنگ کی شکست کھائی اور صلح کرلی۔ روہیلوں سے لڑا اور کامیابی پائی۔ اسی کے زمانے میں روہیلہ پٹھانوں کی ریاست رام پور کی بنیاد پڑی۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پانی پت پر تیسری مشہور جنگ ہوئی (۱۷۶۱ء / ۱۱۷۵ھ)

(باقی بصفحہ ۱۶۱)

(۱) **فسانۂ عجائب** ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء میں لکھی۔ (۲) سرورِ سلطانی ترجمہ شمشیر خانی، ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کے حکم سے مرتب کی۔ کسی نے شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ نثر فارسی میں شمشیر خانی کے نام سے لکھا تھا۔ سرور نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ (۳) شررِ عشق ۱۸۵۶ء میں نواب سکندر جہاں بیگم ریاست بھوپال کے حکم سے لکھا، یہ بھوپال کے جنگل کے پرندوں کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ (۴) شگوفہ محبت بھی اسی سال ۱۸۵۶ء میں لکھا۔ یہ قصہ پہلے مہر چند کھتری نے لکھا تھا۔ اسی کو سرور نے اپنے رنگ میں لکھا۔ (۵) گلزارِ سرور، ترجمہ حدائق العشاق فارسی۔ یہ مذہبی کتاب ہے جس میں روح و عشق کا مناظرہ دکھایا ہے۔ سرور نے اپنے مخصوص طرز رنگین و مقفیٰ

بقیہ صفحہ ۱۶۰

(۴) **آصف الدولہ** (۱۱۸۸ھ ۱۷۷۵ء تا ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء) بن شجاع الدولہ، بڑے شان و شوکت کا نواب تھا۔ اس کا زمانہ نسبتہً پُرامن رہا۔ شجاع الدولہ تک نوابان اودھ کا مرکز حکومت فیض آباد رہا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا۔ مقبرہ آصف الدولہ ہندوستان کی بے نظیر عمارتوں میں شامل ہے۔ سلطنت مغلیہ کی بربادی کے سبب سے دہلی کے شعراء اہل کمال شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے زمانے میں اودھ آئے۔ مرزا سودا، میر تقی میر، میر حسن، میر سوز انہی زمانوں میں لکھنؤ آئے۔ اور ان کے آنے سے لکھنؤ میں شعر و سخن کی رونق ہوئی۔ آصف الدولہ خود بھی شاعر تھا، اچھا کہتا تھا۔

(۵) **وزیر علی خاں** (۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء) میں صرف چار مہینے حکومت کی۔ آصف الدولہ کا فرزند اکبر تھا۔ لیکن اس کی بدکرداری کے سبب سے خود اس کی دادی بہو بیگم والدۂ آصف الدولہ اور چند امراء و اعیان سلطنت مخالف ہو گئے اور انگریزوں کی مدد سے معزول کرا دیا۔ رعایا وزیر علیخاں کی طرفدار تھی لیکن ان کی کچھ نہ چلی۔ وزیر فورٹ ولیم کلکتہ میں مقید رہا اور وہیں ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۶ء میں انتقال کیا۔

(۶) **سعادت علی خاں** (۱۲۱۲ھ ۱۷۹۸ء تا ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء) آصف الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ بھائیوں میں نباہ نہ ہو سکتا تھا اس لئے سعادت علی خاں لکھنؤ سے باہر بریلی، آگرہ، ڈیگ (بھرتپور) وغیرہ میں اقامت گزیں رہا۔ لیکن انگریزوں سے برابر خط و کتابت کرتا رہا کہ آصف الدولہ کے بعد اسی کو حکومت دی جائے۔ جب وزیر علی خاں کو انگریزوں نے معزول کیا تو (باقی صفحہ آئندہ)

میں لکھا ہے۔ مرزا غالب نے اسی طرز میں اس پر تقریظ لکھی ہے۔ (۶) شبستانِ سرور اس میں الف لیلہ کے چند قصوں کا ترجمہ ہے۔ (۷) انشائے سرور، مرزا سرور کے خطوط کا مجموعہ جو ان کے بعد مرتب و شائع ہوا۔ ان میں سے بعض کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ **سرورِ سلطانی ترجمہ شمشیر خانی** کی عبارت مقفیٰ ہے۔ شاہنامہ نثر اُردو میں لکھا ہے۔ یہ کتاب مشہور و مقبول نہ ہوئی، حالانکہ سرور کا مخصوص اسلوب تحریر اس میں بھی موجود ہے۔ سہراب و رستم کی آخری جنگ سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:-

بقیہ صفحہ گذشتہ

سعادت علی خاں سے یہ شرط کی کہ اگر تم نصف ملک ہمیں دیدو اور نصف اپنی حکومت رکھو تو تم کو حکمراں بنائے دیتے ہیں۔ سعادت علی خاں نے منظور کر لیا۔ اور معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ اس طرح کوڑہ، کڑہ، فرخ آباد، الہ آباد، بریلی وغیرہ بہت سا ملک ہاتھ سے نکل گیا اور ایک کرور ۲۵ لاکھ ۲۳ ہزار ۴ سو ۸۵ روپیہ کا نقصان ہوگیا۔ دوسری عجیب و غریب نادانی سعادت علی خاں نے یہ کی کہ ہندوستان پر اپنا سکہ جمانے کے لئے تمام ممالک محروسہ انگریزی کا اس شرط کے ساتھ ٹھیکہ لینا چاہا کہ کرور ہا روپیہ زر پیشگی دینے کا وعدہ کیا۔ اس کام کے لئے ایک انگریز مسٹر اڈرلی کو لندن بھیج کر بادشاہ اور پارلیمنٹ کے سامنے ٹھیکہ کی درخواست پیش کردی۔ اسی زمانے میں لارڈ ہسٹنگز گورنر جنرل ہو کر آرہا تھا۔ اس معاملہ کی سعی و سفارش کے لئے لارڈ کو ایک کرور روپیہ بھیج دیا۔ لارڈ ہندوستان آنے لگا تو اس نے سعادت علی خاں کو خط لکھا کہ میں آتے ہی تمہارا کام کر دوں گا۔ نواب اس خوشی سے ایسا پھولا کہ اپنے دربار میں اس کا ذکر کر دیا۔ یہ غلطی پر غلطی ہوئی۔ لکھنؤ کا ریزیڈنٹ کرنل بیلی پہلے ہی سے نواب کا دشمن تھا۔ اس نے بھی سُن لیا۔ اتفاق سے انہی دنوں میں نواب عارضہ جگر و استسقاء میں مبتلا ہوا۔ غسل صحت کے بعد سواری پر باہر گیا۔ رات کو ماکر یخنی مانگی نواب کے سالے رمضان علی خاں نے زہر ملا کر یخنی پیش کر دی پیتے ہی زہر سرایت کر گیا اور خاتمہ کر دیا۔ نواب سعادت علی خاں بڑا زندہ دل، شاعرانہ مزاج تھا۔ علم و فن اور شعر و ادب کا بڑا قدرداں تھا۔ سید انشاء اللہ خاں، مصحفی، مرزا قتیل، راجہ گلاب رائے گلشن، اسی دربار کے شعرا تھے۔

(۷) **غازی الدین حیدر** (وزارت ۱۸۱۴ء ۱۲۲۹ھ تا ۱۸۱۹ء ۱۲۳۴ھ۔ شاہی ۱۸۱۹ء ۱۲۳۴ھ تا ۱۸۲۷ء ۱۲۴۳ھ)
سعادت علی خاں کا فرزند اکبر تھا۔ چند سال وزارت ولوابی کے بعد لارڈ ہیسٹنگز نے غازی الدین حیدر کو

"دوسرے دن جس وقت تہمتنِ مشرق (آفتاب) آغشتہ بخوں سمندِ نیلگوں (آسمان) پر سوار ہوا، سہراب رستم سے دو چار ہوا۔ آخر کار تہمتن نے نوہ کیا، کوہ دماموں کا جگر پارہ کیا، اور سہراب کا کمربند پکڑ کے سر سے بلند کر کے زمین پر دے ٹپکا، اور فوراً کمر سے خنجر آبدار نکال اس کے سینہ کو چاک کر دیا۔ سہراب نے آہ سرد دلِ زخمی وُپر درد سے کھینچی اور کہا افسوس مشتاقِ دیدارِ پدر، محروم و ناکام پسر، دارِ ناپایدار سے چلا، تہمتن شیر افگن نہ ملا۔ مگر اب تو مچھلی بنکر زیر قدم گا و زمین پناہ لے جائے گا یا اختر ہو کر فلک ہفتمیں پر اپنے تئیں چھپائے گا"

بقیہ صفحہ ۱۶۲

مستقل بادشاہ بنادیا۔ اور سلطنت دہلی سے تعلق منقطع کر دیا۔ یہ نواب بھی علم دوست تھا۔ اس کے زمانے میں لکھنؤ میں ٹائپ اور لیتھو کے مطبع قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و طبع ہوئیں۔ رجب علی سرور، فقیر محمد خاں گویا، شیخ ناسخ، خواجہ آتش، خواجہ وزیر اسی زمانے میں تھے۔

(۸) **نصیر الدین حیدر** (۱۸۲۷ء ۱۲۴۳ھ تا ۱۸۳۷ء ۱۲۵۲ھ) اس کے زمانے میں شاہی خاندان میں بہت فتنہ و فساد رونما ہوا۔ اس بادشاہ کی محبوب ملکہ نواب قدسیہ بیگم تھی۔ کسی بات پر بادشاہ اس سے بدظن و بددل ہو گیا، اس نے زہر کھالیا۔ بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا، اور اس نے ماتمی سیاہ لباس پہننے کا نام رکھا اور اہلِ خاندان کو حکم دیا۔ بادشاہ کی والدہ بادشاہ بیگم بہو سے ناراض تھی اس نے ماتم کرنے سے انکار کیا۔ بادشاہ ماں سے ناراض ہو گیا۔ اور اس کو الماس باغ میں رہنے کا حکم دیا۔ بادشاہ کا فرزند اکبر مرزا فریدون بخت عرف مُنّا جان اپنی ماں کے مرنے کے بعد سے دادی کے پاس رہتا تھا وہ بھی بادشاہ بیگم کے ساتھ چلا گیا۔ بادشاہ نے لڑکے کو اپنے پاس رکھنا چاہا بیگم نے نہ بھیجا۔ بادشاہ بیٹے سے بھی ناراض ہو گیا، اور اعلان کر دیا کہ فریدون بخت بادشاہ زادہ ہی نہیں ہے اس طرح ماں بیٹے (بادشاہ بیگم اور نصیر الدین حیدر) کی رنجش و عناد کا بہت طول ہو گیا۔ آخر میں بادشاہ نے ماں کو راضی کرنا چاہا تو وزیر الممالک نے آتش فتنہ کو اور بھڑکا دیا اور کسی طرح صلح نہ ہونے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو زہر دیدیا گیا۔ نصیر الدین حیدر نے بھی اہلِ کمال کی بہت قدر کی۔ جدید مطابع جاری ہوئے۔ بعض نادر کتابیں عربی و فارسی کی شائع ہوئیں۔ (باقی بصفحہ ۱۶۴)

میرا باپ کیسی منھ نہ موڑے گا، کسی طرح تجھ کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ رستم نے پوچھا اس کا کیا نام ہے۔ سہراب نے کہا رستم جہاں پہلوان ہے اور میری ماں دختر شاہ سمنگاں ہے۔ یہ سنتے ہی دنیا رستم کی نظر میں تیرہ و تار بن گئی۔"

۲۔ گلزار سرور۔ اس کے آغاز میں سرور نے کچھ اپنا حال اور تالیف کتاب کا سبب بیان کیا ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور رنگین نگاری سرور کی ہر جگہ خصوصیت ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"یہاں سے نقاش ثانی معترف نادانی، گردش دیدہ بلا رسیدہ، یار و دیار سے دور، رجب علی بیگ سرور، اپنی گذشتہ داستانِ حیرت بیان لکھتا ہے۔ بارہ سو چوہتر ۱۲۷۴

بقیہ صفحہ ۱۶۳

(۹) **محمد علی شاہ** (۱۸۳۷ء ۱۲۵۲ھ تا ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ) نصیر الدین حیدر کی وفات ناگاہ کی خبر پاتے ہی لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ جنرل لو نے نصیر الدین حیدر کے چچا نصیر الدولہ خلف نواب سعادت خاں کو تخت نشیں کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ ابھی نصیر الدولہ ملبوس شاہی پہننے میں مشغول تھا کہ بادشاہ بیگم اپنے پوتے نصیر الدین حیدر کے لڑکے مرزا فریدوں بخت کو لیکر آ گئی۔ اور اس کو تخت نشیں کرنا چاہا۔ دولت خانہ شاہی کا دروازہ ریزیڈنٹ کے حکم سے بند تھا۔ بادشاہ بیگم نے ہاتھیوں کے ذریعہ سے دروازہ توڑ ڈالا اور فریدوں بخت کو تخت پر بٹھا دیا اور نذریں لینا اور احکام شاہی جاری کرنا شروع کر دیا۔ ریزیڈنٹ نے آ کر بیگم کو سمجھایا کہ مداخلت کرنا بیگم کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ لیکن اس نے نہ مانا۔ ریزیڈنٹ نے انگریزی فوج بلالی اور توپوں کے فیر کا حکم دیدیا۔ بادشاہ بیگم کے حمایتی کچھ کام آئے کچھ فرار ہو گئے۔ بادشاہ بیگم اور فریدوں بخت گرفتار ہو گئے اور نصیر الدولہ محمد علی شاہ کا لقب اختیار کرکے بادشاہ بن گیا۔ نیک دل اور مخیّر تھا، لیکن اس کے

عہد میں بعض کمینوں کو بہت عروج ہوا، لکھنؤ کی حد میں سب سے بے نظیر عمارت امام باڑہ حسین آباد اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔ بادشاہ نے اس امام باڑہ کے مصارف کے لئے بارہ لاکھ روپیہ انگریزی خزانہ میں جمع کر دیئے تھے کہ ان کے سود سے مصارف کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یہ انتظام آج تک بدستور جاری ہے۔ (باقی صفحہ ۱۶۵)

ہجری شہر شعبان میں فلک نے وہ سامان کیا، گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آگئی، اس شعبدہ باز کہن نے نئی نیرنگی دکھائی .... بے فکری اس جا کی دور دور مشہور تھی، بقول مشہور لنگوٹی میں پھاگ کھیلتی تھی، فاقہ کشی میں ڈنڈ پیلتی تھی، اپنے زعم میں قیصر و فغفور تھی، ایسی چمک دمک ہوئی کہ حد سے گذر گئی۔ ہر کمامے راز دامے، فلک کو اجاڑنا اس کا نام و نشان بنا کے بگاڑنا منظور تھا، دگرنہ نہ بادشاہ کے دل میں نہ یہاں کی رعایا کی طبیعت میں فتور تھا۔ حضرت واجد علی شاہ سلطان عالم نے نو برس محمد شاہی کی، اس پر سرکار سے سرتابی نہ کی بلکہ خیر خواہی کی، قیصر باغ کو غیرت گلزار ارم بنایا تھا، کیا لکھوں دن رات جو لطف اٹھایا تھا۔ خدا جانے کس کمبخت کی نظر اس شہر کو کھا گئی، امیر فقیر سب پر تباہی آگئی .... ہند میں فوج سرکار قدیم نمک خوار، پیادہ اور سوار، شامت اعمال سے پھر گئے، غربا سے امرا تک بلا میں گھر گئے۔ جا بجا شور و شر مچایا۔ قتل و غارت سے فساد ہوا، لچّوں کا کیا بگڑا، ہندوستان اس بکھیڑے میں برباد ہوا۔ پہلے دہلی اجڑی، پھاٹک ٹوٹا، پھر لکھنؤ لٹا، یہاں تک کہ بے چراغ ہوا، بے بہمن و دے پامال خزاں خانہ باغ ہوا۔"

۳۔ فسانۂ عجائب ۔ یہ سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسی سے ان کا

بقیہ صفحہ ۱۶۴

(۱۰) **امجد علی شاہ** (۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء تا ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء) یہ بڑا مذہبی بادشاہ تھا۔ امور مملکت و عدالت کا اختیار کلی مجتہد العصر کو سپرد کر دیا تھا۔ مجالس عزا و مرثیہ خوانی کا اہتمام پہلے سے زیادہ اس کے عہد میں ہوا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے کمال کو اسی زمانے میں عروج شروع ہوا۔

(۱۱) **واجد علی شاہ** (۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء تا ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۶ء) یہ بادشاہ عیش و عشرت کی طرف اس قدر راغب تھا کہ بعض کوتہ نگاہ پست فطرت لوگوں کو دخل اندازی کا موقع مل گیا اور نظام سلطنت بگڑنے لگا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے چند بار متنبہ کیا گیا، کچھ توجہ نہ ہوئی۔ آخر غدر سے ایک سال پہلے ۱۸۵۶ء میں بادشاہ کو معزول کر کے اودھ کا حکومت انگریزی سے الحاق کر لیا۔ شاہی اودھ ختم ہو گئی۔ بادشاہ کو کلکتہ کے فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا (باقی بصفحہ آئندہ)

نام زندہ ہے۔ اُردو انشا پردازوں میں ان کا ایک انفرادی درجہ قائم ہے۔

فسانۂ عجائب کی چند خصوصیات یادگار و قابل ذکر و توجہ ہیں:۔

(۱) فسانۂ عجائب کی رنگین و مقفّٰی عبارت اُس زمانہ قدیم کے طرز نگارش سے جُدا گانہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس رنگ کی کم سے کم دو کتابیں ممتاز ہیں۔ فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا، اور تحسین کی نوطرز مرصع۔ ان کے گذشتہ نمونوں سے ظاہر ہے کہ قافیہ پیمائی، عبارت آرائی، عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب، زور قلم اور علمی شان میں کسی سے کم نہیں۔ یہی حال فسانۂ عجائب کا ہے۔ پھر بھی سرور نے

بقیہ صفحۂ گذشتہ

اسی سال بادشاہ نے الحاق اودھ اور واپسی سلطنت کی داد فریاد کے لئے ایک وفد انگلستان کو ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجا۔ اس وفد میں جناب عالیہ ملکہ کشور اور مرزا ولی عہد اور مرزا سکندر حشمت (مخاطب بہ جرنیل صاحب) اور مولوی مسیح الدین خاں کاکوروی خاص لوگ تھے اور بہت سے ان کے مصاحب و خادم تھے۔ یہ لوگ انگلستان پونہچے۔ ملکہ سے ملاقات کی، لیکن ساتھ کے کینہ طبع لوگوں نے ارکان وفد میں اختلاف رائے پیدا کر دیا۔ ادھر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں غدر ہوگیا۔ اور ولایت کے انگریزوں نے الحاق اودھ کو بھی غدر کا ایک سبب قرار دے دیا۔ بغرض یہ وفد ناکام رہا۔ واپسی میں فرانس میں ملکہ کشور اور مرزا سکندر حشمت کا انتقال ہوگیا۔ مرزا ولی عہد بادشاہ کے پاس کلکتہ آگئے۔ بادشاہ قلعہ فورٹ ولیم سے مٹیا برج میں منتقل کر دیئے گئے۔ یہاں نسبتہً بہت عیش و راحت اور یک گونہ آزادی نصیب ہوگئی۔ قلعہ میں بالکل قید ہی تھی ۱۸۸۷ء ۱۳۰۴ھ میں مٹیا برج میں انتقال کیا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ کو عیش و نشاط کے علاوہ علوم و فنون، صنعت و تجارت میں بھی بہت ترقی ہوئی۔ قیصر باغ اسی کی یادگار ہے۔ واجد علی شاہ خود شاعر تھا، اختر تخلص تھا۔ چھ دیوان غزلیات، تین جلد مراثی، چند مثنویاں اور بہت سے مجموعے نظم و نثر کے تصنیف کئے۔ جن کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ دیگر مشاہیر شعر و ادب کے نام یہ ہیں:۔ مرزا رجب علی سرور، میر اصغر علی خاں نسیم دہلوی، نواب محمد خاں رند، مظفر علی خاں اسیر، آفتاب الدولہ قلق، نظر حسن اوج، عابد علی کوثر، علی اوسط رشک، منیر شکوہ آبادی۔ امیر مینائی، امانت، برق، بحر وغیرہ۔

اس روش کو اعتدال کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ مسلسل بیان میں کچھ دیر کے لئے قافیے بھی ترک کر دیتے ہیں اور ثقیل الفاظ سے روانی و صفائی میں کمی نہیں آنے دیتے۔ اس لئے لفظی و تحسین کی سی تعقید اور گنجلک کم پیدا ہوتی ہے اور تحسین کی سی ثقالت و معائبت شاذ و نادر پیدا ہوتی ہے۔

(۳) فسانہ عجائب کے اسلوب تحریر کو اب کیسا ہی سمجھا جائے اور کسی نظر سے دیکھا جائے، لیکن یہ قدیم زمانے کا محبوب و مقبول انداز تھا اور علم انشا کا کمال گنا جاتا تھا۔ اس لئے اس کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے، اس لفظی آرایش اور علم و قابلیت کی نمایش سے موزوں اور ناموزوں دونوں کام لئے جا سکتے ہیں۔ مرزا سرور کی تحریر میں بھی مناسب نامناسب دونوں انداز موجود ہیں۔ مثلاً سرور کہیں عربی و فارسی تراکیب، تشبیہ و استعارہ سے محاکات و منظر کشی کرتے ہیں، لیکن ناکام رہتے ہیں۔ یعنی وہ منظر آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔ دیکھئے، رات گزرنا اور دن نکلنا بیان کرتے ہیں:-

"جس وقت زاغِ شب نے بیضہ ہائے انجم آشیانہ مغرب میں چھپائے، اور صیادانِ سحر خیز دام بر دوش آئے، اور سیمرغ زریں جناح مطلا بال غیرت لال قفس مشرق سے جلوہ افروز ہوا، یعنی شب گذری روز ہوا۔"

یا ایک جگہ "سردی کی شدت" دکھانے کے لئے یہ فقرے لکھتے ہیں:-

"آتش رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی، باغ میں بھی جاڑے کی دہائی تھی، اوس برگ و بار کی صنعت پر در دگار کی دکھاتی تھی، مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی، دانہ ہائے اشک شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے، ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔"

اس سے سردی کا سماں پیش نظر نہیں ہوتا لیکن اسی سردی کو جب اسی مقفّیٰ انداز میں لیکن واقعات کے ساتھ اور قریب واقعہ تشبیہوں کی مدد سے بیان کرتے ہیں تو پوری منظر کشی ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"دو چلّے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی، گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی سردی سے سب کا جی جلتا تھا دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا، زمانے کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا، ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی، گو وہ ترعی شرر تھا، لیکن سردی کو بھی لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔"

(۳) سرور حسب موقع زبان اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ عربی و فارسی کے استعمال کی مثالیں اوپر مذکور ہوئیں۔ ضرورت پر آیات قرآن مجید بھی تضمین کر دیتے ہیں مثلاً:—

"لیکن باس حکومت و ثروت کا نشانہ امید کا چراغ گل۔ اولاد بالکل نہ تھی، خواہش فرزند دردل، ہونے کی خواہش متصل، حسرت پسر میں رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ ہر ساعت برزباں۔ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا وظیفہ دہاں۔ لڑکے کی تمنا میں بادشاہ مثل گدا دست دراز، ایسا لاپرواہ بے نیاز کی قدرت سے بانیاز۔"

یہ ان اس سے آگے جب اس بادشاہ کے ہاں فرزند پیدا ہوتا ہے اور بادشاہ شہزادہ کا جنم پتر کھلوانے کے لئے نجومی پنڈت کو بلاتا ہے تو سرور پنڈتوں کی مخصوص زبان اصطلاحات لکھتے ہیں:—

"نجومی پنڈت جھٹ وہاں حاضر ہوئے، بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی، مہاراج کا بول بالا، جاہ و حشم، مرتبہ دوبالا رہے، ہماری پوتھی کہتی ہے بھگوان کی دیا سے شہزادہ کا چندرمان بلی ہے، چھٹا سورج ہے جو گرہ ہے وہ بھلی ہے، دیگ تیگ کا مالک رہے، دھرم مورت یہ بالک رہے، جلد راج پر براجے پرتھمی میں دھوم مچے ایسی شادی رچے، مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں آئے گی، سنیچر پاؤں پڑے گا، ایک پنکھیرو سوے کے برن میں ہاتھ آئے گا تریا کی کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھوڑ ادیس بدیس لیے آئیگا

ذکر میں شاہزادہ بھٹکے کوئی پاس نہ پھٹکے، ساتھی چھٹیں، اپنے ڈیل سے
ڈانوا ڈول رہے، پھر ایک منکھ ٹھاکر کا سیوک کرپا کرے راہ لگائے
کوئی کلنکن سو ہبی ہوکشت لگائے۔"

(۴) اسی طرح مختلف فنون کی اصطلاحیں، تعریف در ذیل کا طرز کلام، اہل بازار و اہل حرفہ کی گفتگو وغیرہ مختلف اجزائے فسانہ مناسب زبان و بیان میں ادا کیا ہے۔ اس اعتبار سے فسانۂ عجائب اس مخصوص اسلوب تحریر کی پہلی بہترین و مکمل تصنیف ہے۔

(۵) اصل فسانہ میں کوئی خاص جدت نہیں ہے۔ خلاف قیاس واقعات اور عجائبات جیسے اس سے پہلے داستان امیر حمزہ وغیرہ میں ہیں، فسانۂ عجائب میں بھی ہیں۔

(۶) فسانۂ عجائب کو اس اعتبار سے مطالعہ کرنا ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ یہ داستانی لٹریچر کا جزو ہے۔ اس سے پہلے کم اور اس کے بعد بڑی کثرت سے نہایت طویل و ضخیم داستانیں لکھی گئیں۔ ان داستانوں میں اس کا کیا درجہ ہے؟ پھر فسانۂ عجائب کی تصنیف (۱۸۲۴ء) کے تقریباً چالیس برس بعد اردو میں جدید ناول نگاری کا دور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۶۲ء میں زنانہ ناول مراۃ العروس لکھا، اور پھر پے در پے متعدد ناول تصنیف کئے، اور پھر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ۱۸۷۸ء میں فسانہ آزاد لکھا ان ناولوں سے فسانۂ عجائب کا کیا مقابلہ ہے؟

(الف) داستانوں میں فسانۂ عجائب کو کوئی نمایاں مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد الف لیلہ اور بوستانِ خیال اور داستان امیر حمزہ اور اس کے سلسلے ایک الماری بھر داستانیں لکھی گئیں۔ جن میں سے ایک ایک فسانۂ عجائب سے کئی کئی گنی بڑی ہے اور واقعات و نیرنگ و فسوں اور تجربات و مشاہدات کی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔

(ب) ناولوں کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی فسانۂ عجائب کو کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی افرادِ قصّہ کا کیرکٹر، مربوط و مقرر پلاٹ، اشخاص کا مکالمہ، جذبات نگاری جدید ناول کے اصول سے مطابق نہیں ہیں۔ کہیں یہ اجزا درست ہیں، کہیں ناقص، مثلاً "ملکۂ مہر نگار" کا کردار مہر و وفا، صدق و صفا، ہمت و استقلال، دانائی و کاردانی صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ فسانۂ عجائب کا مقابلہ نذیر احمد، سجاد حسین، عبدالحلیم وغیرہ کے ناولوں سے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ سرشار کے فسانۂ آزاد سے اس اعتبار سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے کہ سرور نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں اور سرشار نے اپنے تمام فسانہ میں لکھنؤ کی معاشرت اور سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کا حال دکھایا ہے۔ لیکن سرور کی نقاشی ایسی ہے جیسے نمایش گاہ میں باتصویر پردہ جس پر بازاروں، مجلسوں، مجمعوں کی تصویریں صحیح کھنچی ہوں۔ لیکن بالکل خاموش اور بے حس۔ اور سرشار کی مصوری ایسی ہے جیسے سنیما کے پردہ پر چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویریں۔ سرور مختصر طور پر سرسری بیان لکھتے ہیں۔ سرشار چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل لکھتے ہیں۔ سرور قصّہ اور اس کے عجائبات سے دلچسپی رکھتے ہیں، سرشار قصّہ کو چھوڑ دیتے بلکہ بھول جاتے ہیں اور افرادِ قصّہ اور ان کے خصائص طبع و عجائب فطرت کو بیان کرتے ہیں۔ سرور میں ظرافت و شوخی کہیں نہیں، اور سرشار میں ہر جگہ اور ہر قت ہے۔

(۷) آخر میں سرور کے متعلق یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے فسانۂ عجائب کے دیباچہ میں میر امن دہلوی اور ان کے باغ و بہار پر چوٹیں کی ہیں، لکھتے ہیں:-

"اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اُردو زبان پر لائے، یا اس فسانہ کو بنظر نثاری کسی کو سنائے، اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہلِ زبان، کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا۔ وہاں چندے بودو باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا، فصاحت کا دم بھرتا، جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصّے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دین و حصّہ میں یہ زبان آئی ہے۔ دلّی کے روڑے ہیں کہ محاوروں کے ہات پاؤں توڑے ہیں، پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام

ہوتا ہے، مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے، بشر کو دعویٰ کب سزاوار

ہے، کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست

کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔"

حالانکہ میر امّن نے کسی کا نام لیکر چوٹ نہیں کی تھی۔ نہ اس زمانہ (۱۸۰۲ء) تک لکھنؤ کا کوئی نثار و مصنف مشہور ہوا تھا۔ بلکہ اس زمانے میں لکھنؤ میں بھی جو شاعر ممتاز و مقبول تھے (میر، جرأت، مصحفی، انشا، خلیق وغیرہ) وہ دہلی ہی کے تھے۔ میر امّن نے دہلی کے ٹکسال اور مرکز زبان ہونے کے سبب سے یہ لکھدیا تھا۔

"جو شخص دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار اُمرا کے دیکھے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر و تماشہ اور کوچہ گردی اس شہر کی کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔"

بہر حال رجب علی بیگ سرور کا یہ لعن طعن ہنگامہ آرائی کا سبب بن گیا۔ جس سے اُردو لٹریچر میں بھی اضافہ ہوا۔ یعنی سرور کے جواب میں خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی نے ایک قصّہ "سروشِ سخن" لکھا اور اس میں سرور کا جواب دیا اور اُلٹے اُلٹے اعتراض کئے یہ کتاب ۱۸۶۰ء میں لکھی گئی۔ اس کے جواب میں اور سرور کے حمایت میں جعفر علی شیون لکھنوی نے ۱۸۷۲ء میں ایک فسانہ "طلسم حیرت" لکھا، اس میں اہلِ دہلی کے طعنوں کا جواب دیا۔

"فسانہ عجائب" کے آغاز و اختتام تصنیف کے صحیح سنہ دریافت نہیں ہوئے۔ مرزا محمد عسکری صاحب نے "تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے کہ "۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے" اور یہ سنہ سرور کی تحریر سے ثابت کیا ہے۔ اس سے آگے لکھتے ہیں:- "کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی ...... یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانہ میں

شروع ہوئی تھی اور نصیرالدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی" اس کے بعد لکھتے ہیں،
"بعد اختتام بعہد نصیرالدین حیدر لکھنؤ میں آئی، اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۰ھ ہے جیسا کہ آخر کے قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے" یہ بیانات نہایت غیر مطابق اور غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ اگر ان سنوں کو صحیح مان لیا جائے تو سرور جس سال کانپور گئے اسی سال کے اندر یہ کتاب لکھ لی، اور آخر میں اسی سال کے قطعات تاریخ شامل کر دئے، یہ بالکل قرین قیاس ہے، لیکن ۱۲۴۰ھ (مطابق ۱۸۲۴ء) غازی الدین حیدر کے زمانے کا سال ہے۔ نصیرالدین حیدر کا عہد حکومت اس سے تین سال بعد ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۸۲۷ء) میں شروع ہوتا ہے، پھر اس کے لکھنے کے کیا معنی کہ "نصیرالدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی"

فسانہ عجائب کا طویل نمونہ دینے کی ضرورت نہیں، نہایت مشہور، عام و رائج کتاب ہے۔ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں اس کے اقتباسات شامل ہیں۔ ایک مختصر ٹکڑا درج کیا جاتا ہے جس میں عربی و فارسی کی لفاظی کم ہے روزمرہ و محاورہ زیادہ:—

"یہاں تو یہ حیص بیص تھی کہ جانعالم تشریف فرما ہوا۔ عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشم پر آب بادل کباب غیظ میں آ، تھرتھرا، طوطے سے بحث رہی ہے۔ شہزادہ نے فرمایا، خیر باشد؟ طوطا بولا آج نرا شر ہے، خیر نہیں۔ مگر چندے حیات اس وحشی کی اور آب و دانہ، قفس بیٹھا کھانا باقی تھا، اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے تو میرا طائر روح گربۂ غضب شہزادی سے مجروح ہو کر پرواز کر جاتا، ہر گز جیتا نہ پاتے، مگر پنجرا خالی دیکھ مزاج عالی پریشان ہوتا، بحسرت و افسوس یہ فرماتے ؎

طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدر ہوئی، شہزادہ سے کہا، اگر میری بات کا طوطا جواب صاف نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے ہاتھوں سے

اس کی آنکھیں ملوں گی جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔ جانعالم نے کہا کچھ حال تو کہو، طوطے نے گزارش کی، حضور یہ مقدمہ غلام سے سُنئے، آج شہزادی صاحب اپنی دانست میں بہت نکھر ع

دیکھ آئینہ کو کہتی تھی کہ اللہ رے میں!

مجھ سے پھر فرمایا، تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا، خدا نہ کرے! اس جُرم بیجا پر شہزادی کے نزدیک کُشتنی، سوختنی، گردن زدنی ہوں، بقول میر تقی میر ؎

بے جرم تہِ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو
کچھ بات بُری منہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جانعالم نے کہا، تم بھی کتنی عقل سے خالی، حمق سے بھری ہو، تم تو پری ہو، جانور کی بات پر اتنا آزردہ ہو، گو گویا ہے، پھر طائر ہے۔ یہاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی، آنکھ بدل روکھی صورت بنائی، اور ٹیں سے بولا، خداوند نعمت جُھوٹ جُھوٹ ہے، سچ سچ ہے، میں نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا، اگر راستی پر ہوتا گردن کٹ کے سیدھا گور میں سوتا۔ یہ سُن کے وہ اور مکدر ہوئی۔ مثل مشہور ہے، راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔

جانعالم نے مجبور ہو کر کہا جو ہو سو ہو، مٹھو پیارے سچ کہدو۔"

محمد بخش مہجور

شرفائے دہلی سے تھے، رسمی علوم میں اچھی دستگاہ تھی۔ شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ جرأت (متوفی ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء) کے شاگرد رشید تھے۔ میر و سودا کا زمانہ دیکھا تھا۔ نثر اُردو میں وہی طرزِ مقفیٰ ان کو بھی پسند تھا۔ گلشن بہار ان سے یادگار ہے، اُسی زمانہ کے گمنام مصنف ہیں، اس لئے ان کی کتاب میں سے حمد باری تعالیٰ کی چند سطری نقل کی جاتی ہیں کہ ان کا نام زندہ رہے:-

"حمد و سپاس و ثنائے بے قیاس، اس کریم کارساز، بے نیاز بے انباز بندہ نواز، بے چون و بے چگوں کو، کہ جس نے ساتھ ابر کرم اور بہار قدرت کے گل ہائے گوناگونِ انسان ضعیف البنیان سے گلشن تکوین کو سرسبز و شاداب کرکے اپنے تئیں ہر رنگ نکہت ہر غنچہ و گل میں جلوہ گر کیا ہے۔ فی الواقع بقول میاں جرأت کے ؎

اسے دیکھو تو ہے ہر رنگ میں وہ
عیاں گل میں، نہاں ہے سنگ میں وہ
وہ ہے ہر رنگ میں اور پھر جُدا ہے
خدا ہے وہ، خدا ہے وہ، خدا ہے"

نثر کا چوتھا دور

سنہ ۱۸۳۱ء تا سنہ ۱۸۷۰ء
۱۲۴۶ھ　۱۲۸۶ھ

اس سے پہلے اُن مصنفوں کا تذکرہ کیا گیا جو مصنفین فورٹ ولیم کالج کے ساتھ لیکن کالج سے باہر ہندوستان میں اردو نثر کی تصنیف و تالیف کر رہے تھے۔ یہ چوتھا دوَر ان کے بعد کے مصنفوں کا ہے جن کا زمانۂ تصنیف غدر (سنہ ۱۸۵۷ء) سے پہلے یا کچھ بعد ہے۔ یہ تیسرے اور چوتھے دوَر کی علیحدگی کسی خاص ادبی و لسانی تغیّر کے اصول پر نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اُنیسویں صدی کا نصفِ اول بلکہ دو ثلث تقریباً یکساں ہیں۔ زبان و انشا کی بے قاعدگی و با قاعدگی دونوں ساتھ ساتھ جاری رہی ہیں۔ سنہ ۱۸۰۱ء سے سنہ ۱۸۷۰ء تک، میر امّن سے معاصرینِ غالب تک بے اصول و با اصول دونوں طرح کے لکھنے والے رہے ہے۔ ہم نے فورٹ ولیم کالج کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر اس کو الگ دوَر میں رکھا ہے، اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسی زمانہ میں اور لوگ بھی اسی شاہراہ پر گامزن تھے۔ بیرون کالج والوں کو اُسی دوَر میں لکھ دیا ہے، یہ چوتھا دوَر اسی کے سلسلے میں بعد کے لوگوں کا ہے۔

سدا سکھ لال

سنہ ۱۸۳۲ء میں اُردو عدالتی و سرکاری زبان مقرر کی گئی، لیکن اس سے پہلے اہلِ ہند کی آسانی کے لئے دیوانی و فوجداری و مال گذاری کے قوانین کا اُردو میں ترجمہ شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۳ء (۱۲۱۷ھ) میں گورنمنٹ مغربی شمالی (جس میں موجودہ صوبجات متحدہ بھی شامل تھے) کی طرف سے "ہدایت نامہ مال گذاری" اُردو میں مرتب ہوا۔ یہ قانون کی سب سے پہلی کتابوں میں ہے جو اردو میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد بھی سلسلہ

جاری رہا۔ ۱۲۴۹ھ ۱۸۳۴ء میں منشی سدا سکھ لال نے **مجموعہ قوانین** (ایکٹ ہائے سپریم گورنمنٹ) مرتب کیا، جس میں ۱۷۹۳ء سے ۱۸۳۴ء تک جملہ ایکٹ ہائے مروجہ ممالک مغربی و شمالی تھے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۶۴ء میں مطبع نور الابصار آگرہ میں چھپی تھی۔ بعد کی تین جلدیں بھی اسی مطبع میں ۱۸۶۶ء میں چھپیں۔ اس کے دیباچہ کی چند سطریں یہ ہیں:—

"فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو، فی الواقع یہ جلدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سررشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ وقت ہیں اور کتنے منسوخ ہو گئے۔ واضح ہو کہ مصنف نے ترجمہ اردو میں کہ وہ مسلمہ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا، کچھ تصرف نہیں کیا ہے۔"

اس کے علاوہ سدا سکھ لال نے "فن زراعت" کے متعلق ایک کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی اور اس کا نام **گنگا کی نہر** رکھا۔ یہ ۴۴ صفحہ کا مختصر رسالہ ہے ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں طبع ہوا۔

تراجم علوم و فنون۔ اس موقع پر یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی حکومت میں یعنی غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو میں ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہو گئی تھیں، اور ان میں سے اکثر طبع ہو گئی تھیں۔ تاریخ و جغرافیہ، مذہب، سائنس، نجوم و ہیئت، معاشیات (اکنامکس)، منطق، طبیعات (فزکس)، فن زراعت، تعلیمات، درسیات وغیرہ موضوعات و مضامین کی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے چند کتابیں بعض پرائیویٹ کتب خانوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ کلکتہ وغیرہ کی بڑی یا سرکاری لائبریریوں میں اور ریاستوں یا امیروں کے کتب خانوں میں موجود ہوں گی،

لیکن لندن کے انڈیا آفس کی لائبریری میں سب کی سب موجود ہیں۔ جن میں مطبوعات بھی ہیں اور قلمی بھی۔ ان کی تصنیف و تالیف میں ہندو اہل قلم برابر کے شریک ہیں۔ چند مطبوعہ کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ کھیت کرم ۳ حصّہ مصنفہ کالی رائے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء۔ (فن زراعت)

۲۔ اصول علم انتظام مدن مترجمہ دھرم نرائن مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء۔ (معاشیات)

۳۔ اصول علم طبعی۔ مترجمہ اجودھیا پرشاد دیبوا پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء۔ (طبیعات)

۴۔ عجائب روزگار مصنفہ ماسٹر رام چندر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۷ء۔ (طبیعات)

۵۔ مرآۃ العلوم مصنفہ ہری درمن لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۴۹ء۔ (طبیعات)

۶۔ اصول قواعد مائیات مترجمہ اجودھیا پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء۔ (طبیعات)

۷۔ قانون الطباع (چھاپہ کا فن) مصنفہ بیتل پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء۔ (سائنس)

۸۔ اصول علم ہیئت مصنفہ ماسٹر رام چندر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء۔ (نجوم و ہیئت)

۹۔ مختصر دقائق النجوم مؤلفہ گھٹالے، مطبوعہ مدراس ۱۸۴۸ء۔ (نجوم و ہیئت)

۱۰۔ خلاصۂ نظام آسمانی مرتبہ پنڈت دھامی دھیرا، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء۔ (نجوم و ہیئت)

۱۱۔ جغرافیۂ ہند، مترجمہ پنڈت سواروپ نراین دسیوا روپ نرائن، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء۔ (جغرافیہ)

۱۲۔ فتح گڑھ نامہ (جغرافیہ ضلع فتح گڑھ) مرتبہ کالی رائے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۹ء (جغرافیہ)

۱۳۔ پندنامہ کاشتکاری مصنفہ موتی لال، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء۔ (زراعت)

۱۴۔ ریشم کا کیڑا مرتبہ موتی لال، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء۔ (صنعت و حرفت)

۱۵۔ بخار کی کل (اسٹیم انجن) مؤلفہ ایشوری لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۵ء (سائنس)

۱۶۔ ہوا کا بیان مرتبہ بدری لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۴ء۔ (علم طبیعات)

۱۷۔ معدنیات مؤلفہ جواہر لال، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۵ء۔ (طبیعات)

۱۸۔ خلاصۃ الصنائع مترجمہ بھولا ناتھ، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء۔ (سائنس)

۱۹۔ تحصیل فی جر الثقیل مصنفہ سید احمد خاں (سرسید)، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۴ء۔ (طبیعات)

۲۰۔ ترجمہ معاشیات آل مترجمہ وزیر علی، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء۔ (معاشیات)

۲۱۔ ترجمہ شمسیہ مترجمہ سید محمد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء۔ (منطق)

۲۲۔ مقاصد العلوم مترجمہ سید محمد میر، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۱ء۔ (طبیعات)

۲۳۔ علم حکمت (میکانکس) مولفہ چارلس فنک، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۳ء۔ (سائنس)

۲۴۔ بحر الحکمۃ (اسٹیم انجن) مرتبہ ریورنڈ پارکن، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۷ء۔ (سائنس)

۲۵۔ توصیف زراعت مرتبہ کلب حسین، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۸ء۔ (زراعت)

۲۶۔ علم جغرافیہ مترجمہ میر غلام علی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۱ء۔ (جغرافیہ)

۲۷۔ رسالہ مقناطیس مترجمہ سید کمال الدین، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء۔ (طبیعات)

۲۸۔ بجلی کی ڈاک مولفہ جے، ڈبلیو، بیل، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء۔ (طبیعات)

۲۹۔ اصول جر ثقیل مرتبہ محمد احسن، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۴ء۔ (طبیعات)

۳۰۔ پودے لگانے کی کتاب، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء۔ (زراعت)

فقیر محمد خاں گویا لکھنؤ کے رئیس تھے، شاہانِ اودھ کے زمانے میں فوج کے رسالدار رہے۔ نواب حسام الدولہ خطاب تھا۔ گویا تخلص ہے۔ ناسخ اور وزیر دونوں سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ صاحب دیوان ہیں۔ مطبع نولکشور میں دیوان طبع ہوگیا ہے۔ ۱۸۵۰ء ۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا۔ گویا کی صرف ایک تصنیف ہے۔ ۱۸۳۵ء ۱۲۵۱ھ میں "انوار سہیلی" کا ترجمہ بستان حکمت کے نام سے کیا۔ انوار سہیلی کے اردو ترجمے گویا سے پہلے اور بعد کو اور لوگوں نے بھی کئے، جن میں سے بعض کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے منشی حفیظ الدین نے خرد افروز کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۴۲ء میں محمد ابراہیم بیجاپوری

نے ترجمہ کیا۔ لیکن ان سب سے فقیر محمد خاں گویا کا ترجمہ بہتر ہے۔ سرورؔ کی طرح قافیہ پیمائی نہیں ہے، لیکن الفاظ و فقرات کی ترتیب میں قدامت کا اثر ہے جس سے خواہ مخواہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ تنہا گویا کا قصور نہیں ہے۔ الفاظ کی صحیح و باقاعدہ ترتیب اُس زمانے میں کیا، بہت بعد تک پیدا نہ ہوئی تھی۔ ہر مصنف کی تحریر میں بلا استثنا یہی بات ہے۔ سر سید احمد خاں کی تحریر میں تو یہ بے قاعدگی بہت کثرت سے ہے، خود غالب کی سہل ممتنع زبان بھی اس سے خالی نہیں۔ اگرچہ کم ہے۔ نذیر احمد و حالی کے دور سے یہ عیب بالکل جاتا رہا۔ فقیر محمد خاں گویا نے اپنے ترجمہ میں اصل کتاب انوار سہیلی کے عربی و فارسی الفاظ و تراکیب جا بجا قائم رکھی ہیں۔ اس لئے زبان بالکل آسان نہیں رہی، پھر بھی نہایت خوشنما دلچسپ اور پُر معنی ہے۔ گویا نے دیباچہ میں جو اپنی عبارت لکھی ہے اس کا بھی یہی رنگ ہے۔ سبب تالیف بیان کرتے ہیں :-

"اب سُنا چاہیئے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرُخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں، اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعے کا تھا، اور اس کے مصنف کی فکر رسا پر سب نے زبان ثنا کھولی تھی کہ سبحان اللہ مصنف اس کا عجیب حکیم بے مثل تھا۔ اور عجب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرار الٰہی کا اور خزینہ ہے فیض غیر متناہی کا، بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ جو کچھ اُس نے بیان کیا ہے مظنہ ہے کہ بامداد الہام غیبی ہو، ورنہ اسے انسان ضعیف البنیان کی کیا تاب کہ کُنہ کو اس قدر جزئیات عالم کے پہنچ سکتی ہے ......"

غرض ان خواجہ تاشوں کی فرمائش سے گویا نے یہ کتاب مرتب کی۔ ترجمہ کے متعلق کہتے ہیں :- "برائے نام ترجمہ کیا جاتا ہے، ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جُدا ہے لیکن حق یوں ہے کہ یہ احسان نقاش اوّل کا ہے۔ ورنہ مجھ سے بے مایہ کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی۔"

بستانِ حکمت کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"بادشاہ نے حکم دیا کہ دمنہ کو دار القضا میں سپرد کرو تا قاضی اس کا حال دریافت کرے کہ احکام سیاست میں جب تک شرائط شرعی تمام نہوں گے کچھ حکم نہ کیا جائیگا۔

دمنہ نے کہا کہ کون حاکم راست کار بادشاہ سے زیادہ ہے، اور کون قاضی، عادل شہر یار سے بالاتر ہے۔ الحمد للہ کہ ضمیر منیر بادشاہ آئینہ ہے باصفا بلکہ جام ہے جہاں نما کہ صورت حال ہر ملازم و رعایا کی اس میں ہویدا ہے۔

رُباعی سودا

ایوان عدالت میں تمہارے اے شاہ — ہے ظلم کو کیا دخل، عیاذاً باللہ
شیشے کا اگر طاق سے ٹوٹے ہے پاؤں — پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اور بہ یقین اتنا جانتا ہوں کہ کشفِ شبہات اور رفع حجاب میں کوئی چیز برابر ذات بادشاہ جم جاہ کے نہیں ہے۔ اگر خود شہریار بنفس نفیس، رائے جہاں آرا کو قاضی میرے حال کا فرمائے تو کذب اور صدق میرا مانند صبح صادق کے روشن ہو جائے، جیسا کہ حافظ نے فرمایا۔ بیت

عرض حاجت در حریم حضرتت محتاج نیست — رازِ کس مخفی نماند بر فروغ رائے تو

شیر نے کہا کہ اے دمنہ اندیشہ نہ کر کہ اس مہم میں جستجوے تمام کی جاے گی، اور تحقیق اس کام کی اس طرح پر کہ زیادتی اس سے متصور نہو، عمل میں آئیگی۔

نظم

جُدا کریں گے ہم اس طرح حق و باطل کو — کہ جیسے دودھ سے گھی نکال لیتے ہیں
نکال لیتے ہیں جس طرح عطر پھولوں سے — ہر ایک بات کا ہم جی نکال لیتے ہیں

نیم چند کھتری اُس زمانے میں ہندو اہل ذوق وار بابِ علم اردو شعر و سخن اور علم و ادب کی تحصیل، ترویج اور تکمیل میں نہایت مستعدی سے کوشش کر رہے تھے، جیسا کہ پہلی فہرستوں اور نمونوں سے دریافت ہوا۔

منشی نیم چند کھتری بھی ایسے ہی ادیبوں میں ہیں۔ فارسی سے "قصہ گل باصنوبر" ۱۸۳۷ء / ۱۲۵۲ھ میں ترجمہ کیا۔ اور شائع و مقبول ہوا۔ اس کا نمونہ مولانا احسن مارہروی کی تالیف "نمونۂ منثورات" سے نقل کیا جاتا ہے۔ قصہ کے ٹائٹل پیج کی عبارت یہ ہے:۔

"زبان فارسی سے زبان اردو میں ترجمہ کیا ہوا نیم چند کھتری کا نام سے بابو گورچرن کے نواب مستطاب لارڈ جارج آکلنڈ صاحب بہادر دام اقبالہ کے عہد میں، دانارام برہمن کی تصحیح سے چھاپا گیا۔"

تحریر کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"بعد ازاں فقیر حقیر رضائے الٰہی پر خرسند نیم چند، یوں لکھتا ہے کہ اس عالم ناپائدار میں کسی چیز کو قرار نہیں اور نیستی پر سب کا مدار ہے، اس کی ذات لازوال کے واسطے بقا، اور باقی سب کو فنا ہے مگر ایک گلستانِ سخن کہ خزانِ جہاں اس کے گلوں پر نہیں آتی، چوروں کی چوری، اور رہزنوں کی سرزوری سے یہ دولت کہیں نہیں جاتی، چمن اس کا ہمیشہ تازہ و خرم رہتا ہے، اور اس کی نہروں میں زلال زندگی بہتا ہے، اس کے مکان کی نیو کو حادثے کے بھونچال کا کچھ خطرہ نہیں ہوتا۔"

مولوی قطب الدین دہلوی

ان کے والد کا نام محمد محی الدین احراری ہے۔ دہلی کے بہت بڑے عالم و محدث تھے۔ امارت و ثروت بھی رکھتے تھے۔ مولانا حاجی محمد اسحاق دہلوی (مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے) کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۸۷۲ء / ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف سے دو کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

(۱) **ظفر جلیل** اردو ترجمہ "حصن حصین" (مصنفہ قاضی القضاۃ شمس الدین محمد دمشقی متوفی ۱۴۳۱ء / ۸۳۳ھ) مولوی قطب الدین نے تاریخی نام رکھا ہے۔ اس سے سال تالیف ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۸۳۷ء) نکلتا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"حمد بے شمار ہے اس پاک پروردگار کے لئے کہ ہم کو توفیق دی اپنے ذکر کی اور راہ بتائی اپنی شکر کی، یا الٰہی درود و سلام بے حد نازل کر خاتم النبیین شفیع المذنبین رسول امین پر، اور ان کے اصحاب ابرار اور آل اطہار پر اور سب پر۔"

(۲) **مظاہر حق** اردو ترجمہ و شرح "مشکوٰۃ المصابیح"۔ اس ترجمہ کا نام بھی تاریخی ہے، اس سے ۱۲۵۴ھ (مطابق ۱۸۳۸ء) نکلتے ہیں۔ یہ مولانا قطب الدین کا نہایت عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یعنی چار جلدوں میں بہت بڑی تقطیع کے دو ہزار صفحوں سے زیادہ پر طبع ہوا ہے۔ اُردو زبان میں یہ سب سے پہلی جامع و مکمل حدیث شریف ہے۔ اس کا حال خود قطب الدین صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

بعد اس کے مسکین **محمد قطب الدین** شاہجہاں آبادی عرض کرتا ہے کہ کتاب مشکوٰۃ شریف علم حدیث میں عجب نافع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں مندرج ہیں، اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاد بزرگوار مولانا مخدومنا مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحاق نواسہ حضرت شیخ عبدالعزیز رحمہما اللہ تعالیٰ کے نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا، لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا، مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے بہتر ہے، اس لئے اس ہیچداں نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علیحدہ کرکے لکھا اور فائدے مختصر مناسب مقام کے، شروع مشکوٰۃ وغیرہ سے، مثل مرقاۃ شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق اور حاشیہ سید جمال الدین رحمہم اللہ کے، اور سوائے ان کے سے، زیادہ کرکے خدمت عالی میں عرض کی۔ اور جناب ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے، تبرکاً اس میں درج کئے، اور نام اس کا **مظاہر حق** رکھا گیا کہ اس میں تاریخ اس کی نکلتی ہے۔

مولانا قطب الدین کے استاد بزرگوار کا ترجمہ اس سے بھی پہلے کا ہے، لیکن اب نایاب ہے، مولانا نے مظاہر حق کے فائدوں میں ہر جگہ ان شروح و تراجم و حواشی کا حوالہ دے دیا ہے۔ جن سے استفادہ کیا ہے۔

مظاہر حق میں احادیث کا ترجمہ تو ہر مقام پر ایک ہی اسلوب قدیم کا ہے، لیکن فائدے کہیں بالکل پرانی روشِ بے قاعدہ کے ساتھ ہیں، کہیں ترتیب الفاظ زیادہ صاف و باقاعدہ ہے۔ ترجمہ و فائدہ کا نمونہ عربی کی حدیث کو چھوڑ کر درج کیا جاتا ہے :-

اور روایت ہے واثلہ بن اسقع سے کہا، فرمایا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے، جس شخص نے کہ طلب کیا علم، اور حاصل ہوا اس کو، ہوگا واسطے اس کے دوہرا ثواب اور اگر نہ حاصل ہوا اس کو علم، تو ہوگا واسطے اس کے ایک حصہ ثواب سے، روایت کی یہ دارمی نے **ف** دوہرا ثواب، ایک ثواب طلب کا اور مشقت کا کہ تحصیل علم میں کھینچی ہے، دوسرا ثواب حاصل ہونے علم کا، اور پڑھانے کا اوروں کو، یا ثواب عمل کا کہ علم پر کیا ہے، اور دوسرے کو ایک ثواب مشقت ہی کا ہوگا۔ ہر تقدیر طلب علم میں رہنا چاہیئے۔ اگر حاصل ہوا نورٌ علی نور، ورنہ طلب علم میں مرنا بھی سعادت ہے۔ بیت

گرچہ نتواں بدوست رہ بُردن   شرط یاری ست درطلب مُردن

مفتی صدرالدین آزردہ

والد کا نام مولوی لطف اللہ کشمیری، مفتی صاحب دہلی میں ۱۷۹۸ء / ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا محمد اسحاق، مولانا فضل امام خیرآبادی، مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے مشاہیر علماء سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ غدر سے پہلے انگریزی حکومت کی طرف سے دہلی میں صدرالصدور اور مفتی تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان پر جہاد کے فتوے کا الزام لگایا گیا، گرفتاری اور جائداد کی ضبطی عمل میں آئی۔ لیکن چند روز بعد رہا کر دئے گئے، اور جائداد کا بھی ایک حصہ واپس دیدیا گیا۔ تعلیم و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ "صدرالصدور" ہونے کی حالت میں بھی طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کے

شاگردوں میں نواب یوسف علیخاں والی ریاست رام پور، سر سید احمد خاں۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی بھی شامل ہیں۔ عربی و فارسی کی چند تالیفات اور فتاویٰ ان کی یادگار ہیں۔ شاعری کا بھی ذوق تھا۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا۔ اردو میں شاہ نصیر، میر ممنون اور میاں مجرم اکبرآبادی سے مشورہ کیا ہے۔ اردو کے شاعروں کا ایک تذکرہ فارسی میں مرتب کیا تھا، لیکن اب نایاب ہے ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) میں انتقال کیا۔ مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ امام بخش صہبائی سے مفتی صاحب کے خاص تعلقات تھے۔ اور ان صاحبوں سے اردو میں خط و کتابت رکھتے تھے۔ اردو کی بھی تحریریں مفتی صاحب کی یادگار ہیں۔ ایک خط کی چند سطریں نمونہ و تبرک کے طور پر درج کی جاتی ہیں، جو "یو۔ پی میں اردو" سے ماخوذ ہیں:۔

نامۂ آزردہ بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

"شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتویٰ دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبا مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزارہا کاغذوں پر دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا، اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا۔ مجالس شادی و غمی اور اعراض میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا......."

امام بخش صہبائی دہلی کے رہنے والے، فارسی کے بڑے عالم و محقق تھے، فارسی کی بعض نہایت ادق کتب درسیہ "سہ نثر ظہوری" وغیرہ کی شرحیں

بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی میں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے دہلی کالج میں پروفیسر تھے۔
جہاں مولوی محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔

سرسید احمد خاں سے صہبائی کے خاص تعلقات تھے۔ انھوں نے آثار الصنادید کی تیاری میں سرسید کو بڑی مدد دی تھی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۴۷ء

---

۵ دہلی میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کو مغربی علوم سکھانے کے لئے ایک اسکول کھولا تھا۔ پھر اس کو ترقی دے کر کالج کر دیا گیا۔ دہلی کالج اور قدیم دہلی کالج کے نام سے مشہور رہے۔ ۱۸۲۷ء سے اس میں انگریزی زبان کی تعلیم بھی جاری کر دی گئی۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی زبان سے تو وحشت و نفرت تھی لیکن انگریزوں کے علوم و فنون سیکھنے کا بیحد شوق تھا۔ پھر بھی چار سال میں یعنی ۱۸۳۱ء میں انگریزی زبان پڑھنے والوں کی تعداد کالج میں تین سو (۳۰۰) سے کم نہ تھی۔ یہ کالج دہلی میں کشمیری دروازے کے قریب تھا۔ ریاضی، سائنس وغیرہ علوم کی تعلیم لکچروں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس لئے کہ انگریزی کتابیں آسانی سے میسّر نہ آسکتی تھیں، اور علوم و فنون کے ترجمے اردو میں ہوئے نہ تھے۔ طالب علموں سے کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ بلکہ وظیفے دے دے کے شوق دلایا جاتا تھا۔ علوم کیمیا و طبیعات کے اسباق و تجربات آلات کے ذریعہ سے سکھائے جاتے تھے۔ سائنس کے تجربے اور مشاہدے ہندوستانیوں کے لئے عجیب حیرت و مسرّت کا باعث ہوتے تھے۔ اس کالج کا پرنسپل انگریز ہوتا تھا۔ پروفیسر انگریز اور ہندوستانی دونوں قسم کے تھے۔ مثلاً ماسٹر رام چندر، ماسٹر رام کشن، مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ صہبائی کے زمانے میں ایک فرانسیسی ایم فیلیکس بوترو پرنسپل تھا۔ (اس کا نام صہبائی نے اپنے ترجمہ حدائق البلاغت میں بوترس لکھا ہے۔ لیکن فرنچ زبان کے قاعدے سے ''س'' کا تلفظ نہ ہوگا اور پڑھا جائے گا) اس فرنچ پرنسپل کی نگرانی میں ایک ادبی دہلی انجمن ۱۸۴۲ء میں ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے نام سے دہلی کالج میں قائم کی گئی۔ اس کے اصلی کارپرداز، مولانا صہبائی اور ماسٹر رام چندر تھے۔ اس انجمن نے عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی زبانوں سے ترجمے کر کے ملک و زبان کی بڑی خدمت کی۔ پروفیسر رام چندر کی خدمات کا ذکر آئندہ آئے گا۔ پروفیسر رام کشن نے سر ولیم میکناٹن کی قانونی تالیف ''اصول ہندو شاستر'' کا انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اصول حکومت، (باقی بصفحہ آئندہ)

میں شائع ہوا اس میں عمارتوں کے حالات صہبائی نے لکھے تھے۔ اسی لئے عبارت میں پرانا پن زیادہ تھا اور سرسید کے اسلوب تحریر کے خلاف تھا۔ شاہی قلعۂ معلّٰی سے بھی صہبائی کی رسم و راہ تھی۔ شاہی خاندان کے بعض افراد ان کے شاگرد تھے۔ شعر و سخن میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں جن لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ان میں صہبائی کا حصّہ بھی کسی سے کم نہ رہا۔ یعنی قتل کیے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۵

فن زراعت، فن طب، صرف و نحو زبان انگریزی وغیرہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ مولوی کریم الدین پانی پتی بھی دہلی کالج میں پروفیسر تھے، انھوں نے عورتوں کے لئے چند دلچسپ و مفید کتابیں تصنیف کیں فن عروض پر ایک کتاب لکھی، تاریخ ابوالفدا کا ترجمہ، شعرائے عرب کا تذکرہ، شعرائے اردو کا تذکرہ (جو مسٹر فیلن کی شرکت میں مرتب کیا) قانون وراثت اسلامی پر ایک رسالہ، گلستانِ ہند (مجموعہ لطائف) وغیرہ متعدد کتابیں مولوی کریم الدین کی یادگار رہیں۔ دہلی کالج کے بعض طالب علم بڑے مشہور و نامور ہوئے، مثلاً ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولوی ذکاء اللہ، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، مولوی شہامت علی وزیر اعظم ریاست اندور، ڈاکٹر مکند لال جو طبِّ مغرب کے بڑے عالم و ماہر تھے۔ دہلی کالج کے یورپین پرنسپل بھی اردو کے بڑے ماہر و سرپرست گزرے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اسپرنگر، موسیو بوترو، مسٹر ٹیلر، اسپرنگر کی خدمات سے استفادہ آج تک ناگزیر ہے۔ آخر دہلی کالج ہنگامۂ غدر کی نذر ہو گیا۔ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو کالج کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، اس کے کتب خانہ کو نذرِ آتش کر دیا گیا، اور کالج کے پرنسپل مسٹر فرانسس ٹیلر کو قتل کر دیا گیا، مگر خوش قسمتی سے اس کالج کی آمدنی ایک وقف سے تھی، وہ وقف قائم رہا۔ چنانچہ شورش غدر فرو ہونے کے بعد دوسرا کالج چاندنی چوک میں دہلی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کو مقبولیت حاصل ہو گئی اور چار سو پانسو طالب علم تعلیم پانے لگے۔ اس کالج کے ساتھ لائبریری بھی قائم ہو گئی اور ایک عجائب خانہ بھی کھولا گیا۔ اس کالج کے مقابلے میں پہلا کالج قدیم دہلی کالج کہلاتا ہے۔

کس درد سے کہا ہے :-

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی نے دہلی کالج کی ملازمت کے زمانے میں ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف حدائق البلاغت (مصنفہ ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۵ء) کا اردو ترجمہ مرتب کیا۔ لیکن صرف کہنے کو ترجمہ ہے، ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب ہے۔ صہبائی اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"نسخہ حدائق البلاغت علم بیان اور بدیع اور عروض میں شمس الدین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے قلم بلاغت رقم کا ثمرہ ہے، اور اس کتاب کا اس فن کے استیعاب میں شہرہ ہے، صاحب والا مناقب بلند مراتب حاکم داد ور، داور دانش گستر، ٹیلر صاحب بہادر دام اقبالہ نے کہ شہر سعادت بہر شاہجہاں آباد کے مدارس کے پرنسپل ہیں فقیر سراپا تقصیر خاکپائے علما، گدائے سرکوچہ فضلا، سرگشتہ وادی ناتوانائی، امام بخش صہبائی کو کہ طلبۂ فارسی کی تعلیم کے لئے مدرسی اول کے عہدے پر مشرف ہے، ارشاد کیا کہ اگر یہ نسخہ فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جاوے، اور اس میں عربی اور فارسی مثالوں کی جگہ اشعار اردو، زبانداناں ہند کے مندرج ہوں تو ان لوگوں کے واسطے کہ اردو اشعار سے ذوق رکھتے ہیں، اور اس قدر استعداد نہیں رکھتے کہ عربی اور فارسی کتابوں سے ان مطالب عالیہ کو سمجھ لیں، بہت مفید ہوگا، اس واسطے اس خاکسار نے بموجب اس کے کہ المامور معذور، باوجود کمی استعداد کے، تقدیم امر میں سعی کر کے اسی رسالہ کو ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء مرتب کیا۔ لیکن متعدد ان انصاف پسند پر مطالعہ کے وقت ظاہر ہوگا کہ اس کم استعداد نے مسائل علمی کے لکھنے اور امثلۂ اردو کے فراہم کرنے میں کس قدر سعی کی ہے۔

اور جو کہ یہ مقصود تھا کہ علم بیان اور بدیع اور عروض سے طالبین کو فائدہ تام حاصل ہو، اس واسطے بہت مسائل اصل کتاب سے زیادہ کر دیئے، تاکہ از بسکہ لفظ بلفظ کے ترجمے میں مطلب کی توضیح خوب نہیں ہوتی، اس لئے ترجمہ میں اس امر کا مقید نہیں ہوا۔"

ترجمۂ حدائق البلاغت کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

صنعت تلمیح۔ یہ اس طرح پر ہے کہ کلام مُشعر ہو کسی واقعہ مشہورہ پر، یا ایسی چیز پر اشارہ کیا جائے کہ کتب مستعلمہ میں مذکور ہو، جیسے شعر سودا کا ؎

دکھلائیے جا کر تو تجھے مصر کا بازار
پر داں کوئی خواہاں نہیں اس جنس گراں کا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف قصہ حضرت یوسفؑ کے کہ وہ مشہور ہے، اور یہ شعر فقیر محمد خاں گویا کا ؎

مُنہ دکھانا تو کہاں باتیں تھیں اسکی مجھ تک
لن ترانی کی بھی آئی نہ صدا میرے بعد

اس شعر میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ ہے، حق یہ ہے کہ جو لوگ کہ چاشنی انصاف اور مذاق شعر سے بہرہ رکھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ شعر جواب نہیں رکھتا۔ اور جیسے یہ شعر ؎

خزاں میں اس لئے لوٹے ہے خاک پر گلچیں
کہ یہ علاج ہے اس کا جسے ہو استسقا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف مسئلہ طب کے۔"

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ حدائق البلاغت کے حاشیہ پر دسمبر ۱۸۸۷ء میں مطبع نول کشور واقع شہر کانپور سے شائع ہوا۔

منشی عبدالکریم | لکھنو وطن تھا، کلکتہ میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی کے میر منشی تھے ان کو قصے کہانی کی کتابوں میں الف لیلہ بہت پسند تھی۔

؎ مرزا غالب کو یہ شعر بہت پسند تھا لیکن وہ اس طرح پڑھا کرتے تھے:۔

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں اس جنس گراں کا

ملازمت سے پنشن لینے کے بعد الف لیلہ کے انگریزی ترجمہ سے ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ میں اردو ترجمہ مرتب کیا۔ اور ۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ میں چھپوایا۔ پھر ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں باتصویر شائع کیا۔ اس کا حال دیباچہ میں لکھا ہے۔ اسی کا اقتباس بطور نمونہ "سیر المصنفین" سے اخذ کیا جاتا ہے۔

"وہ کتاب سوا دو سو رات کی کہ جس کو شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے واسطے پڑھانے صاحبان عالی شان کالج کلکتہ کے بکمال تلاش عرب سے منگوا کر چھپوایا تھا، میسر آئی، آخر کار جب راقم بہ سبب شدت امراض کے بعد تقرر پنشن بیت السلطنت لکھنؤ میں کہ مولد اپنا ہے، خانہ نشیں ہوا، وہ نسخہ تمام وکمال انگریزی زبان میں مع تصویرات بہم پونہچا۔ راقم نے اس کو اول سے آخر تک بسبب استعداد سمجھنے انگریزی کے دیکھا ازبسکہ قصّے دلچسپ تھے دو برس تک اس کا ترجمہ کرتا رہا، اور سنہ ۱۲۵۸ ہجری میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا۔ اکثر لوگوں نے منگوا کر نقل اس کی لی، مگر مسودہ راقم کے گھر رہا، دست بدست پھرا کیا۔ چنانچہ پانچ سات جزو تلف ہوئے۔ راقم کو اس کے لکھنے میں دوبارہ تکلیف کرنا پڑی اور طلب کرنے احباب سے نہایت تنگ آیا، جس کو نہ دیتا وہ خفا ہوتا، اور دینے میں اپنی کتاب سے ہاتھ دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ جائے تا سب کے ہاتھ آئے۔ اور راقم بھی ایک ایک نسخہ اس کا عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اسی واسطے راقم نے جس طرح ہو سکا بیچ عہد معدلت مہد بادشاہ وجم جاہ، خاقان زماں، ابو المظفر مصلح الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی ملک اودھ خلد اللہ ملکہٗ اور وزارت وزیر اعظم، نواب امین الدولہ عماد الملک امداد حسین خاں بہادر ذو الفقار جنگ دام اقبالہٗ کے چھپوایا اور سنہ ہجری طبع اس کتاب کے ۱۲۶۳ اور عیسوی ۱۸۴۷ ہیں۔"

منشی عبدالکریم کی عبارت سادہ ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے، لیکن ترتیب الفاظ کی بے قاعدگی وہی ہے جو ان سے پہلے ہر جگہ ہے۔

ماسٹر رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد ان کے شاگرد ہیں۔ گارساں دتاسی دسمبر ۱۸۵۲ء کے خطبہ میں رام چندر کے متعلق لکھتا ہے کہ "ان کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر اس سال کے ماہ جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا، اس پنڈت کی عمر اس وقت ۲۵ سال کی ہے۔ یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا، اور اس کالج میں اس نے انگریزی، ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا، وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے، جن میں سے ایک الجبرا ہے۔ ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں، اور ایک کتاب علم ہندسہ پر ہے۔ ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے، اور ان کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں۔ یہ پروفیسر دو رسالوں کے ایڈیٹر بھی ہیں، ان میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس کا نام "محبوب ہند" ہے۔ یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے، جس میں اہم مسائل و معلومات وقت پر، اہل ہند کی تعلیمی حالت پر، اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۵۔"

ان کے علاوہ ماسٹر رام چندر نے **عجائب روزگار** تصنیف کی جو دہلی میں ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ ایک کتاب **اصول علم ہیئت** لکھی جو ۱۸۴۸ء میں چھپی، ایک تالیف **تذکرۃ الکاملین** کے نام سے مرتب کی جو ۱۸۴۹ء میں دہلی سے نکلی، اس کے بعد تین بار مطبع نولکشور میں چھپی۔ ماسٹر صاحب ملازمت انگریزی کے بعد ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ہو گئے تھے۔

---

۵ منقول از خطبات گارسں دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

اور تذکرۃ الکاملین ریاست کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئی تھی۔

تذکرۃ الکاملین میں یونان، روم قدیم، یورپ، ایران، ہندوستان کے مشاہیر علم و فضل کے مختصر حالات درج کئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر کتاب کے سب سے آخری شخص کے حال کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

"ذکر مُہندس بھاسکر کا۔ یہ شخص بہت بڑا عقلمند اور مہندس ہند میں گزرا ہے، اس کے برابر ذہین اور عاقل اور سچے علم کی پیروی کرنے والا کوئی اور شخص قوم میں نہیں ہوا ہے۔ یہ بزرگ بمقام شہر بنارس میں بیچ سنہ ۱۱۱۵ء کے پیدا ہوا تھا۔ اس شخص نے ہمارے شاستر کی غلطیوں کو درست کیا۔ لیکن اکثر برہمن اس کے قول پر عمل نہیں کرتے، اگرچہ اس کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ لیکن جو بڑے بڑے فاضل اور عاقل ہیں وہ اس کے کلام کو کلام پُران پر ترجیح دیتے ہیں۔ کسی شاستر میں لکھا ہے کہ زمین مثل دائرے کے ہے، اور کہیں یہ لکھا ہے کہ وہ شکل مثلث کے ہے۔ بھاسکر نے ان لغو باتوں کو رد کیا، اور لکھا کہ زمین کی شکل گُردی ہے۔ یہاں سے اس کے ذہن کو دیکھنا چاہئے۔ شاستر میں لکھا ہے کہ زمین سانپ کے پھن اور کچھوے اور آٹھ ہاتھیوں پر سہارا پائے ہوئے ہے۔ بھاسکر نے کہا کہ اگرچہ یہ شاستر میں لکھا ہے، لیکن محض غلط ہے۔ اس نے فرمایا کہ زمین ہوا میں ہمارے معبود حقیقی کے ہاتھ میں معلّق ہے۔"

آغا امانت لکھنوی

سید آغا حسن نام، امانت تخلص، ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے، شاعری مرثیہ گوئی سے شروع کی۔ اس زمانہ میں میاں دلگیر لکھنؤ میں مرثیہ کے بڑے استاد تھے، ان سے اصلاح لی۔ پھر مرثیہ چھوڑ کر غزل گوئی شروع کی۔ بیس۲۰ برس کی عمر میں کسی بیماری سے زبان بند ہوگئی اور دس برس تک گونگے رہے۔ زبان کا کام تحریر سے لیتے تھے۔ اسی حالت

ہیں کربلا گئے۔ وہاں زبان کھل گئی لیکن لکنت باقی رہی۔ امانت شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں استاد مانے جاتے تھے۔ رشک، برق، بحر، گویا جیسے باکمالوں کے ہمعصر تھے۔ لیکن تمام کلام ضلع جگت۔ ایہام، مرعاۃ النظیر سے معمور ہے۔ امانت کا منظوم ڈراما یا ناٹک اندر سبھا نہایت مشہور و مقبول ہوا۔ اردو میں اپنی نوع کی پہلی کتاب ہے۔ دیوان غزلیات اور واسوخت بھی امانت کی یادگار ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔

امانت نے اپنی منظوم "اندر سبھا" کی توضیح و تشریح نثر میں **شرح اندر سبھا** کے نام سے لکھی تھی، لیکن وہ گمنام تھی۔ اس کو سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالہ اردو میں شائع کر دیا ہے۔ اس کی عبارت اُس زمانے کی روش کے مطابق مقفّیٰ ہے، لیکن اُلجھاؤ اور گنجلک نہیں۔ اکثر صاف و رواں ہے۔ اس میں سے "سبب تالیف اندر سبھا" کا اقتباس بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:۔

> یک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانہ ازلی، رفیق شفیق مونس و غم خوار قدیمی جاں نثار، شاگرد اوّل موزوں طبیعت، تخلص عبادت، عاشق کلام امانت، انھوں نے ازراہ محبت کہا کہ بے کار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے، ایسا کوئی جلسہ (یعنی ناٹک) کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے، اور خلق میں شہرت ہووے، آخر الامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا، دبدم شوق زیادہ ہوا، چونکہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا، مگر اپنے نزدیک معیوب تھا، اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا، لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے کا کلام دریافت کر لیا۔ غرض کہ چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ھ ہجری میں اندر سبھا اس جلسے کا نام رکھ کر بجائے چار باب، چار پریاں قرار دے کر شروع کیا۔ شہرت گھر گھر ہوئی، اہل محلہ کو خبر ہوئی، دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے، ہجوم حد سے زیادہ ہوئے رفتہ رفتہ بعد ہزاراں ہزار شور و فساد اور حجت و تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا

مگر اپنے نزدیک بیکار ہوا اگر کسی ریاض سے ایک درخت لگایا، آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا، خیر جو ہوا سو بہتر ہوا اپنا تو یہ قول ہے نقد سے گلہ ہے کسی سے گلہ نہیں۔"

منشی چرنجی لال الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ فلسفہ و ریاضی کا بہت شوق تھا۔ ایک کتاب مصباح المساحت ۱۸۵۴ء میں لکھی۔ اس کے بعد مسٹر ہنری کارٹر کی تحریک اور مسٹر چارلس فنک کی اعانت سے علم نفسیات کی ایک کتاب انگریزی سے ترجمہ کی، اور اس کا نام تعلیم النفس رکھا۔ یہ کتاب گورنمنٹ پریس میں ۱۸۵۹ء میں طبع ہوئی۔ اس کا ایک فقرہ یہ ہے:-

"سنین ماضیہ میں اکثر اساتذہ بہ سبب اس کے کہ ان کو بہ تعمق و تامل سیر کتب کی عادت تھی، نامور اور مشتہر ہو گئے ہیں، اور کبھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی بلا حصول اس عادت کے فضیلت پیدا کرے۔"

مولوی ضیاء الدین خلف شیخ غلام حسن خاں جاگیردار لبسی دارالپور۔ وطن سے دہلی آ کر سکونت پذیر ہو گئے۔ مدرسہ تعلیم المعلمین (نارمل اسکول) میں مدرس مقرر ہوئے۔ علم طبیعات (فزکس) سے خاص لگاؤ تھا، میجر فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی فرمائش سے "اصول علم طبیعات" پر ایک کتاب مخزن الطبیعات دو حصوں میں ترتیب دی، جو لاہور میں ۱۸۶۵ء ۱۲۸۱ھ میں طبع ہوئی۔ حصہ دوم کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

"ارباب بصیرت پر ظاہر ہو کہ جن اجسام میں کشش اتصال اس قدر کم ہے کہ ان کے اجزا بغیر محسوس ہونے مزاحمت کے متحرک ہو سکتے ہیں، ان کو سیال کہتے ہیں۔ اجسام سخت اور اجسام سیال میں بڑا فرق یہی ہے کہ اجسام سخت کے اجزا کو کشش اتصال متصل اور پیوستہ رکھتی ہے۔"

مرزا غالب دہلوی

اب تک جن مصنفوں کے حالات لکھے گئے ان میں مشکل سے کوئی ایسا ہوگا جس کے مفصل حالات اور مکمل سوانح حیات علیحدہ یا تذکروں اور تاریخوں سے ملتے ہوں۔ کتنے ایسے ہیں جن کے سنین ولادت و وفات، مولد و مسکن، معمولی احوال زندگی بھی نامعلوم ہیں، اس لئے ہم بھی زیادہ تفصیل نہ دے سکے۔ مرزا غالب پہلے شخص ہیں جن کی ساری زندگی کے پورے حالات ہمارے سامنے ہیں اور اس صفت میں شاید وہ اول و آخر شخص ہیں کہ ان کی تصنیف اور ان کی سیرت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی مسلسل سوانح عمری نہیں لکھی، لیکن ان کی تمام حیات نہ صرف ان کی تحریروں میں جا بجا مذکور ہے بلکہ ان کے اسلوب و موضوع نگارش پر اثر انداز بھی ہے۔ غالب کی اس خصوصیت اور ان کے شعر و ادب کی انفرادیت کے سبب سے، ان کی ترتیب سوانح، تجزیۂ سیرت، تبصرۂ کلام، شرح دیوان کے متعلق کثرت سے کتابیں لکھی گئیں۔ سب سے پہلے مولانا حالی نے شاگردی کا حق ادا کیا، اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا، مولانا کی "یادگار غالب" کے بعد مسٹر غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" مسٹر محمد اکرام کا "غالب نامہ"، منشی امتیاز علی عرشی کی تالیف "مکاتیب غالب"، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا "مقدمہ کلیات غالب"، ڈاکٹر عبداللطیف کی کتاب "غالب"، مرزا محمد عسکری کی "ادبی خطوط غالب"، اور مختلف مصنفوں کی شروح دیوان غالب، غالب کو سمجھنے کے لئے، اور موافق و مخالف دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ منشی مہیش پرشاد ایم۔ اے پروفیسر ہندو یونیورسٹی بنارس خطوط غالب کے متعلق برسوں تک مستقل ریسرچ (چھان بین) کرتے رہے۔ غالب کے متعلق متفرق مضامین کا، جو مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے ہیں، کوئی حساب و شمار نہیں ہو سکتا۔

بعض کج فہم و تنگ نظر لوگوں کو شکایت ہے کہ غالب کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ

اردو زندہ زبان ہے، اور یہ اس کی زندگی کا ثبوت بھی ہے اور اس کی قوت کا سامان بھی۔ اہل یورپ نے اپنے مصنفین و شعرا میں سے ایک ایک کے تذکرہ و تبصرہ سے ایک ایک کیا کئی کئی الماریاں بھر دی ہیں۔ یہاں اگر مرزا غالب، میر انیس، ڈاکٹر اقبال وغیرہ پر ایک ایک دو دو درجن کتابیں لکھدی گئیں تو ابھی الماری کا ایک ایک خانہ بھی پر نہیں ہوا۔

غالب کا نام و خطاب | اسد اللہ خاں نام، "مرزا نوشہ" عرف، "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" خطاب شاہی، پہلے اسد تخلص تھا پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لقب اسد اللہ الغالب کی مناسبت سے غالب تخلص کر لیا۔

نسل و نسب | غالب کے آبا و اجداد توران کے ایبک ترک تھے، سلسلۂ نسب فریدوں بادشاہ تک پونہچتا ہے۔ غالب کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا۔ کہتے ہیں:-

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ایبکیم از جماعتِ اتراک — در تمامی زماہ دہ چندیم

باپ دادا | غالب کے دادا شاہ عالم بادشاہ دہلی (۱۷۵۹ء ۱۱۷۳ھ تا ۱۸۰۶ء ۱۲۲۱ھ) کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے، بادشاہ کی طرف سے منصب اور پہاسو کا پرگنہ ذات اور رسالہ کی تنخواہ میں عطا ہوا۔ غالب کے والد عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا کی شادی آگرہ کے ایک رئیس خواجہ غلام حسین کی لڑکی سے ہوئی جو میرٹھ میں فوج کے کمیدان (نائب کپتان) تھے۔ عبد اللہ بیگ خاں کا قیام اپنی سسرال آگرہ میں رہتا تھا۔ لیکن مختلف ملازمتیں بھی کیں۔ اول نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے ہاں ملازم ہوئے۔ پھر حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں کی سرکار میں تین سو سوار کے سردار رہے۔ وہاں سے ترک خدمت کر کے آگرہ آ گئے۔ آگرہ سے الور جا کر ریاست کے متوسل ہو گئے۔ وہاں ایک لڑائی میں قتل ہوئے۔

چچا | غالب کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں بہادر کی شادی نواب فخر الدولہ

والی لوہارو کے خاندان میں ہوئی۔ نصر اللہ بیگ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار رہے۔ پھر انگریزی فوج میں چار سو سواروں کے رسالدار ہو گئے، اور جنرل لارڈ لیک کے ساتھ بڑی فوجی خدمات ادا کیں جس کے صلے میں نواح آگرہ کا پرگنہ "سونک سونسا" بقید حین حیات جاگیر میں ملا۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ سرکار نے جاگیر واپس لے لی اور ان کے وارثوں کے لئے سات سو روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی۔

ولادت و تربیت | غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) کو آگرہ میں پیدا ہوئے ان کا مکان آگرہ میں اس جگہ تھا جہاں اب پیپل منڈی کی سڑک پر "کالا محل" واقع ہے۔ غالب پانچ برس کے تھے جو والد کا انتقال ہو گیا، چچا نصر اللہ بیگ خاں نے پرورش کی، لیکن ابھی آٹھ برس کی عمر تھی کہ چچا نے بھی انتقال کیا۔ اس کے بعد غالب کی تربیت ان کی ننھیال میں ہوئی اور لڑکپن آگرہ میں گذرا۔ ایک بزرگ استاد شیخ معظم سے تعلیم حاصل کی، آگرہ کے مشہور بے نظیر شاعر میاں نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ پڑھا۔

شادی | غالب کی عمر ۱۳ برس کی تھی کہ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی، جو نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ و جاگیر دار لوہارو کے حقیقی بھائی تھے۔ غالب کے چچا کی شادی بھی اسی خاندان میں ہوئی تھی، اسی وسیلے سے غالب کا رشتہ[۵] ہوا۔ نواب الٰہی بخش خاں

---

[۵] نواب احمد بخش خاں نے اپنی زندگی میں اپنے لڑکے نواب شمس الدین احمد خاں کو والی فیروز پور بنا دیا تھا، اور خود گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ یہ نواب شمس الدین احمد خاں، نواب مرزا داغ دہلوی کے والد تھے۔ اس حساب سے غالب کا داغ سے سسرالی رشتہ تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں ۱۸۳۵ء میں قتل ہوئے ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں والی فیروز پور و لوہارو ہوئے۔ ان سے غالب کے خاص تعلقات انس و محبت تھے۔

دہلی میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد غالب کی آمد و رفت دہلی میں شروع ہو گئی۔

تحصیل فارسی | اسی عرصے میں ایک شخص ایرانی ملا عبد الصمد ۱۸۱۱ء ۱۲۲۶ھ میں (حسبِ تحریر "قاطع برہان" مصنفہ غالب) آگرہ آیا، اور غالب کے گھر دو برس رہا۔ یہ شخص "زرتشتی" سے مسلمان ہوا تھا۔ غالب نے اس سے فارسی زبان سیکھی۔ اس شخص ایرانی اور اس سے تحصیلِ فارسی کے متعلق خود غالب کے بیانات میں عجیب و دلچسپ اختلاف یا ظرافت ہے۔ "اردوئے معلّٰی" کے متعدد خطوط کے علاوہ ایک مکتوب، ۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں رئیس رامپور کو لکھتے ہیں:۔

"بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجکو ملے، بارے مراد بر آئی، اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کئے، اب مجھے اس امر خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔" (از مکاتیب غالب صفحہ ۸۲)

اس کے برعکس ایک خط میں فرماتے ہیں:۔

"مجھ کو مبدء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے، چونکہ لوگ مجکو بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کے لئے ایک فرضی استاد گھڑ لیا۔"

ان دونوں بیانوں میں مطابقت نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ دوسرا بیان بطورِ ظرافت ہے، یا یہ بات ثابت کرنے کے لئے ہے کہ غالب زبان و ادب فارسی میں کسی کے شاگرد نہ تھے اور یہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلا بیان چند فارسی محاوروں کے سلسلے میں ہے جن کے معنوں میں غالب اور نواب خلد آشیاں کے درمیان اختلاف تھا۔ نواب صاحب ہندوستانی مصنفینِ لغات کے معنوں کو درست سمجھتے تھے۔ غالب اسی خط کے آئندہ سطور میں اُن سب فرہنگ نویسوں کو نالائق اور غیر معتبر ٹھہراتے ہیں۔ یہ غالب کی انشا پردازی ہے کہ کسی اہم بات کے لئے شاندار اور فیصلہ کن الفاظ

لکھتے ہیں۔ چنانچہ نواب صاحب کا "منھ بند کرنے کے لئے" لکھدیا کہ "میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کئے، اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔" گویا "حقائق و دقائق زبان پارسی" لطائفِ تصوّف اور اسرارِ معرفت تھے کہ ایک مرشد کامل نے دو سال میں سارا سلوک طے کرادیا، یا سینہ سے لگاکر علم لدُنی آن واحد میں عطا کردیا، اور اس سے "نفس مطمئنہ" حاصل ہوگیا۔ بلا شُبہہ غالب کو "اس امر خاص میں نفس مطمئنہ" حاصل تھا، اور اکثر ان کی راے درست ہوتی تھی، لیکن یہ بات ان کو کافی مطالعہ کے بعد حاصل ہوئی ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ عبد الصمد ایرانی سے دو سال تک جو فارسی میں گفتگو کی ہوگی، شعر و شاعری کا ذکر و فکر رہا ہوگا، اس سے یک گونہ بصیرت پیدا ہوگئی ہوگی جس نے ذوقِ سلیم، فکر صحیح، مطالعۂ وسیع کے ساتھ مل کر آئندہ راے صائب کا ملکہ پیدا کردیا۔

قیام دہلی | غالباً ۱۸۱۳ء یا ۱۸۱۴ء میں غالب آگرہ چھوڑ کر دہلی آرہے، اس لئے کہ نواب خلد آشیاں کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "میں باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں۔" (از مکاتیب غالب) لیکن دہلی میں آخر عمر تک کوئی ذاتی مکان نہ بنایا۔ مختلف محلوں میں کرایہ کے مکانوں میں رہا کئے۔ سب سے آخر میں حکیم محمود خاں مرحوم کے مکان کے قریب مسجد کے عقب میں رہتے تھے۔ اس مکان کے متعلق کسی کو لکھتے ہیں:-

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے   یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

اولاد ہوئی لیکن زندہ نہ رہی۔ بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنالیا تھا۔ عارف اور ان کے بچّوں کو اولاد سے بڑھ کر سمجھا۔ غالب کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے مرزا یوسف خاں، ان سے بھی بڑی محبّت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا یوسف نے کسی مرض سے صحت پائی تو غالب نے کہا تھا:-

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی   میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے

بھائی نے ۳۰ برس دیوانہ رہ کر اکتوبر ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا، زین العابدین خاں

اس سے پہلے دو بچے چھوڑ کر جوانی میں (سنہ ۱۸۵۶ء ۱۲۷۲ھ میں) داغ دے گئے تھے۔

دیگر حالات | غالب کو چچا کی جاگیر کے عوض سات سو روپیہ سالانہ بحساب باسٹھ روپیہ آٹھ آنہ ماہوار ملتے تھے، لیکن اس قدر آمدنی ان کے لئے کافی نہ تھی اور وہ اس کو اپنے حق سے کم بھی سمجھتے تھے، اس لئے اس میں اضافہ کرانے کی غرض سے سنہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے۔ گورنمنٹ میں اپیل کی، شہنشاہ انگلستان اور انگریز حکام کی شان میں زوردار قصیدے کہے، لیکن دو سال رہ کر کلکتہ سے ناکام آئے، اس سفر میں لکھنؤ، بنارس کی بھی سیر کی۔ نوابانِ اودھ کی مدح میں قصیدے پیش کئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے دربار سے پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر ہوا لیکن سنہ ۱۸۵۶ء میں الحاق اودھ کے ساتھ بند ہو گیا۔

سنہ ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ میں دہلی کالج میں "مدرس فارسی" کا جدید عہدہ قائم کیا گیا، اس کے لئے مسٹر ٹامسن نے (جو بعد کو صوبہ کے لفٹنٹ گورنر ہوئے) غالب کا انتخاب کیا، اور ملاقات یا امتحان کے لئے بلایا، غالب پالکی میں گئے، لیکن منتظر رہے کہ صاحب بہادر لینے کے لئے آئیں، وہ غالب کو اُمیدوار ملازمت سمجھ کر نہ آئے، انھوں نے اپنی کسر شان سمجھی، اور نوکری سے معذرت کر کے لوٹ آئے۔ مولوی امام بخش صہبائی اس عہدے پر لے لئے گئے۔ غالب کو چوسر کھیلنے کا بہت شوق تھا، اور ہمیشہ کچھ برائے نام بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۴۸ء ۱۲۶۴ھ میں جو کوتوال شہر تھا اس کو غالب سے کچھ عناد تھا، اس نے قماربازی کے الزام میں غالب کو گرفتار کرلیا اور چھ مہینے کی سزائے قید کرادی۔ کوتوال کا عناد درست سہی لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کا مکان "جوے کا اڈا" بن گیا تھا۔ جواری جمع رہتے تھے۔ بہرحال تین مہینے کے بعد خود مجسٹریٹ ہی کی رپورٹ پر رہا کر دیے گئے۔ قید خانہ میں غالب کے ساتھ ہر طرح کی عزت کا سلوک ہوتا تھا، گویا صرف نظربندی تھی، لیکن غالب کے غیور و حساس قلب پر اس بے عزتی کی ایسی چوٹ لگی کہ وہ خود اپنی نظر سے گر گئے، اور اپنے نزدیک رؤسا و معززین سے ملنے جلنے کے قابل نہ رہے،

چنانچہ ۱۸۵۲ء / ۱۲۶۸ھ میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"سرکار انگریزی میں بہت بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا، اب بدنام ہوگیا ہوں، بہت بڑا دھبّہ لگ گیا ہے، کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا، مگر ہاں استاد یا پیر یا مدّاح بن کر راہ و رسم پیدا کر دوں۔"[۵۱]

لیکن لوگوں نے غالب کو ایسا نہیں سمجھا، ہر رئیس و بادشاہ کی نظر میں بھی وہی وقعت رہی جو ہمیشہ سے تھی، چنانچہ ۱۸۵۰ء / ۱۲۶۶ھ میں بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ نے غالب کو "تاریخ شاہی" لکھنے کی خدمت پر مامور کیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب، خلعت دیا، پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی اور جب ۱۸۵۴ء / ۱۲۷۱ھ میں بادشاہ کے استاد ذوق کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے پھر جب نواب یوسف علی خاں مسند نشین رامپور ہوئے (۱۸۵۵ء / ۱۲۷۱ھ تا ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۱ھ) تو انھوں نے سو روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی۔ جس زمانے میں نواب صاحب اپنے والد کی مسند نشینی سے پہلے، دہلی میں اقامت گزیں تھے، تو ۱۸۴۰ء سے پہلے نواب صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں غالب سے فارسی پڑھی تھی۔ مسند نشین ہونے کے بعد نواب صاحب نے شاعری شروع کی اور غالب کو استادِ سخن بھی بنا لیا، انہی کے مشورے سے ناظم تخلص کیا۔ غدر میں جب بادشاہ دہلی و قلعہ شاہی سے تعلقات کے سبب سے غالب کی سرکاری پنشن بند ہوگئی تو نواب صاحب ہی کی سعی و سفارش سے تین سال بعد ۱۸۶۰ء میں پھر جاری ہوئی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ غالب نے اس حقیقت حال[۵۲] کے اظہار سے اغماض کیا ہے۔ یوسف مرزا صاحب کو ان کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"والی رامپور کو اس پنسن[۵۲] کے اجرا میں کچھ دخل نہیں، یہ کام خداساز ہے یعنی ابن ابی طالب علیہ السّلام۔"

---

[۵۱] منقول از مکاتیب غالب صفحہ ۵۵۔

[۵۲] غالب پنشن کو سین سے پنسن لکھا کرتے تھے۔

نواب کلب علی خاں رئیس رامپور (۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ تا ۱۸۸۷ء/۱۳۰۴ھ) نے بھی غالب کے سو روپیہ ماہوار جاری رکھے۔ ان دونوں رئیسوں کے دربار سے تنخواہ مقرر کے علاوہ بھی صدہا روپیہ وصول ہوتے رہے۔

وفات | ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کو ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا، اور حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی درگاہ میں اپنے خسر کے پائیں مزار دفن ہوئے۔ "آہ غالب بمرد" مادہ تاریخ ہے، جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا، اور وہ اس وجہ سے کہ آٹھ برس پہلے خود غالب اپنی موت کی آرزو اور پیشین گوئی میں "غالب مُرد" (۱۲۷۷) سے تاریخ نکال چکے تھے۔ اب اس پر لفظِ آہ اور حرفِ ب کا اضافہ عامۃ الورود تھا۔

اخلاق وعادات | غالب، انسان، دوست، استاد، مربّی، مخدوم، خادم شہری ہر حیثیت میں بے نظیر آدمی تھے۔ بہت بڑا حلقۂ احباب رکھتے تھے۔ ہر شخص کے دُکھ درد میں شریک تھے اور واقعی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ خدمتِ احباب؛ ہمدردی، فیاضی کا یہ حال تھا کہ اپنی آمدنی اپنی ذات سے زیادہ دوسروں پر صرف کر دیتے تھے۔ اسی لئے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ لیکن ہمیشہ قرض کا سخت بار محسوس کرتے تھے اور جلد ادا کرنا چاہتے تھے۔ دوستوں اور شاگردوں سے خط وکتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھتے تھے۔ ہر ایک کے ہر حال سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ شاگردوں کے کلام پر اہتمام کے ساتھ اصلاح دیتے تھے، باقاعدہ جواب دینے کا ایسا التزام تھا کہ بیماری، ضعف، معذوری میں بھی لیٹے لیٹے لکھ یا لکھوا دیتے دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ مرنے سے ایک روز پہلے کئی پہر کے بعد بیہوشی سے افاقہ ہوا تو نواب علاء الدین احمد خاں کو جوابِ خط لکھوایا، اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا: "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" فراغ حوصلہ ایسے تھے کہ کسی سائل کو دروازے سے خالی نہ جانے دیتے تھے۔

ایک بار لفٹننٹ گورنر کے دربار سے سات پارچہ کا خلعت اور تین رقوم جواہر

لیکر آئے، جانتے تھے کہ چپراسی اور جمعدار انعام مانگنے آئیں گے، اس لئے گھر آتے ہی خلعت و جواہر بازار بھیجدیئے۔ چپراسی آئے تو اُن کو ٹھالیا، بازار سے ان چیزوں کی قیمت آئی تو انعام دے کر رخصت کیا۔ نہایت متواضع، ملنسار، بے تعصب زندہ دل آدمی تھے۔ ہندو مسلمانوں سے یکساں تعلق اور برتاؤ تھا۔ ان کے خطوط کے مکتوب الیہم میں منشی ہرگوپال تفتہ، ماسٹر پیارے لال آشوب، منشی بہاری لال مشتاق، بابو ہرگوبند سہائے، منشی شیو نراین وغیرہ کتنے ہندو شامل ہیں۔ منشی ہرگوپال کو مرزا تفتہ کہا کرتے تھے۔ ان کے نام ۱۲۳ خطوط ہیں، اتنے کسی دوسرے کو نہیں لکھے۔

علم و فضل اور سخن فہمی| غالب کو مطالعہ کتب سے بیحد شوق تھا، لیکن کتاب خریدتے نہ تھے۔ کتب فروشوں سے کرایہ پر منگا کر پڑھتے تھے۔ شعر و ادب، اخلاق و تصوّف طب و حکمت، قافیہ و نجوم سے بہت دلچسپی تھی، ان علوم و فنون کو خصوصاً ادبیات و تصوف کو کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ درسیات رسمی کی تعلیم مکمل طور پر حاصل نہ کر سکے تھے۔ لیکن ان کے فہم درّاک، ذہن وقّاد اور اور ذوق نقاد نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔ شعرائے عجم کے کلام پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کے ذوق سلیم اور ذہن متوازن نے یہ چیلنج دے دیا تھا:-

"بیا ور ید گر اینجا بود زباں دانے"؟ اور اسی سبب سے اپنے معاصرین میں سے کسی کو فارسی و اُردو میں اپنا ہم پایہ نہ گردانتے تھے۔ مومن و ذوق سے خاصکر چوٹیں چلتی تھیں۔ لیکن چونکہ حقیقی شاعر اور صحیح سخن فہم تھے، اس لئے شعر کو شاعر کی ذات سے الگ کر کے بھی دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ مومن و ذوق کے ان اشعار کو بیحد پسند کرتے تھے:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوق)

مومن کا شعر سن کر فرمایا تھا کہ "کاش مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا"۔ مومن و غالب میں ایسی چشمک تھی کہ دونوں ایک مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے تھے، پھر بھی غالب مومن کے قدردان تھے۔ مومن کے انتقال (۱۸۵۱ء) پر یہ رباعی کہی تھی:-

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر　　خونابہ برُخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومن　　چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

ظرافت | شوخی و ظرافت غالب کا وہ چمکتا ہوا جوہر تھا، جس کی آب و تاب آج تک باقی ہے۔ ان کے خلق و عادت کی یہ خوبی ان کی تمام زندگی پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ بات بات میں شوخی، اور فقرے فقرے میں ظرافت تھی۔ ان کی مہر و محبت، سخا و تواضع کی اب صرف یاد ہی یاد باقی ہے، کوئی اثر و نتیجہ جاری و باقی نہیں، لیکن ان کی شوخی و ظرافت آج بھی ویسا ہی ہنساتی اور خوش کرتی ہے جیسا ان کی زندگی میں ان کے مخاطب و مکتوب الیہ کو خوش کرتی تھی۔ (غالب کے لطیفے "یادگارِ غالب" وغیرہ میں دیکھنے چاہئیں) آج کل مزاحیہ نگاری ایک خاص علم و فن بن گئی ہے، لیکن یہ سب "عقلی مزاح" ہے اور غالب کی "فطری ظرافت" تھی۔ غالب کو اپنی اس فطرت سے بعض فائدے بھی حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ طبعی زندہ دلی کے سبب سے وہ غم و الم کو آسانی سے جھیل جاتے تھے اور مصیبت کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کی بعض نازیبا باتیں "مذاق" کے پردے میں چھپ جاتی تھیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ہنسی ہنسی میں بعض کام بنا لیتے تھے۔ ایک دن غدر کے بعد تحقیقات کے لئے غالب کرنل براؤن کے سامنے پیش ہوئے، اس نے ان کا حلیہ دیکھ کر پوچھا "تم مسلمان ہو؟" یہ بولے "حضور آدھا"۔ کرنل نے کہا "کیا مطلب؟" بولے، "شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا"۔ ایک اور موقع پر کہا تھا کہ "میں نے کسی دن نماز نہیں پڑھی اور کسی دن شراب نہیں چھوڑی، پھر مجھے مسلمان کیوں سمجھتے ہیں"۔ یہ باتیں اصل میں غالب نے جان و آبرو بچانے کے لئے ڈر سے کہی تھیں، لیکن شوخی و ظرافت کے رنگ میں کہیں، اور واقعہ بھی یہی تھا، اس لئے

ان کا نازیبا ہونا مخفی و غیر محسوس رہا۔

شراب و کباب | غالب شراب پیتے تھے، لیکن اس عیب کو چھپاتے نہ تھے، علانیہ پیتے تھے، اور اس گناہ کا احساس رکھتے تھے۔ آم کا بیحد شوق تھا۔ آموں کی کسی نے صفت پوچھی تو کہا "بہت ہوں اور میٹھے ہوں"۔ کھانے میں شامی کباب خاص طور پر پسند تھے۔ جب اور کچھ نہ کھا سکتے تھے تب بھی کباب ضرور کھاتے تھے۔ ان تینوں چیزوں کا اپنے خطوط میں بار بار ذکر کیا ہے۔

بعض عجیب باتیں | غالب کے حالات میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو اُن کے اخلاق سے تخالف رکھتی ہیں۔ غالب غیور تھے، خود دار تھے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ دہلی کالج کی ملازمت کا ارادہ اپنے معیارِ عزت کو پیش نظر رکھ کر، ترک کر دیا، اور سو روپیہ ماہوار کی آمدنی سے قطع نظر کرلی۔ لیکن دوسرے موقعوں پر تحصیل زر کے لئے جد و جہد اور الحاح و زاری میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ غدر سے پہلے پنشن کے اضافہ کے لئے کلکتہ کا سفر کیا اور انگریز حکام کی مدح میں فارسی قصیدے کہے۔ یہ کوشش نامناسب نہ تھی، لیکن قصیدہ خوانی، اور اس حد تک عجیب تھی۔

پھر غدر کے بعد جب پنشن بند ہوگئی، تو اس کو جاری کرانے اور دربار و خلعت کو بحال کرانے کی خاطر مدح خوانی و قصیدہ سرائی کی کوئی حد نہ رکھی۔ ملکہ وکٹوریہ، گورنر جنرل، وائسرائے، لفٹنٹ گورنر، کمشنر وغیرہ کوئی انگریز حاکم، جس کو پنشن کے معاملے سے ذرا سا بھی تعلق تھا، بسا نہ رہا جس کی تعریف میں قصیدہ یا قطعہ نہ کہا ہو۔ دونوں موقعوں کے لئے فارسی کے ۲۵ قصیدے اور قطعے کہے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے خطوط میں پنشن بند ہونے کی حسرت، اجرا کی ضرورت، آرزو، توقع، انتظار، بیقراری کے جذبات جیسے اور جتنے جا بجا ظاہر کئے ہیں، وہ بجائے خود عجیب و دلچسپ ہیں۔ غالب کے قدیم مجموعات خطوط میں بھی یہ مضامین ہیں، لیکن اب "مکاتیبِ غالب" میں رئیسانِ رامپور کے نام غالب کے خطوط شائع ہو جانے سے ان واقعات پر اور زیادہ روشنی پڑ رہی ہے۔ طرفہ تر یہ کہ غالب اجرائے پنشن کے لئے نواب یوسف علی خانصاحب بہادر

سے سفارش چاہتے ہیں۔ نواب صاحب اپنے استاد کی تعمیل ارشاد کرتے ہیں، اور غالب کو اطمینان دلانے کے لئے لکھتے ہیں کہ "ہنگام ملاقات کے اکثر صاحبان ذی شان سے تذکار محامد اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدر دانی سرکار دولت مدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں پیشگاہ گورنمنٹ سے بھی اسی مطابق ظہور میں آوے گا۔"

جب پنشن جاری ہونے کا حکم آتا ہے تو غالب جانتے ہیں کہ اس کامیابی میں نواب صاحب کی کوشش و سفارش شامل ہے۔ اور ایک خط میں نواب صاحب سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ "جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالم غیب میں آپ کا اقبال مجکو مدد پونہچا رہا ہے۔" لیکن پنشن وصول ہونے کے بعد جب لوگ ان سے یہ بات پوچھتے ہیں تو صاف لکھ دیتے ہیں کہ "والی رامپور کو اس پنسن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔"

"مکاتیب غالب" کی اشاعت نے غالب کی سیرت کا ایک نیا باب کھول دیا ہے، یا جو باب پہلے مجمل تھا، اب اس کی شرح شائع کر دی ہے۔ غالب کے دوستوں میں بعض رؤسا، و جاگیردار بھی تھے۔ اور وہ ہمیشہ ہر موقع پر امداد کرتے رہتے تھے، لیکن ان میں سے نواب ضیاء الدین خاں اور نواب علاء الدین خاں بھی، جن سے خاص الخاص مراسم و تعلقات تھے، ایسے نہ تھے کہ بے تحاشا دیتے، اور غالب کی ضرورتیں اسی کی متقاضی تھیں۔ خوبی تقدیر سے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں رئیسان رامپور یکے بعد دیگرے ایسے قدردان مل گئے جو اپنے آپ کو ان کا شاگرد سمجھتے تھے، اور اس قدر عزت کرتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی۔ ان بزرگوں سے طلب زر کے لئے غالب کی الحاح و التجا اور حُسنِ طلب یا قبح سوال کے اسالیب و تراکیب، عجائبِ فطرت بھی ہیں اور نوادرِ ادبیت بھی۔ ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے مکاتیب غالب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہاں مثالاً بعض فقرے نقل کئے جاتے ہیں۔

نواب یوسف علی خاں بہادر کو لکھتے ہیں :-

(۱) "سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پونہچی، اور روپیہ وصول

میں آیا، اور صرف ہو گیا، اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ اس مشاہرہ مقرری کے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجکو اور بھیج دیجئے گا تو جِلا لیجئے گا لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔"

(۲) "یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لیکے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ سوا[1] سو روپیے جو تورہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں لباس نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں۔"

نواب کلب علی خاں بہادر کو لکھتے ہیں :-

(۱) "پیر و مرشد! حضرت فردوس مکاں (یعنی نواب یوسف علی خاں) کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اس کی رسید میں خط تحسین و آفریں کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر نہیں بنتی، دو سو پچاس کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی .... یہ رسم بُری نہیں ہے، اگر جاری رہے تو بہتر ہے۔"

(۲) "حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں، میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔"

(۳) "ماہ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کیا کرتے ہیں۔ اگر حسین[2] علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے، اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے، تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے۔"

---

[1] نواب صاحب نے اپنے چھوٹے لڑکے صاحبزادہ حیدر علی خاں کی شادی کے موقع پر ۱۲۵ روپیہ تورہ و خلعت کے بجائے بھیجے تھے۔

[2] زین العابدین خاں عارف کا چھوٹا لڑکا۔ غالب نے اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کو متبنّیٰ بنا لیا تھا۔ حسین علی خاں غالب کی وفات کے بعد ریاست رامپور میں ملازم دربار ہو گئے تھے۔

ان محتنانِ رامپور کی شان میں قصیدے تو چار پانچ بھی نہیں، اور یہ مکتوبات کی مدح خوانیاں کثیر وطویل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ غالب نواب خلد آشیاں (نواب کلب علی خاں) کے دعوت نامہ پر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور پہنچے۔ نواب صاحب نے ۷ نومبر کو ایک ہزار روپیہ عطا کئے، ۲۸ نومبر کو غالب مرزا تفتہ (منشی ہرگوپال) کو رامپور سے خط لکھتے ہیں، لیکن اس عطیہ کا ذکر نہیں کرتے بلکہ مزید بخشش کی آرزو لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔"

دسمبر میں نواب صاحب نے ۲۰۰ دو سو روپیہ زاد راہ کے لئے مرحمت کر دیئے۔

غالب میں یہ بات بھی بڑی دلچسپ تھی کہ کسی ہندوستانی کی فارسی دانی کے قائل نہ تھے، خصوصاً اپنے زمانے کے اور اپنے زمانے سے قریب کے شعراء مصنفین فارسی کو تو بالکل ہیچ و پوچ سمجھتے تھے۔ ان میں بھی ہندو اہل قلم سے نہایت بیزار تھے۔ خاصکر جب خود ان کے مقابلے میں کسی ہندی یا ہندو کا نام کوئی شخص لیتا تو جل جاتے تھے، اور بڑی تحقیر سے اس کا ذکر کرتے تھے۔ مرزا قتیل، مولوی غیاث الدین مصنف غیاث اللغات وغیرہ سب کو نالائق سمجھتے تھے۔ "برہانِ قاطع" کی قطع و برید کا تو ایک ہنگامہ برپا رکھا۔ بعض اور فرہنگ نویسوں کے متعلق نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں:-

"میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری، شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی عظمائے عجم میں سے نہیں، ہند ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعار قدما، ہادی ان کا قیاس۔ ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو، سبحان اللہ، ہندی بھی اور ہندو بھی؛ نور علی نور!!"

مولوی امام بخش صہبائی غالب کے ہم عصر اور دوست تھے اور فارسی کے بڑے

مشہور و مستند فاضل تھے۔ غالب ان کو بھی کچھ نہ سمجھتے تھے۔ "برہانِ قاطع" کی غلطیاں ثابت کرنے کے لئے غالب نے "قاطع برہان" لکھی۔ غالب کے جواب میں کسی شخص نے "ساطع برہان" شائع کی۔ اس کے مصنف رحیم بیگ کے متعلق غالب لکھتے ہیں (سیاح و شاکر کے نام کے خطوط کا یہ اقتباس ہے):۔

"وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے مُلّا مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا۔ کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے[۵۱]........ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سُن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے، بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ واے اس ہیچ در پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزو وقار ہو۔"[۵۲]

اسی کتاب کی بحث کے سلسلے میں ایک اور جگہ غالب نے مولانا صہبائی پر اس سے زیادہ سخت حملہ کیا ہے، مرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" کو ایک رقعہ (مطبوعہ عود ہندی) میں لکھتے ہیں:۔

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو "امام المحقّقین" خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے آپ کو (یعنی مولوی امام بخش کو) اپنا امام مان لیا ہے، .... اگر حضرت (یعنی رحیم بیگ) بفتحۂ قافِ ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحقَّقین کہتے، تو ایک ماموم (پیرو امام) آپ، اور نراین داس تنبولی دوسرا ہوتا۔"

غالب کا مقصود یہ ہے کہ امام بخش صہبائی سب محققوں کے امام تو ہو نہیں سکتے۔ دو محققوں کے امام ہو سکتے ہیں، ایک رحیم بیگ کے، دوسرے نراین داس تنبولی

---

۵۱ اردوے معلّی (مجموعہ رقعات غالب) بحوالہ مکاتیب غالب۔

۵۲ عود ہندی (مجموعہ رقعات غالب)

کے۔ صبائی اُس زمانے میں زندہ نہ تھے ورنہ ان فقروں کا مزہ لیتے

غالب کا مذہب | بیسویں صدی سے پہلے اہل ہند کی ذہنیت ایسی نہ تھی کہ تذکرہ و تاریخ میں کسی مشہور شخص یا شاعر و مصنف کے مذہب و عقائد کے متعلق بحث روا رکھی جاتی۔ لیکن عصر حاضر میں تقلید فرنگ اور تحقیق و تنقید کے رواج نے اس کی اجازت دیدی ہے۔ اہل یورپ اپنے مشاہیر کے متعلق ذرا ذرا سی بات کی کرید کرتے ہیں۔ ایک سال ولادت یا وفات کو متعین کرنے کے لئے دلیلوں پر دلیلیں لاتے ہیں اور صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ اسی طرح عقائد و رجحاناتِ مذہبی کے ایک ایک پہلو کو روشن کرتے ہیں، اور یہ محض علمی تحقیقات ہوتی ہے، عناد و فساد مقصود نہیں ہوتا۔ غالب کے مذہب پر بھی اس طرح نظر ڈالنی چاہئے۔ ان کے لئے اپنا پسندیدہ مذہب ثابت کرنے کی کوشش تاریخی و علمی نظر میں غیر مستحسن ہے۔ ان کا کوئی مذہب ثابت ہو یا کوئی مذہب بھی ثابت نہ ہو، مورخ و نقاد یا شاعر و ادیب کے نزدیک ان کا پایۂ کمال غیر متزلزل رہنا چاہئے۔ غالب کے متعلق اس زمانے میں اس امر خاص پر بھی بحثیں ہوئی ہیں، مختلف مضامین رسائل میں شائع ہوئے ہیں، اور وہ ہمارے پیش نظر ہیں۔ تاریخ و تذکرہ اور تنقید و تبصرہ کے ذریعہ سے لوگوں نے غالب کے لئے مختلف عقائد ثابت کئے ہیں، یعنی: تفضیلی، مائل بہ تشیع، شیعہ، شیعۂ غالی، نُصیری، صوفی، چشتی و نظامی، اور بیدین و لامذہب۔ اور ان عقائد کے لئے خود غالب یا غالب کے دیکھنے والوں کے بیانات دلیلوں میں لائے گئے ہیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں، مختصر طور پر ہماری رائے و تحقیق یہ ہے:۔

غالب کو بیدین و لامذہب ان کے مختلف و متضاد اقوال کی بنا پر کہا گیا ہے، کہ کبھی نُصیری ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کبھی شیعہ ہونے سے بھی انکار ہے۔ کبھی اپنے آپ کو صوفی صافی بتاتے ہیں۔ کبھی خلفائے راشدین سے بھی بیزار ہیں۔ جس کا ایسا مذہب ہو، اس کا کوئی مذہب نہیں لیکن غالب پر یہ الزام لگانا انتہا درجہ کی جسارت اور محض عناد ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ غالب شاعر بھی تھے اور ظریف بھی

دنیا دار بھی تھے اور رند مشرب بھی۔ ایسا شخص جیسا موقع دیکھتا اور ضرورت سمجھتا ہے کبھی بطریق انبساط، کبھی بطرز شاعری، کبھی بتقاضائے بشریت جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے، لیکن وہ اس کے صحیح خیالات اور اصلی معتقدات نہیں ہوتے اگر اسطرح کے مواقع و اقوال کی گرفت کی جائے تو نماز روزے کے لطیفوں پر ہی غالب کو کافر کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ فتوائے کفر فتور عقل کا ثبوت ہوگا۔ اسی طرح اگر غالب نے یہ کہا:-

منصورِ فرقۂ علیؑ اللّٰہیاں منم آوازۂ "انا اسد اللّٰہ" برآورم

تو اس کو دعوائے نصیریت سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ مضمون ایسا سوجھا، اور اس میں انا اسد اللّٰہ ایسا معنی خیز تھا، کہ اگر اس سے شرک جلی بھی لازم آتا تو غالب کہنے سے باز نہ رہتے، اور بیشک کہنا چاہیئے تھا۔ ایسے شعر اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ نوادر شاعری میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ "صوفی" ہونے کا غالب نے بارہا دعویٰ کیا ہے، اور اپنے آپ کو چشتی نظامی بھی بتایا ہے، یعنی لکھا ہے:-

"شاہ محمد اعظم صاحب خلیفہ تھے مولانا فخر الدین صاحب کے، اور میں مرید ہوں اسی خاندان کا۔"

مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللّٰہ علیہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بزرگ تھے۔ غالب کے آبا و اجداد سب سُنّی تھے۔ ان کی بیوی سُنّی تھیں، ان کی سسرال والے (جاگیر داران لوہارو) سُنّی تھے اور ان میں سے اکثر اسی خاندان کے مرید و معتقد تھے۔ اس لئے غالب بھی اسی خاندان کے مرید ہوں تو عجب نہیں۔ لیکن غالب کا اپنے آپ کو صوفی صافی کہنا اصطلاحی معنوں میں نہ تھا، بلکہ بطور محاورہ تھا، "ولی اللّٰہ" ہونے کا دعویٰ نہ تھا، بلکہ یہ مقصود تھا کہ:-

"آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کُل"

غالب نے تصوّف کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا، اس کے مسائل ذہن نشیں تھے، اصطلاحیں برزبان تھیں، باتیں کرنے اور باتیں بنانے کا بہت شوق تھا، سخن آرائی

اور سخن پروری کی بڑی مشق تھی۔ اسی کا اثر ان کی باتوں اور ان کی شاعری سے نمایاں ہے۔ فارسی و اردو کلام میں تصوّف کے مسائل بہت لکھے ہیں، لیکن ان میں تصوّف کی زبان ہے، صوفی کا دل نہیں، خواجہ میر درد اور غالب کے متصوفانہ کلام کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درد دل سے کہتے ہیں، اور غالب زبان سے۔ درد اُس عالم میں پہنچے ہوئے ہیں، اور غالب کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی۔ غالب "حقیقتِ حقہ، وحدتِ وجود" کے بڑے قائل ہیں، اور فرماتے ہیں کہ

"زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں، اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔"

لیکن یہ کہنا کسی صاحب حال کا سا کہنا نہ تھا۔ بلکہ ایسا تھا کہ:۔

"بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے"

غالب کے مذہب کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

"مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیّع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسولِ خداؐ کے بعد تمام اُمّت سے افضل جانتے تھے۔"

مولانا آزاد دہلوی (صاحبِ آبِ حیات) کی رائے ہے:۔

"مگر اہل راز اور تصنیفات سے یہی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا، اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوشِ محبّت میں تھا، نہ کہ تبرّا و تکرار میں۔"

لیکن غالب کا ایک فقرہ اس سے زیادہ کا بھی پتہ دیتا ہے، فرماتے ہیں:۔

"مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو مسلمہ کو نبوت میں ختم المرسلینؐ کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر جانتے ہیں۔"

"ابو الائمہ" سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور جن بزرگوں کو حضرت علی کا ہمسر مانا جاتا ہے ان کو "نومسلم" کہا ہے، اور جو لوگ مانتے ہیں ان کو "مشرک" ٹھہرایا ہے۔

تصانیف فارسی | غالب نے آخری بادشاہِ دہلی بہادر شاہ ظفر کے حکم سے ۱۲۶۶ھ ۱۸۵۰ء
میں خاندان تیمور کی تاریخ لکھنی شروع کی۔ اس کتاب کا نام "پرتوستان" تجویز
کیا تھا لیکن پہلا حصہ تمام ہوا تھا کہ غدر ہوگیا۔ یہ حصہ مہر نیمروز کے نام سے شائع ہوگیا
ہے۔ اس میں تیمور سے ہمایوں بادشاہ تک کے حالات ہیں۔ دوسرے حصہ میں
اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ ظفر تک کی تاریخ ہوتی، لیکن لکھنے کا موقع نہ ملا۔ اس حصّے
کا نام غالب نے "ماہِ نیم ماہ" تجویز کیا تھا۔ اس ترکیب پر ان کو بڑا ناز تھا۔ دوسرے
رستخیز بیجا پر بہت فخر کرتے تھے۔ یہ ہنگامہ غدر کا مادۂ تاریخ ہے، اور بے شک
بے مثل ہے۔ (۲) دستنبو، اس میں غدر کا حال لکھا ہے۔ خود غالب کا بیان ہے!
"گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں یہ عبارتِ
فارسی نام آمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے۔ اور اس میں صرف
اپنی سرگذشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے (۳) پنج آہنگ میں
فارسی انشا پردازی کے نمونے ہیں۔ (۴) کلیاتِ نظم غالب، بقول غالب "ایک فارسی
دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا ہے۔" اس میں قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات
سب کچھ ہے (۵) سبد چین میں چند فارسی قصائد و غزلیات در قعات ہیں۔
(۶) قاطع برہان میں خانِ آرزو کی "برہانِ قاطع" کے اغلاط ثابت کئے ہیں۔ بعد کو
اس میں اضافہ کیا اور اس کا نام درفشِ کاویانی رکھا۔

اُردو تصانیف | (۱) عودِ ہندی، رقعاتِ غالب کا پہلا مجموعہ غالب کی زندگی
میں، وفات سے چار مہینے پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء (رجب ۱۲۸۵ھ) میں پہلی مرتبہ

---

۵ "رستخیز بیجا" تخرجہ کے ساتھ تاریخ ہے۔ تخرجہ کا عیب جن تاریخی مادّوں میں حسن بن گیا ہے ان میں سے
ایک یہ بھی ہے۔ رستخیز کے اعداد (۱۲۷۷) ہیں۔ ان میں سے (جا) کے چار عدد نکالے جائیں تو ۱۲۷۳ھ
پیدا ہوتے ہیں، یہی غدر کا سال ہے۔ "بیجا" کہکر تخرجہ (تفریق) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "رستخیز بیجا"
(یعنی بے محل قیامت) غدر کے لئے کس قدر موزوں لفظ ہے۔ غالب کی دوسری تاریخ "غدرِ ہندی" ۱۲۷۳ھ
بھی خوب ہے۔ لیکن پہلی اس سے بھی بہتر ہے۔

مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۶۲ رقعات ہیں اور ان کے علاوہ غالب کی لکھی ہوئی دو کتابوں کی تقریظیں اور تین کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔

(۲) اردوے معلی حصہ اوّل دوسرا مجموعہ خطوط غالب کے انتقال سے ۱۹ روز بعد ۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء مطابق ۲۱ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ روز جمعہ کو مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھپ کر تیار ہوا۔ غالب کے شاگرد مرزا قربان علی سالک نے سال طبع لکھا:-

"آج ادن کا سخن تمام ہوا"
۱۲۸۵ھ

اس میں ۴۶۴ صفحے اور ۲۷۴ خطوط ہیں۔

(۳) اردوے معلی حصہ دوم، سنہ ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے متعلق مولوی عبدالاحد مالک مطبع نے لکھا ہے کہ "اس حصہ میں خاصکر وہ رقعات ہیں جن میں انھوں نے (مرزا غالب نے) لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں"۔ اس میں ۵۶ صفحے اور ۵۳ رقعے ہیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۹ء میں جب شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے اردوے معلی کے دونوں حصے یک جا شائع کئے تو آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کر دیا جس میں غیر شائع شدہ ۲۳ خطوط ہیں۔

(۴) مکاتیب غالب، آخری مجموعۂ خطوط ہے جس میں نواب یوسف علی خاں بہادر اور نواب کلب علی خاں بہادر فرمانروایان رامپور کے نام غالب کے ۱۱۵ مکتوبات ہیں۔ یہ مجموعہ نہایت خوبصورت ٹائپ میں بہترین طباعت کے ساتھ ریاست کی جانب سے سنہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے۔ منشی امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ سرکاری نے ۱۸۱ صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے، جس میں ان خطوط کی مدد سے غالب کے حالات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ یہ رقعے ادبی اعتبار سے زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ درجنوں رقعے صرف چار چار پانچ سطروں کے ہیں جن میں تنخواہ ماہانہ کی ہنڈی (یا بقول غالب ہنڈوی) کی رسیدیں ہیں۔ پھر بھی کہیں کہیں کوئی ادبی

یا علمی بات بھی آگئی ہے، یا کوئی قطعہ یا تاریخ شامل ہے، جواب تک شائع نہ ہوا تھا۔ غالب کا مخصوص اسلوبِ نگارش سب میں ہے، اور ظرافت اکثر میں۔ اس لئے یہ مجموعہ بھی تبرکاتِ غالب میں شامل ہے۔

(۵-۶-۷) لطائفِ غیبی، تیغ تیز، نامہ غالب، یہ تینوں رسالے "قاطع بُرہان" کے مخالفوں کے جواب میں لکھے ہیں۔

(۸) تقریظیں اور دیباچے، مختلف کتابوں کے لئے لکھے تھے، "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی حصّہ دوم" میں شامل ہیں۔

غالب کا اسلوبِ تحریر | تقریظوں اور دیباچوں میں غالب نے تحریر کا طرز وہی رکھا ہے جو خود ان کتابوں کا ہے یا جو اس زمانے میں مقبول و رائج تھا، یعنی قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی۔ بقول مولانا حالی کے، "مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہئے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمایش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفاتِ باردہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانہ میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے۔ اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔" اگرچہ ان تحریروں میں کوئی جدّت و نُدرت نہیں، تاہم غالب کی یادگاریں ہیں۔ اس لئے وہ تین تحریروں کے چند فقرے نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ مرزا حاتم علی مہر کی مثنوی کی تقریظ :-

"یہ مثنوی کہ مجموعہ دانش و آگہی ہے، اگرچہ اس کو سفینہ کہہ سکتے ہیں، لیکن فی الحقیقت ایک نہر ہے کہ بحرِ سخن سے ادھر کو بہی ہے۔ سخن ایک معشوقہ پری پیکر ہے۔ تقطیعِ شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکش ماہ تمام پایا ہے، اسی رو سے اس مثنوی نے شعاعِ مہر نام پایا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہاں مہر سے مراد آفتاب ہے، یہ شعاع اس مہر کی ہے کہ جو ذرہ خاک راہ بوتراب ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ سخنور روشن ضمیر

مہر چہرہ، مرزا حاتم علی مہر کو سخن طرازی ہمایہ بیضا ہے۔"

۲. گلزارِ سرور، مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور کی تقریظ:-

"مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان کی خوبی میں فسانۂ عجائب بے نظیر ہے، جس نے میرے دعوے کو اور "فسانۂ عجائب" کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے، کیا ہوا کہ ایک طرح اور ایک قماش کے ہیں۔ یہ دونوں دلفریب نقش ایک ہی نقاش کے ہیں۔ مانا کہ ایک دوسرے کا ثانی ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے۔ مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعویٰ پیمبری کا کرے، کیا عقل کی کمی ہے۔ یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویٰ خدائی نہ کرے، کس حوصلہ کا آدمی ہے۔"

۳. حدائق الانظار، تالیف خواجہ بدرالدین خاں کا دیباچہ:-

"دریں ولا، میرا برادر زادہ سعادت تواماں، خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ اماں، کہ وہ ایک جواں شیریں بیاں تیز ہوش ہے، اور ہر فن کی تحصیل میں سخن کش سخت کوش ہے۔ ستار کا جو خیال ہوا، ایسا بجایا کہ میاں تان سین کی انگلیوں پہ نچایا، مصوری کی طرف جو طبیعت آئی وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت آئی۔ اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا "بوستان خیال" کی فارسی نثر کے اردو کرنے پر آمادہ ہوا .... بعد اختتام نگارش غالب فلک زدہ سے دیباچہ لکھنے کی آرزو کی۔ میں نے ہر چند عجز آمیز معذرت انگیز گفتگو کی، بیدار گر نے ایک بات نہ سنی، اور ایک عذر نہ مانا۔ بھلا اس اصرار کا کیا کیا علاج اور اس ضد کا کیا ٹھکانا۔ بھتیجا اور پیارا بھتیجا، ناچار بجز خامہ فرسائی کچھ بن نہ آئی۔"

۴. سراج المعرفت کا دیباچہ۔ اس کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں، خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میر لال کی کتاب "سراج المعرفت" پر لکھا ہے۔ اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوّف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کئے ہیں، اس کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوّف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد

ایسی عمدہ نثر میں کسی نے لکھے؟" اس دیباچہ کا مختصر نمونہ یہ ہے :۔

"حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامۂ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے لاموثر فی الموجود الا اللہ، اور خط میں مندرج ہے لاموجود الا اللہ۔ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا، وہ نامہ آور اور نام آور کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں: آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیائے پیشیں صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری اٹھا دیں، اور حقیقت یرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت، خواص امت محمدی کا سینہ ہے، اور کلمہ لاالٰہ الّا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ رہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں، اور نفی شرک فی الوجود، جو اصل مقصود ہے، ان کی نظر میں نہیں۔ مگر جب لاالٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے، اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدم گاہ پر آ رہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمہ سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا، یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح افزائے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ..........

جب اولیاء اللہ نے، کہ وہ اطبائے روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے، اور بسبب استیلائے وہم کے مشاہدۂ وحدت ذات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہر چند ان کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے، ناچار اشغال و اذکار وضع کئے۔ تاکہ قوت متخیلہ اس میں الجھی رہے، اور رفتہ رفتہ بجز دلی ملازنامہ ہو جاوے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو، اور ہم دیکھیں ہو بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ ع

دانی ہمہ اوست ۔ ندانی ہمہ اوست

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے، اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہوگیا، بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہوگیا۔ بیخبری اور بیخودی چھاگئی، اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے۔ اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں بہانہ کر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل دیا، انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں، یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں، مگر ہاں کم ہیں اور کہیں کہیں ہیں۔ اور ایسے نفوس کہ جو کسبِ حالت بیخودی کے واسطے محتاجِ اشغال و اذکار ہیں۔ بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں۔"

رقعاتِ اردو کی خصوصیات اور غالب کی اوّلیت

نثرِ اردو میں غالب کی اولویت اور اوّلیت ان کے رقعات کے سبب سے ہے۔ اردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا، اور اس میں جو جدّتیں پیدا کیں، اور ان کو جس التزام، اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا۔ اس میں غالب اوّل بھی ہیں اور آخر بھی۔

۱۸۵۰ء تک غالب فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔ اس سال میں بہادر شاہ ظفر نے ان کو تاریخ نویسی کی خدمت سپرد کی۔ وہ فارسی تحریریں بڑی محنت و کاوش سے لکھا کرتے تھے۔ اب اس تاریخ کے ساتھ خطوط فارسی پر بھی محنت کرنا دشوار تھا۔ اس لئے اُردو میں خط و کتابت شروع کر دی۔ پھر غدر کے بعد صدماتِ اعزہ و احباب، مالی تردّدات اور پیری و امراض نے زیادہ مضمحل کر دیا تو ۱۸۶۱ء میں ارادہ کر لیا اور اعلان کر دیا کہ فارسی انشا پردازی ترک کر کے اُردو ہی میں لکھا کریں گے، لیکن باوجود اس عزم کے بضرورت کبھی کبھی فارسی میں بھی خطوط لکھتے رہے۔ آخر ۱۸۶۵ء فارسی نگاری بالکل چھوڑ دی، اور تا دمِ مرگ (۱۸۶۹ء) اُردو میں خط کتابت کرتے رہے۔

جتنے خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں، اور تین چار مجموعوں میں شائع ہو چکے

ہیں، ان کی ضخامت تقریباً ۹۰۰ صفحات ہے اور تعدادِ خطوط تقریباً ۸۲۵۔ اگرچہ رقعات کا شمار تصنیف میں نہیں ہوا کرتا، لیکن ایسا ضخیم مجموعہ یقیناً غالبؔ کی مستقل تصنیف کہلائے جانے کا مستحق ہے، خاصکر جب ان میں سے تخمیناً سو خطوط کو چھوڑ کر (غالباً اس سے بھی کم) باقی سب میں کم غالبؔ کا ایجاد کردہ طرز تحریر ہے، یا ان کی شوخی و ظرافت ہے، یا ادبی نکات ہیں، یا علمی مباحثہ ہے، یا اشعار کی تشریح ہے، یا شاگردوں کے کلام کی اصلاحات ہیں۔

"رقعات غالب" کی خصوصیات مختصر طور پر یہ ہیں :-

(۱) غالبؔ نے القاب و آداب، مزاج پرسی و خیریت نگاری کا قدیم دستور، جس سے سرمو تجاوز کرنا روا نہ رکھا جاتا تھا، بالکل ترک کر دیا۔ یہ بات نہیں کہ یہ باتیں لکھتے ہی نہ تھے، مگر ان قاعدوں کے اور ان کی ترتیب کے پابند نہ تھے۔ کبھی القاب آداب بالکل چھوڑ دیتے اور اول سطر سے مضمون شروع کر دیتے تھے، کبھی لکھتے تھے تو نئے، مختصر، موزوں القاب لکھتے تھے۔ مثلاً "میاں"، "برخوردار"، "بندہ پرور"، "مہاراج"، "پیر و مرشد"، "بھائی صاحب"، اس سے زیادہ لکھا تو "میری جان کے چین میاں سرفراز حسین"؛ "میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتہ سخندان"۔ کبھی یہ سب غائب اور خط اس طرح سے شروع :-

"ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو؟" یا "مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے!"

اسی طرح دعا، سلام اور اپنا نام، اور تاریخ تحریر لکھنے میں بھی کوئی پابندی نہ تھی مثلاً :-

"نور چشم، راحت جان، میر سرفراز حسین، جیتے رہو اور خوش رہو"۔

"ناوک بیداد کا ہدف، پیر خرف، یعنی غالب آداب بجالاتا ہے"۔

"قبلہ۔ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے، اور کیونکر جیتا ہے؟"

"۶ر دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدھ کا دن، صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام

غالب ہے کہ تم جانتے ہوگے"۔

"جواب کا طالب غالب۔ سہ شنبہ، از روے جنتری ۲۶، از روے رویت ۲۵ رجب ۱۲۸۳ھ"۔

(۲) خط کو مکالمہ بنا دیتے ہیں، اس طرح لکھتے ہیں گویا سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ خود بعض لوگوں کو لکھتے ہیں کہ "پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں، باتیں کرنی ہیں"۔ "بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے"۔ "آپ حضرت سے باتیں کر چکا، خط کو سرنامہ کرکے کہار کو دیتا ہوں"۔ اس طرح کے خط کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے ان کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا، میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج جائیں گی؟ اُس نے کہا، آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو انھوں نے اس طرح لکھا ہے:-

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟
حضرت، ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے"۔

اس طرح کا ذرا طویل انتخاب آگے درج ہوگا۔

(۳) اس طرزِ مکالمہ میں کبھی یہ جدت پیدا کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان کے اندازِ بیان سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:-

"میر مہدی، جیتے رہو! آفریں! صد آفریں! اُردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، کہ مجھے رشک آنے لگا ہے۔ سُنو دلّی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے، یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے"۔

اس "ظالم" سے مراد یہی میر مہدی ہیں۔

(۴) غالبؔ کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی، جس نے، بقول مولانا حالی، ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، ان کی شوخی تحریر ہے، جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی .... پھر جس رُتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا، اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں ان کی لڑکی کو، جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں :۔

"کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں رئیس لوہارو کو ان کے بچپن کے زمانے میں، ان کے رُقعے کا جواب، جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں :۔

"اے مردم چشم جہاں بینِ غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشم جہاں بینِ غالب کی پُتلی۔ چشم جہاں بیں تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر، اور پُتلی تم، میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمہارا دلدادہ ہوں۔"

(۵) کبھی اس پیرایۂ ظرافت سے حُسنِ طلب کا کام لیتے ہیں جیسے نواب صاحب رامپور کے نام کا خط پہلے درج کیا گیا۔ کبھی کسی فرمایش کو ہنسی ہنسی میں ٹال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک بار نواب علاء الدین احمد خاں نے اپنے لڑکے کی تاریخ ولادت اور تاریخی نام کی فرمایش کی۔ غالبؔ مادۂ تاریخ نکالنے سے ہمیشہ گھبراتے ہیں۔ اس فرمایش کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے، جب جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حُسنِ طبع خداداد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو، کہ مجھ پیر غم زدہ دل مُردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین احمد خاں، تیری جان کی قسم! میں نے پہلے

لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر، اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب، دہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

(۶) ظرافت کے لئے نئے نئے پیرائے پیدا کرتے ہیں۔ ناداری میں کپڑے بیچنے پڑے تو لکھتے ہیں:-

"اور لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑا کھاتا ہوں۔"

رامپور کے ایک جشنِ سرکاری کے حال میں لکھتے ہیں:-

"طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع، کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہئے۔"

(۷) بعض خطوط مقفٰی بھی لکھے ہیں، لیکن بقولِ مولانا حالی، مقفٰی عبارت خاصکر ان خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت، اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ مفتی میر عباس کو ان کے احترام اور قدامت پسندی کے سبب سے سراسر مقفٰی خط لکھا ہے۔

(۸) بعض جگہ الفاظ کی ترتیب میں قدامت ہے۔ یہ فارسی کی عادت کا اثر تھا، جو پہلے سے تھا اور بعد تک رہا ہے۔ بعض فارسی محاوروں کو ترجمہ کر دیا ہے مثلاً لکھتے ہیں:-

"کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم مارے۔" (فارسی برہم زدن)

اب بعض خطوط پورے اور بعض کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں رئیس رامپور کے نام کا مکمل مکتوب یہ ہے:-

حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عزّ ورود لایا، تنخواہ جولائی ۱۸۶۵ء حال کا

روپیہ از روے ہنڈوی ملفوفہ معرض وصول میں آیا۔ اگرچہ یہاں مینھ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابر رحمت کے شکریہ میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظرِ اصلاح نظم و اصلاحِ حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب۔ جمعہ ۱۱ ماہ اگست ۱۸۶۵ء

(قطعہ)

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک رہا ہے زور سے، ابر ستارہ بار، برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟ بیار، لائے گلنار گوں، بیار، برس
خدا نے تجھکو عطا کی ہے گوہر افشانی درِ حضور پر، اے ابر، بار بار برس
ہر ایک قطرہ کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے امیر کلب علی خاں جئیں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس
جناب قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو غالب کو بندِ غم سے نجات خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

نواب خلد آشیاں ہی کے نام دوسرا عریضہ ہے۔ رامپور کی نمائش گاہ بے نظیر میں شریک نہو سکنے کی حسرت لکھتے ہیں، کیا خوب پیرایہ پیدا کیا ہے :-

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے، نمائش گاہ سراسر سرور رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں، کہ ہائے میں وہاں نہیں! بالاخانے پر رہتا ہوں اُتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لیکر اُتارا اور پالکی میں بٹھادیا۔ کہار چلے، راہ میں مرا، اور رامپور پہنچ گیا، کہاروں نے جاکر بے نظیر میں میری پالکی رکھدی۔ پالکی قفسِ

اور میں طائر اسیر دہ بھی بے پر و بال، نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں یہ سب بطریق فرض محال ہے۔ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔ بارے تین بیت کا قطعہ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگر پسند آئے تو میں خوشنودی مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں۔

نمایشگہے درخور شان خویش　　برآراست نواب عالی جناب
بہ بیں چوں طرب را نہایت نماند　　بود سال آں "بخشش بیحساب"
خدایا! پسندد خداوندگار　　کہ از طبع غالب ردد پیچ و تاب

بخشش بیحساب کے بارہ سو بچاسی ہوتے ہیں۔ طرب کی نہایت ب ہے موعد ہے۔ جب وہ نہ رہی تو دو عدد گھٹے۔ اور ۱۲۸۳ رہ گئے۔ فہو المقصود۔ اگر حضرت کی مرضی ہو، تو دبدبہ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جاے۔

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

داد کا طالب غالب۔ ۱۴ ماہ اپریل ۱۸۶۷ء عیسوی۔"[۵]

قاضی عبدالجمیل بریلوی کے نام کا خط ہے، اس میں فضلاے ہند پر راے زنی ہے۔ مقفیٰ عبارت لکھی ہے:۔

"صاحب، وہ خط جس میں اشعار سیتہ مظلوم کے تھے مجکو پہنچا، اور میں نے اس خط کا جواب تم کو بھیجا، اور ذکر اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کیا لکھوں، یہاں تُرکی تمام ہے۔ اِخوان و احباب، یا مقتول یا مفقود الخبر، ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں، آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے پابرکاب ہوں۔ طرح بالفتح بمعنی نمونہ اور بمعنی قریب، سچ۔ لیکن طَرَح بفتحین اور چیز ہے۔ غیاث الدین رامپوری میں ایک مُلّاے مکتبی تھا لاعاقل، جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا، اس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا مصرع "گیستم من کہ تا ابد بزیم" لاحول ولا قوۃ! یہ مصرع میرا نہیں۔ "تا ابد بزیم"، یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے [۵]

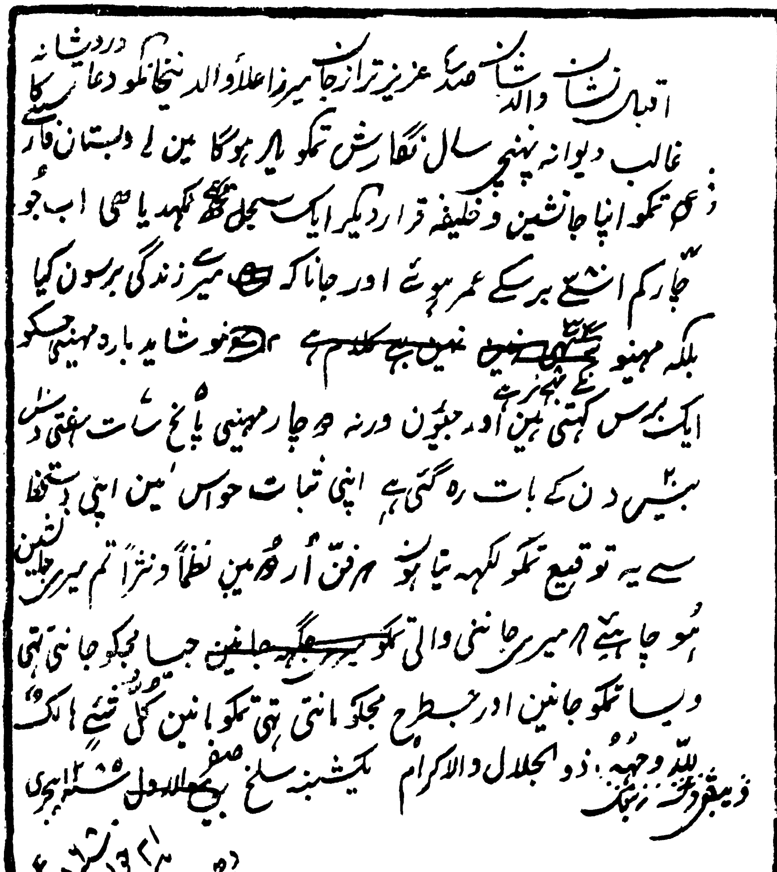
[۵] یہ دونوں خط مکاتیب غالب مرتبہ منشی امتیاز علی صاحب عرشی رامپوری سے منقول ہیں۔

کیستم من کہ جاوداں باشم | چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بگویند، در کدا ایں سال | مرد غالب؟ بگو کہ "غالب مرد"

یہ مادۂ تاریخ از روئے نجوم نہیں۔ بلکہ از روئے کشف ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مرزا غالب کی دستخطی تحریر

وفات سے ۸ مہینے پہلے



اقبال نشان والا شان عزیز تر از جان میرزا علاء الدین خاں کو درویشانہ غالب دیوانہ کی دعا پہنچے سال گذشتہ تمکو یاد ہوگا میں نے دبستان فارسی میں تمکو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل تمکو لکھدیا تھا اب جو چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا بلکہ مہینوں کی نہیں ہے دو چار مہینے تو کلام ہے شاید بارہ مہینے جسکو ایک برس کہتے ہیں اور جیوں ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے اپنی ثبات حواس میں اپنی دستخط سے یہ توقیع تمکو لکھ دیتا ہوں کہ ہر فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو چاہیے کہ میرے جاننے والے تمکو میری جگہ جانیں جیسا مجکو جانتے تھے ویسا تمکو جانیں اور جسطرح مجکو مانتے تھے تمکو مانیں کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام یکشنبہ سلخ ربیع الاول ۱۲۸۵ ہجری

مرقومہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۸ء

مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں، اور ان کے اشعار پر اصلاح دیتے ہیں:-

"آج غزل کو دیکھ، کل یہ لفافہ روانہ کروں گا۔ **شعر**

کوئی آتا نہیں آگے ترے ہنستا ہوکر　　آئنہ جب نظر آیا ہے تو اندھا ہوکر

یہ مطلع دلنشیں ہے، مگر امر تامل طلب ہے کہ آئینہ کو اندھا کہنا چاہئے یا نہیں۔ **شعر**

مردم چشم سیہ جب نظر آتا ہے ترا　　بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہوکر

مردم، آنکھ کی پتلی، مذکر نہیں۔ معشوق کی قید کیا ضرور؟ دعویِٰ حُسن پرستی رہے عموماً۔

یہ خوب ہے **شعر**

نظر آتی ہے جہاں مردمکِ چشم سیاہ　　بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہوکر

شعر

حُرمتِ مے کے لئے پیرِ مغاں کا یہ حکم　　ریش قاضی کی رہے پنبۂ مینا ہوکر

یہ شعر بے لطف ہوگیا۔ کس واسطے کہ جب قاضی کی ریش کہی، تو وہ ایہام

"ریشِ قاضی" کہاں رہا؟"

غالب کا یہ نکتہ شاعروں اور ادیبوں کے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محاورۂ فارسی جو کسی خاص معنی کے لئے مستعمل ہو، بجنسہ لینا چاہئے۔ اس میں تغیّر کرنا، مثلاً اردو میں ترجمہ کر لینا جائز نہیں۔ شراب چھاننے کے کپڑے کو فارسی میں ریشِ قاضی کہتے ہیں۔ اردو میں اس کو قاضی کی ریش نہیں کہتے، اس لئے شاکر کے شعر میں وہ ایہام نہیں رہتا۔ اردو شعر میں اس کی مثال ناسخ کا یہ شعر ہے:-

نہ پائی ریشِ قاضی تو لیا عمامۂ مفتی
مزاج ان مے فروشوں کا بھی کیا ہی لااُبالی ہے　　(ناسخ)

میر مہدی مجروح کے نام خط لکھتے ہیں، اور اس میں مکالمہ کا عجیب لطف پیدا کرتے ہیں۔ اس سے بہتر اور شوخ تر مکالمہ خود غالب کے اور رقعات میں بھی نہیں ہے۔ اس رقعہ میں لکھا یہ ہے کہ میران صاحب آئے، اور ان سے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر معمولی دعا عام طریقہ پر نہیں لکھتے، بلکہ اس طرح شروع کرتے ہیں:-

"اے میرن صاحب! السّلام علیکم"۔ "حضرت آداب"۔ "کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کو خط کا جواب لکھنے کی؟" "حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دُعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟" "نہیں میرن صاحب، اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے"۔ "حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے"۔ "بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے باز رکھتے ہو؟" "سبحان اللہ! اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے، اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے!" "اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟" "کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے لکھئے گا۔" "میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا، اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!"

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر خط کا مضمون شروع کرتے ہیں۔

ان گوناگوں جدتوں، نو بنو اسلوبوں، رنگارنگ ظرافتوں نے غالب کے خطوط میں ایسی دلکشی اور انفرادیت پیدا کر دی ہے کہ یہ طرز ان سے شروع ہو کر انھیں پر ختم ہو گیا۔ لیکن عام طور پر یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ ان خطوں کو دیکھ کر لوگ سادہ و بے تکلف خط لکھنے لگے۔

خواجہ اماں دہلوی بدر الدین خاں عرف خواجہ اماں، دہلی کے رہنے والے مرزا غالب کے عزیز تھے، یعنی بقولِ غالب "میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے"۔ انھوں نے داستان "بوستانِ خیال" کا فارسی سے اردو

میں ترجمہ کیا۔ "بوستانِ خیال" کا مصنف میر تقی خیال گجرات کا رہنے والا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں دہلی آیا۔ اس زمانے میں "داستانِ امیر حمزہ" بہت مقبول تھی میر تقی خیال نے اس کے جواب میں "بوستانِ خیال" لکھی۔ چونکہ پہلی داستان میں تاریخ اسلام کے ایک بزرگ حضرت امیر حمزہ کے کارنامے تھے، اس لئے خیال نے بھی ایک تاریخی ہستی تلاش کی، اور شاہزادہ معزالدین ابو تمیم کو ہیرو بنایا جو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل میں تھے۔ میر تقی خیال نے دس جلدوں میں بہت ضخیم داستان تیار کی ہے۔ خواجہ امان دہلوی نے مہاراجہ شیودان سنگھ والیِ ریاست الور کی فرمائش سے پانچ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ باقی کے لئے عمر فانی نے دفا نہ کی۔

ترجمہ خواجہ امان کی پہلی جلد کا نام حدائق الانظار اور دوسری کا ریاض الابصار ہے۔ پہلی جلد کے لئے غالب نے دیباچہ لکھا تھا جس کا اقتباس ان کے نمونوں میں درج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ذکر غالب نے کئی دوستوں کو لکھا ہے اور خریداری کی فرمائش کی ہے۔ خواجہ غلام غوث بےخبر کو لکھتے ہیں:۔ "میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے نے بوستانِ خیال کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے...... آپ کے پسند آئے یا اور اشخاص خرید کرنا چاہیں تو چھ روپیہ قیمت اور محصول ذمہ خریدار ہے۔"

خواجہ امان نے تمہید میں مقفّی عبارت لکھی ہے، اور عربی و فارسی سے کام لیا ہے، لیکن اصل داستان بہت سادہ سلیس لکھی ہے۔ ریاض الابصار کی تمہید کے چند فقرے یہ ہیں:۔

> "امید کہ یہ ناظورۂ تالیف جدید بھی مثل جلد جلد گزرانیدہ بحصول نقد سرخروئی، پذیرائی، اور خلعت سرسبزی اَخشَنت، جیب و دامانِ مراد کو پُر کرے، اور چاکر موروثی اسی وسیلۂ جزیلہ کے سبب نگاہ گاہ خداوند بارگاہ فلک کارگاہ و سرمایۂ اعزاز و تفاخر ہووے۔ خدا کا شکر کہ ادائے شکر خداوند نعمت کے پردے میں ادائے شکر نعمت خدا ہو، یعنی شکر نعمت خداوند کیا، شکر خدا ادا ہوا۔"

داستان کا نمونہ یہ ہے۔ اس قدر صاف بامحاورہ زبان لکھی ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔

"اب عاقب حرّانی کا حال سنو، اوّل بیان ہوا ہے کہ عاقب حرّانی حکومت کے علاوہ فنِ عیاری میں بھی نہایت مستعد و چالاک ہے۔ اس نے ایک شب قصد کیا کہ خبر و اخبار کے واسطے حریف کے لشکر میں چلئے اور دیکھئے کہ وہ حکیم ضار منکوس کس کام میں مشغول ہے۔ آخر عاقب حرّانی ایک نقب کی راہ سے جس کا دہن بیرونِ شہر باغ میں تھا، باہر نکلا، اور بہت ہوشیاری سے جم قدر کے لشکر میں پہنچا۔ قضارا، اس وقت ایک خدمت گار خاص ضار منکوس کا کسی کام کے واسطے خیمے سے نکلا تھا۔ عاقب نے اس خدمت گار کی گردن میں اس طرح کمند بندکی کہ حلق سے آواز تک نہ نکلی۔ بعد ازاں اس کا پشتارہ باندھ کر ایک خرابے میں رکھ آیا، اور اپنی صورت اس خدمتگار کی شکل سے تبدیل کی بلکہ اسی کا لباس پہن اور خدمت گاروں کی صف میں وارد ہو گیا"

مولوی غلام امام شہید

والد کا نام مولوی شاہ غلام محمد۔ قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ وطن تھا، عربی و فارسی کے بڑے عالم تھے۔ فارسی آغا سید محمد اسمٰعیل مازندرانی سے تحصیل کی تھی، نظم فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ اردو میں شیخ مصحفی کے، ایک عرصہ تک صدر نظامت آگرہ میں سررشتہ دار رہے۔ ۱۸۳۹ء میں سرسید احمد خاں بھی نوکر ہو کر آگرہ آگئے۔ مولانا شہید، سرسید اور دیگر مشاہیر آگرہ کی صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ شہید کی ترکِ ملازمت کے بعد ہندوستان کے مشاہیر امرا اور رؤسا، ان کی خدمت کرتے رہے۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور، سرسالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد، سید عالم خاں رئیس سورت ان کے بڑے قدر دان تھے، حیدرآباد سے ۲۴۰ روپیہ سالانہ نذرانہ مقرر ہو گیا تھا۔ جو آخر عمر تک ملتا رہا۔ یہ سب قدر دانیاں شہید کے عشق و محبت

رسول اللہ کی برکتیں تھیں۔ ان کی شیفتگی و فدائیت اس درجہ پر پونہچ گئی تھی کہ بجز نعت شریف لکھنے اور پڑھنے کے کوئی شغل نہ تھا۔ اسی سبب سے "مداح نبی" و "عاشق رسول" کے مبارک القاب سے مشہور تھے۔ اطراف ہندوستان میں، اضلاع آگرہ و مرادآباد و رامپور والہ آباد و دکن میں شہید نے صدہا شاگرد و مرید چھوڑے۔ پیرانہ سالی میں ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں انتقال کیا۔ منشی غلام غوث بیخبر نے طویل قطعۂ تاریخ کہا ہے، مصرع تاریخ یہ ہے :- "وا سے امام شعرا شد شہید" = ۱۲۹۳ھ۔

فارسی میں قصائد و غزلیات وغیرہ کا ضخیم کلیات شہید کی یادگار ہے۔ اردو میں **انشائے بہار بے خزاں** ان کے خطوط و مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۸۶۶ء میں مرتب و شائع ہوا۔ دوسری کتاب محفل میلاد النبیؐ میں پڑھنے کے لئے تصنیف کی جو **مولد شریف شہید** کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی اور اتنی مرتبہ چھپی کہ اس کی اشاعتوں کا شمار دشوار ہے۔ آج تک رائج و شائع ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے، ایک ایک روایت، ایک ایک شعر سے شہید کا عشق و ولولہ، جوش و شوق، سوز و درد مترشح ہے۔ سنا ہے جب شہید خود اس کو محفل میں پڑھتے تھے، عجب سماں بندھ جاتا تھا۔ اکثر اہل محفل پر وفور رقت سے غش طاری ہو جاتا تھا۔ اس طرز اور اس مقصد کی یہ اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کو دیکھ کر لوگوں نے اس سے اخذ و اقتباس کیا، اس کی نقلیں کیں، اس کے ہو بہو نمونے کی کتابیں لکھیں۔

مولد شریف شہید میں حمد و نعت کے مقامات مقفیٰ، عالمانہ اور عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب سے معمور ہیں۔ باقی مضمون سادہ عبارت میں ہے۔ لیکن اس میں بھی عربی کے الفاظ بیساختہ قلم سے نکلتے ہیں۔ الفاظ کی تقدیم و تاخیر کا وہی قدیم رنگ ہے۔ بعض مقامات سے مختصر نمونے دکھائے جاتے ہیں۔ حمد و نعت یوں اس طرح شروع کرتے ہیں :-

"وہی ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ کہ ذات متجمع صفات اس کی بری ہے شرک اور زوال سے"

اور اُلوہیت اور صمدیت اس کی، پاک ہے ادراک وہم و خیال سے، مشابہت اعراض اور جواہر سے قطعاً مبرا، اور مناسبت اوہام خواطر سے مطلقاً معرا، کیسا معبود مطلق کہ جس نے بنی آدم کے واسطے چراغ رہنمائی کا انبیا کے ہاتھ میں دیا، اور تمام عالم کو سیدالانبیا، سیدالاصفیا، احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع جمال جہاں آرا سے روشن کیا۔"

تخلیق نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اے عاشقانِ روے محمدؐ واے شیفتگانِ گیسوے احمدؐ، جانو اور آگاہ ہو کہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مادۂ تمام موجودات اور خلاصہ جمیع کائنات کا ہے یعنی جب صانع باکمال کو ظاہر کرنا اپنے حُسنِ بے زوال کا منظور ہوا۔ پہلے نورِ احدیت سے نورِ احمدی پیدا کیا، اور تمام موجودات کو اس کے نور سے عالمِ ظہور میں لایا اور ظہور اس ذات ستودہ صفات کا سب انبیا کے بعد محض اس واسطے تھا کہ جس طرح بعد طلوعِ آفتاب کے روشنی ماہتاب اور ستاروں کی چھپ جاتی ہے، فروغ ملتِ محمدی ناسخ سب ملتوں کی ہے۔ اگر وہ نورِ قدم پہلے سب کے جلوہ افروز ہوتا تو وہ انبیا رسالت اور نبوت سے محروم رہتے۔ رباعی لاعلم

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ
اے ختمِ رُسل قرب تو معلومم شد دیر آمدۂ ز راہِ دور آمدۂ

سیرتِ پاک کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

" جب عمر شریف آٹھ برس کی ہوئی عبدالمطلب کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ دریافت کیا کہ اب ایّام اپنی موت کے قریب آئے۔ ابوطالب وغیرہ سے کہا کہ اگرچہ موت سب کے واسطے ہے، لیکن مجھے اس فرزند ہشت سالہ کی یتیمی پر کہ ابھی صغیر تر اور یتیم بے مادر و پدر ہے، سخت حسرت و تاسف ہے، کاش عمر میری اس کی تربیت تک وفا کرتی تو اپنے سامنے خاطر خواہ تربیت اور پرورش کرتا۔ اب تم میں سے کون اس کی پرداخت کا متکفل ہو سکتا ہے۔ ابولہب نے کہا میں بجائے

دل حاضر ہوں، جواب دیا کہ تو دولت و مال البتہ بہت رکھتا ہے، لیکن سنگدل اور بے رحم ہے، فرزندان یتیم اکثر مجروح دل، شکستہ خاطر نازک مزاج ہوتے ہیں، تھوڑے سے رنج کا تحمل نہیں کرسکتے، شاید تجھ سے کسی بات میں خاطر نازک اس یتیم کی آزردہ ہو جائے۔ بعدہٗ حمزہ نے مثل ابولہب کے التماس کیا، جواب پایا کہ تو کوئی فرزند نہیں رکھتا، اس یتیم کے درد سے کیونکر خبردار ہوگا۔ پھر عباس نے کہا اگر میں اس خدمت کا سزاوار ہوں تو شرط خدمت کی بجالاؤں۔ کہا تو عیال و اطفال بہت رکھتا ہے۔ اپنے لڑکوں کے ہوتے یتیم بے پدر کو کب یاد رکھے گا۔ تب ابوطالب نے کہا کہ میں ہرچند مال اور سرمایہ کچھ نہیں رکھتا ہوں، لیکن اگر مجھے لائق اس خدمت کا جانو تو بدل و جان حاضر ہوں۔ کہا تو البتہ قابل اس کام کے ہے۔"

انشائے بہار بے خزاں سے ایک "رقعہ تہنیت و تعزیت آمیز" کا مختصر اقتباس اول و آخر سے درج کیا جاتا ہے:—

"مجموعہ انشائے شیریں زبانی، دیباچہ کتاب سخن معانی زاد حشمتہٗ۔ قلم بعد تشریح مراتب اشتیاق و آرزومندی کے، تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے، اور کچھ خوشی میں آکر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانے میں خوشی و غم دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ دو پھول ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں، ایک دولہا دلہن کے سہرے کے کام آتا ہے، دوسرا میت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے۔ دو موتی ایک سیپ میں پیدا ہوتے ہیں ایک بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں، دوسرے کو کھرل میں پیس کر دوا میں ملاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بنتی ہیں، ایک محفل سرود میں کام آتی ہے دوسری مردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے...... حاصل یہ کہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا، گویا اسی گردش لیل و نہار کی

خزاں و بہار کا تماشا دکھایا۔ اور اس غم نے جتنا رُلایا تھا، آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسایا،........ رنج میں دو ہتّر جو پہلے منہ پر مارا تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اُٹھا کر یوں دُعا مانگی کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے، اور آپ سلامت رہیں اور یہ شادی مُبارک ہو۔"

شہید کی تمام انشا پردازی میں یہی قافیہ پیمائی و عبارت آرائی ہے اور اس طرزِ نگارش میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ تخلیق معانی، ایجاد اسالیب اور تزئین بیان کے بہتر سے بہتر نمونے شہید کی نثر میں ملتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون روضۂ تاج گنج آگرہ کے متعلق بہت مشہور ہے۔ اس طرح کے اسلوب تحریر سے محاکات و منظر کشی کا کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ مدح خوانی کی جاتی ہے۔ قصیدہ سے کسی بادشاہ کی شوکت و عظمت جیسی کچھ ذہن نشین ہوا کرتی ہے، وہی کام شہید کی نثر تاج محل کے متعلق کرتی ہے۔ بہر حال ان کے علم و فضل اور صنعت گری کا نہایت نادر نمونہ ہے۔ مختصر ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے :-

"سُبحان اللہ، کیا روضہ ہے! کہ رضواں جس کے لطف و لطافت سے راضی و خوشنود ہے۔ بارک اللہ، کیا باغ ہے جس میں بہشت کی ہر نعمت موجود ہے۔ سورج اس باغ کا ایک زرد آلو ہے، چاند اس چمن کا گل خوشبو ہے۔ پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اونچی سر اٹھائے تو اُس کو آفتاب کی پگڑی سنبھالنی دشوار ہو جائے، دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ چوب قلم سے جو لکھا ہے، عقل اس طلسمات سے حیران ہے کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے، ویسا دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے مبصر انصاف سے دیکھیں کہ یہ بات کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیم کامل ہے۔ سنگِ مرمر پر سنگ موسیٰ کی پچی کاری کہئے یا آنکھوں کی سفیدی پر پتلیوں کی سیاہی کی نمو داری، حروف ہیں یا کافور کے قرص پر مشک کے دانے پڑے ہیں، نقطے ہیں یا ہیرے کی تختی پر نیلم کے نگیں جڑے ہیں، مینائے آسمان کی طرف تعجب کا ہاتھ اٹھائے ہے کہ یہ نم دیکھنے اور اس بارگاہ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ

اور دم دیکھئے، محراب کا خم، ابرو سے اشارہ کر رہا ہے کہ اندر جا کر ذرا بہار کا عالم دیکھئے۔ نہیں نہیں، غلطی ہوئی مجھ سے، بلکہ محراب کا یہ اشارہ ہے کہ پہلے حواس کو یہاں طاق پر رکھ جایئے تب آگے قدم بڑھایئے۔ پس جو ادھر چوکھٹ لانگنے کی عزیمت ہوئی تو ادھر عقل اور حکمت رخصت ہوئی۔ سَیر سے سیر ہونا تو نگاہ کے ہاتھ ہے، لیکن حیرت یہاں ہر قدم کے ساتھ ہے۔"

خواجہ غلام غوث بیخبر خلفِ خواجہ ظہور اللہ کشمیری۔ ان کے مورث اعلیٰ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کی اولاد سے تھے۔ سلطان مغلیہ کے تسلّطِ کشمیر کے زمانے میں خواجہ بیخبر کے بعض بزرگ کشمیر میں قاضی رہے۔ بیخبر کے والد کشمیر سے ترک وطن کر کے لاسہ (تبت) چلے گئے۔ وہاں سے ریاست نیپال پہنچے، مہاراجہ نیپال نے بڑی عزت کی، خواجہ غلام غوث نیپال میں ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر تھی کہ ان کے والد ہندوستان آگئے۔ اور بنارس میں قیام کیا۔ خواجہ صاحب نے یہیں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ ان کے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں، لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب کے میر منشی تھے۔ بیخبر ۱۶ سال کی عمر میں ۱۸۴۰ء میں میر منشی کے نائب مقرر ہوئے۔ صوبہ کا صدر مقام آگرہ تھا۔ بیخبر مدتوں آگرہ رہے۔ جب لارڈ ایلن برا گورنر جنرل (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء) نے گوالیار پر حملہ کیا (۱۸۴۳ء)، تو گورنر کے منشی خانہ کے ساتھ بیخبر بھی شریک مہم ہوئے۔ اور خاتمۂ جنگ پر کارگذاری کے صلے میں خلعت پایا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ خالو کی پنشن کے بعد ان کی جگہ میر منشی ہو گئے۔ غدر کے زمانے میں صدہا ہندوستانیوں کی جان بچائی اور گورنمنٹ کے بھی انتہا درجہ کے وفادار رہے۔ اس کے صلے میں سند اور خلعت ہفت پارچہ مع تین رقوم جواہر سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے خطاب شہنشاہی اختیار کرنے کے موقع پر لارڈ لٹن نے جو دربار کیا اس میں بھی خواجہ صاحب کو تمغہ قیصری عطا ہوا۔ ۴۵ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۸۵ء

پنشن لی۔ گورنمنٹ نے خان بہادر ذوالقدر کا خطاب دیا، اور یہ مزید اعزاز بخشا کہ پنشن لینے کے لئے عدالت کی حاضری معاف کی۔ پنشن کے بعد نواب خلد آشیاں کلب علیخاں بہادر والی رامپور نے خواجہ صاحب کو ریاست کا مدار المہام بنانا چاہا، لیکن انھوں نے شکریہ کے ساتھ معافی چاہی۔ اور آخر عمر کو یاد الٰہی میں گزار کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔

بیخبر عربی و فارسی کے عالم تھے۔ فارسی کے ایسے بلند پایہ شاعر تھے کہ اہل زبانِ ایران جو وارد ہندوستان ہوئے انھوں نے ان کی زبان دانی و نکتہ سنجی کی داد دی۔ بیخبر مرزا غالب سے چھوٹے تھے، اور ان کا بیحد احترام کرتے تھے۔ غالب باوجود بڑا ہونے کے، بیخبر کی نہایت عزّت کرتے تھے، اور خطوط میں "قبلہ" اور "مولانا" لکھتے تھے۔ بیخبر کی سخن گوئی کے ایسے مداح تھے کہ ان کو ایک خط میں لکھا تھا: "رام پور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے! ابداع اس کو کہتے ہیں جدّتِ طرز اس کا نام ہے، جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے!"[۵] رقعات غالب کا پہلا مجموعہ (عود ہندی) بیخبر کی اعانت و مشورہ سے طبع ہوا۔

بیخبر کے رقعات و نظم فارسی کا مجموعہ خونابۂ جگر کے نام سے شائع ہوا۔ رقعات و نثر اُردو کا مجموعہ فغانِ بیخبر ہے، جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ بیخبر کے انتقال کے بعد ان کے ایک عزیز نے بقیہ نظم و نثر کا مجموعہ رشک لعل و گوہر کے نام سے ۱۹۰۸ء ۱۳۲۶ھ میں شائع کیا۔ بیخبر اُردو کے بھی شاعر تھے، لیکن کم کہتے تھے۔ اُردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی

---

۵ "عود ہندی" میں اس رقعۂ غالب کے ساتھ بیخبر کی وہ غزل بھی درج ہے، مسلسل غزل کہی ہے۔ مطلع و مقطع اور ایک شعر نقل کیا جاتا ہے:۔

چشم کہ باز شد ز خواب؟ فتنہ از و بکار سوست	پردہ ز رُخ کہ بر کشاد؟ جہر ز شرم زرد رُوست
جام صبوحیے کہ زد؟ شیشہ بسجدہ می رود	مے ز لبِ کہ کام یافت؟ جوشِ نشاط در سبوست
بخت کجاست بیخبر؟ تا بر کابِ اوذ دم	بر سرِ رہ نشستہ ام، نیم نگاہم آرزوست

کی طرف ۱۸۴۶ء میں توجہ کی، یعنی غالب سے بھی کچھ پہلے۔ تقریظوں میں بیخبر کا بھی وہی رنگ ہے جو اس زمانے میں مقبول تھا۔ گویا تقریظ کا مفہوم نثر میں قصیدہ خوانی تھا لیکن اور قسم کی نثریں اس سے بہتر و سلیس تر لکھی ہیں۔ چند نمونے دکھائے جاتے ہیں۔

(۱) مولوی غلام امام شہید، بیخبر کے رشتہ کے خسر ہوتے تھے۔ بیخبر ان کی بے انتہا عظمت کرتے تھے کہ لوگوں کو تلمذ کا شبہہ ہونے لگا تھا۔ بیخبر نے شہید کی "انشائے بہار بے خزاں" کی تقریظ لکھی ہے۔ مختلف مقامات سے اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں، اللہ اللہ صفحۂ قرطاس پر کیا جوش بہار معانی ہے! تارِ نگاہ میں بے تکلف موتی پروئے جاتے ہیں، واہ واہ کلک گہر بار کی کیا دُرافشانی ہے...... حرفوں کی سیاہی سے

کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے، گویا درختوں سے چاندنی کھیت کیا ہے

کاغذ کی سفیدی پر حرفوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے، جیسے صحن باغ پر بادل چھا رہا ہے...... اب ان کی اردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا، میر اپنا مرنا غنیمت جانے گا، ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی جو یہ تخلص اختیار کیا، یعنی در پردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں، کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوز کو بھی ان کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو مصحفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔ آتش نہ مرتا تو کیسا کیسا جلتا۔ ان کی اس نثر نے رتبہ نظم کا کھو دیا، استادوں کا سفینہ دریا میں ڈبو دیا۔"

(۲) بیخبر نے شہید کا دیوان مرتب کر کے اس پر دیباچہ لکھا ہے، اس کے متعلق شہید کو خط لکھتے ہیں:-

"قبلہ، میری شوخی دیکھئے، یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں، دریا کے سامنے روانی کے معانی بیان کر رہا ہوں، چاند کے

رو برو نور افشانی کا متحامل کرتا ہوں، لعل کے حضور میں رنگ کی دُکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں مسیحا سے کہتا ہوں جان بخشی کی روایت سنیے، موسٰی سے تمنّا کرتا ہوں کہ یدِ بیضا کی چمک دیکھیے، یعنی حضرت کا دیوان مرتّب کرکے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے، ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو کرے، اندھا چاہے کہ قدرت کے نظّارے سے حظ اُٹھائے، گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکّہ بٹھائے ....

میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو، اس کے لئے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اسے حصول ہو۔"

(۳) بیخبر نے اپنی انشا پردازی سے منظر کشی بھی کی ہے۔ صبح، دوپہر، شام کا سماں دکھایا ہے۔ ان مضامین میں مقفّٰی فقرے اور مبالغہ و تشبیہ وغیرہ بھی ہیں، اور سادہ و سلیس عبارتیں بھی۔ دوپہر کے منظر کا اقتباس یہ ہے:-

"دوپہر کا وقت ہوا، آفتاب سمت الراس پر آیا، زمین تپنے لگی، پاؤں رکھتے ہوئے خوف آتا تھا کہ چھالے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ سانس کی گرمی سے لب پر بتخالے نہ پڑیں۔ آسمان سے وہ آتش باری ہونے لگی کہ ہوا نے شعلۂ جوّالہ کی صورت پیدا کی۔ خاک کے ذرّوں نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی، .... برہمن بتخانے کے کونے میں یوں خاموش ہوکر بیٹھا کہ بُت بن گیا، میکدے میں مُغ زانو پر سر رکھ کے اس شکل سے ہو بیٹھا کہ معلوم ہوتا تھا مٹکے پر پیالہ اوندھا دیا۔ غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی ٹٹّیاں لگالیں، مٹّی کی صراحیوں پر کپڑا بھگو کے لپیٹ دیا۔ امیروں نے تہ خانوں میں آرام فرمایا، خس کی ٹٹّیاں چھڑکی جانے لگیں، فرشی پنکھے کھینچنے لگے، خس کی خوشبو سے ہوا کے جھونکوں پر لخلخہ کا یقین آنے لگا، صراحیاں برف میں لگائی گئیں۔ شربت کی قفلیاں

جمائی گئیں۔"

پہلے اور تیسرے نمونے کے خط کشیدہ فقروں میں کس قدر، موزوں اور مکمل تشبیہیں پیدا کی ہیں۔ دوسرے فقرے میں لطیف ظرافت بھی ہے۔

بےخبر کا اسلوب نثر اُس زمانے سے جداگانہ نہیں ہے، لیکن روشِ قدیم کے محاسنِ تحریر کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بےخبر بیسویں صدی کے شروع تک رہے ہیں، لیکن ان کا طرزِ نگارش بھی اُنیسویں صدی کے نصف اوّل کا ہے۔ اور اسی زمانے کے لکھنے والوں اور غالبؔ کے ہم عصروں میں ہیں۔ اِس لئے ان کو اِسی دَور میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مصنّفین دکن

(۱) محمد ابراہیم بیجاپوری

شمالی ہند کے ساتھ ساتھ دکن میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس دَور سے پہلے کے مصنفینِ دکن کا پہلے سلسلۂ دکن میں ذکر آ چکا ہے۔ دَورِ چہارم میں بھی دکن کے اہلِ تصانیف کی خدمات گراں قدر ہیں، اِس لئے ان کا امتیاز قائم رکھنے کے لئے، علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

محمد ابراہیم بیجاپوری مرزا رجب علی بیگ سرورؔ لکھنوی کے ہمعصر ہیں۔ ان کا ترجمہ انوارِ سہیلی اُسی سال طبع ہوا ہے۔ جس سال سرورؔ نے اپنا فسانۂ عجائب لکھا ہے، یعنی ۱۸۴۴ء (۱۲۴۰ھ) میں۔ تصنیف کا زمانہ کچھ پہلے ہو گا۔ اس کا نمونہ مولوی نصیر الدین ہاشمی کی تالیف (دکن میں اُردو) سے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ تحریر اسی دَور کی تصانیفِ شمالی ہند کے مقابلے میں کس قدر بےجوڑ معلوم ہوتی ہے۔ دکنی الفاظ، محاورات، طرزِ بیان کی اتنی کثرت ہے کہ بعض معاصرینِ دکن، باقر آگاہ وغیرہ کی عبارت سے بھی زیادہ قدامت آمیز ہے۔ چند فقرے یہ ہیں:۔

"چین کے ملک کے ادرس پورس میں ایک بڑا بادشاہ تھا، اس کا نام ہمایوں فال، ہور اُسے ایک بڑا ایکا وزیر تھا، اس کا نام خجستہ رائے۔ ہمایوں فال ایک بار

خجستہ رائے کو ساتھ لیکر شکار کو گیا، وہاں سورج اُٹھے تو دھوپ پڑی تھی۔ ایک پہاڑ کی انی پو جھاڑ اس تھے۔ چھاؤں کی خاطر خجستہ رائے کو ساتھ لے کر اسی چھاؤں کے تلے جا بیٹھا۔ ہور دیکھا تو کیا، کہ ایک جھاڑ اسی کا کھوڑ کا بڑا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر شہد کی مکھیاں یوتی بندنے اندر گھستے اور بہار نکلتے ہیں......"

---

(۲) **شمس الامراء امیر کبیر ثانی** نظام حیدر آباد (دکن) کے دربار میں امیر الامراء تھے۔ ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوئے، اور تین شاہان آصفیہ (نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی، نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث اور نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع) کا زمانہ دیکھا۔ آخری عہد میں امیر کبیر کا خطاب ملا، اور پیشکاری و مدار المہامی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ علم ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ شمس الہندسہ ان کی مشہور تصنیف ہے۔ دیگر علوم و فنون میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں۔ ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء میں رحلت کی۔

ا۔ ستہ شمسیہ۔ یہ علم طبیعات پر چھ رسالے ہیں۔ مولف "دکن میں اُردو" کو ان کے مترجم کا نام تحقیق نہیں ہوا۔ ۱۲۵۲ھ ۱۸۳۷ء میں طبع ہوئے۔ ان کا دیباچہ خود شمس الامرا امیر کبیر نے لکھا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ خود انھوں نے ترجمہ کیا ہے، نہ کسی مترجم کا نام لکھا ہے۔ اس لئے ان رسالوں کو شمس الامرا سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اہتمام بہر حال انہیں کا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"نیاز مند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب شمس الامرا اس طور پر گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں۔ بہ سبب میلان طبیعت کے نسبت اس طرف شوق رکھتا تھا، میری سماعت میں آئیں......... اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ بتدیوں کے فائدہ کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ فائدہ میسر

ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا، اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی، پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے۔ چنانچہ ان دنوں میں حسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریورنڈ جارج چالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے بہم پونہچے۔"

کتاب کے ترجمہ کا نمونہ یہ ہے:-

"کشش ثقل کے بیان میں۔

استاذ۔ اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ تم کو کیفیت و حقیقت سے کُلیہ عمدہ کی آگاہ کروں، جس کو کشش ثقل کہتے ہیں، اور وہ ایک قوت ہے جس کے سبب اجسام بعیدہ باہمدیگر تجاذب رکھتے ہیں، اور یہ امر ظاہر ہے گرنے سے تمام اجسام ثقیلہ کے زمین پر۔

تلمیذ کلاں۔ گولی ہاتھ سے گرنا، اور اینٹ کا چھت سے ساقط ہونا، اور سیب کا جھاڑ سے زمین پر آنا، یہ سب کیا سبب اسی قوت کے ہیں؟

استاذ۔ ہاں یہ سب اسی قوت کے ہیں، جس کو ثقل تعبیر کرتے ہیں۔ پس وہ اجسام جس میں کچھ بھی میل ہے، اگر ان کو کوئی تھامنے والا نہ ہو تو سطح زمین پر قریب عمود وار گریں گے............

اس دیباچہ اور ترجمہ میں بہ نسبت ابراہیم بیجاپوری کے ترجمہ انوار سہیلی کے دکنی زبان کا اثر بالکل نہیں ہے، حالانکہ ان دونوں میں دس بارہ سال کا پس و پیش ہے۔

۲- رسالہ اعمال کرہ۔ یہ رسالہ بھی انھیں امیر کبیر کے اہتمام سے ترجمہ ہوا، اور ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔ اس میں چار باب ہیں، پہلے مقالے میں تعریفات، دوسرے میں جغرافیہ، تیسرے اور چوتھے میں ہیئت۔ دو ایک مقام سے اس کے نمونے یہ ہیں:-

" سوال . جون کی دسویں کو آفتاب کون کون مقام میں عمود دار رہتا ہے، اور کون کون مقام میں طلوع اور غروب نہیں ہوتا ؟

جواب . سندیلہ اور کلکتہ اور آوا اور مکاؤ و جزیرہ چین وغیرہ میں آفتاب عمود دار رہتا ہے، اور منطقہ مبردہ شمالی میں مکنزی اور گرین دیدا اور کیپ میں غروب نہیں ہوتا، اور منطقہ مبردہ جنوبی میں اس جگہ کہ جہاں تمام بحور ہیں، طلوع نہیں کرتا۔"

" زُحل کا بیان . یہ سیارہ مدھم روشنی سے نظر آتا ہے، آفتاب سے بہت دور ہے اور باستعانت بہتر آلہ دوربین کے اہل علم کو اس سیارے کی پٹی کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے اور یہ پٹی اسی سیارے کے اطراف بتمامہ ایک حلقہ روشن ہے۔ اور اس حلقہ کے باہر سات قمر گردش کرتے ہیں اور ان اقمار میں سے ایک قمر اس حلقہ کی سطح پر حرکت کرتا ہے۔"

محمد عثمان مبین انھوں نے عقائد اسلام اور مسائل فقہ کے متعلق ایک کتاب لازم الاسلام ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں مرتب کی۔ اس میں سے " وحدت الوجود" کی بحث کا نمونہ " دکن میں اُردو" سے نقل کیا جاتا ہے :-

" جان کہ اے دوست تمام عالم میں نظر کرو تو خلق کئی کئی طرح کا ہے جو حدیث میں آیا ہے، عالم اٹھارہ ہزار طرح کا ہے۔ بالفعل عالم دنیا کو دیکھو تو کوئی عاجز ہے کوئی مختار ہے اور کوئی قابل ہے، اور کوئی نابکار ہے۔ اور کوئی نیک ہے، کوئی بد ہے اور کوئی بدشکل ہے، اور کوئی خوش قد ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر سب اپنے ہوتے ہیں، آپ ہی مختار ہوتے تو سب لوگ خوب و خوش اور نیک ہوتے جو پسند خاطر ہر ایک ہے۔ یہاں یقین یہ ہوا کہ پیدا کرنے ہار ان کا کوئی جُدا ہے کہ ان کی قابلیت کے موافق پیدا کیا جیسا کہ کمہار مٹی سے طرح طرح کے باسن قابلیت پر ہر ایک ظاہر کیا کرتا ہے۔ پس جان تو پیدا کرنے ہار سب عالم کا شاید دوسرا کوئی ہے۔"

یہ عبارت بھی باوجود آسان طرز بیان کے، صاف نہیں ہے، گنجلک پیدا ہو گئی۔

غلام امام خاں ترین حیدرآبادی

انہوں نے دو کتابیں لکھی ہیں جو تاریخ دکن کے سلسلے میں نہایت معتبر مانی جاتی ہیں:۔

(۱) تاریخ رشید الدین خانی۔ یہ سلاطین دہلی و دکن کی تاریخ ہے، جو غلام امام خاں نے شمس الامرا نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے حکم سے لکھی، اور اپنے مُربّی مخدوم کے نام پر اس کا تاریخی نام رشید الدین خانی رکھا، یعنی سنہ ۱۲۷۰ھ میں مرتب٭ کی، اور یہی سنہ اس کے نام سے نکلتا ہے جو سنہ ۱۸۵۴ء کے مطابق ہے۔ چنانچہ مصنف دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ (اقتباس درج کیا جاتا ہے):۔

امّا بعد، اس خوشہ چین خرمن اساتذۂ متقدمین و متاخرین، خادم الطلبہ نائب الشعرا غلام امام خاں ترین المتخلص بہ تحیر ابن محمد منور خاں ملک غفراللہ ذنوبہٗ نے سنہ ۱۲۷۰ بارہ سو ستر ہجری میں بیچ عہد...... میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہ کے حسب الحکم........ نواب معلّی القاب اقتدار الدولہ بہادر جنگ محمد رشید الدین خاں بہادر دام اقبالہٗ کے خلاصہ احوال فرماں روایان

٭ اس کتاب کے سال تالیف کے سلسلے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب (دکن میں اُردو) میں لکھتے ہیں:۔
"اگرچہ کتاب سنہ ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ بہادر شاہ کے حال میں لکھا ہے:" سلطنت دہلی کو بہادر شاہ شاہ وقت کے جلوس سے ان اوراق کی تحریر تک کہ آخر ذی حج سنہ ۱۲۳۸ھ ہے سولہ برس چھ مہینے پچیس دن ہوتے ہیں"۔ یہاں یہ سنہ ۱۲۳۸ھ یقیناً غلط ہے۔ خواہ ہاشمی صاحب سے نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہو یا کتاب کے کاتب مطبع سے یا اصل تاریخ کے ناقل و کاتب سے۔ اس لئے کہ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ سنہ ۱۲۵۳ھ (سنہ ۱۸۳۷ء) میں تخت نشین ہوئے تھے سال زیر بحث بہادر شاہ کے باپ اکبر شاہ ثانی کے سال جلوس سنہ ۱۲۲۱ھ (سنہ ۱۸۰۶ء) سے سولہ سترہ برس بعد ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصنف تاریخ رشید الدین خانی نے کم سے کم ۳۲ سال اس کی تالیف میں صرف کر کے سنہ ۱۲۷۰ھ میں اس کو ختم کیا، تو اتنے پہلے نواب رشید الدین خاں کا زمانہ اور ان کا حکم نہیں ہو سکتا اور کتاب کے نام اور دیباچہ سے ظاہر ہے کہ انہیں کے لئے لکھی گئی۔

ہند و دکن کا، راجہ ہائے کبار اور سلاطین والا اقتدار سے، ضمیمہ کیفیت ورود و نزول افسرانِ فرہنگ اہلِ فرنگ کے، اور جملہ سوانحاتِ آشتی و جنگ اُن کے رؤسا سے اس دیار کے، ابتدائے عروج سے انتہائے زوال تک ہر ایک ریاست جداگانہ کے، کتب قدیم و جدید سے جمع فریق، اور اخبارات حال کے انتخاب کرکے، سلیس فقراتِ ہندی میں یہ ایک کتاب مختصر تیار کی ہے۔ تا ارباب امارت اور اصحاب متانت کو وقت تقریر اور تدبیر کے کارآمد ہو، اور نام اس کا اسم گرامی پر جناب ممدوح کے، رشید الدین خانی ہے۔ اور مادۂ تاریخ بھی "رشید الدین خانی"

یہ ضخیم کتاب ہے۔ بڑی تقطیع کے تقریباً ۸۰۰ صفحوں پر چھپی ہے۔ راجگانِ ہند سلاطین دہلی، اسلامی سلاطین دکن، مشاہیر دکن کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں انگریزوں کے دکن میں آنے، اور حیدر علی و ٹیپو سلطان سے جنگ کرنے کے واقعات بھی درج کئے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ غلام امام خاں مصنف "رشید الدین خانی" نے یہ دیباچہ کی عبارت جو بالیقین ان کی اپنی تحریر ہے، ترجمہ نہیں ہے، بالکل طرز قدیم میں لکھی ہے بے قاعدہ ہے لیکن خود کتاب کی عبارت نہایت صاف، مربوط، سلجھی ہوئی ہے۔ نمونہ کے لئے "دکن میں اردو" سے آصف جاہ اوّل کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"نواب چونکہ بہ نفس نفیس جمیع مقدمات مالی اور ملکی کا انصرام فرماتے تھے، مگر بعضے ندمائے فی الجملہ ان کے آرام کا خیال کرکے ایک معتمد علیہ مقرر کرانے کے لئے عرض کیا۔

نواب نے خدمت دیوانی کے لئے امرائے کبار میں سے ایک معتمد علیہ متدین کو تجویز کرکے، جن کا نام راقم کو تحقیق نہیں ہوا، اس عہدہ کا مژدہ ان کو پہنچایا۔

محمد ابو الخیر خاں بہادر جو ایک دور اندیش شخص اور خیر خواہ سرکار تھے۔ انھوں نے اس کو نامناسب جانا، اور شب کے وقت جس کی صبح کو کار خدمت اُن کے سپرد ہونے والا تھا، ابو الخیر خاں دردولت پر حاضر ہوئے، اور نواب کو اطلاع کرائی۔ نواب باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ ناوقت آنے کا کیا سبب ہے؟ عرض کیا

جناب والا کل دیوان کیا چاہتے ہیں۔ میں اس بات کا خیال کرتا ہوں شاہجہاں آباد میں جب اس تقرری کا علم ہوگا تو وہ یقین کریں گے، آصف جاہ کبیر سنی کی وجہ سے آرام طلب ہوگئے ہیں۔ اور یہ بات نامناسب ہوگی، تو نواب نے فرمایا میں تو حکم دے چکا ہوں۔ ابوالخیر خاں نے عرض کیا، کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ دربار کے وقت بجائے عرض بیگی کے بندہ کو اعلام کا حکم ہو، فدوی اس وقت کچھ حکمت عملی کر گزریگا۔ صبح کو جب اعلام کا حکم خاں موصوف کے لئے ہوا، تو خاں موصوف نے اُس معتمد علیہ کا نام زبان فارسی میں ندا کی کہ "از خدمت صوبہ داری برہان پور فلاں شخص سرفرازی یافت" ہر چند ناواقف لوگ مع خدام کے کہتے رہے، نہیں اعلام دیوانی کا حکم ہے، مگر چوبدار نے حسب ایماءِ خاں موصوف جلد مجرا ادا کرا دیا، اور نذر پیش کرا دی"

یہ دونوں عبارتیں، دیباچہ و اصل کتاب کی، مشکل سے ایک شخص کی لکھی ہوئی تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ جو شخص اوپر کی سلیس و با اصول تحریر لکھ سکتا ہے۔ اُس سے تعجب ہے کہ دیباچہ میں ایسی بے ربطی جائز رکھے۔ اس کے علاوہ اِسی مصنف نے چودہ[۱۴] برس بعد دوسری تاریخ لکھی ہے، جس کا نیچے ذکر آتا ہے۔ اتنے عرصہ میں زبان اور طرز بیان زیادہ صاف ہوجانا چاہئے، ورنہ ایسا ہی رہنا چاہئے۔ لیکن مندرجہ ذیل نمونوں سے معلوم ہوگا کہ دوسری کتاب (خورشید جاہی) کی دیباچہ و اصل مضمون کی عبارتیں باہم مشابہ ہیں، لیکن اتنی بامحاورہ و باقاعدہ نہیں ہیں جیسی "رشید الدین خانی" کی مرقومہ بالا عبارت ہے۔[۵]

(۲) تاریخ خورشید جاہی۔ امیر کبیر ثالث[۳] موصوف الصدر کے فرزند خورشید جاہ محمد محی الدین خاں بہادر امیر کبیر رابع[۴] کے حکم سے مرتب ہوئی۔ دیباچہ میں حال تالیف لکھتے ہیں:-

---

۵ ہم نے دونوں کتابوں کے دیباچے مولانا احسن مارہروی کی تالیف (نمونۂ منثورات) سے، اور دونوں کتابوں کی درمیانی عبارتیں مولوی نصیر الدین ہاشمی کی کتاب (دکن میں اُردو) سے نقل کی ہیں۔

"سنہ ہذا میں کہ ایک ہزار دو سو چوراسی[۱۲۸۴] ہجری ہے اس کمترین عقیدت گزین پیرو علمائے دین مولوی محمد امام خاں ترین ریاضی داں ملک تخلص کو فرمایا کہ ایک کتاب علم تاریخ میں مختصر مفید، واسطے ملاحظہ اوقات گرامی ہمارے اور فوائد عام خلائق کے، لکھ کر گزرانو، تاہم اس کو حلیۂ طبع سے آراستہ کر کے، انعام ارباب استعداد کا کریں۔ چوں کہ بعد تحریر کتاب لاثانی "رشید الدین خانی" کے کہ اس وقت تخلص نامہ نگار کا ہیچ تھا، ان ایام میں فرصت حاصل تھی، حسب الفرمان واجب الاذعان کے کمر سعی کی بیان جاں کے باندھ کر، ارادہ کیا ہے۔ حسبی اللہ نعم الوکیل......

چونکہ اُس میں احوال صوبہ جات کا برا سہ نہ تھا، اس واسطے اس کی ابتدا صوبہ جات سے کی گئی ہے، اور ذکر اولیاؤں کا اور سوانح بادشاہان ایران و توران اور روم کے مندرج و مندمج ہیں۔ اور مفصل کیفیت حال چہاردہ[۱۴] سال کی سنہ[۱۲۷۰] ہجری سے زمانہ ہذا تک بیان کی گئی ہے، اور نام اس کا اسم گرامی پر ممدوح کے "خورشید جاہی" ہے، اور مادۂ تاریخ "تاریخ جلیل" ہے۔"
۱۲۸۴

کتاب کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔ صوبہ خجستہ بنیاد کا حال لکھتے ہیں:۔

"اس صوبہ کو ملک مرہٹہ کہتے ہیں، بس زمانہ میں نظام شاہیہ کے، صوبہ احمد نگر قرار پایا۔ صاحب نسخۂ جدید لکھا ہے کہ زمانہ سابق میں نام اس کا دیوگڈھ تھا، اور عہد میں راجہ بھوج کے دارا لکما کرتے تھے۔ جب فخر الدین جونا شاہ دہلی نے تمام دکن پر قبضہ کیا تو قلعہ دیوگڈھ کا نام دولت آباد رکھا، اور دار السلطنت اپنا فرمایا۔ بعدہ جب نوبت فتوحات دکن کی اورنگ زیب عالمگیر کو پہنچی، نزدیک ہمایوں موضع کھڑکی میں سنہ ۱۰۶۸ھ میں ایک شہر کمال لطافت و استحکام کے ساتھ آباد کر کے نام اسکا خجستہ بنیاد اورنگ آباد رکھا۔"

شاہ علی | قلوادھونی (حیدر آباد دکن) کے رہنے والے تھے۔ نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے حکم سے فن ریاضی کے دو رسالے سنہ ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں مرتب کئے۔

ایک کا نام تذکرہ رکھا، دوسرے کا انوار بدریہ۔

انوار بدریہ کا نمونہ یہ ہے:۔

تعریف نسبت مساوات۔ مقادیر دو نصف کی جو مراتب میں برابر، اور نسبت میں ایسے ہوں کہ دو مقدار میں ایک صفت کے وہ نسبت ہو جو ہر دو مقدار میں صنف آخر کی ہے۔ پس اطراف ہر صفت کے نسبت دینے کو اوساط نسبت مساوات کہتے ہیں۔

شمالی ہند میں بھی اس زمانے میں اور اس سے پہلے ریاضی، سائنس، فلسفہ وغیرہ بہت سے علوم و فنون کی کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئی ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔

دورِ چہارم کی نثر پر تبصرہ

(۱) یہ دَور اس لئے یہاں ختم کیا گیا ہے کہ اس کے بعد سر سید احمد خاں کے زمانے سے اُردو زبان و ادب میں نمایاں انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ سر سید کی تصانیف، اخبار، سوسائٹی، کالج کے ذریعہ سے تعلیم اور وسائل تعلیم بھی وسیع ہو گئے۔ اور ان کے زیر اثر بہترین مصنف بھی پیدا ہونے لگے، جن کی اختراعات ادبی نے شمع راہ کا کام کیا۔ سر سید کی کوششوں کے ساتھ ساتھ دہلی، لکھنؤ، لاہور وغیرہ بہت سے مقامات پر تعلیمی اِدارے قائم ہوئے، اور انفرادی و اجتماعی سعی و کاوش سے انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے "کائناتِ اُردو" ہی بدل گئی۔

(۲) سر سید کی مساعیِ علمی و ادبی اسی دَور میں شروع ہو گئی تھیں، لیکن بیشتر تصانیف اور وسیع تر کارنامے غدر کے بعد کے ہیں۔ اور آخرِ صدی تک جاری رہے ہیں اِس لئے ان کو دور آیندہ میں رکھا ہے لیکن سب سے پہلے۔

(۳) چوتھے دَور میں زبان، محاورات، ترتیب الفاظ، پابندیِ قواعد، تمام مصنفین میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً یکساں ہیں۔ انشاؔ و غالبؔ سے بہتر اُردو کسی نے نہیں لکھی۔ اس زمانے میں غالبؔ اس اعتبار سے نہایت ممتاز و منفرد ہیں۔

(۴) عبارت میں قافیہ پیمائی بہت مقبول ہے، لیکن "ادبیاتِ لطیف" (فسانہ و انشاء) میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ مذہب اور علوم و فنون کی کتابوں میں نہیں ہے یا کہیں کہیں ہے۔ اس زمانے میں طرزِ بیان کی سادگی و شگفتگی عام نہیں ہے۔

(۵) اس دَور میں یعنی انیسویں صدی کے ۷۰ سال میں (علاوہ فورٹ ولیم کالج کے) ہر علم و فن کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اگرچہ ان کا ایک حصّہ چھپنے کے بعد بھی اب کمیاب یا مفقود ہے، اور ایک حصّہ مسودہ کی صورت میں رہا۔ لیکن بہت سا لٹریچر علوم و موجود ہے۔

(۶) دہلی کالج اور دہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے رواجِ تعلیم اور اشاعت علوم میں بڑا کام کیا۔ ہزارہا ہندوستانیوں کو عالم و روشن خیال بنایا، اور درجنوں مصنف و اہلِ قلم پیدا کر دیئے، جنھوں نے آیندہ دَور کی پیشوائی و رہنمائی کی۔

(۷) اس دَور میں ہندو اہلِ قلم بھی اُردو نثر کی ترقی میں برابر کوشش کرتے رہے، ہر قسم کی کتابیں خصوصاً علوم و فنون، سائنس وغیرہ کی طرف بہت توجہ کی، جیسا کہ بعض نمونوں سے، اور مصنفین کی فہرست سے معلوم ہوا ہوگا، ان صاحبوں کی تصانیف کے نمونے زیادہ دستیاب نہ ہو سکے۔

(۸) یورپین مصنفین نے بھی اُردو میں اور اُردو کے متعلق اپنی زبانوں میں تصانیف کیں۔ اس دَور کے یورپین مصنفین کے تذکرے اور نمونے، ان کی مساعیِ علمی کو ایک جا دکھانے کے لئے پہلے درج کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی خاص طور پر قابلِ ذکر، اور اس کی تصانیف اور لکچر یادگار ہیں۔ اس کا حال اور فہرست تصانیف درج ہو چکی ہے۔

(۹) اس زمانے میں انگریز حکّام کی اُردو سے دلچسپی کی یہ مثالیں بھی یادگار ہیں

کہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے ۱۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں دربار کیا جس میں خطابات اور خلعت دیے گئے۔ اسی موقع پر لفٹنٹ گورنر نے انگریزی میں نہیں، بلکہ اردو میں تقریر کی۔ اس کے بعد فروری میں چیف کمشنر لکھنؤ نے اودھ کے تعلقداروں کا جلسہ کیا، اس میں بھی اس نے اُردو میں تقریر کی۔

(۱۰) لیتھو اور ٹائپ کے مطابع، خصوصاً لیتھو کے (سنگی) چھاپے خانے نہایت کثرت سے جاری ہوئے، ۱۸۳۲ء سے اردو سرکاری زبان قرار پائی، ۱۸۳۵ء سے اخبارات کو آزادی ملی۔ اس لئے اس سال کے بعد سے ۱۸۷۰ء تک تمام ہندوستان میں ایک سَو کے قریب اخبارات و رسائل جاری ہوئے، جن میں سے بعض اسی دوران میں بند ہوگئے۔ بہت سے بعد تک جاری رہے۔ چند اخبار مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آگرہ اخبار، دبدبہ سکندری رامپور آج تک جاری ہیں۔ مطابع میں جس نے سب سے زیادہ ترقی کی، مطبع نول کشور ہے۔ یہ بھی ابتک قائم ہے، اودھ اخبار اسی مطبع کا پرچہ ہے۔ آگرہ اخبار پریس اور دبدبہ سکندری کا مطبع حسنی بھی باقی ہیں۔ ان کے علاوہ اور چند چھاپے خانے اسی زمانے سے ابتک موجود ہیں۔

(۱۱) علمی و اصلاحی انجمنیں بے شمار قائم ہوئیں، ان میں سب سے پہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی (قائم شدہ ۱۸۴۲ء) تھی اور وسعت و خدمت کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی (قائم شدہ ۱۸۶۲ء) اور زمانۂ زیر بحث میں باعتبار ترتیب قیام سب سے آخری نینی تال انسٹی ٹیوٹ (قائم شدہ ۱۸۶۹ء) یہ اُمرا و رؤسا کی انجمن تھی۔ اس کا مقصد تصنیف و تالیف نہ تھا، بلکہ مختلف ذرائع سے ملک میں تعلیم و روشن خیالی کی اشاعت کرنا تھا۔ ان کے علاوہ شاہجہانپور، اٹاوہ، بنارس، بدایوں۔ مرادآباد، الٰہ آباد، لاہور، بہار، وغیرہ مقامات پر الگ الگ انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ جنھوں نے تصنیف، ترجمہ، اخبار، تقریر وغیرہ تمام ذرائع علم و ادب کی ترقی کے لئے استعمال کئے۔

(۱۲) مذہبی مناظرے، علمی مباحثے، اور شعر و سخن کے مشاعرے بھی جاری رہے،

جن کے وسیلوں سے اُردو کی خدمت ہوتی رہی۔ گارسان دتاسی (جن کے خطبات سے اس تبصرہ کی اکثر معلومات اخذ کی گئی ہیں) کے آخری خطبہ میں مذکور ہے کہ اس دَوْر کا آخری شاندار مشاعرہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو آگرہ میں ہوا۔ دتاسی لکھتا ہے کہ

"اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۹ء میں اُن شعرا کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ان ہدایات میں یہ بھی ہے کہ شعرا پہلے سے اپنے نام، تخلص، مذہب، عمر، استاد کا نام، اور یہ کہ آیا استاد زندہ ہے یا فوت ہو گیا، مطبوعہ دواوین کے نام اور دوسرے حالات کے متعلق اطلاع دیدیں۔"

غرض یہ "عہد اردو" آیندہ ادبی انقلاب اور علمی ترقی کے لئے پیش خیمہ تھا۔ جس نے آنے والی نسلوں کے لئے راستہ بنادیا۔

نثر اردو کا پانچواں دور

۱۸۷۱ء تا ۱۹۰۰ء
۱۲۸۸ھ تا ۱۳۱۸ھ

سر سید احمد خاں

سید احمد خاں[۵] ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء مطابق ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے سید تھے۔ ان کا سلسلہ نسب امام نہم حضرت امام محمد تقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے، اسی لئے وہ اپنے آپ کو "نقوی سید" کہتے تھے۔ غالباً ان کے بزرگ ہندوستان میں شاہجہاں کے عہد میں آئے، اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک ان کو سلطنت مغلیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا۔ سر سید کے بزرگوں میں سے ایک شخص سید محمد دوست دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے اور مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے۔ جب اس مورچہ کو انھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کر لیا تو عالمگیر نے ان کو یکہ بہادر کا خطاب دیا۔ سر سید کے دادا سید ہادی تھے، ان کو بادشاہ عالمگیر ثانی کے سنہ ۲ جلوس (۱۱۶۸ھ ۱۷۵۵ء) میں جواد علی خاں کا خطاب اور منصب ہزاری ذات دو پانصد سوار ملا، اور ان کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب اور قباد علی خاں خطاب دیا۔ قباد علی خاں دکن چلے گئے، اور وہیں انتقال کیا، جواد علی خاں (سر سید کے دادا) بدستور دہلی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا، اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے۔ (۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء تا ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء) تو سر سید کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ کا اضافہ ہوا۔ اور عہدۂ احتساب لشکر در صوبہ شاہجہاں آباد عنایت ہوا۔ اور پھر ۱۱۸۸ھ ۱۷۶۴ء میں عہدۂ قضائے لشکر پر متعین ہوئے۔ اسی سال

[۵] سر سید کے حالات مولانا حالی کی حیات جاوید سے ماخوذ ہیں، بلکہ اسی کتاب کی عبارت کو مختصر کر کے مسلسل کر دیا ہے۔

انھوں نے انتقال کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے، اور ان کا پورا دیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا" سید ہادی کے بیٹے، یعنی سرسید کے والد میر متقی، ایک آزاد طبیعت کے آدمی تھے۔ جب سید ہادی کے بعد ان کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا، مگر چونکہ انکو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لئے شاہ عالم کے انتقال کے بعد ان کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا، اور وہ دربار خاص میں جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جا سکتا تھا، برابر جاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اس خاص دربار میں گیا ہوں" سرسید کے والد کو حضرت شاہ غلام علی سے جن کی خانقاہ دہلی میں مشہور ہے بیعت تھی، اور شاہ صاحب ان پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے۔

سرسید کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانی رح کی اولاد میں تھے۔ آپ کے بھائی خواجہ نجیب الدین نواح دہلی میں "شاہ فدا حسین" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بڑے عالم اور خوش بیان تھے، لیکن "رسول شاہی" فرقہ میں داخل ہو گئے تھے، اس لئے چار ابرو کا صفایا کئے، ایک عرقی باندھے، بھبوت مے بیٹھے رہتے تھے۔ سرسید کے حقیقی نانا دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال لائق دانشمند، صاحب علم وفضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ زیچ اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اور خود آلات رصد کے بنانے پر قادر تھے۔ علم ہیئت اور آلات رصد کے متعلق چند رسالے بھی تصنیف کئے تھے۔ ان میں سے ایک کا سرسید نے اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ ان کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں سرسید کے ماموں بھی فنون ریاضی کے ماہر تھے۔ خواجہ فریدالدین تحصیل علوم کے بعد ۱۷۹۷ء ۱۲۱۲ھ میں مدرسہ کلکتہ میں (جو فورٹ ولیم کالج

سے پہلے قائم ہوا تھا اور آج تک ہے) سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر سپرنٹنڈنٹ ہو کر گئے۔ وہاں سے گورنر جنرل مارکوئس ویلزلی نے ان کو ایران میں سفارت پر بھیجا۔ اس کے بعد برما میں ایک پولیٹیکل معاملے کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ کے بھیجا۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے کلکتہ سے بلا کر وزیر سلطنت بنایا اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح رسول شاہیوں میں داخل تھے۔ لیکن وہ وضع اختیار نہ کی تھی۔ مرنے سے دو سال پہلے اپنے مرشد کی پوری پیروی کرنے کے لئے صرف ایک بار چار ابرو کا صفایا کرایا تھا۔

سرسید کی والدہ نہایت دانشمند، نیک دل، پاک سرشت تھیں۔ ان کی تربیتِ اخلاق کا سرسید کی حیات و سیرت پر خاص اثر ہوا ہے۔ ان کا خاندان حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا معتقد و مرید تھا، لیکن وہ خود حضرت شاہ غلام علیؒ سے ارادت رکھتی تھیں۔ ان کی خانقاہ میں نذر نیاز، تعویذ گنڈے کا رواج نہ تھا۔ اس لئے سرسید کی والدہ بھی ان چیزوں کی معتقد نہ تھیں۔ لیکن ان سے بالکل منکر و مانع بھی نہ تھیں۔

سرسید کا بیان ہے کہ "میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے، مگر شاہ عبدالعزیز صاحب کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا۔ اس پر سب اعتقاد رکھتے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے ہاں کے بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس بچے کو دیا جاتا تھا۔ اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کی نے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود (سرسید کے بیٹے) کو بھی ان کی ننھیال والوں نے دو گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھانے اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین کا انتقال ۱۸۲۸ء / ۱۲۴۴ھ میں ہوا۔ والد کا ۱۸۳۸ء / ۱۲۵۴ھ میں۔ بڑے بھائی سید محمد خاں منصف ہنگام ضلع فتحپور کا ۱۸۴۵ء / ۱۲۶۱ھ میں۔ والدہ کا ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ میں، سرسید کے بھائی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے اور بڑے پاک باطن تھے۔ ان کا مزار اہل اللہ کا سا مزار تھا۔ دسہرے کی تعطیل میں دہلی آئے تھے۔

وہاں بخار کی فصل تھی۔ سید محمد خاں کو بھی بخار آنے لگا۔ ان کو یقین ہوگیا کہ اب وقت آگیا۔ اسی حالت میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ گئے۔ اپنی قبر کے لئے جگہ پسند کی۔ جب قبر تیار ہوگئی تو سوار ہو کر وہاں پونہچے۔ قبر میں اتر کر لیٹے۔ بہت پسند کی۔ دوسرے دن کفن کے لئے کپڑا منگوایا۔ سلوا کر پہنا، پسند کیا۔ پھر ایک دن حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ کو (جو ان کے پیر و مرشد کے سجادہ نشین تھے) بلایا اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ اور تیسرے دن انتقال کیا۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے شیخ سعدیؒ نے کہا ہے:-

عروسی بود نوبت ماتمت چو بر نیک روزی بود خاتمت

مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے جو سر سید کو ان کے بھائی کی تعزیت کا خط بھیجا تھا اس میں یہ شعر لکھا تھا:-

قسمت نگر کہ کشتہ شمشیر عشق یافت مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

سر سید کی تعلیم | سر سید کی بسم اللہ کی تقریب حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ شاہ صاحب حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ نقشبندیہ کے خلیفہ تھے۔ سر سید کو شاہ صاحب سے بسم اللہ پڑھنے پر بڑا فخر تھا۔ بڑے ہو کر انھوں نے اس موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا، اور اپنی تقریب بسم اللہ کے ذکر پر اس شعر کو بھی پڑھا کرتے تھے:-

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی ز فیض نقشبند وقت، جانِ جانِ جانانی[5]

اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید کے بعد فارسی و عربی پڑھی، صرف و نحو، معانی و بیان و بدیع، منطق و فلسفہ، ریاضی، اقلیدس، ہیئت، تمام علوم میں بصیرت پیدا کی۔ فن طب بھی حاصل کیا اور چند مہینے مطب بھی کیا۔ دہلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب، آزردہ وغیرہ، ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ پھر نوکر ہونے کے بعد، جب فتحپور سے بدل کر دہلی میں آئے تو مولوی نوازش علی دہلی کے مشہور عالم و واعظ سے پچھلی پڑھائی کو تازہ

۵ جانِ جاناں حضرت میرزا مظہرؒ، اور ان کی جان حضرت شاہ غلام علیؒ۔

کیا۔ فقہ و اصول فقہ پڑھا، مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے مقامات حریری و سبعہ معلقہ پڑھے۔ مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبد العزیز صاحب کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین صاحب کے خلف الصدق تھے، حدیث پڑھی، پھر قرآن مجید کی سند لی۔ استادوں سے تو اتنا ہی پڑھا، لیکن اپنا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا۔ سرسید کے شوق علم کے متعلق یہ واقعہ بھی یادگار رہے کہ جب وہ دہلی سے قائم مقام صدر امین ہوکر رہتک جانے لگے۔ اس وقت مولوی نوازش علی سے تکمیل تعلیم کر رہے تھے۔ مولوی صاحب سے کہا، آپ میرے ساتھ چلئے۔ انھوں نے عذر کیا کہ میرے پاس بہت سے طالب علم ہیں۔ ان کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ سرسید نے کہا سب کو لے چلئے۔ انکے مصارف کا میں ذمہ دار ہوں۔ مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے۔ آخر سرسید مولوی صاحب کو اور ان کے سب شاگردوں کو لے گئے، اور جب تک وہاں رہے سب کے اخراجات کے کفیل رہے۔ اور یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ غازی پور میں سرسید کے پاس ایک یہودی سالم نام، صنعا (یمن) کا رہنے والا آیا، اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش میں پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سرسید نے پوچھا کیا تنخواہ لوگے؟ اس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے۔ سرسید نے کہا، میں تم کو پچیس روپیہ مہینہ دونگا، مجھے عبرانی زبان سکھاؤ۔ یہودی یہ سن کر خوشی کے مارے بڑھ کر سرسید کی ڈاڑھی چوم لی، اور کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اس کو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ مُسرف اور آوارہ مزاج تھا، اس لئے اس کو بقدر ضرورت دیتے رہے، اور اس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اس کا چڑھا ہوا تھا، حساب کرکے اس کے حوالے کر دیا۔

سرسید کی جوانی سرسید کا زمانہ شباب رنگین صحبتوں میں گزرا تھا، باغوں کی سیر، میلوں، تماشوں، راگ رنگ کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی بڑے زندہ دل، بذلہ سنج، حاضر جواب تھے، دہلی میں ایک مشہور طائف شیریں جان

نہایت حسین تھی۔ لیکن اس کی ماں بھدّی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مُجرے کے لئے آئی تھی، سرسید بھی تھے۔ اور وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے، "مادرش بسیار تلخ است"۔ سرسیّد نے فوراً یہ مصرع پڑھا :-

گرچہ[۵] تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

لیکن بھائی کے مرتے ہی سرسید کا دل رنگین صحبتوں سے اُچاٹ ہوگیا، لباس اور وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوالیا، ڈاڑھی چھوڑ دی، پائیچے تشرع کرلئے، کُرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی، اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا۔

سرسید کی ملازمت | سرسید کے والد کو قلعہ شاہی سے تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد وہ آمدنی بند ہوگئی۔ معافی کی ملکیں بھی والد کی حیات تک تھیں، وہ بھی ضبط ہوگئیں، تو ان کو سرکار انگریزی کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں دہلی میں صدر امین تھے۔ انھوں نے ۱۸۳۸ء میں سرسید کو اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ پھر فروری ۱۸۳۹ء سے کمشنری آگرہ کے دفتر میں نائب منشی ہوگئے۔ وہیں منصفی کا امتحان پاس کیا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں منصفِ مین پوری مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۸۴۲ء میں مین پوری سے فتحپور سیکری آگئے اور وہاں چار برس منصف رہے۔ فتحپور سیکری میں جہاں اکبر بادشاہ کی خوابگاہ تھی، حُسن اتفاق سے وہی عالی شان مکان سرسید کو رہنے کے لئے ملا، یہ چاروں برس اسی مکان میں گزرے۔

اسی زمانے میں بہادر شاہ آخری تاجدارِ دہلی نے سرسید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی آئے ہوئے تھے حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ سے سفارش کی۔ بادشاہ نے سرسید کو بلا کر "جوادالدولہ سیّد احمد خاں عارف جنگ" کا

---

۵ یہ مصرع اس طرح ضرب المثل ہے۔ "صبر تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد"

خطاب دیا، اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں۔

۱۸۴۶ء میں فتحپور سیکری سے دہلی تبدیل ہو گئے۔ یہاں سے دوبار قائم مقام صدرِ امین ہو کر رہتک بھی گئے۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں مستقل صدرِ امین مقرر ہو کر دہلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس گزرے تھے کہ غدر ہو گیا۔

غدر میں سرسید کی خدمات | ۱۰ ارمئی ۱۸۵۷ء (۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ) کو دہلی میں بغاوت ہوئی، اور ۱۲ ارمئی کو یہ خبر بجنور پونچ گئی۔ وہاں اس وقت بیس یوروپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ مسٹر شیکسپیر کلکٹر و مجسٹریٹ تھے۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو یہ لوگ بہت گھبرائے، لیکن سرسید نے جا کر ان کی تشفی کی، اور کہا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے، جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے، اُس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں"۔ چنانچہ سرسید مع اور ہندوستانی افسروں کے تمام رات مسلح ہو کر کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے۔ ساری رات کرسیوں پہ بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے، یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی۔ آخر باغیوں کو نشیب و فراز سمجھا کر انگریزوں کے قتل سے باز رکھا، اور سب کو رڑکی روانہ کر دیا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بجنور میں باغیوں کی عملداری ہو گئی۔ اور وہ لوگ سرسید کے اور اُن کے رُفقاء میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہو گئے۔ سرسید نے ایک مہینے تک بجنور کا انتظام بخوبی قائم رکھا۔ لیکن باغی دشمن ہو گئے تھے۔ اس لئے سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں میرٹھ کے ارادے سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں مختلف مقامات پر چند بار باغیوں نے ان کے قتل و غارت کا ارادہ کیا لیکن ہر موقع پر بعض خیر خواہ زمینداروں نے بچا لیا۔ اثنائے راہ میں چاند پور سے چل کر سرسید نے بچھراؤں پونچ کر علالت اور راستے کی کوفت کے سبب سے چند روز مولوی

محمود[۵] عالم صاحب کے مکان پر، جو ان کے دوست تھے مقام کیا، اور اپنی مفصل سرگزشت حکّام انگریزی کو لکھ بھیجی، اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔

سرسیّد میرٹھ میں کئی مہینے رہے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دہلی میں انگریزی فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اسباب سب لوٹ لیا۔ ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی مارے گئے۔ ان کی والدہ اور خالہ دہلی میں تھیں۔ سرسید میرٹھ سے دہلی آئے، گھر تباہ ہو چکا تھا۔ ماں خالہ کو میرٹھ لے گئے۔ انگریزوں نے رڑکی میں اپنی فوج جمع کر لی۔ سرسید بھی تمام عملۂ بجنور کے ساتھ بحکم سرکار رڑکی بلالئے گئے۔ تمام روہیل کھنڈ سخت باغی تھا، بجنور، مراد آباد، بریلی کے ضلعے سرکشوں کے زیر اثر تھے۔ ان اضلاع پر قبضہ کرنے کے لئے رڑکی سے فوج روانہ ہوئی۔ سرسید بھی ساتھ تھے۔ اس موقع پر سرسید نے کمال دلیری و دانشمندی سے کام لیا۔ حکّامِ سرکاری میں یہ بحث پیش آئی کہ اب ان اضلاع سرکش میں کون لوگ باغی تصور کئے جائیں۔ سرسید نے اس باب میں افسران فوج سے گفتگو کی، اور بہت بحث مباحثہ کے بعد یہ طے کرالیا کہ سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلے کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو فسادات

۵ مولوی محمود عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ خاکسار مولّف کے پردادا تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز کی اولاد میں تھے۔ اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ زمانۂ غدر میں اپنے وطن بچھراوں (ضلع مراد آباد) میں رضا و توکل اور سکون و وقار کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اہل قصبہ نے لوٹ مار کے ڈر سے اپنا زر و زیور ان کے پاس رکھ دیا تھا۔ مولوی محمود عالم صاحب مرزا غالب کے ہم عصر تھے، اور ان سے بھی مراسم رکھتے تھے۔ دہلی کی آمد و رفت کے زمانے میں سرسید سے بھی تعلقات قائم ہوئے ہوں گے۔ غالب سے دو سال پہلے ۴ ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۸۶۷ء کو وفات پائی۔ سرسید کے قیام بچھراوں کا ذکر مولانا حالی کی "حیات جاوید" مطبوعہ ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۱ سے ماخوذ ہے۔ باقی تمام حالات بھی اسی کتاب سے تقریباً مولانا حالی ہی کے الفاظ میں نقل کئے گئے ہیں۔ قادری

رعایا، ہندو مسلمان، دونوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں کئے، ان کے سبب سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس وقت اگر سرسید یہ جرارت نہ کرتے اور یہ فیصلہ نہ کرا دیتے تو ضلع بجنور بالکل تباہ ہو جاتا۔ خصوصاً کوئی مسلمان اس ضلع میں باقی نہ رہتا۔ سرسید کی اس دانشمندی کے سبب سے ضلع بجنور غدر کے نتائج میں سب سے کم مبتلا ہوا۔ اور ضلع مراد آباد میں ضبط شدہ جاگیریں سب سے زیادہ واپس دی گئیں۔

خدمات غدر کا صلہ | گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری جو سرسید سے ظہور میں آئی، وہ کسی خلعت یا انعام کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ لیکن گورنمنٹ نے ان کی خدمات کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔ میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاندپور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی سرکار نے ضبط کر لیا تھا اور جس طرح دیگر خیر خواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئیں تھیں یہ تعلقہ چاندپور سرکار نے سرسید کو دینا چاہا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ سرسید نے خود ایک مرتبہ اس کے متعلق کہا تھا کہ "بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھکو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہو گا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لیکر تعلقہ دار بنوں۔"

غدر کے بعد | اپریل ۱۸۵۸ء میں سرسید صدر الصدور ہو کر مراد آباد گئے۔ وہاں چند کتابیں لکھیں۔ ۱۸۶۰ء میں وہاں سخت قحط پڑا۔ قحط کا انتظام سرسید نے اس خوبی سے کیا کہ انسانی ہمدردی کا اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل ہے۔ قحط زدوں کی سرکاری امداد کے علاوہ خود سرسید کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔ مراد آباد کے ایک عالم رئیس مولوی عالم علی کو بغاوت کے الزام اور سزائے موت سے بچایا۔ مولوی صاحب نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے مکان

میں پناہ دی تھی۔ باغیوں نے زبردستی گھر میں گھس کر ان سب کو قتل کر دیا۔ اور مولوی صاحب کے گھر کا آدمی کوئی نہ مارا گیا۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ ان کے اشارے سے یہ قتل عمل میں آیا۔ سر سید نے مولوی صاحب کی بے گناہی ثابت کر کے بری کرا دیا۔ چار برس کے بعد ۱۸۶۲ء میں سر سید کی بدلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی۔ وہاں بھی علمی و تعلیمی کام کرتے رہے۔ (ان کاموں کا ذکر الگ عنوان میں آئے گا) ۱۸۶۴ء میں غازی پور سے علی گڈھ کو تبدیل ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں عہدۂ جج خفیفہ پر ترقی پا کر علی گڈھ سے بنارس گئے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے انگلستان روانہ ہوئے۔ دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود ساتھ تھے۔ سفر کا مقصد سید محمود کی تعلیم کے علاوہ ولایت کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ و مشاہدہ تھا۔ لندن میں ان کو سی، ایس، آئی کا خطاب اور تمغا ملا، مشاہیر و عمائدِ ملک سے ملاقات کی، ملکہ وکٹوریہ اور پرنس آف ویلز کی لیوی" (دربارِ عام) میں شریک ہوئے۔ بعض کلب کے ممبر بنائے گئے، وہاں کی یونیورسٹیوں، کتب خانوں، عجائب خانوں کو غور سے دیکھا۔ ان سب باتوں کے سوا سر سید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ شائع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو، اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاصکر سر ولیم میور (لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب) نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کی سیرت پاک کے متعلق کی ہیں ان کو رفع کیا جائے۔ چنانچہ سر سید نے لندن میں ایک مختصر رسالہ انگریزی میں شائع کیا۔ اور ولایت سے آکر مفصل کتاب اردو میں چھپوائی۔ ولایت میں تقریباً ڈیڑھ سال رہکر سر سید مع بڑے بیٹے سید حامد کے اکتوبر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان آ گئے۔ اور بنارس میں اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ بنارس ہی کے زمانۂ قیام میں ۱۸۷۵ء میں ایک ابتدائی مدرسہ علی گڈھ میں قائم کیا اور پھر جولائی ۱۸۷۶ء سے پنشن لیکر مستقل طور پر علی گڈھ میں رہنے لگے۔

سر سید کی وفات پنشن کے بعد ۲۲ برس ہمہ تن قومی خدمات میں مصروف رہ کر

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ۱۰ بجے رات کے علی گڈھ میں انتقال کیا۔ اور کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔ تواریخِ وفات عربی الفاظ اور قرآنی آیات سے بے نظیر نکلی ہیں، یعنی۔
غَفَرَ لَہٗ (۱۳۱۵) اِنَّ الْعَاقِبَۃَ لِلْمُتَّقِیْن (۱۳۱۵) اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ (۱۳۱۵)[۵]

سر سید کے خطابات و اعزازات | شاہی خطاب "جواد الدولہ عارف جنگ" کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ گورنمنٹ نے سی، ایس، آئی کے بعد ۱۸۸۸ء میں "کے. سی. ایس آئی" کا خطاب دیا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی نے ۱۸۸۹ء میں "ایل ایل ڈی" کی اعزازی ڈگری دی۔ لندن جانے سے پہلے "رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن" کے فیلو مقرر ہو گئے تھے۔ لندن میں وہاں کے سب سے زیادہ نامی اور معزز کلب ایتھنی نیم کلب کے ممبر بنائے گئے۔ ۱۸۷۸ء میں وائسرے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور چار برس ممبر رہے۔ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے ممبر ہوئے اور شہادت دی۔ ۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔

سر سید کی ملکی و قومی خدمات | سر سید نے ہنگامۂ غدر کے سلسلے میں اپنے ملک و قوم کی جو خدمتیں کیں ان کے علاوہ ہندوستان کے لئے عموماً اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً فلاح و صلاح کی جد و جہد شروع کر دی۔ تعلیمی میدان میں پہلا قدم یہ تھا کہ ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا۔ اسی سال رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند لکھ کر مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، اور علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں۔ اسی سال غازی پور میں انگریزی مدرسہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے قائم کیا۔ غازی پور سے علی گڈھ بدلی ہوئی تو سوسائٹی کا دفتر بھی ساتھ آ گیا۔ علی گڈھ میں اس کے تیس ہزار روپیہ لاگت سے عمارت اور باغ تیار ہوا۔ اس میں ہر مہینے سائنس پر لکچر دیا جاتا تھا، اور آلات سے تجربے دکھائے جاتے تھے،

[۵] قرآن مجید سے یہ تاریخ علامہ ڈاکٹر اقبال نے نکالی تھی جیسا کہ انھوں نے ایک بار محمد حسین صاحب عرشی سے کہا تھا۔ (ملفوظاتِ اقبال مرتبہ نظامی ص[illegible])

تاریخ، معاشرت، کاشتکاری کے متعلق بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع کئے گئے۔

۱۸۶۶ء میں علی گڑھ میں سرسید نے ایک انجمن برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کریں، اور اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے اپنے تمام مقاصد و مطالب گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔ چنانچہ ریل اور ڈاک خانہ کی بعض آسانیاں حاصل کی گئیں۔

۱۸۶۶ء میں اور اس کے بعد سرسید کی تحریک سے مختلف اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم کی گئیں جن میں ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل تھے۔ ۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے ایک اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔ جو آج تک جاری ہے، لیکن اس کا نام مسلم یونیورسٹی گزٹ رکھدیا گیا ہے۔

۱۸۶۷ء میں سرسید نے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز گورنمنٹ کے سامنے پیش کی۔ جس میں تمام علوم وفنون کی تعلیم اردو زبان میں ہو، اسی زبان میں امتحان لئے جائیں، اور جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو علم کی مختلف شاخوں میں دی جاتی ہیں وہی سندیں ان طلبہ کو دی جائیں جو انھیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دیکر کامیاب ہوں۔ اس یونیورسٹی کے لئے تمام علوم وفنون کی کتابیں اپنی سوسائٹی کی نگرانی میں ترجمہ و تالیف کرانے کا سرسید نے ذمہ لیا، اور اہتمام شروع کردیا۔ منجملہ دیگر اہل علم و قلم کے مولوی ذکاءاللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب اور پنڈت دھرم نرائن بھی اس خدمت کے لئے آمادہ ہوگئے۔ لیکن یونیورسٹی کی تجویز آگے نہ بڑھ سکی اس لئے کہ سرسید کو گورنمنٹ کا یہ ارادہ معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ یونیورسٹی کو توڑ کر ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے۔ جس میں انگریزی بطور اختیاری زبان کے رہے گی، اور سرسید یہ نہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی انگریزی زبان سے محروم رہ جائیں۔ اس کے علاوہ اردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں چھیڑ چھاڑ شروع کردی کہ سرسید کی مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لئے اردو اور ہندوؤں کے لئے ہندی زبان ہو، آخر سرسید نے اس کا خیال ہی

چھوڑ دیا۔ بنارس میں سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقہ سے بہتر کوئی طریقۂ علاج عمدہ بے خطر نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں انھوں نے بنارس میں اس علاج کے رواج کے لئے ایک کمیٹی بنائی، جس کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکرٹری سرسید تھے۔ اور ایک شفاخانہ بنام ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کھولا گیا۔ اس شفاخانہ کا چرچا چند روز میں نزدیک و دور ہوگیا۔ پہلے مہینے ہی میں پانچ سو سولہ (۵۱۶) مریض شفاخانہ میں آئے۔ سرسید نے اس علاج کے اصول پر لکچر بھی دیا۔ اور ایک رسالہ بھی لکھ کر چھپوایا۔

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ چنانچہ ہندوؤں نے اس کام کے لئے کمیٹیاں اور سبھائیں بنائیں اور گورنمنٹ کو میموریل بھیجے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ سرسید نے اردو کی حمایت میں مضامین لکھے۔ اس وقت اردو کے مخالفوں کی تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ ۱۸۸۲ء میں پھر ہندوؤں نے ایجوکیشن کمیشن کو میموریل بھیجے۔ سرسید نے باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر ظاہر کردیا کہ یہ مسئلہ تعلیمی نہیں ہے بلکہ بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی، ہندوؤں نے سر انٹونی مکڈانل لفٹننٹ گورنر کی خدمت میں پھر ایک میموریل اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کے لئے پیش کیا گیا۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج والم کے سبب سے (جس کا سب سے بڑا باعث سرسید کے بڑے بیٹے سید حامد کی علالت اور سوء مزاج تھا) ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے، مگر اسی حالت میں

انھوں نے اس مسئلہ پر ایک مضمون لکھا جو ۱۹ مارچ کے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ یہ غالباً ان کی آخری قومی تحریر تھی، اس میں بھی ان کی فطری صاف گوئی نمایاں ہے۔ مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

"غالباً اس وقت ان کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبہ کے ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر اس زمانے میں، جبکہ صوبہ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بعوض اُردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ معاون اس تجویز کے تھے، پس ان صوبوں میں بھی ہندی وناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پرانے مُردہ مضمون کے اٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے، اور وہ ان کو ناشکرا سمجھتی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے میموریل کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں پیش کی ہیں۔ اس وقت ہز آنر نے عدالتوں کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن سرسید کے انتقال کے بعد ۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور رزولیوشن پاس ہوا جو دونوں قوموں کو سر انٹونی مکڈانل کا عہد حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا۔ یعنی عدالت کی زبان بجائے ہندی و اُردو کے انگریزی قرار دیدی گئی۔

[11] سرسید کا سفرِ لندن بھی قوم کی خاطر تھا، وہاں بھی قوم و مذہب کی خدمت سے غافل نہ رہے، جس کا پہلے ذکر کیا گیا۔ ولایت سے آکر ایک رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس کا پہلا نمبر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء مطابق یکم شوال ۱۲۸۷ھ کو نکلا۔ اس پرچہ کے ذریعہ سے اُردو صحافت میں انشا پردازی میں، اخلاق و معاشرت میں، عام معلومات میں اس قدر ترقی اور اتنا اچھا انقلاب پیدا ہوا کہ اس زمانے کے بیسوں اُردو رسائل و اخبارات سے نہ ہو سکا تھا۔ سرسید کے علاوہ بہترین اہل علم و قلم اس کے مضمون نگار تھے۔ "تہذیب الاخلاق" کے بعض مذہبی مباحث سے مسلمانوں نے اختلاف کیا، جوابات لکھے، سرسید پر کفر کے فتوے لگائے،

اس رسالہ کے جواب میں رسالے نکالنے شروع کیے، یہ سب کچھ ہوا، لیکن اس سے اُردو زبان وادب کو بڑا نفع پونہچا۔ "تہذیب الاخلاق" کی سلیس، با اصول، پُرزور نثر نگاری نے تمام ملک میں یہی طرزِ نگارش عام کردیا۔ تہذیب الاخلاق پہلی بار ۱۸۷۰ء/۱۲۸۷ھ سے ۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ھ تک جاری رہا۔ دوسری بار ۱۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ سے ۱۸۸۱ء/۱۲۹۹ھ تک۔ تیسری بار ۱۸۹۴ء/۱۳۱۱ھ سے ۱۸۹۷ء/۱۳۱۴ھ تک۔ سر سید کی وفات کے بعد "تہذیب الاخلاق" کی جلدوں سے سر سید، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، نواب وقارالملک وغیرہ مضمون نگاروں کے مضامین کے مجموعے مرتب کردئے گئے، جو اِن بزرگوں کی مستقل تصانیف کا حکم رکھتے ہیں۔

سر سید نے "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ہی ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو بنارس میں کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی۔ اس کے مقاصد کا اعلان پہلے سے اشتہار و اخبار کے ذریعہ سے کر دیا تھا کہ "انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اُٹھا رہے ہیں، اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے، اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کام کے لئے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔" چنانچہ نواب کلب علی خاں بہادر رئیس رامپور، کنور وزیر علی خاں رئیس دانپور اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ کی۔ انعامی اشتہار جاری کیا گیا، تین انعام پانسو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپیہ کے مقرر ہوئے۔ میعادِ معیّن کے اندر ۳۲ مضمون مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے موصول ہوئے۔ مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کا مضمون سب سے عمدہ تھا، مگر ان کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا۔ اور پہلا انعام مولوی سید اشرف علی ایم اے کو ملا، جو اُس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے۔ دوسرا انعام نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کو، اور

تیسرا انعام مولوی عبدالودود کو ملا۔ سرسید نے ان مضامین سے رپورٹ تیار کر کے شائع کی۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ علی گڈھ کالج کی اسکیم بھی تھی۔ گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹوں نے قیام کالج کی تجویز کو پسند کیا اور ہر طرح کی امداد دینے کا وعدہ کیا۔

مجوزہ مدرسۃ المسلمین کا سرمایہ جمع کرنے کے لئے سرسید نے کمیٹی خزینۃ البضاعۃ قائم کی۔ جس میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل نے دس ہزار روپیہ اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے ایک ہزار روپیہ دئے۔

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڈھ میں ابتدائی مدرسہ کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔ اور یکم جون سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی۔ قیام مدرسہ کی تاریخ مولوی صفدر حسین نے خوب کہی ہے۔ قطعہ کا آخری شعر یہ ہے:-

تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخ مدرسہ کی ۔ بولا یہ ملہم غیب "اٹھارہ سے پچھتر"[۵]

۹۲ ۱۲ھ

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے نے علی گڈھ میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کا سنگ بنیاد رکھا، اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج کلاس قائم ہو گیا۔ ۱۸۸۳ء تک ایف اے، بی اے، ایم اے، اور قانون کے امتحانات کے لئے کلکتہ یونیورسٹی سے اس کالج کا الحاق ہو گیا۔ اس کے بعد سائنس، آرٹس اور قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی سے اس کا تعلق ہو گیا۔ اور آج وہی کالج مسلم یونیورسٹی ہے۔

سرسید ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۳ء تک وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے اس عرصہ میں انھوں نے دو قانونی مسودے کونسل میں پیش کئے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون، اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہو گئے اور اس وقت سے آج تک ان کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔ تیسرا نہایت ضروری و مفید مسودہ قانون وقف خاندانی (یا وقف علی الاولاد) کے متعلق

۵ لفظوں میں عیسوی سنہ ظاہر کیا گیا ہے، جن کے اعداد سے ہجری سنہ نکلتا ہے۔ "نو" کی جگہ "سے" پورا روزمرہ تھا۔ اٹھارہ سے پچھتر یعنی اٹھارہ سو پچھتر (۱۸۷۵ء)

تیار کیا تھا، تاکہ ذی مقدور خاندانوں کی اولاد موروثی جائداد کو فروخت نہ کر سکے۔
اور وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ میں نیلام نہ ہو سکے۔ لیکن اُس وقت
مختلف وجوہ سے سرسید یہ مسودہ قانون کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ اب "قانون وقف
علی الاولاد" پاس ہو گیا ہے، اور رائج ہے۔

اُس کے علاوہ سرسید نے قانون انتقال جائداد، قانون حقوق استفادہ،
قانون ترمیم ضابطہ فوجداری، قانون لوکل سیلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسطہ کے
کونسل میں پیش ہونے پر جیسی پُرزور اور باوقعت تقریریں کیں، ان کو سُن کر کونسل
کے انگریز ممبر اور خود وائسرائے بھی حیران تھے۔ سرسید برائے نام انگریزی جانتے
تھے۔ اپنے دستخط کر سکتے تھے اور چند جملے ٹوٹے پھوٹے بول سکتے تھے۔ لیکن کونسل
میں اسپیچ دینے کے لئے اکثر چھوٹی چھوٹی تقریروں کو وہ اول خود اردو میں لکھ کر
ان کا انگریزی میں ترجمہ کرانے تھے، اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر
خود کونسل میں پڑھتے تھے۔ اور بڑی بڑی اسپیچوں کو کونسل کا سکرٹری پڑھ کر سنادیتا
تھا۔ سرسید کی ایک انگریزی اسپیچ پر جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی تھی لارڈ لٹن نے بڑا
تعجب ظاہر کیا تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے
اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے، اور مہربانی سے میرے کندھے پر
ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہ سُنی تھی"۔

۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید کونسل کے ممبر تھے، ان کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیٹی
میں لی گئی تھی، جس سے ان کا بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ (ماہر تعلیم) ہونا ثابت ہوتا ہے۔
اس کمیشن کے چند سوالات یہ تھے:۔ آیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی
کے زیادہ مفید ہوگی؟" کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جاسکتا ہے؟
"گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم کی تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟" گرانٹ ان ایڈ (امدادی تعلیمی)
کا قاعدہ جو بالفعل مروج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟" گورنمنٹ مسلمان لڑکوں کی تعلیم میں کہاں تک
کوشش کر سکتی ہے، اور اس میں کامیابی کی کیا توقع ہے؟" اس طرح کے سب سوالوں کے جواب

سرسید نے نہایت دانشمندی، معاملہ فہمی، صداقت اور دلیری کے ساتھ دیئے۔

۱۸۸۳ء[19] سرسید نے "محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن" قائم کی تاکہ اس کے چندے سے مسلمان لڑکوں کو انگلستان بھیجا جائے، اور سول سروس کے امتحان مقابلہ، یا ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری یا بیرسٹری، ڈاکٹری، انجنیری کا ڈپلوما حاصل کرنے میں اعانت کی جائے۔

۱۸۸۶ء[20] میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ یہ ہندوستان میں سب سے بڑی تعلیمی انجمن تھی۔ سرسید کی زندگی میں اس کے گیارہ اجلاس ہوئے۔ اتنے ہی عرصے میں اس کانفرنس کے ذریعہ سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوگئی۔ بے شمار انجمنیں، مکاتب، اسکول قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں، تعلیمی مردم شماریاں ہوئیں، غیر سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ طالب علموں کو وظائف دئے گئے۔ اسی طرح سے مسلمانوں کی اصلاح حال اور ترقی تعلیم کا ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا گیا۔ یہ کانفرنس آج تک قائم ہے، اگرچہ آجکل ملکی انقلابات اور سیاسی حالات کے سبب سے پہلی سی سرگرمی نہیں رہی۔

"انڈین[21] نیشنل کانگرس" کی مخالفت بھی سرسید کا ایک کارنامہ ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس سے ایک سال پہلے کانگرس قائم ہوئی تھی۔ پہلے یہ مجلس بنگالیوں نے بابو سرندر و ناتھ بنرجی کی سعی و مشورہ سے کلکتہ میں قائم کی تھی اور اس کا نام "بنگال نیشنل لیگ" رکھا تھا۔ پھر اسی سے انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل کی گئی۔ پہلے اس کا جو مقصد مشتہر کیا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے اس کا مطالبہ کیا جائے۔ اس کے بعد مختلف پمفلٹوں کے ذریعہ سے جو خیالات شائع کئے گئے ان میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقۂ حکومت کی برائی ایسے طور پر ظاہر کی گئی جس سے خاص کر جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے دل پر برا اثر ہوتا تھا، اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی سرسید نے دو سال تک کانگرس کی رفتار اور کارروائی کو بغور دیکھا۔ آخر

یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے کہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجی ٹیشن (شورش) پھیلانا بعینہ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا، پس مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ ایجی ٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں۔ چنانچہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جبکہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور انڈین نیشنل کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا، مسلمانوں کے عام جلسہ میں سر سید نے کانگرس کے خلاف نہایت مفصل اور پُر زور لکچر دیا۔ اس کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں دوسرا لکچر ایسا ہی طولانی دیا۔ اور پھر مضامین، تقریروں اور زبانی گفتگو کے ذریعہ سے علانیہ مخالفت شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم مسلمان کانگرس میں شریک ہوئے۔ اس کام میں کانفرنس کے وجود نے بھی مدد دی۔ دونوں کا انعقاد دسمبر کے ہفتہ آخری میں ہوتا تھا۔ اس لئے ہزارہا مسلمان کانفرنس کی طرف متوجہ رہتے تھے۔

اس کے بعد ۲۲ اگست ۱۸۸۸ء میں سر سید نے علی گڈھ میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (مجلسِ مُحبّانِ وطن) اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگرس میں شریک نہیں ہیں، ان کی رائیں اور خیالات اور خط کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہلِ انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائے اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کی جائے۔ اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط، اضلاع شمال مغرب و اودھ، اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگرس کے برخلاف جلسے کئے گئے۔ تمام تعلقہ دارانِ اودھ، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدرآباد، اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا۔ ان تدبیروں سے گورنمنٹ کو یقین دلایا گیا کہ کانگرس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاصکر مسلمان شریک نہیں ہیں۔ سر سید ایک خط میں بدرالدین طیب جی کو کانگرس کے ایجی ٹیشن میں مسلمانوں کی شرکت کے نقصانات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ:- غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے بیچ میں کود پڑے ہندوؤں کو

گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہوگئے، مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہوگئے۔"

سرسید کی گوناگوں خدمات کا یہ مختصر خاکہ ہے جو "حیات جاوید" سے تقریباً مولانا حالی ہی کے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس میں ان کی مذہبی خدمات شامل نہیں ہیں۔ ان کا ذکر ان کی تصانیف کے سلسلے میں آئے گا۔

سرسید کی تصانیف اور علمی و مذہبی خدمات

۱۸۳۵ء میں اخبارات کو آزادی ملی، اسی سال سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے دہلی سے سید الاخبار جاری کیا۔ سرسید کی سب سے پہلی علمی و ادبی خدمت اس اخبار میں مضمون نویسی تھی۔

(۱) جام جم (فارسی)۔ ملازمت آگرہ کے زمانے میں سرسید نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی۔ اس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ تک ۴۳ بادشاہوں کا مختصر حال لکھا۔ ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔

(۲) جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ مولفہ ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ۔ مولود شریف کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے سرسید نے اس رسالہ میں اُس زمانے کے خیالات کے موافق صحیح روایتیں درج کیں۔

(۳) تحفۂ حسن، مولفہ ۱۸۴۴ء ۱۲۶۰ھ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی تصنیف تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم و دوازدہم کا ترجمہ۔ یہ رسالہ شیعوں کی تردید میں لکھا تھا۔ اس کے بعد سرسید نے کبھی شیعوں کے عقائد و اعمال سے تعرّض نہیں کیا۔

(۴) تسہیل فی جر الثقیل، مطبوعہ ۱۸۴۴ء۔ ابوذر یمنی کے عربی رسالے سے کسی عالم بوعلی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، اور "معیار العقول" نام رکھا تھا، سرسید نے فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس رسالہ میں مصنف نے جر ثقیل کے پانچ اصول بیان کئے ہیں۔ یعنی بھاری چیزوں کے اُٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے، دبانے، نچوڑنے کے لئے پانچ کلیں بتائی ہیں، اور ان کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

(۵) آثار الصنادید۔ یہ کتاب سرسید کا نہایت عجیب و نادر کارنامہ و یادگار ہے اور اردو میں اپنی نوع کی پہلی چیز۔ اور جس محنت و کاوش سے مرتب کی گئی اس کے لحاظ سے کم سے کم ہندوستان میں اور اردو میں آخری چیز بھی ہے۔ اس میں عمارات دہلی کا حال ہے۔ عمارات بیرون شہر، لال قلعہ، عمارات قلعہ، عمارات شہر دہلی یعنی حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باولیوں، کنووں وغیرہ کے حالات، ان کے نقشے، تصویریں، کتبے، دہلی کے پرانے شہروں، قلعوں، محلوں کا بیان، پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے، جس میں ایک سو بیس مشائخ، علما، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرا، شعرا، خوشنویس، مصور، موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔ اکثر عمارتوں کے عرض و طول و بلندی کی پیمایش کرنی، ہر عمارت کی صورت حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے، ہر کتبے کا بعینہ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچوانا، اور اس طرح سوا سو سے زیادہ عمارتوں کی تحقیقات کرنا فی الحقیقۃ نہایت دشوار کام تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب سے پڑھے نہ جا سکتے تھے، ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے، اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔"

باوجود اس قدر مشکلات کے "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس کی عبارت سرسید نے مولوی امام بخش صہبائی سے لکھوائی تھی، اس لئے رنگین و مقفیٰ تھی، سلیس و رواں تھی۔ اسی زمانے میں مسٹر آربرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی ولایت جاتے تھے، وہ اس کا ایک نسخہ ساتھ لے گئے، اور وہاں جا کر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبروں نے بہت پسند کیا۔ اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ مسٹر آربرٹس نے دہلی واپس آکر سرسید کی شرکت سے انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ اس وقت

سرسید نے اس پر نظرثانی کی۔ پہلے ایڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ و تکلفات کے سبب سے بے مزہ ہوگئی تھی۔ دوبارہ سادہ و سلیس عبارت میں لکھی گئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ لیکن غدر میں اس کے تقریباً تمام نسخے تلف ہوگئے۔ مسٹر رابرٹس کی بھی دہلی سے تبدیلی ہوگئی تھی اس لئے انگریزی کا ترجمہ بھی رہ گیا۔ لیکن فرانس کے مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرکے مشتہر کیا، جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی۔ اسی فرنچ ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا۔

"آثار الصنادید" کا تیسرا ایڈیشن منشی رحمت اللہ رعد نے اپنے نامی پریس کانپور میں ۱۹۰۴ء میں شائع کیا۔ جس میں پہلے دونوں ایڈیشنوں کی خوبیاں جمع کر دیں۔

(۶) کلمۃ الحق، مؤلفہ ۱۸۴۹ء۔ یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقۂ مروّجہ کے برخلاف لکھا ہے۔

(۷) راہ سنت در ردّ بدعت، مؤلفہ ۱۸۵۰ء۔ یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانے میں اہل بدعت کے برخلاف، متبعین سنّت کی تائید میں لکھا ہے۔ سرسید خود بھی غیر مقلّد تھے اور مقلدین کو بدعتی سمجھتے تھے۔

(۸) نمیقہ در بیان مسئلہ تصوّر شیخ، مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے، جس میں تصور شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلہ محبت خدا و محبت و رحمت الٰہی بتایا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ مشائخ نقشبندیہ جن کے تصور شیخ کو سرسید وسیلہ محبت الٰہی بتاتے ہیں، وہ سب کے سب اہل تقلید تھے۔ یعنی سرسید ان کے اصل تصوف کو صحیح مانتے ہیں۔ لیکن ان کے اصول تقلید کو غلط جانتے ہیں۔

(۹) سلسلۃ الملوک، مرتبہ ۱۸۵۲ء۔ یہ ان راجاؤں اور بادشاہوں کو مختصر

مگر مفید و صحیح فہرست ہے جو دہلی میں پانچ ہزار برس سے فرماں روا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس میں راجہ جدھشٹر سے ملکہ وکٹوریہ تک ۲۰۲ بادشاہوں کا حال نقشہ و جدول کی صورت میں لکھا ہے۔ جواب آثار الصنادید کے تیسرے ایڈیشن میں شامل ہے اور دوسرے میں بھی تھی۔

(۱۰) قول متین در ابطال حرکت زمین۔ اس رسالہ میں قدیم خیالات کے مطابق سرسید نے زمین کی حرکت کو غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن بعد کو حرکت زمین کے قائل ہوگئے تھے اور اس کو یقینی جانتے تھے۔

(۱۱) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار، مترجمہ ۱۸۴۶ء۔ سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ فرید الدین نے "پرکار تناسبہ" کے اعمال پر جو انھوں نے خود سوچ سوچ کر نکالے تھے، فارسی میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ سرسید نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا ترجمہ اردو میں کیا، اور مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔

(۱۲) سیرت فریدیہ۔ سرسید نے یہ کتاب اپنے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین کے حالات میں لکھی ہے۔ اس میں اپنے بچپن کے حالات بھی درج کئے ہیں۔

(۱۳) تاریخ ضلع بجنور۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں سرسید صدر امین ہو کر بجنور گئے۔ وہاں کلکٹر کی فرمایش سے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی۔ کلکٹر نے اس کو گورنمنٹ میں بھیجدیا، ابھی وہاں سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہوگیا۔ اور وہ غالباً آگرہ میں غدر کے سبب سے تلف ہوگئی۔

(۱۴) تصحیح آئین اکبری۔ شہنشاہ مغلیہ اکبر اعظم (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے وزیر و مشیر ابو الفضل (متوفی ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء) نے بادشاہ کے اصول و طریق سلطنت پر "آئین اکبری" لکھی تھی۔ اس کی فارسی زبان بالکل نئے طرز کی تھی، جس میں عربی کے الفاظ کم تھے۔ اور اسلوب بیان دشوار فہم تھا کاتبوں کی بے پروائی سے اس کتاب میں غلطیاں بہت تھیں۔ سرسید نے بجنور میں ایک تاجر دہلی

حاجی قطب الدین کی فرمائش سے آئین اکبری کی تصحیح کی پہلی اور تیسری دو جلدیں ۱۸۵۶ء میں شائع ہو گئیں۔ دوسری جلد کی تصحیح میں دشواریاں تھیں۔ اس لئے اس کو موخر رکھا تھا۔ جب اس کی صحت مکمل ہوئی اور مطبع میں بھیجی گئی تو غدر ہو گیا۔ اور وہ ضائع ہو گئی۔ اس کی پہلی جلد خاکسار راقم کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ دہلی کے نامور لوگوں نے آئین اکبری پر تقریظیں⁵ لکھی تھیں۔

۵ مولانا صہبائی، مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ کے علاوہ مرزا غالب نے بھی منظوم تقریظ مثنوی کی صورت میں لکھی تھی۔ اہل ہند کی فارسی انشا پردازی سے نفرت و تحقیر غالب کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اور انگریز پرستی کو انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اس لئے "آئین اکبری" کی تعریف کرنا ان کے خلافِ آئین تھا۔ چنانچہ اپنی تقریظ منظوم میں سر سید کی رائے تصحیح کو ننگ وعارِ ہمت والا بتایا ہے۔ آئینِ اکبری کو "متاع کس مخر" کہا ہے۔ اس کے طرز تحریر سے اپنی انشا پردازی کو کنایتہً "خوشتر" بتایا ہے۔ سر سید کی اس کوشش کو "مردہ پروردن" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اکبر بادشاہ کے آئین و اصول حکمرانی کے مقابلے میں انگریزوں کی ریل، دخانی جہاز، تار برقی، بجلی کی روشنی وغیرہ کو سراہا ہے۔ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:-

مژدہ یاراں را کہ این دیرین کتاب — یافت از اقبالِ سید فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی — کہنگی پوشید تشریف نوی
دیں کہ ہر تصحیح آئین رائے اوست — ننگ دعار ہمت والائے اوست
کس مخر باشد بگیتی این متاع — خواجہ را چہ بود امید انتفاع
گر ز آئیں می رود با ما سخن — چشم بکشا اندریں دیر کہن
صاحبانِ انگلستان را نگر — شیوہ و انداز ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — انچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد — گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
علتک گردوں بگرداند دخاں — نرہ گاو واسپ را ماند دخاں
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند — حرف چوں طائر بہ پرواز آورند

(باقی صفحہ ۲۷۳ پر)

(۱۵) تاریخ سرکشی بجنور، مراد آباد آکر لکھی۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات و واقعاتِ غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقید تاریخ نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس میں بہت سی تحریریں اور یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ | شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
طرز تحریرش اگر گوئی خوش است | نے فزوں از ہرچہ می جوئی خوش است
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است | گرمرے ہست افسرے ہم بودہ است
مُردہ پروردن مبارک کار نیست | خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

سرسید نے یہ تقریظ نہیں چھپوائی اور یہ کہہ کر غالب کو واپس کر دی کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں۔ غالب کے کلیات فارسی میں چھپی ہوئی ہے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ جب سے سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا غالب سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے، اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا اتفاق سے مرزا غالب مارچ ۱۸۶۰ء میں رامپور سے دہلی کو جاتے ہیں مراد آباد اُترے۔ سرسید مراد آباد میں صدر الصدور تھے۔ لیکن اسی حجاب کے سبب سے غالب نے ان کو اطلاع نہ دی تھی اور سرائے میں ٹھہر گئے تھے سرسید کو معلوم ہوا تو فوراً سرائے میں پہنچے اور مرزا غالب کو مع اسباب اور ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آئے، مرزا پالکی سے اُترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اُٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سرسید نے کہا آپ خاطر جمع رکھئے میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا، بھئی مجھے دکھا دو، تم نے کہاں رکھی ہے۔ انھوں نے کوٹھری میں لیجا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ میں بوتل اُٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی لئے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے ؎

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر می کنند | چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

سرسید ہنس کے چُپ ہو رہے، اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی رفع ہو گئی۔ مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دہلی چلے آئے۔

سرسید ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لئے مواد جمع کرتے رہے تھے۔ ایسی حالت میں جبکہ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، انگریزی عملداری بالکل اُٹھ گئی تھی، لوگوں کے گھر بار لُٹ رہے تھے، اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے، وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے۔

(۱۶) رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ مراد آباد ہی میں یہ رسالہ بھی ۱۸۵۸ء میں لکھ کر چھپوایا۔ یہ بھی سرسید کی ملکی خیر خواہی، قومی محبت اور اخلاقی جرات کی یادگار ہے۔ ہنگامۂ غدر میں گورنمنٹ عموماً اہلِ ہند سے اور خصوصاً مسلمانوں سے بدظن ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ تباہیاں مسلمانوں پر آئی تھیں۔ سرسید نے اس کتاب میں غدر کو حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کا نتیجہ ثابت کیا ہے۔ اور تمام بدتدبیریاں اور سختیاں گنائی ہیں۔ سرسید نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اہلِ ہند نے سرکشی کے لئے پہلے سے کوئی سازش نہ کی تھی، مسلمانوں میں بھی جہاد کی کوئی سازش نہ تھی، اودھ کی ضبطی بھی اس عام فساد کا باعث نہ تھا، فوج میں باہم بغاوت کی صلاح بھی نہ تھی، باغی فوج کی پہلے سے بادشاہ دہلی سے بھی سازش نہ تھی، بلکہ بہت سی باتیں برسوں سے جمع ہو رہی تھیں، جن سے ہندوستانیوں کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انتظام حکومت، قانون سازی اور مشورہ و تدبیر میں ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہ تھا، اور حاکم و رعایا کے درمیان تبادلۂ خیالات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ گورنمنٹ کے احکام و قوانین کی مصلحت کو اہلِ ہند نہ سمجھ سکتے تھے بلکہ برعکس سمجھ لیتے تھے، اور ان کو سمجھانے کا کوئی وسیلہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ گورنمنٹ نے جو انتظامات کئے، اور جو قانون نافذ کئے ان سے ہندوستانیوں کو غلط فہمی پیدا ہوتی، اور انھوں نے اس کے دو نتیجے سمجھے۔ ایک یہ کہ سرکار ہندوستانیوں کو مفلس و تباہ کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے مذہب میں مداخلت کرنا اور ان کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ یہ مسالہ مدتوں سے جمع ہو رہا تھا۔ اس کے بھڑک اُٹھنے کے لئے کارتوس کاٹنے کا حکم اور نافرمانی پر میرٹھ کی فوج کو پابہ زنجیر کر کے رسوا کرنا، شتابہ بن گیا۔ بہرحال غدر کی معلومات کے متعلق سرسید کا یہ رسالہ آج بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ سرسید اگر اس کی مطبوعہ

کاپیاں ہندوستان میں عام طور پر شائع کر دیتے، تو اہل ہند میں از سر نو جوش پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا، لیکن انھوں نے یہ دانشمندی کی کہ چھپوانے کے بعد اسکی ایک جلد گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجدی، اور چند جلدیں اپنے پاس محفوظ و مخفی رکھیں باقی کچھ کم پانسو جلدیں سیدھی ولایت کو گورنمنٹ کے پاس بھیجدیں۔ وہاں اس کے ترجمے ہوئے، اس پر بحثیں ہوئیں۔ اکثر نے اس رسالہ کو سر سید کی خیر خواہی پر محمول کیا۔ لیکن بعضوں نے اس کی بنا پر سر سید کو غدار اور مفسد قرار دیا۔ اور گورنمنٹ سے سر سید کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ سر سید نے شائع کرنا کیا، کسی کو یہ کتاب دکھائی تک نہیں، تو وہ حیران رہ گئے۔

(۱۷) لایل محمڈنز آف انڈیا (ہندوستان کے وفادار مسلمان) - چونکہ غدر کے بعد گورنمنٹ کی چشمِ غضب سب سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھی۔ ان کی غداری کا ہر جگہ چرچا تھا، اور وفاداری کا کہیں ذکر نہ تھا، اس لئے سر سید نے مسلمانوں کے حالات کا ایک سلسلہ اس نام سے شروع کیا، اور اس کو اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ۳، ۴ صفحے چھپ کر اور شائع ہو کر رہ گئے۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں جاری ہوا، اور تین نمبروں کے بعد سنہ ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

(۱۸) تحقیق لفظ نصاریٰ۔ غدر کے بعد بعض مسلمانوں کی ایسی تحریریں گورنمنٹ کو دستیاب ہوئیں جن میں انگریزوں کو "نصاریٰ" لکھا تھا۔ انگریزوں نے اس لفظ کو اپنی توہین و تحقیر سمجھا، اور یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسٰی علیہ السلام کو حقارت سے ناصری (یعنی ناصرہ گاؤں کا رہنے والا) کہتے ہیں، اسی طرح مسلمان ہم کو "نصاریٰ" کہتے ہیں۔ اس بنا پر گورنمنٹ نے بعض مسلمانوں کو سزائیں دیں۔ سر سید کو جو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے زمانۂ قیام مراد آباد میں لفظ نصاریٰ کی تحقیق پر مختصر رسالہ لکھ کر شائع کیا۔ اس میں ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ ناصری سے مشتق نہیں ہے، بلکہ نصر سے مشتق ہے۔ قرآن میں حضرت عیسٰیؑ کو ناصری نہیں کہا گیا، نہ "قریۂ ناصرہ" کا

کہیں ذکر ہے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں عیسائی خود اپنے آپ کو "نصاریٰ" کہتے تھے۔ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار نے لکھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے، کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یورپین افسر نے جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی! اس رسالہ کی اشاعت کے بعد کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔

(۱۹) تصحیح تاریخ فیروز شاہی۔ مراد آباد ہی میں سر سید نے ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی" کی تصحیح کی۔ یہ مورخ برن (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا تھا، بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں مشہور تھا۔ اس لئے اس کی یہ تاریخ، جو فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت کے متعلق ہے، بہت معتبر اور مستند ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے لئے سر سید نے چار مختلف نسخوں سے مقابلہ کرکے تصحیح کی، اور سوسائٹی نے ۱۸۶۲ء میں شائع کی۔

(۲۰) تبیین الکلام۔ یہ تصنیف بھی سر سید کی قومی محبت، تدبّر و دانشمندی، شوق علم و تحقیق، ہمّت و استقلال کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ کہاں سر سید اور ان کی قدیم رنگ کی تعلیم اور سرکاری و قومی مصروفیتیں، اور کہاں توریت و انجیل کی تفسیر! لیکن بقول مولانا حالی کے "مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمتِ دشوار"۔ سر سید نے غدر کے بعد جتنی کتابیں لکھیں، اُن سے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ عیسائی قوم اور انگریزی حکومت کے دل سے اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی اور غدّاری کا خیال رفع کیا جائے، دوسرے یہ کہ اسلام کی ہمہ گیری و رواداری اور مطابقتِ عقل و سائنس کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرکے ان میں بیداری، روشن خیالی اور آزادی رائے پیدا کی جائے، اور انگریزوں سے میل جول، ان کے علوم و فنون، اور ان کی حکومت سے فائدہ حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ انہی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر سر سید نے پہلے انجیل کی تفسیر

اور پھر قرآن کی تفسیر لکھی "خطبات احمدیہ" اور اس کے مختلف مقالے جو علٰحدہ شائع ہوئے، وہ بھی اسی کام کے لئے تھے۔ بلکہ ان کے صدہا مضامین "تہذیب الاخلاق" کا بھی بیشتر یہی مُدعا تھا۔

غدر سے پہلے جب دہلی و آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جابجا مباحثے ہونے لگے، اس وقت سرسید کو خیال آیا کہ اسلام کی حمایت میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں۔ عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مخاصمانہ طریقہ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے، مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہوا، وہ اسلام کو بدستور ظلم، خونریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے، اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لئے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضرور تھا، اسی طرح یہ بھی ضرور تھا کہ مناظرہ کے مخاصمانہ طریقہ کو چھوڑ کر آشتی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے، اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لئے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے۔ اور جو امور فی الواقع دونوں مذہبوں میں موافق یا مخالف ہیں۔ ان کو اپنی اپنی جگہ صاف طور پر بیان کیا جائے اور اس طرح اس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہو گئی ہے رفع کیا جائے[۵]۔

۵ یہ عبارت بجنسہ مولانا حالی کی "حیات جاوید" سے منقول ہے، دوسری کتابوں کے متعلق بھی اس سے پہلے اور بعد کی اکثر عبارتیں اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ البتہ کہیں مقدم و مؤخر اور مختصر کردی گئی ہیں۔

اس تفسیر کے لئے عیسائی مذہب، بائبل کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے واقفیت ضروری تھی۔ اور بہت کچھ سامان درکار تھا۔ یہ سرسید کی بے نظیر ہمت و محنت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں خریدیں، ایک انگریزی خواں نوکر رکھا جو ان کا ترجمہ سناتا تھا، کتب احادیث و تفسیر سے سندیں بہم پونہچانے کے لئے ایک عربی داں عالم کو نوکر رکھا، ایک یہودی سالم نام کو نوکر رکھ کر عبرانی زبان پڑھنی شروع کی۔ مولوی عنایت رسول چریاکوٹی عربی و عبرانی کے بہت بڑے عالم تھے، ان سے مدد لی، اپنی اردو تحریر کو انگریزی میں ترجمہ کرانے کے لئے ایک یورپین کو سو روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا۔ کئی ہزار روپیہ کا پریس رڑکی سے منگوایا، اور اس کے لئے اردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے چنانچہ تالیف کے ساتھ ساتھ طباعت بھی شروع ہوگئی۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری خط میں اور اس کا اردو ترجمہ اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ دوسرے کالم میں اسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں۔ بڑی محنت اور تحقیق و تلاش سے لکھے ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت باہمی تنافر مذہبی کے دور کرنے کی تمہید ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی ناقدردانی و مخالفت اور طباعت کی کثرت مصارف کے سبب سے دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔ ایک میں دس مقدمے اور ردود تھے ہیں۔ دوسری میں تفسیر۔ اس کتاب کا پورا نام سرسید نے یہ لکھا ہے:-

"تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام" ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۸ھ میں غازی پور میں شائع ہوئی۔ (اس کا نمونہ آئندہ درج کیا جائے گا)

(۲۱) علاج ہومیوپیتھک۔ بنارس میں سرسید نے ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کے رائج کرنے کی کوشش کی، شفاخانہ قائم کیا۔ اسی کے سلسلے میں ایک رسالہ بھی

۱۸۶۷ء میں لکھ کر شائع کیا۔

(۲۲) احکام طعام اہل کتاب۔ مسلمانوں کے دلوں سے انگریزی معاشرت کی نفرت دُور کرنے، اور انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کی عادت ڈالنے کے لئے یہ رسالہ لکھا، اور قرآن وحدیث سے اہل کتاب کے کھانے کو جائز ثابت کیا۔ سرسید نے خود پہلے ہی سے انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے حسب عادت اس پر بھی بہت لے دے کی۔

(۲۳) سفرنامہ لندن۔ سرسید نے اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں پیش آیا ہے قلمبند کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کئے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

(۲۴) خطبات احمدیہ۔ سرسید کی مذہبی خدماتِ ماضی و مستقبل میں بہترین خدمت یہ تصنیف ہے۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں لکھیں "اسباب بغاوت"۔ "تبئین الکلام" وغیرہ، وہ بھی قوم و مذہب کے سوز و درد کا نتیجہ تھیں، لیکن ان میں دُنیا کے مقاصد و فوائد کا خیال بھی شریک تھا۔ "خطبات احمدیہ" خالص اسلامی خدمت تھی۔ اس کے بعد سرسید نے تفسیر القرآن لکھی، اور وہ بھی دینی خدمت، اور اس سے زیادہ مہتم بالشان خدمت تھی۔

"خطبات احمدیہ" کی ضرورت و اہمیت اور اس کی تالیف کے لئے سرسید کی کوشش و کاوش کا اندازہ مولانا حالی کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا، اُن کی منادیوں میں اخباروں اور رسالوں میں زیادہ تر بوچھار اسلام پر ہوتی تھی، اسلام کی بُرائیاں اور بانیِ اسلام پر نکتہ چینیاں انکی تقریر و تحریر کا موضوع تھا۔ اور بعض جاہل و مفلس مسلمان ان کے دام میں آجاتے تھے۔ دوسرے، مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم

نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمراں قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے، اور انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغاوت وفساد کا سرچشمہ اور امن وعافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

تیسرے[۳] مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم وفنون کی طرف سے خطرہ تھا، جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتے جاتے تھے اور جن سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا، یہاں تک کہ خود سرسید کو یہ تعلیم پھیلانی پڑی۔ اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کے عقائد واعمال اور اصول وقوانین کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہو جاتے۔

سرسید نے ان مقاصد کی طرف پہلے ہی بار اس وقت توجہ کی تھی جب مراد آباد میں "تفسیر انجیل" کی بنیاد ڈالی۔ پھر جب سر ولیم میور (لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب) کی کتاب لائف آف محمدؐ چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پونہچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کی بیخ کنی میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت سرسید کی بے چینی اور جوش وخروش کا عجب حال تھا۔ آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ غدر میں اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے، اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لئے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو ان کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان کے بعض دوست جو سرکاری عہدہ دار اور سر ولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے، سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے تھے، مگر سرسید نے ان کا کہنا نہ مانا، اور ولایت پونہچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں سے کتابیں اور اطلاعیں بہم پونہچائیں، عربی کی کتابیں مصر وفرانس وجرمنی سے منگائیں، لیٹن اور انگریزی کی پرانی نایاب کتابیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں، اور شب وروز کی لگاتار محنت سے بارہ[۱۲] مقالات لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام

سے ۱۸۷۰ء میں چھپوا کر شائع کئے۔

اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سرسید کے دل میں تھا، اور جو مالی مشکلات اس کے شائع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت اس کے لکھنے میں ان کو کرنی پڑی، اس کا کسی قدر اندازہ ان کے خطوں سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کو لکھے تھے۔ مختلف خطوں کے اقتباسات یہ ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "ولیم میور صاحب کی کتاب کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا، اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا، اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لایق ہو جاؤں تو بلا سے...... لکھتے ہیں شب و روز مصروف ہوں، اسکے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے، سود اور روپیہ میں ادا کردوں گا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلّی لکھا ہے، اور لکھدیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیجدو۔ کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہوگیا ہے، خدا مدد کرے........ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے۔"

غرض چار ہزار کے قریب روپیہ خرچ ہوا، اور کتاب چھپ گئی۔ اس کی ان کو بے انتہا خوشی اور فخر تھا۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ "اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا"...... "سر ولیم میور صاحب اور اور مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈالدو، وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو، اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام، ورنہ میرا نام نہیں۔" ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے، اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں۔"

اس کتاب کے متعلق انگریزوں کی رائے سب سے زیادہ قابل توجہ ہے،

اس لئے کہ انھی کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ ریورنڈ ہوپر پرنسپل ڈوونٹی کالج لاہور کہتے ہیں کہ "مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خاں کو کافر، ملحد اور بدمذہب سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔"

مسٹر آرنلڈ مصنف "پریچنگ آف اسلام" لکھتے ہیں کہ "ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا۔ لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر لکھ کر شائع کی ہو۔" لندن کے ایک اخبار میں کسی انگریز نے لکھا تھا کہ "عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہئے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔"

سرسید نے ولایت سے آکر خطباتِ احمدیہ کو تفصیل کے ساتھ مرتب کیا، اور اردو میں شائع کیا۔ اردو کتاب انگریزی کتاب سے بہت زیادہ طویل و مفصل ہے۔ اس کا نمونہ آگے درج کیا جائیگا۔ اس سلسلے میں سرسید کی یہ خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں کہ لندن پہنچکر ان کو معلوم ہوا کہ وہاں کے ایک مصنف جان ڈیون پورٹ نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں ایک کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن لکھی ہے۔ سرسید نے اس کے مضامین سنے اور بہت پسند کئے۔ مصنف کو اتنی استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے چھپواتا اور لندن کا کوئی پبلشر اس کے چھاپنے کی حامی نہ بھرتا تھا۔ سرسید نے فوراً روپیہ کا بندوبست کر کے وہیں اس کتاب کو چھپوا دیا اور اس کی کئی سو جلدیں ہندوستان کو بھیجدیں۔ یہاں اس کا ایک ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن دہلوی نے کیا، اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے، دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہو گئے۔

انگلستان کے ایک اور ذی دقعت مصنف گاڈفری ہگنز کی کتاب جو اس نے کسی زمانے میں اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی۔ سرسید نے لندن میں

ایک جرمن کتاب فروش کی دکان سے دس گنی قیمت پر خریدی، اور ہندوستان میں آکر ان لوگوں کے لئے جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے، پانسو روپیہ خرچ کر کے اس کا اردو ترجمہ مولوی محمد احسن پروفیسر بریلی کالج سے کرا کے حمایت الاسلام کے نام سے شائع کر دیا۔

(۲۵) رسالہ ابطال غلامی۔ یہ مضمون اگرچہ بقدر ضرورت "خطبات احمدیہ" میں لکھا جا چکا تھا، مگر ولایت سے آنے کے بعد سرسید نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول "تہذیب الاخلاق" میں شائع کیا، اور پھر علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ علمائے اسلام کو تو یہ بھی احساس نہ تھا کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب و افریقہ میں جاری ہے، اس میں کیا برائی ہے اور وہ اصول اسلام کے موافق ہے یا نہیں۔ اور اس کی بھی پروا نہ تھی کہ عیسائی قومیں اسلام پر بڑا طعن کرتی ہیں کہ اس نے لونڈی غلام بنانا جائز کیا ہے۔ اگرچہ اٹھارویں صدی تک یورپ و امریکہ میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی، اور وہاں غلاموں کی جو حالت زار تھی، اس بے رحمی اور سنگدلی کی اسلام میں کہیں نظیر نہیں پائی جاتی۔ لیکن انیسویں صدی سے وہاں غلامی کا بالکل انسداد ہو گیا تھا، اس لئے وہ لوگ اسلام پر اعتراض کرنے میں دلیر تھے۔ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہایت مدلل طریقے سے ثابت کیا کہ اسلام نے اول اول غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور آزاد کرنے کی ترغیب دی اور پھر اس رسم کو بالکل ممنوع کر دیا۔ سرسید کے بعض دعووں اور دلیلوں میں علمائے اسلام سے اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۲۶) تفسیر القرآن۔ سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں کمال جسارت سے کام لیا۔ ان کے پیش نظر وہی خطرے تھے جو "خطبات احمدیہ" کے لکھنے کا باعث ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نوجوان مسلمان مغربی فلسفہ و سائنس پڑھ کر اسلام کے ہر عقیدہ قانون کو عقل سے جانچیں گے، اور عقل کے موافق نہ پانے کے سبب سے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے، اس لئے سرسید نے یہ طے کر لیا کہ اسلام کے ہر عقیدے ہر قانون ہر حکم، ہر قصے کو عقل کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اور جو اس کسوٹی پر کھرا نہ نکلے اسکو

ٹکسال باہر کر دیا جائے۔ سرسید کا یہ خیال صرف ایک حد تک درست تھا، یعنی اسلام کی بہت سی باتیں عقل انسانی اور قدرت کے قوانینِ معلومہ ومسلّمہ کے بالکل موافق ہیں۔ بلکہ جملہ مذاہب عالم میں، صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس کی صداقت وفضیلت کی علم وعمل اور عقل وتجربہ نے ہمیشہ تصدیق کی ہے، لیکن نفسِ مذہب ایسی چیز ہے جس میں بعض اَن دیکھی اور بن سمجھی باتوں کے ماننے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اور اسلام بھی اس کُلّیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

سرسید کا تفسیر القرآن میں تمام معجزات اور خلاف عادت اور غیب کی باتوں سے انکار کرنا، ایمان بالغیب کی غلط تاویل کرنا، جنوں سے صحرائی اقوام مراد لینا وغیرہ وغیرہ اصلاحی نظر سے غیر ضروری تھا، اور اسلامی نگاہ میں غلط فہمی پر مبنی۔ چنانچہ مولانا حالی کی بھی یہی رائے ہے۔ کہتے ہیں:- "آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا وہ حد اعتدال سے متجاوز ہوگیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سُن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیوں کر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔" سرسید نے ایمان بالغیب کی اہمیت وضرورت پر نظر نہیں کی۔ انھوں نے یورپ کے ایک فلاسفر کولٹن کا یہ مقولہ نہ سُنا تھا کہ "وہ شخص جو صرف ان چیزوں پر اعتقاد رکھتا ہے جن کو وہ پوری طرح سمجھ لیتا ہے، یا تو اُس کا سر بہت لمبا ہے۔ یا اُس کا مذہب بہت چھوٹا ہے۔" اس قسم کی باتوں کے علاوہ سرسید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے اور مسائل کی تشریح وتوجیہ میں البتہ کارنمایاں کیا ہے۔ مثلاً قصص قرآنی پر عیسائیوں کو اعتراض تھا کہ غلط بیان ہوئے ہیں۔ یا بعض واقعات کی سرے سے کوئی اصل ہی نہیں۔ سرسید نے ہر ایسے قصے یا واقعہ کا بائبل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن و بائبل کی تطبیق کی ہے، یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے، اور جس قصے کا پتا موجودہ بائبل میں نہیں لگا اس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔ اسی طرح ارکان وفرائض اسلام نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مصالح بیان کئے ہیں۔ جہاد اسلام کی تشریح اس قدر واضح ومدلّل طریقے سے کی ہے کہ اس پر انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسی طرح تعدد ازدواج، طلاق، غلامی وغیرہ قوانین واحکام

کی تفسیر قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔

اگر سرسید بجائے پوری تفسیر اور آیت آیت کی تشریح و توجیہ کے، صرف ایسے ہی مسائل پر الگ الگ مضامین لکھ دیتے، تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بہرحال ان کی نیت بخیر تھی، ان کے خلوص و صداقت میں کوئی کلام نہیں، اس لئے ان کو خطائے اجتہادی پر بھی ثواب ملے گا۔ سرسید پر اس سے پہلے بھی کفر کے فتوے لگائے جا رہے تھے، یہ تفسیر سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا۔ انھوں نے کافر گروں کو اپنے اس شعر سے جواب دیا ہے:-

خدا دارم، دلِ بریاں زعشقِ مصطفیٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

تفسیر القرآن کی پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی، اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اور جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغامِ اجل آ پہنچا۔ اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۂ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۂ انبیا تک، اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل تفسیر السموات، ازالۃ الغین عن قصۃ ذی القرنین، ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم وغیرہ، جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہئے، سرسید سے یادگار رہ گئے۔

(۲۷) النظر فی بعض المسائل۔ چند مسائل اسلامی و قرآنی پر بحث کی ہے۔

(۲۸) سفر نامہ پنجاب۔ علی گڈھ کالج کی کوشش کے سلسلے میں سرسید نے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کا سفر کیا۔ وہاں انھوں نے جو لکچر دئیے اور تقریریں کیں وہ سب برجستہ و برمحل زبانی تقریریں تھیں، لیکن سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلمبند ہو گئے۔

(۲۹) جواب اُمّہات المومنین۔ یہ گویا سرسید کی آخری تصنیف ہے۔ کسی دیسی عیسائی نے حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے تعدّد ازدواج پر اعتراض کیا، اور "اُمّہات المومنین" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔ سرسید نے باوجود ضعف و مرض کے اس کا جواب لکھا۔

(۳۰، ۳۱) انشاء اللہ۔ نادان خداپرست۔ یہ دو مضمون قصہ کے طور پر سرسید نے لکھے ہیں "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہونے کے بعد ان کو الگ بھی چھاپ دیا گیا۔

(۳۲) مضامین تہذیب الاخلاق۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ سرسید کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" تین دفعہ کرکے گیارہ بارہ برس جاری رہا اس میں اور لوگوں نے بھی مضامین لکھے، لیکن سب سے زیادہ سرسید کے مضامین ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے سب مضامین علیحدہ چھاپ دیئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی سرسید کی ایک تصنیف ہے۔ یہ رسالہ اردو کا پہلا رسالہ نہ تھا، اس سے پہلے درجنوں نکل چکے تھے اور نکل رہے تھے۔ لیکن مضمونوں اور مضمون نگاروں دونوں کے لحاظ سے ہندوستان کا بہترین پرچہ تھا۔ سرسید کے مجموعہ مضامین میں زبان، طرز بیان، مضمون کی ایسی رنگا رنگی، اتنی جدت، اس قدر دلکشی ہے کہ بغیر مطالعہ کے اندازہ دشوار ہے۔ اس میں مذہبی، قومی، اخلاقی، اصلاحی، ہر قسم کے مضامین ہیں۔ اور انکے اسلوب نگارش میں فکر و تخیل، منطق و فلسفہ، جوش و خروش، متانت و جزالت، شوخی و ظرافت ہر رنگ کا حسب موقع جلوہ ہے۔ بعض نمونے پیش کئے جائیں گے۔

(۳۳) خطوط سرسید۔ سرسید کے پوتے مرحوم سر راس مسعود (نواب مسعود جنگ) متوفی ۱۹۳۷ء نے چند سال ہوئے ان کے خطوط کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ غالب کے بعد سرسید پہلے شخص ہیں جن کے خطوط زبان و ادب اور علم و عمل کے نقطۂ نظر سے دلکشی اور افادہ کا گنجینہ ہیں۔ ان میں پرائیوٹ خط بھی ہیں اور قومی و ملکی و مذہبی معاملات کے متعلق بھی۔ صرف ان خطوں سے ہی سرسید کی سیرت و اخلاق کا صحیح و اصلی نقشہ مرتب ہو سکتا ہے۔

(۳۴) مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ سرسید کی تمام تقریریں یکجا شائع کر دی گئی ہیں۔

سرسید کا طرز تحریر اور اس کے نمونے | (۱) دورِ قدیم۔ سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے غالباً ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں دہلی سے "سید الاخبار" جاری کیا۔

سرسید نے سب سے پہلے اس میں مضامین لکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۵ء تک متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سب کا اسلوب تحریر قدیم ہے۔ یعنی الفاظ کی بے محل تقدیم و تاخیر یا قواعد سے بے پروائی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں "وہ تحریر یا تقریر کی رُو میں گرامر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں، بالکل آزاد تھے"۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ یہ بے پروائی و آزادی فی نفسہ پسندیدہ، ضروری اور قابل تقلید ہے۔ بلکہ سرسید کے زمانے میں قواعد زبان کی پابندی سخت نہ تھی، الفاظ کی بے ترتیبی عام تھی، اُردو فقروں پر اکثر دھوکا ہوتا تھا کہ فارسی کا ترجمہ ہیں۔ مضاف الیہ کو اکثر مضاف کے بعد لکھتے اور بولتے تھے، متعلقات فعل کو فعل کے بعد رکھ دیتے تھے۔ بعض فارسی اسلوب اور فارسی محاورات کے ترجمے اس زمانے میں مستعمل تھے، جو اب نہیں ہیں۔ یہ سب باتیں سرسید کی تحریروں میں بھی ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں کہ ان کو اس کا احساس نہ تھا، اصل میں عادت یوں ہی تھی۔ ان کے ہم عمروں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو یہی عادت نہ ہو۔ غالب کے رُقعے خالص ادبی ٹکڑے ہیں، لیکن وہاں بھی غالب کی اس عادت کی یادگاریں موجود ہیں۔ یہ عادت رفتہ رفتہ چھوٹی ہے۔ سرسید کے "رسالہ اسباب بغاوت" میں جابجا ایسے فقرے ہیں، تہذیب الاخلاق کے مضامین میں بہت کم ہیں۔ "اسباب بغاوت" کا ایک فقرہ ہے "جس کی (یعنی انگریزی گورنمنٹ کی) ابتدا ۱۷۵۷ء وقت شکست کھانے سراج الدولہ کے پلاسی پر سے شمار ہوتی ہے"۔ یہ تعقید بعد کو تقریباً جاتی رہی۔ "وہ" کی جگہ "وے" انھوں نے بعد کو بہت کم کر دیا تھا۔ "کرکے" کی جگہ "کرکر" آخر تک لکھتے بولتے رہے۔ ان لفظوں میں بھی یہ بات نہ تھی کہ التزام کے ساتھ بولتے تھے۔ بلکہ جیسا چاہا کہہ دیا۔ اسی طرح "چونکہ" کی جگہ "جو کہ" لکھتے تھے۔

اسباب بغاوت ہند کی تحریر کا نمونہ یہ ہے:۔

"لیجس لیٹف کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا

کہ گورنمنٹ کو اصلی مضرت قوانین وضوابط کی جو جاری ہوئے، بخوبی معلوم نہیں ہوسکی، اور اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کو واجبات سے تھا، ملحوظ نہیں رہیں، اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی، بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہوا۔ گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی۔ جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی، ہندوستانیوں کو بسبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اور لہٰذا اُس تجویز سے واقف نہ تھے، اس کی بنیاد معلوم نہوتی۔ اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے وطنوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔ اور وہ بعض باتیں جو درحقیقت گورنمنٹ سے برخلاف رواج اور مخالف طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں قطع نظر اس سے کہ وہ فی نفسہ اچھی نہیں یا بُری، زیادہ تر ان کے غلط خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پونہچ گئی کہ رعایائے ہندوستان ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی، اور پھر اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی، اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں، اور کل ہیں تو پرسوں نہیں۔ اور کوئی شخص ان کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے اس خیال کو دور کرنے والی نہ تھی جبکہ رعایا کا گورنمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہئے، تو پھر کیا توقع ہوسکتی ہے وفاداری کی ایسی گورنمنٹ کو ایسی رعایا سے، اور جبکہ ہماری گورنمنٹ درحقیقت ایسی نہ تھی تو ان غلط خیالات کا ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو رنج کہ ان کے دل پر تھا اس کا علاج نہ ہونا، صرف اسی سبب سے تھا کہ لیجس لیٹیف کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے۔ اگر ہوتے تو یہ سب باتیں رفع ہوتی جاتیں۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف یہی ایک بات ہے جس نے اپنی بہت سی شاخیں پیدا کر کر تمام ہندوستان میں بیجا فساد کر دیا۔"

اس اقتباس میں سرسید کے طرز تحریر کے علاوہ ان کا نرم و گرم بیان، صاف گوئی، جرأت اور صحتِ رائے بھی قابل دید ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا وہ زمانہ (۱۸۵۸ء) ہے جب نتائج و مواخذات غدر سے امن بھی نہ ہوا تھا۔ اور یہ وہ تحریر ہے جو سیدھی ولایت بھیجنے کے لئے چھپوائی گئی تھی، چنانچہ سب سے پہلے لندن کی گورمنٹ نے دیکھی، ترجمہ کرائی اور اس پر رائے زنی کی۔ ۱۸۵۸ء کے بعد سرسید نے اپنی زندگی میں اس کو دوبارہ نہیں چھپوایا۔ پھر ۴۵ برس بعد علی گڑھ کالج کے "ڈیولی بک ڈپو" نے ۱۹۰۳ء میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا۔ وہی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے۔

آثار الصنادید کا اقتباس یہ ہے:۔

نشیمن ظل الٰہی یا سنگین تخت

"اس مکان کے بیچوں بیچ میں شرقی دیوار سے ملا ہوا سنگ مرمر کا تخت ہے چار گز کا مربع، اور اس پر چار ستون لگا کر بنگلے کے طور پر اس کی چھت بنائی ہے، اور آدمی کے قد سے زائد کرسی دی ہے، اس کے پیچھے ایک طاق ہے سنگ مرمر کا بنا ہوا، سات گز لمبا اور ڈھائی گز کا چوڑا، اس کو ہر ہر قسم کے چرند و پرند کی تصویریں عجب عجب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور اس میں ایک آدمی کی تصویر ہے جو دوتارہ بجا کر گا رہا ہے۔ ملک اٹلی میں جو فرنگستان میں واقع ہے، آرفیوس کلاونت کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اس کی آواز سن کر مست ہو جاتے اور اس کے گرد آبیٹھتے تھے۔ اسی ملک میں رفیل ایک مصور تھا کہ تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا۔ اس مصور نے آرفیوس کے گانے کی جو کہانی مشہور تھی۔ اس کے مطابق اپنے خیال سے ایک مرقع کھینچا تھا، اور چرند و پرند اس کے گرد گانا سننے کو بیٹھے ہوئے بنائے تھے۔ یہ مصور ۱۵۲۰ء میں مرا مگر یہ مرقع اس کا بنایا ہوا ملک اٹلی اور ولایت فرنگستان میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے، اور اب تک اس کی نقلیں موجود ہیں۔ وہی مرقع اس طاق میں پتھر کی پچیکاری میں کھودا ہے۔ پس یہ تصویر اسی آرفیوس کی ہے، اور چونکہ اس مرقع کا سوائے فرنگستان کے اور کہیں رواج نہ تھا،

اس سبب سے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی انگریز اٹلی کے ملک کا شریک تھا اس محراب کی بغل میں دروازہ ہے، اور اندر سے بھی آنے کا راستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ اکثر امیر میں سے جس کسی کو عرض کرنا ہوتا تھا، اس تخت پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا۔ یہ تخت اتنا اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا گلا تخت تک پہنچتا ہے۔"

یہ تحریر اسباب بغاوت سے چار سال پہلے (۱۸۵۴ء) کی ہے۔ اور اسی اسلوب کی ہے۔

(۲) دورِ جدید۔ غدر کے بعد جب سرسید نے اپنا مقصد حیات، مسلک زندگی اور لائحہ عمل متعین کر لیا۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے قومی و ملکی، مذہبی و معاشرتی، اصلاحی و اخلاقی علمی و تعلیمی خدمات شروع کیں، اس وقت سے ان کے فکر و قلم اور زبان و بیان کا اصلی جوہر اور حقیقی کمال نمایاں ہوا۔ ان سے پہلے کسی ایک شخص کے زبان و قلم سے اس قدر گوناگوں مضامین ادا نہ ہوئے تھے۔ سرسید کی مختلف موضوعات کی کتابیں، اخبار و رسالہ کے مضامین، پبلک تقریریں اور پرائیویٹ خطوط شاہد ہیں کہ ہر نوع کی بہتر سے بہتر تحریر کی بنیاد ڈالنے والے سب سے پہلے سرسید ہیں۔

سرسید کی تحریر میں زبان و محاورہ کی لطافت بیان کی سادگی و صفائی، استعارہ و تشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال و بے ساختگی، بیان کا جوش، طرز ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی، حسب موقع متانت و ظرافت، اس قدر کثرت صحت اور موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان سے پہلے کہیں نہ تھی، ان کے ساتھیوں میں ان سے بہتر نہ تھی، اور ان کے ہم زمانہ لوگوں میں اکثر انہی کے اتباع کی بدولت تھی۔ سرسید پیچیدہ سیاسی مسائل، باریک مذہبی نکات اور دشوار اصلاحی مباحث کو نہایت صفائی سادگی، بے تکلفی اور زور و قوت کے ساتھ بیان کر سکتے تھے۔ ان کی برجستہ تقریروں اور قلم برداشتہ تحریروں میں بھی وہی انداز پیدا ہے، جو غور و فکر سے لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین میں ہے۔ حسب موقع اسلوب بیان اختیار کرنا، شوخی و سنجیدگی سے

برمحل کام لینا، جذب و اثر پیدا کرنا ان کے لئے بالکل فطری و طبعی بات تھی۔ کسی خاص کوشش و ارادہ کو دخل نہ تھا۔ گویا ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی اور صحیح انداز خود بخود پیدا ہو جاتا تھا۔ جن الفاظ و محاورات کے بولنے کی ان کو عادت تھی بے تکلف ان کو استعمال کر دیتے تھے، یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ اہل زبان یا اہلِ دہلی کیا اور کس طرح بولتے ہیں، دقیق علمی، فلسفیانہ، سائنٹفک، تنقیدی مضامین اس قدر سلجھا کر بیان کرتے تھے کہ اس فن میں گویا ان کو اوّلیت حاصل تھی، بعض مضامین میں علمائے یورپ کی فکر و رائے پر تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ فضلائے عرب و عجم کی تحقیق پر نقد و نظر کی ہے، اپنے زمانے کے اہلِ قلم اور اپنے مخالفوں کے مباحث کی تنقیح کی ہے۔ خود سرسید کی تصانیف میں تاریخ و سیرت، مذہب و اخلاق، سیاست و حکمت وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔ ہر جگہ سرسید کا جوش بیان اور زور قلم نمایاں ہیں۔ اور انھوں نے اردو زبان میں ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی قابلیت ثابت کر دی ہے۔ جہاں ان کو اصابت رائے حاصل نہیں ہے وہاں بھی ان کا خلوص و دلسوزی ناقابل انکار ہے۔

مزاح و ظرافت سرسید کا فطری رنگ تھا۔ لیکن یہ موقع و محل پر صرف ہوتا تھا، خصوصاً پرائیویٹ خطوط میں یا مخالفوں کے مباحثہ میں اس رنگ کی شوخی نہایت دلچسپ اور کارگر ہے۔ جذب و اثر پیدا کرنے کے موقع پر کوئی روحانی قوت ان کے اندر کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب ان کے مختلف اسالیب بیان کے نمونے انکی تصانیف لکچروں اور خطوں سے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) تبیین الکلام (تفسیر توراۃ و انجیل) مطبوعہ ۱۸۶۲ء کے مقدمۂ تاسعہ میں لکھتے ہیں:۔

"اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک لفظ یا فقرہ کئی معنی رکھتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں دوسری زبان کا ایسا لفظ نہیں ہوتا جس سے وہ سب معنی حاصل ہوں، اس لئے مترجم بمجبوری یا تو اس کا ترجمہ کسی ایک پہلو پر کرتا ہے، یا صرف بموجب اپنی رائے اور اپنے

اعتقاد اور اپنے مسلمات کے اس کا ترجمہ کر دینا ہے جو درحقیقت کلام الٰہی کی وسعت کو ناواجب تنگی میں ڈالتا ہے، کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ جب تک بذریعہ الہام کے کوئی خاص معنی کسی کلام الٰہی کے مقرر نہوئے ہوں، اس وقت کلام الٰہی سے جس قدر مطالب ہوں اُن سب کو سمجھے اور سب پر غور کرے، اور جو مطلب حق اور صحیح ثابت ہو اس کو اختیار کرے۔ پس جبکہ مترجم نے اس کلام الٰہی کو جس میں متعدد پہلو تھے ایک پہلو پر جو اس کے اعتقاد کے مطابق تھا، ترجمہ کر دیا تو اس نے ایک عام حق تلفی کی، خصوصاً اس صورت میں جبکہ اس کا اعتقاد جس کے بموجب اس نے ترجمہ کیا، درحقیقت غلط ہو۔ ان وجوہات سے ہم مسلمانوں کے ہاں ضرور تر ہے کہ جس زبان میں مذہب کی اصلی کتابیں ہوں اس زبان سے واقف ہونا چاہئے، اور جب تک اصل زبان سے واقفیت نہو، صرف ترجمہ پر اعتقادیات میں اعتماد نہیں ہو سکتا۔ دیکھو کیسی غلطی کی کتنے بڑے مترجم ایکویلا اور تھیوڈوشن اور سیمکس نے کہ کتاب اشعیاہ باب ۷، درس ۱۴ میں جو "علمہ" کا لفظ عبری زبان کا تھا، اس کا ترجمہ بجائے "کنواری" کے "جوان عورت" کر دیا۔ اس لئے ہمارے مذہب میں یہ حکم ہے کہ جب تک بخوبی صوت نہو جاوے، اس وقت تک ترجموں کی نہ تصدیق کرنی چاہئے نہ تکذیب کرنی چاہئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جو کچھ خدا نے اُتارا ہے، اس پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔"

(۲) خطبات احمدیہ میں "تعدّدِ ازدواج" پر بھی نہایت طویل و مدلل بحث کی ہے۔ اس کے ایک حصّے کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدّدِ ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے، اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، تعدّد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا، جو اس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا، ضرور ایسا ہوگا، جو قانون قدرت کے تو برخلاف نہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے، اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت، اور صورت ہائے

خاص ہو اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو، اور یہی مسئلہ تحقیث اسلام کا ہے۔

قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے)........ اس آیت کے اگر وہی ظاہری معنی لیے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا اور علما نے لیے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے، کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازدواج کی، جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، جرأت نہیں کریگا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ اِنْ لَّمْ تَعْدِلُوْا [51] بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا [52]۔ پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔"

(۳) تفسیر القرآن میں "سورۂ توبہ" کی تفسیر میں مسئلہ جہاد پر بحث کرتے ہوئے آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے غزوات (لڑائیوں) کی نسبت لکھتے ہیں:—

"تمام انبیا جبکہ قوم کی اصلاح اور ان کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً ان کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں۔ اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا، اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر بعد حضرت مسیح کے اس کے لئے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اس کے پیرووں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزور حکومت اس کو

---

۵۱ یعنی اگر عدل نہ کر سکو۔
۵۲ یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے۔

ترقی دی گئی .... پس یہ کہنا کہ انبیا کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں، ایک ایسا قول ہے جس کو قانون قدرت مردود ٹھہراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں۔ مگر حضرت مسیح نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے ان کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گزرا تھا، اور صرف ستّر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) ان پر ایمان لائے تھے۔ ان کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں، حاصل نہیں ہوئی تھی، اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوس ناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا۔ اس کے بعد اگر اس کے (یعنی دین مسیح کے) ایسے حامی پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکتے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔"

(۴) تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے سرسید نے جو خدمت قوم و مذہب کے ساتھ اردو زبان و ادب کی انجام دی اس کے نتائج و فوائد نہایت وسیع و جلیل اور زود اثر و دور رس ثابت ہوئے۔ سرسید کے مخالف کثرت سے تھے جو ان کی ہر اصلاح و تحریک اور ہر تجویز و رائے کی مخالفت کرتے تھے، خواہ وہ قومی ہو یا مذہبی یا تعلیمی۔ سرسید حسب ضرورت ان کا جواب لکھتے تھے۔ اس طرح سرسید کی جولانی قلم کے لئے میدان بڑھ گیا، اور دوسرے مخالف مصنفوں اور رسالوں نے بغیر ارادہ وہی سادہ و صحیح اسلوب بیان اختیار کر لیا جو سرسید نے شروع کیا تھا۔ مضامینِ سرسید کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(الف) تہذیب الاخلاق پہلی مرتبہ ۱۸۷۰ء (۱۲۸۷ھ) میں جاری ہوا تھا۔ اس کے سب سے پہلے پرچے میں سرسید نے اس کے جاری کرنے کا مقصد بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

"اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے

سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے، اور وہ بھی دُنیا میں مہذب قومیں کہلاویں۔ سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا، اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے، اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"

(ب) اس سے تین سال بعد نئے سال ہجری کے پہلے پرچے میں جو "افتتاحیہ" سرسید نے لکھا ہے، اس سے ان کی ہلکی سی شوخی تحریر، ظرافت وطنز، اور مخالفین کو جواب دینے کا انداز معلوم ہوگا۔ فرماتے ہیں:—

"الحمد للہ کہ سنہ ۹۰ نوے پورا ہوا اور سنہ ۹۱ اکیانوے شروع ہوگیا۔ ہمارے اس پرچہ کو جاری ہوئے سوا تین برس ہو گئے۔ پچھلا سال بھی خندۂ گل و نالۂ بلبل سے خالی نہیں گیا، ہمارے آہ و نالہ نے بدستور غلغلہ رکھا، اور ہمارے ناصحانِ شفیق کا بھی شور و شغب کم نہوا۔ ؎

حُسن شہرت، عشق رسوائی تقاضا می کند　　جرم معشوق و گناہ عاشقِ بیچارہ نیست

ناصحانِ شفیق نے ہم کو کبھی کچھ کہا اور کبھی کچھ، آخر کار ہم کو کافر و ملحد ٹھہرا ہی دیا، دور و نزدیک کے مولوی صاحبوں سے کفر کے فتووں پر مہریں چھاپ ہی منگوائیں، اور ہمارے اوپر ہمارے ناصح شفیق جناب مولوی حاجی سید امداد العلی صاحب نے ایک رسالہ چھاپ ہی دیا، اور "امداد الآفاق" اس کا نام رکھا۔ بھلا اور کچھ ہوا یا نہ ہوا، بیچارے غریب چھاپہ والے کو تو فائدہ ہوگیا۔ اسی سال میں ہماری تحریرات کی تردید میں مولانا علی بخش خاں صاحب بہادر نے (جو امید ہے کہ اب تک حاجی بھی ہوگئے ہوں گے، اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ سے ان کو بھی حاجی لکھا کریں گے) دو رسالے تحریر فرمائے، جن میں سے ایک کا نام شہاب

ثاقب اور دوسرے کا نام تائید الاسلام۔ اخباروں میں نور الانوار اپنا نور عالم میں برساتا ہی تھا، مگر اس سے ایک اور پرچہ ان کے گھر کا اُجالا مسمی بہ "نور الآفاق لامع ظلمۃ النفاق" پیدا ہوا ہے، جو نہایت ہی دلچسپ ہے، اور ہمارے اس پرچہ "تہذیب الاخلاق" کے جواب میں نکلا ہے۔ اس کے مضامین ظاہراً تو جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب بہادر کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں، مگر بعض لوگ ان مضامین کو لے پالک بتاتے ہیں۔ بہرحال ہم کو اس سے کیا کہ وہ میاں نذیر کے ہیں یا میاں بشیر کے، کسی کے ہوں مگر دلچسپ ہیں خدا ان کی عمر دراز کرے۔"

(ج) اسی سلسلے میں ایک اور اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولوی علی بخش خاں (سب آرڈینیٹ جج گورکھپور) سرسید کے شاید سب سے بڑے مخالف تھے۔ سب سے زیادہ تردیدی کتابیں اور مضامین انہی نے لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے علماء سے سرسید کے کفر کے فتوے لکھوا کر لائے۔ ان کی مذکورہ بالا کتاب "تائید الاسلام" کے جواب میں سرسید نے ایک مضمون "دافع البہتان" لکھا۔ اس مضمون کو ذیل کے فقرے پر ختم کیا ہے۔ شوخی و ظرافت قابل دید ہے:۔

"جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں؟ ظاہراً اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریباً اسی زمانہ کے حج کو تشریف لیجانے والے تھے۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جاویں گے۔ جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بدپرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا۔ مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہئے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں اور شبلی و جنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں، مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں، نہ کسی بشارت سے، آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں۔ جب تک میں بھی نہ معاف کروں معاف نہیں ہو سکتے۔ پس

مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ حج دیدا حمد کا احرام باندھے، اور گناہوں کی معافی چاہئے، ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہوجائے گا۔"

(د) سر سید نے "آزادی رائے" پر ایک اخلاقی و اصلاحی مضمون عالمانہ تحقیق کے رنگ میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک انگریز محقق کے مقالے سے استفادہ کیا ہے، جیسا کہ آغاز مضمون میں ذکر کرتے ہیں کہ "ہم اپنے اس آرٹیکل کو ایک بڑے لائق اور قابل زمانۂ حال کے فیلسوف کی تحریر سے اخذ کرتے ہیں۔" اس کا ایک فقرہ (پیراگراف) یہ ہے:۔

"اگرچہ رسم و رواج بھی اس کے برخلاف رایوں کے اظہار کے لئے ایک بہت قوی مزاحم کارگنا جاتا ہے، لیکن مذہبی خیالات، مخالف مذہب رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لئے نہایت اقوی مزاحم کار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس مخالف رائے کا اظہار ہونا اُن کو ناپسند ہے بلکہ اسی کے ساتھ جوش مذہبی اُمنڈ آتا ہے، اور عقل کو سلیم نہیں رکھتا، اور اس حالت میں ان سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں جو اُنھیں کے مذہب کو جس کے وہ طرفدار ہیں مضرت پہنچاتے ہیں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بسبب پوشیدہ رہنے ان اعتراضوں کے، انھیں کے مذہب کے لوگ ان کے حل پر متوجہ نہوں، اور مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیق کئے اور بلا دفع کئے باقی رہ جاویں۔ وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ نسلیں بسبب ناتحقیق باقی رہ جانے ان اعتراضوں کے، جس وقت ان اعتراضوں سے واقف ہوں، اسی وقت مذہب سے منحرف ہوجاویں۔ وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں، مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے۔ اگر انھیں کے مذہب کا کوئی شخص بغرض حصول اغراض مذکورہ ان کو پھیلانا چاہے تو اس کو خود معترض کی جگہ تصور کرتے ہیں، اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں۔"

یہ مضمون بھی سر سید کے طویل محققانہ مقالات میں سے ہے۔ اس طرح کے اخلاقی

مقالے مختلف عنوانات، سوشلزم، سیلف ریسپکٹ، رسم و رواج، خوشامد، ریا وغیرہ پر بڑی کثرت سے لکھے ہیں۔ یہ فن مقالہ نگاری سرسید کے زمانے سے پہلے اُردو میں داخل نہ ہوا تھا۔ اخبارات و رسائل کے جاری ہونے سے اس کا آغاز ہوا۔ سرسید کے اخبار "سوسائٹی گزٹ" اور رسالہ "تہذیب الاخلاق" سے پہلے اور بہت سے اخبار اور رسالے جاری تھے۔ اور ان میں مذہبی، اخلاقی، علمی مقالات شائع ہوتے تھے لیکن سرسید نے نئے نئے مفید و دلچسپ عنوانوں پر مضامین لکھے، بڑی کثرت سے لکھے اور نہایت صحیح اسلوب بیان اختیار کیا۔ اس لئے اوّلیت و افضلیت کا سہرا سرسید ہی کے سر ہے۔

(۷) مقالات کی ایک قسم تمثیلی یا رمزیہ ہے، جس کو انگریزی میں "ایلیگوری" کہتے ہیں۔ اس طرز نگارش میں مستقل کتابیں "سب رس"، "اخوان الصفا"، "بستانِ حکمت" وغیرہ پہلے بھی اردو میں لکھی گئی ہیں، جن کا ذکر آچکا ہے لیکن مختلف و متفرق موضوعات پر مختصر مقالاتِ تمثیلی لکھنے کا رواج سرسید کے زمانے سے، بلکہ انہی کے قلم سے شروع ہوا۔ اگرچہ ان کے ساتھ ہی ساتھ اور لوگ بھی شریک کار ہو گئے۔ آزاد کے مضامین "نیرنگ خیال"، محسن الملک کی "موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ"، حالی کی "زبان گویا"، اور ان سب سے بڑھ کر شرر لکھنوی کے مضامین "دلگداز" اُردو کی قابل قدر یادگاریں ہیں۔

سرسید کی تمثیل نگاری کا ایک نادر نمونہ ان کا مضمون "امید کی خوشی" ہے اس کے مختلف مقامات کے اقتباسات سرسید ہی کے الفاظ میں مسلسل کر کے لکھے جاتے ہیں:۔

"اے نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبتوں کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لئے، نام آدمی نام آوری کے لئے، بہادری بہادری کے لئے، فیاضی فیاضی کے لئے، محبت محبت کے لئے، نیکی نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان

کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ پہلا گنہگار انسان، جبکہ شیطان کے چنگل میں پھنسا، اور تمام بدیوں نے اسے گھیرا، تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی، تو نے اس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا، تو نے ہی اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو نے ہی اس کو ذلت سے نکالا اور پھر اس کو اعلیٰ درجہ پر پہنچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا تھا۔

وہ پہلا ناخدا۔ جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا، اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا، تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینچنے والی، اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں، اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے، اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے، اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے، اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اسے بہادروں کی قوت بازو، اور اے بہادری کی ماں، تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے، ان کا کان نقارہ میں سے تیرے نغمہ کی آواز سنتا ہے۔

وہ[۵] قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے، دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے، انھیں کو دشمن پاتا ہے، دوست آشنا دیوانہ

۵ یہاں سر سید خود اپنی مثال دیتے ہیں۔

کہتے ہیں، عالم فاضل کُفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند، عزیز، اقارب سب سمجھاتے ہیں، اور پھر یہ شعر پڑھ کر چُپ ہو رہتے ہیں:۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں بھائی سیدؔ تو کچھ دوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں، مگر ہاں کرکر، محنت اور دلسوزی سے دُور رہکر، بہت سے ہمدردی کیا کرتے ہیں، پر کو ٹھی کٹھلے سے الگ کرکر، مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت، تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ اور ہمارے دل کی عزیز، اور ہمارے پیارے مہدی[۵] کی پیاری "امید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلّی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید، جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے، اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، مُنھ پر مُردنی چھاتی ہے۔ ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے، تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں، اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے، تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے، اور ایک نئی لازوال زندگی کی، جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، اُمید ہوتی ہے۔

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دُنیا! جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچتی، تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی، اور موت کی سواری سے۔ مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام امید ہے۔

[۵] یعنی نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے، اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلف آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بُردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں، نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے:-

بقدر ہر سکوں راحت بود، بنگر تفاوت را

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن"

(ف) سر سید نے بعض مضامین "مکالمہ" کے طرز میں لکھے ہیں۔ اُردو میں یہ روش مرزا غالب کی ایجاد ہے۔ لیکن سر سید کی مقالہ نگاری کے دَور میں مکالمہ یا ڈرامے کا انداز اور لوگوں نے بھی شروع کر دیا تھا۔ "تہذیب الاخلاق" کے جاری ہونے سے پہلے مولوی نذیر احمد دہلوی کی "مراۃ العروس" شائع ہو گئی تھی جس میں افرادِ قصہ کی گفتگو پرانی داستانوں کی طرح نہیں، بلکہ نئے ناولوں کے انداز میں تھی۔ پھر "تہذیب الاخلاق" کے دوسرے دَور میں اخبار اودھ پنچ لکھنؤ (مجریہ ۱۸۷۷ء) نکلنے لگا تھا، اور اس میں مزاحیہ مضامین مکالمہ کے طرز میں بھی لکھے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۷۸ء سے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "اودھ اخبار" میں اپنا فسانہ آزاد شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے انداز تحریر سے سر سید باخبر تھے، تاہم ان کے طرز مکالمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب کا اتباع کیا ہے۔ ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ انھوں نے عجائبات مذہب یا معجزات کے انکار میں ایک مضمون عجائبات کا ڈھول اور قبول لکھا ہے۔ اس کو مکالمہ کے رنگ میں شروع کرتے ہیں

"ہیں! تم نے یہ کیسی متضاد باتیں کیں؟"

"حضرت میں کیا کروں، انسان کی جبلت ہی ایسی متضاد باتوں پر واقع ہوئی ہے۔"

"اس متضاد جبلت کے سبب بڑے بڑے بزرگوں، یہاں تک کہ انبیا کو بھی نہایت مشکلیں پیش آئی ہیں۔ مذہب سی عمدہ چیز کا بھی اسی جبلت نے ستیاناس کر دیا۔"

"حضرت، ابتک تو ہماری سمجھ میں یہ معنا نہیں آیا۔ اگر آپ کچھ تفصیل سے بتادیں تو شاید سمجھ میں آجاوے۔"

"میاں سمجھو! دنیا میں قدرتی عجائبات اس قدر ہیں کہ انسان نہ ان کو سمجھ سکتا ہے، نہ گن سکتا ہے۔ دن کا ہونا، رات کا آنا، چمکدار سورج کا نکلنا، باریک چاند کا دکھائی دینا، اور پھر بڑھتا جانا، بدر ہونا، اور اپنی چاندنی سے اندھیری دنیا کو روشن کرنا، پھر گھٹتا جانا، اور پہلی طرح باریک سا ہو کر چھپ جانا، کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟"

(اس کے بعد بہت سے عجائبات قدرت، کالی گھٹا کا اٹھنا، درختوں کا اُگنا، پرندوں کا ہوا میں اڑنا، شہد کی مکھی کے کرتب وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ اور ہر بات پر کہتے ہیں کہ کیا عجائبات قدرت نہیں ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔)

"مگر چونکہ یہ باتیں روزمرہ دیکھنے میں آتی ہیں، ان کا عجیب بلکہ عجیب تر ہونا انسان کے خیال میں نہیں رہتا۔ اور اس سے ذہول (فراموشی یا غفلت) ہو جاتا ہے، مگر انسان جب کسی مذہب پر اعتقاد لاتا ہے، یا کسی شخص کو مقدس سمجھتا ہے، تو عجائبات کو اس کے ساتھ لگاتا ہے، اور جو عجائبات اس کے ساتھ لگائے گئے ہیں، ان سب کو قبول کرتا ہے، بلکہ بغیر ان عجائبات کے مذہب کی حقیقت یا اس شخص کے تقدس کو تسلیم نہیں کرتا۔" (اس کے بعد حضرت نوح، سلیمان، موسیٰ، یونس، عیسیٰ علیہم السّلام کے معجزات کا ذکر کرکے لکھتے ہیں)

"یہی خیال اولیاء اللہ تک بھی پہنچ گیا۔ جب تک ان میں کرامتیں نہ پائی جائیں اور ان پر یقین نہ کیا جائے کہ ولیوں نے مُردوں کو بھی زندہ کر دیا ہے، اور برسوں کی ڈوبی ہوئی برات کو دریا میں سے زندہ نکال دیا، اور جنھیں اور چناں کیا، اس وقت تک ان کے ولی ہونے پر بھی یقین نہیں ہوتا.....

رفتہ رفتہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جم گئی کہ عجائبات کے بغیر نہ مذہب چلتا ہے، نہ لوگ ایسے مذہب کو جس میں کچھ عجائبات نہ ہوں قبول کرتے ہیں۔ مگر

یہ سخت غلطی ہے کوئی مذہب جو سچا ہے اور سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے جو فطرت کے خلاف ہوں، عقل انسانی کے خلاف ہوں، اور کوئی سمجھدار آدمی ان کو تسلیم نہ کرے، بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔ گو کہ بعد کو اس کے ماننے والوں نے عجائبات پرستی کی راہ سے اس میں بہت سے عجائبات شامل کر دئے ہوں۔ اس میں جس قدر حصہ عجائبات کا ہے، وہ ان عجائبات پرستوں کا شامل کیا ہوا ہے، جو قدرت کو عجائبات کو ذہول کرتے ہیں، اور خلاف قدرت اور خلاف عقل عجائبات کو قبول کرتے ہیں۔ خدا ان عجائب پرستوں سے بچائے۔

(ش) سرسید کو حسب موقع جدید اسالیب بیان پیدا کرنے، اور ہر موضوع کو قوت و قدرت کے ساتھ بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ مثلاً بقول مولانا حالی کے، "واقعات و حالات کے حُسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچتے تھے کہ جو برائیاں بسبب الفت و عادت کے دلوں میں کھُب گئی ہوں، اُن کی بُرائی، اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں ان کی خوبی، فوراً دلوں پر نقش ہو جاتی ہے"۔ یہ کمال جو سرسید کی تحریریں دیکھا جاتا ہے، ان سے پہلے نہ تھا۔ اور ان کے بعد کی تحریروں کے مقابلے میں بھی ان کی انفرادیت آج تک قائم ہے۔ اس کی مثالیں خاص کر "تہذیب الاخلاق" کی قدیم و جدید جلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔ جن میں سے بہترین نمونہ سرسید کا مضمون بحث و تکرار ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

"جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، اور پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے، اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے

داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منھ سے جھاگ نکل چھٹتے ہیں، اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منھ میں، اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اُس کو کاٹا، اور اُس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دُم دبا کر بھاگ نکلا۔

ناتہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چڑھ جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی اُس کی مٹھی میں، لپاڈکی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا، تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا، اور ایک اُدھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا، تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تو تُو تکار تک نوبت آ جاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے پر ہی خیر گذر جاتی ہے مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کے پرکھنے کے لئے

بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب، شایستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہتے۔"

(۸) **سرسید کی تقریر**: بقول مولانا حالی کے ہندوستان میں اُنیسویں صدی سے پہلے قومی اور ملکی مجمعوں میں اسپیچ یا لکچر دینے کا رواج نہیں پایا جاتا۔ سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی ملکی زبان میں پبلک اسپیکنگ کی راہ نکالی ہے۔ مولانا حالی سرسید کے بیتر نگار کرنل گریہم کی رائے نقل کرتے ہیں کہ "وہ (یعنی سرسید) ایک پیدائشی اور ریٹر (مقرر) ہیں۔ جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی طرزِ تقریر مسٹر گلیڈ اسٹن سے مشابہ ہوتی ہے اسی جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہوجاتی ہے، اور چہرہ متغیر ہوجاتا ہے، اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں انکے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔"

مولانا حالی کہتے ہیں کہ "اس کا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا، جب کہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے پورے تین برس گزر چکے تھے۔ اس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا۔۔۔۔۔۔ ۲۹ ردسمبر کو جو لکچر کہ سرسید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں، جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا، اس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار قطار نہ روتا ہو، اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔۔۔ خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگوں کردی تھی":۔

"اے بزرگانِ پنجاب، میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اپنا خیرخواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کی دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں، جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے، چمار، تلی، کا فسر

بُت پرست، بدعقیدہ، سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت سرا کے دشمن ہوتے ہیں، اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ بس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چماری کی مانند تصور کیجئے۔ اور میری محنت و مشقت سے اپنے لئے گھر بنتے دیکھئے، اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا، اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھائیے کیا آپ صاحب مجھ بدبخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ ڈبونا اور خراب وخستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو، اس سے عبرت پکڑو، اور برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔"

(ب) اوپر کی تقریر سے گیارہ برس بعد ۱۸۸۴ء میں سرسید نے بمقام گورداسپور خاتونانِ پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں تقریر کی تھی۔ یہ ایڈریس مسلمان عورتوں کی طرف سے سرسید کی خدمت میں پیش کیا تھا، جس کی بانی سردار محمد حیات خاں بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں، مگر اس کے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی تقریر تھی جس میں شریف ہندو، مسلمان، عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ سرسید کے چند فقرے یہ تھے:-

"اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شب قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں ہے۔ جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی ہے[1] وہ میرے لئے ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکر گذار ہوں۔

اے میری بہنو، میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگی نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے

[1] سرسید نے ایڈریس کو مؤنث کہا ہے، لیکن اب مذکر بولنا فصیح مانا جاتا ہے۔

کہ ہم مَردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں، مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔

تمھاری نیکی، تمھاری بُردباری، تمھاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر بار کا انتظام، ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دُنیا میں اپنے تیئں کسی قسم کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمھارے ہی سبب ہے۔ میں نے تمھارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمھارے لڑکوں کے لئے کر رہا ہوں، درحقیقت وہ لڑکوں لڑکیوں دونوں کے لئے ہے۔

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمھاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مَردوں کو جو تمھارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی، اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔

اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں، جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے، شرکت کی، وہ ایک نمونہ تمھاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لئے تمھارا شکر ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا تعالیٰ کی برکت ہو، اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین۔"

(ج) سر سید نے اپنے پوتے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں (غالباً سنہ ۱۸۹۴ء میں) بمقام علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے بعد تمام ممبروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی، اس کے چند آخری فقرے یہ تھے:۔

"اے حضرات، گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے، مگر اس سے نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لئے اسی کا گیت گایا جاتا ہے، ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے اس وقت اس کے دو علانیہ ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمد محمود اور مسٹر راس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے، جو نہایت محبّت پر دلالت کرتی ہے، اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا، اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا، اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔ دوسرا نمونہ (راجہ جے کشن داس بہادر، سی، ایس، آئی کی طرف نہایت جوش محبت کے ساتھ اشارہ کرکے کہا) ہمارا یہ داڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے۔ اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں، اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں، اور سید راس مسعود "دادا راجہ" پس ہم اپنے دوستوں سے محبت کرنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔"

(۶) **سرسید کے خطوط**۔ خطوط میں بھی سرسید کی طرز تحریر اور اُفتاد طبع کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔ القاب غالب کی طرح مختصر لکھتے ہیں، "بھائی"، "مخدومی" وغیرہ۔ ظرافت جو غالب کی طرح سرسید کی بھی طبیعت ثانیہ ہے جا بجا چمکتی ہے۔ سرسید کے لائق پوتے سر راس مسعود مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) نے "خطوط سرسید" کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ چند خطوں کا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

(الف) سرسید کے کسی نہایت عزیز دوست کو ایک زمانے میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو نماز پر تعرّض کرتا تھا، اور اس امر کی اطلاع انھوں نے سرسید کو بھی کی تھی۔ اس کے متعلق سرسید ان کو لکھتے ہیں:۔

"بھائی...... کل میں سارے دن متردد رہا، کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا،

اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا؛ دو دو اکھٹی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی، یہ سب باتیں مجھ میں ہیں، اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت بُحرنیا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے، جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا، یہ بات سُنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کُفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامتِ اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی، اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں، کتنا واہیات تھا۔ طریق سالمی استعفا دے دینا تھا، صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مر جاتے، نہایت اچھا ہوتا۔ والسّلام"

(ب) خان بہادر مولوی سید زین العابدین خاں سے سرسید کو خاص محبّت و یگانگت تھی، اور اسی خصوصیت کے سبب سے ان پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضی بھی رہتی تھی۔ جب خان بہادر صاحب ریاست رامپور کی اسٹیٹ کونسل کے جوڈیشل ممبر ہو کر رامپور چلے گئے تو سرسید نے اپنی علالت کے زمانے میں (غالباً ۱۸۹۷ء میں) ان کو یہ خط بھیجا تھا:-

"مکرمی زینو! ابھی تمھارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جُدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمھارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان ہکلاتی ہے اور کوئی بیان نہیں ہے کہ اس کو بُرا کہوں، دل میں غصّہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے

جس پر غصہ نکالوں، ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔
حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہوگیا۔ صبح کو
اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو ع "اے کہ ہرگز فراموشت نکنم" کا
نقشہ ہوگیا ہے۔"

سرسید کی تحریر کی خصوصیات

(۱) سرسید کی تحریر میں جو طرزِ قدیم کا اثر اور متروک الفاظ کا استعمال ہے، وہ کوئی عیب نہیں۔ اُس زمانے کے سب لوگ ایسا ہی لکھتے تھے۔ البتہ یہ بات ضرور محسوس ہوتی اور ذرا گراں گزرتی ہے کہ کبھی کبھی ان کے فقرے زیادہ طویل اور پیچدار ہوجاتے ہیں۔ اگر ان کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم کردیا جائے تو زیادہ سلیس ہوجائیں۔ الفاظ کی بے قاعدہ تقدیم و تاخیر بھی کہیں کہیں اُلجھن پیدا کردیتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی کمی ان کی تحریر میں نہیں ہے۔

(۲) سرسید نے مختلف موضوعات و مضامین پر قلم اٹھایا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ ہر موضوع اور ہر موقع کے لئے اس کے مناسب زبان و بیان اختیار کیا ہے۔ کسی دعوے پر دلیل لاتے ہیں تو ایسی قوت کے ساتھ کہ اس سے بہتر کا امکان نظر نہیں آتا۔ جذبات سے اپیل کرتے ہیں تو ایسی ہی تاثیر کے ساتھ۔ کسی مسئلے کی تحقیق کرتے ہیں تو اس کے کسی جزو کو نہیں چھوڑتے، کوئی منظر و واقعہ بیان کرتے ہیں تو تصویر کھینچ دیتے ہیں، ظرافت و مزاح کا موقع ہوتا ہے تو بے اختیار ہنسا دیتے ہیں۔ الفاظ کی متانت، لطافت، شوخی و رنگینی کو حسبِ موقع صرف کرنے پر حیرتناک اختیار رکھتے تھے۔ اس صفت کے بغیر کوئی شخص ادیب نہیں بن سکتا۔ اور یہ صفت سرسید سے پہلے ان سے بہتر کسی تنہا مصنف میں نہیں پائی جاتی۔

(۳) سر سید کی تحریر و تقریر ان کے مسلک و مشن کے سبب سے نہایت دُور رس اور وسیع الاثر تھی۔ اس لئے ان کے دوستوں کے ساتھ اُن کے دشمنوں نے بھی نادانستہ و بے اختیار وہی طرز و روش اختیار کر لی، اور اس طرح دوسروں کی تصانیف اور اخبارات و رسائل کی زبان میں بھی سلاست و صفائی پیدا ہو گئی۔

(۴) سر سید کی بعض تصانیف مثلاً "خطبات احمدیہ" اور اکثر مضامین تہذیب الاخلاق ایسے موضوعوں پر اور اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان سے پہلے اُردو میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ سر سید کی کتابوں سے زیادہ ان کے مضامین مفید ہیں جن سے اُردو میں فن مقالہ نگاری پیدا ہو گیا۔

(۵) سر سید کے مذہبی عقائد اور قومی و تعلیمی مشاغل کو بہت سے مسلمان ناپسند کرتے تھے اور ان کی مخالفت میں کتابیں لکھتے تھے، اخبار نکالتے تھے، مضامین شائع کرتے تھے۔ اس ذریعہ سے اُردو میں بڑا لٹریچر پیدا ہو گیا۔ یہ بھی بالواسطہ سر سید ہی کا احسان تھا

(۶) سر سید کی براہ راست تربیت سے، اور ان کی تصنیف و تحریر کے اثر سے مُلک میں نامور مصنف پیدا ہو گئے۔ مولوی وحید الدین سلیم نے سالہا سال اور مولانا شبلی نے چند سال سر سید کو ان کی "تفسیر قرآن" کی ترتیب میں مدد دی ہے۔ سر سید کو دیکھ کر ان بزرگ میں صاحب تصنیف بننے کا ذوق و سلیقہ پیدا ہوا۔ شبلی کا علم الکلام کی طرف رُجحان سر سید کی تفسیر اور خطبات سے پیدا ہوا۔ مولانا حالی اور نواب محسن الملک بھی سر سید کے زیر اثر اور پیش نظر رہتے تھے۔ مولوی چراغ علی، نواب وقار الملک، نواب حاجی محمد اسمٰعیل سر سید ہی کی تحریر و صحبت کے اثر سے مضمون نگار و مصنف بنے۔ مولوی عبد الحلیم شرر لکھنوی کی تحریر پر سر سید کی مقالہ نگاری کا اثر پڑا۔ مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خاں، خوشی محمد خاں ناظر سر سید سے اثر پذیر اور تربیت یافتہ ہیں۔

ان اعتبارات سے سر سید اپنے دور کے منفرد شخص ہیں۔ ان کی سب سے پہلی

تصنیف "آثار الصنادید" (سنہ ۱۸۵۴ء) کے بعد سے ان کی زندگی کے ۴۵ برس میں، بلکہ پوری اُنیسویں صدی میں، کوئی دوسرا مُصنّف ایسا نہیں ہے جس نے تعداد میں اتنی زیادہ، مضامین میں اتنی مختلف، ضخامت میں اتنی گراں، خوبیوں میں اتنی اعلیٰ، فوائد میں اتنی کثیر، اثر میں اتنی وسیع تصنیف کی ہوں۔ یہ تمام محاسن و فضائل کسی ایک مصنّف میں جمع نہیں ہیں۔

اس دَور کے غیر مشہور مصنّفین

سر سیّد کے زمانۂ تصنیف یا غدر سے پہلے بھی مختلف اطرافِ ہند میں مصنف پیدا ہو گئے تھے جیسا کہ ۱۲۲۲ھ اور ۱۲۷۷ھ و ۱۲۸۰ھ کی فہرستوں سے معلوم ہوا۔ سر سید کے زمانے میں اُنیسویں صدی کے آخر تک اتنی کثرت سے اور ایسے اعلیٰ درجے کے مصنف پیدا ہوئے کہ ان کی تصانیف پر آج تک اُردو زبان و ادب کو فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بعض کتابیں اردو میں بالکل نئی ایجاد تھیں، اور بعض ایسی تھیں کہ موضوع و مضمون یا زبان و طرز بیان کے اعتبار سے آج تک ان سے بہتر نہ لکھی جا سکیں، جب تصانیف و اہل تصنیف کی اتنی کثرت ہو تو ادب اردو کے مُورّخ کے لئے بجُز اس کے چارۂ کار نہیں کہ ان میں سے انتخاب کر کے چند ممتاز ہستیوں کا تذکرہ کر دے۔ یہی راہِ عمل ہم بھی اختیار کرتے ہیں، لیکن ناظرین کے اندازے کے لئے چند غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں اور ان کی تصانیف کی فہرست درج کرتے ہیں اور ان میں سے بعض کے حالات اور نمونے بھی۔

(۱) تواریخ راسلس مترجمہ سید محمد میر لکھنوی (سنہ ۱۸۳۹ء)

(۲) عجائبات فرنگ سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش (سنہ ۱۸۴۷ء)

(۳) برکات قاسم مصنفہ شاہ محمد قاسم ابوالعلائی داناپوری (سنہ ۱۸۵۷ء)

(۴) تذکرۃ المشاہیر مرتبہ منشی سدا سکھ لال (۱۸۶۰ء)

(۵) تصویر شعرا مرتبہ مفتی اکرام اللہ صدیقی گوپاموی (۱۸۶۱ء)

(۶) ترجمہ دفتر ابوالفضل مرتبہ مولوی قمرالدین اکبرآبادی (۱۸۶۱ء)

(۷) تذکرہ شعر و سخن مرتبہ نیاز علی پریشاں (۱۸۶۹ء)

(۸) گلستان بے خزاں مرتبہ حکیم سید قطب الدین خاں باطن اکبرآبادی (۱۸۶۱ء)

(۹) آثار شعرائے ہنود مرتبہ دیبی پرشاد (۱۸۸۵ء)

(۱۰) سفرنامہ یورپ مرتبہ مرزا نثار علی بیگ اکبرآبادی (۱۸۸۵ء)

(۱۱) زبدۃ الحکمۃ مصنفہ مولانا عبدالحق خیرآبادی

(۱۲) خلاصۃ المنطق مصنفہ منشی دیبی پرشاد بدایونی (۱۸۶۲ء)

(۱۳) منہاج المنطق مترجمہ مولوی محمد رضا خاں لکھنوی (۱۸۸۱ء)

(۱۴) انتخاب یادگار مرتبہ منشی مفتی امیر احمد مینائی (۱۸۷۳ء، ۱۲۹۰ھ)

(۱۵) البرہان (سرسید کی تفسیر قرآن کا رد) مصنفہ مولوی محمد علی تحصیلدار چھرایونی (۱۸۸۰ء کے بعد)

(۱۶) آئینہ وکالت مصنفہ پنڈت گرراج کشور دت مصنف ایٹہ (۱۸۸۹ء، ۱۳۰۶ھ)[۵]

ان میں پہلی دو کتابیں غدر سے پہلے کی ہیں۔ باقی اُنیسویں صدی کے نصف آخر کی ہیں۔ یہ فہرست بہت طویل ہوسکتی تھی، لیکن یہاں اُن چند کتابوں کا نام لیا گیا ہے جو بلحاظِ موضوع یا باعتبار مصنفین ممتاز ہیں اور اردو ادب کے لئے اضافہ۔ اِن میں سے بعض کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

یوسف خاں کمبل پوش حیدرآباد وطن اصلی تھا، سیر و سیاحت کے لئے گھر سے نکلے، تمام ہندوستان کی سیر کر کے انگلستان کا سفر کیا۔ یورپ کے دوسرے مقامات اور مصر وغیرہ کی بھی سیر کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ

[۵] ان کتابوں میں سے کچھ خاکسار مؤلف کے پاس ہیں اور اکثر جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے کتب خانہ میں ہیں۔

ہندوستانی سیاحوں میں سب سے قدیم تھے۔ ۱۸۲۹ء سے سیاحت شروع کی، ۱۸۳۷ء میں ولایت کا سفر کیا۔ حالات سفر لکھتے گئے، جن کو ۱۸۴۷ء میں دہلی میں چھپوایا۔ پھر دوبارہ ۱۸۷۳ء میں مطبع نولکشور میں چھپا۔ عجائبات فرنگ اس کا نام ہے۔ یہ اُردو میں سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ محض ایک سیاح کا سفرنامہ ہے، جس کی کوئی قومی و ملکی یا تعلیمی غرض نہ تھی۔ اور سب لوگوں کے سفر مثلاً مولوی مسیح الدین، سرسید احمد خاں، راجہ رام موہن رائے وغیرہ کے اس سے بعد کے ہیں، اور بغرض سیر و سیاحت نہ تھے۔

پھر اُنیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی میں بھی لوگوں نے یورپ کے سفرنامے لکھے ہیں۔

یوسف خاں کمبل پوش ۳۰ مارچ ۱۸۳۷ء کو کلکتہ سے انگلستان روانہ ہوئے تھے، اور ۲۵ جولائی ۱۸۳۸ء کو واپس کلکتہ پہنچے۔ سفر کے حالات بقید تاریخ لکھے ہیں۔ راستے کے ہوٹلوں اور لندن وغیرہ کے محلّوں کے نام اور نمبر تک درج کئے ہیں۔ اپنا مذہب سلیمانی بتایا ہے ہر جگہ اس کا ذکر کیا ہے، اصول مذہب بھی لکھے ہیں اور اس کو حضرت سلیمان علیہ السّلام کا مذہب بتایا ہے "سلیمانی" نام کا یہی سبب ہے۔ شراب پیتے تھے، بڑی بے تکلفی سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بلکہ ایک جگہ کمال جسارت سے شراب کو جائز بتادیا ہے، لکھتے ہیں:—

"وہاں کے مالک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی اور شراب انگوری ہم کو پلائی، عجب ذائقہ کی تھی کہ کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم ملائی سے میرا نوکر تھا، اس نے مجھ سے کہا، تم مذہب سلیمانی رکھتے ہو، شراب کیوں پیتے ہو، میں نے جواب دیا کہ حضرت پیغمبر نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا۔"

انگریزوں کے اخلاق کی بیحد تعریف کرتے ہیں، سفر میں جن مصائب میں انگریزوں نے ان کی مدد کی ہے ان کا ذکر بڑی احسانمندی سے کرتے ہیں اور ہندوستانیوں کے اخلاق سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یورپ و لندن کے حُسن و جمال کے نہایت مدّاح ہیں۔ ہر جگہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ حسین عورتوں سے اپنی محبت کا حال لکھتے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیتے ہیں: "مگر خالی اغراض نفسانی سے تھی"۔ وہاں کی بدکاری کے چشمدید واقعات بیان کرتے ہیں۔ غرض کمبل پوش صاحب نے سفر اور سفرنامہ دونوں کا حق ادا کردیا ہے۔

اس عجائبات فرنگ کی زبان بالکل وہی ہے جو سوا سو ۱۲۵ برس پہلے کی ہونی چاہیئے۔

قافیہ پیمائی بھی کی ہے۔ لیکن دلچسپ واقعات اور ذاتی تاثر کے سبب سے فسانہ وناول کا سا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مختصر اقتباسات یہ ہیں۔ شروع میں لکھتے ہیں:۔

"آغاز حال مولف۔ یہ فقیر بیچ سن اٹھارہ سو اٹھائیس (۱۸۲۸) عیسوی مطابق سن بارہ سو چوالیس (۱۲۴۴) ہجری کے حیدر آباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکپور، نیپال، اکبر آباد، شاہجہان آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پہنچا۔ یہاں بمدد گاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خاں منکس صاحب بہادر کے، ملازمت نصیرالدین حیدر بادشاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حال پُر اشتغال پر مبذول فرمائی، کہ ہرگز نہیں تاب بیان اور یارائے گویائی، رسالۂ خاص سلیمانی میں عہدہ جماعہ داری کا دیا۔ بعد چند روز کے صوبہ داری اسی رسالے کی دے کر درماہہ بڑھایا۔ بندہ چین سے زندگی بسر کرتا، اور شکرانہ منعم حقیقی کا بجا لاتا۔ ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامنگیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اس کے بیشتر کتابوں تاریخ کی سیر کرتا، دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے محظوظ ہوتا۔ ایکبارگی سن اٹھارہ سو چھتیس (۱۸۳۶ع) عیسوی میں دل میرا طلبگار سیاحیِ جہان خصوص ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بعد عنایت و انعام اجازت دی۔ عاجز تسلیمات بجالایا، اور راہی منزل مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارہ کلکتہ میں پہنچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعدازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس (۱۸۳۷) عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا ازابیلہ، کپتان اس کا ڈبیدبران صاحب مع اپنی بی بی کے تھا۔ جہاز وزن میں چھ سو ٹن کا کنارے گنگا پر آ لگا تھا۔"

پیرس کی سیر میں لکھتے ہیں:۔

"پندرھویں دن ایک مکان میں گیا، وہاں صدہا آدمی قالیچے شطرنجیاں بُن رہے

تھے، بناوٹ میں تصویر عمدہ کھینچتے۔ دریافت ہوا کہ وہ سب مصوّر تھے، تصویریں قالین اور دریوں پر ایسی معلوم ہوتیں کہ کسی مصوّر کامل نے تصویریں کاغذ پر کھینچی ہیں۔ ان کی کاریگری دیکھ کر متحیّر ہوا۔ حال ان کا پوچھا، ظاہر ہوا کہ واسطے فرش دیوان عام شاہ فرانسیس کے بنتے ہیں، اور کہیں نہیں بیچتے۔ زبان فرانسیسی میں اس کام کو ٹپسٹری کہتے ہیں۔ اس کے بعد کونسل کے مقام پر گیا۔ ایک مکان فلک بنیاد دیکھا۔ ستون سنگ مرمر کے ایکڈال راست اس میں لگے۔ صاحبان کونسل اپنے رتبے کے موافق جا بجا بیٹھے۔ ہر ایک کے نمبر لکھے۔ اس مکان کی شکست و ریخت کے لئے مزدور لگے تھے۔ میں یہ حال دیکھ کر باہر نکلا۔ پانی برسنے لگا، سارے کپڑے تر ہوئے، مگر گرتے پڑتے گھر چلے، راہ میں دو رنڈیاں[۵]، ایک خوبصورت، دوسری کریہ المنظر ملیں۔ میری وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ترک ترک کہتی تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آئیں، اکبار پانو پھسلا، دونوں لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب جا کر زن جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا، بدشکل کو ویسے ہی چھوڑا، وہ بڑی محنت سے اُٹھ کر اپنی بولی میں کچھ کہنے لگی، مگر اس زبان سے مجھ کو آگہی نہ تھی۔ آخر اس نے ایک دھکا دیا مجھکو زمین پر گرایا، دوسری عورت خوبصورت نے جس کو میں نے اُٹھایا تھا، میری طرف ہو کر اس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچانی غنیمت سمجھا وہاں سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے ہوئے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں دیتے میرے پیچھے دوڑتے آتے۔ بہزار خرابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پونہچا۔ میرا حال دیکھ کر سب ہمراہی ہنسنے لگے، میں سخت نادم و شرمندہ ہوا۔ پانو میں چوٹ آئی تھی، اس سبب سے دو ایک دن قیام کیا۔"

شاہ محمد قاسم داناپوری سیّد شاہ محمد قاسم ابو العلائی ابن سیّد تراب الحق داناپور کے ایک ذی علم صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے سلسلہ ابوالعلائیہ کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن آپ کو اس شغل سے زیادہ ملازمت کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کچہری صدر دیوانی

[۵] اس زمانے میں لکھنؤ میں عورت کو رنڈی کہتے تھے۔ یہاں کسبی عورتیں مراد نہیں ہیں۔

الہ آباد میں رہے۔ پھر صدر دیوانی الہ آباد سے آگرہ کو منتقل ہوئی تو ۱۸۴۵ء ۱۲۶۱ھ میں شاہ محمد قاسم صاحب بھی آگرہ آ گئے۔ صدر نظامت میں "مسل خواں" تھے۔ ایک مرتبہ انگریز حاکم کے سامنے مسل پڑھ رہے تھے، واقعات مقدمہ نے ان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ یکایک جذب پیدا ہو گیا، زور سے "اللہ" کا نعرہ مارا، اور مسل پھینک کر نکل گئے۔ بہت دنوں تک کچہری کا رُخ نہ کیا۔ لیکن انگریز حاکم ان سے بہت خوش تھا، پھر بُلایا اور اپنے دفتر والوں سے کہا کہ آیندہ ان کو کوئی "اللہ والی" مسل نہ دی جائے۔

آگرہ کے صدر نظامت میں بیشتر حُکام و وکلاء مسلمان تھے۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی وکیل صدر تھے۔ ان سے شاہ محمد قاسم کے خاص تعلقات ہو گئے۔ مولوی غلام امام شہید بھی دفتر نظامت آگرہ میں ملازم تھے۔ مولوی کریم اللہ خاں[۵] صدر الصدور (سب جج) تھے۔ ان سب کی نشست مفتی انعام اللہ خاں کے مکان پر رہتی تھی۔

اس زمانے کا یہ عجیب واقعہ یادگار رہے کہ نواب چیناپٹن (میسور) کے برادرزادہ سید شاہ احمد علی قادری عرف ضیاء الدین دلاور جنگ کو جہاد کا شوق پیدا ہوا، اور میسور سے چل کر آگرہ آئے بخت و اتفاق سے مفتی انعام اللہ کے مہمان ہوئے۔ یہاں آگرہ کے اکثر علماء و رؤسا کا مجمع رہتا تھا۔ سب نے سید احمد علی صاحب کے عزم جہاد کی تائید کی اور امداد بہم پہنچائی۔ سید میسوری اپنے مریدوں اور رفیقوں کو لیکر شاہجہانپور کی طرف روانہ ہوئے، پوربیوں سے جہاد کیا، اور راجہ پوائیں شاہجہانپور کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد آگرہ کے بعض وکلاء و حکام و رؤساء پر رشوت ستانی کا مقدمہ برپا ہو گیا جس میں مفتی انعام اللہ، مولوی غلام امام شہید، شاہ محمد قاسم وغیرہ متہم گردانے گئے۔ اس مقدمہ کی سماعت کے لئے مسٹر ولسن جج مرادآباد خاص طور پر متعین کر کے بلائے گئے۔ مفتی انعام اللہ کے داماد خواجہ غلام غوث خاں بہادر بیخبر اُس وقت لفٹنٹ گورنر کے میر منشی تھے، لیکن وہ بھی

---

۵ مولوی کریم اللہ خاں ابن قاضی فقیر اللہ نیاز مند مؤلف کے بزرگوں میں تھے۔ صدر الصدور ہونے کی وجہ سے نام کے ساتھ "خاں" لکھا جاتا تھا، پھراؤں ضلع مرادآباد وطن تھا ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۸ء ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی۔

اپنے خسر کی مدد یا سفارش نہ کر سکے۔ آخر مقدمہ کا ثبوت بہم نہ ہو سکا۔ تمام حضرات میں سے صرف شاہ محمد قاسم کو ۶ ماہ کی سزا کا حکم ہوا تھا، وہ بھی اپیل میں منسوخ ہو گیا۔ یہ ہنگامہ آگرہ میں "وِلسن گردی" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

اس مقدمے کا اصلی سبب رشوت ستانی نہ تھا۔ مولوی امام شہید وغیرہ رشوت سے بالاتر ہستیاں تھیں، چنانچہ اسکا کوئی ثبوت بہم نہ پہنچ سکا۔ اصل میں انگریزوں کو اس پر غصہ تھا کہ ان عالموں، مفتیوں، صوفیوں نے سید احمد علی شاہ میسوری کے جہاد کی حمایت کی۔ اسکا انتقام انگریزی حکومت کو لینا تھا۔ لیکن اعانت جہاد کے جرم کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ صرف اسقدر معلوم و مشہور تھا کہ سید میسوری مفتی انعام اللہ کے مکان پر مقیم تھے۔ باقی تمام کارروائی نہایت خفیہ ہوتی تھی۔ اس واقعہ سے بیس برس پہلے (۱۸۲۸ء میں) مولوی سید احمد بریلوی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی سکھوں سے جہاد کر چکے تھے "ترغیبِ جہاد" وغیرہ کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ مسلمانوں کے جوش کا اندازہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تھا لیکن یہ واقعہ جہاد اس طرح پیش آیا کہ سید احمد علی میسوری کو روکنا انگریزوں کے اختیار سے باہر تھا۔ سید مجاہد جلد شہید ہو گئے۔ ان کا لشکر منتشر ہو گیا۔ اس لئے انگریزوں نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو ان کے بس میں تھے اور اس کام کے لئے ۱۸۴۷ء میں "وِلسن گردی" برپا کر دی۔

اسی سال تمام وکلاء و عہدہ دار جو "ولسن گردی" کے لپیٹ میں آئے، ترک وکالت و ملازمت کر کے صدر سے علیحدہ ہو گئے۔ شاہ محمد قاسم بھی آگرہ سے اپنے وطن داناپور چلے گئے۔ وہیں وفات پائی۔

شاہ محمد قاسم صاحب تصانیف ہیں۔ اسرارِ قاسمی اور اعجاز غوثیہ فارسی میں لکھیں۔ اسرار قاسمی کا اردو ترجمہ مفتی انعام اللہ نے کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اردو میں نجات قاسم تصنیف کی ہے جس میں سیدنا امیر ابو العلا کے حالات و کرامات کا ذکر ہے۔ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ میں بمقام نینی تال لکھی ہے، اور مطبع اشرف الاخبار آگرہ میں اسی سال چھپائی گئی ہے۔

نجات قاسم کا نمونہ مختلف مقامات سے یہ ہے :-

"یہ کاتب گنہگار جب پہلے پہل شہر اکبر آباد میں حاضر ہوا ہے تو سال بارہ سو اکسٹھ ہجری تھا، جس وقت روضہ منورہ پر حاضر ہو کر بعد قدمبوسی اور فاتحہ کے آنکھیں بند کر کے پائیں مزار شریف کے بیٹھا معاً کانوں میں یہ آواز آئی کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت کے انتقال کے پورے دو سو برس کے بعد تو زیارت سے مزار انور کے مشرف ہوا"۔[۵]

"جس روز یہ کاتب عاصی صدر دیوانی کی کچہری کے ساتھ بلدہ متبرکہ اکبر آباد میں پہنچا اس کی صبح کو مکان فرودگاہ سے بہ تمنائے زیارت روضہ منورہ اپنے پیشوا حضرت امیر ابوالعلا قدس اللہ سرّہ کے چلا، مگر چونکہ اس وقت تلک شہر کے محلوں اور سواد شہر سے محض نابلند تھا، اور جو آدمی ہمراہ تھے وہ بھی بالکل ناواقف تھے۔ گونہ تردد ہوا۔ پھر یہ خیال کیا کہ شہر سے باہر نکل کر کسو سے راستہ درگاہ شریف کا پوچھ لیں گے۔ جب چارسو دروازے سے آگے بڑھا ہنوز نوبت پوچھنے کی کسو سے نہیں پہنچی تھی کہ دو لڑکے نہ معلوم کدھر سے آ کے میری پالکی کے ساتھ ہوئے اور خود بخود پوچھنے لگے کہ تم ابُّولالا کی درگاہ پر جاؤ گے۔ فائدہ۔ واضح ہو کہ شہر اکبر آباد کے بازاری لوگ اور سب لڑکے ہمارے حضرت کو ابُّولالا کہتے ہیں، اور یہ لفظ ان کی زبان سے اتنا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ لطف اس کا تحریر میں نہیں آ سکتا....."

حضرت امیر ابوالعلاؒ کے حالات میں لکھتے ہیں :-

"جاننا چاہیئے کہ جب حضرت خواجہ فیضی قدس سرہٗ کسو لڑائی میں شہید ہو گئے۔ تب راجہ مان سنگھ نے اس عہدۂ نظامت پر بر سر دو ان کے جناب حضرت امیر ابوالعلا قدس سرہٗ کو مقرر کر کے منصب سہ ہزاری ذات اور سہ ہزاری سوار کا بادشاہ کے حضور سے دلوایا۔ آپ کے پاس اسباب تجمّل اور شوکت کا از قسم ہاتھی گھوڑے

---

۵ حضرت سیدنا امیر ابوالعلا رحمۃ اللہ کا وصال ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۱ء زمانہ شاہجہاں ہوا ہے۔ حضرت کی ولادت ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں بعہد شہنشاہ اکبر ہوئی۔

اور اونٹ اور رتھ وغیرہ سامانِ امرائی بہت تھا۔ چنانچہ نقل ہے کہ بعد ترک دنیا اور جلوہ افروزی مسند فقر و درویشی کے بھی یہ حال تھا کہ جب کبھی آپ شکار کو تشریف لیجاتے تو بیالیس نفر صرف باز دار ہم رکاب فیض انتساب کے ہوتے تھے، اور سامان کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔ الغرض راجہ مان سنگھ باوصف ایسے احتشام ظاہری کے کہ تمام قلمرو بنگالہ کا مالک اور حاکم تھا، حضرت کی اس قدر تعظیم و تکریم کرتا تھا کہ اپنی مجلس میں جمیع امرا بلکہ اپنے فرزندوں سے بھی بالاتر جگہ آپ کو دیتا تھا۔"

مفتی اکرام اللہ صدیقی

مفتی انعام اللہ خاں صدیقی گوپاموی کے فرزند رشید تھے۔ ۱۸۳۵ء (۱۲۵۱ھ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور علمائے عصر سے اکتساب علم کیا۔ ڈاکٹر مکند لال اکبر آبادی سے ڈاکٹری پڑھی۔ پھر مختاری کا امتحان پاس کر کے الہ آباد میں مختار رہے۔ تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ متعدد کتابیں فارسی و اردو میں لکھیں۔ مثلاً عمائے اودھ، اخبار واصلین، تذکرۂ مصنفین، قواعد اردو، فارسی جدید، مفید الطلاب۔

ان میں تصویر شعرا خاص چیز ہے۔ اسی زمانے میں آگرہ شعرائے شہر و بیرون شہر کا اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ اکثر شعر و شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ مولوی غلام امام شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات نے اس میں عجیب روح پھونک دی تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) میں بابو بینی پرشاد وکیل صدر کے مکان پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کے سخنوروں کے کلام و حالات مفتی اکرام اللہ نے مرتب کئے، اور اس گلدستہ کا تاریخی نام "تصویر شعرا" (۱۲۷۷ھ) رکھا۔ ۱۸۶۱ء میں مرزا اعلیٰ حسین قیصر کے مطبع حیدری میں طبع ہوا۔ اس کی تمہید مختصر کر کے درج کی جاتی ہے:-

بشنو از انصاف اگر مقبلی — شعر بود حجت روشن دلی
در شرف شعر رسولِ خدا — گفت بسے قول، بمدح و ثنا

شعر کہ اصحاب نبیؐ گفتہ اند چوں لُدُر و یاقوت دگر سفتہ اند
شعر علیؑ گفت و حسینؑ و حسنؑ کعبؓ و انسؓ گفت و اویسؓ قرن
شعر کہ حسانؓ عرب گفتہ است سید کونین پذیرفتہ است
منع ز اشعار نکرد ست نبیؐ تائب ازاں کار نکرد ست نبیؐ
بلکہ برا دکرد ہزار آفریں سید کونین رسولِؐ امیں

سخنوران معنی آفریں پر واضح اور آشکارا ہے کہ سخن کی قدر افزائی کے لئے طبع سلیم اور ذہن فہیم درکار ہے۔ سخنور کو ہمیشہ سخندان کی جستجو ہے، کس واسطے کہ گوہر کی جوہر شناسی سے قدر اور آبرو ہے۔

نرسد ہیچ کمالے بہ سخن سنجیدن کہ سخن را صلۂ نیست بجز فہمیدن

جو لوگ اس قاعدے کو نہیں مانتے ہیں، وہ آپ اپنی قدر نہیں جانتے ہیں۔ بیشک سخن کی تمیز کے لئے مخاطب معنی فہم درکار ہے۔ اپنی ستائش اپنی زبان سے کب سزاوار ہے۔ شاعر جب تک سخن فہم سے داد نہ پائے گا۔ اپنے مونہہ میاں مٹھو کہنے سے سخن گو نہو جائے گا۔ بیت

طوطی ز معنی سخن خویش غافل است ہر کس سخنور است سخنداں نمی شود

اس نظر سے شعرائے فخر البلاد اکبر آباد کو اہل جوہر جوہر شناس کی جستجو اور سخنور سخن فہم کی آرزو رہتی ہے۔ الحمدللہ کہ دعائے باطنی نے مدعائے دلی کی صورت دکھائی، اور بعد عرصہ دراز کے مراد ان کی باحسن وجوہ برآئی کہ ان دنوں بحسن اتفاق جناب برگزیدہ آفاق جوہر آئینہ کمال، صورت گر حسن و جمال، معنی آفریں نازک خیال۔ نکتہ سنج، عدیم المثال، استاد یکتا۔ امام الشعرا فاضل وحید حضرت مولانا غلام امام شہید مدظلہم اور سخنور شیریں مقال، معنی سنج نازک خیال[1] برادر گرامی قدر منشی غلام غوث صاحب بیخبر میر منشی نواب مستطاب لفٹنٹ گورنر بہادر اس شہر میں رونق افروز ہوئے ہر طرف ان کے مقدم سعد سے چہل پہل ہو گئی

[1] چار پانچ سطریں مدحیہ الفاظ کی تھیں وہ چھوڑ دی ہیں۔

خاص وعام فیض یاب اور مسرت اندوز ہوئے۔ معنی پروران سخنور نے موقع وقت غنیمت سمجھ کر اس بات کا ارادہ کیا کہ کلام ہمدگر سے چاشنی گر مذاق ہوں، اور جوہر طبیعت آزمائی دکھائیں۔ یہ بات سنتے ہی انجمن آرائے سخن و معانی، رموز شناس اسرار سخندانی سر دفتر ارباب ہنر، جوہر شناس صاحب جوہر، نوبادہ گلشن مراد بابو بینی پرشاد صاحب عالی قدر وکیل عدالت صدر زاد حشمتہ نے اپنے دولت خانہ فیض کاشانہ کو فروش منقش اور مصفا اور کنول جھاڑ مردنگیاں دیوارگیریاں فانوس، اور مرآت حیرت افزا سے جسے دیکھ کر آفتاب و مہتاب پھڑک جاوے اور پردہائے زنگار رنگ گلہائے بوقلموں عطریات گوناگوں سے جس کی خوشبو سے چمن زار بہشت مہک جاوے، پیراستہ کر کے صلائے عام دی اور ارباب ذوق و شوق کو خبر کی کہ نکتہ دران صبح نفس اور سخن سنجان قیقہ رس تشریف لاویں، ہم کو مرہون منت فرماویں۔ بس تمام شہر میں اس مشاعرہ کی شہرت ہوئی۔ عجب طرح کی رنگیں صحبت ہوئی .... یہ مجموعہ اس مجمع کا جامع کلام ہے" "تصویر شعرا" اس کا تاریخی نام ہے۔

کلام شعرا کا بھی نمونہ دکھایا جاتا ہے۔ طرحی و غیر طرحی غزلوں کے علاوہ چار پانچ شاعروں نے بانی مشاعرہ بابو بینی پرشاد صاحب کی مدح میں رباعیاں بھی پڑھی تھیں۔ ان میں سے مرزا عباس تلمیح اکبرآبادی کی رباعی درج کی جاتی ہے:۔

بابو کا ہے دل حُبّ علی سے آباد ہے دوستی علی سے ہردم دل شاد
اس "دوستی علی" کے گن لو اعداد ہے ہم عدد اس سے "بابو بینی پرشاد"
۵۹۰
۵۹۰

طرحی غزلوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:۔

آسیر۔ میر گلزار علی خلف و جانشین میاں نظیر اکبرآبادی:۔

ساقیا ہوش میں آ، ظرف کو دیکھ آنکھیں کھول ان تنگ ظرفوں کو اتنا نہیں بھر دیتے ہیں
آنکھ اپنی سر محفل نہیں ملنے پاتی دیکھتے ہیں وہ کدھر، جام کدھر دیتے ہیں

باطن۔ حکیم سید قطب الدین اکبرآبادی:۔

رازداران حقیقت کے لبوں پر ہے مہر　　خود خبر دار ہیں وہ کس کو خبر دیتے ہیں

بہادر۔ بابو رن بہادر سنگھ:۔

اے مسیحا ترے بیمار شب ہجراں کو　　جام خورشید میں تبرید سحر دیتے ہیں
دل بھر آتا ہے، اب خیر نہیں عالم کی　　آج طوفاں کی خبر دیدۂ تر دیتے ہیں

راجہ۔ مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر راجہ کاشی:۔

یار کے حُسن پر آشوب کی ہے دل میں جگہ　　یہ وہ دریا ہے جسے کوزے میں بھر دیتے ہیں
راجہ یہ شوق اسیری ہے کہ مرغانِ قفس　　اپنے منقار سے پر اپنے کتر دیتے ہیں

صفیر۔ لالہ گنگا سہائے:۔

اُڑ گئے ہجر کی شب۔ وصل کے دشمن میرے　　آج آواز نہیں مرغِ سحر دیتے ہیں

مہر۔ میرزا حاتم علی بیگ مہر شاگرد ناسخ:۔

یہ نئی طرز مسیحائی ہے، سبحان اللہ　　جان آجاتی ہے، وہ دم بھی اگر دیتے ہیں
ہم تو اللہ کو بھی یوں نہیں کرتے سجدہ　　اے صنم سر کو ترے پاؤں پہ دھر دیتے ہیں

حکیم قطب الدین باطن

حکیم میر مہدی طاہر کے فرزند، محلہ تاج گنج آگرہ میں رہتے تھے۔ غالباً ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۱ء) میں پیدا ہوئے۔ اس لئے کہ تذکرہ "شعر و سخن" مرتبہ نیاز علی پریشاں میں (جو ۱۲۸۶ھ میں لکھا گیا ہے، اور جس کا ذکر اس کے بعد آتا ہے) حکیم باطن صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ حکیم صاحب کے اسلاف طبیب شاہی رہے ہیں۔ انھوں نے عربی و فارسی میاں نظیر اکبر آبادی سے حاصل کی۔ شاعری میں بھی انھیں کے شاگرد تھے۔ حکیم صاحب کے دادا حکیم سید واجد علی اکبر آبادی حضرت مولانا فخر الدین قدس سرہٗ کے خلیفہ خاص تھے۔ اور حکیم صاحب خود حضرت سید غلام نصیر الدین دہلوی عرف میاں[۵] کالے" کے مرید تھے۔ اپنے پیشۂ آبائی طبابت کے سلسلے میں صاحبزادہ محمد یٰسین خلف ٹیپو سلطان شہیدؒ کی سرکار

---

۵ حکیم مومن خاں دہلوی کے میاں صاحب کے نام کا کیا خوب سجع کہا ہے:۔ "ہر دم نام میاں کالے"

سے وظیفہ پاتے تھے۔

باطن صاحب نے چار دیوان، ایک مثنوی اور مختلف منظومات یادگار چھوڑی ہیں اور ایک عجیب و غریب پُرگوئی کا ثبوت یہ دیا ہے کہ تمام مثنوی میر حسن کا خمسہ کر دیا ہے اور اس کا نام "اعجاز رقم" رکھا ہے۔ یہ سب نظم کی تصانیف ہیں۔ ایک نثر کی تصنیف تذکرہ گلستان بیخزاں ہے، جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے گلشن بے خار کے جواب میں لکھی ہے۔ چنانچہ حکیم باطن اپنے تذکرہ کی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

خامہ نے جب دیا جواب سوال — زد بر و دکھ کے "گلشن بے خار"
منصفان زمانہ کہنے لگے — ہے "گلستان بےخزاں" میں بہار
بلبل فکر پھر تو اے باطن — چھپایا یہ کھول کر منقار
نام تاریخی اس شگوفے کا — "نغمۂ عندلیب" کہہ اے یار

۱۲۶۱ھ

نواب شیفتہ کے ساتھ حکیم باطن کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ شیفتہ نے اپنے تذکرہ "گلشن بیخار" میں میاں نظیر اکبرآبادی کے متعلق یہ رائے لکھی تھی ——

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیین جاری ست و نظر بر آں ابیات در اعداد شعرا نشاید شمرد"

—— یعنی میاں نظیر کے اشعار بازاری لوگوں کی زباں پر جاری ہیں۔ ان اشعار کی بنا پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں۔

میاں نظیر حکیم باطن کے استاد تھے۔ اس لئے حکیم صاحب کو شیفتہ کی رائے نہایت ناگوار ہوئی۔ شیفتہ کے تذکرے کے مقابلے میں اپنا تذکرہ لکھ ڈالا۔ اور اس میں جہاں موقع پایا شیفتہ، شیفتہ کے استاد مومن کو، شیفتہ کے احباب آزردہ وغیرہ کو خوب بُرا بھلا کہا۔ شیفتہ نے آزردہ کی بڑی تعریف کی ہے، اس لئے باطن نے آزردہ کی ہجو ملیح و صریح دونوں لکھیں۔ ان کے اشعار میں اصلاحیں دیں۔ انکے بعض الفاظ کو غلط بتایا اور اس پر بڑا طومار لکھا۔ گویا حکیم باطن صاحب نے اپنا تذکرہ اسی کام کے لئے لکھا تھا۔

حکیم صاحب نے تذکرہ گلستاں بے خزاں میں بے مزہ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کی ہے۔ اس لئے طویل نمونہ درج کرنا بے لطف ہوگا۔

حمد باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ صنعت براعۃ الاستہلال یا تلازمۂ شعر و شاعری کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"مطلع انوار انواع صفات، حُسنِ مطلع تجلیات غزل کائنات، حمد اس سشاعر یکتا کی ہے، جس نے بے مدد استاد، بوقلموں مضامین، بیت الغزل عالم میں بحرِ حسن مقطع از مطلع تا مقطع ساتھ ایک فکر کے بیاض عدم سے لاکر قلم قدرت سے صفحۂ دیوانِ وجود پر لکھیں۔"

تذکرہ میں حکیم مومن خاں دہلوی کا حال اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

"مومن تخلص، مومن خاں نام، ساکنِ شاہجہاں آباد، شاگردانِ سخن کے استادؔ اگر نور باف سحر بیاض فکر دیکھے تو صحن خانہ سے کوچ کر جائے۔ کشش الفاظ سے اس کے ہوش میں خرابی پائی جائے۔ رشتۂ جاں تار تار ہو، رشک مضمون سے ہر شاعر ہاتھ مل مل کے بیقرار ہو۔ کلام میٹھا ایسا گاڑھا کہ جس کی حیرت سے شیریں زباں شل کوہکن کے شور مچائیں۔ نشہ شراب الفاظ سے مخمورانِ خمخانۂ سخن دستار کو ہوا میں اُڑائیں۔"

تذکرے کے اعتبار سے یعنی انتخاب کلام، حالات و تنقید میں حکیم باطن کا گلستان بیخزاں یا نغمۂ عندلیب بالکل ہیچ و پوچ ہے۔ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں بہترین اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ باطن نے جہاں اسکے علاوہ اپنا انتخاب دیا ہے، نہایت معمولی ہے۔ باطن سخن سنجی سے بالکل عاری ہیں۔ اسی لئے ان کا تذکرہ آج کسی گنتی میں نہیں۔

نیاز علی پریشاں خلف شیخ رجب علی شیخ صدیقی تھے۔ ان کے اسلاف قدیم دہلی کے تھے۔ جو سعادت خاں برہان الملک کے ساتھ دہلی سے اودھ گئے اور سندیلہ کو مسکن بنایا۔ لیکن پریشاں کے قریبی بزرگ

آگرہ آ گئے۔ ان کی ولادت و تربیت آگرہ ہی کی ہے۔ پریشاں مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔ مثنوی، واسوخت، غزل قصیدہ سب کچھ کہا ہے۔ لیکن ان کی بہترین یادگار تذکرہ شعور سخن ہے۔ اس کی ترتیب ان کو بالیقین حکیم قطب الدین باطن کے تذکرہ کو دیکھ سن کر سوجھی ہوگی۔ لیکن اس پر بہت اضافہ کیا اور ترتیب کے لئے بڑا اہتمام کیا۔ یعنی ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء (مطابق ۱۰ رجب ۱۲۸۶ھ) کو آگرہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کرنے کا ارادہ کیا۔ اور کئی مہینے پہلے اس کا اعلان تقسیم کیا اور اخباروں میں چھپوایا، یہاں تک کہ ہندوستان سے باہر بھی اس کی خبر پہونچ گئی۔ چنانچہ فرانسیسی مستشرق پروفیسر گارسان دتاسی نے اپنے خطبہ ۱۸۶۹ء میں اس مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے:—

"ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ہونے والا تھا۔ اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۹ء میں ان شعراء کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ہے جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔"

(از خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۸۰۲ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو)

پریشان نے مشاعرے کے اشتہار میں ایک نقشہ درج کیا تھا، اور شعراء سے اس کی خانہ پری کی درخواست کی تھی۔ خانے یہ تھے۔ نام شاعر، تخلص، ولدیت، نام استاد، مدت شاعری، استاد زندہ ہیں یا نہیں، سکونت قدیم و جدید، تصنیفات، حالات۔ اشتہار میں مشاعرے کی غرض پریشان نے یہ لکھی ہے:—

"غرض اس جلسہ دلچسپ سے یہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شہروں یا قصبوں کے شاعروں کا حال مفصل ایک خاص تذکرے میں واسطے یادگاری کے لکھا جاوے تاکہ اس طرح واحد کے ذریعے ان کی فکر کا نتیجہ ظاہر ہو۔"

یہ مشاعرہ مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ کاشی کے مکان واقع کشمیری بازار آگرہ میں منعقد ہوا۔ اس کا حال پریشان لکھتے ہیں:—

"اسی شاعروں نے اپنی اپنی غزلیں بعد ایک دوسرے کے بہت صفائی کے ساتھ پڑھیں۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر جب پڑھ چکے تو خلیفہ سید گلزار علی صاحب اسیر نے پڑھ کر لوگوں کو محظوظ کیا۔ اس کے بعد جناب راجہ صاحب بہادر نے کلام دلآویز سُنایا۔ آفتاب طلوع ہو گیا تھا۔ مشاعرہ برخاست ہوا۔"

دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"اب سُنئے کہ ایک روز جی نے چاہا کہ کوئی ایسا کام کیجئے جس سے نام باقی رہے۔ مگر یہ فقیر بادشاہ نہ تھا کہ رعایا پر رحم کرتا، غنی نہ تھا کہ محتاجوں کو مال و زر دیتا، زور آور نہ تھا کہ رستم کی طرح گرز اُٹھاتا، سپاہی نہ تھا کہ تیر و شمشیر کے وار دکھاتا، صاحبِ کرامت نہ تھا کہ کشف سے کرشمے ظاہر کرتا، عالم نہ تھا کہ جھگڑے چکاتا، سخی نہ تھا کہ ایثار کرتا، حکیم نہ تھا کہ معالج ہوتا، شاعر تھا، جھوٹ سچ بکتا تھا۔ پھر کون سی صورت نام باقی رہنے کی تھی۔ غزل، رباعی، مثنوی، واسوخت، مخمس، مسدس وغیرہ کہنے والے کہہ گئے، کسی نے کوئی بات اُٹھا نہ رکھی نہ مضمون آرائی، نظم و نثر کی صفائی مجھ سے کب بن پڑتی ہے۔ بالفرض دو چار شعر مرمٹ کر کہے۔ تو کیا کہے۔ اس پر فخر کرنا نرا اوچھا پن ہے۔ وضع میں دھبا لگتا ہے۔ سب سے قطع نظر کرکے یوں ٹھہرائی کہ ایک تذکرہ نئی طرز کا تالیف ہو تو کیا خوب ہو۔ پھر یہ بھی خیال ہوا کہ تذکرے تو بہت سے ہیں، محمد نیاز علی تم کیا تدبیر کرو گے۔ بھئی ایسا کرو کہ تذکرہ بطور مشاعرے کے مرتب ہو، جس میں زمانۂ حال کے سخنوروں کا کلام خواہ فارسی، خواہ اُردو، ایک ہی طرح پر لکھا جاوے۔ غرضکہ نیا پہلو یہ نکالا کہ طرح زرِ طبیعت کے آزمانے کی کسوٹی ہوتی ہے، کھوٹا کھرا پرکھا جاتا ہے، قافیہ اور ردیف کی نشست، بندش اور ترکیب کی خوبی، الفاظ اور معانی کی درستی، مضمون اور محاورہ چستی معلوم ہو جاتی ہے۔ خیر ان باتوں کو سوچ سمجھ کر استاد نامدار جناب مرزا صاحب گردون وقار سے کہا، انھوں نے فرمایا، ہاں بات تو ٹھیک ہے، مگر در تدبیر کرو۔ لاؤ طرح کہدیں، شاعر پسند کر لیں۔ چنانچہ مصرع طرح اردو کا فرمایا۔ ع

تری دیوار کے سایہ تلے آکر ہما ٹھہرے

دوسرا مصرع میرے بڑے مہربان مولوی احمد خاں صاحب تخلص صوفی نے تجویز کیا وہ یہ ہے:۔

در سرم از نکہت زلف است شوئے دگر

فارسی کا مصرع کیا شگفتہ ہے اور اُردو کا بہت پہلو دار، قافیہ وسیع، بحر رواں تمام حُسن رکھتا ہے۔ ایک اشتہار میں دونوں مصرعے مع ایک نقشہ مجوّزہ مؤلّف کے لکھ کر جا بجا بھیجے گئے"۔

پریشاں کو تذکرہ کا تاریخی نام شعر و سخن (۱۲۸۶ھ) خوب ہاتھ آیا ہے۔ اس تذکرہ میں شعرائے آگرہ کی فارسی و اُردو غزلیں ایک سو ایک ہیں۔ باہر کے شاعروں میں الہ آباد کی ۲۴ غزلیں درج ہیں۔ جن میں اعظم علی اعظم شاگرد خواجہ آتش لکھنوی اور منیر شکوہ آبادی ممتاز ہیں۔

شعرائے آگرہ میں بعض سن رسیدہ و کہنہ مشق ہیں لیکن اکثر نوجوان و کمسن ہیں۔ بعض شاعروں نے غالب کو اپنا استاد بتایا ہے۔ مثلاً مد دعلی تپش۔ شیخ عبدالمجید رسوا۔ رسوا نے اپنے حال میں لکھا ہے کہ "ایک مدت جناب میرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب کی خدمت میں رہ کر نظم و نثر فارسی کی مہارت کی"۔ یہ مشاعرہ غالب کے انتقال سے آٹھ مہینے بعد ہوا ہے۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی مولانا عبدالحق کے دادا مولوی فضل امام خیرآبادی تھے جن کی تصنیف مرقات علم منطق میں آج تک شامل درسیات ہے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ریاست پٹیالہ میں ملازمت کی۔ پھر دہلی میں صدر الصدور رہے۔ ۱۸۴۳ء ۱۲۵۹ھ میں وفات پائی۔ ان کے فرزند مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ جو ۱۷۹۷ء ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے، مرزا غالب کے بالکل ہم عمر تھے اور بڑے مخلص و بے تکلف دوست۔ علوم معقول اپنے والد سے حاصل کئے، اور علم حدیث حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے۔ دہلی میں سررشتہ دار رہے۔

پھر جھجر، الور، ٹونک کی ریاستوں میں ممتاز عہدوں پر رہے۔ لکھنؤ میں بھی صدر الصدور رہے ریاست رامپور میں نواب یوسف علی خاں نے بلایا اور تلمذ اختیار کیا۔ نواب کلب علی خاں نے بھی کچھ پڑھا۔ بڑے عالم متبحر تھے، اور عربی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر۔ ہندوستان میں ان کا جواب نہ تھا، بلکہ عرب کے شعرائے معاصرین سے بھی تحسین حاصل کی۔ کثیر التصانیف تھے، عربی میں درجنوں کتابیں اور حاشیے لکھے ہیں۔

مولوی فضل حق کے قیام لکھنؤ کے زمانے کا ایک لطیفہ[۵] بہت دلچسپ ہے جو حضرت قبلۂ عالم مولانا الحاج پیر سید جماعت علی شاہ صاحب امیر الملت محدث علی پوری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جس زمانے میں مولوی فضل حق صاحب لکھنؤ میں مقیم تھے، منشی نولکشور نے ان کی خدمت میں درخواست کی کہ اوقات فرصت میں مطبع کی عربی کتابوں کی صحت کتابت فرما دیا کریں۔ مولانا فضل حق نے قبول کر لیا، ایک مرتبہ مجتہد العصر لکھنؤ کی ایک مناظرہ کی کتاب مطبع نولکشور میں طبع ہونے کے لئے آئی۔ اس کی کاپیاں تصحیح کے لئے مولانا فضل حق کے پاس آئیں۔ آپ کتاب کی تصحیح بھی کرتے جاتے تھے اور مجتہد صاحب کے اعتراضات کا جواب بھی حاشیہ پر لکھتے جاتے تھے، جب کتاب چھپ کر مجتہد العصر کے پاس پہنچی تو انھوں نے سر پیٹ لیا کہ تمام عمر کی کمائی برباد گئی، اور منشی نولکشور سے دریافت کیا، انھوں نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ آخر مجتہد صاحب نے کتابوں کے انبار میں آگ لگوا دی۔

سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں اور منشی امیر احمد مینائی نے "انتخاب یادگار" میں مولانا فضل حق کے عربی قصائد کا انتخاب درج کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہوگیا، تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرم بغاوت عائد کیا گیا۔ اور حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم صادر ہوا، لیکن مولانا کے فرزند ثانی اور منشی غلام غوث بیخبر نے مقدمہ کی پیروی جاری رکھی، اور آخر رہائی کا حکم حاصل کر لیا، لیکن "تا تریاق از عراق" والا مضمون صادق آیا۔ جس وقت پروانہ

[۵] ماخوذ از فضلائے ہند مرتبہ مفتی انتظام اللہ صاحب۔

آزادی رنگون پہنچا۔ اسی وقت مولانا کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ۱۸۶۱ء ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی، اور رنگون میں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا عبد الحق ان کے فرزند اکبر تھے۔ ۱۸۲۸ء ۱۲۴۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد سے تحصیل علوم کی۔ ۱۶ سال کی عمر میں سند فضیلت حاصل کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، کچھ دنوں ٹونک میں رہے۔ پھر نواب کلب علی خاں نے رامپور بلا لیا۔ اور اپنے پوتے نواب حامد علی خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ ۱۸۶۵ء ۱۲۸۱ھ سے ۱۸۸۶ء ۱۳۰۴ھ تک یعنی نواب کلب علی خاں کی تمام مدت حکومت رامپور میں رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد کلکتہ گئے، وہاں حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ کے افسر رہے۔ شمس العلماء کا خطاب پایا، وہاں سے ۱۸۹۶ء ۱۳۱۴ھ میں نواب حامد علی خاں نے رامپور بلا لیا اور خود تلمذ اختیار کیا۔ یہاں سے بیمار ہو کر وطن خیر آباد گئے اور ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔

مولانا عبد الحق خیر آبادی اپنے زمانے میں امام فلسفہ تھے۔ آپ کے شاگردوں میں سے متعدد نامور علماء نکلے۔ مولانا نے ۴۰ کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک کتاب زبدۃ الحکمۃ اردو میں لکھی۔ یہ منطق کی قدیم کتابوں میں ہے، اور ایک کامل فن کے قلم سے نکلی ہے۔ اس سے پہلے منطق کی ایک اور کتاب کا پتہ چلتا ہے، یعنی ترجمہ شمسیہ مرتبہ سید محمد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۲ء لیکن وہ ترجمہ ہے اور اب نایاب۔ مولوی عبد الحق کی کتاب کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ مولوی نذیر احمد دہلوی نے بھی منطق میں ایک کتاب "مبادی الحکمۃ" کے نام سے لکھی ہے۔ اسی زمانے میں اور لوگوں نے بھی منطق کے رسالے لکھے ہیں۔ ان کا نمونہ اس کے بعد دیا جاتا ہے۔

زبدۃ الحکمۃ میں مولوی عبد الحق صاحب نے علمائے سابق کا اختلاف اور ان پر اپنا محاکمہ بھی لکھا ہے۔ مختصر نمونہ یہ ہے:۔

"جاننا چاہئے کہ علم دو قسم ہے، ایک تصور، دوسرے تصدیق۔ اس واسطے کہ جو چیز جانی جاوے بغیر حکم کے، یعنی اثبات یا نفی اس کے ساتھ نہ ہو، بلکہ صرف معنی اور مفہوم اس چیز کا ذہن میں حاصل ہو، اس کو تصور کہتے ہیں۔ جیسا کہ ادراک زید کا

یا قائم کا بغیر اس کے کہ حکم کیا جاوے زید پر ساتھ قائم کے۔ اور اگر جانی جاوے اس طور پر کہ حکم ہو اس پر اثبات یا نفی کا، اس کو تصدیق کہتے ہیں، جیسے جاننا زیدؒ قائمؒ کے معنی کا اور یقین کرنا اس کا۔ اور تصدیق کی حقیقت میں اختلاف ہے، حکماء کے نزدیک تصدیق صرف حکم کا نام ہے اور تصور موضوع محمول کا اور ایسا تصور نسبت حکیمہ کا اس کی تحقیق کی شرط ہے، یہ تصورات اس کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔ اس تقدیر پر تصدیق ادراک بسیط کا نام ہے۔"

منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی[۵]

منشی دیبی پرشاد سحر بدایوں کے کایستھ خاندان سے تھے۔ اپنے زمانے کے مشہور ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ ۱۸۹۵ء میں اسی خدمت پر بدایوں میں تھے۔ وہیں ۱۸۹۶ء میں پنشن لی اور مولوی محمد ذکریا خاں ذکی دہلوی (تلمیذ مرزا غالب) سب ڈپٹی انسپکٹر کو چارج دیا۔ نہایت ذی جوہر، صاحب ذوق آدمی تھے پنشن لیکر اپنے وطن بدایوں میں مستقل قیام اختیار کیا تو مرنے دم تک ارباب علم و ادب ہی سے صحبت رہی۔ ان کے مکان پر بھی ادیبوں اور شاعروں کا مجمع رہتا تھا۔ خود بھی شاعر تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کے جلسۂ تعزیت میں ایک مرثیہ لکھکر پڑھا۔ "سحر سامری" دیوان ان کی یادگار ہے۔ غالباً ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا۔

دیوان غزلیات کے علاوہ مختلف مضمونوں پر بہت اور بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ ادب کے تمام فنوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ خوش نویسی پر ان کی ارژنگ چیں اور نظم پروین اردو میں بہترین کتابیں ہیں۔ بار بار شائع ہو چکی ہیں اور اب بھی ملتی ہیں۔ ایک کتاب املا اور رسم خط پر ہے: معیار الاملا (دوسری اشاعت ۱۸۹۷ء)۔ ایک تالیف معیار البلاغت ہے جو ۱۸۶۶ء میں لکھی گئی تھی۔ جب سے

---

۵ منشی دیبی پرشاد کے یہ حالات ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی (الٰہ آباد یونیورسٹی) اور جناب محمد سلیمان صاحب بدایونی جابر کراچی نے خطوط میں لکھکر مؤلف کو آگرہ بھیجے تھے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں کئی بار چھپی۔ اس میں معانی، بیان، بدیع، عروض، قافیہ، اقسام نظم ونثر کے بیان میں چھ باب ہیں۔ سحرؔ کی دوسری تصانیف مرآۃ العلوم، رکاز العروض اور خلاصۃ المنطق ہیں۔ خلاصۃ المنطق سنہ ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا اور سنہ ۱۸۶۳ء میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"فصل چہارم بحث حجت میں حجت تین قسم ہے۔ اوّل قیاس اور وہ استدلال ہے حال کلّی کا حال جزئی پر۔ جیسے کل انسان حیوان ہیں، اور کل حیوان جسم ہیں، پس قیاس ہوا کہ کل انسان جسم ہیں۔ پس حال کلّی یعنی حیوان سے حال جزئی یعنی انسان پر دلالت ہوئی۔ دوم استقرا یعنی استدلال حال جزئی سے حال کلّی پر جیسے ہر انسان وطیور وبہائم کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتا ہے، پس معلوم ہوا کہ سب حیوانات کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتے ہیں۔ یہاں حال جزئیات یعنی انسان وطیور وبہائم سے حال کلّی حیوانات پر دلالت کی گئی۔ سوم تمثیل وہ دلالت کرنا ہے حال جزئی سے حال جزئی پر۔ بسبب اشتراک کسی امر کے ان میں، جیسے کہیں کہ بنگ حرام ہے کیونکہ شراب حرام ہے اور دونوں جزئی ہیں سکر کے یعنی دونوں میں نشہ ہے۔ مگر واضح ہو کہ استقرا وتمثیل مفید ظن ہیں، قیاس مفید یقیں۔"

مولوی محمد رضا لکھنوی

علمائے فرنگی محل کے خاندان سے تھے۔ قطب شہید فرنگی محلی ان کے اجداد میں ہیں۔ ان کے والد مولوی غلام یحییٰ خاں بنارس میں صدر الصدور رہے۔ اور سلسلہ تدریس کا بھی جاری رکھا۔ مولوی محمد رضا بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ طبیب حاذق تھے۔ مطب بھی کرتے تھے۔ پنشن کے بعد بھوپال میں ملازم ہوگئے تھے۔ جس وقت رسالہ منہاج المنطق لکھا ہے، مولوی محمد رضا خاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع کھیری تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر بیلنٹین کے انگریزی رسالہ منطق کا اُردو ترجمہ ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"بجائے مصطلحات والفاظ متداولہ منطق انگریزی کے بجنسہ مصطلحات والفاظ مستعملہ منطق عربی داخل ترجمہ کئے، اور التزام اس امر کا رکھا کہ محاورہ زبان اردو بھی ساقط نہ ہو اور ترجمہ بھی لفظاً بلفظٍ ہو۔"

یہ ترجمہ سنہ ۱۸۸۰ء (۱۲۹۸ھ) میں مرتب ہوا اور سنہ ۱۸۸۱ء میں مطبع نول کشور میں طبع ہوا۔

انگریزی میں کتب منطق کی ترتیب اور پڑھانے کا طریقہ عربی کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہے۔ یہی فرق اوپر کے دو مصنفوں کی تالیفات اور مولوی محمد رضا خاں کے ترجمہ میں ہے، اگرچہ ترجمہ کی زبان ان دونوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ صاف نہیں ہے۔ منہاج المنطق کا نمونہ یہ ہے:۔

"۲۶- قضیہ صادقہ کا عکس کچھ ضرور نہیں کہ صادق ہی ہو. مثلاً کُل گھوڑے حیوان ہیں قضیہ صادق ہے مگر اس کا عکس کہ کُل حیوان گھوڑے ہیں کاذب ہے. اصل قضیہ میں ہم نے سب گھوڑوں کا ذکر کیا ہے نہ سب حیوانات کا، اس لئے اس کے عکس میں ہم کو کُل حیوان کے ذکر کرنے کے بجائے صرف بعض حیوان کا ذکر کرنا چاہئے، اور اصل قضیہ میں اس بات کا ایما نہیں پایا جاتا کہ کُل حیوان گھوڑے ہیں، البتہ بعض کے ہونے کا پایا جاتا ہے۔

۲۷- یہ اقوال جو دفعہ ۲۲ سے ۲۶ تک مذکور ہوئے، بواسطہ اشکال کے بخوبی بیان ہو سکتے ہیں۔ پہلے یہ قضیہ لو کُل گھوڑے حیوان ہیں اور فرض کرو کہ سب گھوڑے ایک مثلث میں گھیرے جاویں، اور سب حیوان ایک دائرے میں۔ پس اس صورت میں اگر قضیہ مذکورہ صحیح ہے تو بالکل مثلث دائرہ کے اندر گھر جائے گا اس طور پر اور بالکل مثلث کے دائرہ میں گھر جانے کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑے کے کل افراد پر حکم ہے، اور چونکہ گھوڑے کے سوا اور بھی حیوان ہیں، اس لئے مثلث دائرہ کی تمام سطح پر محیط نہیں۔ اور اگر ہم اصل قضیہ کو منعکس کریں تو اس صورت میں کُل حیوان تو محکوم علیہ ہو ہی نہیں سکتے مگر چند۔ پس ہم کو حیوان کے ساتھ لفظ بعض کی بھی قید لگانی ضرور ہوگی، اور ہم شکل میں بھی دیکھتے ہیں کہ دائرہ کی بعض سطح مثلث کے ساتھ منطبق ہے حالانکہ بالکل مثلث بعض دائرہ کے ساتھ منطبق ہے"۔

مولوی محمد علی تحصیلدار

بچھراؤں ضلع مراد آباد وطن تھا۔ ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کی ابتدا ۱۸۳۴ء میں سررشتہ داری صدر الصدور سے ہوئی۔ صیغہ نظامت اور سررشتہ داخل خارج میں رہے۔ حدود تحصیلات قائم کرنے پر مامور رہے۔ رجسٹرار دیوانی رہے، پھر ۱۸۴۹ء میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں تحصیلدار ہوئے۔ تبادلے ہوتے رہے۔ بلاری ضلع مراد آباد سے جون ۱۸۷۶ء میں پنشن پائی۔ اور ۱۳۰۵ھ ۱۸۸۷ء میں رحلت فرمائی۔

مولوی عبدالرشید صاحب نے قطعۂ تاریخ کہا:-

جنابِ محمد علی حامیٔ دیں — بہ معقول و منقول فردِ یگانہ
بگویم سنِ رحلتش با دلائل — "مفسّر محدث فقیہ زمانہ"

۱۳۰۵ھ

مصرع تاریخ کے اعداد (۱۲۳۰) میں دلائل کے اعداد (۷۵) جمع کرنے سے ۱۳۰۵ھ سالِ وفات نکلتا ہے۔

سرسید کی مذہبی تحریروں نے علمائے ہند کو نہایت مضطرب کر دیا تھا۔ ہر طرف سے ان کی مخالفت میں کتابیں اور اخبار و رسائل شائع ہو رہے تھے۔ حدِّ اعتدال کو قائم رکھنا۔ عالم و جاہل دونوں کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ جوشِ مخالفت میں سرسید پر کفر کے فتوے لگا دیئے گئے۔ پھر جب ۱۸۸۰ء سے سرسید نے تفسیرِ قرآن کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو مخالفت اَور بڑھ گئی۔ ان مخالفوں میں ایک زبردست مخالف مولوی محمد علی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے سرسید کے ایک ایک فقرہ ایک ایک بات کا جواب لکھنا شروع کر دیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحوں کی کئی جلدیں تصنیف کیں۔ یہ مجلدات **البرہان** کے نام سے مشہور ہیں۔ پورا نام یہ ہے:- البُرھان علیٰ تجھیلِ مَنْ قَالَ بِغَیْرِ عِلْمٍ فِی الْقُرْآن۔ اب نہ سرسید کی تفسیر کوئی پڑھتا ہے نہ اس کا ردّ دیکھنے کی کسی کو ضرورت ہے۔ لیکن اس قسم کا لٹریچر بھی انیسویں صدی کی عجیب و غریب پیداوار ہے۔ مولوی محمد علی صاحب بڑے عالم اور باخبر بزرگ تھے۔ اس زمانے میں ایک طرف عیسائی اسلام پر حملے کر رہے تھے۔ دوسری طرف سرسید اور مولوی چراغ علی نے عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں اسلام کے بعض مُسَلَّم قوانین و اصول کی توجیہ اور رائے زنی شروع کر دی۔ ایسے معرکہ آرا ئیں مطابق حدیث شریف اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ (میری امت کا اختلاف رائے و اجتہاد بھی رحمت ہے) کبھی ایک فریق حق پر ہوتا ہے، کبھی دوسرا۔ بہر حال مولوی محمد علی صاحب

نے عیسائیوں اور (بقول خود) نیچریوں، دونوں کے جواب لکھے۔ ۱۸۷۴ء میں کانپور سے ایک رسالہ نور الآفاق اسی مذہبی مناظرے اور مناقشے کے لئے جاری ہوا تھا۔ اس میں مولوی صاحب نے مضامین لکھے۔

مولوی محمد علی صاحب کی متعدد غیر مطبوعہ تصانیف کے علاوہ مطبوعہ کتابیں یہ ہیں :-

(۱) سَدُّ الشقاقِ فِی جوازِ الاِستِرقاق۔ سر سید کے رسالہ "ابطال غلامی" کا جواب، اسلام میں لونڈی بنانے کے رواج کو جائز ثابت کیا ہے۔ مطبوعہ نظامی پریس کانپور ۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱ھ۔

(۲) ظفر مبین۔ مسٹر اینڈرسن کے اعتراضات کا جواب۔

(۳) سوط اللہ الجبار۔ یہ بھی اینڈرسن کا جواب ہے۔

(۴) البرھان۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مطبوعہ مطبع گلزار احمدی مراد آباد۔

مولوی محمد علی نے اپنی تصنیف البرہان میں سر سید کی ہر قسم کی غلطیاں قرآن فہمی وعربی دانی کے متعلق صرف ونحو، علم زبان، علم کلام، اصول تفسیر کے حوالوں کے ساتھ بیان کی ہیں۔ زبان میں قدامت کا اثر ایسا ہی ہے جیسا سر سید کی تحریریں۔ سر سید کو ہر جگہ "سید الطائفہ" یا "سید الطائفۃ النیچریہ" لکھا ہے۔ اول لفظ قَالَ لکھ کر سر سید کی تفسیر کا حصہ نقل کیا ہے۔ پھر قلتُ لکھ کر اپنا جواب لکھا ہے۔ نمونہ یہ ہے :-

"قَالَ، جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بجز اس کی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے ان کو نہیں دکھا سکتے تھے۔ پس وہ ان کو قریب اس پہاڑ کے لے گئے جس کی آتش فشانی اور گڑگڑاہٹ اور زور شور کی آواز اور پتھروں کی آواز کے خوف سے بیہوش ہو گئے۔

قُلتُ۔ بیان واقعہ میں کس قدر مغالطہ کو کام میں لا رہے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کلمات ہیں لَن نُّؤمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللہَ جَھرَۃً، یعنی ہم تجھ پر ایمان نہ لاوینگے

جب تک اللہ کو عیاناً نہ دیکھ لیں گے۔ اس گستاخی اور کفر کی سزا میں ان پر یہ عذاب نازل ہوا تھا اگر یہ کہتے کہ ہم خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ان پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا، بلکہ حضرت موسیٰ ان کو سمجھا دیتے کہ تم خدا کو اس دار دنیا میں نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سمجھا دیا تھا کہ (لَنْ تَرَانِیْ)۔[۵]......

اور چونکہ بقول سید الطائفہ کے وہ پہاڑ آتش فشاں تھا، اور آتش فشاں پہاڑوں کا حال جو کچھ ہے وہ کوئی عجائبات سے نہیں، ایک معمولی بات ہے۔ اس سے تو بدرجہا زائد عجائبات وہ دیکھ چکے تھے کہ ان کی نظروں کے سامنے بحر قلزم پھٹ گیا۔ اور پانی کے تودے کوہ ہائے عظیم کے برابر ان کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے، اور وہ خشکی میں ان تودوں کے درمیان عین قعر دریا میں ہو کر نکل گئے۔ عصا کی کیفیت دیکھ چکے تھے کہ اژدہا ہو کر ساحروں کی لاٹھیوں اور رسّیوں کو نگل گیا۔ مقام رفیدیم میں ایک سنگ خارا سے بارہ چشمے پانی کے جاری کر دئے۔ ان عجائبات کے مقابلہ میں ایک ایسے امر کو دستور مستمر کے موافق ظہور اس کا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے وہ لوگ کس طرح پر عجائبات اور کرشمہ سمجھ سکتے تھے، اور ایسا امر معمولی کہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کی نہ کچھ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے، نہ ان کی عظمت، نہ ان کی نبوۃ و تقرّب پر دلالت کرتا ہے، کسی طرح پر باعث اس کا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے اس مقولۂ کفریہ سے کہ (لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ) رجوع کریں، بلکہ یہ امر موجب ازدیاد کفر اور بدگمانی کا تھا کہ قوم کو دھوکا دیا۔ خدا کے دکھانے کا تو اظہار کیا اور کوہ آتش فشاں میں لیجا کر ان کی مٹی خراب کی۔ اور کیا سید الطائفہ کے نزدیک وہ لوگ سب کے سب اندھے بہرے نادان ایسے مسلوب الحواس تھے کہ دور سے نہ گڑگڑاہٹ کی آواز سنی نہ آگ کے شعلے دیکھے نہ آگ کی گرمی ان کو محسوس ہوئی، اپنی موت ان کو نظر نہ آئی۔ یہانتک کہ اس مقام سے کہ جہاں سے

[۵] یہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر عزیزی سے ایک طویل فارسی عبارت اپنے قول کی تائید میں نقل کی ہے۔ وہ حذف کر دی گئی۔

یہ امور محسوس ہو سکتے تھے آگے تک بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ایسے قریب پونہچ گئے کہ مرنے تک کی نوبت پونہچ گئی .... بس کسی طرح عقل باور نہیں کرتی کہ ایسے لوگ موسیٰ عم کے کہنے سے دیدہ و دانستہ آتش نشاں پہاڑ کے قریب اپنی جان کھونے کو چلے جاتے اور ان سے یہ جھگڑا نہ کرتے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے دکھانے کے تجھ سے خواہاں تھے تو ہمیں اس آتش فشاں پر مار ڈالنے کے واسطے لئے جاتا ہے۔"

منشی امیر احمد مینائی

حضرت امیر مینائی لکھنوی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مشاہیرِ مصنفینِ نثر میں ان کا شمار نہیں ہوتا۔ لیکن انھوں نے بھی نثر کی چند کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک "تذکرۂ شعرا" ہے، اس لئے اہم اور قابل ذکر ہے۔ دوسری اردو لغت کی کتاب (امیر اللغات) ہے۔ یہ اردو کی بہترین خدمت تھی اگر مکمل ہو جاتی، لیکن ناتمام بھی حضرت امیر مینائی کا کارنامہ ہے۔ یہ راہ پہلے انھیں نے نکالی۔ جن اصول پر لکھنا شروع کیا تھا، ان پر چل کر اور لوگوں نے کامیابیاں حاصل کیں۔

امیر مینائی مولوی کرم محمد کے فرزند رشید تھے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے عہد حکومت میں ۱۸۳۲ء / ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ درسیات کی تکمیل مفتی سعد اللہ رامپوری اور علمائے فرنگی محل سے کی، شاعری کا بچپن سے شوق تھا، منشی مظفر علی اسیر سے تلمذ حاصل کیا۔ اس زمانے میں آتش و ناسخ کے شاگردوں کے باہم معرکے اور انیس و دبیر کے مقابلے زور شور پر تھے۔ جرح و قدح اور نقد و نظر کا بازار گرم تھا۔ اس لئے کسی ادنیٰ شاعر کو فروغ حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت امیر مینائی نے شروع ہی سے شاعری پر محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہرت حاصل کر لی کہ ۱۸۵۲ء / ۱۲۷۵ھ میں جبکہ امیر صاحب کی عمر بیس۲۰ سال کی تھی واجد علی شاہ نے ان کو طلب کیا اور کلام سنا۔ بادشاہ کے حکم سے دو کتابیں

ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان لکھ کر پیش کیں۔ اور دربارِ شاہی سے خلعت پایا۔
غدر کے بعد ۱۸۵۸ء ۱۲۷۵ھ میں نواب یوسف علی خاں نے رامپور بُلالیا۔ اور بڑی عزّت کی۔ اپنے کلام پر اصلاح بھی لی۔ پھر اُن کے بعد نوّاب کلب علی خاں نے امیر کو اپنا اُستاد بنالیا۔ ان کے بعد نوّاب حامد علی خاں نے قدر و منزلت کی۔ ۴۲ برس ریاست رامپور میں بڑی عزّت و راحت سے رہے۔ پھر نوّاب مرزا داغ نے امیر صاحب کو حیدر آباد بُلالیا۔ حضور نظام کا ایما پہلے ہو چکا تھا۔ امیر حیدر آباد گئے، لیکن جاتے ہی بیمار ہو گئے اور اکتوبر ۱۹۰۰ء (جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ) میں وصال فرمایا۔

خاکسار مولّف نے تاریخ وفات کہی تھی:۔ "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند" (۱۳۱۸)۔ عیسوی تاریخ قرآن مجید سے نکلی:۔ وَلَلْآخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلیٰ ۱۹۰۰ء

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب حضرت امیر مینائیؔ سفر دکن پر جانے لگے تو اپنا یہ شعر پڑھا ؎

اب نہ ٹھہروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

اس میں لفظ غریب الوطنی سے ان کا سال وفات (۱۳۱۸ھ) نکلتا ہے۔

امیر مینائیؔ بڑے عالم، مفتی، عابد و زاہد، اور صاحب عرفان تھے سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں رامپور کے ایک عارف کامل حضرت امیر شاہ قدس سرّہٗ کے مرید اور صاحب اجازت تھے۔ باوجود مشاغل شعر و ادب اور خدمت سلاطین کے ریاضت روحانی میں فرق نہ آتا تھا۔ دیانت کا یہ حال تھا کہ جس زمانے میں امیر صاحب رامپور میں عدالت دیوانی کے حاکم تھے، نواب خُلد آشیاں کلب علی خاں ولی عہد تھے۔ ایک مرتبہ ولی عہد بہادر کے کسی خادم خاص کا مقدمہ حضرت امیر مینائیؔ کی عدالت میں پیش ہوا۔ ولی عہد نے امیر صاحب سے اس کی سفارش کہلا بھیجی۔ لیکن انھوں نے انصاف و دیانت کو ہاتھ سے نہ دیا اور روئداد مقدمہ کے لحاظ سے اس شخص کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ اس وقت ولی عہد کو یہ بات ناگوار گذری لیکن جب خود تخت نشیں ہوئے، اور مصالح عدالت و سیاست پر نظر پڑی تو ایک دن خود امیر صاحب سے فرمایا کہ اب آپ کی اس کارروائی کا مجھ سے زیادہ قدر شناس کوئی نہیں۔

حضرت امیر مینائی عربی و فارسی کے عالم ہونے کے علاوہ ہندی و سنسکرت بھی خوب جانتے تھے، طب بھی پڑھی تھی، علم جفر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جفر میں دو کتابیں "امور غیبیہ"[۵۱] اور "رموز غیب" بھی لکھی تھیں۔ امیر مغفور کی تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ کثرت سے ہیں۔ ۲۵ سے کم نہیں۔ لیکن اکثر نظم کی ہیں، جن میں دو دیوان عشقیہ، مرآۃ الغیب (۱۲۸۹ھ) اور صنم خانۂ عشق (۱۳۰۶ھ) ایک دیوان نعتیہ محامد خاتم النبیین (۱۲۸۷ھ) ایک مجموعہ واسوخت، مینائے سخن (جو بعد وفات شائع ہوا) خاص چیزیں ہیں۔ نثر میں رسالہ میلاد شریف خیابان آفرینش (۱۳۰۵ھ)، نماز کے اسرار، زاد الامیر، امیر اللغات اور انتخاب یادگار مطبوعہ یادگاریں ہیں۔ امیر مرحوم کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب اکبرآبادی مرحوم (سابق پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار) نے مکتوبات امیر مینائی کے نام سے مجموعہ خطوط شائع کر دیا ہے۔

امیر صاحب کے مکان رامپور میں ۱۸۹۹ء میں آگ لگ گئی تھی۔ جس سے ان کے کتب خانہ کا بڑا حصہ جل گیا۔[۵۲] یہ حضرت امیر کے ذاتی نقصان کے علاوہ ملک و قوم اور زبان و ادب کا اتنا بڑا نقصان تھا جس کی کوئی تلافی ممکن نہ تھی۔ کتنی غیر مطبوعہ تصانیف خاک سیاہ ہو گئیں۔ جن میں ان کے دوسرے دیوان کے بعد کا کلام بھی تھا، جس کے متعلق خود حضرت امیر کا بھی خیال تھا کہ "صنم خانہ" سے بہتر ہے۔ "صنم خانۂ عشق" کو وہ اپنا بہترین کلام نہ سمجھتے تھے۔

---

۵۱ ممکن ہے یہ نام تاریخی ہوں۔ پہلے سے ۱۲۶۴ھ اور دوسرے سے ۱۲۶۵ھ نکلتے ہیں۔ امیر مرحوم کی اکثر کتابوں کے نام تاریخی ہیں۔ اس لئے یہ قیاس ہوتا ہے۔

۵۲ بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ء درج ہے۔ اگر ایسا ہے تو ممکن ہے وہ آگ پہلے لگی ہو۔ ۱۸۹۹ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے۔ میں رام پور میں حضرت امیر مینائی کے محلے میں ان کے مکانات سے قریب ہی رہتا تھا۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے میرا مکان فاصلے پر تھا۔ پھر بھی وہاں سے جلے ہوئے کاغذ اڑ کر میرے گھر آتے تھے۔ اس حادثہ سے ہم سب پر عجب ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور جلیل صاحب کا دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ بعض تقریبیں جن میں شریک ہوا یاد ہیں۔　حامد حسن قادری

امیر مرحوم کی تصانیف نثر میں انتخاب یادگار (۱۲۹۰ھ) سب سے قدیم ہے۔ یہ نام تاریخی ہے۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں مرتب ہوا۔ اس میں صرف اُن شاعروں کا حال و کلام درج ہے جو رامپور کے رہنے والے یا دربار رامپور سے تعلق رکھنے والے تھے۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر کے حکم سے لکھا گیا۔ امیر مرحوم دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"ایک دن بندگان حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعرائے ماضی وحال کا ایسا تیار ہو کہ اس سے خاص اس دارالریاست کے متوطن اور متوسل شاعروں کی مختصر کیفیت سخن گوئی کی حقیقت نقش صفحۂ روزگار رہو۔ اسی ضمن میں اعزاز اس ہیچداں کا بھی منظور ہوا۔ بندۂ ہیچمیرز اس خدمت پر مامور ہوا، اور محض باقتضائے عطوفت خسروانی آغاز سے انجام تک برابر حضور نے التفات فرمایا۔ تب یہ تذکرہ ایک سال میں تمامی پر آیا۔"

چھ سو صفحے کے قریب ضخامت ہے۔ اور چار سَو سے زیادہ شاعروں کا حال ہے۔ شروع میں ۶۸ صفحوں میں تمام والیان ریاست رامپور کا مفصل حال لکھا ہے، اور ان میں سے جو شاعر تھے ان کا کلام بھی۔ اس کے بعد عام شعرا کا تذکرہ حروف تہجی کی ترتیب سے۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی، جس زبان کا جو مسلمان یا ہندو شاعر ہے۔ اس کا تھوڑا یا بہت تذکرہ ضرور ہے۔ عربی اور ہندی کے تمام اشعار کا اردو ترجمہ بین السطور میں لکھ دیا۔ انتخاب یادگار میں چونکہ شعرائے رامپور کا احاطہ کرنا تھا، اس لئے ہر قسم کے شاعر شامل کر لئے گئے، بہرحال یادگار ہونے میں شک نہیں۔ کتنے اچھے شاعر ایسے بھی ہیں، جو اور کسی تذکرے میں نہ مل سکتے۔ "خمخانۂ جاوید" جیسے تذکروں کو انتخاب یادگار سے بہت مدد ملی۔

اس کی طرز تحریر میں کوئی خاص بات نہیں۔ جس زمانے میں امیر مغفور نے یہ کتاب لکھی ہے۔ مقفیٰ عبارت کا رواج تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سرسید کی صاف و روان تحریریں شائع ہو رہی تھیں، مولوی نذیر احمد دہلوی کی "مراۃ العروس" وغیرہ مشہور ہو گئی تھیں۔ عام کتابوں اور رسالوں میں قافیہ کی آرائش باقی نہ رہی تھی۔ لیکن غالباً کچھ تو حضرت امیر کی اپنی پسند کچھ یہ خیال کہ شاہی فرمان سے کتاب لکھی جاتی ہے تو

اس پر محنت بھی ہونی چاہئے اور کچھ خصوصیت اور زیب و زینت بھی انتخاب یادگار کی اس خاص طرز کے باعث تھے۔ مختصر نمونہ یہ ہے:-

"حیاؔ، صاحب عالم مرزا رحیم الدین خلف صاحب عالم مرزا محمد کریم الدین رسا، اٹھتر برس کا سن ہے، جیسا ظاہر ہے ویسا ہی باطن ہے۔ نہایت خوش طبیعت نیک خصال ہیں، آفرینش سخن میں بڑے ذی کمال ہیں، شطرنج بھی خوب کھیلتے ہیں، وطن تدیمی ان کا دہلی ہے مگر مدت سے اسی سرکار فیض آثار میں تعلق ہے، مع اہل و عیال یہیں رہتے ہیں، مشق کا یہ عالم ہے کہ مواجی طبیعت سے دریا کی طرح بہتے ہیں، زبان اچھی مذاق اچھا ہے، فکر بلند ذہن رسا ہے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد رشید ہیں، اشعار ان کے قابل دید ہیں۔

تھے اک نگاہ میں مرے عقدے تمام حل　　اتنا سا کام آپ کو دشوار ہو گیا
تڑپنے یہ نہ دیکھا گیا، یہ محض غلط　　نہ بیٹھنے کا مگر ان کو اک بہانہ ہوا
دشمن صد چاک دامن اور سودا عشق کا　　یہ بھی کیا میں ہو گیا، میرا گریباں ہو گیا
چین کیا آئے شب غم موت بھی آتی نہیں　　یاں تو دم کا بھی نکلنا دل کا ارماں ہو گیا
ہاتھ ہے دل پر پس مرگ اس لئے　　درد نکل جائے نہ دم کی طرح
یہ میدان محشر ہے، دنیا نہیں ہے　　کہ ٹکڑے اڑا دو گے گھر سے نکل کر"

امیر صاحب نے حیاؔ کے بہت سے شعر درج کئے ہیں، یہاں امیرؔ کی پسند اور انتخاب کی خوبی دکھانے کے لئے چند شعر نقل کر دیئے گئے ہیں۔

امیر مینائی مرحوم کا دوسرا کارنامہ امیر اللغات ہے۔ ان سے پہلے بھی اردو لغات[5]

---

[5] اردو لغات۔ اردو کی چند قدیم لغت کا ذکر یورپین مصنفین کے ذکر میں آ چکا ہے۔ اہل یورپ کی لغات اردو سے پہلے ملا عبدالواسع ہانسوی نے غرائب اللغات لکھی تھی جس کو سراج الدین علی خاں آرزو نے دوبارہ صحت کے ساتھ نوادر الالفاظ کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی نے کوئی قابل ذکر لغات کی کتاب نہیں لکھی۔ یورپ والوں کو ہندوستان میں آکر اردو زبان سیکھنے کے سلسلے میں اردو (باقی حاشیہ صفحہ ۳۴۲ پر)

کی کتابیں بہت لکھی گئیں، لیکن ایسی جامع کتاب کوئی نہ تھی۔ امیر مرحوم نے اُردو محاوروں کا احاطہ اور سند کے اشعار کا اضافہ بڑی کاوش کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن صرف دو جلدیں آلف ممدودہ و آلف مقصورہ کے الفاظ کی ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئیں۔ تکمیل نہ ہو سکی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۱)

کی فرہنگ کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک مشنری ایم۔ ٹی نیسیس نے ۱۷۴۳ء میں اُردو لغات مرتب کئے۔ پھر ۱۷۷۳ء میں فرگیس نے ہندوستانی انگریزی لغت لکھی۔ پھر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۳ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری شائع کی، اس کے بعد اہلِ یورپ نے کثرت سے اُردو لغت لکھے، جن میں یہ کتابیں ممتاز ہیں:۔ (۱) کپتان ٹیلر کی اُردو انگریزی لغت (۱۸۰۸ء) (۲) گلیڈون کی ڈکشنری (۱۸۰۹ء)۔ (۳) کپتان روبک کی "لغت جہازرانی" ۱۸۱۱ء۔ (۴) جان شیکسپیر کی اُردو لغت ۱۸۱۳ء۔ (۵) ڈنکن فوربس کی ہندوستانی لغت ۱۸۴۷ء (۶) فرانسیسی برٹرینڈ کی اُردو لغت ۱۸۵۸ء۔ (۷) ڈاکٹر فیلن کی چار اُردو ڈکشنریاں عام الفاظ کی الگ اور قانونی الفاظ کی الگ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۸۰ء تک۔ (۸) پلیٹ کی اردو ہندی ڈکشنری ۱۸۸۴ء۔

اہلِ ہند نے بھی لغت نویسی کی طرف توجہ کی، (۱) میر اوحدالدین بلگرامی نے اُردو لغات اور محاورے "نفائس اللغات" میں جمع کئے۔ کتاب فارسی میں لکھی ہے۔ عربی مترادف الفاظ بھی لکھے ہیں۔ محمد علی شاہ اودھ کے عہد حکومت (تا ۱۸۴۲ء) میں مرتب ہوئی (۲) اس کتاب میں جو لغت رہ گئے تھے۔ ان کو بھی شامل کر کے محبوب علی رامپوری نے منتخب النفائس کے نام سے نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کی، یعنی تمام لغت جدولوں میں لکھی ہے۔ تین خانے بنائے ہیں۔ پہلے خانے میں اُردو لفظ، اس کے سامنے دوسرے خانے میں فارسی مترادف اور تیسرے میں عربی۔ متن میں کوئی عبارت نہیں۔ لغات کے اعراب، تشریح، سند کے اشعار وغیرہ سب حاشیہ میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں امجد علی شاہ اودھ (عہد حکومت تا ۱۸۴۷ء) کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ اور ۱۸۶۸ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپی۔ مصنفینِ لغت میں علی اوسط رشک، مرزا پچھو بیگ عاشق، حکیم ضامن علی جلال، لالہ چرنجی لال اور مولوی سبحان بخش کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ (۳) مولوی سید احمد دہلوی کی "فرہنگ آصفیہ" ۱۸۹۲ء (۴) امیر اللغات (۵) فصیح اللغات مولانا احسن مارہروی نے مرتب کرنی شروع کی تھی۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۳۴۳ پر)

امیر اللغات کا دیباچہ امیر صاحب نے نہایت سلیس و رواں اردو میں لکھا ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے "امیر اللغات" کی داستانِ تالیف بھی معلوم ہو گی:۔

"میں نے ہوش سنبھالا، آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہلِ زبان اور زباندان مرزمین سخن کے فرمانروا ہیں۔ انھیں صحبتوں میں اُردو زبان کی چھان بنان کا شوق مجھے بھی ہوا، اسی زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی، اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی کہ اُردو الفاظ کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں۔ اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی، اور غدر ہو گیا۔ وطن کی تباہی اور گھر بار کے لُٹنے سے چند سے حواس ہی جمع نہ ہو سکے، الفاظ کیسے! لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی رہی، یہاں تک کہ فردوس مکاں نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والی رامپور نے مجھے طلب فرما کر عزت کا خلعت اور اطمینان کا سرمایہ دیا۔ اب میں پھر اپنی تمنا کے سلسلے کو بڑھانے لگا مگر اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی میرے متعلق تھی۔ نواب فردوس مکاں اپنے کلام میں بھی متوجہ فرماتے تھے، اور فن شاعری کے مشغلے جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۲)

حضرت داغ دہلوی سے اس کے سند کے اشعار لکھوائے تھے لیکن ناتمام رہ گئی۔ (۶) نواب عزیز جنگ کی "آصف اللغات" یہ ڈکشنری کیا انسائیکلو پیڈیا تھی۔ لیکن ناتمام رہ گئی تقریباً ۸ ہزار صفحوں میں حرف (ت) تک نوبت پہنچی تھی۔ (۷) نور اللغات مولوی نور الحسن علوی نیر کاکوروی نے ۱۹۳۰ء میں مکمل کر کے شائع کی۔ (۸) اس کے بعد پنجاب سے جامع اللغات مولوی عبد المجید نے شائع کی۔ یہ نور اللغات سے زیادہ ضخیم ہے۔ ان بڑی کتابوں کے علاوہ خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی، مرزا عزیز لکھنوی، مولوی فیروز الدین وغیرہ نے مختلف اُردو لغات شائع کی ہیں۔ (۹) انگریزی لغات کے اُردو معانی کے لئے اب تک کوئی مکمل و مستند ڈکشنری نہ تھی۔ یہ کمی حال میں ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب نے پوری کر دی کہ "اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری" کے نام سے نہایت ضخیم لغت انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

نئی نئی شکلوں سے پیش آتے ہیں، وہ یوں بھی کم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو میں نہ پا سکا کہ اپنے ارادے کو پورا کروں، تاہم کچھ کچھ شغل چلا گیا۔ جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد آیا تب فرصت کی کمی اور بڑھی، لیکن کچھ ہی ہوا، یہاں وہی دھن بندھی رہی۔ ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدر دان، سر الفرڈ لائل صاحب بہادر (لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی و چیف کمشنر اودھ) نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اُردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلد آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی، فوراً "آنکھ" کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا، جسے نواب خلد آشیاں نے جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر (سابق سفیر ریاست و حال وائس پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی) کے ذریعے سے سر الفرڈ لائل صاحب بہادر کے پاس بھیجا۔"

آگے کا قصہ یہ ہے کہ لفٹنٹ گورنر نے نمونہ پسند کیا اور سرپرستی و امداد کی اُمید دلائی۔ لیکن وہ چلے گئے اور نواب خلد آشیاں کا انتقال ہو گیا۔ امیر اللغات کا کام رُک گیا۔ آخر نواب حامد علی خاں کے عہد میں اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ امیر اللغات کا نمونہ یہ ہے:-

"آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ گئی ہیں یہ مثل اس جگہ بولتے ہیں جہاں کسی کام میں بہت کچھ محنت و مشقت ہو چکے، تھوڑی سی کوشش باقی رہے۔ داغ ؎

جو منچیں آنکھیں تو پلکیں بھی کوئی پل کی ہیں رہی ہیں بس یہی آنکھوں کی سوئیاں باقی

اس مثل کی نسبت ایک کہانی مشہور ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی عورت نے ایک شخص کو دیکھا کہ مُردہ سا پڑا ہے اور تمام بدن میں سوئیاں چبھی ہوئی ہیں۔ سمجھی کہ کسی نے اس پر جادو کیا ہے اس لئے کہ بقول مشہور ایک قسم کے جادو میں سوئیاں بھی چبھوتے ہیں۔ وہ سوئیاں نکالنے لگی۔ سارے بدن کی سوئیاں نکال لیں، صرف آنکھوں کی باقی رہ گئی تھیں کہ ایک عورت وہاں اور آ گئی۔ اس سے اس نے کہا کہ اب آنکھوں کی سوئیاں نکالنی باقی ہیں تو یہاں ٹھہر کا رہ

میں ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کسی ضرورت کو گئی۔ اس عورت نے اس کی آنکھوں کی سوئیاں نکال لیں۔ اور وہ شخص سحر سے نجات پا کر اٹھ بیٹھا۔ محبت اور ہمدردی اس عورت کی ثابت ہوئی جس نے آنکھوں کی سوئیاں نکالی تھیں۔"

امیر مینائی کے خطوط بھی ان کی عمدہ یادگار ہیں۔ بعض میں شعر و ادب کے مسائل بیان کئے ہیں۔ بعض پرائیویٹ خط بہت دلچسپ ہیں۔ اس طرح کا ایک خط حضرت داغ دہلوی کو لکھا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مرزا داغ کو حضور نظام دکن نے "استاد السلطان" کا خطاب دیا۔ اخباروں میں اس کا تذکرہ چھپا، امیر صاحب نے بھی دیکھا۔ انھیں دنوں میں مرزا داغ کا خط امیر کے پاس آیا، لیکن انھوں نے اپنے خطاب و اعزاز کا ذکر نہ لکھا تھا۔ اس خط کے جواب میں امیر لکھتے ہیں:-

"مصدر لطف اتم قدیمی مکرم سلامت۔ سلام مسنون اخلاص مقرون۔ مدت کے بعد نوازش نامہ آیا، ممنون یادآوری فرمایا۔ بندہ نواز مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز کیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کہ خط نہ پہنچا ہو۔ بہرکیف جرم ناکردہ کا عذر خواہ ہوں۔ اخبار گورکھپور میں ریاض نے آپ کا مخاطب بخطاب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھاپا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا، مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ سرور کھٹ گیا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے تلمذ سے فرمائی وہ میرے سرور آیندہ ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہے ہیں۔ خدا جلد ظہور میں لائے۔ شکایت جو آپ نے "صنم خانۂ عشق" دیوان دوم تک نہ پہنچنے کی لکھی ہے، وہ دیوان چھپا کہاں، ورنہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔ تالیفات کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچنا معاذاللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ نے ترک وسیلہ سے نہ گزارا ہو۔ افسوس کہ اتنی مدت تک یکجائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔ میاں بوڑھے ہو گئے ہو، یہ شیوہ چھوڑ دو کہ زبردستی رنگا دشک کے لئے ایک بات قرار دی ہے۔"

(داغ نے امیر کے خطاب کے متعلق استفسار کیا ہوگا، اس کا جواب اسی خط میں دیتے ہیں)

اول تو میں خطاب پہنے ہی سے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا، اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا، یہ تو بالکل پسند نہیں۔ میاں اب تو وہ وقت آگیا کہ مرحوم و مغفور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو، کوئی اور حوصلہ نہیں ہے ۔۔۔۔

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ میں کہتا کیا ہوں جو لکھوں، جی افسردہ رہتا ہے کبھی کسی گلدستے والے کے اصرار سے کچھ بکتا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ یہ فراغتیں چشم بددور، آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں، خدا جمعیت خاطر بڑھائے۔

(اسی خط کی آخری سطروں میں کس بے تکلفی اور خلوص سے لکھتے ہیں)

ارے یار، استاد السلطان ہونے کی مٹھائی تو لاؤ۔ یا استاد یا استاد برسوں کہا کیا ہے۔ اب جو وقت آیا تو استاد کی شیرینی نذار د۔ امید ہے کہ کبھی کبھی رسم رسل و رسائل رہے۔ میں ابتدا سے تمہارا دوست اور خیر خواہ ہوں، میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

امیر فقیر ۳۱ مارچ ۹۱ء

یہ خط مکتوبات امیر مینائی میں شامل نہیں ہے۔ رسالہ نیرنگ[۵] دہلی کے امیر نمبر سے نقل کیا گیا ہے۔ اس لئے نادر یادگار ہے۔

---

۵ مولوی عزیز اللہ خاں رامپوری مرحوم نے غالباً ۱۹۲۷ء میں ریاست رامپور سے "نیرنگ" جاری کیا۔ گھر کا چھاپہ خانہ ان کے والد مغفور سعید اللہ خاں صاحب عیش رامپوری کا قائم کردہ (مطبع سعیدی) موجود تھا۔ سعید اللہ خاں بھی بڑے صاحب ذوق تھے۔ ایک رسالہ تہذیب نام مدتوں نکال چکے تھے۔ بعض نادر کتابیں اپنے مطبع سے شائع کیں۔ تسیر شکوہ آبادی کے کئی دیوان چھاپے۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کا دیوان شائع کیا۔ منشی احمد علی شوق قدوائی کی نظموں کا مجموعہ (گنجینہ) کے نام سے شائع کیا۔ ان کے فرزند رشید عزیز اللہ خاں نے نیرنگ کو علمی و ادبی شان کے ساتھ جاری رکھا۔ بعض خاص نمبر بڑے اہتمام سے شائع کئے۔ جن میں میر نمبر اور امیر نمبر ممتاز ہیں۔ عزیز اللہ خاں بیمار رہنے لگے تو ان کے دوست عشرت رحمانی صاحب رامپوری نے ہاتھ بٹایا اور نیرنگ کا اہتمام اپنے ذمہ لیکر دہلی سے نکالنا شروع کیا۔ عزیز اللہ خاں کی بے وقت جواں موت نے ایسا صدمہ پہنچایا کہ نیرنگ دہلی میں بھی اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ اور کچھ عرصہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔

ایک اور خط حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی کے نام یہ ہے:-

۸ر مارچ ۱۸۹۸ء

مجبی حکیم صاحب

سلام مسنون دعا مشحون۔ مہربانی نامے نے پونہچ کر شکر گذار یاد آوری کیا۔ ابتک آپ کا فائز مرام نہونا سخت افسوس کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حسب دلخواہ کامیاب فرمائے۔ یہ داعی خیر دعا سے کسی وقت غافل نہیں ہے۔

بھانا پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے۔ ہمیں (میں ہی) کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو، مگر کسی معتبر کلام میں ابتک نظر سے نہیں گزرا۔ حکم اس کے استعمال کا نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت امیر مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیونکر رہ گیا۔ اور میں نے بھی اسے دیکھا ہے تو سوا اپنے سہو نظر کے اور کیا کہا جائے انکھڑیاں چشم معشوق کے لئے مخصوص ہے، اور یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے۔ بڈھنا لفظ نہیں ہے بدھنا ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ صبا ؎

شور جس کا ہے وہ ہے عشق جنوں زا دل میں
بدھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں

ایجاد مذکر ہے۔ سند کے واسطے شعر ذیل میں دیکھئے۔ آج کل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں، اور جا بجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغؔ کا قول ہے کہ دلّی میں مونث ہے مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے، اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔ نسیم دہلوی ؎

قبر پہ آیا ہے دینے کو مبارکباد مرگ — یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

میر ؎

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستاں میں ۔۔۔ زاغوں کو لگا رہنے صیّاد گلستاں میں

اگرچہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا ہے، وہ سند کے لئے پورے طور سے کافی نہیں ہوسکتا، مگر دیوان میں اس طرح چھپا ہے، اور ثقات کو اسی طرح پڑھتے سُنا ہے۔ غافل لکھنوی ؎

اتنی بینائی کہاں دیکھیں جو سیر جزو و کُل ۔۔۔ عالم ایجاد میں تو سیکڑوں ایجاد ہیں

دشنام زیادہ مونث ہے مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر لکھا ہے۔ لہٰذا مختلف فیہ کہا جاسکتا ہے۔ ناسخ ؎

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی ۔۔۔ تو گویا پیمبر کو دشنام دی

ولہ ؎

بارہا میں گیا ہوں نزد امام ۔۔۔ کبھی مجھکو نہ دی کوئی دشنام

ظفر ؎

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے ۔۔۔ خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے

ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہم کو ۔۔۔ کاہے کو سُننے کو دشنام کسو کے آتے

سب بندہ زادے اور جلیل حسن بالتخصیص تسلیم گذار و سپاس گذار ہیں۔

امیر فقیر

پنڈت گرراج کشور دت

ان کا مفصل حال معلوم نہیں۔ آگرہ کے رہنے والے تھے، سینٹ جانس کالج آگرہ میں تعلیم پائی۔ مختلف مقامات پر منصف رہے۔ سب ججی سے پنشن لیکر آگرہ میں قیام کیا۔ اپنے پُرانے کالج کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے پریزیڈنٹ رہے۔

پنڈت صاحب متعدد قانونی کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب آئینۂ وکالت ہے۔ جو ۱۸۸۹ء ۱۳۰۶ھ میں اورینٹل جوب پریس آگرہ سے شائع ہوئی۔ پنڈت جی اس کتاب کے دیباچے میں ان کتابوں کا ذکر کرکے جن سے اس کی

تالیف میں مدد لی ہے لکھتے ہیں:-

"اگرچہ کتاب ہذا کی نسبت کسی قسم کی اختراع کا دعویٰ کرنا منجانب میرے ایک قسم کی گستاخی ہوگی، مگر اس قدر میں جرأت کرکے کہہ سکتا ہوں کہ نصف سے زیادہ مضمون کتاب ہذا کا میرے ذاتی تجربہ اور فکر کا نتیجہ ہے۔"

پنڈت گرراج کشور صاحب سے پہلے قانون کی بہت کتابیں لکھی گئی تھیں۔ تمام قوانین اُردو میں منضبط ہو گئے تھے۔ اور اس قسم کی کتابیں برابر مرتب و شائع ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام الہ آباد کا مطبع نظائر قانون ہند کر رہا تھا۔ جس نے شاید کوئی ایکٹ اور کوئی نظیر اردو میں منتقل کرنے سے نہ چھوڑی تھی۔ بقول خود اہل مطبع کے "ہر چہار عدالت ہائے ہائی کورٹ واقع ہند" یعنی کلکتہ و مدراس و بمبئی و الہ آباد کے نظائر قانونی کا لفظ بلفظ ترجمہ ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا تھا۔ مسٹر جسٹس سید محمود جج ہائی کورٹ الہ آباد کے قانون شہادت کی شرح اسی مطبع نے شائع کی تھی۔

لیکن پنڈت گرراج کشور کی تصنیف آئینہ وکالت اپنی وضع کی خاص کتاب ہے۔ پنڈت جی نے مقدمہ کی پیروی، استغاثہ و اپیل، جرح و جواب دہی کے قانون اور طریق کار بتانے کے علاوہ وکیلوں کو ایسے اصول سمجھائے ہیں جو ایک تجربہ کار اور ہمدرد حاکم ہی سمجھا سکتا تھا۔ قانون جیسے خشک موضوع کو مثالوں اور تمثیلوں سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ زبان میں البتہ پُرانا پن موجود ہے۔ وکیل کے ذاتی اخلاق کی بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"خودی اور طمع سے ہمیشہ وکیل کو سخت پرہیز کرنا چاہیئے...... خودی یا غرور ایسی بُری چیز ہے کہ جس شخص میں یہ ہوتی ہے وہ اپنے آپ پر نامناسب اور بیجا طور پر فخر اور ناز کرتا ہے، مگر بالعموم لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور اپنے دل میں کچھ اس کی وقعت نہیں سمجھتے ہیں...... طمع ایسی بُری شے ہے کہ یہ انسان کی طبیعت سے نیکی اور بالعموم عمدہ اور پسندیدہ صفات کی بیخ کنی کرتی ہے........

ایک مشہور مصنف فارسی نے کیا خوب کہا ہے۔ مصرعہ "طمع را سہ حرف است ہر سہ تہی"، یعنی طمع کے تین حروف ہیں، اور تینوں خالی ہیں۔ اور ایک انگریزی مصنف نے طمع کے مندر کا ذکر کیا ہے، اور اس مندر کا طمع کو دیوتا قرار دیا ہے، اور طمع کی صورت اور اس کے تعلقات[۱] کا فوٹو اس طرح پر کھینچا ہے کہ اندر مندر کے طمع کا دیوتا بیٹھا تھا، اور اس کی غلیظ[۲] لمبی داڑھی تھی، اور ضعیف چہرہ بھوک کا مارا ہوا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف روپیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور اس کے دو مصاحب یعنی داہنی طرف ظلم صاحب اور بائیں طرف بخل صاحب تشریف رکھتے تھے، اور پانچ چھ افسران منتظم میاں بے ایمانی اور رشوت ستانی اور استحصال بالجبر اور فریب وغیرہ تھے، اور وہاں بہت سے بڈھے اشخاص قریب المرگ[۳] روپیوں کی تھیلیوں پر تکیہ لگائے لیٹے ہوئے تھے، اور جوں جوں ان کی حالت جانکنی کی ہوتی تھی، اتنی ہی حسرت کے ساتھ وے روپیوں کی تھیلیوں کو اپنے ہاتھوں سے جلدی پکڑ لیتے تھے۔ مگر وے سب ایک بڑے زبردست جن سے جس کا نام افلاس ہے بہت کانپتے تھے۔ لہٰذا اس طور پر صورت طمع اور اس کے تعلقات کے بیان کرنے کے ہمارے مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ جس وقت اس مقام پر افلاس داخل ہوا، سب لوگ خوف سے کانپنے لگے، مگر ہم نے آگے بڑھ کر اس طور پر التجا کی: اے افلاس تو مجکو کبھی دکھلائی نہ دینا، اور اگر تو یہ میری عرض قبول نہ کرے تو اس بات کا خیال رہے کہ تیری دھمکی اور گیدڑ بھبکی سے مجھ میں کوئی بات ناشکرے پن یا غیر منصفی کی نہ آوے...... اور اگر وہ دولت میرے پاس مع اپنے ہمراہیان خودی اور

---

۵۱ تعلقات کا لفظ متعلقات کی جگہ لکھا ہے۔

۵۲ غلیظ سے مراد "گھنی" ہے۔ اور یہ استعمال درست۔ اگرچہ ہندوستان میں رائج نہیں ہے۔ غلیظ کے معنی سخت اور موٹے کے ہیں۔ نجس و ناپاک نہیں۔ قرآن مجید میں ہے: میثاقاً غلیظاً (سخت اور پکا عہد)

۵۳ قریب المرگ کی غلط ترکیب اس قدر متعمل ہے کہ اس کو علمائے زبان و ادب کے سوا سب ہی بولتے ہیں۔

طمع کے آوے تو اسے افلاس توجلدی سے آکر مجکو بچا، مگر اپنے ساتھ اپنی دو بہنوں یعنی آزادی اور بے گناہی کو لا، جن کی صحبت میں تو ہمیشہ خوش رہتا ہے۔

اس دور کے مشاہیرِ ادب

اوپر جن مصنّفوں کا ذکر کیا گیا ان میں امیر مینائی کے علاوہ اور کسی کا تذکرہ کسی بڑے چھوٹے تذکرہ و تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس طرح کے بے شمار مصنف ہیں، لیکن یہ سب لوگ کچھ خاص صاحب طرز نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ سرسید کے اثر سے اور اُن کے رفیقوں میں جو مصنف پیدا ہوئے، وہ اُردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند مشاہیر کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نواب محسن الملک سید مہدی علی نام۔ میر ضامن علی کے خلف رشید۔ سادات بارہہ کے ایک شیعہ خاندان کے فرد تھے۔ اٹاوہ وطن و مولد ہے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جو محض اپنے جوہر ذاتی سے مرتبۂ کمال پر پہونچ جاتے ہیں۔ چنانچہ دس روپیہ کی تنخواہ سے تین ہزار روپیہ ماہوار تک ترقی کی، اور گمنامی سے بیرونِ ہند تک نام پایا۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اٹاوہ میں حاصل کی۔ پہلے کلکٹری میں ملازم ہوئے۔ مسٹر ہیوم کلکٹر تھے (جو انڈین نیشنل کانگرس کے محرک و بانی تھے)۔ انھوں نے ان کے جوہر پہچانے اور اہلمد کر دیا۔ پھر غدر کے بعد پیشکار اور سررشتہ دار بنا دیا۔ ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہو گئے۔ تحصیلداری کے زمانے میں انھوں نے اُردو میں ۲ دو کتابیں لکھیں "قانون مال" اور "قانون فوجداری"۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے شیعہ سے سُنّی ہونے کا اعلان کیا اور اس کے بعد ان اختلافات عقائد کے متعلق ایک کتاب آیاتِ بیّنات کے نام سے لکھنی شروع کی۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے امتحان مقابلہ میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی، ۱۸۶۷ء میں مرزاپور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ان فرائض کے ساتھ بعض یا ستون

کا انتظام و مشورہ بھی ان کے سپرد رہا۔ حیدر آباد کے وزیر اعظم سر سالار جنگ نے شہرت سُنی، پھر اتفاق سے کلکتہ جاتے ہوئے مرزا پور میں وزیر کی ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔ سر سالار جنگ نے ۱۸۶۷ء میں ان کی خدمات حیدر آباد کے لئے لے لیں۔ وہاں اوّل بارہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ناظم بندوبست اور انسپکٹر جنرل صیغۂ مال مقرر ہوئے۔ پھر چند روز میں پندرہ سو روپیہ تنخواہ ہو گئی اور کمشنر بندوبست ہو گئے۔ اور نواب منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سکرٹری (اعلیٰ معتمد مالی) ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں سر سالار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد فینانشل اور پولٹیکل سکرٹری بنائے گئے۔ سہ ہزاری منصب اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور خطاب میں محسن الدولہ محسن الملک کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد ریاست کے معدنیات کے متعلق کچھ معاملات حکومت اعلیٰ اور پارلیمنٹ سے طے کرنے کے لئے انگلستان بھیجے گئے۔ محسن الملک نے یہ خدمت نہایت حُسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دی۔ اور وہاں کے مشاہیر سے بھی ملے۔ جن میں سے وزیر اعظم برطانیہ مسٹر گلیڈ اسٹن سے خاص تعلقات قائم ہو گئے کہ بعد کو بھی رسم مراسلت جاری رہی۔

آخر بیس سال ریاست کی خدمت نیک نامی سے انجام دینے کے بعد آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن پر رخصت ہوئے۔ سر سید سے تعلقات قائم ہو چکے تھے شروع میں تو سر سید کے مذہبی عقائد اور آزاد خیالی سے بہت بیزار تھے۔ لیکن ملازمت مرزا پور کے زمانے میں سر سید کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تو پھر محسن الملک سے زیادہ سر سید کا عاشق کوئی نہ تھا۔ چنانچہ حیدر آباد سے آکر سر سید کے ساتھ علی گڈھ میں قیام کیا، اور باقی زندگی قومی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ سر سید کے انتقال (۱۸۹۸ء) کے بعد سر سید کی وصیت و تمنا کے مطابق ان کے صاحبزادہ سید محمود علی گڈھ کالج کے سکرٹری ہوئے۔ پھر ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو محسن الملک سکرٹری منتخب ہو گئے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) کو شملہ میں انتقال کیا۔ وہاں سے علی گڈھ لاکر سرسید کے قریب دفن کئے گئے۔[۵]

جس وقت کالج کا انتظام نواب محسن الملک کے ہاتھ میں آیا، کالج کی حالت بہت نازک تھی۔ سرسید کے آخری دنوں میں ایک لاکھ روپیہ کا غبن ہوجانے کے سبب سے کالج پر قرضہ کا بارگراں آپڑا تھا۔ اس کے علاوہ ابتک کالج پر ملک و قوم کا پورا اعتماد نہ تھا۔ نواب محسن الملک نے اپنے خلوص، ہمت، کوشش اور اثر سے چند سال میں تمام مشکلیں حل کردیں، اتنا چندہ جمع ہوگیا کہ تمام قرضہ ادا کردیا گیا، کثرت سے طلباء داخل ہونے لگے، اور اعتماد قائم ہوگیا۔ نواب صاحب کی

---

[۵] خاکسار مولف نے آیۂ کریمہ سے تاریخ وفات کہی "اُولٰئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا" (سورہ مومن۔ رکوع ۵۔ پارہ ۲۴) ۱۳۲۵ھ نکلتے ہیں۔ وہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا۔ میں نے نواب صاحب کا ایک مرثیہ بھی بصورت ترکیب بند اُسی وقت لکھا تھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

تیرگی ملک پہ چھائی ہے سیہ بختی کی — قوم کا ڈوب گیا آج ستارا افسوس
اور کیا اس سے سوا ہوگی تباہی اے قوم — محسن الملک کریں تجھ سے کنارا افسوس
ان سے وابستہ تھیں اُمیدیں ہزاروں اپنی — قوم کا ٹوٹ گیا آج سہارا افسوس

مولانا حالی نے اس موقع پر نہایت دردناک قطعہ کہا تھا اور دسمبر ۱۹۰۷ء میں کانفرنس کے اجلاس کراچی میں (جس کے خود مولانا حالی پریسیڈنٹ تھے) سُنایا تھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

وہ ملک کا محسن، وہ مسلمانوں کا غمخوار — سر کرکے مہم، قوم کے کام آگیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اس کو بھی وہی قوم کا غم کھاگیا آخر
یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی — دنیا کو تماشا یہ، وہ دکھلاگیا آخر
تھدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری — کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

حامد حسن قادری مولف

تقریر نہایت پر جوش اور موثر ہوتی تھی۔ ان کے خلوص کا خاص طور پر اثر پڑتا تھا، اور ان کی تدبیریں نہایت کارگر ہوتی تھیں۔ نواب صاحب نے سرسید کی زندگی میں اور ان کے بعد اپنی جیب سے ہزارہا روپیہ چندوں میں دیئے۔ جب لندن میں سرسید کو روپیہ کی ضرورت پیش آئی تو نواب محسن الملک نے اپنی ایک مہینے کی پوری تنخواہ بھیج دی

نواب محسن الملک نے کثرت سے کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ دو قانونی کتابوں (جن کا پہلے نام لیا گیا ہے) اور دو تین مذہبی کتابوں کے علاوہ ان کی یادگار ادبی ان کے مضامین تہذیب الاخلاق اور لکچر اور خطوط ہیں، لیکن ان میں ایک خاص شانِ ادب پائی جاتی ہے۔ جوش و خلوص ان کی ہر تحریر کے نمایاں عنصر ہیں۔ طرزِ تحریر نہایت صاف مدلل اور موثر ہے بعض مضامین خالص ادیبانہ رنگ اور شاعرانہ تخیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ زبان و بیان میں کچھ قدامت کا اثر ضرور ہے۔ بعض تحریروں کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) آیات بینات۔ خالص مذہبی کتاب ہے۔ سب سے پہلے اس کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں مرزا پور کے مشن پریس میں ٹائپ میں چھپی۔ پھر لیتھو کے مطبع میں بھی چھاپی گئی۔ اس کی تحریر کا سلسلہ جاری تھا کہ نواب صاحب کے تعلقات سرسید سے قائم ہو گئے اور وہ خدمت قومی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آیات بینات کا موضوع اس مسلک کے خلاف تھا۔ اس لئے تین جلدیں لکھ کر اس کو ناتمام چھوڑ دیا۔ اس کتاب میں نواب محسن الملک نے فرقۂ مخالف کے تمام عقائد و اعمال سے طویل بحث کی ہے، اور مدلل تردید کی ہے۔ وہی حصے قابل نقل و اقتباس ہیں، لیکن اس کو مصلحتہً چھوڑ کر دیباچہ سے چند سطریں بطور نمونۂ عبارت درج کیجاتی ہیں:۔

"پس ہم لوگوں کو فقط اسلام کے نام پر خوش ہونا اور صرف توحید اور نبوت کے اقرار پر اپنے کو ناجی سمجھنا نہ چاہیے، بلکہ ہر عقیدے کی تحقیق کرنا اور ہر اعتقادی مسئلے کی تطبیق کتاب اللہ اور کتاب الرسول سے دینا ضرور ہے۔ اور یہ ممکن نہیں

کہ جو شخص اپنے سچے اور صاف دل سے صرف اپنی نجات کی امید پر خدا کی کتاب کو دیکھے اور تعصب اور عناد کو دخل نہ دے، وہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے، اور ایسے حق کے طالب کو خدا گمراہی میں پڑا رکھے۔ ہاں جو کوئی پہلے سے سچائی کا طالب نہ ہو اور مذہبی تعصب میں گرفتار ہو، اور سوائے مجادلے اور مکابرے کے اسے اور کچھ منظور نہ ہو اور اپنے آبائی دین و مذہب کو تقلیداً سچ جانتا ہو، وہ بے شک اپنی گمراہی میں پڑا رہے گا، اور اپنے دل کو باطل عقیدوں سے کبھی پاک و صاف نہ کر سکے گا۔"

(۲) مضامین تہذیب الاخلاق۔ یہ مضامین نواب محسن الملک کا ادبی کارنامہ ہیں۔ سرسید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس میں نواب صاحب نے بھی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تاریخی، اصلاحی مضامین لکھے۔ جن کا مجموعہ بعد کو شائع ہو گیا ہے۔ ایک مضمون تمثیلی رنگ میں بہت دلچسپ لکھا ہے۔ اس قسم کی طرزِ نگارش کا ذکر سرسید کے مضامین کے سلسلے میں آ چکا ہے۔ نواب محسن الملک کے مضمون (موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ) کے مختلف اقتباسات انہی کے الفاظ میں مسلسل کئے جاتے ہیں:—

موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ۔ ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا اور اس طلسم کدے کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصورِ قدرت نے کھینچ رکھی ہے، دکھایا، درحقیقت میں نے اُسے ویسا ہی پایا جیسا سُنا کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا تو ایک چار دیواری دیکھی جو میرے خیال سے بھی زیادہ مضبوط تھی .... میں نے وہاں ایک رفیق پایا، جس کا نام خرد تھا۔ اس سے حقیقت اس کی پوچھی تو اس کے اندر ایک ایسا پُر فضا باغ ہے جسے جنّت عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو .... میں چند سے اس باغ

میں رہا، پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا جس سے دل بہلاتا ....

آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا تھا مگر دروازہ کھُلا ہوا اور دیوار شکستہ .... میں نے اپنے رہنما سے پوچھا ....

اُس نے کہا یہ وہ باغ نہیں ہے دوسرا ہے۔ پہلے اسی باغ کی طرح آراستہ تھا، خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا اور زمانے کے انقلاب نے پامال کردیا..

جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامی رفیق کو میرے ساتھ کردیا۔ اس کے ساتھ میں ان دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا....

تب تاریخ نامی ایک روشن ضمیر ملا۔ اُس نے کہا ہزار برس ہوتے ہیں تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تروتازہ سبز و شاداب تھا جیسا وہ باغ جو تم نے اول دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا اور گندے چشمے پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب وہ چشمہ پر آگیا ہے۔ تب تو میں نے خیال کیا، اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمت کو ساتھ لیکر چلا، مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا اور پتھر سرکانے پر مجھ کو موت کا خوف دلایا۔

میں جان بچا کر ہٹا ...... میں نے چاہا کہ اس خیال کو چھوڑ دوں اور یہ پتھر جیسا ہے ویسا ہی رہنے دوں، پر استقلال نامی ایک رجز خواں نے میرا دل بڑھایا، اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اُس نے کہا، میں نے ایمان نامی فقیر سے سُنا ہے کہ اس چشمے کا ایک کھودنے والا ہے، وہ سب مشکل حل کرسکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اس تک ہوسکتی ہے۔ اسکی راہ میں اوّل تو مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے۔ جس میں سوائے آنکھ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اس سے بچ گئے تو رسوائی اور بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں، جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اس کا ملتا ہے۔ جہاں اخلاص

کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ اور دعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے، تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے...... پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اس تک تمہاری رسائی ہوئی اور اس نے تمہاری نذر لے لی تو وہ اقبال کو تمہارے ساتھ کرے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے، سب کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کریں گے اور تمہارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے.........

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہکر "جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے، جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں، پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے، جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر آگیا ہے جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی، نیکی نما تعصب، علم نما نادانی، جھوٹا زہد، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقریر، عامیانہ غلامی، ضرر انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے۔" چپ ہو رہا۔

(۳) مسلمانوں کی تہذیب، نواب صاحب کا اصلاحی و اخلاقی مضمون ہے، اس کا موضوع پہلے ہی فقرے میں بیان کرتے ہیں:۔

"میرا یہ مضمون مسلمانوں کی تہذیب پر ہے کہ وہ پہلے کیسی تھی اور اب کیسی ہے اور آئندہ کیسی ہوگی۔"

بڑی تحقیق کے ساتھ لکھا ہے، قدیم مسلمانوں کی مکمل تہذیب کا خاکہ کھینچا ہے۔ تمام علوم و فنون میں مسلمانوں اور عربوں کی اوّلیات اور کارنامے بیان کئے ہیں۔ اور پھر مسلمانانِ ہند کی موجودہ حالت کو بیان کرتے وقت ان ہی علوم و فنون میں سے ایک ایک کی حالت الگ الگ لکھتے ہیں۔ اور اس میں ظریفانہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔

نواب محسن الملک کی تحریر کا مزاحی پہلو عام طور پر معلوم و مشہور نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ رنگ کم اور ہلکا ہے لیکن جہاں ہے، دلچسپ ہے۔ ان فقروں کو دیکھئے:۔

"طبیعات جاننے والا مسلمانوں میں کوئی نہیں رہا۔ ہاں چند مسائل کا بیان ہمارے زمانے کے عالم اس طرح پر کرتے ہیں کہ عناصر چار ہیں، خاک، باد، آب، آتش۔ یہ چاروں بسیط ہیں۔ خاک کے اوپر آب اور آب کے اوپر باد اور باد کے اوپر آگ ہے، اور بہت بڑا ناری کرہ ہے۔ آسمان کی حرکت سے مشتعل رہتا ہے مگر چونکہ قطبین کی طرف حرکت کم ہے، اس لئے وہاں مشتعل بھی کم ہے۔ اور اس سبب سے اس کی شکل اہلیلجی ہو گئی ہے۔ جب شاگرد پوچھتا ہے کہ اہلیلجی کی کیا شکل ہے، تو استاد اپنی سُرمہ دانی نکال کر دکھلاتے ہیں کہ ایسی بیچ سے موٹی، دونوں طرف پتلی۔ پس اس زمانے میں عالموں کی یہ طبیعات رہ گئی ہے جس پر ہر کوئی ہنستا ہے۔"

"ہندسہ حساب کچھ باقی ہے۔ اقلیدس کا ایک مقالہ اور خلاصۃ الحساب کی تحصیل اربعہ یا جذر تک فضیلت کی پگڑی بندھوا دیتی ہے، مگر طالب علم یہ سوچتے ہیں کہ تحریر اقلیدس کے پڑھنے اور ان ٹیڑھی سیدھی شکلوں کے بنانے میں کیا فائدہ ہے۔"

"علم نباتات کی تحقیقات اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں نے لکھا ہے کہ سراندیپ میں ایک درخت ہے جس پر کلمہ لکھا ہوا ہے، نہ زمین پر اس کا پتا گرتا ہے، نہ کوئی جانور اسے کھا سکتا ہے ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالموں کا اس پر یقین ہے کہ بعض

بوٹیاں ایسی ہیں جن سے سونا چاندی بن سکتا ہے۔"

"علم حیوانات میں بلاشبہ بڑی ترقی ہے۔ کیونکہ ہم اپنے ہاں کے بڑے بڑے عالموں کو تقریر کرتے سنتے ہیں کہ اگر بکری کتے سے بچہ پیدا ہو تو اس کا کھانا درست ہے یا نہیں۔"

شادی بیاہ کے دستور کو لکھتے ہیں :۔

"نہ مرد عورت کو دیکھنے پاتا ہے، نہ عورت مرد کو، یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ پر نکاح کا مدار آرہا ہے۔"

(۴) مسلمانوں کی ترقی اور اُن کے تنزل کے اسباب۔ یہ مضمون بہت طویل ہے۔ مسلمانوں کی ترقیوں کو تاریخی حوالے کے ساتھ بیان کرکے اُن کے تنزّل کے پانچ سبب بتائے ہیں اور تفصیلی بحث کی ہے۔ پانچواں سبب غلط مذہبی خیالات کو بتایا ہے۔ یہ حصّہ بہت پُرجوش لکھا ہے۔ قرآن و حدیث سے خوب خوب استدلال کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں :۔

"غرضکہ سارا قرآن اور ساری تعلیم ہمارے ہادی کی یہی ہے کہ وہ استعداد جو بدوِ فطرت میں خدا نے رکھی ہے، وہ کام میں لائی جاوے اور دنیا و دین کی ساری نعمتیں حاصل کی جاویں۔ قرآن سر دلیم کی سمجھی ہوئی وہ زنجیر نہیں ہے جس میں ہم دنیاوی ترقیات کے لئے جکڑے ہوئے ہیں، بلکہ برخلاف اس کے وہ ان بندوں کو توڑنے والے ہیں جو عیسائیت نے یا عیسائیوں نے انسانوں پر اس سے روکنے کے لئے لگائے تھے۔ غور کرو خدا کی اس جھڑکی پہ جو رہبانیت اور جوگی بننے کے لئے ہے۔ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ (کس نے خدا کی وہ نعمت حرام کی جو خدا نے بندوں کے لئے پیدا کی)، پڑھو خدا کی یہ آیت جو دنیاوی لذّتوں سے متمتّع ہونے کے لئے ہے۔ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (اچھی چیزیں جو ہم نے روزی کی ہیں، کھاؤ اور اچھے کام کرو)...... دیکھو کیسا عام اجازت نامہ ہے خدا کا، دنیا کمانے کے لئے۔

فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو)۔ پھر خدا اپنے اچھے بندوں کو کیا دعا سکھاتا ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (اے خدا ہم کو دنیا اور آخرت میں بھلائی دے) یعنی دنیا اور دین دونوں کی بھلائی۔ جبکہ قرآن کے یہ احکام ہوں اور طلب معیشت اور تجارت اور کسب حلال کے لئے صاف صاف ترغیبیں اور بشارتیں، جیسا کہ ہمارے ہادیؐ نے طلب معیشت کے لئے فرمایا ہو۔ اِنَّ مِنَ الذُّنُوْبِ ذُنُوْبًا لَا یُکَفِّرُھَا اِلَّا الْھَمُّ فِیْ طَلَبِ الْمَعِیْشَۃِ (بعض ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف یہ ہے کہ معاش کی فکر میں رنج اُٹھایا جاوے)، اور تجارت کے لئے ارشاد کیا ہو کہ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ یُحْشَرُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مَعَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ (سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اُٹھے گا)، اور طلب دنیا کے لئے صاف صاف لفظوں میں یہ خوش خبری سنائی ہو کہ مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا تَعَفُّفًا عَنِ الْمَسْئَلَۃِ وَسَعْیًا عَلٰی عِیَالِہٖ وَتَعَطُّفًا عَلٰی جَارِہٖ لَقِیَ اللّٰہَ وَجْھُہٗ کَالْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ (جو شخص دنیا کو بطریق حلال تلاش کرتا ہے اور جس کا مقصد سوال کرنے سے بچنا اور آل اولاد کے لئے کوشش اور ہمسایہ پر مہربانی کرنا ہوتا ہے، اُس کا منہ خدا کی ملاقات کے وقت چودھویں رات کے چاند کا سا ہوگا) تو کیا ایسا مذہب دنیاوی خوشیوں کے حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاؤں کی زنجیر ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ انکے لئے خط آزادی ہے۔"

(۵) ایک کھلا خط۔ نواب محسن الملک نے ۱۰ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو بمبئی سے ایک خط سرسید کے نام لکھا ہے، جس میں ایجوکیشنل کانفرنس کی اصلاح و ترقی کے لئے کچھ تجویزیں پیش کی ہیں، اور سرسید سے درخواست کی ہے کہ اس خط کو کانفرنس کے دوسرے اجلاس (منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۸۸۷ء بمقام لکھنؤ) کے منظور شدہ

نویں رزولیوشن اور اس کی تائیدی تقریروں کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی طرح بصورت کتاب چھاپا گیا ہے۔ اس نویں تجویز کا خلاصہ یہ تھا:۔

"ہر شہر و قصبہ میں کانگرس[۵] کے مقاصد کے لئے کمیٹیاں مقرر ہوں اور وہ کمیٹیاں اپنی ماتحت کمیٹیاں مقرر کریں اور انجمن ہائے اسلامی جو بالفعل ہیں وہ اس کانگرس کے مقاصد کی تکمیل اپنے ذمہ لیں"۔

نواب صاحب کے خط کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"۔۔۔۔۔۔ پس باوجود ان تمام باتوں کے اس مجلس کا ترقی نہ کرنا بلکہ روز بروز اس میں تنزل ہونا ایک حیرت انگیز معاملہ ہے۔ مگر میرے نزدیک کوئی اور بڑا قوی سبب اس کا سوائے اس کے نہیں ہے کہ وقت سے پیشتر مجلس کے مقام اور مجلس کی کارروائی سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جب بہت ہی تھوڑا وقت رہ جاتا ہے تب لوگوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں مقام پر اس کا اجلاس ہوگا، اور چونکہ دوسرے لوگ اس کی اشاعت میں اور اس میں شریک ہونے کے لئے ترغیب دینے کی تدبیریں نہیں کرتے اس لئے سوائے چند پرانے ارکان اور چند مدرسے کے طلبہ اور چند وزیٹر کے باہر سے نئے نئے لوگ نہیں آتے، اور بوجہ اس کے کہ رزولیوشن بہت کم پیش کئے جاتے ہیں اور ان پر تنگی وقت سے بحث کی نوبت نہیں آتی، لوگوں کے

---

۵ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء میں بنگالیوں کی انڈین نیشنل کانگرس کے جواب میں قائم کی گئی تھی اس لئے اس کے نام میں بھی "کانگرس" کا لفظ رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد دفع اشتباہ کے لئے کانفرنس کا لفظ تجویز کیا گیا اور پورا نام محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ پھر اینگلو اورینٹل کی جگہ آل انڈیا کر دیا گیا۔ پھر گذشتہ جنگ عظیم کے بعد بیداری ہند کے اثر سے لفظ محمڈن کی ناموزونیت محسوس ہوئی۔ یہ لفظ اہل یورپ کی ساخت اور لفظ کرسچین کی تقلید تھی، اس لئے محمڈن کی جگہ مسلم کا لفظ نہ صرف کانفرنس کے نام میں بلکہ تمام تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہونے لگا۔

دل سرد ہوتے اور ان کے ولولے اور جوش ٹھنڈے پڑتے جاتے ہیں اور نظم اور قصائد نے اس مجلس کو بزم مشاعرہ بنادیا ہے اور واہ واہ قاہ قاہ کی آواز نے اس مجلس کو بجائے قومی مجلس کے ایک دل لگی کا جلسہ کردیا ہے۔"

(۶) تقریر نواب محسن الملک کانفرنس کی تقریروں میں نواب صاحب کی آخری تقریر انیسویں اجلاس میں ۲۱ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوئی تھی۔ آیندہ اجلاس سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ تقریر بہت طویل اور نہایت پرجوش ہے۔ اس کا مختصر اقتباس یہ ہے:۔

حضرات! کانفرنس کے ابتک کامیاب نہ ہونے کا اصل سبب یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔ رہی قوم کی حالت، اس میں بھی کسی قسم کی ترقی نظر نہیں آتی، نہ ان کی صلاح و فلاح کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ روز بروز ان کا افلاس بڑھتا جاتا ہے، اور ان کی قوتیں دن بدن منتشر اور ضائع ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا سبب کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ قوموں کی صلاح و فلاح دو فرقوں پر منحصر ہے، اول علماء دوسرے اُمراء، مگر علماء اپنے اصلی فرائض کا خیال نہیں رکھتے اور زمانے کی رفتار اور زمانے کی ضرورتوں کو نہیں دیکھتے۔ ...... مثلاً اگر کسی عالم سے کہا جائے کہ اس زمانے میں جبکہ مسلمان مفلس اور تباہ ہو رہے ہیں اور علوم و فنون اور صنعت و حرفت سے ناواقف ہیں، ان کو علوم و فنون جدیدہ اور سائنس کی تعلیم کی ہدایت کیجئے، اور صنعت و حرفت سیکھنے کی ترغیب دیجئے، تو وہ یہ کہہ کر کہ سائنس اسلام کے مخالف ہے اور صنعت و حرفت دُنیاداروں کا کام ہے، ہماری بات کو نہایت نفرت سے سُنیں گے، اور اَلدُّنیَا جِیفَۃٌ وَّ طُلَّابُھَا کِلَابٌ[ع۵] کہہ کر مسلمانوں کو اور نفرت دلائیں گے۔ حالانکہ یہ باتیں اور اس قسم کی ہدایت و نصیحت اس زمانے میں اُن پر فرضِ کفایہ ہے اور اس کے ادا نہ کرنے سے وہ خود گنہگار ہو رہے ہیں، اور ساری قوم کو عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ بوجہ ناواقفیت علوم اور نہ جاننے صنعت و حرفت کے وہ دُنیا کی اور قوموں کے مقابلہ میں

ع۵ دُنیا مُردار ہے اور اس کے طالب سگ مردار خوار۔

ذلیل و خوار ہیں، مگر وہ ہرگز اس کی ہدایت نہ کریں گے، اور بجز نماز جنازہ اور دفن میت اور جواب سلام وغیرہ کے ان باتوں کو فرض کفایہ نہ سمجھیں گے۔ ہمارے زمانے کے ایک مصری عالم نے اس افسوس ناک حالت کو دیکھ کر نہایت رنج و غم سے یہ لکھا ہے کہ انھیں علماء کا فرض کفایہ سے ناواقف ہونا اصلی سبب اس کا ہے کہ ساری قوم صنعت و حرفت کے فوائد سے محروم ہو گئی ہے.......... اس کی تائید میں وہ عالم لکھتا ہے کہ اس وقت جو شخص مسلمانوں میں کسی صنعت کے زندہ کرنے یا آلہ کے ایجاد کرنے یا کوئی کمیٹی قائم کرنے یا صنعتی مدرسہ جاری کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گا، تو شریعت کے حکم کے مطابق اس نیک کام کا، اور قیامت تک اس پر عمل کرنے والوں کا اس کو اجر ملے گا، اور شخص قوم میں اعلیٰ درجے کا مصلح اور مجدد ہوگا۔ اسے لکھ کر وہ عالم صاف صاف کہتا ہے کہ مغربی علوم میں جو قرآن مجید کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں اور اسلامی علوم میں کچھ فرق نہیں ہے، کیونکہ وہ بقائے زندگی کا ذریعہ ہے، اور یہ روحانی زندگی قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ بغیر ان دونوں کے اسلام اور ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی.......

حضرات! کتنے ایسے عالم اس وقت ہم میں ہیں جو ان باتوں کو سن کر غصے میں نہ آویں گے، اور ان باتوں کا نیچریانہ کلام سمجھ کر اس سے متنفر نہ ہوں گے اور یہ سُن کر کہ صنعت و حرفت کا سکھانا، اور اس کی ہدایت کرنا اصل عبادت ہے، کہنے والے کو نیچری اور کافر نہ کہیں گے۔ جب کہ ہادیان طریقت کا یہ حال ہو، اور وہ خود سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں، تو قوم اور اُمت کیونکر منزلِ مقصود پر پہنچ سکتی ہے

نواب وقار الملک

مشتاق حسین[۵] نام، امروہہ (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے۔ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام شیخ تفضّل حسین ہے۔ ان کے اجداد میں ایک بزرگ دیوان عبدالمومن خاں تھے، جو شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں دیوان تن کے عہدے پر ممتاز تھے۔ یہ عہدہ وزارت سے کم نہ تھا۔ شاہی بجٹ، اور منصب و جاگیر کی عطا و ترقی اسی عہدے سے متعلق تھی۔ نواب صاحب کمبوہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا انتقال ان کی شیر خوارگی کے زمانے میں ہوگیا تھا۔ والدہ نے تربیت کی۔ رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر سب سے پہلے اسی سرکاری مدرسے میں جہاں خود تعلیم حاصل کی تھی ۱۸۵۹ء میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۰ء میں سخت قحط پڑا۔ جا بجا محتاج خانے قائم ہوئے۔ امروہہ کے محتاج خانے کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ اس کے بعد عدالت صدر الصدور علی گڈھ میں سررشتہ دار اور پھر منصرم ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہوئے۔ گورنمنٹ نے علی گڈھ کی میونسپلٹی کا ممبر بھی مقرر کر دیا۔ ۱۸۷۴ء میں سرسید کے ساتھ گورکھپور، بستی وغیرہ کے قحط کا انتظام کیا۔

نواب صاحب سرکاری ملازمت کے علاوہ سرسید کے ساتھ قومی کام بھی کرتے رہے۔ ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک مدرسہ مفید الخلائق جاری کیا۔ ۱۸۶۹ء میں سررشتہ تعلیم کے ممبر ہوئے اور

---

۵ مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بی۔ اے نے اپنے ترجمہ تاریخ ادب اُردو میں نواب وقار الملک کو "خلافت علی گڈھ کا خلیفہ ثانی" لکھا ہے۔ اس تشبیہ کا ایسی کتاب میں جس کا مناظرہ و مظاہر مذہبی سے تعلق نہیں، کوئی محل نہ تھا خاص کر جبکہ ترتیب صحیح کی بنا پر غلط بھی ہے۔ یعنی علی گڈھ کالج کے سکرٹریوں میں نواب وقار الملک کا چوتھا نمبر ہے یاد رہے کہ سرسید کے بعد سید محمود باقاعدہ سکرٹری ہوئے تھے اگرچہ چند روز کے بعد ہی ان کو دست کش ہونا پڑا۔ اس لئے سید محمود کو شمار سے حذف نہیں کر سکتے۔

مدارس ضلع کے نگراں رہے۔ اسی سال نواب صاحب نے بطور کثیر چندہ جمع کر کے ایک یونانی شفا خانہ اور دوا خانہ جاری کرایا۔ ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو اس میں مضامین لکھے۔ اور اکثر لکھتے رہے۔ ۱۸۷۱ء میں جب سر سید نے کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کی طرف سے ایک مضمون لکھوانے کا اعلان کیا (جس کا ذکر سر سید کے حال میں ص۱۱۲ پر آچکا ہے) تو نواب وقار الملک نے بھی مضمون لکھا اور اس پر دوسرے نمبر کا انعام دیا گیا۔ سوسائٹی اور اس کے پریس اور تہذیب الاخلاق کا انتظام بھی نواب صاحب کے سپرد تھا۔

۱۸۷۴ء میں حیدر آباد کے مدار المہام سر سالار جنگ اول کو سلطنت دکن کے انتظام کے لئے بہترین مُدبروں کی تلاش ہوئی۔ سر سید سے بھی مشورہ کیا۔ انہی کی سفارش سے نواب محسن الملک کے بعد نواب وقار الملک بھی حیدر آباد گئے۔ اس سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ نواب وقار الملک نماز کے نہایت پابند تھے۔ کچہری میں جب ظہر کی نماز کا وقت آتا، اُٹھ کر نماز پڑھنے چلے جاتے۔ علی گڑھ میں جب یہ صورت پیش آئی تو مسٹر کالون کلکٹر نے روکا، نواب صاحب نے نہ مانا۔ کلکٹر نے ضد کی؛ انھوں نے استعفا دیدیا۔ لیکن اس قصور بر خاست کرنا مصلحت کے خلاف تھا، چھ مہینے کی رخصت دیدی۔ اس عرصے میں اللہ تعالیٰ نے رزق کا دوسرا دروازہ کھول دیا، ۱۸۷۵ء کے شروع میں نواب صاحب حیدر آباد بُلا لئے گئے۔

نواب وقار الملک دو مرتبہ حیدر آباد گئے، پہلی بار ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک رہے۔ حیدر آباد میں مدار المہام (سر سالار جنگ)، صدر المہام (سر آسماں جاہ) امیر کبیر (نواب رشید الدین خاں)، اور ریزیڈنٹ (سر رچرڈ میڈ) کے باہم تعلقات خوشگوار نہ تھے، اور نواب صاحب کو ان ہی افسروں سے سابقہ پڑتا تھا۔ نواب صاحب دیانت، فرض شناسی اور اخلاقی جرأت میں ایسا مضبوط کیرکٹر رکھتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو مرعوب نہ کر سکتی تھی۔ ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے چاہا کہ نواب صاحب اپنی اصلی رائے کے خلاف سر آسماں جاہ کے سامنے رائے ظاہر کریں۔

نواب صاحب نے انکار کر دیا، سر سالار جنگ اس پر نا خوش ہو گئے، نواب صاحب نے فوراً استعفا بھیج دیا۔ اور لکھ دیا کہ میں کل ہی اپنے وطن جانا چاہتا ہوں۔ لیکن جیسے نواب وقار الملک متدین اور راستباز تھے ایسے ہی سر سالار جنگ فراخدل اور قدر شناس تھے۔ استعفا دیکھ کر نواب صاحب کو بلایا۔ صاف طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا کہ بیشک مجھے کوئی حق نہ تھا کہ غلط بیانی پر مجبور کرتا۔ اس ملاقات میں دونوں پر رقت کا عالم طاری تھا۔ نواب صاحب نے استعفا واپس لے لیا۔ لیکن امیر کبیر اور ریذیڈنٹ نواب صاحب کے مخالف تھے، انھوں نے کچھ عرصے بعد موقع پاکر سر سالار جنگ پر زور ڈالا کہ اگر مولوی مشتاق حسین برخاست نہ کئے گئے تو ہماری آپ کی دوستی میں فرق آجائے گا۔ نواب صاحب اس وقت رخصت پر وطن آئے ہوئے تھے، ان کو اس بات کا علم ہوا تو فوراً سر سالار جنگ کو لکھا کہ میں نہیں چاہتا ہوں کہ میرے سبب سے آپ لوگوں میں نا اتفاقی ہو اور ریاست کے کاروبار میں خلل آئے، آپ بے تامل مجھے خدمت سے سبکدوش کر دیجئے، میں خوش ہوں گا کہ یہ بھی مجھ سے اپنی سرکار کی ایک عمدہ خدمت ادا ہوئی۔ چنانچہ نواب صاحب کو علحدہ کر دیا گیا۔ لیکن سر سالار جنگ نے سیکرٹ سروس فنڈ سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا، اور نواب وقار الملک علی گڈھ میں بیٹھے ہوئے سرکار نظام کی خدمت انجام دینے لگے، اس عرصے میں قانون مال گذاری مرتب کیا اور دفتروں کے قواعد و ضوابط بنائے۔

ساڑھے تین سال کے بعد جب امیر کبیر کا انتقال ہو گیا اور سر رچرڈ میڈ ریذیڈنٹ چلے گئے تو سر سالار جنگ نے نواب صاحب کو پھر بلا لیا۔ اس موقع پر سر سالار جنگ نے اپنے قلم سے خط لکھا (مرقومہ ۲۷ جمادی الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء) فارسی میں خط ہے، نواب صاحب کو "عدالت پناہ" القاب لکھا ہے۔ نواب صاحب فوراً چلے گئے، اور پھر دس بارہ سال خدمت کر کے سات سو روپیہ ماہوار پنشن پر واپس آئے۔

نواب وقار الملک نے حیدر آباد میں فلاح ملک، اصلاح سلطنت اور استحکام سیاست کے سلسلے میں جو عظیم الشان خدمات انجام دیں وہ نواب محسن الملک کی شاندار خدمات سے کم نہ تھیں۔ کسی دوسرے ہندوستانی کا تو ان سے مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ان خدمتوں کے صلے میں اعلیحضرت نظام الملک آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں بہادر (مرحوم) نے نواب صاحب کو ۱۸۸۵ء ۱۳۰۲ھ میں "خان بہادر" اور "انتصار جنگ" اور ۱۸۹۰ء ۱۳۰۸ھ میں "وقار الدولہ وقار الملک" کے خطابات عطا کئے۔ پھر حکومت ہند کی طرف سے بھی "نواب" کا خطاب ملا۔ لارڈ منٹو نے اپنے ہاتھ سے سند دی۔

نواب صاحب حیدر آباد میں سرسید کے قومی کاموں میں اعانت اور خاص کر علی گڑھ کالج کے استحکام میں امداد کرتے رہے۔ ہزاروں روپے اپنے پاس سے دئیے۔ جب ان کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا تھا تو پہلے مہینے کا اضافہ سرسید کو بھیج دیتے تھے۔ جب سرسید ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد گئے تو ان کے ساتھ دورہ کرکے وہاں کے امیروں سے چندہ دلوانے کے علاوہ ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی طرف سے بتقریب دورہ و دعوت پیش کیا۔ حیدر آباد سے آکر ہمہ تن کالج کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ کالج کی کوئی عمارت، کوئی شعبہ، کوئی مصرف ایسا نہ تھا جس میں نواب وقار الملک کی مالی مدد شامل نہ ہو۔

اسی طرح انتظامی معاملات نہایت خلوص و صداقت کے ساتھ انجام دئیے نواب صاحب حق گوئی میں اس قدر بیخوف تھے کہ سرسید کا احترام و محبت بھی ان کو اپنی سچی رائے کے اظہار سے باز نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۸۸۹ء میں سرسید نے اپنے بعد سید محمود کو سکرٹری مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تو نواب صاحب نے شدید مخالفت کی یہاں تک کہ سرسید کے دل میں ان کی طرف سے کشیدگی پیدا ہو گئی۔ لیکن نواب صاحب کا دل ویسا ہی صاف رہا، اور سرسید کی وہی محبت قائم رہی۔ آخر جب یہ تجویز منظور ہو گئی تو نواب صاحب

نے بھی کثرت رائے کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا، اور پھر جب سرسید کے انتقال کے بعد سید محمود سکرٹری ہوئے اور چند روز ہی میں ان کی مخالفت اور ان کی معزولی کی کوشش ہر طرف سے ہونے لگی، تو نواب وقار الملک پہلے شخص تھے جنھوں نے اس فیصلے کے احترام کو پیش نظر رکھا اور خود سید محمود کی اصلاحِ حال و خیال کی کوشش کی تاکہ وہ سکرٹری کے عہدے پر قائم رہ سکیں۔

نواب محسن الملک کے سکرٹری ہونے پر اُن کے دست و بازو بن کر کام کیا۔ ۱۹۰۳ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کی سرگرم کوشش کی اور اس کے پہلے سکرٹری منتخب ہوئے۔ لیکن جب نواب محسن الملک کے بعد کالج کے سکرٹری ہوئے تو مسلم لیگ کا عہدہ چھوڑ دیا، لیکن اس کے حامی و معاون رہے۔

۱۹۱۰ء میں جب ہز ہائینس سر آغا خاں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں علی گڈھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی اور گورنمنٹ کی منظوری کی اُمید دلائی تو نواب صاحب نے اس کے لئے ایسی جان توڑ کوشش کی کہ ڈیڑھ سال میں تیس لاکھ روپیہ کے قریب چندہ جمع کر لیا۔ لیکن اس سخت جسمانی محنت سے ان کی صحت پر بہت بار پڑ گیا اور وہ اگست ۱۹۱۲ء میں ضعف و علالت کے سبب سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن پھر بھی وہی دُھن لگی رہی۔ اور ۱۹۱۵ء تک ہر قومی و مذہبی تحریک و خدمت میں حصّہ لیتے رہے۔ جنگ بلقان و طرابلس کے سلسلے میں مجروحین طرابلس کے لئے اپنے گاؤں کا ایک حصّہ فروخت کر کے ایک ہزار روپیہ چندہ دیا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ، کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے انہدام، ایران میں رُوس کی مداخلت وغیرہ تمام واقعات پر بڑی آزادی اور دلیری کے ساتھ اظہار رائے کرتے رہے۔

آخر ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء روز شنبہ کو امروہہ میں انتقال کیا۔ اور ہندوستان، اسلام اور کالج کا محترم[۵] بزرگ بے ریا خادم اور دردمند رہنما اُٹھ گیا۔ راقم نے قرآن مجید سے تاریخ نکالی:۔ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا = ۱۹۱۷ء (سورہ فرقان رکوع ۳)

۵ ترجمہ:۔ "ٹھکانا بھی بہتر سے بہتر اور خواب گاہ بھی عمدہ سے عمدہ۔"

علی گڈھ کالج کو یہ دو نواب، محسن الملک اور وقارالملک، یکے بعد دیگرے ایسی ہستیاں ملیں کہ تمام ہندوستان میں سے ان سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ دونوں کی افتادِ طبع اور طریقِ عمل میں یک گونہ اختلاف تھا، لیکن منتہائے نظر اور منزلِ مقصود دونوں کی ایک تھی، اس لئے دونوں دو راستوں سے ایک ہی جگہ پونہچ جاتے تھے۔ نواب محسن الملک کا مسلک یہ تھا کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"، اور نواب وقارالملک اس پر عامل تھے (بقول علامہ اقبال) کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"۔

نواب وقارالملک اچھے لیڈر کے ساتھ اچھے ادیب بھی تھے۔ بے ریائی اور بے خوفی سادگی اور صفائی ان کے دل، زبان اور قلم تینوں کے یکساں اور اٹل اصول تھے۔ انھوں کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ سر سید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر و معاون تھے۔ اس کا مقصد علمی کتابیں ترجمہ و تالیف کرانا تھا۔ اس سلسلے میں نواب وقارالملک نے بھی ایک انگریزی کتاب "فرینچ ریوولیوشن اینڈ نپولین" (انقلاب فرانس اور نپولین) کا اُردو میں ترجمہ "سرگذشت نپولین بوناپارٹ" کے نام سے کیا، جو ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی، لیکن نواب صاحب اتنی انگریزی نہ جانتے تھے، اس لئے ان کے دو مددگار منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد انگریزی کا ترجمہ سُناتے تھے اور نواب صاحب اپنی عبارت میں لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ نواب صاحب نے تہذیب الاخلاق میں کثرت سے مذہبی و قومی مضامین لکھے، اور آخر عمر تک مختلف اخباروں میں حسب ضرورت لکھتے رہے۔ بعض تحریروں کے مختصر نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) ۱۸۸۹ء میں سید محمود کے آئندہ سکرٹری بنانے سے جب نواب صاحب نے سرسید کی پرزور مخالفت کی، تو اپنی راے کے سلسلے میں لکھا تھا:۔

"میری خود کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی راے لکھتا اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے۔ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس سے توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے

بخش دے۔ انسانوں کے متعلق اگر ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے تو ان سے معذرت کر کے صفائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن قوم اور ملک کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنا گناہ بخشواتا پھرے گا۔ تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

(۲) جب سنہ ۱۹۱۱ء کے شاہی دربار دہلی کے موقع پر گورنمنٹ کی طرف سے تقسیم بنگال کو منسوخ کیا گیا، تو مسلمانوں کو حکومت کی پالیسی سے ایسی مایوسی ہوئی کہ کانگریس میں شامل ہو کر ہندؤوں کا ساتھ دینے کا ارادہ کرنے لگے۔ اس موقع پر نواب وقارالملک نے یہ غلط قدم اُٹھانے سے مسلمانوں کو روکا۔ اور گورنمنٹ کی بیدردانہ پالیسی کے متعلق اپنی بے لاگ رائے لکھی۔ فرماتے ہیں:۔

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ یہ عام رائے سمجھنی چاہیئے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے، اور بعد اس کے کہ وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف اُمیدیں دلائی تھیں، الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ اس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائیگی۔"

آگے چل کر پھر اسی رائے کا اعادہ کرتے اور مسلمانوں کی ہمت بندھاتے ہیں:۔

"یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد جواب مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسا کرنا چاہیئے، لاحاصل مشورہ ہے، اب زمانہ ایسے لاحاصل بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس چیز پر ہم کو بھروسا کرنا چاہیئے، وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے، اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل ابنائے وطن نے پیش کی ہے۔ ہمارے سامنے موجود ہے۔"

آخر میں پھر گورنمنٹ کی اسی پالیسی (دونوں بنگال کے الحاق) پر تنقید کرتے ہیں:۔

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانے کی تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گذر گیا، بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان

بھی ہے، اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کس کا مراکو اور کس کی ٹرپولی، اور کہاں کا ایران؟ یہاں سرے سے اسلام ہی کا قلع قمع ہوا جاتا ہے۔"

مسلمانوں کو شرکت کانگریس سے روکتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی شیرازہ کو منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے۔ ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر نہیں کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہئے۔ وفاداری خود غرض ہے، وہ جوہر نہیں ہے۔ اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قائم ہوتی ہے اور جس قدر اس بنیاد میں تزلزل ہوگا، وفاداری بھی لامحالہ متزلزل ہوگی پس مسلمان جو من حیث القوم نیشنل کانگریس سے ابتک علیحدہ ہیں، اس کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اہم دعاوی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں، ان کا سوراج مسلمانوں کے حق میں تباہ کن ہے ...."

(۳) اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کی شکست کے سلسلے میں بقول نواب وقار الملک "ہنگامۂ محشر" برپا ہوا۔ یہی ان کے مضمون کا عنوان ہے جو انھوں نے اس واقعہ کے متعلق لکھا تھا، اس میں اپنی بے لاگ اور بے دھڑک رائے لکھتے ہیں:۔

"بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا، اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانان صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں، یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو ایک ٹائلر نہیں، آئندہ ہم کو توقع رکھنی چاہئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لئے ٹائلر ثابت ہوگا۔ اگر اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی دفعتہً ہمارے جذبات

کے خلاف کارروائی کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتے گا، اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزّت کو برقرار رکھیں، یا پیروں کے تلے پامال ہونے دیں۔"[۵]

مولوی چراغ علی

نواب[۵۲] اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علیؒ خداساز اور خود آموز و خود افروز" ہستیوں میں تھے جو اپنے ذاتی جوہر اور کاوش و کوشش سے ممتاز و سربلند ہوجاتے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد کا اصلی وطن کشمیر تھا۔ وہاں سے ان کا خاندان پنجاب آیا، اور پھر میرٹھ منتقل ہوگیا۔ ان کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ و سہارنپور میں ملازم رہے۔ پھر ۱۸۴۹ء میں پنجاب و سرحد میں مہتمم بندوبست رہے۔ یہ منصب کلکٹر کے عہدے سے کم نہ تھا۔ اس سے مولوی محمد بخش کی قابلیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

مولوی چراغ علی ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے، اور دس برس کے تھے کہ والد عین شباب میں ۱۸۵۶ء میں رحلت کر گئے۔ مولوی صاحب کے تین بھائی اور تھے، یہ سب میں بڑے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی لیکن اُردو، فارسی، انگریزی کی معمولی تعلیم ہوسکی۔ کوئی امتحان پاس نہ کرسکے۔ ابھی طالب علم تھے کہ ضلع بستی میں خزانے کے منشی ہوگئے۔ بیس روپیہ تنخواہ ہوئی۔ چند سال بعد غالباً ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ میں ڈپٹی منصرم ہوگئے۔ اور پھر سیتاپور تبادلہ ہوگیا۔ اس زمانے میں سرسید لکھنؤ آئے تو مولوی چراغ علی سیتاپور سے لکھنؤ آکر ان سے ملے، اور دونوں میں بڑا ارتباط پیدا ہوگیا۔ جس کا سبب یہ تھا کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف تھا۔ اور اسلام کی فضیلت و

---

[۵۱] نواب وقار الملک کے حالات اور اقتباسات تحریر میں بشیر پاشا سیریز (اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ) کے شائع کردہ تذکرہ نواب وقار الملک (مرتبہ مولوی محمد امین زبیری) سے مدد لی گئی ہے

[۵۲] یہ حالات ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے مضامین (چند ہم عصر) سے لئے گئے ہیں۔

حقانیت غیر مسلم اقوام خصوصاً عیسائی پادریوں کے سامنے پیش کرنے اور ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ اس سے پہلے اس قسم کی کتابیں اور مضامین لکھ چکے تھے۔ سرسید بھی یہی کام کر رہے تھے۔ اور ان دونوں میں باہم خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ سرسید نے اس ملاقات کے بعد ان کو کچھ ترجمہ کا کام دیا جو حیدرآباد سے سرسید کے پاس آیا تھا اور اس کا معاوضہ بھی دلوایا۔ ۱۸۷۶ء میں مولوی صاحب نے علی گڑھ دورہ کر یہ کام کیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں سرسید نے مولوی چراغ علی کو سرسالار جنگ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں ان کو مددگار معتمد مال گذاری کا عہدہ دیا گیا۔ چار سو روپیہ تنخواہ ہوئی۔ اس کے بعد سات سو روپیہ ہو گئے ورنگل و گلبرگہ کے صوبہ دار ہوئے اور پھر معتمد مال و فینانس ہو گئے۔ یہ سب خدمات ایسی محنت، قابلیت اور دیانت کے ساتھ انجام دیں کہ صلے میں نواب اعظم یار جنگ بہادر کا خطاب ملا۔

مولوی چراغ علی نہایت مستقل مزاج، صائب رائے، بے لوث، غیر متعصب اور انتہا درجہ کے جفاکش آدمی تھے۔ جس زمانے میں فنانشل سکریٹری تھے، خبر ملی کہ مسٹر کرالی کنٹرولر جنرل ہو کر آرہے ہیں۔ مولوی صاحب نے فنانس پر انگریزی کی سب اعلیٰ درجہ کتابیں منگالیں اور ان کا ایسا مطالعہ کیا کہ جب مسٹر کرالی سے ملاقات ہوئی اور اس موضوع پر گفتگو کا موقع پیش آیا تو وہ انکی قابلیت اور وسعت معلومات پر حیران رہ گئے۔

مولوی چراغ علی کو ابتدائے عمر میں باقاعدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لیکن اپنے شوق اور محنت سے سب کمی پوری کرلی۔ عربی و فارسی کے عالم تھے۔ کلدانی، لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی مہارت پیدا کرلی تھی۔ انگریزی زبان پر تو ایسی قدرت حاصل کی تھی کہ بڑے بڑے انگریزی اخبارات ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ گویا عمر بھر طالب علم رہے۔ ایسا انہماک ہو جاتا تھا کہ ایک بار تہہ خانے میں آگ لگ گئی۔ یہ تہہ نشین

میں بیٹھے پڑھتے رہے، خبر تک نہ ہوئی۔ ریاست کے ایسے سچے خیر خواہ اور دیانتدار امین تھے کہ اپنے اصول کے مقابلے کسی کی سفارش نہ سنتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب وقارالامرا بہادر نے کسی کی سفارش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے تو ٹالا، پھر ادھر سے اصرار ہوا تو نواب صاحب سے صاف کہہ دیا کہ "آپ اس لئے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لٹادیں، آپ کا کام خزانے کی حفاظت ہے"۔

بے تعصّب ایسے تھے کہ کسی فرقہ و مذہب سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ یہاں تک کہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے کچھ تعلق نہ تھا۔ چنانچہ مردم شماری کے موقع پر "فرقہ" کے خانے میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو "شیعہ" لکھدیا، اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے آگے صفر لکھدیئے۔

۱۵ر جون ۱۸۹۵ء (مطابق ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ) کو ۵۰ برس کی عمر میں مرض ذیابیطس کے اپریشن کے بعد یکایک بمبئی میں انتقال کیا۔ چراغِ حق (۱۳۱۲ھ) تاریخ ہے۔ جسٹس سیّد محمود (خلف سر سید) کو صنعت تاریخ گوئی بہت پسند تھی۔ انھوں نے ایک فقرۂ نثر میں عیسوی سن نکالے۔ مولانا حالی نے اس فقرے کو قطعہ میں موزوں کردیا۔ ان تینوں بزرگوں کی یادگار کے طور پر اس کو نقل کیا جاتا ہے:—

زخمے از مرگِ چراغ علی آمد بردل | کہ از و خاطرِ افکار بصد غم شدہ جفت
از خرد سالِ وفاتش چو بجستم محمود | "شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا" گفت

۱۸۹۵ء

مولوی چراغ علی نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا مصروف و کثیر الاشتغال انسان کیونکر اتنا وقت نکال سکتا تھا۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ مولوی صاحب کا پسندیدہ و محبوب موضوع اسلام و حقانیت اسلام تھا۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں قانون اور فنانس سے بھی کافی شغف پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ زیادہ کتابیں اسی مضمون پر لکھی ہیں۔

اسلام پر بھی چند ضخیم کتابیں بڑی تحقیق کے ساتھ مجتہدانہ شان کی لکھی ہیں۔ جن کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوگیا ہے۔ مثلاً

(۱) تحقیق الجہاد، عیسائیوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔

(۲) اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام۔ اسلام کی سوشل اصلاحات کے متعلق۔ اس کے پہلے ۴ صفحوں کا ترجمہ مولوی چراغ علی نے کیا تھا۔

(۳) محمدؐ پیغمبر برحق۔ سیرت پاک پر محققانہ تالیف ہے اس کا اُردو ترجمہ غالباً نہیں ہوا۔

(۴) تعلیقات (اُردو) ایک پادری کی کتاب "تاریخ محمدی" کے جواب میں۔ یہ رسالہ مولوی چراغ علی کی سب سے پہلی تالیف ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۲ء۔

(۵) اسلام کی دنیوی برکتیں۔ نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ بہت پسند کی گئی اور بار بار شائع ہوئی۔

(۶) قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ قرآن مجید میں جن اقوام قدیمہ کا ذکر ہے ان کا حال قدیم تاریخوں سے تلاش کیا ہے۔ اور عیسائیوں کے اس اعتراض کو اٹھایا ہے کہ قرآن کی مذکورہ اقوام کا کوئی وجود کبھی نہ تھا۔

(۷) رسائل چراغ علی۔ مولوی صاحب نے بہت سے مضامین حیدر آباد آنے سے پہلے سیتا پور و لکھنؤ میں لکھے تھے۔ جو مسودے کی صورت میں رہ گئے۔ ان چھوٹے بڑے ۵۴ رسالوں میں سے چار رسالے مولوی عبداللہ خاں نے بڑی محنت سے مرتب و درست کر کے ۱۹۱۸ء / ۱۳۳۶ھ میں کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد سے شائع کئے۔ مولوی چراغ علی کے ہر مسودے کے آخر میں ان کے دستخط اور مقام و تاریخ تحریر درج ہے۔ اس مجموعہ میں یہ رسالے ہیں:۔

(الف) تہذیب الکلام فی حقیقۃ الاسلام سب سے بڑا رسالہ ہے ۱۲۳ صفحوں میں شائع ہوا ہے۔ آخر میں ۲۳ راکتوبر ۱۸۷۵ء سیتاپور ملک اودھ درج ہے۔ اس میں مولوی سید محمد عسکری تحصیلدار لکھنؤ اور مولوی محمد علی چھرایونی تحصیلدار بلاری ضلع مراد آباد کے چند اعتراضات کا جواب ہے۔

(ب) مجموعہ روایات استرقاق دستری۔ اس رسالے میں صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث و سیر و مغازی سے چند ایسی معتبر روایتیں جمع کی ہیں، جن میں رسم غلامی کی بیخ کنی پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غزوات میں آپ کے عمل مبارک سے دکھائی ہے۔ مارچ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیتاپور لکھا گیا۔

(ج) تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام۔ مولوی محمد علی پھلواروی کے ایک مضمون مطبوعہ نورالآفاق کانپور کا جواب جس میں ثابت کیا ہے کہ فتح مکہ (۸ھ) کے بعد غلام بنانا قطعاً موقوف کر دیا گیا۔

(د) تحقیق مسئلہ تعدد ازدواج۔ مولوی محمد حسین بٹالوی ایڈیٹر رسالہ "اشاعۃ السنۃ" کے ایک مضمون متعلق نکاح و طلاق پر تنقید۔ اس میں یورپین مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب بھی آگئے ہیں۔ یہ رسالہ ناتمام ہے اس لئے تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔

(۸) العلوم الجدیدہ والاسلام۔ یہ مولوی چراغ علی کی آخری تصنیف تھی لیکن اس کی صرف تمہید رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں چھپی تھی کہ یکایک ان کا انتقال ہو گیا۔

مولوی چراغ علی صاحب کی فضیلت علمی اور کمال تحقیق کے سلسلے میں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مولوی صاحب کے کاغذات میں مرزا غلام احمد قادیانی[۵] کے

---

۵ مرزا غلام احمد قادیانی، قادیان ضلع گورداسپور (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ شروع میں عیسائی اور آریہ مخالفین اسلام سے تحریری و زبانی مناظرے کئے۔ اور متعدد کتابیں اسی موضوع پر لکھیں۔ ۱۸۸۰ء میں براہین احمدیہ شائع کی۔ اس کتاب میں سب سے پہلے اپنے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس سے پہلے سب مسلمان مرزا صاحب کے طرفدار تھے۔ اس دعوے سے سب چونک گئے۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے پے در پے قسم قسم کے دعوے کرنے شروع کر دئیے۔ آخر نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ مسیح موعود اور مہدی معہود بن گئے۔ پھر کرشن اوتار ہونے کا بھی دعویٰ کر دیا۔ ۱۸۹۰ء میں اپنا فرقہ احمدیہ الگ قائم کر لیا۔ مئی ۱۹۰۸ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ قادیان میں دفن ہوئے۔ مرزا صاحب بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے خیالات اور تحریروں پر سر سید کی آزادی رائے، تاویل آیات اور طرز استدلال کا بہت اثر پڑا ہے۔

چند خطوط نکلے ہیں، جن میں مرزا صاحب نے اپنی تصنیف "براہین احمدیہ" کی تیاری میں مولوی صاحب سے علمی اعانت چاہی ہے۔ ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء میں مرزا صاحب نے کئی خط مولوی صاحب کو لکھے ہیں اور ان کی تحقیقات و مضامین کا اشتیاق و انتظار ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کرکے میرے پاس بھیج دیں۔ اور میں نے ایک کتاب، جو دس حصے پر مشتمل ہے، تصنیف کی ہے، اور نام اس کا "براہین احمدیہ حقانیۃ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ" رکھا ہے۔ اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں، اور اپنے محقر کلام کو ان سے زیب و زینت بخشوں"۔

مولوی چراغ علی کا طریقۂ استدلال وہی ہے جو سر سید کا ہے۔ ہر مسئلہ کے ایک ایک پہلو، بلکہ حسب ضرورت ہر محاورہ و لفظ پر بحث کرتے ہیں۔ ہر ممکن ذریعہ عقلی و نقلی سے اس پر دلیل لاتے ہیں جو بات لکھتے ہیں نہایت متانت و قوت سے لکھتے ہیں۔ طرز تحریر و زبان سر سید کے مقابلے میں زیادہ صاف و رواں اور بامحاورہ ہے۔ سر سید، نواب محسن الملک مولوی محمد علی وغیرہ، اس زمانے کے اکثر لکھنے والے الفاظ کی صحیح ترتیب کا خیال نہیں رکھتے۔ مولوی چراغ علی میں یہ بات نہیں ہے۔

نمونۂ تحریر یہ ہے:۔

(۱) اعظم الکلام کے ابتدائی صفحات جو خود مولوی چراغ علی نے اردو میں لکھے ہیں، ان کا مختصر اقتباس یہ ہے:۔

"جدید قانون زن و شو کی وجہ سے، جس کی پیغمبرؐ خدا نے اپنے پیرووں کو تلقین کی، اور بعض دانشمندانہ، عادلانہ اور سخت قیود سے، آپ نے طلاق کی سہولت کو بھی رفع کیا ہے۔ یہ قیود بہت ہی معقول ہیں، اور ان میں طرفین کے فائدے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ قرآن میں اہلِ عرب کو نصیحت اور تاکید کی گئی ہے کہ وہ

اپنی بی بیوں کے بارے میں خراب رسوم کو ترک کر دیں۔ آنحضرت صلعم نے غلامی کو موقوف کر کے لونڈیوں کے رکھنے کے رواج کو بھی موقوف کیا، اور اس وقت جو عورتیں غلامی کی حالت میں تھیں، ان سے عقد کر لینے کی تاکید کی۔ ورنہ وہ لونڈیاں بنا کر رکھی جاتیں۔ شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنے کے خلاف نہایت سخت اور شدائد احکام ہیں، اور اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ عقبیٰ میں اس کا بڑا عذاب ہوگا، اس طرح عرب اور دیگر اسلامی ممالک سے دختر کشی کی رسم بالکل اٹھ گئی۔ سب سے اول قرآن میں قانون وراثت ایسا قائم کیا گیا کہ اس میں عرب کی عورتوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا گیا۔"

(۲) رسائل چراغ علی میں سے تیسرے رسالہ (تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام) میں اپنا جواب اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

۱۔ مولوی محمد علی صاحب کی تقریر جو فاضلانہ تحریر کی پوری تصویر ہے، "نور الافاق" نمبر (۵) مطبوعہ کانپور، مطبع نظامی میں چھپ کر میرے پاس پہنچی۔ جو تعلیم ہم مسلمانوں میں ان دنوں عمدہ اور کافی تصوّر کی جاتی ہے، اس کا یہ ٹھیک ٹھیک فوٹوگراف ہے۔

۲۔ آزاد اور خود مختار مخلوقات کا غلام بنانا ایک ایسی بدنامی اور ارباب دانش کی نظر میں حقارت و ذلّت ہے جس کو ہر ایک شخص جو ادنیٰ سی بصیرت رکھتا ہو اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے، اور اس میں کچھ شک ہی نہیں کہ خدا نے ہر ایک شخص کو آفرینش کی راہ سے ایک ہی سی حیثیتِ عقلی و جسمانی کا پیدا کیا ہے، اور تمام مخلوقات فطرت کی راہ سے باہم مساوی ہیں۔ پس اگر فطرت میں آزادی ہے تو سب کے سب آزاد ہونے چاہئیں یا اس کے بالعکس، ورنہ در اصل قدرتی فرق اور فطرتی تمیز آزاد اور غلام میں نہیں پائی جاتی۔

۳۔ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم ۳۰۔ آیت ۲۹) خدا کی بناوٹ میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔

ایک بڑی مضبوط اور قوی دلیل ہے اس بنائی ہوئی حالت اور جبری و قہری

صورت کے بطلان کی، جو ابتدا میں ناملائم حرکات والی زبردست قوم نے اپنے مغلوب قیدیوں کو غلام بنا کر جبریہ ان کو فطرتی حقوق، قدرتی اختیار، اور طبعی آزادی سے محروم رکھا تھا۔ پس غلام بنانا اور اس کی جان و مال پر تصرف کرنا خلقت الٰہی میں تغیر کرنا ہے، اور اسی بات کی پیشین گوئی شیطان نے پہلے سے کی ہے۔

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (النساء ۴۔ آیت ۱۱۸۔ اور ضرور ان کو یہ سمجھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ کی بناوٹ بدل دیں۔

اور جب غلامی کی یہ صورت ہو تو کیونکر تسلیم کیا جائے کہ اسلام نے باوجود حق اور رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور تمام جہان کو تہذیب اور حکمت سکھلانے کے، پھر بھی ایسی رسم قبیح و مخالف فطرت کو کسی کسی صورت میں جاری رکھا ہو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور استرقاق (غلام بنانا) دونوں جمع ہو سکیں۔

۴۔ آغاز اسلام اور ابتداء سے وحی سے غلاموں کی حالت میں اصلاح اور غلامی کے انسداد کے لئے کوشش، ترغیب، اور فکر و تدبیر کی گئی اور شروع ہی میں اخلاق اور موعظت کی راہ سے قیدیوں کی آزادی کی رغبت دلائی گئی۔

بعض تقصیرات کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا گیا۔ مثلاً:۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ (البلد ۹۰۔ آیت ۱۲)	اے پیغمبرؐ تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ کسی کی گردن کا چھڑا دینا ہے۔

(الف) کفارۂ قتل خطا میں ارشاد ہوا۔ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (النساء۔ ایت ۹۲)
(ب) کفارۂ قسم میں ارشاد ہوا۔ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (المائدہ ۵۔ آیت)
(ج) کفارۂ ظہار میں ارشاد ہوا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (المجادلہ ۵۸۔ آیت ۳)
(د) مسلم نے کئی اسناد سے یہ حدیث نقل کی ہے:۔

من لطم مملوکہ او ضربہ فکفارتہ ان یعتقہ (مسلم ج ۲ صـ ۱۹م مصر ۱۳۲۹ھ وغیرہ)	جو شخص اپنے غلام کو طمانچہ مارے یا زد و کوب کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے۔

اور جو غلام ان تحریص و ترغیب پر بھی بے آزادی کے رہ جائیں، ان کے لئے

کتابت[۵] کا حکم ہوا:۔

(یہاں سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۳ مع ترجمہ نقل کی ہے، جس کو ہم حذف کرتے ہیں)

اور قیدیوں اور غلاموں کو مال دینے پر بھی ترغیب دی گئی:۔

وَفِی الرِّقَابِ (البقرہ ۲ آیت ۱۷۷) اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں۔

مکہ میں جب غلاموں کی آزادی کا بہت چرچا اسلام کی بدولت ہوا تو غلاموں کے مالکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ جیسی کہ اب غلامی کی حمایت کرنے والوں میں ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے "سیرت محمدی" میں لکھا ہے:۔

"جب محمدؐ نے غلامی کی آزادی کا اعلان کیا تو ان میں بہت جوش پھیلا، حتیٰ کہ عبداللہ بن جدعان نے جس کے پاس بہت سے (۱۰۰) غلام تھے بناچاری ان کو مکہ سے کہیں اور بھیج دیا کہ ایسا نہ ہو وہ سب کے سب مسلمان ہو جائیں۔"

(سیرت محمدیؐ صفحہ ۱۵۹ مطبوعہ الہ آباد ۱۸۵۱ء)

سُبحان اللہ اس زمانہ میں تو اس طرح قولاً فعلاً، موعظۃً اور شرعاً غلاموں کی آزادی کا حکم دینے اور آزاد کر دینے سے اسلام کی نیک نامی اور غیر مسلم اقوام کا حُسن ظن حاصل کیا جاتا تھا، اور ایک یہ زمانہ ہے جس میں اگر کہیں ضمناً بھی غلامی کے عدم جواز کا ذکر آجائے تو بڑے بڑے مولوی صاحب اسلام کو بدنام کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں، اور "نور الآفاق" کے اوراق سیاہ کئے جاتے ہیں۔

---

۵ مالک غلام سے وعدہ کر لیتا تھا کہ اتنی رقم محنت مزدوری سے جمع کر کے دیدے تو پھر آزاد ہے۔ اس کو کتابت و مکاتبت کہتے ہیں۔

پانچویں دَور کی نثر پر تبصرہ

(۱) زمانے کے لحاظ سے پانچواں[۵] اور چھٹا[۶] دَور الگ الگ نہیں۔ دونوں کی ابتدا و انتہا تقریباً ساتھ ساتھ ہے۔ بلکہ یہ تفریق نثر نگاری کی خصوصیات کے سبب سے کی گئی ہے۔

(۲) پانچویں دَور میں جن مصنفوں کا تذکرہ کیا گیا انھوں نے باعتبار موضوع و مضمون مختلف قسم کی کتابیں لکھیں جن میں بعض مضامین اپنی نوعیت میں اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً سرسید، مولوی چراغ علی اور ان کے مخالفوں نے مذہبی مضامین جیسی جامعیت کے ساتھ لکھے، اس سے پہلے نہ لکھے گئے تھے۔ سرسید کی "آثارالصنادید" اور مضامین تہذیب الاخلاق اُردو میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دَور میں شعرا کے تذکرے بھی بجائے خود دلچسپ اضافے ہیں۔

(۳) لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے اور ایجاد اسالیب کے اعتبار سے ان تمام مصنّفوں میں بجز سرسید کے، کسی کا کوئی خاص مرتبہ نہیں ہے۔ طرز قدیم کا اثر سب میں ہے، کہیں قافیہ بندی کی حد تک، کہیں الفاظ کی بے ترتیبی، اور زبان و محاورہ کی بے پروائی کی صورت میں۔ ان میں سے کوئی مصنّف "**صاحب طرز**" نہیں کہا جا سکتا۔

(۴) اسی امتیاز کو نمایاں کرنے کی غرض سے اُنیسویں[۱۹] صدی کے دوسرے اہل قلم کو علیٰحدہ لکھا جاتا ہے۔ جنھوں مختلف قسم کے بالکل جدید، موزوں اور انفرادی اسالیب بیان کیے

(۵) چھٹے دَور کے مصنّف صرف طرز نگارش کے سبب سے ممتاز نہیں، بلکہ نئے نئے موضوعاتِ تصنیف کے موجد بھی ہیں۔

(۶) اُردو تصانیف میں ابتک جو کمی نظر آتی ہے وہ صحیح تنقید اور عالمانہ تحقیق و تدقیق کی ہے۔ کوئی مضمون و موضوع ہو، زبان و ادب ہو یا تاریخ یا سیرت یا شاعری یا اور کچھ، اس کے لکھنے کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ہر پہلو پر غور نہ کیا جائے اور ہر ممکن ذریعہ سے ایک ایک جزو، ایک ایک رُخ کی تحقیق و تنقید نہ کی جائے۔ یہ کام گذشتہ دَور میں صرف مذہب کے متعلق کیا گیا ہے۔ تصنیف و تالیف کی اور کسی شاخ کے لئے ایسی کاوش نہیں کی گئی۔

(۷) یہ نقد و نظر، تحقیق و تنقیح، موازنہ و مقابلہ آئندہ مصنفین کی امتیازی و انفرادی خصوصیت ہے۔

نثرِ اردو کا

چھٹا دور

(غدر کے بعد سے بیسویں صدی کے شروع تک)

مولوی محمد حسین آزاد

والد کا نام مولوی محمد باقر ہے۔ شیعہ مجتہدین کے خاندان سے تھے۔ غالباً ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ آزاد کے والد نے ۱۸۳۷ء میں "اردو اخبار" دہلی سے نکالا تھا۔ جو اردو کا پہلا اخبار نہیں تو دہلی کا پہلا اخبار ضرور تھا۔ ان کے والد کے استاد ذوق دہلوی سے بڑے تعلقات تھے۔ اسی سبب سے آزاد ذوق کے شاگرد ہوئے، اور انکے ساتھ دہلی کے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ آزاد کو اپنے استاد سے جیسی محبت تھی، اس کی مثال دنیا میں کم ملتی ہے۔ آزاد نے قدیم دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی، جہاں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب ان کے رفقاے تعلیم تھے۔ استاد ذوق کے انتقال (۱۸۵۴ء) کے بعد آزاد نے حکیم آغا جان عیش سے کچھ دنوں فیض سخن حاصل کیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آزاد کے والد بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اور دہلی دروازے کے باہر ایک میدان میں باغیوں کے ساتھ محصور و نظر بند کر دئیے گئے۔ یہ حادثہ آزاد کے لئے کیا کم المناک و جاں گداز تھا کہ آزاد کو غایت محبت کے سبب سے اس حالت میں والد کی زیارت کا شوق ہوا۔ اس وقت دہلی کی ایسی فضا تھی کہ باہر چلنا پھرنا بھی خطرناک تھا۔ آخر آزاد کو فوج کے ایک سکھ جرنیل کا خیال آیا جو ان کے والد کا دوست تھا۔ اسکے

؎ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء میں آزاد کا انتقال ۷۷ سال کی عمر میں ہوا ہے۔ اس سے سال ولادت نکالا گیا ہے۔ اور کوئی ذریعہ اطلاع نہ تھا۔

پاس گئے اور اپنی آرزو بیان کی۔ اُس نے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ انھوں نے اپنے دل کی تڑپ کا اظہار کیا۔ آخر اس نے کہا کہ تم میرے سائیس کا لباس پہنکر میرے ساتھ چل سکتے ہو، اور کوئی تدبیر نہیں۔ چنانچہ آزاد سائیس کے حُلیے میں سکھ جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس میدانِ محشر میں پہنچے۔ جہاں قیدی اپنی زندگی کی آخری ساعتیں گذار رہے تھے۔ انہی لوگوں میں ایک طرف کو ایک مردِ خدا عبادت میں مصروف تھا۔ چہرے پر اطمینان و سکون کے آثار تھے، یہی آزاد کے شفیق بڈھے باپ تھے، جن کی عمر اس وقت ستر سال سے زائد تھی۔ بہت دیر کے بعد نظر اُٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا لاڈوں کا پیارا جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اِدھر یہی حالت بیٹے پر گذری۔ دُنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہو گئی۔ جب نظر نے یاوری کی، تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہیں کہ بس آخری ملاقات ہو گئی، اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو۔ اس اشارے کے بعد انھوں نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دئے۔ آزاد نے اس وقت لاکھ ضبط کیا۔ لیکن نہو سکا۔ وہاں سے روتے ہو رخصت ہوئے۔ اور اس وقت تک اس وفادار جرنیل کی حفاظت میں رہے جب تک شاہجہاں آباد کی یہ مظلوم روحیں قفسِ عنصری میں قید رہیں[۵]۔ جب شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تو آزاد اسی سکھ جرنیل کی مدد سے باہر نکلے۔ بغل میں اُستاد ذوقؔ کی نظموں کا بستہ تھا، جس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

جب غدر کی دار و گیر سے کچھ امن کی صورت نظر آئی تو آزاد مع اہل و عیال لکھنؤ چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی گردشِ تقدیر ساتھ رہی، آخر ایک مدت بعد ۱۸۶۴ء میں لاہور

۵ یہ کیفیت بلکہ آخری سطریں (جو علامات اقتباس سے محدود ہیں) تقریباً بجنسہ رسالہ کتابی دنیا (شائع کردہ کتاب گھر دہلی) کے ایک مضمون سے لی گئی ہیں۔ اس رسالے میں "آزاد کے مکمل سوانح حیات" سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ اب تک آزاد کے مفصل حالات کہیں نہ ملتے تھے۔

پونچے - اور پنڈت من پھول میر منشی لفٹنٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے سررشتہ تعلیم میں پندرہ روپیہ کے ملازم ہوگئے۔ اس زمانے میں میجر فلر ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ میجر صاحب بڑے علم دوست تھے اور ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی سے خاص اُنس رکھتے تھے۔ آزاد اور ماسٹر صاحب کے تعلقات نہایت دوستانہ و مخلصانہ تھے۔ آزاد نے ماسٹر صاحب سے فرمائش کی کہ میجر صاحب سے ہمیں بھی ملوا دیجئے۔ ایکبار موقع مل گیا۔ میجر فلر نے کوئی اُردو کی تحریر لکھی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب کو دکھائی۔ اس میں میجر صاحب نے ایجاد کو مونث لکھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اعتراض کیا کہ "ایجاد" مذکر ہے۔ میجر صاحب نے کہا کہ یہ تحریر مولوی کریم الدین صاحب سررشتہ دار کو دکھائی ہے۔ مولوی صاحب بلائے گئے۔ انھوں نے اعتراض سُن کر کہا کہ مذکر بولنے کی سند درکار ہے۔ ماسٹر پیارے لال صاحب نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے محکمہ میں جو مولوی محمد حسین دہلوی ہیں ان کو بہت سے شعر یاد ہیں۔ میجر نے آزاد کو بلا کر سوال کیا۔ آزاد نے فوراً سودا کا یہ شعر پڑھ دیا :-

ہائے یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے　　　نسخہ میں معجون زر بنا د ہے

میجر صاحب بہت خوش ہوئے اور آزاد کی قدر کرنے لگے۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور سے ایک سرکاری اخبار اتالیق پنجاب نکلتا تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اس کے ایڈیٹر تھے۔ کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اس اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا اور ۷۵ روپیہ تنخواہ کر دی پھر اتالیق پنجاب بند کرکے اس کی جگہ پنجاب میگزین جاری ہوا، تو آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر رہے۔ آزاد کے بعد حالی نے بھی یہ خدمت انجام دی۔

آزاد ۱۸۶۵ء میں کسی سرکاری کام کے لئے کلکتہ گئے۔ اسی سال پنڈت من پھول کے ساتھ سرکاری سفارت کی غرض سے کابل و بخارا گئے۔ ایران کا بھی سفر کیا۔ دوبارہ ۱۸۸۲ء میں ایران گئے۔ ایران میں آزاد نے فارسی جدید میں مہارت پیدا کی۔ اور وہاں سے آکر ایرانی فارسی کے متعلق کچھ درسی کتابیں

بھی مرتب کیں۔ آزاد ایک عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی و عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریا کے ۵۰ سالہ جشن تاجپوشی کے موقع پر آزاد کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء سے آزاد کے دماغ میں کچھ اختلال کے آثار شروع ہوئے۔ پھر یہ کیفیت بڑھ کر مستقل ہو گئی۔ اور زندگی کے باقی بیس برس اس حالت میں گزرے کہ کبھی جذب و بیخودی نظر آتی تھی، کبھی جنون کی شان پیدا ہو جاتی تھی۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء (مطابق ۹ محرم ۱۳۲۸ھ) کو رحلت فرمائی۔

اُردو شاعری پر آزاد کا احسان جس زمانے میں آزاد پنجاب کے سررشتہ تعلیم میں منسلک تھے، اور حالی بھی بک ڈپو کے اہتمام کے لیے وہاں ملازم ہو کر پہنچ گئے تھے۔ آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ کی تائید سے جدید شاعری کا دور شروع ہوا۔ یعنی ایک بزمِ ادب انجمن پنجاب کے نام سے قائم ہوئی جس میں بجائے طرحی غزلوں

---

۵ **جدید اُردو شاعری**۔ اُردو شاعری کی ابتدا سے شاعری کی جو قسمیں عام طور پر رائج ہیں، وہ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت وغیرہ تھیں۔ یہ قدیم شاعری اور ادبیاتِ قدیم (کلاسیکل لٹریچر) کہلاتی ہیں۔ ان اصنافِ سخن کا موضوع و مقصود حسن و عشق، مدح و ہجو، قصص و حکایات، اخلاق و تصوف تھا۔ ان کے مقابلے میں جدید شاعری سے یہ مراد ہے کہ کسی جذبہ یا منظر یا حقیقت یا واقعہ کے متعلق چھوٹی یا بڑی مستقل نظم لکھی جائے۔ اس میں یہ اقسام شامل ہیں (۱) تخیلی شاعری یعنی محبت، عداوت، مسرت، غم، ایثار، خودداری وغیرہ میں سے کسی جذبہ کی تصویر کشی۔ (۲) منظر کشی یعنی کسی وقت، موسم، مقام یا اوضاع و احوال وغیرہ کی تصویر کشی۔ مثلاً صبح و شام، بہار، برسات، دریا، باغ۔ تیتری، کوئل، اشنان، تیرتھ، دیوالی، عید وغیرہ کا منظر نظم میں بیان کرنا۔ (۳) بیانیہ شاعری۔ کسی خاص واقعہ کو نظم کرنا۔ مثلاً حاتم کی سخاوت، سکندر و قزاق کی گفتگو، رام چندر جی کا بن باس۔ (۴) تمثیلی یا رمزیہ شاعری۔ یعنی غیر ذی روح یا غیر ذی عقل چیزوں کو انسانی خواص و افعال دے کر ان کے قصے یا مکالمات لکھنا، جس سے کوئی اخلاقی پہلو ذہن نشین کرنا مقصود ہو۔ جیسے نظیر اکبر آبادی کی نظم ہنس پیا خالی کا مناظرہ دولت و وقت یا تاجر و طوطی کا مشہور واقعہ۔ (۵) وطنی و قومی شاعری یعنی ملک و قوم کی اصلاح و فلاح کے متعلق نظمیں۔

(باقی آئندہ صفحہ پر)

کے مختلف موضوعات قومی و اخلاقی اور مناظر و حقائق کے نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ چنانچہ آزاد کی مثنوی "زمستاں"، "ابرِ کرم" وغیرہ اور حالی کی "حبِ وطن" اور "برکھارت" وغیرہ اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ اس جدّت و ایجاد کا خیال سب سے پہلے آزاد کو آیا اور انھوں نے خود کہہ کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر جدید نظموں کو رواجِ عام دیا۔ اس لئے یہ انقلابِ شاعری آزاد کی اوّلیات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ انجمن پنجاب کا سب سے پہلا مشاعرہ ۸ رمئی ۱۸۷۴ء کو ہوا تھا، اس میں آزاد نے (شام کی آمد اور رات کی کیفیت) پڑھ کر سنائی۔ یہ مشاعرہ صرف گیارہ مہینے جاری رہا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۶

مختصر تاریخ

(۱) پہلا دور۔ قدیم زمانے میں اس طرح کی نظمیں لکھنے کا عام رواج نہ تھا۔ قصیدوں کی تشبیب، مثنویوں اور مرثیوں کے ضمنی مناظر میں ان جدید نظموں کی مشابہت موجود ہے۔ اگر یہ ٹکڑے قصائد وغیرہ میں سے الگ کر لئے جائیں تو جدید شاعری کے ذیل میں آسکتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ قدیم زمانے میں بعض شاعروں نے الگ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً گولکنڈہ کے بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۶۱۱ء) کے قلمی دیوان میں متعدد نظمیں پھول، پھل، ترکاری، شادی بیاہ، شب برات، ہولی، بسنت وغیرہ پر موجود ہیں۔ ایک نظم میں صراحی و پیالہ کا مناظرہ ہے۔ ان نظموں کی زبان دکھنی اردو ہے۔ دکن کے اور شاعروں نے بھی ایسی نظمیں لکھی ہیں۔

(۲) دوسرا دور۔ اس سے سنو برس بعد دہلی میں مرزا سودا (۱۷۱۳ء-۱۷۸۰ء) اور میر تقی میر (۱۷۲۴ء-۱۸۱۰ء) اور بعض دوسرے شاعروں نے مناظرِ قدرت، مظاہرِ صنعت، اور واقعات و حوادث کے متعلق نظمیں لکھیں۔ خصوصاً میر کی نظمیں آج تک اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔

(۳) تیسرا دور۔ میر و سودا کے زمانے میں، لیکن ان سے عمر میں چھوٹے اور شاعری میں کم رتبہ ایک بے نظیر شاعر میاں نظیر اکبر آبادی (۱۷۴۰ء-۱۸۳۰ء) تھے۔ میاں نظیر اس جدید شاعری کے ایسے عجیب علم بردار تھے کہ ان کا نام سب سے الگ لکھنے کے قابل ہے۔ گویا وہ اپنے دور میں اکیلے ہیں۔ نظیر فنِ شاعری کے اصول و قواعد کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔ (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

آزاد کی تصانیف سررشتہ تعلیم پنجاب کی ملازمت کے زمانے میں کرنل ہالرائڈ کی فرمایش سے آزاد نے اردو ریڈریں، فارسی ریڈریں، قواعد اردو، قصص ہند (تاریخی کہانیاں) مرتب کیں۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوع کی بہترین کتابیں ہیں۔ بچوں کی درسیات میں اس سے بہتر کتابیں موجود نہ تھیں۔ اور ان کے بعد بھی مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے سوا کسی سے ان سے بہتر نہ بن سکیں۔ خصوصاً قصص ہند کی فصاحت و دلکشی اور لطف و تاثیر کا آج تک جواب نہ ہوسکا۔ قند پارسی بھی فارسی جدید کے متعلق آزاد کی مفید کتاب ہے۔ نصیحت کا کرن پھول اخلاقی و تعلیمی قصہ ہے جو لڑکیوں کے لئے آزاد نے تصنیف کیا ہے۔ ان سے زیادہ عظیم الشان آزاد کے علمی و ادبی و لسانی کارنامے یہ ہیں:-

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۷) اور جو موضوع اپنی شاعری کے لئے پسند کیا تھا وہ مقبول و رائج نہ تھا اگرچہ شاعرانہ محاسن میں نظیر کا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے صدہا نظمیں اپنے جذبات و تاثرات سے لکھیں جن میں قدرتی مناظر، فطری جذبات، اخلاق و نصائح، مشاغل حیات سب کچھ شامل ہے۔ آدمی نامہ، فقیر کی صدا، پیسہ نامہ، برسات کی بہاریں، تیراکی کا میلا، ہولی، دیوالی، بسنت، عید، عرس، وغیرہ پر عجیب و غریب نظمیں لکھی ہیں۔ جو اس رنگ میں نہ پہلے لکھی گئی تھیں۔ نہ آج تک لکھی گئی ہیں۔

(۴) چوتھا دور۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے علم و ادب، تہذیب و تعلیم، فکر و تخیل کے انقلاب کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ نظم جدید کی اس تحریک و اشاعت کا مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ حالی کے سر سہرا ہے۔ ۱۸۷۴ء سے اردو میں یہ مستقل صنف شاعری شروع ہوگئی۔ حالی و آزاد کے ہم عصر انیسویں صدی کے بہترین شاعر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ہیں، جنکی نظمیں محاسن شاعری میں آزاد و حالی دونوں سے بہتر ہیں۔ قدامت و افادہ و کثرت میں حالی کو تفوق پر تفوق ہے۔ ان بزرگوں کے ساتھ اکبر الہ آبادی، پیارے لال شاکر، نظیر شاہ، جوالا پرشاد برق، ذاکر، سہا، سرور جہان آبادی، شوق قدوائی وغیرہ امتیاز خاص رکھتے ہیں۔

(۵) پانچواں دور۔ بیسویں صدی کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس کی رفتار و ترقی میں بعض

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

۱۔ آب حیات (تذکرۂ شعراء)۔ ۲۔ نیرنگ خیال دو حصے (رمزیہ یا تمثیلی مضامین)۔
۳۔ دربار اکبری (شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے کی تاریخ) ۴۔ سخندان فارس (فارسی علم اللسان)۔
۵۔ نگارستان فارس (تذکرۂ شعرائے فارسی)۔ ۶۔ دیوان ذوق (مع حالات و تشریحات)۔
۷۔ نظم آزاد (قومی و اخلاقی نظموں کا مجموعہ) یہ سب کتابیں آزاد کی زندگی میں شائع ہو گئی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے وُرثا نے قلمی مسودات سے بہت سی کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔
۸۔ تذکرۂ علماء (۴۰ مشاہیر ہند کا تذکرہ)۔ ۹۔ سیاک و نماک (آزاد کی مجذوبانہ تحریر) ۱۰۔ کائنات عرب (جغرافیہ و احوال عرب)۔ ۱۱۔ لغت آزاد (اردو الفاظ کے فارسی مترادفات)۔ ۱۲۔ ڈرامۂ اکبر (فسانہ جہانگیر و نور جہاں)۔ ۱۳۔ سیر ایران

(بقایا حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ماہوار رسالوں نے بڑی مدد دی، مثلاً رسالہ مخزن لاہور (جاری شدہ ۱۹۰۲ء) اور رسالہ زمانہ کانپور (جاری شدہ ۱۹۰۳ء)۔ ان کے علاوہ بیسویں صدی کے ان پچاس سال میں بے شمار رسالے جاری ہوئے اور ان کے ذریعہ سے ہزارہا جدید نظمیں شائع ہو گئیں۔ ہر مہینے بلامبالغہ کئی سو نظموں کا اضافہ ہو جاتا ہے اس زمانہ کے چند ممتاز جدید شاعر یہ ہیں:۔ ڈاکٹر اقبال، مرزا عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، چکبست لکھنوی، ظفر علی خاں، درگا سہائے سرور، تلوک چند محروم، نادر کاکوروی، سیماب اکبرآبادی، ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ یہاں صرف چند نام لکھ دیئے گئے ہیں، لیکن ترجیح بلامرجح نہیں ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جن کی جدید شاعری ۱۹۰۱ء سے کچھ پہلے یا کچھ بعد شروع ہوئی۔ اب ان میں کتنے رحلت فرما گئے اور جو زندہ ہیں ان میں سے کسی کی عمر ۶۰ سال سے کم نہ ہو گی۔

(۶) چھٹا دَور ان جدید شاعروں کا ہے، جن کی شاعری جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) یا تحریک آزادی (۱۹۲۰ء) کے بعد منظر عام پر آئی ہے۔ ان میں نسبتہً قدیم شاعر جوش ملیح آبادی ہیں۔ جوش سے زیادہ مکمل خوبصورت اور کثرت سے لکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لیکن نئے زمانے میں ایسے جوہر قابل بھی موجود ہیں کہ تکمیل شاعری کے بعد ان پر اردو اور ہندوستان کو ناز ہو گا۔ اگرچہ آجکل شاعروں کی کثرت اس قدر ہو گئی ہے کہ اعلیٰ معیار کا قائم رہنا دشوار ہے۔ اندیشہ ہے کہ کمال سے پہلے زوال نہ شروع ہو جائے۔

(سفرنامہ) ۱۴۔ فلسفۂ الٰہیات (مجذوبانہ تصنیف)۔ ۱۵۔ جانورستان (حالات حیوانات) ۱۶۔ مکتوباتِ آزاد (مجموعہ خطوط) ۱۷۔ بیاضِ آزاد (آزاد کے پسندیدہ اشعار)۔ ۱۸۔ خمکدۂ آزاد (غزلیات و منظومات)۔

آزاد کا طرز تحریر اگر کسی شخص کو آزاد کی سوانح زندگی، انقلابات و مصائب، افتادِ طبع اور جذب و جنون کا حال معلوم نہ ہو، اور وہ ان کی آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قصصِ ہند، اور دربارِ اکبری، سخندانِ فارس وغیرہ کتابیں جو آثارِ جنون سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں، مطالعہ کرے، تو پڑھنے والا آزاد کے اسلوبِ تحریر کی جدّت و دلکشی، اور آزاد کی ذہانت و لطافتِ طبع سے متاثر ہونے کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے گا کہ یہ مصنف "خیالی بندہ" اور "عالمِ خیال" کا رہنے والا ہے۔ اس کی ذہنی فضا احساسات و تاثرات سے بھری ہوئی یا اسکے دماغ پر تخیل کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔

علّامہ آزاد کی تمام تصانیف اس "نظریہ" کی دلیل ہیں۔ صرف نیرنگِ خیال کے تمثیلی و رمزیہ (ایلیگوریکل) مضامین پر یہ قیاس قائم نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی مستقل کتابیں عربی و فارسی میں بھی لکھی گئی ہیں۔ اور اردو میں بھی۔ ایسے مضامین سرسید، محسن الملک، حالی وغیرہ نے بھی لکھے ہیں۔ اور وہ یقیناً "خیالی بندے" نہ تھے۔ نیرنگِ خیال کے علاوہ آزاد کی "آبِ حیات" میں ہر دور کی تمہید و خاتمہ، آبِ حیات، دربارِ اکبری، سخندانِ فارس، دیوانِ ذوق کے صدہا چھوٹے جملے اور بڑی عبارتیں، آزاد کی اس ذہنیت کی شاہد ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جو طرزِ نگارش سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آزاد اپنے تخلص (آزاد) کو جا بجا ضمیر متکلم کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ انداز کہیں کہیں قدیم مصنفوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن نہ اس کثرت سے اور نہ اس طور پر جیسے :-

(الف) "آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔"

(آب حیات کا سب سے پہلا جملہ)

(ب) "ایک سحر البیان، دوسرے گلزار نسیم، اور تعجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس واسطے آزاد کو واجب ہے کہ کچھ لکھے اور اہل سخن سے اپنی رائے کی صحت وسقم کا حال پوچھے۔" (آب حیات ذکر میر حسن)

(ج) "استاد مرحوم یہ حسرت ساتھ لے گئے، والد میرے شہید آرزو ہوئے میں بڈھا ہو گیا۔ اب خطرہ ہے کہ امانت رہے، اور آزاد کو مسافر خانہ سے کوچ کا حکم آجائے۔" (دیباچہ دیوان ذوق کی پہلی سطریں)

(د) "ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے، نہ وہ رہے، نہ بیاض رہی۔" (دیوان ذوق ص ۳۴۹)

(ہ) "آہ استاد، کہاں استاد۔ خیر آزاد، بہار زندگی کے لطف ہوتے ہیں...۔"

(دیوان ذوق ص ۳۵۳)

(و) "آزاد نے جو کچھ کیا، نیک نیت اور پاک عقیدت سے کیا ہے۔" (دیوان ذوق ص ۳۵۴)

(ز) کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں، مگر آزاد تم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں۔" (سخندان فارس ص ۶۷)

(ح) "جب ان کے چراغ خاندان سید خورشید علی نفیس بھی شعاع توجہ دریغ فرمائیں تو غیروں سے کیا امید۔ انھوں نے آزاد خاکسار کو آب حیات کی رسید سے بھی شاداب نہ کیا۔" (آب حیات تذکرہ میر انیس)

نام کا یہ استعمال عجیب آزاد روی کی شان رکھتا ہے۔

(۲) دوسرا جدید اسلوب یہ ہے کہ جا بجا استعارہ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ دوسرے مصنفوں نے کہیں اتفاق ہی سے کیا ہوگا۔ مثلاً

(۱) قدر دانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا، اور نام کو

پھولوں کی مہلک بنا کر اُڑا یا۔" (آبِ حیات تذکرہ میر تقی میر)

(۲) "فتحیاب لڑکے صاحب ملک اور صاحب زبان تھے۔ ان کی حب الوطنی اور بلند نظری فارسی کی زبان کو مخالفت کے کانوں سے سنتی تو عجب نہ تھا۔"

(سخندانِ فارس۔ فارسی زبان میں انقلاب)

(۳) "اقبال مندوں کے دربار میں علوم و فنون کے ساتھ انشا پردازی بھی اُمیدوار آئی۔ انھوں نے فقط امید کا پیٹ نہ بھرا، بلکہ ذوق شوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوا دیئے۔" (سخندانِ فارس کا وہی مضمون)

(۴) "دیکھو مُلّا صاحب نے ظرافت کا نشتر مارا تھا، وہاں سے سخاوت کا چشمہ بہہ نکلا۔" (دربار اکبری: تذکرہ بیرم خاں)

(۵) ایک مضمون میں اہل وطن کو "تم" اور "تمھارے" لفظوں سے خطاب کرتے کرتے یکایک تخاطب بدل کر فرماتے ہیں:۔

"اے خاک ہندوستان، اگر تجھ میں امرء القیس اور لبید نہیں تو نہیں۔ کالیداس ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحرا و دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی دالمیک ہی پیدا کر دو۔" (لکچر انجمن پنجاب ضمیمہ نیرنگ خیال حصہ اوّل)

(۶) "خان خاناں اور خان اعظم کے ایوان ملک ملک کے صنائع و بدائع سے ایک کامل نمائش گاہ بنے ہوئے تھے، جن کے در و دیوار فصل بہار کی چادر کو ہاتھوں پر پھیلائے کھڑے تھے، اور ہر ستون ایک باغ کو بغل میں دبائے تھا۔"

(دربار اکبری، جشن نوروزی جلال الدین اکبر)

(۷) استاد ذوق کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے کے ذکر پر لکھتے ہیں:۔

"اِدھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا، اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للکار نہ سمجھنا، یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔"

(دیوان ذوق)

یہ شاعرانہ فقرے اور تخیلی انداز آزاد کی تمام تصانیف میں بڑی کثرت سے ہے لیکن بالکل آورد ہے۔ یہ اسلوب مرزا غالب کے رقعوں میں کہیں پایا جاتا ہے تو اس انداز سے کہ آورد نہیں معلوم ہوتا، لیکن دور اصلاح و ترقی یعنی سرسید اور ان کے بعد کے مصنفوں میں نہیں ہے۔ بہرحال یہ آزاد کی خصوصیت ہے۔

(۳) علامہ آزاد کی طبیعت میں نازک خیالی اور لطافت و موزونیت خدا داد تھی۔ فارسی زبان کی محبت و شغف نے اس جوہر کو چمکا دیا تھا۔ ظہوری اور نعمت خاں عالی کی نثر کو پسند کرتے تھے، اور ان کی نازک خیالیوں اور بلند پروازیوں کا اثر دل و دماغ پر تھا۔ چنانچہ سخندان فارس میں لکھتے ہیں:۔

"ان کے نازک خیال، خوبصورت استعارے، نئی نئی تشبیہیں، خوشنما ترکیبیں لفظوں کی عمدہ تراشیں، خیالوں کی نزاکتیں، طبیعتوں کی بلند پروازیاں، صنعتوں کے ہجوم، جواب نہیں رکھتے۔ ظہوری نے جس فقرہ کے ساتھ فقرہ جوڑا ہے، مجال نہیں کہ ایک کو اُٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اس کی جگہ رکھ سکے۔ ذرا دیکھنا، بادشاہ کی فصاحت کی تعریف میں کہتا ہے:۔ نکتہ ہاے برجستہ غنچہ ہاے مربستہ (پھر کہتا ہے) ہر صفحش چمنے، ہر سطرے انجمنے، ہر حرفش فصلے، ہر فرعش اصلے۔ (حسن کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے) ابروان خجستہ، کلید دل ہاے بستہ۔"

اس کے بعد اس طرز تحریر کے استعمال کے متعلق ہدایت کرتے ہیں:۔

"بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو بڑی غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیئے۔ انھوں نے خوبی الفاظ، اور نزاکت خیال، اور زور طبع کو بے مطلب و بے مدعا خرچ کیا ہے۔ تم انھیں لو، اور بیان مطلب کے کام میں لاؤ۔ پھر دیکھو گے تمھاری عبارت کیا کیفیت اور کیا تاثیر پیدا کرتی ہے۔"

چنانچہ آزاد خود اپنی تصانیف میں اس سے کام لیتے ہیں۔ اوپر جو مثالیں

متفرق جملوں کی لکھی گئی ہیں، ایسا ہی اسلوب نگارش آزاد کے ہاں طویل و مسلسل عبارتوں میں بھی ملتا ہے۔ نمونے دیکھئے:۔

(الف) "اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا، مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا، البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گذر چکا تھا، اور ان کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے، اس واسطے گویا اُردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سُرمہ، تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوت بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا، اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا۔" (آب حیات، زبان اُردو کی تاریخ صـ۴۹)

(ب) "جب وہ صاحب کمال (استاد ذوق) عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جنکی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقاے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔" (آب حیات تذکرہ ذوق)

(ج) "نظم اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف (یعنی مرزا سودا) نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم (یعنی استاد ذوق) کے سوائے کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا، اور انھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری، ظہیر، ظہوری۔ نظیری، عرفی، فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں، لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔" (آب حیات و دیوان ذوق، قصائد پر رائے)

(د) "حضرت عشق نے شادی کی تھی، اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا، ہمایوں کو دم بھر کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا .... جو چھوڑ کا رُخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آتی ہے، قریب پہنچکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی، دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منھ کھولے بیٹھی ہے۔" (دربار اکبری صـ۲)

(ه) اسی کے آگے اکبر بادشاہ کی ولادت کا ذکر کرتے ہیں:۔

"اس عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک، اقبال کا تارا طلوع ہوا۔ یہ ستارہ ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ اُدھر نہ اٹھی، مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا، آفتاب ہو کر چمکے گا اور سارے تارے اس کی روشنی میں دُھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے۔" (دربار اکبری صـ۲)

نثر میں شاعرانہ تخیئل و اسلوب بیان کی ایسی دلکش و برجستہ مثالیں آزاد کے ہم عصروں میں کہیں نہیں ملتیں۔ یہ بھی آزاد کے "عالم خیال" کی تصویریں ہیں۔

(۴) خیالی طرزادا کی ایک اور دلچسپ صورت آزاد یہ اختیار کرتے ہیں کہ تاریخی واقعات و قیاسات، جن کو دوسرے مصنف واقعہ فرض کرکے واقعہ کے طور پر بیان کرتے ہیں، ان کو آزاد قیاسی و احتمالی انداز سے لکھتے ہیں۔ مثلاً زبانوں کی ساخت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

(الف) "مگر ایک زمانہ ضرور ہوگا کہ جس میں ان کی ایک زبان ہوگی۔ اسی کے الفاظ ایک گھرانے کے آدمی ایک گھر میں رہ سہ کر بولتے ہوں گے۔ اور ایک ہی الفاظ گھروں کے کاروبار میں کام دیتے ہوں گے، یا یہ دونوں زبانیں ایک زبان سے اس طرح نکلی ہوں گی جس طرح ایک ماں باپ کی دو بیٹیاں جُدا ہو گئیں۔"

(سخندانِ فارس صـ۱)

(ب) کوٹھی کے لفظ کی اصل اور اس کے رواج کی صورت بیان کرتے ہیں:۔

ہندوستان میں صاحب لوگ لباس تجارت میں آئے تھے۔ چونکہ تاجروں کا

رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین تاجروں ہی سے ہوتا تھا، اول اول معاملات بھی بنگالہ کے تاجروں اور مہاجنوں ہی سے ہوتے ہوں گے۔ عام مسافرت میں انھیں نوکر چاکر درکار ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی انھیں سے لئے ہوں گے۔ عالی شان مہاجنوں اور سوداگروں کی دکانوں کو کوٹھی کہتے ہیں۔ چونکہ صاحب لوگ لباس تجارت میں تھے جب کسی سے ملتے جلتے ہوں گے، کوٹھی پر جا کر ملتے ہوں گے۔ وہ پوچھتے ہوں گے آپ کی کوٹھی کہاں ہے، یہ پتا بتا دیتے ہوں گے، اور سمجھتے ہوں گے کہ کوٹھی گھر کو کہتے ہیں، کیونکہ مسافر تھے۔ ان کی دکان اور کوٹھی ایک ہی تھی۔ ان کے نوکر بھی کوٹھی ہی کہتے ہوں گے۔ کام کے موقع پر آپ کہتے ہوں گے، یہ چیز ہماری کوٹھی پر لے آؤ۔ اور لوگ کہتے ہوں گے' یہ چیز صاحب کی کوٹھی پر دے آؤ۔ مدت کے بعد تجارت کا پردہ اُٹھا دیا۔ وہی گھر دارالحکومت ہو گئے۔ جب سے کوٹھی کا نام جو محاورہ میں آگیا تھا، وہی رہا۔ اور یہ نیک نیتی کا پھل ہے۔" (سخندانِ فارس)

(ج) عبدالرحیم خانخاناں کے بچپن کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں:۔

"وہ تین برس کی جان (عبدالرحیم خانخاناں) کیا کرتا ہوگا، سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ ان کی گود میں دبک جاتا ہوگا، ٹورتا ہوگا، اَنا کے پاس چھپ جاتا ہوگا، افسوس وہ بچاریاں کہاں چھپالیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی! تیری پناہ! عجب وقت ہوگا، شام غریباں اسی کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گذری ہوگی، دن ہوا تو روز محشر۔" (دربار اکبری صفحہ ۵۶)

(د) "زبان اُردو کی تاریخ" کے سلسلے میں ہندوستان کی قدیم تاریخ بیان کرتے ہیں:۔

فتح یابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اُتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے، پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے، اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے، کچھ

بھاگے ہوں گے، وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے ہوں گے، کچھ فتحیابوں کی غلامی اور خدمتگاری میں کام آئے ہوں گے، اور وہی شودر کہلائے ہوں گے، چنانچہ ابتک بھی ان کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔

(آب حیات ص۸)

(۴) اسی طرح جن شاعروں کا ذکر آئندہ کرنے والے ہیں، ان کے کلام کی خصوصیات جب خلاصہ کے طور پر پہلے بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی وہی پُرانہ خیال دکھاتے ہیں۔ آب حیات کے ہر دَور کی تمہید میں اس طرح کے فقرے لکھے ہیں۔ مثلاً "دور سوم" پر تنقید کرتے ہیں :-

"تم دیکھنا، وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اُتار دیں گے، قدر دانوں سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے۔ لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے، مگر ایسا جیسے گلاب کے پھُول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا، اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے، سودا کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔"　　(آب حیات تمہید دور سوم)

یہ اسلوب تحریر نہایت دلچسپ، لطیف اور پُرتاثیر ہے۔ اور محاکات پیدا کرنے کا بالکل صحیح طریقہ۔ لیکن یہ بھی "خیالستان آزاد" کے جلوے ہیں، کوئی اور مصنف اس طرح نہیں لکھتا۔ آزاد کی ایجاد ہے۔

(۵) علامہ آزاد کی تحریر پر فارسی نثر کی کتابوں میں سے گلستان سعدی کی طرز تحریر کا اثر ہے۔ سخندانِ فارس میں ایک جگہ گلستاں کا ذکر لکھتے ہیں :-

"عجائب اتفاقات سے یہ ہے کہ اسی صدی کے ۶۵۶ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھول دیا۔ اس میں فصاحت نے تربت اور سلاست

نے دُود ھایا، اور گلستاں ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی جس کا آج تک جواب نہیں ...... چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں، اور کتری کتری عبارت ہے، مگر خدا نے اس کے بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں ایسا لوچ دیا ہے کہ ریشم کے لچھے مسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ صنائع و بدائع کی دستکاری نے اسے قلم نہیں لگایا، مگر سادگی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، اس کے ننھے ننھے فقرے، آیت اور حدیث کی طرح اب تک تقریروں اور تحریروں کو قوت دیتے ہیں، مزا یہ ہے کہ جو چٹخارہ زبان کو نظم پڑھنے میں آتا ہے، وہ اس کی نثر میں آتا ہے کیونکہ اس کی قدرتی فصاحت نظم و نثر کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے۔" (سخندانِ فارس، تیسرا لکچر ص ۶۳)

اگرچہ آزاد کی زبان کو صنائع بدائع کی دستکاری نے قلم لگایا ہے، پھر بھی منہ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کے فقرے گلستاں کے فقروں کی طرح تقریروں اور تحریروں کو قوت نہیں دیتے، تاہم ان کے پڑھنے میں زبان کو نظم کا سا چٹخارا ملتا ہے۔

یہی وصف طرز آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت اور بالکل انفرادی شان ہے، جس میں کوئی دوسرا مصنف ان کا شریک نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے تشبیہہ و استعارہ کی لطافت و برجستگی، بیان کی سلاست و روانی، الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت سب مل کر سادگی و پُرکاری کا عجیب و نادر نمونہ پیش کرتے۔ اور یہ اسلوب علامہ آزاد کی ہر تحریر میں موجود ہے۔ اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن لکھ کر دیکھئے تو صفحہ دو صفحے لکھنے مشکل ہیں۔ آزاد اسی اسلوب بیان کے سبب سے صاحبِ طرز کہلاتے ہیں۔ مذکورہ بالا سب چھوٹی بڑی عبارتیں اس کے نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ اور نمونے آزاد کی تصانیف کے سلسلے میں آئندہ آتے ہیں۔

طرز آزاد کا نقص

علامہ آزاد نے مختلف موضوعوں پر کتابیں لکھی ہیں:۔ خیالی و تمثیلی مضامین (نیرنگ خیال) تذکرۂ شعرا (آب حیات)، تاریخ و سیرت (دربار اکبری)

فلسفہ زبان (سخندانِ فارس) تاریخی کہانیاں (قصصِ ہند) وغیرہ۔ ان میں سے ہر موضوع کے لئے الگ اسلوب بیان ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے ہر تصنیف اپنے خیالی رنگ میں لکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخی واقعات جو تشبیہ و استعارہ میں بیان کئے گئے، وہ اگرچہ صحیح و اصلی تھے، تب بھی ان میں فسانہ کا رنگ آگیا۔ اور درست و واقعی تنقید بھی جب مبالغہ کے انداز میں لکھی گئی تو خیالی ہوگئی۔ انکی آب حیات میں نیرنگ خیال کا لطف ہے، اور دربار اکبری میں قصص ہند کا مزہ۔ اسی لئے کہیں کہیں آزاد کی تحقیق تحقیق نہیں معلوم ہوتی، اور تنقید تنقید نہیں رہتی۔ لیکن کچھ نہ رہنے پر بھی انشاپردازی کا عجیب لطف و اثر رہتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ آزاد کے متعلق علامہ شبلی کی یہ رائے ہے:۔

"آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم اِدھر اُدھر گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔"

آزاد کی طبیعت کا عجیب خاصہ

علامہ آزاد مورخ بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اور مورخ و نقاد کا پہلا فرض صداقت، انصاف اور بے تعصبی ہے، لیکن آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ اپنی رائے کی تائید میں، یا اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لئے یا اپنے پسندیدہ و ناپسندیدہ شخص کی مدح و ذم کی خاطر، کبھی واقعات فرض کر لیتے ہیں، کبھی خلاف واقع نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ اس کام کے لئے اسلوب بیان بڑا دلچسپ و عجیب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے حالات بیان کر رہے ہیں اسکے جملہ محاسن و فضائل نہایت عقیدت و ارادت سے لکھتے ہیں گویا بے تعصبی کے ساتھ انصاف کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن لکھتے لکھتے کبھی درمیان میں، کبھی آخیر میں چٹکی لے لیتے ہیں۔ آب حیات اور دربار اکبری میں اس کا زیادہ موقع تھا۔ وہیں یہ باتیں خوب نظر آتی ہیں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ دربار اکبری تو صرف اسی غرض سے لکھی ہے۔ یہ تمام کتاب مُلّا عبدالقادر بدایونی کی تصنیف منتخب التواریخ پر مبنی ہے۔ بلکہ مُلّا صاحب کی تردید و تضحیک کے لئے لکھی گئی ہے۔ علامہ آزاد

کو اکبر بادشاہ کی ذات و حکومت سے کوئی خاص تعلق و ہمدردی نہیں، اس کے اس لئے مدّاح ہیں کہ وہ ابوالفضل، فیضی، خانخاناں وغیرہ کا قدرداں ہے۔ اور چونکہ مُلّا عبدالقادر نے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر فیضی وغیرہ کی زمانہ سازی و اسلام کشی کو صداقت و جوشِ اسلامی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لئے آزاد مُلّا صاحب سے بیزار ہیں۔ آزاد کی تصانیف سے چند مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) آبِ حیات دورِ سوم میں حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کی جو مذمت آزاد نے کی ہے وہ صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۸ پر درج ہے۔

(۲) آبِ حیات دورِ پنجم میں شاہ نصیر دہلوی کے حسنِ اعتقاد کے سلسلے میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس سے آزاد کا حسنِ ظن اور حُسنِ بیان مترشح ہے۔

(۳) آبِ حیات کی اشاعت اول میں آزاد نے حکیم مومن خاں دہلوی کا حال اپنی ذاتی رنجش و کدورت کے سبب سے دانستہ ترک کر دیا تھا۔ ورنہ خلاف قیاس ہے کہ جب علامہ آزاد ۲۵ برس کی عمر تک دہلی میں رہے تھے۔ مومن خاں کو دیکھا تھا، اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی تھی، ان کا کلام ان کی زبان سے سُنا تھا، تو اُن کے حالات سے اتنی آگاہی نہ ہوتی کہ "آبِ حیات" کے لئے ان کا تذکرہ مرتب کر سکتے۔

(۴) دربارِ اکبری میں علامہ آزاد ہر موقع پر مُلّا عبدالقادر بدایونی کو لعن طعن کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ دل کا بخار نکالنے کے سوا کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً مُلّا صاحب نے ابوالفضل کے حال میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

> "و تفسیر آیۃ الکرسی کہ دقائق و نکات قرآنی دراں خیلے درج شدہ می گویند کہ تصنیف والدش بود گذرانیدہ، عزّ تحسین یافت و "تفسیر اکبری" تاریخ آں شد" (منتخب التواریخ جلد دوم ص۱۹۸)

اس پر علامہ آزاد "دربارِ اکبری" (ص۴۹۳) مُلّا عبدالقادر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> "مگر روئے حسد سیاہ، تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو بھی

شوشہ لگا دیا کہ لوگ کہتے ہیں اس کے باپ کی تصنیف ہے اچھا یہ ہی ہے تو اس کے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اس کا باپ تو ایسا تھا۔ تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا۔"

یہ ایک مثال ہے جس کے نمونوں سے تمام دربار اکبری بھری پڑی ہے۔

(۵) دیوان ذوق میں آزاد لکھتے ہیں:۔

۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا تھا۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ انھیں ساتھ لیکر استاد مرحوم (یعنی ذوق) کے پاس آئے۔ اور بڑے اصراروں سے مشاعروں میں آنے کا اقرار لیا........ ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں استاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا، کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنائیے، مدتیں گذر گئیں۔ آپ کے منہ سے کچھ نہیں سنا۔ میں نے کہا، حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا، پھر کہا، خیر میں نے دو شعر سنا دیے، انھیں دنوں میں ہوئے تھے:۔ ؎

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے، ہندو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی، کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا، انھوں نے بھی کچھ سنایا؟ فرمایا، نہیں، یہی کہتے رہے، نجوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا، دل نہیں لگتا، چرچا جاتا رہا وغیرہ وغیرہ اس بیان سے بندہ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے، بے شک ان کے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہوں گے، مگر سخن سنج نکتہ شناس تھے۔ ساتھ اس کے عاشق معشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو، اور اس میں اثبات مضمون ہم گواہوں سے قائم ہو۔ اس پر غزلیت

کے اوصاف سے متصف ہو وغیرہ وغیرہ۔ اسے سُن کر جو پڑھتے تو اُسی رُتبہ کا مطلع پڑھتے، وہ زبان پر نہ دھرا تھا، اور وہ ان لوگوں میں نہ تھے کہ شعر سُنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔ بات کو سمجھتے تھے اور محل و مقام پہچانتے تھے۔"

دیکھئے علامہ آزاد کس قدر خوبصورت طریقے سے مومن خاں کی تنقیص کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے مدح کر رہے ہیں۔

آزاد کی سخن سنجی

عجیب بات ہے کہ علامہ آزاد نثر کے لفظوں اور فقروں، ترکیبوں اور بندشوں کے تناسب و ترنم اور صفائی و سلاست کے متعلق، اور تخیل و طرز و ادا کے لحاظ سے جس قدر ذوق صحیح اور طبع سلیم رکھتے تھے۔ نظم کی لفظی و معنوی خوبیوں میں اس کے بالکل برعکس مذاق پایا تھا۔ ان کے خواص طبیعت کے سلسلے میں اسکی بعض مثالیں دیکھئے:۔

(۱) اوپر کی مثال میں ذوق کے مطلع کی اس قدر تحسین خود آزاد کی سخن سنجی کی داد دے رہی ہے۔ اہل ذوق جانتے ہیں کہ اس مطلع کا اُردو شاعری اور صنف غزل میں کوئی مرتبہ نہیں۔ یہ مضمون اور اس کے اثبات کے چاروں گواہ نہ شاعری کا شاہکار، نہ ذوق کا کارنامہ۔

(۲) آزاد نے آب حیات پہلے لکھی ہے۔ دیوان ذوق اس کے ایک عرصہ بعد مرتب کیا ہے۔ دیوان کی بعض غزلوں میں آزاد نے تصرف کیا ہے۔ اس کی توجیہ دیباچہ دیوان کے آغاز ہی میں کرتے ہیں:۔

"ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے، دیوان مروجہ میں کچھ چھپے، اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سُنے، کبھی کچھ سُنے۔ پھٹے پُرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ سینے پیٹے اشعار کا پڑھنا۔ مٹے حرفوں کا اُجالنا، اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر

نکالنا، میرا کام نہ تھا، خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شاملِ حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہوگئیں، اور دن اندھیرے ہوگئے۔ جب یہ مہم سرانجام ہوئی ہے۔"

یعنی علامہ آزاد کے جو کچھ جی میں آیا، اور جہاں جیسا مناسب سمجھا، لکھ دیا۔

آزاد کے مُرتّبہ "دیوانِ ذوق" میں جو غزلیں دیوان مروّجہ سے علیحدہ ہیں، ان کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن جو غزلیں خود آزاد "آبِ حیات" میں درج کرچکے تھے، ان کو دیوان میں درج کرتے وقت جو حک و اصلاح کی ہے، اس سے آزاد کے ذوقِ سخن کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً آبِ حیات میں ذوق کا مطلع ہے:-

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے　　سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

اس کو آزاد نے "دیوانِ ذوق" میں اس طرح لکھا ہے:-

مزے تو دل کو ملے تھے، ہوئے زباں کے لئے　　یہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

ذوقِ سلیم جانتا ہے کہ آزاد کے تصرّف نے دونوں مصرعوں کو سست اور مضمون کو پست کردیا۔

اسی غزل کا ایک اور شعر آبِ حیات میں یوں ہے:-

الٰہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا　　کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

اور دیوان میں اس طرح:-

الٰہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا　　کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

اس ترمیم میں دو عیب پیدا ہوگئے، ایک بندش کا، ایک مضمون کا۔ اور تعجب ہے کہ آزاد کی نظر ان پر نہ پڑی۔ پہلے مصرع میں (ہے) کا لفظ آنے سے تعقید پیدا ہوگئی جبکہ (ہے) کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ پہلی صورت میں (اُس صنم) سے اپنے محبوب کی تخصیص میں بہت لطف تھا جو دوسری صورت کی عمومیت سے جاتا رہا۔

اسی غزل کا ایک اچھا خاصا شعر تھا:-

نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجتِ ساماں　　اثاثہ چاہیئے کیا خانۂ کماں کے لئے

اس کو آزاد نے اس طرح بدل کر مہمل کر دیا :-

قدِ خمیدہ پر اپنے ہیں بال زیب و بال — اثاثہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

استاد ذوق کے بہت سے اشعار میں اس طرح کے تصرفات کئے ہیں۔

(۳) آزاد خود اپنی نظموں میں بھی جا بجا تعقید کا عیب پیدا کر دیتے ہیں۔

آزاد کی نظم (شام کی آمد اور رات کی کیفیت) کے بعض شعر دیکھئے :-

زاہد مراقبے کا ہے دم سب کو دے رہا — اور آپ مارے نیند کے جھونکے ہے لے رہا
سونے کو دھر بھی ہے بہ خواب عدم گیا — دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا
دل دے رہا جو شیر محبت کے جام ہے — ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے

اوّلیاتِ آزاد

آزاد کا مرتبہ

آزاد با کمال "خدا ساز" ہستیوں میں تھے۔ ان کا ذہن زبان و محاورہ، الفاظ و بندش کے انتخاب کے متعلق صحیح توازن و تناسب رکھتا تھا، اور ان کی طبیعت میں ندرت آفرینی و جدت طرازی اعلیٰ درجے کی تھی۔ زبان و بیان کی شیرینی و نرمی میں کوئی ادیب ان کا شریک نہیں ہے۔

اس لئے آزاد اپنے زمانے کے **پہلے صاحب طرز** ہیں۔ آزاد کے طرز کو شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں بیان کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ آزاد تنہا "طرحدار" ادیب ہیں۔ ان کی تحریر کا بانکپن، سچ یہ ہے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ گویا "مزے یہ دل کے لئے ہیں، نہیں زبان کے لئے"

اسی جدت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ علامہ آزاد نے طرز عبارت کی ایجاد کے علاوہ مضامین و موضوعات کی ترتیب و تالیف میں وہ جدتیں پیدا کی ہیں جو ان سے پہلے موجود نہ تھیں، اور یہ **اوّلیاتِ آزاد** ہیں، مثلاً

(۱) شعراء کے تذکرے آزاد سے پہلے بھی بہت لکھے گئے، لیکن سب نہایت مختصر تھے، اکثر میں حروف تہجی کی ترتیب تھی، کسی میں زمانے کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھا گیا تو مجمل اور سرسری طور پر، کسی میں حالات و کلام کے متعلق تحقیق و

تفصیل نہ تھی، مقابلہ و موازنہ نہ تھا، زبان و محاورہ اور طرز کلام کا تجزیہ و ارتقاء نہ تھا۔

آزاد کو سب سے پہلے ان تمام اجزاء و لوازم تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے **آب حیات** میں یہ سب خامیاں رفع کر دیں۔ اور ایسی کتاب لکھ دی کہ آج بھی کوئی تذکرہ نویس آب حیات کے استفادہ سے بے نیاز نہیں ہے۔ پھر اس میں اگر کچھ غلط بیانیاں اور بیجا طرفداریاں بھی ہوں تو ان سے آزاد کے فضلِ تقدّم اور آب حیات کی اوّلیت میں فرق نہیں آتا۔

(۲) زبان کی ساخت اور ارتقاء کے متعلق آزاد کی **سخندانِ فارس** اور "**مقدمہ آب حیات**" سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آزاد کی زباندانی، شوق تحقیق اور قوت ایجاد نے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تصانیف پیدا کر دی ہیں۔

(۳) رمزیہ و تمثیلی مضامین اور ان کے اسالیب نگارش کا اس قدر تنوّع اور ایسا کمال آزاد کے "**نیرنگ خیال**" سے پہلے نظر نہیں آتا۔ آزاد نے اس پیرایہ میں مسائل مذہبی و علمی و ادبی کی تحقیق بھی کی ہے اور نقد و تبصرہ بھی۔ طعن و طنز بھی کیا ہے اور اخلاق بھی سکھائے ہیں۔

(۴) اگرچہ مولانا شبلی کی تاریخ و سیرت کی تصانیف الفاروق وغیرہ کے سبب سے علّامہ آزاد کی "**دربار اکبری**" کو اولیت کا درجہ حاصل نہیں ہے، تاہم تاریخ میں ادبی شان پیدا کرنا اور افسانہ و ناول سے زیادہ دلچسپ بنا دینا آزاد ہی کا پہلا کمال ہے۔ خصوصاً اکبر بادشاہ کے حالات خاص اہتمام سے لکھے ہیں اگرچہ آزاد نے اکبر کی بیدینی اور علماء کی توہین کو بہت سراہا ہے۔

اس لحاظ سے **آزاد** کا مرتبہ **موجد** کا بھی ہے **نقاد** کا بھی **صاحب طرز** بھی۔ آزاد سب سے پہلے **انشا پرداز** ہیں، پھر مورخ، تذکرہ نویس، سیرت نگار۔ ان کی تحقیق و تنقید سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی انشا پردازی سے

انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بقاے دوام کے اعتبار سے آزاد بہ حیثیت انشا پرداز کے زندۂ جاوید ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی میں ان کی ہر کتاب سدا بہار گلزار ہے، مطالعہ و حوالہ کے لئے ان کی ہر کتاب مفید و ضروری ہے، لیکن تحقیق و تنقید کی نظر میں ان کی ہر کتاب پرانی ہو چکی ہے۔ آبِ حیات کے نظریے بدل چکے ہیں، اور بہتر تبصرے لکھے جا چکے ہیں۔ سخندانِ فارس کے تجزیے اور تقریظیں اب قول فیصل نہیں رہیں۔ دربار اکبری تاریخ کے طالب علموں اور استادوں کے لئے پہلے بھی کچھ عجوبہ نہ تھی، اب تو بہت با اصول، مفصّل و مکمل تاریخیں موجود ہیں۔

نگارستان فارس (تذکرہ شعرائے فارسی) صرف آزاد کے شغف و عشق فارسی کا ایک چھینٹا ہے لیکن اتنا ہلکا پڑا ہے کہ خود آزاد کی تالیفات میں بھی اس کا کوئی درجہ نہیں۔ قدیم تذکرات، تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، آتشکدہ آذر، سرو آزاد وغیرہ کے مقابلے میں بھی کچھ نہیں ہے، چہ جائیکہ مولانا شبلی اور پروفیسر براؤن کی تالیفات سے مقابلہ ہو سکے۔ نیرنگ خیال آزاد کی دوسری کتابوں سے زیادہ دیرپا ہے۔ اس لئے کہ یہ نہ تاریخ ہے، نہ تذکرہ، نہ سیرت، نہ فلسفۂ زبان، بلکہ صرف انشا ہی انشا ہے۔ اگرچہ یہ طرزِ رمز و تمثیل مستقل مقالہ نگاری کی صورت میں رائج نہیں ہے۔ لیکن یہ شانِ مجاز اور مصرفِ استعارہ شعر و ادب کا جزوی عنصر ہے۔ اور اب بھی فسانے اور ناول، مزاحیات و طنزیات، بلکہ تنقیدیں اور تبصرے، اور ادبیات و عملیات بھی نیرنگ خیال کے رنگ تحریر کے نمونے ضمنی و جزئی طور پر اپنے اندر رکھتے ہیں۔

علامہ آزاد جدید شاعری کے بشیر و ہیں، اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے۔ یہ چیز ان کی اوّلیات میں شامل ہے لیکن ان کی شاعری کا تذکرہ و تبصرہ، ہماری کتاب کے "حصۂ نظم" کا حق ہے۔

تصانیفِ آزاد کے نمونے

علاّمہ آزاد کی مختلف تحریروں کے بہت سے چھوٹے بڑے نمونے پہلے پیش

کئے جا چکے ہیں، وہ سب آزاد کے اسلوبِ خاص کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ تاہم ان کی تمام تصنیفات سے ایک ایک دو اقتباسات ایسے درج کئے جاتے ہیں، جن سے آزاد کی انشائے خصوصی کے علاوہ، مختلف مضامین و موضوعات میں ان کا طرزِ بیان اور قوتِ تحریر بھی نظر کے سامنے آجائے۔

(۱) **آبِ حیات** کا مقدمہ کافی طویل لکھا ہے، جو خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں "بھاشا پر فارسی کا اثر" بھی دکھایا ہے۔ ایک جگہ اس مضمون کو بیان کرتے ہیں کہ "ہند کی تشبیہیں جاتی ہیں، فارسی اور عرب کی تشبیہیں اور خیالات اُن کی جگہ قابض ہوگئے"۔

دونوں زبانوں کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کے بغیر مجھ سے آگے نہیں بڑھا جاتا۔ یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں، اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں، لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے، اس لئے دیکھو ان کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اُڑنے سے تشبیہ دیتے تھے، فارسی میں زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی ہے، مگر بھونرے اُڑ گئے، اور اس کی جگہ مشک، بنفشہ، سنبل، ریحان آگئے، جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں۔ مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے، اور زلف کو کوئلے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف میں شام برن اور میگھ برن کہتے تھے۔ اس سے کھلتا رنگ ہوتا تو چنپک برنی کہتے تھے۔ اب سمن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حسن کی بہار دیتے ہیں، مگر چندر مکھ اور ماہ رُخ مشترک ہے۔

آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول اور کمولا کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اُردو میں آہو چشم رہے مگر موتے ہوا ہوگئے اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگس شہلا آگئی جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی

بلکہ ترکِ چشم، شمشیرِ نگاہ سے قتل کرنے لگے۔

رفتار کے لئے بھاشا میں ہتھنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اُڑ گیا، فقط کبکِ دری، شورِ محشر اور فتنۂ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے۔

پھر فارسی، اُردو، اور ہندی کی انشا پردازی کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایک طویل مضمون درمیان سے کچھ حذف کر کے آزاد ہی کے الفاظ میں مسلسل کر کے لکھا جاتا ہے:-

فارسی اور اردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے، اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے، اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے۔ وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے، اس کی کیفیت ہمیں ان خط و خال سے سمجھاتی ہے جو خاص اسی شے کے دیکھنے، سُننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی، مگر سُننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سُننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں، صاف اسی کی بُرائی یا بھلائی نہیں دکھا دیتے بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا بُرا سمجھا ہوا ہے، اس کے لوازمات کو شے اول پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھول کہ نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے، جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حُسن کا انداز دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے۔ خواجہ وزیر وزیر :-

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا ہو کر ‌ ‌ ‌ روح میری گلِ عارض میں رہے بو ہو کر

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں، اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے، لیکن اگر دُور جا پڑیں

اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت ہوتی ہے۔

ان خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں، ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آ کر وہ بھی عالم تصویر میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اول اشیاء بے جان کو جاندار بلکہ انسان فرض کرتے ہیں، بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں، ان بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں، جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوے ثانی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہمائے عقل اوج اقبال سے سایہ ڈالے۔ تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے سینہ میں دانش عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ اول تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے اور وہ بھی اسی ملک کے ساتھ ہے۔ اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھئے، وہاں ان کے فرضی ہما کا جانا دیکھئے۔ پھر زمین پر اس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسانا دیکھئے۔ پھر اس فرضی ہما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے، جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے، یا جن خوشبوئیوں کو سونگھتا ہے، انہی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہدیتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا انشا پرداز ذرا بگڑ جاتا ہے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں، اور دہانِ غار

پتھروں سے دانت پیسنے لگیں۔

آبِ حیات میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، خصوصاً شاعرانہ نوک جھونک، ذاتی رنجشیں اور سیرت و اخلاق کے لطیفے کوشش و تلاش سے درج کئے ہیں۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جو علامہ آزاد نے کتابوں سے دیکھ کر لکھی ہیں اور ایسی بھی جو اُن کو اپنے اُستاد یا بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچی ہیں۔

شیخ قلندر بخش جُرات کے حال میں لکھتے ہیں:۔

جرأت، میاں جعفر علی حسرت[۵] کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر تھے، اور موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے، چنانچہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اول نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں، چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا تھا:۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی، حُسن طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا:۔

جُرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے، "تا خدا ندہد سلیماں کے دہد"۔

میاں جرأت کے حال میں، بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات ہے تو یہ ہے کہ

---

۵ اس پر آزاد خود ہی یہ حاشیہ چڑھاتے ہیں:۔ "حسرت بھی نامی شاعر تھے، مگر اصلی پیشہ عطاری تھا، دیوان موجود ہے، پھیکے شربت کا مزا آتا ہے۔ مرزا رفیع (یعنی سودا) نے اِنھیں کی شان میں غزل کہی ہے، جس کا مطلع ہے:۔

بھڑانہ کا آندھی سے اُڑا ڈھیر ہوا پر ہر مُرغ اسے کھا کے ہوا سیر ہوا پر

اسی طرح ہجو کی آندھی میں ساری دُکان کا خاکہ اُڑا دیا ہے۔" (حاشیہ آبِ حیات صفحہ ۲۲۶)

عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حادثہ چیچک سے ہوا، مگر استادِ مرحوم (یعنی حضرت ذوق) نے ایک دن فرمایا کہ یہی زمانہ کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے ان کے کمال کو بڑی قدر دانی سے دیکھا، بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی اور ایک بدنما داغ ان کے دامن پر دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے، بعض ضرورتوں سے کہ شوخیٔ عمر کا مقتضیٰ ہے خود اندھے بنے، رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے۔

تفصیل اجمال بہ عبرت احوال۔ بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت و نجابت غریبی پر عاشق ہے، دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی، دولت آئی شامت آئی۔ میاں جرأت کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی، مسخرا پن کی حد سے گزری ہوئی تھی۔ اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل، سید انشا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں، دوسرے دن دوسرے امیر آئے، سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ ۴، ۵ دن وہاں رہے، کوئی اور نواب آئے وہاں سے وہ لے گئے، جہاں جائیں، آرام و آسایش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سُنیں، بہت خوش ہوئیں، اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سُنیں گے۔ گھر میں لاکر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھیں، باہر یہ بیٹھے چند روز کے بعد خاص خاص بی بیوں کا برائے نام پردہ رہا، باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا، نانا، کوئی ماموں، چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دُکھنے آئیں۔ چند روز ضُعفِ بصر کا بہانہ کر کے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہو گئیں۔ مطلب یہ تھا کہ اہلِ حُسن کے دیدار سے آنکھیں سُکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت

خاطر کرتے ہیں، نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سو کر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا۔ لونڈی نہ بولی۔ اُنھوں نے پھر پکارا۔ اُس نے کہا بیوی جا ضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے منہ سے نکل گیا کہ "غیبانی دوانی ہوئی ہے۔ سامنے تو رکھا ہے، دیتی کیوں نہیں"۔ بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ "دُوہی بیوی، یہ مُوا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے، یہ تو خاصہ سُجاکھا ہے، ابھی میرے ساتھ یہ واردات گذری"۔ اس وقت یہ راز کُھلا، مگر اس میں شُبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے ؎

مزن فالِ بد کآورد حالِ بد مبادا کسے کو زند فالِ بد

آزاد نے آب حیات میں اپنے استاد ذوق کا حال سب سے طویل، ۶۰ صفحوں میں لکھا ہے۔ ان کے ساتھ آزاد کی محبت و عقیدت کا حال پہلے لکھا گیا ہے۔ اسی حسنِ ارادت کے ساتھ ہر بات کی تفصیل کی ہے۔ ابتدا اس طرح کرتے ہیں:-

ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق۔ جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا، اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہوا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا، وہ باغ برباد ہوگیا۔ نہ ہم صفیر رہے، نہ ہم داستاں رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لئے ٹکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہوگئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کیا تھا روٹی سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادوکار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو

بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں، وہ اور اور اصل کی شاخیں ہیں۔ انھوں نے اور پانی سے نشوونما پائی ہے، وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ......

ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے، مگر کیا کروں، جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے، لیکن نہیں اس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو، یہ کام کا نہیں، اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات ان کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی، ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

چنانچہ آزاد نے استاد ذوق کے حالات کا ایک حرف نہیں چھوڑا۔ لیکن بعض باتیں بڑی عجیب لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ بہادر شاہ ظفر اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے کلام کو ذوق کا کہا ہوا بتایا ہے۔ بادشاہ کے کلام کے متعلق آزاد کا یہ دعویٰ مشہور ہے اور اس پر ردو قدح ہو چکی ہے۔ معروف کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:-

ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے، جس میں ردیف وار (۱۰۱) مطلع ہے، اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام "تسبیح زمرد" رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پرو دی تھی۔

دوسرے، ذوق کے مذہب کو چھپایا ہے اور اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"فقرا اور بزرگانِ دین کے ساتھ انھیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، علماء اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے اور

کبھی ان پر طعن وتشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا۔

حالانکہ آزاد کے والد اور استاد دونوں ہم عمر و ہم مکتب تھے۔ اور (بقولِ آزاد)
"وہ رابطہ ان کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت تک ایسا بندھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا"
آزاد اکثر سارا سارا دن ذوق کی خدمت میں گذارتے تھے۔ ان کے وضو، نماز، وظیفے سب کا ذکر کیا ہے۔ اس پر بھی آزاد کو اور اہلِ دہلی کو ان کے مذہب کا حال نہ کھلا کہ سُنی تھے یا شیعہ!!

حالاتِ ذوق کا ایک دلچسپ اقتباس یہ ہے:۔

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ ع "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت"
چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں، اور ان کے تنکے جو گرتے تھے، انھیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آبیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ انھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ انھوں نے پھر اڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا، ایک طرف حافظ ویراں بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویراں بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا کہ بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے عالم ہے، حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیۡدُ کی آیت پڑھ کر کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا بِسۡمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اکبَرُ کر دے گا۔ دیوانی ہے جو تمہارے سر پر آئے۔

استادِ ذوق کے کلام پر لوگ جو اعتراض کرتے تھے، ان کے ذکر میں آزاد لکھتے ہیں:۔

ایک دن میں آذخ (عبداللہ خاں آذخ) سے ملا، اور استاد کے مطلع کا ذکر آیا:۔

مقابل اس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے ۔۔۔ صبا دو دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، اور کہا

یاں جو بِرگِ گُلِ خورشید کا کھڑکا ہو جائے ۔۔۔ دھول دستارِ فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ "سحر ہو جائے" جو استاد نے باندھا ہے یہ جائز نہیں، مگر تجاہل کرکے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں بات کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا، اور استعارہ میں لاکر! میری طرف دیکھ کر ہنسے، اور کہا کہ بھئی واہ، آخر شاگرد تھے، ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

دوسرے دن میں استاد مرحوم کی خدمت میں گیا، اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے۔ اور ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے، یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی، نہوئی، نہوئی، وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حُسن اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا، بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا، قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو، وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ تبذل، عامیانہ اب ثقہ، متین، اور شریفانہ ہے۔

اس عبارت کا آخری فقرہ علامہ آزاد کی انشا پردازی کا دلچسپ نمونہ ہے۔ بظاہر استاد کی زبان سے ذوق کے مضمون کو سراہتے ہیں، لیکن دراصل طعن و طنز مقصود ہے، یعنی ذوق کا محاورہ "دھول لگنے سے تڑکا ہو جانا" تبذل و عامیانہ ہے۔ اس سے تو ذوق ہی کا محاورہ "سحر ہو جانا" متین و ثقہ تھا۔ لیکن حقیقت میں آزاد نے استاد کی طرف سے جو جواب دیا ہے وہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ جب ہماری زبان میں پہلے سے ایک محاورہ موجود ہے کہ "ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا" تو پھر اس محاورے میں تڑکے کا کوئی عربی نہ فارسی میں مترادف استعمال کرنا جائز نہیں۔ اگر "دھول لگنے" کا مضمون نہ ہوتا تو چاہتے کہتے۔ اب سحر ہو جانے کو ثابت کرنے کے لئے مضمون کو طول اور پیچ دینا، بات کی پیچ اور طولِ امل ہے۔

ذوق کے حالات میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکانِ ضرور جاتے تھے، اور تین چار چلمیں حقہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹی کے دن اس وقت جایا کرتا تھا، اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکانِ ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی، پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے، اجی ہمارا وہ شعر اس دن تم نے کیا پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے، ہاں اب اسے یوں بنا لو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پائخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لو جی ۴۳ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا، حضرت کیونکر؟ فرمایا، ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا۔ ع "کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کیساتھ" ابتدائے مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہئے، اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی، حضرت پھر کیا؟ فرمایا، ع "کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ" کمر کو اوپر ڈال دو۔ عرض کی، پھر وہ کیونکر؟ ۳، ۴ مصرع الٹ پلٹ کئے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے:-

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں   کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کیساتھ

(۲) **نیرنگ خیال** ان خیالی و تمثیلی مضامین کے لکھنے کی تحریک پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ نے علامہ آزاد کے سامنے پیش کی تھی۔ انگریزی میں سوئفٹ اور جان بنین وغیرہ نے اس قسم کی مستقل کتابیں اور متفرق مضامین لکھے ہیں۔ قدیم یونانی ادبیات اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی رمزیہ (ایلی گریکل) تصانیف موجود ہیں۔ اُن لوگوں کا مقصد مذہب، اخلاق یا حکومت کی اصلاح ہے۔ عقائد رائجہ یا سیاست حاضرہ پر درپردہ نقد و تبصرہ کیا ہے۔ علامہ آزاد کا جدت طراز و خیال آفریں دماغ اس موضوع کے لئے نہایت موزوں تھا۔ کرنل ہالرائڈ نے ان تحریروں کے لئے خاکہ سا بتا دیا تھا۔ لیکن وہ اسلوب بیان یا موضوعات کے متعلق کچھ اشارے ہوں گے۔ مضامین اصل میں آزاد ہی کی اختراعِ بدیع ہیں۔

اور باوجود انگریزی نہ جاننے کے آزاد نے ان مضامین میں ادبیات انگریزی کی جیسی شان پیدا کر دی ہے وہ تنہا آزاد کا کمال ہے۔

سیاست کا موضوع تو آزاد کے زمانے میں خارج از بحث تھا۔ اس پر تنقید و تبصرہ آزاد سے متوقع نہ تھا۔ مذہب، اخلاق، علم و فن اور شعر و ادب پر آزاد نے بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے، لطیف نکتے بیان کئے ہیں، اور عجیب عجیب پیرایے اختیار کئے ہیں۔ صرف اتنی کمی نظر آتی ہے کہ آزاد نے رمز و تمثیل کی صرف ایک شکل پسند کی ہے، اور ہر جگہ اسی سے کام لیا ہے۔ یعنی اشیاء بےجان اور قُویٰ و اخلاق انسانی کو مجسّم کر کے اپنے فسانوں کے اشخاص و کردار پیدا کئے ہیں ہر جگہ ایمان، دل، عقل، نفس، انصاف، ظلم وغیرہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کو بار بار دیکھ کر جی اکتا جاتا ہے۔ تاہم آزاد نے اپنی ذہانت سے واقعات اور ان کی صورتیں نئی نئی پیدا کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نیرنگ خیال ان کی فکر و خیال کی نیرنگیوں کا نادر نمونہ ہے۔

نیرنگ خیال کے دو حصّے ہیں۔ حصّہ اول میں تمہید کے طور پر ایک مضمون لکھا ہے:۔ "اردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات" اس میں مائتھالوجی (اساطیر یا علم الاصنام) کا ذکر کیا ہے، جس پر مضامینِ نیرنگ خیال کی بنیاد ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> فارسی اردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانہ یا زندگی کو عمرِ رواں یا آبِ گذراں کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو یا رسنِ عمر کو کاٹ رہا ہے اور یہ بھی ؎
>
> گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
>
> اسی طرح غصّے کے باب میں دیکھا ہوگا کہ اسے آتشِ غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ "ہمچو مارِ سیاہ بر خود بپیچید"۔ اور "ہمچو سپند از جا برجست"۔ پس انگریزی میں میتھالوجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسّم دیبی یا دیوتا مقرر کیا ہے۔ اور اُنھی سامانوں سے سجایا ہے جو ان کے لئے لازم اور شایان شان ہیں۔ مثلاً

غصہ ۔ ایک عورت ہے، کالا رنگ، ڈراؤنی صورت، تمام بدن پر بال کھڑے ہیں جیسے لوہے کی سلاخیں، سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اٹھائے لہرا رہے ہیں اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

عشق ۔ ایک موقع پر اسے نوجوان خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے، اور اپنے عالم میں اچھلتا کودتا ہے، مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا۔ کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جوڑا ہوا ہے کہ جدھر چاہتا ہے مار بیٹھتا ہے۔ اس کی پناہ نہیں....

افواہ یا شہرت ۔ اس کی تصویر ایک بڑھیا عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے منہ میں زبان ہلتی ہے۔ ساتھ ہی ساری زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے وہی عالم میں ایک ایک زبان پر آتی ہے۔

انگریزی میں انھیں گاڈز کہتے ہیں۔ اور ہر ایک جذبۂ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ وغیرہ کے لئے مختلف گاڈز تیار کئے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹادیا۔ اس لئے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں، ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیا کے لئے ایک ایک دیبی یا دیوتا ہیں۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں اور اس کے صنائع بدائع پر نظر کریں تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کونسا صانع ہوگا جو ایسی دستکاری کرسکے۔ پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو اور اسی نسبت سے تمام عالم موجودات اور اس کے جزئیات کو دیکھو۔ پھر جب دیکھتے ہیں کہ اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ عَنْہُ اِلَّا الْوَاحِدُ، یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا ہے تو ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لئے ایک ایک **ربُّ النوع** فرض کیا جائے جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو، اور سب کا مالک **ربُّ الارباب** جامع جمیع صفاتِ کمال۔

اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک **فرشتۂ موکل** مانا ہے۔
میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے۔ ورنہ وہی دیبی یا دیوتا، وہی گاڈز، وہی ربّ النوع، وہی فرشتۂ موکل۔

غالباً یہی باتیں ہوں گی جو انگریزی علم اساطیر کے متعلق کرنل بالرائڈ نے علامہ آزاد کے لئے بصورت خاکہ تیار کی ہوں۔

ایک مضمون "سچ اور جھوٹ کا رزمنامہ" ہے اس میں لکھتے ہیں:۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ جس طرح بچّوں کو کڑوی دوا مٹھائی ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں، تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی، سلطان آسمانی کی بیٹی تھی۔ جو کہ ملکۂ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا۔ تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزّتِ دوام کا تاج مرصّع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ، نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور رہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اُسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے، تو اُن کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اُس دن وہ بھی آیا ہوا تھا، اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا، چنانچہ وہاں سے چھپ چھپاتے نکلا، اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔

اس قسم کے مضامین میں واقعات و کیفیات کی رنگینی اور رنگا رنگی تو بہت ہے، اور

خوب ہے۔ بے شمار واقعات بیان کئے ہیں اور تقریباً تمام فضائل و رذائل کو متشکل کرکے عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ لیکن پیرایۂ تمثیل یہی ہے جو اوپر دکھایا گیا۔

لیکن بعض مضامین میں زیادہ جدت و ندرت سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مضمون لکھا ہے۔ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں:-

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ آپ اپنے تئیں بدنصیب سمجھتے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالا تر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا۔ اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا، اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے۔ لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔ (پھر اس انبار مصائب کی تفصیل لکھتے ہوئے کہتے ہیں)

اس عالم میں بعض چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔

صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پُرانے سے چکن کے کُھنہ میں ایک بھاری سی گٹھری لیئے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑتا آتا تھا۔ بدن سے پسینا بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا۔ اُس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جُورو بہت بُری تھی۔ اُس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

اس کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دُود آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزۂ ہوائی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آتے تو اتنا نہ ہوسکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ جدوجہد سے سر ہلایا۔ مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اُسی طرح چلے گئے۔

دیکھئے آزاد نے عاشقوں کی کیا خوب لاج رکھی ہے۔ آگے لکھتے ہیں (درمیان سے عبارتیں حذف کردی گئی ہیں):-

بہت بُڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جُھرّیاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ موٹے موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی ...... اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پرواہ چلا آتا ہے۔ اس نے ایک گٹھری پھینک دی، مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے۔ مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم و حیا کو پھینک گئے ...

ہم اس انبوہ آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے، اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک کر دیکھ رہے تھے جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب

سب کو اختیار ہے، جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف کو تبدیل کرلیں، اور اپنے اپنے بوجھ لیکر گھروں کو چلے جائیں...... چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیرمرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا درد قولنج سے جاں بلب تھا، اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لئے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے درد مذکور کو پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہوکر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجئے اور اپنا لڑکا لیجئے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجے بہتر ہے، مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا........

عورتیں بچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔.... کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہوتا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں، وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بموجب ہوتی ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے........

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا، مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ و زاری

نالہ و فریاد، آہ و افسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بیکس آدم زاد کے حال دردناک پر پھر رحم آیا، اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر و گردن سے اُتار کر پھینک دیا۔

ایک اور مضمون میں بھی پُرلطف جدت پیدا کی ہے یعنی "**شہرت عام اور بقاے دوام کا دربار**" قائم کیا ہے۔ جس میں تاریخ عالم کے اکثر مشاہیر کو لاکر بٹھایا ہے۔ چنانچہ کالی داس، محمود، فردوسی، نظامی، چنگیز خاں، امیر تیمور، بوعلی سینا، اکبر، جہانگیر، شیواجی، مرزا سودا، ناسخ، آتش، ذوق، غالب کو قرینے سے دربار میں کرسیاں دی ہیں۔ شروع میں لکھتے ہیں:۔

بقاے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح رُوح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جاے گی کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا، جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں، اور شہرتِ دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے کام اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا تو ثواب آخرت کے لئے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوے۔ لیکن میں اس دربار میں اُنھیں لوگوں کو لاؤں گا جنھوں نے اپنی محنت ہاے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہاے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔

دربار کے حال سے مختلف حصے اقتباس کرکے لکھے جاتے ہیں:۔

جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا ایک پنڈت آیا، دونوں ہاتھ اُٹھاکر اشیرباد کہی اور بقاے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنّے کے نودانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ **راجہ بھوج** تھے اور ۳۲ پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب **سنگھاسن بتیسی** جوان کے

عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ **کالی داس** **شاعر** تھا، جس نے ان کے عہد میں نوکتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

...... دفعتہً **سکندر** نے آواز دی "انھیں لاؤ"۔ جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا۔ کہ مقیشی داڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا، سکندر خود اُٹھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا، اپنے برابر کرسی پر بٹھایا، اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ **نظامی گنجوی** ہیں اور اس سہرے میں **خمسہ** کے مضامین سے پھول پروے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اُٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا۔ اب یہ کبھی نہ کملائیں گے۔

...... اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا، جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ دولت میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ **جہانگیر** تھا اور **بیگم نور جہاں** تھی۔

...... تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مُرقّع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انھیں انھیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ **ہندوستانی شاعر** تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض

پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اُٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ **مرزا رفیع سودا** تھے۔

مرزا سودا دہلوی کی ہجوگوئی کو پھولوں کے کانٹوں سے تشبیہ دے کر کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

(۳) سخندانِ فارس کے دو حصے یکجا ہیں۔ پہلے میں فارسی زبان کی اصلیت اور ساخت کو بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ایک درجن سے زیادہ لکچر ہیں' جو کالج کے طلبہ کے سامنے پڑھنے کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ پہلا لکچر ۹ فروری ۱۸۷۲ء کو دیا گیا ہے اور کئی سال میں یہ سلسلہ پورا ہوا ہے۔ اس حصے میں ایران کی قدیم زبان' اسلام کے بعد کی زبان، اس کے تغیرات، ایران کی معاشرت و تمدن اور ان کا زبان پر اثر۔ انقلابات ملکی اور ان کا علم و ادب پر اثر، مصنفوں اور شاعروں اور ان کی تصانیف کا حال۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی کیفیت وغیرہ مختلف مضامین پر مفید و دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی اس موضوع کی کوئی تصنیف اُردو کیا، فارسی میں بھی نہ تھی۔ علامہ آزاد کی رنگینئ تحریر اس میں بھی قائم ہے۔ بعض اقتباسات یہ ہیں:-

حصہ اوّل میں الفاظ کی ولادت و نسل اور نوعیت و ساخت بیان کرتے ہیں:-

> میرے دوستو، تم حیران ہوگے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے، اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے جُز جُز کو الگ کرتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں؟ اور کیونکر وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں؟ اور ملک بملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوے ہیں؟ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے، ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے، اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں متفق ہیں، اور کونسی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لئے خاص ہیں۔ پھر ان سببوں کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں، اور یہ غیر منقطع کام ہے۔ کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے

کبھی تنزّل میں۔ مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے، اور اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطلب کے لئے لکھتا ہوں:۔

گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا۔ **بان** پر جوڑ معلوم ہوا اس نے **گرے** کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بمعنی **گلو** پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جزو لباس کا گلے پر قبضہ ہے، اس لئے اس کا نام **گریبان** رکھا ہوگا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں **گریو** انہی معنوں میں آیا ہے۔ اور **بان** سنسکرت میں **وان** ہے۔ ثابت ہو گیا کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی۔ یہاں مرگیا وہاں جیتا ہے۔

کلابتوں کو سب پہنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ فلسفی زبان اس کا بل کھولتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ **کلابہ** کلاوہ (سوت کا لچھا)۔ **آلتوں** ترکی میں **سونے** کو کہتے ہیں۔ وہی سنہرا لچھا۔ (سخندانِ فارس حصہ اول ص ۱۵-۱۶)

ایران میں ساتویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری تک پانچ چھ سو برس جو زبان و ادب کا رنگ رہا اس پر ریویو کرتے ہیں:۔

سنہ ۶۶۹ھ میں عبداللہ وصاف ابن فضل اللہ نے غازان خاں شاہزادہ چنگیزی کے لئے **تاریخ وصاف** لکھنی شروع کی۔ حقیقت میں بڑا زور مارا ہے، اور فارسی عربی زباندانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی، فارسی، ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے۔ استعارہ اور تشبیہ نظم میں سو برس پہلے رنگ دینے لگے تھے، نثر میں بہت کم تھے۔ انھوں نے اس قدر بہتات کی کہ مطلب گم ہو گیا۔ عبارت کو مقفّیٰ کیا اور ہر فقرے پر اس کا ہم معنی فقرہ اور سوار کیا۔ ہر صفحہ میں دو دو تین تین عربی شعر اور عربی عبارتیں، کہیں کہیں سطریں، آدھا صفحہ اور زیادہ بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غازان خاں کی حکومت کنارۂ ایران سے سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ خاک عرب کا اثر ضرور ظاہر ہوتا تھا۔ ترکی الفاظ کیوں نہ آتے، ترک بچوں میں بیٹھ کر لکھتے تھے، اور ترک بادشاہ کے

دربار میں کھڑے ہو کر سُناتے تھے، اور چونکہ فاضل تھے، صاحب زبان تھے۔ آمد طبع کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اس لئے کہیں چھوٹے کہیں بڑے بڑے فقرے لکھ کر لمبے لمبے ہاتھ مارتے تھے ....

میرے دوستو، یہ انشا پرداز مُنہ زور گھوڑوں کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں بے ارادہ کسی منزل کے خواہ مخواہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے اور حق پوچھو تو یہ بھی کمال ہے۔ ذرا سی بات کو بلکہ بے بنیاد معاملہ کو، مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے، یا باغ کا حال کہ خوب شاداب ہے، یا بازاری دکانداروں کی تعریف کو اس قدر لمبانا اور چوڑانا بغیر دودھ کے اُبال اُٹھانا ہے، اور یہ انہی کا کام تھا مگر بے حاصل۔

ایک تیز قلم مصوّر نے نظر کے زور سے اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتّی پر فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جُز اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا۔ یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا، اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پُرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک دونوں نے بڑا کمال کیا، مگر اس قلعہ کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملک رانی کرے، اور جہاز میں کونسا لشکر سمندر پار اُترے۔

(۴) دربارِ اکبری میں اکبر بادشاہ کے ذاتی، درباری، آئینی حالات اور سلطنت کے خاص خاص ارکان، وُزراء، علماء، اُمراء کے سوانح بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف تاریخوں سے جمع کئے ہیں، جن میں مُلّا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" کا عنصر غالب ہے۔ صفحے کے صفحے اسی تاریخ سے ترجمہ کر دئے ہیں۔ بعض مقامات کے مختصر نمونے یہ ہیں:-

محبت کے ناز و نیاز۔ اکبر بادشاہ قوم کا ترک، مذہب کا مسلمان تھا۔ راجہ یہاں کے ہندی وطن اور ہندو مذہب تھے۔ اتفاق اور اختلاف کے مقدمے تو ہزاروں تھے، مگر میں ان میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں۔ ذرا آپس کے

برتاؤ دیکھو، اور ان سے دلوں کے حال کا پتا لگاؤ۔ اسی ہنگامے میں (یعنی تیسری یلغار گجرات پر) راجہ جے مل (راجہ روپسی کا بیٹا تھا) اکبر کے برابر نکلا۔ اس کا بکتر بہت بھاری تھا۔ اکبر نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت یہی ہے۔ زرہ وہیں رہ گئی۔ درد خواہ بادشاہ نے اسی وقت بکتر اتروایا اور اپنے خاصے کی زرہ پہنوادی۔ وہ سلام کرکے خوش ہوتا ہوا اپنے رفیقوں میں گیا۔ اتنے میں راجہ کرن (مالدیو راجہ جودھپور کے پوتے) کو دیکھا کہ اس کے پاس زرہ بکتر کچھ نہ تھا۔ بادشاہ نے وہی بکتر اُسے دیدیا۔ جے مل اپنے باپ (روپسی) کے سامنے گیا۔ اس نے پوچھا بکتر کہاں ہے؟ جے مل نے سارا ماجرا سنایا۔ روپسی کی جودھپوریوں سے خاندانی عداوت چلی آتی تھی۔ اسی وقت بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا کہ حضور میرا بکتر مرحمت ہو۔ وہ میرے بزرگوں سے چلا آتا ہے، اور بڑا مبارک اور فتح نصیب ہے۔ اس وقت بادشاہ کو یاد آیا کہ ان کی کھٹک ہے۔ فرمایا کہ خیر ہم نے اسی واسطے خاصے کی زرہ تمھیں دیدی ہے کہ فتح کا تعویذ اور اقبال کا گٹکا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ روپسی کے دل نے نہ مانا۔ اور تو کچھ نہ ہوسکا، اسلحۂ جنگ اُتار کر پھینک دئے۔ اور کہا خیر میں میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا۔ اس نازک موقع پر اکبر کو بھی اور کچھ نہ بن آیا۔ کہا خیر ہمارے جاں نثار ننگے لڑیں تو ہم سے بھی نہیں ہوسکتا کہ زرہ بکتر میں چھپ کر میدان میں لڑیں۔ ہم بھی برہنہ تیر و تلوار کے منہ پر جائیں گے۔ راجہ بھگوانداس اسی وقت گھوڑا اُڑا کر جے مل کے پاس گئے۔ اسے سمجھایا۔ بہت لعنت ملامت کی اور سمجھا بجھا کر دنیا کے رستے کا نشیب و فراز دکھایا۔ یہ بڈھا خاندان کا ستون تھا۔ اس کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اس نے شرمندہ ہوکر پھر ہتیار سجے۔ راجہ بھگوانداس نے آکر عرض کی کہ حضور، روپسی نے بھنگ پی تھی، اس کی لہروں نے ترنگ دکھائی تھی، اور کچھ بات نہ تھی۔ اکبر سن کر ہنسنے لگا اور ایسا نازک جھگڑا لطیفہ ہوکر اُڑ گیا۔

تمام دربار اکبری آزاد کی انشاپردازی کا عجیب دلکش نمونہ ہے۔ بعض حصے اور

بعض واقعات خاص طور پر موثر ہیں۔ ان میں سے ایک خان زماں علی خاں شیبانی کا حال ہے۔ اس میں سے کچھ اقتباس کیا جاتا ہے:-

غرض رات نے صبح کی کروٹ لی۔ ستارہ نے آنکھ ماری اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جاکر بہ آواز بلند چلایا کہ مستو، بے خبرو، کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پونہچے اور دریا بھی اُتر لئے۔ اس وقت خان زماں کے کان کھڑے ہوئے، مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنوں خاں قاقشال کو بھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا، کچھ پرواہ نہ کی ...... غرض نور کا تڑکا تھا کہ بادشاہی نقارہ پر چوٹ پڑی۔ یہ آواز سُن کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کا بندوبست کرنے لگے۔

۹۷۴ھ نو بجے پیر کا دن، عید قرباں کی پہلی تاریخ تھی۔ منکروال (سنگروال) علاقہ الہ آباد پر مقام تھا کہ میدان جنگ میں تلوار میان سے نکلی۔ دونوں بھائی شیر ببر کی طرح آئے اور اپنے پرے جما کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ قلب میں خان زماں قائم ہوا۔ ادھر سے اکبر نے ہاتھیوں کی صف باندھ کر فوج کے پرے باندھے ...... بادشاہ "بال سندر" ہاتھی پر سوار تھے، اور مرزا عزیز کوکہ خواصی میں بیٹھے تھے۔ ان کا خاندان گرد و پیش جما ہوا تھا۔ اکبر نے دیکھا کہ میدان کا رنگ بدلا۔ بنظر احتیاط ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوا، اور بہادروں کو للکارا۔

اب دونوں بھائیوں (خان زماں اور بہادر خاں) نے پہچانا کہ ضرور بادشاہ اس لشکر میں ہے ..... اب انھوں نے مرنا دل میں ٹھان لیا اور جہاں جہاں تھے وہیں قائم ہوگئے۔ مگر نمک کی مار کا حربہ کچھ اور ہی ضرب رکھتا ہے۔ بہادر خاں کے گھوڑے کے سینے میں ایک تیر لگا کہ چراغ پا ہو کر گر پڑا، اور وہ پیادہ ہوگیا۔ بادشاہ کو ابھی تک اس حال کی خبر نہ ہوئی تھی۔ سب کو بدحواس دیکھ کر خود آگے بڑھا اور فوجداروں کو آواز دی کہ ہاتھیوں کی صف کو علی قلی خاں کی فوج پر ریل دو کہ بہادر خاں کو ادھر متوجہ ہونا پڑے۔ دونو لشکر تہ و بالا

ہو رہے تھے۔ علی قلی خاں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ بار بار بہادر خاں کا حال پوچھتا تھا اور مدد بھیجتا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ دونوں بھائیوں پر کیا گذری کہ اکبری بہادروں کو فتح کی رگ پھڑکتی معلوم ہوئی اور کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

بات یہ ہوئی کہ ادھر سے "ہیرانند" ہاتھی علی قلی خاں کی فوج پر جھکا۔ اُدھر سے مقابلہ میں "رودیانہ" ہاتھی تھا۔ ہیرانند نے قدم کاٹ کر اس طرح کلّے کی ٹکر ماری کہ رودیانہ سینہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک تیر قضا کے تیر کی طرح علی قلی خاں کے لگا۔ دلاور بڑی بے پروائی سے نکال رہا تھا کہ دوسرا تیر گھوڑے کے لگا، اور ایسا بیڈھب لگا کہ ہرگز نہ سنبھل سکا، گرا اور سوار کو بھی لیکر گرا۔ ہمراہیوں نے دوسرا گھوڑا سامنے کیا۔ اتنے عرصے میں کہ وہ سوار ہو، ایک بادشاہی ہاتھی باغیوں کو پامال کرتا ہوا، بلا کی طرح اس پر پہنچا۔ خان زماں نے آواز دی، فوجدار ہاتھی کو روکنا، میں سپہ سالار ہوں، زندہ حضور میں لے جا، بہت انعام پائے گا۔ اس کمبخت نے نہ سُنا، ہاتھی کو ہول ہی دیا۔ افسوس وہ خان زماں جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اُڑتے تھے، اُسے ہاتھی روندکر ہوا کی طرح اور طرف نکل گیا، اور وہ خاک پر سسکتا رہ گیا۔ اللہ اللہ! جس بہادر کو فتح و اقبال ہوا کے گھوڑوں پر چڑھاتے تھے، جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر لٹاتے تھے، وہ خاک پر پڑا دم توڑتا تھا، جوانی سرہانے کھڑی سر ملتی تھی، اور دلاوری زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب و خیال ہو گئے تھے۔ ہاں، خان زماں، یہ یہاں کا معمولی قانون ہے، تم نے ہزاروں کو خاک و خون میں لٹایا، آؤ بھائی، اب تمہاری باری ہے۔ اسی خاک پر تمھیں سونا ہوگا۔

سر لشکر کے مرتے ہی لشکر پریشان ہوگیا۔ فوج شاہی میں فتح کا نقارہ بج گیا۔ اکبر ادھر ادھر کمک دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں نظر بہادر، بہادر خاں کو اپنے آگے گھوڑے پر سوار کرکے لایا، اور حضور میں پیش کیا۔ اکبر نے پوچھا "بہادر، چونی؟"

کچھ جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر کہا۔ اُس نے کہا، "الحمد للہ علیٰ کُلِّ حال" بادشاہ کا دل بھر آیا۔ بچپن کا عالم اور ساتھ کا کھیلنا یاد آیا۔ پھر کہا "بہادر! با بشاچہ بدی کردہ بودیم کہ شمشیر بروے ماکشیدید" وہ شرمندہ تر مارا سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارے خجالت کے کچھ جواب نہ دے سکا۔ کہا تو یہ کہا "الحمد للہ علیٰ کُلِّ حالِ کہ در آخر عمر دیدارِ حضرت بادشاہ، کہ ماحیِ گناہان است، نصیب شد" آفریں ہے اکبر کے حوصلے کو! اگنہ بخش کا لفظ سُنتے ہی آنکھیں نیچی کر لیں، اور کہا "بحفاظت نگہدارید" اس نے پانی مانگا، اپنی چھاگل میں سے پانی دیا...... کوئی کہتا ہے بے اطلاع، کوئی کہتا ہے اکبر کے اشارے سے شہباز خاں کمبو نے بے نظیر بہادر کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، مگر مُلّا صاحب کہتے ہیں کہ شہنشاہ اس کے قتل پر راضی نہ تھے۔

بادشاہ میدان میں کھڑے تھے۔ نمک حرام پکڑے آتے تھے، اور مارے جاتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال خان زماں کا تھا، جو آتا تھا اس سے پوچھتے تھے...... حکم دیا کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے، انعام پائے۔ ولایتی کے سر کے لئے اشرفی، ہندوستانی کے سر کے لئے روپیہ۔ ہائے کمبخت ہندوستانیوں! تمہارے سر کٹ کر بھی سستے ہی رہے! لشکر کے لوگ بے سر و پا اٹھ دوڑے۔ گودیں بھر بھر کر سر لاتے تھے، اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے تھے۔ ہر سر کو دیکھتے تھے، دکھاتے تھے، اور پہچانتے تھے۔ افسوس انہی سروں میں خان زماں کا سر بھی ملا کہ ادبار کا سر ہو گیا۔ سبحان اللہ! جس سر سے فتح کا نشان جُدا نہ ہوتا تھا، جس سے اقبال کا خود نہ اُترتا تھا جس چہرے کو کامیابیوں کی سرخی شگفتہ رکھتی تھی، اس پر خون نے سیاہ دھاریاں کھینچی تھیں، نحوست نے خاک ڈال دی تھی، کون پہچانے؟ سب کو تردّد تھا۔ ارزانی مل اس کا حامی اور معتبر دیوان بھی قیدیوں میں حاضر تھا۔ بلایا اور دکھا کر پوچھا۔ اس نے سر کو اُٹھا لیا، اپنے سر پر دے مارا، اور ڈاڑھیں مار کر رونے لگا۔

خواجہ دولت کہ پہلے اس کے حرم سرا کا خواجہ سرا تھا، وہاں سے آکر حضور میں ملازم اور پھر دولت خاں ہوگیا تھا، اُس نے دیکھا، اور کہا، مرنے والے کو عادت تھی کہ ہمیشہ پان بائیں طرف سے کھایا کرتا تھا، اس لئے ادھر کے دانت رنگین ہوگئے تھے۔ دیکھا تو ایسا ہی تھا......

جب اکبر کو یقین ہوگیا کہ خان زماں کا بھی کام تمام ہوا، تو گھوڑے سے اُتر کر خاک پر پیشانی کو رکھ دیا اور سجدۂ شکر بجالایا..... خاں زماں! بل بے تری ہیبت، اور واہ رے تیرا دبدبہ! مرد ہو تو ایسا ہو! آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔ تیری لاش اس سے بھی سوا خراب وخوار ہوتی، مگر آقا کی جان نثاری میں ہوتی تو آب زر سے لکھی جاتی۔ خدا حاسدوں کا منھ کالا کرے، جنھوں نے دونو بھائیوں کی سُنہری سرخروئی کو روسیاہی کر دیا، آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بدا صالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے محفوظ رکھے۔ یہ نااہل خود کچھ نہیں کرسکتے، اوروں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں، اور مورچے باندھتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو افسروں سے لڑاتے ہیں۔ خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا۔ اپنے تئیں خدا کے اور انھیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان کے اعمال ہی ان کو سمجھ سمجھا لیتے ہیں ؎

تو بد کنندہ خود را بروزگار گذار کہ روزگار ترا چاکریست کینہ گذار

(۵) مکتوبات آزاد ۔ علامہ آزاد کی اور چھوٹی تصانیف "قصص ہند"، "نصیحت کا کرن پھول" وغیرہ میں ان کا وہی اسلوب نگارش موجود ہے، بعض کتابیں مثلاً "تذکرۂ علما"، اس قدر سادہ اور طرز آزاد سے علحدہ ہے کہ ان کی تصنیف ہی نہیں معلوم ہوتی۔ ایک ایک دو دو صفحے کے نہایت مختصر و ناکافی حالات ہیں، جیسے کسی بڑی کتاب کی تیاری کے لئے نوٹس اور اشارے لکھے گئے ہوں، اس لئے باقی تصانیف کے نمونے ترک کئے جاتے ہیں۔ مکتوبات آزاد البتہ دلچسپ چیز ہے

علامہ آزاد کے یہ سب خطوط صرف ایک شخص میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی (برادر عزیز نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے نام ہیں، جو انڈین میڈیکل سروس میں فوجی ڈاکٹر تھے، اور ایک زمانے میں بسلسلۂ ملازمت امرتسر میں رہے تھے۔ یہ مکتوبات اول ۱۹۰۶ء میں رسالہ مخزن لاہور میں بالاقساط اور پھر ۱۹۰۷ء میں بصورت کتاب شائع ہوئے تھے۔

اس مجموعہ کا دیباچہ سید جالب دہلوی نے لکھا تھا، جو اس زمانے میں پیسہ اخبار لاہور کے دفتر ادارت میں تھے، اور پھر آخر میں روزنامہ ہمدم لکھنؤ نکالتے رہے۔

خطوط آزاد کی اہمیت کے متعلق سید جالب صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"ان مکتوبات کے ذریعے سے رسالہ مخزن نے نہ صرف مولانا کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک دلآویز نمونہ شائقین اردو کو دکھایا ہے، بلکہ بالواسطہ اُن کی پُرحوادث مگر قیمتی زندگی کے حالات کا وہ دلچسپ حصّہ بہم پہنچایا ہے جس کا مہیا ہونا خود حضرت آزاد سے بھی نظر بحالات موجودہ سخت دشوار تھا۔"

ان مکتوبات میں کچھ خطوط کتابوں کی طباعت و اشاعت کے متعلق ہیں۔ بعض میں ذاتی حالات ہیں۔ چند کالج اور یونیورسٹی کے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اکثر سادہ رسمی زبان میں لکھے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں آزاد کا مخصوص اسلوب نگارش بھی ملتا ہے۔ القاب و آداب اکثر خطوں میں صرف "جناب من، تسلیم" ہیں۔ کہیں "عالیجناب" کا لفظ ہے۔ بعض خطوط میں چھوٹے یا بڑے دعائیہ جملے بھی ہیں۔ مثلاً "ادام اللہ اقبالکم وضاعف اجلالکم" اپنا نام اکثر صرف "آزاد" لکھتے ہیں، کہیں پورا نام مع تخلص۔

نمونے کے لئے مکتوبات آزاد کا سب سے پہلا خط بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ یہ اس زمانے میں لکھا گیا ہے جب علامہ آزاد "دربار اکبری" مرتب کر رہے تھے۔ اس کتاب کو سرسالار جنگ اول کے نام سے معنون کرنا چاہتے ہیں۔ خط میں اسی انتساب کی دو صورتوں کا ذکر ہے۔ پورا خط یہ ہے:-

"عالیجناب من دام اجلالکم، تسلیم، عنایت نامہ باعث اعزاز ہوا۔ رات کو دس بجے میں گھر پہنچا۔ اس وقت خطوط اور کاغذوں کا انبوہ سامنے ہے، دل "دربار" ...

ہے، اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔ آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے، مجھے کہاں؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ "ماثر الامرا" اور "سوانح اکبری" کس زمانے میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتا لگا تھا۔ ۲ دن میں بھاگ گیا، اور دوڑا دوڑا آیا۔ جو کچھ ہاتھ لگا، اسے دیکھا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ ماثر الامرا بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے، وہ ماثر الامرا سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گذرنا کفر ہے۔ ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے، اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو "دربار اکبری" کا مشاہدہ کرے گا، یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو ماثر ہاتھ نہیں آئی۔

دونوں صورتوں کی تفصیل آپ اب پوچھتے ہیں۔ افسوس دیباچہ لکھنے کی نوبت ابھی کہاں آئی۔ خدا وہ دن کرے۔ دو صورتیں یہ کہ ایک تو وہی معمولی طریقہ کہ ایک نسخہ پہلے ممدوح کو بھیجا، اور استمزاج کیا۔ ممدوح نے منظور فرمایا، مصنف نے شکریہ ادا کیا۔ دوسری صورت کا مضمون آئینۂ خیال میں ایک تصویر موہوم ہے، اور اس وقت فرصت مفقود۔ اچھا میں خلاصہ غلاصہ قلمبند تو کرتا ہوں، دیکھوں کچھ رنگ دیتا ہے یا نہیں۔

اس کا مضمون یوں تصور فرمائیے کہ جب اس موقع پر آب و رنگ اپنی دستکاری خرچ کر چکے تو عالم بالا کے پاک نہاد زمین پر اتر آئے۔ دونوں عقلیں، پانچوں حواس، غور، فکر، وہم، خیال وغیرہ وغیرہ سے انجمن منعقد ہوئی۔ مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے۔ سب نے وہ بینیں اٹھائیں، اور شش جہت میں نگاہیں دوڑائیں۔ کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی۔ مگر وہ ایوانِ عالیشان وغیرہ وغیرہ۔ وہم نے اعتراض کیا کہ جب تک سمت سے عمارت نہ خاص ہو، ایسی عمارت بنتا نہیں۔ آزاد نے کہا، سحر کا نور، شفق کی سرخی، صبح کا عالم جب نظر آتا ہے، اہل دل سمجھتے ہیں سجا ہوا:

صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں، دل کہتا ہے صلّ علیٰ۔ اس میں آفتاب سے اجازت، اور اس میں خسرو گُل سے استمزاج کون کرتا ہے۔ میں نے ایسا ممدوح پایا، اسی کے دامن اقبال سے وابستہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ اسے سب نے تسلیم کیا۔ اب غائبانہ عرض کرتا ہوں کہ، وغیرہ وغیرہ۔

میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہے، اور اس میں کچھ ہرج نہیں۔

۲۶ر ستمبر ۱۸۸۲ء

محمد حسین عفی عنہ آزاد

لاہور مستی دروازہ

جس زمانے کے یہ خطوط ہیں، اسی زمانہ (۱۸۸۲ء) میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، اور نظام تعلیمات میں ردّ و بدل ہو رہا تھا۔ علاّمہ آزاد کو اپنے کالج کے ٹوٹنے اور نوکری جاتے رہنے کا اندیشہ تھا۔ اس کے متعلق چند خطوں میں میجر سید حسن صاحب کو لکھتے ہیں۔ بعض فقرے مختلف خطوط سے نقل کئے جاتے ہیں۔

"جناب من، تسلیم۔ آپ دیکھتے ہیں، یہ علم کی چڑیل (یونیورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کئے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی۔ چند مہینے میں سُن لیجئے گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لئے ہم پکڑے جاتے ہیں......

کالج کے باب میں بھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی۔ خواہ سررشتۂ تعلیم میں، خواہ سول لائن میں۔ اخیر درجہ پنشن کا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ۱۵۰ روپے مہینہ آتا ہے، اس میں ۵۰ روپے آئیں گے، تو صورت حال کیا ہو گی، لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو، تھوڑا کھاؤ، اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدا کریم کارساز ہے۔ وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں۔ عہدہ کے لئے کوشش نہ کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

(مرقومہ ۳ر فروری ۱۸۸۳ء)

میرے بارے میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے، دل کو نہایت تشفیؔ اور استقلال حاصل ہوا ہے۔ اپنے جد کے خانہ زادوں کی دستگیری آپ صاحب نہ فرمائیں گے تو اَور کون ہے۔ پروردگار عالم اس خاندان کو اقتدار روز افزوں عطا فرمائے۔ میں نے اپنے دل سے یہ قرار دے لیا ہے اگر اکسٹرا اسسٹنٹی دی تو اختیار کرلوں گا، ورنہ پنشن لوں گا۔ تھوڑے پر قناعت کروں گا، اپنی کتابوں کو پوری کوشش سے تیار کر کے پیشکش کرتا رہوں گا، اور دعائے دولت میں مصروف رہوں گا۔ ہاں جو خدمت فرمائیں گے، وہ بھی بجالاؤں گا۔ کالج کا تغیرؔ نہیں بھی ہوتا، تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں تو اب آپ صاحبوں کا ہو چکا ہوں۔

درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہو تم سنو یا نہ سنو۔ نالہ کئے جاؤں گا
بھیڑ ہووے گی، رُخِ یار ادھر ہو کہ نہو حشر پر وعدہ دیدار ہے، میں ڈرتا ہوں

(مرقومہ ۱۰ر فروری ۱۸۸۳ء)

...... نوکری کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونیورسٹی پر آپ مجھے کیوں ٹالتے ہیں۔ یہ ہے کیا قصہ! آپ کے جد کی سرکار تو ہے۔ حضرت! اس غلام زادکو آزاد کر کے وہ دست بردار نہیں ہوگی، انشاء اللہ آپ دیکھیں گے اس سے بہتر صورت ہوگی، اور بدرجہا بہتر ہوگی...... خوشا بحال آزاد کہ ۵۰ روپے پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجالائے گا، اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ اسباب جہاں
آنچہ ما درکار داریم، اکثرے درکار نیست

آہا۔ پھر انشاء اللہ کیا خاطر جمع اور شگفتگی طبع کے ساتھ تصنیفات کو درست کروں۔ (مرقومہ ۲۰ر اپریل ۱۸۸۴ء)

میرا حال یہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم بموجب لکھ بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر سے میری تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے گی۔ گویا اس تاریخ سے میں ان کے

ماتحت سمجھا جاؤں گا۔ یا قسمت! یا نصیب!

(مرقومہ ۲۷ جولائی ۱۸۸۴ء)

سر سالار جنگ جن کے نام سے آزاد اپنی "دربار اکبری" کا انتساب کرنا چاہتے تھے، ان کا فروری ۱۸۸۳ء میں یکایک انتقال ہوگیا۔ اور آزاد کی وہ تجویز پوری نہ ہو سکی۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

...... گر مشورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا وہی ڈڈیکیشن کا مقرری خاکہ رنگ بھر کر سجا دوں یا اُسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثہ جانکاہ پر عالم نے نالہ وزاری کے معمولی حق ادا کئے اور یادگار کے لئے تاریخیں اور نظمیں لکھیں۔ فقیر آزاد سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ یہ کتاب ان کے نام پر لکھتا ہے کہ ان دنوں زیر قلم تھی۔

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مزا تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے ان کے سامنے پڑھتا، اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر وہ کیا فرماتے ہیں۔ ہائے سر سالار جنگ! سارے ارمان دل کے دل میں رہے۔ ہائے سر سالار جنگ!

مولی اسد اللہ الغالب حاضر وناظر ہیں کہ پھر آنسو آنکھوں میں بھر آئے آپ سے کیا اپنا حال کہوں۔ میرا دل کچھ اور دل ہے۔

(مرقومہ ۲۰ مارچ ۱۸۸۳ء)

آپ اُنھیں پھر لکھ دیجئے گا کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم مغفور کی ہو چکیں۔ خدا گواہ ہے۔ مجھے ان سے غائبانہ عشق تھا۔ پہلے کہتا تو خوشامد تھی۔ اب تو خاص ان کے اور میرے درمیان میں معاملہ ہے۔ دیکھئے آج لوح روحانی پر ان کا خیال کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اس کی باتیں قابلِ یقین ہرگز نہیں لیکن اسے میں نے ایک بہلاوا اپنے دل کا کر رکھا ہے۔ رات کو ایک بجے دو بجے بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں۔ اور یقین آپ کریں کہ یہ ابنائے زماں اخوان الشیاطین جو

زندہ ہیں، ان سے تو اس کی باتیں بہر حال بہتر ہیں۔

بسکہ از بر خورد عالم عکس مطلب یدہ ام
برمم از آب واز آیئنہ پنہاں می شوم

(مرقومہ ۱۸ / مئی ۱۸۸۳ء)

علامہ آزاد کو عمر بھر پنجاب میں رہنے اور پنجابیوں سے گفتگو کرتے رہنے کے سبب سے پنجابی بول چال کی عادت ہوگئی تھی، کبھی کبھی اپنی تحریر میں بھی لکھ دیتے تھے۔ انھیں خطوط میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔ "کیا میں نے پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے" دہلی میں کہیں گے، "کرلیا ہے" دربار اکبری میں بھی یہ بات نظر آتی ہے۔ آب حیات میں نہیں ہے۔

(۶) **فلسفۂ الٰہیات**۔ یعنی علامہ آزاد کے "وہ حکیمانہ جذبات جو عربی، فارسی، سنسکرت سے اخذ کئے اور حالتِ بیخودی میں الہامی اردو کے انداز میں تحریر فرمائے"۔

شاید ساری دنیا کے مصنفوں میں تنہا آزاد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے عالم جنوں میں بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کے اس دماغی اثر کا ذکر ان کے حالات میں آچکا ہے۔ فلسفۂ الٰہیات میں علامہ آزاد کے پوتے آغا محمد طاہر صاحب نے آزاد کے ان حالات کے متعلق ایک دیباچہ شامل کیا ہے۔ اس کا اقتباس یہ ہے :۔

جب مشاغل سے فارغ ہوتے تو جس طرح زبانوں کے کھوج نکالتے ہیں اسی روحانی فلسفہ کے سراغ کے درپے ہوتے، اور مختلف ممالک کے فلسفوں کو بڑی خوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست کرتے۔ چنانچہ اس بات کا کچھ ثبوت ناظرین کو اسی کتاب میں ملے گا۔ مگر یہ باتیں اکثر اکیلے میں ہوتیں اور خاص اپنی ذات کے لئے مخصوص تھیں، اوروں سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔

ایک دفعہ ایک تختی لائے جو شاید اب بھی ملتی ہو۔ وہ روحوں کو بلاتی تھی۔ روحیں سوالات کا جواب پنسل سے لکھ دیتی تھیں۔ مگر یہ بہت ابتدائی باتیں

ہیں۔ کچھ دنوں بعد اسے پھینک دیا، اور بغیر کسی خارجی مدد کے خود فرماتے کہ فلاں کی یا فلاں جگہ کی روح آئی ہے۔ پہلے خود سوال کرتے، پھر تھوڑی دیر خاموش رہتے۔ بعد ازاں تعجب کے لہجہ میں اس بات کا جواب دیتے اور کہتے "اچھا، تو یوں ہے"؟ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر شخص بہت ہی آہستگی کے ساتھ ان سے کچھ کہہ رہا ہے، یا دل و دماغ میں ان باتوں کا جواب اُتر رہا ہے، جس کو یہ اپنے دل و دماغ کا نتیجہ نہیں سمجھتے، بلکہ کسی اور قوت کا اثر سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرار تھے۔ احباب و آشنا سے ملتے تھے۔ سارے کام حسب معمول کرتے تھے۔ بایں ہمہ طبیعت میں ایک لٹک سی پیدا ہو چلی تھی، اور اکثر اوقات تنہائی میں آپ ہی آپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی حال میں ۱۸۸۵ء کے آخر میں ایران کا سفر کیا۔ جہاں سے واپس آکر سخندان فارس مکمل کیا۔ سفرنامہ اور لغت کا مسودہ بنا کر لائے۔ یہ سب چیزیں تو دنیا والوں اور اہل ملک کے لئے تھیں۔ اپنے لئے جو کچھ لائے وہ دماغ میں محفوظ تھا۔ پھر کالج میں آکر لکچر دینے لگے ...... ظاہر میں یہ سب کچھ تھا، لیکن باطن میں دوسرا رنگ غالب آنا جاتا تھا۔ دریں آواں، مولانا کی ایک چہیتی اور لاڈوں کی پالی فاضلہ بیٹی کا انتقال ہوگیا، جو بقول مولانا ان کے علمی مشاغل میں ان کی مُشیر اور دست راست تھی۔ اس واقعہ نے قلب پر بہت اثر کیا اور اس دُنیا سے بالکل جی اُچاٹ ہوگیا....

آخر کار وہ دن آگیا جبکہ ساغر دل مختلف قسم کی شرابوں سے سراپا معمور ہوگیا۔ ع "پیمانہ بھر چکا تھا، چھلکنے کی دیر تھی"۔ سو اس کے لئے ایک بہانہ مل گیا۔ قدرت نے وہ سامان بھی پیدا کر دیا۔ ۱۸۸۶ء کے لگ بھگ لاہور میں ایک درویش سید دھیان شاہ چشتی تشریف لائے، جو کبھی سالک تھے اور کبھی مجذوب..... مولانا کو بھی تقدیر ادھر لے گئی۔ بعد چندے راز و نیاز کی مجلسیں گرم ہونے لگیں۔ تخلیہ کی ان صحبتوں کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا بہت جلد ظہور میں آگیا کہ مولانا با ایں ہمہ علم و فضل دیوانگی و وارفتگی کے ہمدوش ہوکر محبت کے کوچہ و بازار میں سودائی

کا تمغہ لگائے پریشانی کا پٹکا باندھے، جذب کامل کا علم ہاتھ میں لئے باآواز بلند یہ شعر پڑھتے ہوئے مارے مارے پھریں:۔

اگنی کا ہے گمان شک ہے ملاگیری کا   رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہوکر

ایک دن مولانا کالج سے پڑھا کر نکلے تو بجائے گھر آنے کے نویں کوٹ (سید صاحب کی جائے قیام) چلے گئے۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ سید صاحب (سید میاں شاہ چشتی) نے نظر اٹھا کر دیکھا، مسکرائے، اور فرمایا "جا محمد حسین جا، تیرے لئے دلی کا حکم آیا ہے، دلی چلا جا" خدا جانے اس اک نگہ ناز میں کیا جادو تھا، اور اس ایک فقرہ میں کیا تاثیر تھی، جس نے آزاد کو اپنا اسیر بنالیا۔

...... الغرض "بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرمغاں گوید" والی بات ہوگئی۔ حضرت آزاد اسی وقت پیدل دلی کی طرف روانہ ہوگئے...... دلی پہنچے مگر عجیب شان سے پونہچے، سرسے پگڑی غائب، پیر میں جوتا ندارد۔ حال حیران پریشان۔ ایک آناً فاناً میں تمام دلی میں شور مچ گیا۔ رشتہ دار منت سماجت کرتے کہ برائے خدا گھر چلئے، مگر یہاں کون سنتا تھا، کبھی قدم شریف، کبھی استاد ذوق کی قبر، کبھی شہر، کبھی جنگل، جہاں مستوں کا من کہتا، وہیں جاتے اور دن گذارتے ...... آخر دلی سے خبر آئی تو والد ماجد مرحوم دہلی گئے۔ ڈھونڈا، بہت کچھ سمجھایا مگر ایک نہ مانی ...... اس عرصہ میں وہ جذبہ سکون کی طرف مائل ہو چلا تھا۔ ان کے بچپن کے دوست شمس العلماء ذکاء اللہ صاحب مرحوم منا پر جا کر اپنے دولت خانے پر لے آئے۔ تقریباً ایک سال تک مہمان رکھا، اور وہ وہ نازبرداریاں کیں کہ اس زمانہ کی دوستی اور محبت ان پر قربان ہے۔ خود اور سارا گھر گویا ان کے حکم کے پابند تھے۔ اس عرصہ میں طبیعت نے بہت کچھ قرار پکڑ لیا تھا، اور سید میاں شاہ والی کیفیت ہوگئی تھی، کبھی سالک تھے، کبھی مجذوب۔ چنانچہ والد صاحب دہلی گئے اور اپنے ساتھ لے آئے۔ اب مولانا اپنے علیحدہ مکان میں رہنے لگے۔ آس پاس الماریوں میں

کتب خانہ سجادیا۔ درمیان میں پلنگ۔ ایک گوشہ میں چھوٹا سا بوریا، اس پر فرش۔ کاغذ قلم دوات سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتے۔ صبح و شام وہیں بیٹھتے۔ چار پانچ میل سیر کو جنگل یا باغوں میں جاتے، جہاں ہر پتہ ان کا مخاطب تھا، ہر درخت ان سے بات کرتا تھا نسیم کا ہر جھونکا ان کے لئے نئی خبریں لاتا تھا۔ پھولوں کی خوشبو خدا جانے کس کا پتہ دیتی تھی۔ غرض کہ صبح و شام کی تفریح ان کی زندگی تھی۔ راہ میں کوئی ملتا اور سلام کرتا تو جواب دیتے اور کھڑے ہو کر اس کے لئے دعا کرتے اور روانہ ہو جاتے۔ دونوں وقت گھر پر کھانا کھاتے۔ آم اور تربوز سے بہت رغبت تھی۔...... یہ تمام کیفیات گویا مولانا کی ذہنیت کے ابتدائی مراحل سے لیکر انتہائی معراج تک کی ایک مجمل مگر سبق آموز تاریخ ہے۔

سید جالب دہلوی نے بھی "مکتوبات آزاد" کے دیباچہ میں **حضرت آزاد** کے قلبی و دماغی میلان و رجحان کی طرف اشارے کئے ہیں۔ جن کا آخری نتیجہ مستقل بیخودی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جالب صاحب لکھتے ہیں:۔

مولانائے موصوف نے سن رشد و تمیز کو پہنچتے ہی علمی فوائد پر خیالی دلچسپیوں کو ترجیح دینی شروع کر دی تھی، اور اوائل شباب ہی میں اپنی طبیعت کا یہ نرالا رنگ معاصرین و احباب پر ظاہر فرمادیا تھا اور بیس بائیس سال کی عمر میں قدامت پرستی کو کھلم کھلا اپنا شعار خاص قرار دے لیا تھا نیز صوفیائے کرام کے معتقدات میں جن دو عالموں جسمانی و روحانی یا سفلی و علوی کا الگ الگ آباد ہونا مذکور ہے ان کی دیکھ بھال اپنے لئے ضروری ٹھہرائی تھی، اور اپنے اوقات گرامی کا ایک حصہ روحانیات پر غور کرنے اور دونوں عالموں کے ظاہری و باطنی تعلقات کا پتہ لگانے لئے مختص کر رکھا تھا، اور ویدانت اور تصوف میں جو ریاضتیں تزکیۂ نفس و تصفیہ باطن کے لئے مقرر ہیں، وہ مہنتوں اور درویشوں کی صحبتوں میں رہ کر سیکھی تھیں۔ متعدد اشغال و اذکار کو اپنا لازمۂ زندگی بنایا تھا۔ اور ذکر خفی و جلی اور وردنا دعلی میں وہ مشق بہم پہونچائی تھی کہ آپ کے سانس کی حرکات بعض اوقات پاس بیٹھنے والوں کو چونکا دیتی تھیں...... ایک طرف تو یہ

خیالات تھے جنھوں نے سالہا سال کی پختگی سے عقائد کا درجہ حاصل کر لیا تھا، اور دوسری جانب وجہ معاش میں بھی آپ کو تعلیم و تحقیق السنہ ہی سے واسطہ پڑا تھا۔ اور اس کام میں جو تین زبانیں فارسی، اردو، اور ہندی آپ کا سرمایۂ امتیاز تھیں، ان کے لٹریچر کا دار و مدار صرف شاعری پر آکر ٹھہرا تھا۔ اس لئے آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہتی تھی، اور شعرائے ہند و فارس کے نتائج افکار ہر وقت آپ کے انیس خلوت ہوا کرتے تھے۔ اس لئے کوئی محل تعجب نہیں کہ جب ارباب زمانہ کی ناقدری و بیوفائی اور دنیائے دنی کے مصائب و آلام کا ساکنان عالم خیال کی دلجوئی و مدارات سے مقابلہ پیش آیا، تو آخرالذکر طمانیت و یکسوئی کا گلزار سراپا بہار دکھا کر، اور سالہا سال بے غل و غش اس میں سیر کرنے کی اُمید دلا کر حضرت آزاد کی طبعیت کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے، اور مولانائے موصوف جملہ تعلقاتِ دنیادی سے مُنہ موڑ کر اور عقل و خرد کے ساتھ ملکی لٹریچر کو روتا چھوڑ کر یہ شعر پڑھتے ہوئے دیارِ تصوّر کے گلشن بے خزاں میں پہنچے۔

زہشیارانِ عالم ہر کرا دیدم غمے دارد
دلا، دیوانہ شو، دیوانگی ہم عالمے دارد

خمخانۂ جاوید (تذکرۂ شعراء) میں علّامہ آزاد کی اس کیفیت کے ذکر میں لکھا ہے:۔

رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب فرماتے ہیں کہ جنون کے شروع میں ایک دن آزاد مجھ سے ملنے آئے، اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹے باتیں کرتے رہے مگر ان الفاظ کے بجز اور کچھ زبان پہ نہیں لائے کہ رائے صاحب آپ اس شعر کو پڑھا کیجئے، اور اس کے معنی آپ جو چاہیں، سمجھ لیں۔

پردہ در کعبہ سے اُٹھا دینا ہے آساں پر پردۂ رخسار صنم اُٹھ نہیں سکتا

یہ تفصیل اس لئے لکھی گئی ہے کہ علّامہ آزاد کی یہ حالت جذب و بیخودی صرف مصائب و آلام کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ مادّہ ان کے آب و گل میں خمیر تھا، اور بقول سید جالب

کے "آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیّل کی دنیا میں رہتی تھی۔" یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت تھی کہ جب آخر کار ان کی یہ حالت ہونے والی تھی تو پہلے ہی سے ان کے دل و دماغ میں الٰہیات و تصوّف کا شوق پیدا کر دیا تھا کہ اس عالم میں بھی بے کیف و بے فیض نہ رہیں۔ قاعدہ ہے کہ اس حالت سے پہلے جیسے خیالات دل و دماغ پر چھائے ہوتے ہیں، وہی اس عالم میں جم جاتے ہیں اور زبان سے نکلتے ہیں۔ آزاد کو ہندوؤں کے فلسفہ و الٰہیات سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ ان کی اس عالم کی تصنیف **سپاک و نماک** میں بھی اس کا اثر ہے، اور یہ **فلسفۂ الٰہیات** تو اول سے آخر تک اسی رنگ میں ہے۔

فلسفۂ الٰہیات کو غور سے پڑھ کر دیکھا جائے تو آزاد کی بے ربطی اجزائے حواس میں بھی ایک قسم کی شیرازہ بندی نظر آتی ہے۔ زبان و انداز بیان سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو مضمون و موضوع کی صحیح ترتیب ہوش و حواس کا پتہ دیتی ہے۔ ابتدا میں تمہید ہے۔ اس کے بعد سات باب ہیں، جن کا نام ملاپ رکھا ہے۔ "ہر ملاپ" کا ایک عنوان ہے۔ کہیں عنوان کے نیچے موضوعِ باب کی تفصیل بھی لکھ دی ہے۔ پہلا ملاپ اس طرح شروع کرتے ہیں:-

پہلا ملاپ (اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جنھیں ہم دیکھتے ہیں، اور وہ ہیں اور سوچتے ہیں اور پاتے ہیں کہ ہیں)

پہلے ان میں مادّہ ہے۔ وہ ہے، اور وہ معدوم نہیں ہوتا۔ اسے کیسا ہی رگڑو یا کاٹ کر چاہو کہ وہ ایسا ہو کہ سمجھو اب نہیں رہا، یہ نہ ہوگا۔ وہ ایسا رَوَہ رَوَہ مہین ہو کر عالم اور آفاق میں پھیلا ہوا اُڑ رہا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا، اور وہ ہے! وہ کیا ہے؟ وہ **ہیولیٰ**۔ اس کے رَوے ایسے ننھے مہین ہیں کہ کسی قوّۃ حسّی سے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کو بھی چاہیں تو ایک کو دو اور دو کو چار کر ڈالیں، تو وہ رہیں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ کہیں اب معدوم ہو گئے۔ اسی کو ہم نے عرب میں کہا کہ ہر جزو مُجزّٰی ہے، جزوِ نامُجزّٰی محال ہے۔ اچھا، تم ایک جزو

نا مجھڑی لاؤ، ہم دوسرا ویسا ہی اور لیں گے۔ ان دو کی درز جہاں ملی ہوئی ہے
اوپر والے کی کسی جگہ پر ہو گی۔ وہیں سے کٹا اور دونوں ٹکڑے موجود۔ انھیں
پھر چاہو تو پھر اسی طرح کاٹ لو، اور کاٹتے چلے جاؤ، معدوم نہ ہوں گے۔ اچھا
قرعمیق میں ڈال کر تحلیل کرو۔ وہ نہ رہے گا، اور صورۃ میں ظاہر ہو گا، معدوم
نہ ہو گا۔ دھواں ہو جائے گا، ہوا ہو گا، نظر نہ آئے گا، پر ہو گا!

اس طویل عبارت میں کہیں بدحواسی نہیں محسوس ہوتی۔ اسی طرح اسی باب اول کا ایک دوسرا مسئلہ دیکھئے۔ کافی لمبا مضمون ہے اور بالکل مربوط۔ فرماتے ہیں۔

حرکۃ اسے نہیں کہتے کہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے، مسافت طے ہوئی، یا
پرندہ اُڑا، اور بلند ہوا، یا درخت اُگا اور بڑھتا چلا گیا، اور اسی طرح برعکس۔
حرکۃ ایک امر ہے معنوی کے اندر ہے۔ وہ ظہور میں آتا ہے، تب حرکۃ اس کی
معلوم ہوتی ہے۔ **ارسطو** نے اسے اور طرح بیان کیا ہے، اور **عرب** نے
لیا ہے، اور کہا ہے، هُوَ الْخُرُوْجُ مِنَ الْقُوَّةِ اِلَى الْفِعْلِ۔ یہ ہے حرکۃ۔
حرکۃ کو جب ہم سوچتے ہیں تو وہ ایک محرک کی محتاج ہے ہر وقت اسی واسطے ہم
اپنے میں حرکۃ کے لئے **ارادہ** کو ضروری جانتے ہیں اور یہ ان باتوں میں ہے
جو اپنے اختیار میں ہیں۔ جو اپنے اختیار میں نہیں اور اپنے میں نہیں ان میں جو
حرکۃ ہو **حرکۃ بالغیر** کہیں گے۔ محرک جب غیر ہو اور محسوس ہو تو **قاسر**
ہے۔ اور نہیں تو **قدرۃ الٰہی** ہے۔ وہ اگر عادۃ میں نہیں ہے تو **الٰہی**
ہے۔ اور نہیں تو **طبیعی** ہے۔ ہم طبیعی کو نہیں لیتے اور قسری کو بھی نہیں
لیتے۔ ارادی کو لیتے ہیں۔

ارادی حرکۃ ہماری دنیا کے کاموں میں ہمیشہ غیروں کی معاونۃ کو دیکھتی
ہے، کچھ بھی نہیں تو روپیہ، اور پانی، اور ہوا، سردی میں گرمی، گرمی میں سردی۔
یہ ضرورت تو بہت محتاج الیہ ہیں کہ بے ان کے گذارہ نہیں۔ ہم اپنی ارادی حرکۃ
میں ایسے ایسے غیروں کے محتاج ہیں۔ اگر ہم **الشعور** کی طرف متوجہ ہوں تو ہمارے

کام ہمارے اختیار میں ہوں، اور پھر جب ہم ایک طرف ہوں تو **ایشور** کی طرف ہوں۔ اس وقت جانو کہ ہماری **ارادی حرکت** کدھر کو ہونی چاہیے۔ بس وہ ارادہ **ایشور** کی طرف ہو۔ اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہیے۔

یہاں تک بالکل ہوش و حواس میں لکھنے کے بعد یکایک بہکنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد یہ انداز پیدا ہو جاتا ہے:-

اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہیے۔ ہم ہوں ادھر، اور ادھر، اور ادھر۔ وہ مقام نہیں معلوم ہوتا کہ **ایشور** کسی درجہ سے دَیا فرماتے ہیں۔ ہم کو اُدھر کا دھیان اور ان کا دھیان، اُدھر کا دھیان اور ان کا دھیان، اُدھر کا دھیان اور ان کا دھیان باندھنا چاہیے۔ اُدھر اور اُدھر۔ وہ مقام پھر معلوم نہیں کہ کس نقطہ سے **سری نارائن** کی دَیا شروع ہوتی ہے مگر ہوتی ہے، اور اعتقاد رکھنا چاہیے کہ ہوتی ہے۔ وہ ہوگا تو ہوگی۔ اور ہوگی۔ اور ہوگی۔

پوری کتاب میں ویدانت کی اصطلاحات فلسفہ و تصوّف کی تشریح ہے۔ جہاں جہاں خدا سے خطاب کرتے ہیں، ہر جگہ ایشور لکھتے ہیں۔ مسئلہ حلول و تناسخ کی طرف جابجا اشارے کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ایشور کا اوتار تصوّر کرتے ہیں۔ چنانچہ تمہید ہی میں لکھتے ہیں:-

ہم ہیں اپنے کام میں، تم ہوئے ناکام۔ دیکھو یہ ہے ہمارا کام۔ ہم ہیں کہ کرتے ہیں پورا **فلسفہ الٰہی** کو، اور دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں۔ تھے ہم **سری مہاراجہ جے چند** ہوئے ہم **پروفسر آزاد**۔

کتاب کا خاتمہ عجیب لکھا ہے۔ بیخودی میں خودی شامل ہے۔ فرماتے ہیں:-

ہم نے **پتا کا جامیا** (اس کے معنی خود آزاد نے "راہِ آگاہی" بتائے ہیں) کو یہاں ختم کیا۔ دیکھ **سری جے چند** تو ہے راجوں کا راجہ۔ **مہاراجہ**۔ یہ ہم نے کیا ہے تجکو۔ آج ہے تو ایسا، جو حکم ہم دیتے ہیں، تو جاری کرتا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ آج کے ۴ ہزار برس بعد تو ہوگا

پروفیسر آزاد اسی کتاب کو تو لکھے گا۔ اپنی زبان میں اسے **اردو** کہیں گے۔ **اردو** تیرا لشکر ہے۔ زبان کا نام یہ ہوگا۔ ہم نے جو کچھ بتایا ہے وہی تو نے لکھا ہے۔ ہم اس وقت ان سب کو ظہور دیں گے۔ پھر بھی کافر ایسے ہوں گے کہ ہماری **قدرۃ** کو نہ مانیں گے ...... اب ہم تجھے کہتے ہیں، تو ہے **پروفیسر آزاد**۔ لکھ تو اپنی طرف سے۔ **سری مہاراج** میں کیا عرض کروں، جو حضور سے ارشاد ہو وہی ہو۔ اچھا ہم کہتے ہیں۔ اے میرے **ایشور** تو نے کہا، تو نے لکھوایا، مجھ میں کیا طاقت ہے۔ تو نے کہا بس، میں نے کہا بس، یہی خاتمہ ہوگیا۔ (ہاں **پروفیسر آزاد**) لکھ آج ہے ۲۲ ماگھ بدی سمت ۱۸۵۳۔ جنوری کی پہلی سنہ ۱۸۹۶ عیسوی۔ ربیع الثانی کی ۲۶ سنہ ۱۳۱۶ ہجری۔ دن ہے بدھ کا۔ سنہ مہینے۔ مہینوں کی تاریخیں۔ دن کسی میں فرق نہیں۔ یہ ہے ہماری **حکمۃ**۔ جب ہم اپنا فلسفہ کام میں لائیں گے۔ ٹھیک وہی وقت ہوگا۔ جو ہم وعدہ کر چکے۔ یہی ہے! یہی ہے! یہی ہے! بس!

مولوی ذکاء اللہ

والد کا نام ثناء اللہ۔ سنہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں مولوی محمد حسین صاحب آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ساتھ ہوگیا۔ اور ان تینوں میں بڑے تعلقات اتحاد پیدا ہوگئے۔ مولوی ذکاء اللہ کو ریاضی سے خاص مناسبت تھی۔ ماسٹر رام چندر (جن کا ذکر اور نمونہ تصنیف پہلے آچکا ہے) ریاضی کے استاد تھے۔ اور اپنے اس لائق شاگرد پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ ذکاء اللہ صاحب اکثر اوّل نمبر پر کامیاب ہوتے تھے اور قابلیت کے وظیفے حاصل کرتے تھے۔ دو تمغے بھی اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر حاصل کئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اسی کالج میں معلّم ریاضی مقرر ہوگئے۔ پھر آگرہ کالج میں سات سال تک معلّم فارسی و اردو رہے۔ سنہ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے۔

گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ تین سال بعد اورینٹل کالج کی لکچراری کے لئے پروانہ تقرر آیا۔ لیکن اتفاق سے اس کے ساتھ ہی میور سنٹرل کالج الہ آباد کی پروفیسری بھی آپ کو پیش کی گئی۔ آپ نے الہ آباد کو ترجیح دی۔ اور ۱۵ سال اس کالج میں پروفیسر فارسی رہ کر ۱۸۸۵ء میں پنشن حاصل کی۔ پھر عمر کے باقی ۲۴ سال خانہ نشیں رہ کر تصنیف و تالیف میں گذار دیئے، اور ۷ ار نومبر ۱۹۱۰ء (شوال ۱۳۲۸ھ) کو دہلی میں انتقال کیا۔

مؤلفِ احقر نے آیۂ کریمہ سے تاریخ نکالی: وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۱۳۲۸ھ) سورہ بقرہ۔ رکوع ۱۶۔

ان کی وفات کے بعد ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ایک مضمون ان کے متعلق رسالہ تمدن دہلی (بابت اگست ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولوی ذکاء اللہ صاحب کے بعض خاص حالات لکھے ہیں۔ اس لئے "سیر المصنفین" سے اس مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کس قسم کے عالم پیدا کرے گی جو پانچ یونیورسٹیاں آج تک پیدا نہ کر سکیں۔ آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ ہوتے تو میں انھیں کو پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجۂ تکمیل کو پہنچ کر وماذالک علی اللہ بعزیز، ان جیسے عالم پیدا کر سکے گی، کریم النفس، وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، روشن دماغ، متنوع المعلومات، کثیر التصانیف، خیر خواہ عامۂ خلق، فیاض طبع، برٹش گورنمنٹ کے قدرشناس، ارادتمند، راسخ الاعتقاد، صلح کل، مرنجان و مرنج۔

مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ میرا ربط و ضبط بچپن سے شروع ہوا، جبکہ وہ دہلی کالج، یا دش بخیر، کی فارسی جماعت میں تھے، اور میں عربی میں۔ بااینہمہ ریاضیات میں ہم سبق تھے، ماسٹر رام چندر کے شاگرد۔ مولوی ذکاء اللہ

کی طبیعت کو ریاضیات کے ساتھ خدا داد مناسبت تھی، اور وہ جماعت میں سب سے پیش پیش رہتے تھے، اور اسی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے منظور نظر بھی تھے۔ اور چونکہ ماسٹر صاحب نے بڑے بڑے مباحثوں کے بعد عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا، ماسٹر صاحب کی ہمہ وقت کی ہم نشینی کے شبہہ سے لوگ مولوی ذکاء اللہ کو مذہب کی طرف سے متہم بھی کرتے تھے۔ لیکن میں مولوی ذکاء اللہ کا سب سے پُرانا ملاقاتی ہوں۔ ان کے معاصر جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اکثر مر چکے ہیں۔ ایک میں گراں جاں کسی مصلحت سے ارذل العمر کی سختیاں جھیلنے کو بچا ہوں، لیکن تابکے، بس اب بھی گواہی دیتا ہوں، اور مرکر بھی خدا کے حضور میں گواہی دوں گا کہ جہاں تک آدمی کو آدمی کے بطون کا علم ہو سکتا ہے، میرے علم میں مولوی ذکاء اللہ پکّے مُوَحِّد تھے، ایک صرف ایک خدا کے بجمیع صفاتہ الکمالیہ قائل، خیر یہ معاملہ تو بینہ و بین اللہ، میں مولوی ذکاء اللہ کی جس ادا کو ہمیشہ نظر استحسان سے دیکھتا رہا، وہ یہ تھی کہ حسد ان کو چھو تک نہیں گیا تھا۔ وہ علم ہی کو بڑی دولت اور بڑی حشمت سمجھتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر جو عمر طبعی سے متجاوز ہوئی طالب علمی میں صرف کی، اور پھر بھی نفس واپسیں تک ان کو علم سے سیری نہیں ہوئی۔ وہ علم کو علم ہی کے لئے حاصل کرتے، یعنی علم ہی ان کا مقصود بالذّات تھا، نہ ان فائدوں کی طمع سے جو علم پر متفرع ہوتے ہیں۔ انھوں نے مدرسے سے نکل کر نوکری کی حالت میں، اور نوکری بھی سررشتہ تعلیم کی نوکری، از خود انگریزی کا شوق کیا، اور اپنے مطالعہ سے بے مدد استاد اس کو اس درجہ تک پونہچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے ہچکچاتے تھے، مگر ان کی ہر طرح کی معلومات، جو انھوں نے انگریزی کی بدولت جمع کی تھی، اتنی وسیع تھی کہ بی۔اے اور ایم۔اے کو نصیب نہیں ہوتی۔ مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی بسوط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب لکھنے کے لئے کیسے فرصت پاتا تھا۔

مولوی ذکاء اللہ کی ایک اور ادا جس میں وہ منفرد تھے، ان کی مستقل مزاجی تھی کہ انھوں نے انگریزی کے اتنے تبحّر پر بال برابر اپنی وضع کو نہیں بدلا۔ اور وہ باوجودیکہ سید احمد خاں کے گویا پٹھو تھے، مگر انھوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی تک نہیں اوڑھی انگریزی جوتی تک نہیں پہنی۔ میں جاڑے کے دنوں میں ان کو بوڑھے بنیے کی طرح کارچوبی دار پائجامہ پہنے دیکھتا اور ہنسا کرتا۔

غرض مولوی ذکاء اللہ کی وضع ظاہر یا طرز ماندہ بود یا گفتگو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی اُن کو چھو بھی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو مذہبًا وہ بھی یقینًا مسلمان تھے، مگر ان کا دامنِ عقیدت لوثِ تعصب سے بالکل پاک تھا۔ وہ باہمی میل جول میں مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے۔ سب سے خلوص کے ساتھ ملتے، اور حاضر و غائب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے۔ یہ ان کے اس خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مرتے دم تک مولوی ذکاء اللہ سکرات کی سی بیقراری پادری صاحب کو تھی (یعنی ریورنڈ سی ایف اینڈ روز کو) بہ ظاہر دونوں میں کسی ایک کی کوئی غرض دنیاوی دوسرے سے متعلق نہ تھی، مگر دونوں نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا، اور ان کی باہمی محبت الحُبُّ لِلّٰہ کی قسم سے تھی "یہ مودۃِ اہلِ صفا بہ در رُو دچہ در قفا"

تصانیف اور ان کی قدر دانی

مولوی ذکاء اللہ کو ابتدا سے تعلیم و تعلّم اور خدمت علم و فن کا شوق تھا۔ اتفاق سے آپ کو ملازمتیں بھی اس شغل اور اسی صیغہ کی ملیں۔ ریاضی سے سب سے زیادہ مناسبت تھی تو سب سے زیادہ اسی فن کی کتابیں لکھیں۔ چونکہ ان کے زمانے میں تعلیم اردو زبان میں تھی، اس لئے ذکاء اللہ صاحب کی ریاضیات و طبیعات کی کتابیں سرکاری نصاب تعلیم میں داخل ہوئیں۔ اور اس خدمت کے صلے میں گورنمنٹ سے پندرہ سو روپیہ کا انعام ملا۔ اور شمس العلما، اور خان بہادر کے خطابات عطا ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹری کے زمانے میں تعلیم نسواں کی وسعت و اشاعت کے صلے میں گورنمنٹ نے خلعت بھی دیا تھا۔ ان کی اقسام تصانیف کی فہرست "سیر المصنفین" میں درج کی گئی ہے۔ اس سے نقل کی جاتی ہے:-

مضمون	تعداد تصانیف مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۶	۸۷
تاریخ و جغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم و ادب	۱۶	۰	۱۶
علم اخلاق	۶	۰	۶
طبیعیات و ہیئت	۷	۲	۹
سیاست مدن	۲	۵	۷
میزان	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

ان میں سے تاریخ ہندوستان کے ۱۸ حصے ہیں جن کے مجموعی صفحات ۷۱۶۹ ہیں۔ اس کے علاوہ سوانحمری ملکہ وکٹوریہ، کرزن نامہ، سوانحمری مولوی سمیع اللہ، تاریخ عہد انگلشیہ، آئین قیصری بہت سی کتابیں ایسی تصنیف کیں کہ ان سے پہلے ان موضوعات پر کسی نے لکھی تھیں۔

مستقل ضخیم کتابوں کے علاوہ مولوی ذکاء اللہ نے مختلف رسالوں اور اخباروں میں بے شمار مضامین لکھے، تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ، مخزن لاہور، زمانہ کانپور، رسالہ حسن حیدر آباد وغیرہ مشہور پرچوں میں بھی لکھتے رہتے تھے، اور شمس کلکتہ، فتیح بہار میسور وغیرہ غیر مشہور رسالوں کو بھی بے تأمل لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ کسی سے انکار نہ تھا۔

کثرت مطالعہ اور اس کام میں ضبط و استقلال کا یہ عالم تھا کہ اپنے دولت خانہ کوچہ چیلاں میں ایک مخصوص جگہ پر دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے، اور اتنی مدت اس جگہ بیٹھے کہ دیوار میں گڑھا ہوگیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں میں نے بھی اس "تکیہ گاہِ علم و فضل" کی زیارت کی تھی۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب کے ہم عصروں میں کسی ایک مصنف نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں نہیں لکھیں۔ لیکن یہ بخت و تقدیر کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اب انکی تصانیف کی طباعت اشاعت، قدر دانی و فیض رسانی کم سے کم ہے۔ انکی تصانیف ریاضی و سائنس ان کے زمانے میں شامل درسیات رہیں۔ پھر جب تمام اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم و امتحانات انگریزی میں ہونے لگے تو ان کی ضرورت نہ رہی تاریخوں اور جغرافیوں کا بھی یہی حال ہوا۔ سوانحمریاں ملکہ وکٹوریہ، لارڈ کرزن وغیرہ ایسے اشخاص کی تھیں جن سے عام دلچسپی بھی نہ تھی، اور انگریزی میں ان سے بہتر موجود تھیں۔ ان کی تاریخ ہندوستان، بے شک اپنی ضخامت و تفصیل و تحقیق کے سبب سے قابل قدر اور لائق مطالعہ تھی۔ لیکن ان کی طوالت و گرانی قیمت کے سبب سے عام لوگ اس سے مستفیض نہ ہو سکے۔ پھر ایک یہ بات بھی تھی کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی اکثر کتابیں، خصوصاً یہ تاریخ، نہایت معمولی کاغذ اور کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئیں، اور حسن ظاہری میں دلکش و بصارت نواز نہ رہیں۔ اب صرف ان کے مضامین کہیں کہیں درسی کتابوں میں داخل نظر آتے ہیں، اور بس۔

مولوی ذکاء اللہ کا طرز تحریر

مولوی ذکاء اللہ صاحب کی طبیعت میں اختراع و ایجاد کا مادہ بہت کم تھا۔ اس لئے ان کی تحریریں بجز صفائی و روانی اور تفصیل و تجزیہ کے زبان و طرز بیان کا کوئی لطف نہیں، بلکہ ان کی زبان میں محاورہ دہلی کا بھی مزہ نہیں ہے۔ ان کو غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی عادت تھی، اس لئے علمی، تاریخی، سیاسی، اخلاقی ہر قسم کے مضامین کو پوری وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ لیکن مسرت و الم، غصہ و نفرت، شوخی و ظرافت کے کسی موقع پر ان کے الفاظ سے ان کا جوش طبیعت بہت کم مترشح ہوتا ہے۔

ان کی اکثر تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ مضامین ان کی ذاتی فکر اور آزادانہ تحریر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

کہیں کہیں محاورۂ اردو کے خلاف فارسی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً تاریخ ہندوستان میں رانا اودے پور کے سلسلۂ ذکر میں لکھتے ہیں:۔

"سپاہ کشتہ و اسیر ہوئی، خویشوں نے مع منتسبوں کے اپنا سر پکڑا۔"

فارسی محاورہ ہے، "سر خویشتن گرفتند" یعنی اپنا اپنا راستہ لیا۔ ساتھ چھوڑ گئے۔ کبھی عوام کی زبان کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً "عزت و ناموری" کے مضمون میں کہتے ہیں:۔ "اشرافوں کا ممتاز کرنے والا کمال ہے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ "حضرت اکبر بادشاہ نے پنجاہ سال سلطنت کی۔" یہاں "پچاس" کا لفظ زیادہ فصیح تھا۔ اسی مضمون میں شہر اودے پور کے حال میں لکھتے ہیں:۔ "بڑی پر فضا اور خوش جا ہے" یعنی خوش وضع جگہ ہے۔ کبھی غیر متعارف یا کم مشہور لفظ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اسی بیان میں فرماتے ہیں:۔

"اس حسن خدمات کے جلدو میں راے سندر داس کو راے رایاں کا خطاب ملا۔"

"جلدو" کی جگہ انعام و صلہ اچھے خاصے لفظ تھے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کو الفاظ و عبارت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ جو قلم سے نکل گیا، نکل گیا۔

تاریخی کتابیں بڑی کاوش و تحقیق کے ساتھ لکھتے ہیں، چنانچہ خود اپنا طریق نگارش بیان کرتے ہیں:۔

"میرا قاعدہ ہے کہ میں سلاطین ہند کی تاریخ نویسی کے لئے وہ تواریخ لیتا ہوں جن کے مؤلف عہد نویس ہوں، اور وہ سب سے زیادہ معتبر و مستند سمجھی جاتی ہوں۔ ان سے تاریخی حالات اخذ کر کے لکھتا ہوں، اور پھر انگریزی تاریخوں سے جن کا ایک انبار میرے پاس موجود ہے، بعض مضامین التقاط کر کے لکھتا ہوں۔"

(تاریخ ہندوستان جلد ہفتم۔ احوال شاہجہاں)

یورپ کے مورخوں نے اپنی تواریخ ہند میں غلط بیانیاں کی ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے بقول اپنے، "ان تاریخوں کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے۔ اور ان کی غلطیوں کو بیان کیا ہے۔" لیکن یہ تصحیح

اغلاط زوردار الفاظ میں نہیں کرتے۔ انگریزوں کی خامیاں بیان کرنے میں جرأت سے کام نہیں لیتے۔

تصانیف کے نمونے (۱) **تاریخ ہندوستان** جلد ہفتم ظفرنامہ شاہجہاں میں رانا اودے پور سے محاربات شاہی کا حال لکھتے ہیں۔ ایک مقام کا مختصر اقتباس یہ ہے:-

رانا کا حال ایسا تنگ کیا کہ وہ ایک لحظہ کسی مقام میں آرام نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی مع اس کے بیٹے کے ساتھ، اہل وعیال اس کے، جابجا پڑے پھرتے تھے، خود تھوڑے آدمیوں کے ساتھ سرگرداں تھا۔ اور برسات کے موسم کا انتظار کرتا تھا کہ وہ راہوں اور گذرگاہوں کو پانی سے گھیرلے، اور مجھے دشمنوں کی آگ سے بچاوے۔

سلطان خرم نے کوہستان کی تنگناؤں میں تھانے بٹھادیئے تھے کہ جہاں رانا کی خبر پائیں، وہاں فوراً اس کے پکڑنے کو لشکر روانہ ہو۔ محمد شاہ کو کلنگ کے بتخانوں کی تخریب اور راجپوتوں کی تادیب کے لئے روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی تاراج شروع کی، اور بہت آدمیوں کو مارا اور قید کیا۔ رائے سندرداس سروہی کی طرف گیا، وہاں رانا کے اہل وعیال کا نشان اس کو بتایا تھا، مگر اس کے پہنچنے سے قبل چترمان رانا اہل وعیال کو دوسری جگہ لے گیا تھا۔ اس سرزمین میں رائے سندرداس نے قتل وغارت اور اسیر کرنے اور منازل ہنود کے خراب کرنے میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ بت خانوں پر راجپوت بڑے دلیرانہ لڑے، اور آخر کو جوہر کرکے مع اہل وعیال مرے۔ اس رائے نے بادشاہ کے حقوق کا پاس کیا اور اپنے آئین و کیش کا کچھ خیال نہیں کیا۔ بتوں کو جلایا اور بتخانوں کو ڈھایا۔

بدل با چناں مہر او خانہ ساخت　کہ ہندو بہ تخریب بت خانہ تاخت

اس حسن خدمات کے صلے میں رائے سندرداس کو رائے رایاں کا خطاب ملا، اور رفتہ رفتہ اس کا درجہ ایسا بڑھا کہ راجہ بکرماجیت کا خطاب مرحمت ہوا جس سے

بڑھ کر راجاؤں کے واسطے کوئی خطاب نہیں۔

شاہجہاں کے حال میں لکھتے ہیں:—

جب شاہجہاں نے تخت شاہی پر جلوس کیا، تو اس کو مراسم ملت مصطفوی و شریعت محمدیؐ کا جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا، ایسا پاس و لحاظ تھا کہ اول حکم اس نے یہ دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا، معبود حقیقی سزاوار ہے۔ اب آیندہ کوئی دوسرے کے لئے اپنی پیشانی کو خاک ذلت پر نہ رکھے، یعنی عہد اکبری میں بادشاہ کو جو سجدہ کرنے کا دستور تھا، وہ موقوف کیا۔ مہابت خاں خانخاناں نے معروض کیا کہ جہاں آفریں نے نظام عالم کے لئے اپنے بندوں کو مرتبہ نوازش و بزرگ داشت میں متفاوت پیدا کیا ہے۔ ایک کو اوج عزت و رفعت عنایت کیا۔ اور مرتبہ والا خداوندگاری اور پایہ بلند فرمانگذاری پر پونہچایا، اور مسند کامگاری و بختیاری پر متمکن کیا، اور دوسرے کو حکم پذیری اور فرماں برداری کے لئے پیدا کیا۔ اور ہر ایک کو استعداد کار کے اندازہ اور حالت روزگار کے موافق اس کے امور ضروریہ کے اتمام میں مدد و معاون بنایا۔ ایسے ہی مراتب تعظیم و تفاوت کو لوازم انتظام اور مراسم قوام عالم بنایا۔ اگر حضرت کو پرہیزگاری اور احکام الٰہی کی اطاعت کے سبب سے سجدہ ناپسند ہے تو اس کی جگہ زمیں بوس مقرر کیا جائے، جس سے مخدوم خادم ہیں، اور رئیس مرؤس میں، اور سلطان و رعیت میں استقامت امور جمہور کے لئے امتیاز نہ ہو۔ بادشاہ دیں پناہ نے اس کی ملتمس کو منظور کیا، اور یہ قرار دیا کہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کے پشت دست پر بوسہ دیں۔ اس کا نام "زمیں بوس" رکھا گیا۔ مگر اس میں بھی سجدہ کے ساتھ مشابہت ہوتی تھی، اس کو بھی موقوف کر کے تسلیم چہارم مقرر کی جس کا نام آگے آئے گا۔ اور سادات کو کہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں، اور فضلاء صلاح آثار اور درویشان پرہیزگار، اور زاویہ نشینان عبادت گذار کو اس زمیں بوس سے معاف کیا، اور یہ مقرر کیا کہ جس وقت بادشاہ سے ملاقات ہو تو "سلام علیکم" کریں، اور جب رخصت ہوں تو فاتحہ پڑھیں۔

(۲) **تاریخ عہد انگلشیہ** میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات بیان کرتے ہیں:—

اس نے اپنی سرکار کی خیر خواہی اور خیر اندیشی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر اس میں اس نے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا۔ جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا، تو اس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا آگا پیچھا نہیں سوچا۔ از راہ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا، اہل انگلستان نے اس کو بے سروسامانی سمجھا۔ اس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا کہ وہ عدالت اور صداقت کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا، اور مروّت و فتوّت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا۔ "گر ضرورت بود روا باشد" پر عمل تھا۔ وہ خود رائی کے سبب سے بر خود غلط اتنا تھا کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا، ہر کام اس کا ایک راز سربستہ اور سر پوشیدہ تھا کسی کام کی اصل و حقیقت کھلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ گو اس کے ظاہر ہو جانے سے نقصان نہو۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ ہر کام کو بڑے پیچ پاچ سے کرتا تھا۔ غرض اس میں جو خوبیاں تھیں وہ تحسین کے قابل تھیں، اور جو برائیاں تھیں وہ نفریں کے لائق۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ رعایا پروری، سپاہ کی دلداری، لوگوں کو اپنا کر لینا۔ رفاہیت عباد اور معموری بلاد کا خیال، یہ سب خوبیاں اس میں ایسی تھیں کہ وہ ایک طوطی خوش رنگ کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اپنی سرکار کی نمک شناسی کے سبب سے اس کی گنجینہ آمائی، دولت افزائی ایک ایسی بلّی اس میں تھی کہ وہ اس طوطی خوش رنگ کو نوچے کھاتی تھی۔ مگر اس بلّی کے بھنبوڑنے کے لئے اس کے پاس ایک کُتّا بھی موجود تھا، جو اس کی خود پرستی و خود رائی تھی۔ غرض یہ فضائل اور رذائل اس میں کام کر رہے تھے، جو ایک بڑے بند مکان میں طوطی اور بلّی اور کُتّا کام کریں۔

یہ تشبیہ نہایت درست و موزوں پیدا کی ہے۔

(۳) **مضامین ذکاء اللہ** یہ ادبی خدمت دوسری مستقل ضخیم تصانیف سے کچھ کم وقیع وگراں قدر نہیں ہے۔ سرسید کی طرح مولوی ذکاء اللہ

نے بھی مختلف ضروری موضوعوں پر بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ اور ہر مضمون اس قدر صحتِ فکر، قوتِ استدلال اور تفصیل و تشریح کے ساتھ لکھا ہے کہ حقیقت میں حق ادا کر دیا ہے۔ بعض مضامین انگریزی سے تقریباً لفظی ترجمہ ہیں، بعض انگریزی مضامین سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اکثر ان کی اپنی فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بیان کی متانت و سلاست جو اور تصانیف میں ہے، یہاں بھی ہے، بعض مضامین میں جدتِ تخیل اور لطفِ بیان ایسا ہے جو ان کی تاریخوں میں نہیں ملتا۔ چند مضامین سے مختصر اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:۔

(الف) **ادب**۔ ادب کے معنی اس ریاضت محمودہ اور کوشش و سعی کے ہیں، جس سے کسب فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں۔

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا کہ بے ادب اسے دیکھ کر با ادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے، وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے۔ جیسے آہوے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے، وہ اور آہوں کو پکڑ لاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے، اس کا فکر استاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے۔ تو لالہ و گل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو، نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں، وہ خردمندوں کے نزدیک نبرد صلاح ہے۔ اگر تمہاری داڑھی کوّوں کے پروں کی سی سیاہ ہو، تو بڈھوں کی بگلا کی سی سفید داڑھی کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گل عذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اسے نہ چڑاؤ کیونکہ کوئی بدصورت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سُرخ و سفید تھا، ایک زنگی پر ہنسا، تو زنگی نے جواب دیا کہ "میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے زیب ہے، اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے"۔

یہ عبارت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے اخلاق کی کسی فارسی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو۔

(ب) ذیل کا مضمون انگریزی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو مشہور مصنف بیکن نے لکھا ہے، بلکہ جا بجا اس کا لفظی ترجمہ ہے۔

کتب کا مطالعہ۔ مطالعہ تنہائی اور عزلت میں خوشی بخشتا ہے، گفتگو و تقریر میں حسن بیان پیدا کرتا، معاملات کے فیصلہ اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھاتا ہے۔ بس مطالعہ سے حسن بیان اور قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات مقدمات کو تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مگر مقدمات و منصوبوں کی ترتیب اور عام اصلاح کی تدابیر جیسی چاہئے، عالم و فاضل ہی کرتے ہیں۔

تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور ان کی باتوں کی تردید کریں گے یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کریں گے، یا ہم خود بہت باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصودِ اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے، پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی ان پر عمل کریں گے۔

بعض کتابوں کا صرف مزا چکھا جاتا ہے، یعنی ان میں سے کچھ کچھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض بالکل نگلی جاتی ہیں۔ یعنی کُل پڑھی جاتی ہیں مگر بے توجہی اور بے غوری سے۔ بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کے ہضم کی جاتی ہیں، یعنی اول سے آخر تک بڑی توجہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب سے جو کتابیں بنتی ہیں، ان کا حال آب مقطر کا سا ہے۔

(ج) مولوی ذکاء اللہ کی انشا پردازی، قوت تخیل اور جدت آفرینی کا ایک دلچسپ نمونہ ذیل کا مضمون ہے۔ بعض حصے حذف کر کے شروع سے آخر تک نقل کیا جاتا ہے:-

آگ۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنی مخلوق میں اپنی صفات کی نشانیاں عجب حیرت انگیز ادا سے دکھائی ہیں کہ انسان ان نشانیوں کو ذی نشان سمجھ کر اپنا معبود بناتا ہے، حقیقت تک عدم رسائی کی وجہ سے مجاز میں بالکل محو ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی ازلی الٰہی کتاب میں آگ (اگنی) کا بیان دیکھو تو تم کو معلوم ہو گا کہ وہ ایک نشان کبریائی دکھا رہی ہے، معبود بنی بیٹھی ہے، آدمیوں کو اپنا بندہ بنا کر پوجا کرا رہی ہے۔

ہمہ دانی کی صفت سے اس کی ذات موصوف ہو رہی ہے (یہ وہ صفت ہے کہ اللہ ہی کی ذات سے مخصوص ہے)۔ اس کی ذات کی نسبت وہ نکتے بیان ہو رہے ہیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے، اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی ذہانت کی ضرورت ہے۔

یہ مثل کہ "آگ میں مُوتو یا مسلمان ہو" ایسے محل پر بولی جاتی ہے، جہاں ہر طرح سے کام کرنے میں بُرائی ہی بُرائی ہو۔ آگ ہندوؤں کی معبود ہے۔ اگر اس میں مُوتے تو نرک میں پڑے، مسلمان ہو تو جہنم میں جاے۔ دونوں طرح سے خرابی ہی خرابی ہے۔ آگ ہندوؤں کی ایسی معبود ہے۔

زردشتیوں کی کتابوں میں آگ نور الٰہی کا ظہور دکھا رہی ہے۔ آدمیوں کے سر کو اپنے آگے سجدہ میں جھکا رہی ہے، اپنی پرستش کے لئے آتشکدے بنوا رہی ہے، جن میں بجنسہ درخشاں و تاباں رہتی ہے .... ارسطاطالیس نے استقراء سے اربعہ بسائط عنصریہ، خاک، باد، آب، آتش، قرار دئے، مگر عناصر کو بسیط حالت میں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ آتش حالت بسیط میں زمین پر معدوم اور کرۂ نار میں موجود۔ انسان کرۂ نار میں پونہچ کر کیونکر دیکھ سکتا ہے۔ خاک حالت بسیط میں زمین کے طبقۂ اولیٰ اور طبقۂ طینیہ کے نیچے بیٹھی ہے۔ تحت الثریٰ میں جا کر اس کی زیارت ہو سکتی ہے جو انسان کے لئے ناممکن ہے۔ ہوا بسیط حالت میں کرۂ ہوا کے طبقۂ سوم میں موجود ہے۔ انسان اگر پر لگا کے جاے تو اس کی قدم بوسی کر سکتا ہے، مگر یہ بھی ممکن نہیں۔ پانی تو کہیں حالت بسیط میں رل ہی نہیں سکتا۔

ارسطو کے نزدیک ان چاروں عنصروں کا مولد ایک ہی ہے۔ مگر محققین زمانۂ حال آگ کو ہیولیٰ سے خالی جانتے ہیں، اور اس کو مادی نہیں مانتے۔ حرکت سے کہتے ہیں کہ حرارت پیدا ہوتی ہے۔ آگ بھی اس حرارت کی ایک کیفیت ہے۔ ان مباحث میں ہنگامۂ سخن گرم کرنے سے مجھے اندیشہ ہے کہ قلم دیا سلائی بن کر

میرے ہاتھ کو نہ جلائے ....

آگ عجیب نامبارک اولاد ہے، پیدا ہوتے ہی ماں باپوں کو کھا جاتی ہے۔ جن لکڑیوں کی زناشوئی سے پیدا ہوتی ہے، انھیں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اور آپ ماں باپ کو مار کر زندہ رہتی ہے... **آگ** ہماری دشمنِ جانسوز بھی ہے اور دوست دل افروز بھی۔ وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے۔ مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لئے ہماری رنج و تکلیف دُور کرنے کے لئے، آسائش و آرام کے واسطے، صدہا ضروریات زندگی کے رفع کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے۔ ہمارے چولہے پر ماماگری کرتی ہے، اُپلے کنڈے جلا کر روٹی اور کھانا پکاتی ہے۔ آگ ہی نے انسان کو پکانا سکھایا ہے جس کے سبب سے وہ حیوانوں سے ممتاز ہو گیا ہے، جیسا انسان حیوانِ ناطق کہلاتا ہے، ایسا ہی پرندہ حیوان۔ کیونکہ حیوان اپنی ہنڈیا پکانے کے لئے آگ پر نہیں چڑھاتا۔ یہ تو حضرت انسان ہی عقل کے پورے ہیں کہ پھو پھو کر کے آگ روشن کرتے ہیں، اور اپنی خوراک پکاتے ہیں، اور اس کی دھونی سے آنکھوں کو اذیت پونہچاتے ہیں ....

جن ملکوں میں سردی کی شدت ہے اور برف کثرت سے پڑتی ہے، وہاں بغیر آگ اور ایندھن کے آدمی کا جینا مشکل ہو جاتا ہے...... انگلستان ایک سرد ملک ہے۔ اس کے اندر ہر گھر میں ایک آتش دان ہوتا ہے جس کے گرد گھر والے آگ تاپنے بیٹھتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں کو طرح طرح کے سبق سکھاتے ہیں۔ وہ بچپنے کی اُون کے ساتھ ایسے بنے جاتے ہیں کہ بڑھاپے تک ان کے تار و پود ٹوٹتے نہیں، دلوں پر وہ نقش جماتے ہیں کہ عمر کی درازی ان کو مٹا نہیں سکتی، وہ پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ امتدادِ زمانہ ان پر زنگ نہیں چڑھا سکتا۔ یونیورسٹی کے "آنرز" پانے والے بہت تھوڑے سے آدمی ہوتے ہیں، مگر آتشدانوں کے گریجویٹ سب ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں جو علم تحصیل ہوتا ہے

وہ ایک مدت کے بعد حافظہ میں پژمردہ و مُردہ ہو جاتا ہے، مگر اِن آتشدانوں کے گرد کا سبق پڑھا ہوا ہمیشہ زندہ و تازہ رہتا ہے۔

جاڑے کے موسم میں ہندوستان میں دیہات میں صبح شام رات کو دیکھو کہ ایک الاؤ جلتا ہے، جس کے گرد گنوار حلقہ باندھ کر خشک زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہیں اور چلم میں بہت سی آگ بھر کر ایک حقہ پر رکھتے ہیں، اور اس کا دور لگاتے ہیں۔ ایک ایک دو دو گھونٹ پی کر حقہ کی نے دوسرے منہ کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی اولاد کے بیاہ شادی کرنے کی، گائے بھینس کے بیاہنے کی، بھیڑ بکری کے پالنے کی، اور کھیتی کے بگڑنے سنورنے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ عجیب دلچسپ اور دل رُبا ہوتی ہیں۔ اگر کوئی اُن کو سُنے تو اس کو وہ علم حاصل ہو جو کبھی کتابوں سے نہیں حاصل ہو سکتا۔

اب تک ہم نے **آگ** کی دوستی کا بیان کیا۔ اب اس کی دشمنی کا ذکر سُنو کہ جب یہ مادر مہربان ہم سے خفا ہوتی ہے تو خدا کی پناہ! اس کے آتش ناک غصہ کے سامنے ساری مخلوق بھاگتی ہے، مگر وہ بھلا کب اس کو چھوڑتی ہے۔ اس طرح پکڑ لیتی ہے جیسے بھاگتے ہوئے لشکر کو دشمن پکڑ لیتا ہے، اور فنا کر دیتا ہے۔ جس چیز کو چھوتی ہے چاٹ کر سیاہ کر دیتی ہے۔ کھیتوں کو اس طرح کاٹتی ہے جیسے کہ نائی قینچی سے داڑھیوں کو تراشتا ہے جب درختوں کی رگڑ سے وہ پیدا ہوتی ہے تو جنگل کے جنگل جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ جب وہ بھڑکتی ہے اور اپنے شعلے ہوا میں اُڑاتی ہے تو سمندروں کی لہروں کی کیفیت دکھاتی ہے۔ سمندر میں بھی وہ فاسفورس کی روشنی کے جلوے خوب دکھاتی ہے۔ جہاں آگ ہو کر گذر جاتی ہے، وہ جگہ دھواں دھار ہو کر تاریک ہو جاتی ہے۔ وہ دھوئیں کا تاج سر پر لگا کے اور شعلوں کے بال بنا کے تاریکی کو دور کر دیتی ہے۔

غرض **آگ** بھی عجیب چیز ہے کہ زمین پر نار ہے، آفتاب میں نور ہے، آسمان پر بجلی ہے، لوہے اور چقماق میں شعلہ ہے۔ گرم ملک والوں نے جو

جہنم بنایا ہے، اس میں وہ گنہگاروں کی تعزیر کے لئے ایک سخت عذاب ہے۔ بسرو ملک والوں نے جو جنت بنائی ہے اس میں نکوکاروں کے تاپنے اور آرام کرنے لئے جاں فزا ہے۔

خدانخواستہ اگر آتش دنیا سے معدوم ہو جائے تو بہت سے کام دنیا کے ٹھنڈے ہو جائیں۔ نہ چونہ پکے کہ اینٹ پتھر کو جوڑے، نہ ریت سے منہ دیکھنے کا شیشہ بنے۔ غرض عالم کے حسن کے بڑے حصے میں گرماگرمی اور دل فریبی نہ رہے، اس کا جوبن خاک میں مل جائے، اسکی بہار پر خزاں آجائے۔

آگ اپنے تئیں کھاتی ہے اگر اس کو کوئی چیز کھانے کو نہ ملے اَلنَّارُ تَأْكُلُ نَفْسَهَا اِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَأْكُلُهٗ۔ **آگ** خاکستر ہو کر بہت آدمیوں کو کھلاتی ہے اَلنَّارُ کَثِیْرُ الرَّمَادِ لِاَنَّهَا تُطْعِمُ الْعِبَادَ۔

"آب و آتش را چہ آشنائی" آگ پانی کو بخار بنا کر اڑاتی ہے، اس طرح اپنے دل کا بخار نکالتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے، اس لئے کہ یہ عنصر انسان کے کاموں میں ہمیشہ زیادہ آئے، ہوا کو اس کا خدمت گار مقرر کر دیا ہے کہ اس پر پنکھا جھلا کرے۔

مولوی نذیر احمد

والد کا نام مولوی سعادت علی ہے۔ ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء (۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۲ھ) کو پیدا ہوئے۔ وطن اصلی موضع ریہڑ تحصیل نگینہ ضلع بجنور ہے۔ شاہ عبدالغفور اعظم پوری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں۔ اعظم پور ضلع بجنور میں ہے۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے مشاہیر اولیاء اللہ میں تھے۔ مولوی نذیر احمد کی ننھیال بھی علماء کے خاندان میں تھی جو شاہی زمانے میں قاضی رہ چکے تھے۔ چار برس کی عمر میں والد کے ساتھ بجنور آگئے۔

ابتدائی تعلیم ابتدائی تعلیم کچھ مکتب میں اور کچھ والد سے حاصل کی۔ والد خود بڑے

عالم تھے۔ ۹ برس کی عمر تک انھوں نے فارسی عربی پڑھائی، پھر مولوی نصر اللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور سے پانچ سال تک عربی نحو، منطق، فلسفہ پڑھا۔ ۱۴ برس کی عمر تھی کہ والد ان کو لیکر دہلی آئے، اور مدرسہ مسجد اورنگ آبادی کے فاضل مدرس مولوی عبدالخالق کے سپرد کر گئے، یہاں مولوی نذیر احمد نے بالکل طالب علمانہ زندگی بسر کی، جس کا حال مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد صاحب کی زبانی اس طرح لکھا ہے :-

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبری ہاتھ میں لے، گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی، کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھدی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں، ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے قدم رکھا، اُدھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی، نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اُٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی ...... بہرحال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔" (از مضمون مطبوعہ رسالہ اُردو)

دہلی کالج کی تعلیم

اس طالب علمی اور ٹکڑ گدائی سے مولوی نذیر احمد خوش اور مطمئن نہ تھے، لیکن طلب علم کی خاطر گوارا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن دہلی کالج میں تقسیم انعام کا جلسہ تھا۔ یہ بھی اتفاق سے اُدھر جا نکلے۔ تماشائیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ یہ گر پڑے اور چوٹ لگ گئی۔ حُسنِ اتفاق سے کالج کے پرنسپل نے دیکھ لیا، اور ان کو اُٹھا کر بڑی ہمدردی و شفقت کی اور پوچھا، کیا پڑھتے ہو؟۔ انھوں نے کہا شرح مُلّا اور ابو الفضل پڑھتا ہوں۔ جلسے کے بعد

پرنسپل کے کہنے سے مفتی صدرالدین خاں صاحب نے شرحِ ملا میں مولوی نذیر احمد کا امتحان لیا، انھوں نے نہایت عمدہ جواب دئے۔ پرنسپل نے کالج میں داخل[۵] کرلیا اور چار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کردیا جو بڑھتے بڑھتے چوبیس روپیہ ماہوار ہوگیا۔ اس وظیفے کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں:-

"مجھ کو مرحوم دہلی کالج میں اپنا وظیفہ پانا یاد ہے۔ جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں نے اور نہ صرف میں نے بلکہ ہمارے سارے خاندان نے اسکو سلسلۂ ملازمت کا آغاز سمجھا۔"

دہلی کالج میں مولوی ذکاء اللہ ان کے ہم جماعت تھے۔ مولانا نذیر احمد کو ریاضی اور تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، لیکن وظیفہ کی خاطر پڑھتے تھے۔ کالج میں داخل ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا اور محنت سے پڑھنے لگے۔ آخر ۱۸۵۴ء میں آٹھ سال کی تعلیم کے بعد کالج چھوڑا۔ کالج کی تعلیم کے متعلق

---

۵ نذیر احمد صاحب کے کالج میں داخل ہونے کا سال ۱۸۴۵ء ان کی سوانح عمری "حیات النذیر" میں اور اس سے "سیر المصنفین" وغیرہ تذکروں میں درج کیا گیا ہے اور بہت تذکروں نے ان کا سال ولادت بھی ۱۸۳۶ء لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۹ برس کی عمر تک والد سے اور اس کے بعد ۵ سال مولوی نصراللہ خاں سے تعلیم پاکر بجنور سے دہلی آئے۔ اس حساب سے دہلی آنے کے وقت ان کی عمر ۱۴ سال کی ہوتی ہے۔ تو ولادت کے سال مذکور کے حساب سے ۱۸۵۰ء میں دہلی آئے۔ پھر ۱۸۴۵ء کالج میں داخل ہونے کا سال کیونکر ہوسکتا ہے۔ اس سال ان کی عمر ۹ سال کی ہوتی ہے۔ ان سنوں کی تاویل و تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ مولانا کا سالِ ولادت ۱۸۳۶ء انکی بڑی عمر میں اور ملازمت کی حالت میں کسی پنڈت نے ان کا جنم پتر بنا کر بتایا تھا۔ خود ان کو اپنا سال ولادت ۱۸۳۳ء یاد تھا، اور یہی سال انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست میں لکھا تھا۔ قراین و حالات سے یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ سنہ ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۴۹ھ کے مطابق ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مسلمان عموماً ہجری سال سے واقعات کا حساب لگایا کرتے تھے۔ اس حساب سے مولانا جب ۱۴ سال کی عمر میں دہلی آئے تو ۱۲۶۱ھ یا ۱۲۶۲ھ ہوگا۔ اور یہ ۱۸۴۴ء کے مطابق ہے۔ اس طرح کالج میں داخل ہونے کا سال ۱۸۴۵ء ہوسکتا ہے۔

خود لکھتے ہیں:۔

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگذر)، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد علیٰ بصیرۃ، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں، اور جو حقیقت میں ثمرۂ زندگی ہیں، ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا، مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔"

جس زمانے میں نذیر احمد صاحب مولوی عبدالخالق صاحب سے پڑھتے اور ان کے گھر کا کام کیا کرتے، ان کی خورد سال پوتی کو گود میں لئے پھرنا اور اس کی ٹہل کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ خوبی تقدیر سے آخر بڑے ہو کر اسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ مفتی صدر الدین صاحب نے نکاح پڑھایا اور گیارہ ہزار کا مہر باندھا گیا۔ پھر مولانا نے ایک اور نکاح اپنے کنبے میں والدہ کے اصرار سے کیا۔ لیکن اس سے نباہ نہ ہو سکا۔ اور طلاق پر معاملے کو ختم کرنا پڑا۔

ملازمت | ۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات (پنجاب) میں چالیس روپیہ ماہوار کے مدرس ہوے۔ دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور آگئے۔ یہاں انگریز انسپکٹر سے نہ بنی، اس لئے استعفا دے کر دہلی چلے گئے۔ ابھی دہلی پونہچے نہ تھے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر برپا ہو گیا۔ یہ بھی غدر کے مصائب میں بتلا رہے۔ اتفاق سے اس ہنگامہ میں نذیر احمد صاحب نے ایک میم کی جان بچائی۔ غدر کے بعد اس خدمت کے صلے میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد مقرر ہوے۔

الہ آباد میں نذیر احمد صاحب منشی عبداللہ خاں صاحب امین عدالت کے مکان پر مقیم ہوے۔ منشی صاحب انگریزی جانتے تھے۔ ان کی ترغیب سے انھوں نے بھی انگریزی پڑھنی شروع کی، اور کافی قابلیت پیدا کر لی۔ مولانا نے ایک لکچر میں انگریزی پڑھنے کے سلسلے میں کہا تھا:۔

"میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں۔
والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے، مگر اپنے وقت کے بڑے دیندار، صاف
کہدیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول، مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں"

اسی زمانے میں گورنمنٹ نے ان کو قانون انکم ٹیکس کے ترجمہ کی خدمت سپرد کی۔ یہ ترجمہ بڑی قابلیت سے کیا۔ اس کے بعد تعزیرات ہند کے ترجمہ کا کام ملا۔ اور اس کے صلے میں کانپور کی تحصیلداری ملی۔ دو برس تحصیلدار رہے۔ ترجمہ ختم ہونے پر ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر بنا دئے گئے۔ پھر ایک انگریزی علم ہیئت کی کتاب کا ترجمہ سموات کے نام سے کیا۔ اور یہ ترجمہ تنقید و نظر ثانی کی غرض سے ریزیڈنٹ حیدر آباد کے ذریعہ سے امیر کبیر مدار المہام ریاست کے پاس بھیجا گیا۔ امیر کبیر علم ہیئت و ریاضی کے بڑے ماہر تھے، (اس داستانِ تاریخ اردو کے صفحہ ۲۳۵ پر اُن کا ذکر آچکا ہے) مولوی نذیر احمد کا ترجمہ بہت پسند کیا گیا، اور ان کی غیر معمولی ذہانت و قابلیت نے ایسا اثر پیدا کیا کہ سر سالار جنگ نے ان کو حیدر آباد بُلا لیا۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی اور نواب محسن الملک کے خطوط مولوی نذیر احمد کے پاس آئے کہ سر سالار جنگ آپ کی خدمات حیدر آباد کے لئے منتقل کرانا چاہتے ہیں۔ پھر سر سید احمد خاں کے ذریعہ سے سرکار نظام کی طرف سے تحریر موصول ہوئی کہ بالفعل ۸۵۰ روپیہ اور پھر ایک ہزار بیس روپیہ ماہوار بحساب سکہ انگریزی ملیں گے۔ مولانا اس وقت اعظم گڈھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ رخصت لیکر دہلی ہوتے ہوئے حیدر آباد چلے گئے۔ ۲۷ر اپریل ۱۸۷۷ء کو وہاں پہونچ کر نواب محسن الملک کے پاس قیام کیا۔

حیدر آباد میں ترقی کرتے کرتے "بورڈ آف ریونیو" کے ممبر ہو گئے۔ سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہو گئی۔ سر سالار جنگ بیحد قدر و عزت کرتے تھے۔ اس زمانے میں میر محبوب علی خاں بہادر نظام دکن نابالغ تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے سر سالار جنگ نے مولوی نذیر احمد صاحب سے خاص طور پر نصاب تعلیم مرتب کرایا لیکن یہ کتابیں

شائع نہ کی گئیں۔

قیام حیدر آباد کے زمانے میں نذیر احمد صاحب کو قرآن مجید حفظ کرنے کا خیال ہوا، اور اپنے بے نظیر حافظہ کی مدد سے چھ مہینے میں پورا قرآن یاد کر لیا۔

سر سالار جنگ نے اپنے فرزند لائق علی خاں کو مولوی نذیر احمد کی شاگردی میں دیدیا وہ اور مہاراجہ کشن پرشاد دونوں ان کے مکان پر پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد لائق علی خاں سالار جنگ ثانی ہوئے چونکہ مولوی نذیر احمد ان کے استاد رہ چکے تھے، بعض لوگوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ مولوی صاحب شاگرد پر اپنا اثر نہ ڈالیں، اس لئے ان لوگوں نے استاد کی طرف سے شاگرد کے کان بھرنے شروع کئے۔ ان کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی، موقع دیکھ کر پنشن لیکر دہلی چلے آئے۔ حیدر آباد میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ چھوٹ جانے کا بہت قلق تھا۔ اب یکسو ہو کر علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

انعامات و خطابات "مراۃ العروس" اور "توبۃ النصوح" پر ایک ایک ہزار روپیہ انعام گورنمنٹ سے ملا۔ پہلی کتاب پر ایک گھڑی بھی ملی۔ ۱۸۹۷ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ قرآن مجید کا ترجمہ چھپنے پر اس کی ایک جلد مولانا نے سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کو انگلستان بھیجی۔ اس عظیم الشان علمی خدمت کے اعتراف میں ۱۹۰۲ء میں اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری پیش کی۔ پھر ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری دی۔

شغل سود و تجارت مولوی نذیر احمد کی ابتدائی زندگی عسرت میں گزری تھی، اس لئے انکی طبیعت میں کفایت شعاری کا مادہ اور دولت کی قدر پیدا ہو گئی تھی۔ تجارت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لئے خود بھی تجارت میں روپیہ لگاتے تھے اور دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو محض اعتبار پر روپیہ دیدیتے تھے۔ خود انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ "اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں۔" اپنے روپیہ پر کھلم کھلا سود لیتے تھے۔ ایک روپیہ سیکڑہ شرح سود مقرر تھی۔ اپنی تصنیف

الحقوق والفرائض میں مسئلہ سود پر بحث کی ہے، اور اس کو جائز بتایا ہے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ نہایت جزرس و کفایت شعار تھے، یہاں تک کہ بخیل مشہور ہو گئے تھے اور دوسری طرف اس قدر سادہ مزاج اور صاحب مروت تھے کہ نہ جائداد کی نگرانی کرتے تھے۔ نہ تجارت کی دیکھ بھال، اور روپیہ بے تکلف قرض دیتے رہتے تھے۔ اس ترکیب سے بڑی دولت لوگوں نے اڑا لی۔ چنانچہ وفات کے بعد امید سے بہت کم روپیہ نکلا۔ حالانکہ صرف پنشن کا روپیہ ڈھائی لاکھ ہوتا ہے۔ بینک میں نقد روپیہ پچاس ہزار تھا۔ جائداد ملاکر ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ کی مالیت نہ تھی۔

شوخی و ظرافت | بچپن سے نہایت ذہین اور شوخ طبع تھے۔ یہی کیفیت آخر عمر تک رہی۔ بچپن میں چلبلی طبیعت کے سبب سے ایک وقت میں ایک جگہ بیٹھ کر حجامت نہ بنوا سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور بھاگ گئے۔ پھر پکڑے آئے اور حجامت بنی۔ لڑکپن میں مولوی عبدالخالق کے گھر کا مسالہ پیسنے میں دق کیا کرتے تھے۔ پھر بڑے ہو کر نوکر ہوئے اور قانون انکم ٹیکس کا ترجمہ سپرد ہوا تو اسمیں بابو شیو پرشاد انسپکٹر مدارس شریک ہو گئے۔ مولانا خود ہی ترجمہ کرنا چاہتے تھے، لیکن بابو صاحب کے ماتحت تھے۔ اور کچھ نہ کرسکے تو ان کو پریشان کرنا شروع کیا۔ بابو جی ترجمہ بولتے تھے۔ یہ لکھتے۔ درمیان میں انھوں نے پوچھا "لکھ چکے؟" مولانا نے یہ لفظ بھی لکھ دیا۔ انھوں نے پڑھوا کر سنا تو یہ لفظ بھی پڑھ دیا۔ وہ خفا ہوے اور کہا "یہ داخل گستاخی ہے"۔ انھوں نے یہ فقرہ بھی درج کردیا۔ آخر انسپکٹر صاحب عاجز آ گئے۔

مولانا کے بعض لطیفے قابل ذکر ہیں۔ (۱) ایک مرتبہ سر سالار جنگ ثانی نواب لائق علی خاں بہادر شملے سے علی گڈھ جاتے تھے۔ مولانا غازی آباد کے اسٹیشن پر جاکر ملے۔ انھوں نے باتوں میں یہ بھی کہا کہ آپ ناحق حیدر آباد سے چلے آئے اب بھی وہیں چلئے"۔ مولانا نے فرمایا "نمک خوار سرکار ہوں، گر معافی کا

خواستگار رہوں۔ اب جس حال میں ہوں وہی میرے لئے مناسب ہے۔ ایک مرتبہ حیدر آباد جاکر تو پنشن پر نکالا گیا۔ اب دوسری مرتبہ جاؤں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پنشن بھی کھو آؤں"۔ سر سالار جنگ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

(۲) حیدر آباد سے آکر دہلی میں قیام کیا تو انگریزی حکام ان کی خدمات اور کارناموں سے واقف نہ تھے۔ ایک مرتبہ دہلی میں کوئی جلسہ ہوا۔ ڈپٹی کمشنر نے اہل دہلی کو بلانے کے لئے ایک معمولی فہرست گشت کرائی۔ ان میں ان کا نام بھی تھا۔ انھوں نے فہرست کے حاشیے پر یہ لکھ دیا:—

"اگر یہ سرکاری طلبی ہے تو سمن یا وارنٹ آنا چاہئے۔ دوستانہ بلاوا ہے تو چٹھی آنی چاہئے۔ اور یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں اور آنا نہ آنا میری مرضی پر منحصر ہے، تو میں نہیں آسکتا۔"

ڈپٹی کمشنر اس تحریر کو دیکھ چونکا اور تحصیلدار سے پوچھا۔ جب ان کا حال معلوم ہوا تو تحصیلدار سے کہا کہ تم نے پہلے مجھ سے کیوں نہ کہا کہ میں چٹھی لکھتا۔ چنانچہ اس نے الگ خط لکھ کر بلایا۔ اور زبانی معذرت کی۔

(۳) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا، اور مولوی نذیر احمد تقریر کر رہے تھے۔ اسی درمیان میں لارڈ کچنر کمانڈر انچیف افواج ہند جلسہ میں آئے۔ تھوڑی دیر بیٹھے، کچھ تقریر کی اور رخصت ہو گئے۔ ان کے اٹھتے ہی مولانا پھر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اور ابھی لارڈ صاحب اسٹیج سے اترے ہی تھے کہ انھوں نے فرمایا۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (حق آیا، باطل دور ہوا۔ بے شک باطل جانے ہی والا تھا) یہ سن کر سارا مجمع ہنس پڑا۔ لارڈ کچنر مصر میں رہ چکے تھے۔ عربی خوب جانتے تھے۔ دل ہی دل میں اس پھبتی کا مزہ لیا ہوگا۔

(۴) اس کانفرنس کی صدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں نے قبول کر لی تھی۔ لیکن آنے میں دیر ہو گئی تھی اور جلسہ شروع ہو گیا تھا۔ مولوی نذیر احمد کا لکچر ہو رہا تھا

کہ سر آغا خاں آ گئے۔ وہ ایسے خوبصورت اور شاندار جوان تھے کہ اپنے جمال و وجاہت سے تمام جلسے پر چھا گئے۔ نواب محسن الملک نے مولانا کا سر آغا خاں سے تعارف کرایا۔ ان کے ہاتھ میں لکچر تھا۔ تعارف ہوتے ہی لکچر میز پر رکھ دیا، اور بڑی متانت کیساتھ آغا خاں سے خطاب کر کے فرمایا:-

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

تمام جلسہ یہ شعر سن کر پھڑک گیا۔ سر آغا خاں بھی منہ پر رومال رکھ کر ہنستے رہے۔ حاضرین نے مولانا سے بار بار پڑھوا کر سُنا۔

(۵) ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ کابل ۱۹۰۶ء میں ہندوستان آئے۔ عید الفطر ۱۳۲۴ھ کی نماز دہلی میں پڑھی، جمعہ کا روز تھا۔ نماز کے بعد دربار کیا اور مخصوص مشاہیر دہلی و ہند کو ملنے کے لئے بلایا۔ ان میں مولوی نذیر احمد بھی تھے۔ یہ جب امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُن کو دیکھتے ہی عرب شاعر متنبی کا یہ شعر پڑھا ؎

عِیدٌ[۱] وَعِیدٌ وَعِیدٌ صِرنَ مُجتَمِعَہ   وَجہُ الحَبِیبِ وَیَومُ العِیدِ وَالجُمُعَہ

(۶) حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی بورڈ قائم ہوا تھا۔ اس کے تین ممبر تھے۔ مولوی دلیل الدین خاں، منشی اکرام اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد۔ ان میں سے مولوی دلیل الدین خاں بسیار خوار مشہور تھے۔ منشی اکرام اللہ خاں شوقین مزاج آدمی تھے، اور مولوی نذیر احمد کی کفایت شعاری بخل کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے مولوی نذیر احمد سے بورڈ کے ممبروں کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے کہا، "ہم ارکانِ ثلٰثہ کُلُوا[۲] وَاشرَبُوا وَلَا تُسرِفُوا کے مصداق ہیں"۔

(۷) نواب محسن الملک عربی کے بڑے عالم نہ تھے۔ اور مولوی نذیر احمد مشہور ادیب

[۱] تین عیدیں ساتھ جمع ہو گئی ہیں، روئے حبیب، یوم عید اور جمعہ۔ [۲] یعنی کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو۔

اور نواب صاحب میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ایک روز حیدرآباد میں "مولویت" کا ذکر آگیا۔ کسی نے نواب صاحب کو "مولوی مہدی علی" کہا۔ مولوی نذیر احمد بولے کہ "اگر مہدی علی مولوی ہیں، تو یہ جو سامنے کھڑا ہے یہ بھی مولوی چاند خاں ہے۔" چاند خاں ان کا قدیم ملازم تھا۔ لمبی داڑھی تھی اور صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔

قوت تقریر

حیدرآباد سے آکر مولوی نذیر احمد صاحب نے تصنیف وتالیف کے علاوہ قومی کاموں میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ قدرت نے ان کو غیر معمولی قوت بیان عطا کی ہے۔ چنانچہ پہلی ہی تقریر نے وہ اثر پیدا کیا اور مقبولیت حاصل کی کہ پھر ان کے بغیر کوئی مجلس گرم نہ ہوتی تھی۔ آواز، لہجہ، انداز بیان سب ایسے پائے کے تھے کہ ان کے جادو سے تمام جلسہ مسحور ہو جاتا تھا۔ اہل مجلس کو ہنسانا، رلانا، ان کے اختیار میں تھا۔ چندے کی اپیل اس طرح کرتے تھے کہ حاضرین کی جیبیں جھاڑ لیتے تھے کتنا ہی بڑا مجمع ہو ان کو چیخنے چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف بلند آواز سے تقریر کرتے اور دور تک پہنچ جاتی۔ اکثر اپنی تقریر پہلے سے چھپوا لیتے اور اس کی مطبوعہ کاپی ان کے ہاتھ میں ہوتی، لیکن تقریر میں تحریر کے پابند نہ رہتے۔ کہتے چلے جاتے اور سامعین کو بھی اپنی رَو میں بہا لیجاتے۔ سننے والے نفس مضمون سے زیادہ ان کے لب و لہجہ، فصاحت بیان اور طاقت لسان کے گرویدہ ہوتے تھے۔ اور ان کے لطائف وظرائف کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ نہ مولانا اپنی رَو میں اصل مضمون کی طرف لوٹ کر آتے نہ سامعین اس کے منتظر رہتے۔ وقت ختم ہو جاتا، مولانا بیٹھ جاتے اور حاضرین کو حسرت رہتی کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

یہ بات ان کے ہم عصروں میں سے کسی میں نہ تھی۔ سرسید اور نواب محسن الملک اصول تقریر اور فن خطابت کے اعتبار سے مولوی نذیر احمد سے بہتر تھے۔ لیکن مجمع عام کے لئے ان کی تقریر اُن سے زیادہ شاندار اور دلکش ہوتی تھی۔

اس پر طرّہ یہ کہ سرسید اور محسن الملک دونوں سے زیادہ، بلکہ تمام مقرّروں سے زیادہ مولوی نذیر احمد اپنی تقریر میں عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور محاورے، عربی کے فقرے، اشعار اور آیتیں جابجا استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی ان کے طرز ادا، جوش بیان و فصاحت زبان کے سبب سے تقریر کی دلکشی میں فرق نہ آتا تھا۔ اس طرح انھوں نے اپنی اس خداداد قابلیت سے بھی ملک و قوم کی بڑی خدمت لی۔ مولانا طبعاً بیباک اور عادتاً دریدہ دہن واقع ہوئے تھے۔ صاف گوئی میں کبھی حد سے گزر جاتے تھے، اور تلخ گوئی پر اتر آتے تھے لیکن سامعین ان کی خاطر سے اس کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔

وفات | مرنے سے چند مہینے پہلے علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ کمزوری بڑھتی گئی۔ باہر آنا جانا، ملنا جلنا چھوڑ دیا، اور علاج کی بھی توجہ نہ کی۔ سمجھتے تھے کہ وقت آ گیا ہے۔ آخر فالج ہوا، اور چار پانچ روز بعد ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو جمعہ کے روز رحلت کی۔ خاکسار مؤلف نے قرآن مجید سے تاریخ وفات نکالی:-

لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَالِدِيْنَ[۵] فِيهَا أَبَدًا

۱۳۳۰ھ (سورۂ توبہ رکوع ۳)

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف | ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے مولوی ذکاء اللہ صاحب کی کثرت تصانیف پر تعجب ظاہر کیا ہے۔ وہ خود بھی بسیار نویسی اور زود نویسی میں کسی سے کم نہ تھے۔ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں جن میں بعض ان کی اوّلیات میں شامل ہیں کہ ان سے پہلے اس طرز اس موضوع پر کسی نے قلم نہ اٹھایا تھا۔ مثلاً زنانہ لٹریچر اور اس میں ناول کا طرز۔ ترجمۂ قرآن مجید کی سلاست اور تسلسل۔ الحقوق والفرائض میں مضامین قرآن کی ترتیب۔ قانونی کتابوں کے ترجمے۔ یہ سب ان کی بے نظیر جودت طبع اور جدت فکر کے شاہد ہیں۔

---

[۵] قرآن مجید کا الفاظ خلدین بغیر الف ہے۔ میں نے ایک عدد کا اضافہ کرنے کے لئے الف سے خالدین لکھ دیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف کا سلسلہ بڑے دلچسپ طریقے سے شروع ہوا ہے۔ اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:۔

"میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ... ڈھونڈھا تلاش کیا۔ کہیں پتا نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے مرآۃ العروس۔ چھوٹی کے لئے منتخب الحکایات بشیر کے لئے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سانم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں، بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دے۔ گروہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے، اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی، وہ ورق کے لئے متقاضی تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔" (دربارِ لکچر ڈپٹی نذیر احمد)

اس کے بعد نذیر احمد صاحب ان کتابوں کی شہرت و اشاعت کا قصہ بیان کرتے ہیں، وہ بھی عجیب اتفاق اور پُر لطف واقعہ ہے۔ یعنی ڈپٹی صاحب کے چھوٹے صاحبزادہ بشیر الدین کی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سے کہیں ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے لڑکے سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو۔ بشیر الدین نے مذکورۂ بالا کتابوں کا نام بتایا۔ ڈائرکٹر صاحب نے تعجب سے کہا کہ اُردو میں ان ناموں کی تو کوئی کتابیں نہیں ہیں۔ لڑکے نے کہا کہ یہ کتابیں ابا نے میرے اور آپا کے لئے لکھی ہیں۔ صاحب نے کہا اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور مرآۃ العروس، منتخب الحکایات اور چند پند کے قلمی نسخے لے آیا۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کتابوں کو دیکھا اور مرآۃ العروس کو بہت پسند کیا۔ اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ اس پر ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی گھڑی انعام میں ملی۔ اس کے بعد تصانیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ناول (زنانہ لٹریچر)

(۱) مرآۃ العروس مطبوعہ ۱۸۶۹ء

(۲) بنات النعش (مرآۃ العروس کا دوسرا حصہ) جس میں لڑکیوں کو دستکاری اور علمی زندگی کی ترغیب دی ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۳ء

(۳) توبۃ النصوح جس میں سچی اسلامی زندگی کی تعلیم ہے۔ اس پر بھی ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

(۴) محصنات یا فسانۂ مبتلا مطبوعہ ۱۸۸۵ء

(۵) ابن الوقت مطبوعہ ۱۸۸۸ء۔ غدر کے زمانے کا قصہ۔ انگریزی اور ہندوستانی و اسلامی معاشرت کا مقابلہ۔

(۶) رویائے صادقہ۔ دہلی کے قدیم شریف خاندان کی زندگی۔

(۷) ایامیٰ، جس میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت و فوائد بیان کئے ہیں۔

(۲) اخلاق

(۱) منتخب الحکایات۔ (۲) چند پند۔ (۳) موعظہ حسنہ

(۳) مذہب

(۱) ترجمہ قرآن مجید۔

(۲) الحقوق و الفرائض۔ ۳ حصے ۱۹۰۶ء میں لکھی۔

(۳) الاجتہاد۔ عقائد اسلامی کا عقلی ثبوت ۱۹۰۸ء / ۱۳۲۴ھ میں لکھی۔

(۴) اُمّہات الامّہ۔ از دواج مطہرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات۔

(۵) ادعیۃ القرآن۔ اس میں قرآن مجید کی تمام دعائیں ایک جا کر دی ہیں اور ان پر مفید حاشیے لکھے ہیں۔

(۴) منطق

(۱) مبادی الحکمت۔ اس رسالے میں علم منطق کی تعلیم کا جدید و دلچسپ طریقہ اختیار کیا ہے، جو منطق کی مروّجہ درسی کتابوں سے مختلف ہے۔ مثالیں بھی نئی نئی تلاش کی ہیں جن سے

کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مصنف ۱۸۷۱ء ۱۲۸۸ھ

(۵) علم ہیئت

(۱) سمٰوات۔ اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ گورنمنٹ نے اس پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ ۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ میں ترجمہ کی۔

(۶) قواعد

(۱) ما یغنیك فی الصرف۔ (۲) صرف صغیر۔ عربی قواعد کے متعلق لکھیں۔

(۷) متفرق

(۱) رسم الخط۔ (۲) نصاب خسرو۔ (۳) فسانۂ غدر۔ (۴) مجموعۂ لکچر۔ (۵) نظم بے نظیر نذیر۔ (ان کی نظموں کا مجموعہ)

قانونی کتابوں کے ترجمے ان کے علاوہ ہیں۔ آخر عمر میں مطالب القرآن کے نام سے ایک ضخیم تصنیف کا آغاز کیا تھا لیکن تمام نہ کر سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا طرز تحریر

علامہ آزاد کی طرح مولانا نذیر احمد بھی صاحب طرزِ خاص ہیں، اور ان کا طرز تحریر بھی سب سے الگ اور نرالا ہے کہ چند سطروں سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ ڈپٹی صاحب کی تحریر ہے۔ خالص دہلی کی زبان اور محاورے استعمال کرتے ہیں۔ زنانہ ناولوں میں شریف مستورات کی بہترین زبان اور انداز اختیار کیا ہے۔ طرز بیان نہایت صاف، واضح اور زور دار ہوتا ہے۔ روانی اور بیساختگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ بات کو سمجھانے کے نئے نئے طریقے پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کی سی رنگین عبارت نہیں لکھتے، لیکن حسب موقع کبھی استعارہ و تشبیہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ انکے اسلوب میں ایک اجتماع اضداد عجیب ہے کہ ایک ہی تحریر میں کہیں نہایت مغلق و گراں عربی کے الفاظ و تراکیب و محاورات لکھتے ہیں، اور دوسری جگہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خاصکر لکچروں میں انگریزی کے الفاظ اور محاورے بھی جا بجا لے آتے ہیں، اگرچہ یہ اکثر بیجا ہوتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے طرز تحریر کی ایک نمایاں خصوصیت، جس میں ان کا کوئی ہم عصر شریک نہیں ہے، ان کی ظرافت ہے۔ ظریفانہ رنگ کا ناولوں اور تقریروں میں زیادہ موقع تھا۔ وہیں ہے اور بہت دلچسپ و خوشگوار ہے۔ ظرافت کو حد اعتدال سے بڑھنے نہیں دیتے۔ اور صحیح موقع پر صرف کرتے ہیں۔

طرز نذیر احمد کی بے اعتدالی

ڈپٹی نذیر احمد بڑے ذہین و طباع تھے۔ بچپن سے طالب علمی شروع کر دی تھی۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ اخذ کرنے اور محفوظ رکھنے کی عادت تھی۔ زبان و محاورہ اور ادب و انشا سے فطری مناسبت و دلچسپی تھی، اس کے ساتھ ہی چونکہ اصلی دہلوی نہ تھے اور دہلی کو وطن بنانا تھا، اس لئے دہلی کی زبان کو اہل زبان کی طرح حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لڑکپن اور آغاز شباب ہی میں پہلے طالب علمی اور پھر شادی کے سبب سے دہلی کے شریف خاندانوں میں آمد و رفت اور ارتباط پیدا ہو گیا۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے زبان دہلی کے تمام لوازم و محاسن بہت جلد حاصل کر لئے۔ پھر تصانیف کے سلسلے میں اتفاق سے سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کے لئے زنانہ فسانے لکھے، اور ان میں ہو بہو زنانہ زبان لکھی۔ یہ زنانہ لٹریچر عرصہ تک پے در پے تیار کرتے رہے۔ ہندی کی چندی اور بال کی کھال نکالنے کا طبعاً شوق تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر کتاب میں ایک ایک بات کو نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب کی طبیعت و تحریر دونوں میں صاف بیانی، گھریلو روزمرہ، زنانہ انداز بیان اور ٹھیٹ زبان راسخ ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ یہ احساس جاتا رہا کہ یہ طرز تحریر ہر تصنیف کے لئے موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جب انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا مذہبی کتابیں، سیرت و سوانح مرتب کئے، تو ان میں بھی عامیانہ بول چال، محاورے، کہاوتیں لکھ دیں۔ اور ایسا اسلوب بیان اختیار کیا جو کہیں اس موضوع و فن کے مناسب

نہ رہا، اور کہیں بزرگان دین۔ نبئ کریم، اصحاب کرام، اہل بیت اطہار (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی شان کے خلاف ہو گیا۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں :۔

(۱) الحقوق و الفرائض میں سب سے پہلا فقرہ یہ لکھتے ہیں :۔

"کسی نے کیا اچھی، تُلی ہوئی، باون تولے پاؤ رتی بات کہی ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا تو اُس نے اپنے پروردگار ہی کو پہچانا) یعنی اپنے نفس کی معرفت خدا کی دلیل ہے۔"

اس اقتباس کا پہلا جملہ حقوق و فرائض جیسے سنجیدہ موضوع کے لئے بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اس تمام کتاب میں عقائد و اعمال، حقوق اللہ و حقوق العباد اپنے اسی بے تکلف اسلوب اور زبان و محاورہ میں لکھے ہیں جس میں اس طرح کے مضامین زنانہ ناولوں میں فسانہ کے بڑے بوڑھے مردوں اور عورتوں کی زبانی لڑکوں لڑکیوں کے لئے بیان کئے ہیں۔ یہ انداز متانت موضوع کے لحاظ سے درست نہ سہی، لیکن اگر کوئی شخص ساری کتاب اسی رنگ میں لکھے تو اعتراض ہلکا ہو جاتا ہے۔ بہر حال فقرۂ مندرجہ میں کوئی سوء ادب نہیں۔ لیکن ڈپٹی صاحب کو یہ طرز بے محل اختیار کرنے میں بھی باک نہ تھا۔ مثلاً

(۲) الاجتہاد میں تذکرۂ ہجرت میں لکھتے ہیں :۔

"خدا کا کرنا، پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معلوم ہو گیا۔ اندھیرے میں چُپکے سے سٹک گئے۔"

(۳) اسی کتاب میں پھر لکھتے ہیں :۔

"اب تم ان حالات حقۂ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کسی مفاد کو توقع کر سکتے تھے۔ اسی دعوے نے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی کہ ؎

بھڑکی تو مدتوں سے مادات ہو گئی گالی لکھو نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی

باقی ہے مار کھانی توسن ہو گئے ایک دن　　اس کی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

(اسی دعوے نے ان کو شہر بدر کرایا۔" (الاجتہاد ص۵۳)

(۴) اُمہات الاُمہ میں اخلاقِ نبی کریمؐ اور اسباب نکاح کے تذکرے میں ہجرت کے متعلق یہ فقرہ لکھتے ہیں۔

"........ تقویت اور حمایت اور حفاظت نہوتی تو رسالت کی بیل ایک گھڑی بھی منڈھے چڑھنے والی نہ تھی۔ مگر صداقت کے بھروسے پر پیغمبر صاحب تیرہ برس دشمنوں کے نرغے میں چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کئے۔ یہاں تک کہ آخر کو پاۓ ثبات جگہ سے اکھڑ گئے اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی۔"

اس بے ادبی و گستاخی کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی "سٹک گئے" "گت بنوائی تھی" "چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کئے" جیسے محاوروں کا اور اس قطعے کے چسپاں کرنے کا یہ محل نہ تھا۔ لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے ذہن سے فرق مراتب اُٹھ گیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ ان کو ادب ملحوظ نہ تھا یا قصداً بے حرمتی کی۔ بلکہ اپنے طرز تحریر کی عادت کے سبب سے ان محاوروں کو ایسے موقع پر بھی وہ ادب و احترام کے منافی نہ سمجھتے تھے، اور یہی ان کے نفس عقل کا دھوکا تھا۔ ان رکیک اور سوقیانہ الفاظ سے اس ذاتؐ گرامی کو ارفع و اعلیٰ، اقدس و اطہر سمجھنا چاہیے تھا۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس طرح کے الفاظ، محاورے اور مثال جب ڈپٹی صاحب نے ناولوں کے فرضی اشخاص کے یا اپنے متعلق لکھے ہیں تو ناموزوں اور ناگوار نہیں معلوم ہوتے مثلاً ایک لکچر کے آغاز میں اپنا حال بیان کرتے ہیں:-

"نہ مجھ کو شعر گوئی کا شوق ہے اور نہ سلیقہ، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ماںڈ تو بھتیرا بیٹھنا چاہتی ہے مگر رنڈ وے نہیں بیٹھنے دیتے۔ جب جب کوئی صاحب مجھے لکچر دینے بلاتے ہیں، اور بلانے والے تو بہت ہیں، اس لئے کہ انجمنوں اور

سالانہ جلسوں اور لیکچروں کا تو دوڑ بہ کھل پڑا ہے، مگر میں اپنے لیکچروں کی ہوا نہیں اُکھڑنے دیتا کہ گلیوں گلیوں کام بڑھئی کام بڑھئی پکارتا پڑا پھروں۔“

(لیکچر ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۰ء بمقام ریاست رامپور)

یا مثلاً الاجتہاد میں اپنے آپ کو خطاب کر کے لکھتے ہیں:۔

”تم اپنی ہستی کو کیوں بھولتے ہو، تو گدھی کمہار کی، تجھے رام سے کو تہ۔

کہاں راجہ بھوج، کہاں بھجوا تیلی“

لیکن جب ایسی باتیں خدا و رسُول کی زبان سے نکلواتے ہیں تو نہایت نازیبا ہو جاتی ہیں۔ جیسے توبۃ النصوح میں اللہ تعالیٰ کا قول نصوح کے لئے لکھا ہے:۔

”نہ خر نا مشخص کہ ہم تو دیں نون، وہ کہے میری آنکھیں پھوٹیں“

اسی طرح کی بے اعتدالیاں قرآن مجید کے ترجمہ میں کی ہیں۔ اس طرز تحریر میں ایک ذراسی بات تھی جس کو ملحوظ رکھنے سے یہ تمام تصنیفات بے عیب ہو جاتیں، اور جس کا خیال نہ کرنے سے یہ اعتراضات واقع ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنی ہر نوع و موضوع کی کتاب اپنے مخصوص بے تکلف اسلوب میں لکھنا چاہتے تھے۔ اس اصول پر اعتراض سہی، لیکن بے اصولی کے علاوہ کوئی اعتراض نہ ہو سکتا اگر احترام و ادب کے موقع پر صرف سادگی و صفائی کو قائم رکھتے، ابتذال و سوقیت نہ برتتے۔ اور خدا و رسول اور بزرگان دین کے متعلق رکیک محاورے نہ لکھتے۔ انھوں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں۔ فقرے کے فقرے، صفحے کے صفحے بزرگوں کے تذکرے میں ایسے بھی لکھے ہیں جن میں قابلِ اعتراض زبان نہیں ہے تو ممکن و سہل تھا کہ وہاں بھی نہ ہوتی جہاں ہے۔ اس سے ان کے اسلوب خصوصی میں کوئی فرق نہ آتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ ڈپٹی صاحب کو اس کا احساس ہی نہ رہا تھا۔

دوسرا پہلو بے اعتدالی کا یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی کے الفاظ

بڑی کثرت سے بالکل بے ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات لکچروں میں زیادہ ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ بھی انھوں نے سامعین کی دلچسپی اور دل لگی کے لئے اختیار کیا تھا۔ اگرچہ ان کی تقریر اس کے بغیر بھی ہمیشہ دلکش ہوتی تھی۔ انگریزی الفاظ کا استعمال سب سے پہلے سرسید نے شروع کیا تھا، لیکن ان کے ہاں ناگوار کثرت نہ تھی۔ مولانا حالی نے بہت زیادہ استعمال کئے، اور مولانا نذیر احمد نے تو انتہا کردی۔ سرسید کچھ شُدبُد انگریزی جانتے تھے۔ حالی اتنی بھی نہیں۔ نذیر احمد اچھے خاصے ماہر تھے۔ ان کو اس نئی زبان سے نئی دلچسپی پیدا ہوئی تھی، اس کی اشاعت و ترغیب ان کے کانفرنسی لکچروں کا مقصود تھا۔ انگریزوں اور انگریزی دانوں کو خوش کرنے کا بھی شوق تھا۔ غرض انھوں نے اپنے ابتدائی لکچروں ہی سے انگریزی الفاظ کا استعمال شروع کردیا۔ اور پھر اس کو اتنا بڑھایا کہ مفرد الفاظ کے علاوہ، مرکبات، محاورے، جملے، ضرب الامثال بھی بے تکلف لکھنے بولنے لگے۔ یہ ذکر بے ضرورت، بلاوجہ اور غیر مشہور الفاظ کا ہے۔ مثلاً

۱۔ محمدن کالج کو انٹیٹی[۵۱] یا کوالیٹی[۵۲] کسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے درد کی کافی دوا نہیں۔

۲۔ یہ ایسا زبردست ثبوت ان کی فیور[۵۳] میں ہے۔

۳۔ جن صفتوں کے مجموعے کا نام اسلام ہے نیچرلی[۵۴] اس بات کے مقتضی ہیں۔

۴۔ اس امام کے ہاتھ پر فارملی[۵۵] بیعت کرو۔

۵۔ انگریزوں کی طرح کی ہائی لائف[۵۶] نہ رکھیں

---

۵۱ کمیّت۔

۵۲ کیفیت۔

۵۳ حمایت۔

۵۴ طبعاً یا فطری طور پر۔

۵۵ حسب آئین۔

۵۶ اونچی شاندار زندگی۔

۷۔ انگلش ہیبٹس[۵۱] کا مُنہ چرانے لگے ہیں

۸۔ .... مقلّد ہیں، غیر مقلّد ہیں، اور دی لاسٹ دو ناٹ دی لیسٹ[۵۲] بڑے غل غپاڑے بڑے جوش و خروش کے نئی قسم کے مسلمان نیچری ہیں۔

(جملہ اقتباسات از لکچر ایجوکیشنل کانگریس منعقدہ دسمبر ۱۸۸۹ء بمقام علی گڈھ)

۹۔ اپنے تئیں خیر الاخلاف بعد الاسلاف ورددی آف دیر فور فادرز[۵۳] بنانے کی کوشش کریں۔

۱۰۔ آڈینس[۵۴] قرآن سے اُوور ڈوسڈ[۵۵] ہوگیا ہے۔ (لکچر ۱۹۰۰ء بمقام رامپور)

اسی طرح عربی کے الفاظ و مرکّبات بالکل بے ضرورت، صرف اپنے شوق و عادت کے سبب سے بے تکلّف لکھتے ہیں۔ آیات قرآنی یا عربی امثال و اشعار کا ذکر نہیں۔ وہ تو ڈپٹی صاحب کی تحریر کا خاص جوہر ہیں۔ بلکہ وہ عربی کے الفاظ و محاورات اجزائے جملہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ بغیر ان کے جملہ پورا نہیں ہوتا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً

۱۔ جس کے افراد کے دلوں میں وللاکثر حکم الکل[۵۶] منافست کی ذرا سی گدگدی بھی نہو، میں نہیں سمجھتا کہ ایسی قوم کا کوئی شخص بھی کسی بات پر بھی فخر کرسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم مسلمانوں میں بالنسبۃ الیٰ اقوام اُخر[۵۷] شخصی عزتیں بہت کم ہیں مگر ہیں۔

۲۔ کچھ اس طرح کا ٹیڑھا وقت آگیا ہے کہ اس زمانے کے اسلام اور خوشدلی میں

---

[۵۱] انگریزی طریقے اور عادتیں۔

[۵۲] سب سے آخری اگرچہ سب سے کم وقعت نہیں۔

[۵۳] یہ انگریزی پہلی عربی کی مترادف ہے۔ یعنی اپنے اسلاف کی شان کے لائق۔

[۵۴] مجمع حاضرین۔

[۵۵] وہ مریض جس کو مقدار سے زیادہ دوا پلا دی گئی ہو۔ یعنی حاضرین جلسہ کو ضرورت سے زیادہ قرآن سُنایا گیا ہے۔

[۵۶] اور اکثر کے لئے کُل کا حکم ہے۔ [۵۷] دوسری اقوام کے مقابلے میں۔

مانعتہ الجمع کی سی نسبت قائم ہوگئی ہے۔ بعضہم وقلیل ماھم جن کو خوش ہونے کا موقع ہے، خدا کا فرمودہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ[۵۱] ان کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتا۔

۳- یا ایک چھوٹا سا ضلع کیفما اتفق[۵۲] اختیار کرو اور تحقیقات کرکے ایسے لوگوں کی فہرست بناؤ جو صاحب زکوٰۃ ہیں۔ (جملہ اقتباسات از لکچر ۱۸۸۹ء)

تیسری بات یہ کہ ڈپٹی صاحب مضمون کی تکرار بہت کرتے ہیں، اور بات کو بیچ دیگر فقرے کو بہت طویل کر دیتے ہیں۔ یہ انداز خطیبانہ ہے۔ خطبوں اور لکچروں کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ لیکن ڈپٹی صاحب اپنی ہر تصنیف میں یہ طرز برتتے ہیں۔

چوتھے، ہر قسم کی تصانیف میں محاورات و امثال کی کثرت کے سبب سے متانت و وقار قائم نہیں رہتا۔ یہ چیزیں، جہاں شوخی و بے ادبی کی حد تک نہیں پہونچتیں، وہاں بھی عبارت و اسلوب کا وقار کھو دیتی ہیں۔ یہ انداز روزمرّہ کی بے تکلف گفتگو کا ہے اس لئے ناولوں کے علاوہ کسی کتاب میں اختیار کرنے کا نہ تھا۔ حد یہ ہے کہ ترجمہ قرآن مجید بھی کہیں کہیں پایۂ متانت سے گر گیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اس طرز عبارت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے، اور وہی اس کی تاویل ہے۔ وہ یہ کہ نذیر احمد صاحب نے اپنی کتابیں مورخ و سیرت نگار اور مفتی و مفسر کی حیثیت سے نہیں لکھیں، بلکہ ادیب و انشا پرداز کی حیثیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس لئے ان کے ناول و قصص اور فقہ و سیرت سب کا ایک رنگ بیان ہے۔ یہی توجیہ و معذرت مولوی محمد حسین آزاد کے طرز تحریر کے لئے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں دونوں صاحبوں کا مرتبہ صرف زباندانوں و انشا پردازکا رہ جاتا ہے۔ مورّخ و محقق کی شان باقی نہیں رہتی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ادبیات اور مرتبہ

(۱) ڈپٹی صاحب سے پہلے کا تمام اردو لٹریچر ہمارے سامنے ہے۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کی کتابیں مفقود ہیں۔ نذیر احمد

---

[۵۱] بعض لوگ اور وہ تھوڑے ہیں۔

[۵۲] جو کوئی ہو۔ یعنی کوئی ضلع ہو۔

پہلے مصنف ہیں۔ جنھوں نے زنانہ لٹریچر اس اہتمام و کثرت کے ساتھ مُہیّا کیا۔ یہ کتابیں اپنی جامعیت اور حُسن ترتیب میں اُردو زبان اور نذیر احمد کی اوّلیات میں داخل ہیں۔ اور نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی آج تک بے مثال و ناگزیر ہیں۔ نذیر احمد کے بعد صرف راشد الخیری نے قدیم تہذیب معاشرت کو اپنی زنانہ تصانیف میں زندہ رکھا ہے۔ اب عورتوں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔

(۲) اُردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی صاحب ہیں۔ بعید از قیاس داستانوں کی جگہ اصلی واقعات اور صحیح معاشرت کو قصّہ کی صورت میں پیش کرنے کا انہی کے سر سہرا ہے۔ اُردو کے دوسرے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ ان کا فسانۂ آزاد دسمبر ۱۸۷۸ء سے اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اور ۱۸۸۰ء میں بصورت کتاب چھپا ہے۔ لیکن نذیر احمد صاحب کا پہلا ناول مرآۃ العروس فسانۂ آزاد سے دس برس پہلے ۱۸۶۹ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اور دوسرا ناول بنات النعش بھی سرشار کے فسانہ سے پہلے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔

(۳) ترجمۂ قرآن مجید ایسی سلاست، شگفتگی اور تسلسل کے ساتھ نذیر احمد کی ایجاد ہے اور ترجمہ کو مقابل کے صفحے پر چھاپنا دلچسپ جدّت۔ اب صرف ترجمہ کے صفحے کے صفحے بے تکلف پڑھتے چلے جائیے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلسل و مربوط کتاب پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات کسی قدیم ترجمہ میں نہ تھی۔ بعد کے ہر ترجمہ میں ہے۔ اور یہ نذیر احمد صاحب کا فیضان ہے۔

(۴) عقائد و مسائل اسلامی کا استنباط و ترتیب قرآن و حدیث سے جس طرح نذیر احمد صاحب نے الحقوق وغیرہ میں کیا ہے، یہ بھی انھیں کی اختراع ہے۔ بعد کو اس کی بھی تقلید ہوئی اور ہو رہی ہے۔

(۵) زبان و انشا پردازی کا جو لطف و مزہ ان کی تمام تصانیف میں ہے وہ ڈپٹی صاحب کا انفرادی و امتیازی رنگ ہے۔ اور **شوخی و ظرافت** کے وہ تنہا مالک ہیں۔

اس لئے ڈپٹی نذیر احمد بھی **موجد و صاحب طرز** کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے احسانات اردو زبان و ادب پر نہایت گراں بہا ہیں۔

نمونہ تصانیف

(۱) **مرآۃ العروس**، نذیر احمد کا پہلا مکمل زنانہ ناول ہے۔ دہلی کے شریف خاندان کی معاشرت ہو بہو نقشہ کھینچا ہے۔ یہ فسانہ اسقدر مشہور و مقبول ہوا کہ اس کے افراد قصہ اصغری، اکبری اور ماما عظمت آج تک زبان زد ہیں اور مثال میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مرآۃ العروس کی مقبولیت کا ذکر ڈپٹی صاحب نے نبات النعش کے دیباچے میں کیا ہے:۔

"مرآۃ العروس کو پہلے پہل چھپے ہوئے اب تیسرا برس ہے، اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہوا ہے۔ اسی دو سوا دو برس میں اس کی کوئی آٹھ نو بلکہ دس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، اور ہر سمت سے طلب اور ہر طرف سے مانگ چلی آ رہی ہے۔ ایک بابو صاحب اپنی بنگالی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ ایک پنڈت جی مہاراج بھاکا میں۔ اور نہ میری استدعا و فرمایش سے، بلکہ اپنی آرزو و خواہش سے۔ پسند و قبول کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی۔"

ان فسانوں میں مکالمہ کا طرز تحریر قدیم داستانوں سے جداگانہ ہے اور نذیر احمد صاحب نے اس کو پہلی مرتبہ اردو میں پیدا کیا ہے۔ یہ اسلوب انگریزی میں ناول کا نہیں۔ بلکہ ڈرامے کا ہے کہ کسی فرد قصہ کا نام آغاز سطر میں لکھ کر اس کے آگے اس کی گفتگو لکھی جائے۔ انگریزی ناول کا طرز مکالمہ نذیر احمد صاحب کے زمانے میں انگریزی زبان و ادب سے ناآشنا لوگوں میں مقبول ہونا دشوار تھا۔ اس لئے ڈرامے کا انداز اختیار کرنا مناسب تھا۔ یہ چیز ایسی مقبول ہوئی کہ شرر و سرشار سے لیکر اب تک اسی کی تقلید ہو رہی ہے۔ بیسویں صدی کے ادب جدید میں مختصر فسانے اور بعض ناول انگریزی مکالمے کے طرز میں البتہ لکھے گئے ہیں۔ اور اب عادت کے سبب سے نامانوس نہیں رہا۔

نذیر احمد صاحب کی ایک وضع خاص یہ بھی ہے کہ ناولوں میں طویل اخلاقی وعظ و تقریر ضرور داخل کرتے ہیں۔ مرآۃ العروس بھی اس سے خالی نہیں۔ اس کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرور سوچنا چاہئے کہ ماں باپ سے الگ ہوئے پیچھے اُن کی زندگی کیونکر گذرے گی دنیا میں بہت بھاری بوجھ مردوں کے سر پر ہے دنیا میں کھانا کپڑا اور روزمرہ کے خرچ کی سب چیزیں روپیہ سے حاصل ہوتی ہیں اور یہ سب کھڑاگ روپیہ کا ہے۔ عورتوں کو بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکثر کمانے اور روپیہ پیدا کرنے کی محنت سے محفوظ رہتی ہیں۔ دیکھو مرد کیسی کیسی سخت محنت کرتے ہیں کوئی بھاری بوجھ سر پر اُٹھاتا ہے کوئی لکڑی ڈھوتا ہے۔ سُنار لہار۔ ٹھٹھیرا۔ کیرا۔ کندلہ گر۔ زرکوب۔ دبکیہ۔ تارکش۔ ملمع ساز۔ جڑیا۔ سلمہ ستارے والا۔ بٹیہ۔ بدرساز۔ مینا ساز۔ قلعی گر۔ سادہ کار۔ صیقل گر۔ آئینہ ساز۔ زردوز۔ منہیار۔ نعلبند۔ نگینہ ساز۔ کامدانی والا۔ سان گر۔ نیاریا۔ ڈھلیا۔ بڑھئی۔ خرادی۔ ناریل والا۔ کنگھی ساز۔ بنس پھوڑ۔ کاغذی۔ جلاہہ۔ رفوگر۔ رنگریز۔ چھیپی۔ درزی۔ دستاربند۔ علاقہ بند۔ نیچہ بند۔ موچی۔ دھرکن۔ سنگتراش۔ حکاک۔ معار۔ دیگر۔ کمہار۔ حلوائی۔ تیلی۔ تنبولی۔ رنگساز۔ گندھی وغیرہ جتنے پیشے والے ہیں سب کے کاموں میں برابر درجے کی تکلیف ہے۔ اور یہ تمام تکلیف روپیہ کمانے کے واسطے مرد سہتے اور اٹھاتے ہیں لیکن اس بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ عورتوں سے سوائے کھانے اور سو رہنے کے کوئی کام دنیا کا متعلق نہیں ہے بلکہ خانہ داری کے تمام کام عورتیں کرتی ہیں مرد اپنی کمائی عورتوں کے آگے لاکر رکھ دیتے ہیں اور عورتیں اپنی عقل سے اس کو ایسے بندوبست اور سلیقے کے ساتھ اُٹھاتی ہیں کہ آرام کے سوائے عزت اور نام پر حرف نہیں آنے پاتا۔ بس اگر غور سے دیکھو تو دنیا کی گاڑی جب تک ایک پہیہ مرد کا اور دوسرا پہیہ عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی۔ مردوں کو روپیہ کمانے کے

بعد اتنا وقت نہیں بچتا کہ اس کو گھر کے چھوٹے کاموں میں صرف کریں۔ اے لڑکو وہ بات سیکھو کہ مرد ہوکر تمھارے کام آئے اور اے لڑکیو وہ ہنر حاصل کرو کہ عورت ہونے پر تم کو اُس سے خوشی اور فائدہ ہو۔ بیشک عورت کو خدا نے مرد کی نسبت کسی قدر کمزور پیدا کیا ہے لیکن ہاتھ پاؤں کان۔ آنکھ۔ عقل۔ سمجھ۔ یاد سب مرد کے برابر عورت کو دیئے ہیں۔ لڑکے انھیں چیزوں سے کام لے کر عالم۔ حافظ۔ حکیم۔ کاریگر۔ دستکار ہر فن میں طاق اور ہر ہنر میں مشاق ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں اپنا وقت گڑیاں کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھوتی ہیں بے ہنر رہتی ہیں اور جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا وہ مردوں کی طرح دنیا میں نامور اور مشہور ہوئی ہیں۔ جیسے نور جہاں بیگم۔ زیب النسا بیگم یا ان دنوں نواب سکندر بیگم یا ملکہ وکٹوریہ یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے ایک چھوٹے سے گھر اور کنبے کا نہیں بلکہ ملک اور جہاں کا بندوبست کیا۔

(۲) **بنات النعش**، اس کا موضوع خود مصنف اس کے دیباچے میں بتاتے ہیں:-

"یہ کتاب اسی مرآۃ العروس کا گویا دوسرا حصہ ہے۔ وہی بولی ہے، وہی طرز ہے مرآۃ العروس سے تعلیم اخلاق و خانہ داری مقصود تھی۔ اس سے وہ بھی ہے مگر ضمناً، اور معلومات علمی خاصتہً"

چنانچہ بنات النعش میں حساب کی دلچسپ باتیں، تاریخ، جغرافیہ، علم ہیئت، جسمانی ریاضت، حفظان صحت وغیرہ مختلف معلومات فراہم کی ہیں اور فسانے کے اندر اشخاص کے دوران گفتگو میں سمجھائی ہیں۔ مثلاً

(الف) **حسن آرا**۔ خیر اب وہ زمین کا گول ہونا ثابت کیجیے کیا آپ اُس بات کو ٹالنا چاہتی ہیں۔

محمودہ۔ ہاں تو۔ یہ انگنائی پچاس گز لمبی ہے اس سرے سے اُس سرے تک

پینتیس یعنی پانچ کم دو بیسی پھیرے کرو تو ایک میل ہو اور دو میل کا
ایک کوس ہوتا ہے۔

حسن آرا۔ اوفو اتنا بڑا میل اور اتنا بڑا کوس ہوتا ہے۔

محمودہ۔ اب قطب صاحب کی لاٹ کو فرمائیے کہ کے کوس لمبی ہے۔

حسن آرا۔ میں تو جانتی ہوں کہ اس حساب سے پوری میل بھی لمبی نہ ہوگی۔

محمودہ۔ میلوں کے حساب کتنی بڑی ہے۔ چوبیس ہزار میل اس کا دور ہے
مردوں میں بارہ کوس کی منزل مقرر ہے یعنی مرد لوگ جو سفر کرتے ہیں تو
بارہ کوس روز چلے جاتے ہیں اور واقع میں آرام کے ساتھ سفر
کیا جائے تو بارہ کوس دن بھر چلنے کو بہت ہے۔ اس حساب سے اگر
کوئی آدمی ناک کی سیدھ چلنا شروع کرے تو پانچ برس میں جہاں سے
چلا تھا وہیں آکر کھڑا ہوگا اور اس کا صرف ایک پھیرا پورا ہوگا۔

حسن آرا۔ اللہ اکبر اب جو میں خیال کرتی ہوں تو زمین بہت ہی بڑی ہے
بھلا تم نے کیوں کر جانا کہ چوبیس ہزار میل دور ہے۔

محمودہ۔ کتابوں سے جانا ہمت والے لوگوں نے محنت اُٹھا کر برسوں سفر کیا
اور تمام دور ناپ ڈالا خشکی کی راہ تو سیدھا چلنا مشکل ہے
کہیں کہیں بڑے بڑے دو دو تین تین کوس کے اونچے ہمینوں کی
چڑھائی کے دشوار گزار پہاڑ ہیں کہیں سیکڑوں کوس کے جنگل
ہیں جن میں نہ کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ ہے نہ پانی کا آسرا نہ
راہ نہ سڑک مگر سمندر سمندر جہازوں پر لوگوں نے سفر کیا ہے اور
قطب نما کے سہارے سے سیدھ لگائے چلے گئے اور
آخر کو وہیں آموجود ہوئے جہاں سے چلے تھے کیا اب بھی زمین
کے گول ہونے میں شک و شبہ ہے۔

(ب) بنات النعش کے اصل قصہ کے آخری حصہ کا اقتباس یہ ہے:۔

" جب اس کے بیاہ کی تاریخ قریب پہونچی تو ہر چند گھر والوں نے اس کو
مکتب جانے سے روکا مگر اس کو مکتب سے ایسا کچھ انس ہو گیا تھا کہ ایک لمحہ
مکتب سے جدا رہنا اس کو شاق تھا حسب دستور مکتب میں آتی رہی یہاں
تک کہ مانیوں بیٹھنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے تب ناچار سلطانہ بیگم
خود استانی اصغری خانم کے پاس گئیں سلام و دعا اور مزاج پرسی کے بعد
سلطانہ بیگم بولیں استانی جی تم میں ایسا جی پڑا تھا کہ ہر روز کہتی تھی آج
جاؤں کل جاؤں لیکن تمھاری اس لونڈی کے بیاہ برات کی فکر میں ایک دم کی
چھٹی نہیں ملتی۔ سیتی میں نہیں پروتی میں نہیں مگر کام ہے کہ سمٹنے ہی میں نہیں
آتا آخر آج میں زبردستی نکل کھڑی ہوئی سو کام کاج کا حرج کیا اور میں نے
کہا کہ چلوں ذرا کھڑے کھڑے استانی جی سے تو مل آؤں۔

استانی جی۔ درست ہے یہی تو کام کا وقت ہے آپ نے ناحق
تکلیف کی مجھی کو بلا بھیجا ہوتا۔ میں بھی دن رات آپ ہی کے کام میں
لگی لپٹی رہتی ہوں۔ جوڑے جو میں نے سینے اور مصالحہ ٹانکنے کو
آپ سے منگوائے تھے سب تیار ہیں۔ پہلے تو میرا جی ڈرتا تھا کہ
جوڑے ماشاء اللہ بہت بھاری ہیں اور خدا کے فضل سے امیر
گھر جانے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو یہ لڑکیاں کہیں بگاڑ دیں مگر نہیں
حسن آرا بیگم کی محبت سے لڑکیوں نے خوب ہی جی لگا کر سیا
اور مصالحہ بھی بہت صفائی سے ٹانکا اس جوڑی گلبدن کے
پائجامے میں جو میں نے پرسوں سلوا کر بھیجا ہے ذرا کلیوں کا
گوکھرو کھنچ زیادہ گیا ہے بہتیرا ٹھہر یا نوکتی رہی کہ استانی جی
لاؤ ادھیڑ کر پھر ٹانک دوں میں نے کہا خیر رہنے بھی دو ادھیڑنے
سے گوکھرو خراب ہو جائے گا آئندہ اس کا خیال رکھنا۔

سلطانہ بیگم۔ وہ جوڑا میں نے اپنے یہاں کی مغلانیوں کو دکھایا تھا

پھڑک گئیں اور کہنے لگیں پھر کہاں مَردوں کی چٹکی اور کہاں عورتوں کی۔

میں - اری مردوں کا یہاں کیا مذکور۔

مغلانیاں - اے حضور یہ جوڑا میاں علی جان کے کارخانے کا ٹنکا ہوا معلوم ہوتا ہے اسی سے ٹانکا ایسا درست بیٹھا چلا گیا ہے تو لونڈیوں کے عرض کرنے کا یہ مطلب ہے کہ عورتوں کا کام کیسا ہی سجل کیوں نہ ہو مردوں کے کام کو نہیں پا سکتا۔

میں - کہاں کے علی جان اور کیسے مرد یہ جوڑا تو میری استانی جی کے مکتب کی لڑکیوں نے سیا اور انھیں نے اس میں مصالح ٹانکا ہے یہ سُن کر مغلانیاں بار بار جوڑے کو کھول کھول کر بغور دیکھتی تھیں اور کہتی تھیں حضور فرماتی ہیں تو ہم کو یقین ہے لیکن عورتوں کے ہاتھ میں یہ صفائی اور یہ ستھراپن ہم نے تو نہیں دیکھا

استانی جی - خیر اور جوڑوں کی سلائی مجھ کو بھی پسند ہے۔ پھر آپ نے حسن آرا بیگم کے جوڑے میں، بھیج دیے ہوتے لڑکیاں تو خوشی خوشی سی دیتیں۔

سلطانہ بیگم - اور یہ سارا جہیز کس نے سیا اور کس نے ٹانکا مغلانیوں سے تو میں نے صرف موٹا کام لیا چاندنیاں ہوئیں گٹھریاں ہوئیں دسترخوان ہوئے سوزنیاں ہوئیں موباف کتنے غلاف تکیے توشک لحاف اس طرح کی چیزیں البتہ مغلانیوں نے سی ہیں یا ہاں شب خوابی کے کپڑے باقی پہننے کے کپڑے تو مکتب میں اور کچھ تھوڑے باجی کے یہاں سے پروئے گئے۔

استانی جی - الٰہی خیر سے حسن آرا بیگم کو ایک یہ ہزاروں اور گھس لس کر پُرانے ہوں۔

سلطانہ بیگم (ٹھنڈا سانس بھر کر) ہاں استانی جی دُعا کیجئے۔ اللہ نصیب

کرے۔ بیٹیوں کا بھی کچھ عجب نازک معاملہ ہے کن کن مصیبتوں سے پالو پرورش کرو اور پھر دشمن پرایا کا پرایا کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتی ورنہ میں حسنا کو اپنی نظروں سے دور نہونے دیتی شہر میں ایک سمدھیانہ کرکے وہ وہ آفتیں اٹھائیں کہ میں نے آگے کو توبہ کی اور کان اینٹھا ورنہ حکیم صاحب بیچارے کا کچھ قصور نہیں کیسی کیسی باتیں حُسنا کے واسطے منگوائیں ایک سے ایک بڑھی چڑھی میں نے کہا حاشا ادھر کی دنیا اُدھر ہوجائے گی میں شہر میں اب بیٹی نہ دوں گی کالا مُنھ ایسے شہر کا جس میں یہ کچھ رسوائی اور فضیحت ہے سو اُستانی جی اب دیہات والوں سے معاملہ کیا ہے۔ خدا کے ہاتھ شرم ہے۔

اُستانی جی۔ حسن آرا بیگم سے آپ مطمئن رہئے اول تو جھجر والے خود بڑے رئیس ہیں۔ دوسرے خاک چاٹ کر کہتی ہوں آپ انشاءاللہ دیکھ لیجئے گا کہ بیاہ کے دوسرے تیسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم تمام ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک نہ بن بیٹھیں تو مجھ کو اُلٹا اُلاہنا دیجئے گا کیا آپ کو حسن آرا بیگم کے مزاج میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

سلطانہ بیگم۔ فرق آپ کی عنایت سے زمین آسمان کا ہے آپ کے فیضانِ تعلیم نے خاک کو اکسیر تانبے کو کندن ذرّے کو خورشید پوتھ کو لعل۔ سفید حیوان کو آدم حسنا کو ماشاءاللہ حسن آرا بیگم بنا دیا اس کی خوبی تقدیر کی یہی ایک بڑی نشانی ہے کہ وہ شاگرد اور آپ جیسی اس کی استانی ہے۔ یہ ایسا احسان آپ نے ہم سب گھر والوں پر کیا ہے کہ جب تک جئیں گے آپ کے مرہون منّت رہیں گے۔ مگر جب سے حسنا نے بیاہ کی طیاری ہوتے دیکھی ہے کچھ سہم سی گئی ہے۔ یوں نہیں گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تھا اور بھی دل اُچاٹ ہوگیا ہے نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ کسی سے

بولتی اور بات کرتی ہے ارادہ تھا کہ پورے مہینے بھر مایوں بٹھاؤں گی

اس کی حالت دیکھ کر میں نے کہا کہ مایوں سے بدتر تو یہ خود ہوتی جاتی ہے۔ رنگت زرد ہوگئی ہے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں چہرہ دیکھو اداس صورت دیکھو غمگین میں کہتی ہوں اس کو اتنی عمر میں فکر کیوں ہے اس عمر میں تو لڑکیوں کو دلہن بننے کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔

استانی جی۔ حسن آرا بیگم اور لڑکیوں کی طرح نادان نہیں ہیں ماشاءاللہ بڑی فہمیدہ اور زیرک لڑکی ہے یہی کچھ گھر کے چھوٹنے کا خیال ہوگا۔

سلطانہ بیگم۔ گھر کی تو اس کو مطلق پرواہ نہیں البتہ مکتب اس کی جان ہے دیکھئے کیوں کر بچی کا دل بہلے گا۔

استانی جی۔ میں سمجھا دوں گی اور یوں آدمی اپنے پیاروں سے جدا ہوتا ہے تو رنج ہوتا ہی ہے۔

(۳) **توبۃ النصوح**، ان فسانوں میں بہترین کتاب ہے۔ اس کا موضوع و مقصود تعلیم دینداری ہے۔ اس کا قصہ، واقعات کا تسلسل، کردار اشخاص کی موزونیت، مکالمات کا تناسب و برجستگی، سب کچھ نہایت خوبصورت و دلکش ہے۔ یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کے اقتباسات مدارس کے نصابات میں ہمیشہ شائع ہوتے ہیں۔ اس کے بعض حصے خاص طور پر موثر و دلچسپ ہیں۔ ایک نصوح کا خواب، دوسرے کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ کا معاملہ دونوں بہت طویل ہیں۔ اس لئے صرف دوسرے کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ نصوح کا بڑا لڑکا کلیم ماں باپ سے روٹھ کر گھر سے نکلتا ہے اور اپنے ایک دوست کے گھر جاتا ہے:-

کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ

کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہونچا ہرچند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا وہ بھی حقیقی نہیں ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو عالی جاہ سرکار دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی اس پر خود اس کی رشوت ستانی بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اُس کا اعتداد دہلی کے رُوداروں میں ہوگیا۔ مرزا کی ماں اوایل عمر میں بیوہ ہوگئی۔ جمعدار نے باوجودے کہ دُور کی قرابت تھی حسبتہً لِلّٰہ اس کا تکفّل اپنے ذمّے لیا جمعدار اپنی حین حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے پوتے نواسے کثرت سے تھے انھوں نے بے اعتنائی کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیّت کر کے مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقّت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینہ کی کرایہ کی دُکانیں مرزا کے نام کردیں۔

یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں مرزا کی بیوی تین تین آدمی اور سات روپیہ کی کُل کائنات اس پر مرزا کی شیخی اور نمودیہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو مُنہ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گُھسا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان کسی کو ماموں جان۔ کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے

ادعائی رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا اُن کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں مگر امیرزادگی نبھتی تو کیسے نبھتی۔ دوکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بیچاری بہتیرا بکتی مگر کون سُنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیئے کی جوتی۔ سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے اوپر شبنم یا ہلکی سی تنزیب۔ نیچے کوئی حرصدار کا ساڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم کی نہیں۔ خیر یہ تو صبح شام اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی سُرخ نیفہ کا پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھو تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سرِ بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلاناغہ آتے اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا بار بار

کے پکارنے اور زنجیر کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں اور اُن میں سے ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے۔

کلیم ۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی ۔ کون مرزا۔

کلیم ۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی ۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کر لے کہ جلدی سے کلیم نے کہا کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟

لونڈی ہے کیوں نہیں۔

پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی ۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔

دوسری لونڈی ۔ ارے کمبخت یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بنایا کرتا ہے (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نا جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دُبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم ۔ ہاں ہاں وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی ۔ تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے وہ اس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور

بولے اہا آپ ہیں معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔
بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ بس ذرا کپڑے پہن آؤں
تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم۔ چلئے گا کہاں میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں۔

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ۔ تو چلئے اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی فضا کی جگہ
ہے میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں اگر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی مسجد ضرار[۵] کی طرح ویران وحشت ناک نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا نہ طالب علم نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ اُن کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چارناچار اسی مسجد میں ٹھیرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدّر فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو اُن کو غشی میں پایا اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمایئے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے کلیم نے باپ کی طلب اپنا انکار بھائی کی التجا

۵ پیغمبر صاحب کے وقت میں بعض لوگوں نے ضد میں آکر دوسری مسجد کو اُجاڑنے کے لئے ایک مسجد بنائی تھی پیغمبر صاحب نے اُسے ڈھوادیا۔

ماں کا اصرار تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا پھر اب ارادہ کیا ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا۔ خیر نیت شب حرام صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمایئے۔ میں جاکر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اُس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں متعدد دیوان خانے۔ کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دُکانیں اور سرائیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے اُن سے ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مُجھ سے اور آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل دُور سا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہوگیا

لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منالے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت اور حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم۔ خیر مقام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جاویں گے اور آپ زیادہ پریشان ہوجیئے گا اور اس مکان میں آبابیلوں کی بہت کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پرواہ نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود ہی پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا کیونکہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی دوسرے یہ کہ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض ہی نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے

اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یار میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا۔ سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک دکان کھلی بھی ہیں۔ تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر۔ گھر میں تو آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو اور تم کو دونوں کو کافی ہوگی۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا۔ یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو تو کیسے جھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھئے اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے

تحقیق سُنا ہے کہ حضور والا کے خاصّہ میں چھدامی کی دُکان کا چنا بلاناغہ تُلک کر جاتا ہے اور واقعہ میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا۔ ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما یوں صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذّت کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سُنی ہے۔

مرزا کلیم۔ فرمائیے۔

چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاقِ عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جیوں جیوں میں نے زمین سے سر باہر نکالا تیرِ ستم چلنے لگا ماکولات اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ تو میری قطع و بُرید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے کچّے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکرے بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے پکا تو شاخ و برگ بھُس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخِ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اس کو چکّی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں بھاڑ میں بھونیں۔ بیس بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں گھونگھنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بیباکانہ

چٹر پٹر بولنا سُن کر حاضرین دربار میں اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اس کے کھانے کو دوڑا چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آزبھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہونچ سکتا ورنہ میر تدوسکے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں۔

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔

کلیم بھوکا تو تھا ہی اسکو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزیدار معلوم ہوئے۔

مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال ہم نے تھوڑا سا اوپر بیان کیا۔

گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے نہ چراغ نہ چارپائی نہ بہن نہ بھائی نہ مونس نہ غمخوار نہ نوکر نہ خدمت گار مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانہ میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغ نو گرفتار اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کرکے تنبیہہ پکڑتا اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجر دم باپ کیساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی ثنا میں۔

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلّے کا کوئی اور عیّار ٹوپی جوتی رومال چھڑی تکیہ دری یعنی جو چیز کہ کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جُدا تھی لے کر چمپت ہوا۔

یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کر اُٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی کوئی

پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیر دن گرد کا بھبوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔

مسجد تھی ویران اس میں پانی کہاں۔ صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آ نکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں۔ یا مُنہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔

اس میں دوپہر ہونے آئی بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا جوں ہی زینہ پر چڑھا تو کلیم اُس سے عرضِ مطلب کرنے کے لئے لپکا وہ لڑکا اس کی ہیئتِ کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا خدا جانے اس نے اُس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقہ سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلّو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا سیدھا مرزا کے مکان پر گیا آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے سے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو مُنہ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پُرانی جوتی اور ٹوپی تاکہ کسی طرح گلی کے کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔

یہ سوچ کر اُس نے کہا کہ کیوں حضرت آپ مجھ سے واقف ہیں۔ اندر سے آواز آئی ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمھارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

تکیہ و دری کا نام سُن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں تامّل تھا کہ اندر سے آواز آئی مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر تکیہ دری تو اس سے لو۔ کلیم یہ بات سُن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے

چور چور کر کے جالیا۔

ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق موفت ثابت کئے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

(۴) **رویائے صادقہ**، یہ ناول واقعات کے اعتبار سے بالکل سادہ ہے۔ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ لیکن نوعیت میں عجیب ہے۔ "اس کتاب میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سچا اسلام بالکل عقل کے مطابق ہے، اور اس میں شکوک اور اشتباہات کو دخل نہیں ہو سکتا" قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک لڑکی سچے خواب دیکھا کرتی ہے۔ جو دیکھتی ہے وہی پیش آتا ہے۔ اس لئے گھر اور باہر کے سب لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور اس پر کوئی غیبی اثر سمجھتے ہیں۔ بالآخر اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ شوہر کے گھر جا کر وہ ایک طویل مذہبی خواب دیکھتی ہے۔ (جو کتاب کے ۰۰ اصفحوں میں سمایا ہے) کتاب کا مقصد یہی خواب ہے جو سوال و جواب کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ لیکن قصہ کی دلچسپی خواب سے اوپر تک رہتی ہے۔ آگے تو بس ایک مذہبی کتاب رہ جاتی ہے۔

رویائے صادقہ کی پہلی فصل بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے:۔

پہلی فصل تمہید کے طور پر صادقہ کی تقریب اور اسکی خواب دیکھنے کی عادت

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا دھوکا ہوا ہے۔ ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو سگی بہنیں تھیں۔ اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں اور اصلی ایک، بلکہ نہیں اس کو بیسیوں ہی ہیں لوگ **صادقہ** کہنے لگے تھے۔ اس واسطے کہ اس نے ساری عمر ہرگز کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے

یوسفی بیگم کا خطاب ملا۔ اِس لئے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اُس کو تعبیر میں ایسا ملکہ ہوگیا تھا کہ اس کی رائے تیر بہدف ہوتی تھی یوں تو کوئی ایسا بندہ بشر نہیں جو سوتے میں خواب نہ دیکھتا ہو۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی کا دماغ ایک لمحہ بھی بیکار نہیں رہ سکتا وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہے جیسا جاگتے میں ویسا سوتے میں۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتا۔ مگر تو بھی وہ جتنی دیر سوتے ہیں۔ خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ جانوروں میں سے اور جانوروں کا تو حال معلوم نہیں مگر گھوڑے کو جس کا جی چاہے آزمالے کہ تھان پر کھڑا سو رہا ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ خرّانٹوں کی آواز چلی آتی ہے اور یکایک خاص طور پر ہنہنایا ایسے موقع پر سائیس یا جو کوئی آدمی موجود ہوتا ہے۔ تھان ہے تھان ہے کہہ دیا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا کہ گھوڑا بھی کسی نہ کسی طرح کے خواب دیکھتا ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ عقلیں دوڑائیں۔ مگر کسی کو ٹھیک پتہ نہیں ملا۔ کہ خواب ہے کیا چیز۔ اور اس کی تعبیر کے اصول کیا ہیں۔ ہم بھی مدتوں اس خبط میں گرفتار رہے۔ جب سے صادقہ کا حال سُنا۔ یہ خیال ہی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ خواب بھی اسرارِ الٰہی میں سے ہے ع

خدا کی باتیں خدا ہی جانیں

اس عورت کا دماغ بھی خدا نے عجیب ہی طرح کا بنایا تھا وہ پرلے درجے کی ذہین تھی۔ یوں بھی لڑکیاں بولنے اور بات چیت کرنے پر جلد قادر ہو جاتی ہیں۔ اور صادقہ تو پورے ڈھائی برس کی بھی نہ ہوگی کہ ہم نے اپنے کانوں اُس کو مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر مسلسل گفتگو کرتے سُنا۔ نہ لغزش نہ لکنت نہ رکاوٹ۔ اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اُس کو اپنے بچپن کے اُن وقتوں کی باتیں جبکہ اس کو اچھی طرح گفتگو بھی نہیں کرنی آتی تھی۔ ایسے صاف طور پر یاد تھیں کہ گویا کل کی بات ہے۔ ایک دفعہ کا اُس نے مذکور کیا کہ میں جھولے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اوپر سے گری چھپکلی۔ اور اتفاق سے اس وقت کوئی میرے

پاس نہ تھا۔ میرے جی میں آیا کہ آواز دوں۔ مگر بولنا نہیں آتا تھا۔ ناچار رونے لگی۔ ددا نے مجکو آکر اُٹھا لیا۔ میں چُپکی تو ہوگئی۔ مگر جب پھر اُس نے جھُولے میں لٹانا چاہا تو میں اکڑ گئی۔ ددا سمجھ تو گئی کہ جھولے میں لیٹنا نہیں چاہتی۔ مگر اس کو سب کون سمجھائے۔ آخر اماں جان کا ذہن منتقل ہوا۔ اور لگیں کہنے ادے ذرا نہا لچے کو تو دیکھو۔ جوں نہالچہ اُٹھایا چھپکلی کود یہ جا وہ جا۔ اماں جان نے مجھے گود میں لیکر پیار کیا۔ اور اُسی وقت چھت گیری بندھوا دی۔ تب میرے دم میں دم آیا۔ وہ ایسی باتوں کے ایسے ٹھیک پتے دیتی تھی کہ تسلیم اور تصدیق کے سوائے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ غالباً اُس نے خواب بھی اسی زمانے سے دیکھنے شروع کئے ہوں گے۔ مگر اس کا چرچا گھر میں اس وقت سے ہونے لگا۔ جب سے اس کو بولنا آیا۔ جیسی اس کی عمر تھی ویسے اس کے خیالات تھے ویسے ہی اس کے ان دنوں کے خواب بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دن اُس کا بھائی کہ وہ بھی بچہ ہی تھا۔ اس سے کوئی دو سوا دو برس بڑا سویرے اُٹھ کھانے کے لئے ضد کرنے لگا۔ ماں نے کہا باسی کھچڑی تو میں تم کو دینے کی نہیں رہیں پکوریاں۔ سو اول تو ابھی دکانیں نہیں کھُلیں۔ اور دوسرے وہی ایسی کونسی خوبی بھری ہیں۔ گھی کا نام اور آدھے سے زیادہ تیل اور پھر ماش کی دال۔ نہیں صاحب ذرا دم لو۔ ابھی میں تم کو روغنی ٹکیا ڈلوائے دیتی ہوں پھر چاہنا کھانڈ سے کھانا۔ یا مربّے کی پھانک سے۔ مگر خدا کے لئے اوپر سے پانی نہ پی لینا۔ ایسا نہ ہو پھر رات کو آپ بھی مارے کھانسی کے بے چین ہو اور ہم سب کی نیند بھی حرام کرو۔ یہ سن کر صادقہ بولی۔ اماں جان مربّے کا مرتبان تو گر کر ٹوٹ گیا۔

ماں۔ یہ کب اور کیونکر۔

صادقہ۔ کب اور کیونکر تو میں جانتی نہیں مگر میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ خواب کا نام سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ بات گئی گزری ہوئی۔ ماما نے

جلدی جلدی کر کے توا چڑھایا ٹکیا پکائی۔ جوں مُربّے کے لئے کوٹھری کھولی ایک جھوڑ دو دو بلیاں نکل کر بھاگیں۔ اندر جا کر دیکھا تو واقع میں مرتبان زمین پر ٹوٹا پڑا ہے۔ دو چار بار تو لوگ خبر نہ ہوئے۔ لیکن جب دیکھا کہ یہ ہر روز خواب دیکھتی اور جو دیکھتی ویسا ہی ظہور میں آتا تو گھر والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ صبح ہوئی اور سب نے پوچھنا شروع کیا کیوں بی آج کیا خواب دیکھا۔ نہ کبھی ایسا ہوا کہ صادقہ نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو۔ اور نہ ایسا ہوا کہ دیکھا ہو اور سچا نہ اُترا ہو۔ رفتہ رفتہ پہلے گھر میں پھر محلّے میں پھر تو سارے شہر میں ایک غل سا مچ گیا۔ اِدھر تو صادقہ کی شہرت بڑھتی جاتی تھی۔ اُدھر عمر کے ساتھ ساتھ وہ خوابوں میں ترقی کر رہی تھی۔ صادقہ کے خوابوں کے سلسلے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کسی علم کے بتدی کو پہلے آسان آسان باتیں سکھائی جاتی ہیں اور پھر بتدریج وہ مُشکل مُشکل کتابوں پر عبور کرتا ہے۔ اسی طرح صادقہ کو پہلے صاف صاف خواب دکھائی دیتے تھے۔ یعنی جو بات ہوئی۔ جیسی کی تیسی اُس کو خواب میں دکھائی دے گئی۔ وہی خواب وہی تعبیر۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس کے خواب بیچدار ہوتے چلے جو بدون تعبیر کے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتے تھے جیسے پہیلی یا معمہ یا چیستان۔ مثلاً گھر میں کسی کو تپ آنے کو ہوتی تو اس نے خواب میں دیکھا۔ بخار چڑھا ہوا ہے۔ اور پڑے ہیں۔ پھر یوں دیکھنے لگی کہ دھوپ میں بیٹھے ہیں یا آگ سے تاپ رہے ہیں اور آخر آخر کو ایسا معلوم ہوا کہ آگے دیگچی[۵] رکھی ہے اس میں چار رنگ کے چاول ہیں مگر بُسے ہوئے۔ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ صادقہ کو خواب ہی میں اُس کی تعبیر بھی معلوم ہو جاتی تھی۔ گویا تعبیر بھی جزو خواب تھی۔ اور کبھی خواب میں تعبیر معلوم نہ ہوئی تو اُس نے بیداری میں آپ تعبیر دے لی۔ ایک عجیب

۵ دیگچی۔ معدہ۔ چار رنگ کے چاول صفرا۔ خون۔ بلغم۔ سودا چار غلطیں۔ چاولوں کا بُسنا غلطوں کا فساد جس سے تپ آتی ہے۔

بات اور تھی کہ صادقہ کبھی فرمائشی خواب بھی دیکھتی تھی یعنی مثلاً ہم کو ایک بات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے اور ہم نے اس سے درخواست کی۔ جیسا کچھ ہونے والا ہوا۔ صادقہ نے خواب میں دیکھ دیا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار کی نہ تھی۔ بتیری مرتبہ ایسا ہوا کہ صادقہ نے خواب دیکھنا چاہا اور بھلا یا بُرا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صادقہ نے سب تو نہیں مگر اپنے ضروری اور معرکے کے خواب تعبیر سمیت روزنامچے کے طور پر ایک کتاب میں جمع کر لئے تھے اور اتفاق سے وہ اصل روزنامچہ ہمارے ہاتھ آ گیا ہے اور ہم اس کو عن قریب چھپوانے والے ہیں۔ جب وہ روزنامچہ مشتہر ہوگا تو قابل دید ہوگا۔ نہایت دلچسپ۔ اس روزنامچے میں ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ کودن سے کودن اور غبی سے غبی اس کو پڑھ لے اور اُلجھی ہوئی باتوں کو آسانی کے ساتھ سُلجھانے لگے۔ اور اس میں تو ذرا سا بھی تامل نہیں کہ صادقہ کا روزنامچہ دیکھنے کے بعد اتنی بات تو چار و ناچار تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس جہاں کے علاوہ ایک عالم ارواح بھی ہے اور سوتے میں ہم کو اس کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر ہم اس میں مشق و مہارت پیدا کریں تو بہت سے اسرار قدرت منکشف ہوں۔ اور یہی معمولی خواب جو ہم اکثر دیکھا کرتے ہیں اور کبھی ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر ایک میں بڑے بڑے مطالب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم کو ان کے دریافت کرنے کا سلیقہ نہیں۔

(۵) ابن الوقت، نذیر احمد صاحب کے دوسرے ناول محصنات (دو شادیاں کرنے کی خرابیاں) اور رایا می (بیواؤں کی دکھ بھری کہانی) بھی نہایت دلچسپ اور ان کی مخصوص زبان و بیان کے عمدہ نمونے ہیں۔ لیکن ابن الوقت بالکل نئی وضع کا ناول ہے۔ اس میں انگریزی معاشرت کی کورانہ تقلید کے نتائج دکھائے کہ "ازیں سو رانده وزاں سو در مانده" نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے۔ "ابن الوقت" قصہ کا ہیرو ہے جو ایک انگریز "مسٹر نوبل" کے زیر اثر آ کر اپنی ہندوستانی و اسلامی معاشرت چھوڑ کر انگریزی وضع اختیار کرتا ہے۔ اگرچہ ڈپٹی صاحب نے الحقوق والفرائض میں لکھ دیا ہے کہ ابن الوقت سے مراد خود ڈپٹی صاحب

ہیں اور یہ ان کا اپنا فسانہ ہے لیکن حقیقت یں نذیر احمد صاحب نے اپنی وضع اس حد تک نہ بدلی تھی کہ ابن الوقت ان کو سمجھا جا سکے۔ اس لئے لوگوں نے اس کو سر سید پر ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ سید محمود نے ڈپٹی صاحب سے شکایت بھی کی کہ آپ نے یہ کتاب لکھ کر میرے والد کو بدنام کیا ہے لیکن انھوں نے کہا کہ میں نے تو انگریزی وضع اختیار کرنے والوں کو گالیاں دی ہیں۔ اب جو چاہے اپنے اوپر لے لے۔ ابن الوقت کا مختصر اقتباس یہ ہے:۔

ہم نے تحقیق سے سُنا ہے کہ ابن الوقت نے بارہا اپنے رازداروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ہے مگر میرا حال یہ ہے کہ انگریزی کھانا کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی، سچ تو یہ ہے کہ ایک دن سیری نہیں ہوئی اور میں اکثر خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ابن الوقت کے خاص خدمتگار کی زبانی معتبر روایت ہے کہ ایک بار اس کو سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق لگا بہکنے۔ تو وہ ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا تھا اور کھانے بھی پلاؤ، زردہ، متنجن، بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کا بھرتا، دھوئی ماش کی پھریری دال، امردوں کی کچالو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چٹپٹی چیزوں کو ترس گیا تھا۔

معلوم ہے کہ ابن الوقت، ابتدائے تبدیل وضع سے گھر بار چھوڑ کر باہر چھاؤنی میں جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ اس کی کوٹھی کا احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ تھا لیکن اس کی زندگی ویسی ہی اُداس تھی جیسی ایک بیچلر[۵] کی ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیر چشم تھا۔ اس کے یہاں نوکروں کی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کہ دلّی کی اتنی بڑی چھاؤنی میں بس دو چار ہی جگہ اور رہوں گی اس لئے کہ اس کے تمام نوکر سلیقہ مند اور مستعد تھے اور حقیقت امر ہے کہ انہی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں اس کی اتنی بات بھی

۵ کنوارا۔ غیر شادی شدہ۔

بنا رکھی تھی۔ مگر نوکر کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں پھر بھی مالک کی تائید کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ انگریزی زندگی ایسے بکھیڑے کی زندگی تھی کہ ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا، صفائی کی نگرانی اور ہر چیز کی خبر گیری کے لئے بہ مشکل وفا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نوکر انگریزی مذاق سے خوب واقف تھے مگر ابن الوقت سے خود صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے ایسی خراش تراش ایجاد کرنے لگا تھا کہ خواہی نہ خواہی اس کو دیکھنا پڑتا تھا۔ دعوت ایسے مزے کی چیز ہے کہ کھلانے والا اور کھانے والا دونوں ہی خوش ہوتے ہیں مگر ابن الوقت کے یہاں کی دعوت اس کے حق میں ایک مصیبت ہوتی تھی کھانا تو کہیں جا کر رات کے نو دس بجے نصیب ہوتا اور اہتمام کی آندھی صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کو تو کوئی ایسی دعوت یاد نہیں کہ ابن الوقت تکان کی وجہ سے اس کے بعد علیل نہ ہوا ہو۔ پھر چھٹے چھ ماہے دعوت ہو تو خیر! یہاں ہر مہینے کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے دو تین بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اٹھتا تھا کہ میں نے کہاں کا کھڑاگ اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ ابن الوقت بیچارے مصیبت کے مارے کو ایک سے ایک سخت مشکل در پیش تھی کہ وہ تو وہی ہٹ کا پورا تھا کہ ان آفتوں کو بری طرح یا بھلی طرح جھیلتا رہا۔ دوسرا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوا ہوتا اور پھر اس کا نام نہ لیتا" ہاتھیوں کے ساتھ گنے کھانا کچھ لڑکوں کا کھیل ہے۔"

ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصہ خوش حال تھا قلعے کی تنخواہیں تو تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام و اکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑ رہتا تھا۔ ہمارے اندازے میں ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپیہ ماہوار سے ہرگز کم نہ تھی اور غدر کے بعد سے تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ نہ سو نہ سوا سو۔ ماشاء اللہ ایک دم سے پانسو۔ اس آمدنی پر اچھے سے اچھا کھاتا۔ اچھے سے اچھا پہنتا، غرض امیرانہ خرچ رکھتا۔ مگر ہندوستانیوں کا سا ہوتا تو چند سال کے عرصہ میں اس کے پاس معتدبہ سرمایہ ہو جاتا لیکن ابے پکڑے کرنی چاہی انگریزوں کی ریس۔ پورا برس

خیریت سے گزرنے نہیں پایا کہ لگا ادھار کھانے۔ جس وقت اس کو جاں نثار نے نہلا دھلا کر پہلے پہل انگریزی کپڑے پہنائے تو کوٹھی کا ساز و سامان اور اپنی شان دیکھ کر اس کو اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ اپنے آپے میں نہیں سماتا تھا اور ابھی اس خوشی کا اثر طبیعت پر باقی تھا کہ ایک چپراسی بڑا لمبا چوڑا لفافہ لئے ہوئے برآمدے تک آیا۔ قاعدے کے مطابق بیرا (بیرہ) نے لفافہ کشتی میں رکھ کے صاحب کے حضور میں پیش کیا۔ کھولا تو جنرل سپلائر کا بل تھا۔ کتنے کا؟ کچھ اوپر پانچ ہزار کا۔ پانچ ہزار کی رقم دیکھ کر قریب تھا کہ حواس مختل ہو جائیں۔ مگر "سنگ آمد و سخت آمد" چون و چرا کرنے کا موقع نہیں "قہر درویش برجانِ درویش" دینا ہی پڑا۔ مگر کیونکر؟ ہزار کا توڑا نوبل[۵۱] صاحب کا دیا ہوا سر بند رکھا ہوا تھا وہ لیا اور بہزار مشکل دو ہزار گھر میں سے فراہم کئے پھر بھی سوا دو ہزار اور ہوں تو پنڈ چھوٹے بارے غدر سے پہلے نواب معشوق محل بیگم صاحبہ کی سرکار میں ابن الوقت کی معرفت گڑ والوں[۵۲] کا لین دین تھا۔ ڈرتے ڈرتے ان کو رقعہ لکھا۔ اسامی تھی کھری اور جان دار، انھوں نے بے تامل روپیہ حوالے کیا یوں جنرل سپلائر کا پوت پورا ہوا۔ لیکن ابن الوقت نے خرچ کا ڈربا کھول دیا تھا جس نسبت سے اس کی آمد بڑھی تھی اگر اسی نسبت سے خرچ بھی بڑھتا تو چنداں حرج کی بات نہ تھی۔ پر اس نے لیٹنے کے ساتھ چادر کے باہر پاؤں پھیلا دیے۔ اول سرے گھر کے تہرے چوہرے مکان ہوتے ساتے چالیس روپیہ کا بنگلہ، پھر فٹن، ٹمٹم (ٹینڈم)، بردم، بانکی گاڑی، چار قسم کی بگھیاں اور چار کے چار گھوڑے اور ایک زین سواری کا، پانچ۔ دھوبی، سقہ، چوکیدار، فراش،

---

۵۱ ایک انگریز جن کو ایام غدر میں ابن الوقت نے پناہ دی تھی اور ان سے خلا ملا ہونے کے بعد ابن الوقت نے ہندوستانی تمدن کو چھوڑ کر یورپ کا تمدن اختیار کیا تھا۔ نوبل صاحب موصوف مسٹر ابن الوقت کے معاون و مددگار رہے۔

۵۲ دہلی کے مشہور ساہوکار تھے۔

مشعلچی، باورچی، سائیس، گراس کٹ، مہتر، مالی، بیرا، دو ڈھائی درجن کے قریب شاگرد پیشہ، ان کی تنخواہیں اور تنخواہوں کے علاوہ، وردی، اس کی مناسبت سے دوسرے مصارف، باستثناء میز کرسی کہ اس کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ مہینے میں اچھے جید دو کھانے بھی ہو گئے تو ساری تنخواہ پر پانی کا پھر جانا کچھ بات نہیں۔

ابن الوقت نے شروع میں شاید تین یا چار تنخواہیں وقت پر لی ہونگی اس کے بعد سے تو خزانچی کے ساتھ معاملہ ہو گیا۔ ایک چھوڑ دو دو جا جن دینے والے۔ جب ضرورت ہوئی جتنا چاہا منگوا لیا۔ تنخواہ تو اوپر سے اوپر خزانچی لے لیا کرتا تھا اور زمینداری کا محاصل گڑ والوں کی کوٹھی میں چلا جاتا تھا ان بیچا کو صاحب بننے کی دھن میں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ سر پر کتنا قرضہ لدتا چلا جا رہا ہے۔ غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی کی زد نہیں لگ جاتی بس ابن الوقت کو صاحب بننے کی زد تھی۔ شروع شروع میں تو اس کو مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اس کی ساری رفارم اسی پر منحصر ہو گئی تھی کہ یورپ کے اوضاع و اطوار میں سے کوئی وضع اور کوئی طرز چھوٹنے نہ پائے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ تیرے پاس اتنا پیسہ بھی ہے؟ جتنا ان کے پاس ہے۔ کمبخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی کچھ ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنھوں نے ذرا سی انگریزی پڑھ لی تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے، تباہی کے لچھن سیکھتے چلے جاتے تھے۔ اس کے اندرونی حالات کی تو کسی کو خبر نہ تھی۔ ظاہر میں دیکھتے تھے کہ انگریزوں سے ملتا جلتا ہے۔ جو بات کسی ہندوستانی عہدے دار کو نصیب نہیں، اس کو حاصل ہے اور لوگوں کی نظر میں انگریزی وضع خدا کے فضل سے جو کسی ایک کو بھلی ہو۔ سبھی نے تو اپنی اپنی جگہ تھوڑا بہت نقصان اٹھایا اور شاید نقصان نہ بھی اٹھایا تو کسی کو کسی قسم کا فائدہ تو ہوا نہیں۔ اور ہوتا کیسے؟ کوئی مفلس آدمی مالداروں کے سے کام کرنے لگے تو وہ کیونکر

پنپ سکتا ہے؟

(۶) **ترجمہ قرآن مجید**، ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی سب سے بڑی مذہبی خدمت اور زنانہ ناولوں کے بعد اردو زبان و ادب کا عظیم الشان کارنامہ قرآن کریم کا ترجمہ ہے اس سے پہلے صرف دو نوں "شاہ بھائیوں" (شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب) کے اردو ترجمے تھے۔ ان کی زبان سو برس کی پرانی ہو چکی تھی۔ ڈپٹی صاحب نے اپنے ترجمے میں نہایت ضروری و مفید اضافے کئے:۔

(۱) صرف زبان کو با محاورہ نہیں کیا، بلکہ خطوط ہلالی میں تشریحی الفاظ لکھ کر عبارت کو مسلسل و مربوط کر دیا۔

(۲) حاشیے پر فائدے لکھے۔ ان میں شاہ عبدالقادر صاحب کی تفسیر "موضح القرآن" سے مدد لی ہے، بلکہ جا بجا ان کی عبارتیں نقل کر دی ہیں۔

(۳) لغات عربی کی تشریح الگ لکھی۔ یہ عربی داں قاریوں کو خاصکر مفید ہے۔

(۴) مضامین قرآن مجید کی فہرست حوالۂ آیات کے ساتھ ایسی تفصیل و تجزیہ کے ساتھ مرتب کی کہ مطالب قرآنی کے اندازے کے ساتھ تنزیل الٰہی کی ضرورت و عظمت بھی بیک نظر معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز بھی اردو میں عجیب و جدید تھی۔

نذیر احمد صاحب نے ترجمۂ قرآن بھی اپنی بے تکلف زبان و محاورہ میں کیا ہے۔ مثلاً

(۱) ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ	پھر عرش پر جا براجا
(۲) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ (اعراف پارہ ۸)	(اس پر) شیطان بولا کہ جیسی تو نے میری راہ ماری ہے، میں بھی تیرے سیدھے راستے پر بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں تو سہی
(۳) وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ (اعراف)	اور ان کے پروردگار نے ان کو ڈانٹا کہ کیا ہم نے تم کو اس درخت (کے کھانے) کی مناہی نہیں کی تھی۔

(۴) قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ	ان کے باپ (یعقوب) نے کہنا شروع کیا کہ اگر مجھ کو سترا بہترا نہ بناؤ تو (ایک بات کہوں کہ) مجھ کو تو یوسف کی مہک آ رہی ہے۔
(یوسف پارہ ۱۳)	
(۵) فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ	تو (اے پیغمبر) تمہارے پروردگار نے ان (سب) پر عذاب کا کوڑا پھٹکار اہے شک تمہارا پروردگار نافرمانوں کی تاک میں (لگا رہتا) ہے۔
(فجر پارہ ۳۰)	
(۶) فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا۔	تو ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کے بدلے ان پر ہلاکت لانازل کی اور سب کو (مار کے) پٹڑا کر دیا۔
(شمس۔ پارہ ۳۰)	
(۷) اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا	کیونکہ نماز صبح کا وقت نور ظہور کا وقت ہے۔
(بنی اسرائیل پارہ ۱۵)	

اس آخری ترجمہ (نور ظہور کا وقت) پر نذیر احمد صاحب نے حاشیہ پر یہ فائدہ لکھا ہے:۔

"مفسرین نے لفظ مشہود کے بہت سے معنی لکھے ہیں بعض کہتے ہیں کہ انتظام دنیا کے لئے جو فرشتے آتے ہیں، دن کے فرشتے الگ ہیں، اور رات کے الگ ہیں، اس وقت ان کی بدلی ہوتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صبح کی نماز میں نمازی کثرت سے جمع ہوتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ صبح کا وقت حضور قلب کا وقت ہے کہ نماز میں جی خوب لگتا ہے۔ اور اس کے سوا اور بہت سے اقوال ہیں۔ ان سب تفسیروں پر نظر کر کے ہم نے ایک لگتا ہوا سا ترجمہ اختیار کر لیا ہے۔ اور قرآن الفجر کے معنی تو ظاہر ہیں "صبح کا قرآن"، مگر اس سے مراد نماز صبح ہے"۔

ترجمہ کے نمونے میں انھی آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جن کا شاہ صاحبان کے ترجمہ سے اقتباس ہو چکا ہے اور اس کتاب کے صفحہ ۵۵ پر درج ہے تا کہ

اسلوب و زبان کا باہم مقابلہ آسان ہو:-

(ا) "اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اس کے وبال میں) نہ پکڑ اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں، جس طرح ان پر تو نے (ان کے گناہوں کی پاداش میں) احکام سخت کا) بار ڈالا تھا ویسا بار ہم پر نہ ڈال۔ اور اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ جس (کے اٹھانے) کی ہم کو طاقت نہیں ہم سے نہ اٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگذر اور ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا (حامی و مددگار ہے۔ تو ان لوگوں کے مقابلے میں جو کافر ہیں ہماری مدد کر۔"

(سورہ بقرہ کی آخری آیت)

(ب) "(پھر ہم جنات اور بنی آدم دونوں سے مخاطب ہو کر پوچھیں گے کہ) اے گروہ جن و انس کیا تمھارے پاس تمھیں میں کے پیغمبر نہیں آئے کہ تم سے ہمارے احکام بیان کریں اور تمھارے اس روز (قیامت) کے پیش آنے سے تم کو ڈرائیں۔ وہ عرض کریں گے ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں (یعنی اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں) اور (واقعہ میں) دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا اور (اب) انھوں نے آپ ہی اپنے اوپر گواہی دی (یعنی اقرار کیا) کہ بے شک وہ کافر تھے۔"

ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کی جدتوں اور خوبیوں سے بعد کے مترجمین نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ خطوط ہلالی کے تشریحی الفاظ بلا استثنا تمام مترجمین نے اپنے اپنے ترجموں میں بڑھائے تفسیری حاشیے بھی اکثر نے لکھے۔ چند مشہور مترجم یہ ہیں:- مولوی فتح محمد جالندھری، مولوی عاشق الٰہی، مولوی احمد رضا خاں بریلوی۔ مولوی اشرف علی تھانوی، مولوی محمود الحسن دیوبندی۔ ان سب کے ترجمے اپنے اپنے دائروں میں مقبول ہیں۔ لیکن یہ سب مولوی نذیر احمد دہلوی سے مستفیض ہیں۔ اگرچہ سب نہیں تو ان میں سے اکثر وہ ہیں جنھوں نے نذیر احمد پر ترجمہ کی

خامیوں اور زبان و محاورہ کی آزادیوں کے سبب سے کفر تک کے فتوے لگا دئے تھے۔ اس ہنگامہ آرائی کی حقیقت یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد باوجود وضع قدیم کے بہت کچھ آزاد خیال تھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے آپ کو مجتہد سمجھتے تھے۔ اس لئے عقائد و اعمال میں بعض وہ باتیں بھی شامل تھیں جو مذہب جمہور کے خلاف ہیں۔ یہ بنائے فساد تھی۔ اور اس بنا پر علماء کا ڈپٹی صاحب سے اختلاف بیجا نہ تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ جن مترجموں کے نام اوپر لکھے گئے، ان میں سے بھی بعض بزرگ عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے باہم تخالف و تضاد رکھتے ہیں۔ اور ایک کا ترجمہ دوسرے کے نزدیک نامعتبر ہے۔ اس قسم کا اختلاف ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ ہم کو اس وقت ترجمہ کی جدتوں اور خوبیوں سے بحث ہے، اس میں ڈپٹی صاحب کا فضلِ تقدم مسلّم ہے۔

(۷) **الحقوق والفرائض**، ترجمۂ قرآن شریف کی مفصل فہرست مضامین بناتے وقت ڈپٹی نذیر احمد صاحب کو خیال آیا ہوگا کہ یہ مضامین الگ کتاب کی صورت میں مرتب کر دئے جائیں جن میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف کے حوالے بھی ہوں اور اپنی طرف سے ان مطالب کی تفسیر بھی۔ چنانچہ ایک ہزار صفحوں کے تین حصے تیار کر دئے۔ پہلا حصہ حقوق اللہ، دوسرا حقوق العباد، تیسرا اخلاق تیسرے حصے کے آخر میں "خاتمۃ الطبع" شامل ہے۔ جو ڈپٹی صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھا ہے۔ یعنی اس تاریخ تالیف ختم کی ہے۔ اس کے آغاز میں صورت تالیف یہ بیان کرتے ہیں:۔

> "جس چاؤ سے ہم نے اس کتاب کے جمع کرنے کا منصوبہ باندھا۔ اسی نے آخر کار ختم کی خوشی میں کھنڈت کی۔ ہم نے اس کو خدا کی خاص عنایت سمجھا کہ ہم نے ایسی کتاب کی ضرورت کا احساس کیا۔ ہر چند جستجو کی عربی، فارسی، اردو میں اس طرح کی کتاب کا کہیں پتہ نہ لگا۔ مجبور اپنے بوتے سے بڑھ کر آپ اس کا بیڑا اُٹھایا۔ شوق متقاضی کہ جو کام برسوں میں ہونے کا ہے مہینوں میں سرانجام

پاسے، مہینوں کا دنوں میں، دنوں کا گھڑیوں میں، گھڑیوں کا پلوں میں۔ اور ایسا ہی ہوا کہ مسوّدے کی سیاہی سوکھنے نہیں پاتی تھی کہ چھپنے کے لئے دیا جاتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ چھاپے خانے والوں کے تقاضے سے مسوّدہ لکھا گیا ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ کہیں ایسی مُہتم بالشان تصنیفیں اس عُجلت سے بھی ہوتی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی عمر کا مُعتدبہ حصّہ اسی شغل میں گذارا ہے تو اطمینان سے برسوں میں مسوّدے کئے ہیں۔ برسوں مسوّدے زیر نظر رہے ہیں، اور اس پر بھی آخری پروف تک اصلاح و ترمیم ہوتی رہی ہے۔ تب کہیں جاکر کتاب کو صلہ قبول حاصل ہوا ہے۵۔"

الحقوق والفرائض کی ترتیب اس طرح ہے کہ ہر عنوان کے نیچے قرآن و حدیث کے متعلقہ اقتباسات لکھے ہیں اور بالمقابل اُن کا ترجمہ کیا ہے۔ اور نیچے ضروری حاشیے دئے ہیں۔ پھر من المترجم لکھ کر اپنی تفسیر و تشریح لکھی ہے جو کہیں چند سطریں ہیں کہیں طویل مضمون اور کہیں رسالہ کا رسالہ۔ حقوق اور

---

۵ ڈپٹی صاحب کا یہ مضمون دیکھ کر اس نوٹ کے لکھنے کا خیال آیا۔ یہ میری خامی و کوتاہی کا اظہار و اقرار تو ہے لیکن "تصنیفی لطیفہ" بھی ہے کہ میری یہ تالیف داستان تاریخ اردو بھی اسی طرح لکھی اور چھاپی جا رہی ہے کہ کبھی مسوّدے کے چند اوراق لکھتے ہی مطبع کو دیدے گئے اور کبھی اہل مطبع کے تقاضے سے مسوّدہ لکھا گیا۔ لیکن مجھ میں اور ڈپٹی صاحب میں یہ فرق ہے کہ انھوں نے کتاب کو شروع کرنے کے بعد ختم کرکے دم لیا۔ اور مجھے لکھتے ہوئے چوتھا برس ہے۔ نہ لکھنا ختم ہوا نہ چھپنا۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنی شروع کی اور کتاب کا تاریخی نام بھی اُسی سال نکال لیا۔ اسی سال کتاب چھپنی شروع ہوئی، لیکن ۱۹۳۹ء کے شروع میں تالیف و طباعت دونوں بند ہوگئیں۔ پھر آخر سال میں دونوں کام شروع ہوئے اور رُک گئے پھر ۱۹۴۰ء میں کتاب کے ۴۹۶ چھپنے کے بعد مسوّدہ ختم ہوگیا اور کام بند رہا۔ اب ۱۹۴۱ء کے وسط میں پھر لکھنا اور چھپنا شروع ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فہرست مضامین بھی چھپتی جاتی ہے۔ اسی سال ختم کرنے کے ارادے سے اختتام تالیف کی تاریخ بھی سر ورق پر لکھوا دی ہے وما توفیقی الا باللہ۔ یہ مضمون دیباچے میں لکھنے کا تھا، لیکن یہیں سہی۔ حامد حسن قادری

اخلاق و آداب کا ایسا احاطہ کیا ہے کہ اپنے نزدیک ادنیٰ سی بات بھی انہیں چھوڑی۔ نمونے کے طور ایک چھوٹی سی فصل پوری نقل کی جاتی ہے :-

حقے پان کے آداب

عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ (ترمذی)	ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آدمی کا بہترین اسلام ان چیزوں کے چھوڑ دینے میں ہے جو اس کے کار آمد نہیں۔

من المترجم۔ ہم اپنی جگہ اسی خیال میں ہیں کہ یہ کتاب احکام شریعۃ اسلامی کے فتاوے کا کام دے۔ بڑی چھوٹی کوئی بات اس سے رہ نہ جائے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں میں ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بڑی بھول ہوئی کہ حقے پان تماکو کی نسبت کچھ نہیں لکھا، حالانکہ یہ چیزیں ہم مسلمانوں میں اس کثرت سے چل پڑی ہیں کہ اب ان ہی کی توانمع مُدارات رہ گئی ہے۔ اور غالباً دو تہائی سے زیادہ ہی زیادہ مرد و زن اس بلا میں مبتلا ہیں۔ حقیقت میں تو حقہ پان تماکو ماکولات اور مشروبات کی قسم کے ہیں نہیں، اور اسی وجہ سے ہم نے کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کے بیان میں ان کے حال سے تعرض نہیں کیا۔ مگر بولنے میں حقے پان تماکو کو کھانے پینے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کثرتِ استعمال اور تعبیر کے لحاظ سے ہم نے اُن کا جُدا گانہ باب قائم کیا۔ فرضی حکایتوں میں سے ایک حکایت ہے کہ ایک چوہے کو کہیں سے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی۔ وہ برخود غلط اسی گرہ کے برتے پر اپنے تئیں پنساری سمجھنے لگا۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ خصوصاً ان دنوں کے متزلزل العقیدہ مسلمانوں کا کہ تا وقتیکہ عقل اجازت نہ دے، معاذ اللہ خدا رسول کسی کے کہنے کا یقین نہیں کرتے، تو یہ گویا وہی برخود غلط چوہے ہیں، اور عقل اُن کی ہلدی کی گرہ۔ بے شک ہم کو عقل اسی لئے دی گئی ہے کہ ہم اس سے دنیا اور دین

دونوں میں مدد لیں۔ اس کی ہدایت پر کاربند ہوں، اور عقل ہی کی وجہ سے ہم مکلف باشرائع بھی ٹھہرائے گئے ہیں۔ مگر غلطی کیا ہوتی ہے کہ ہم (ہر کس را عقل خود بکمال و فرزند خود بجمال) اپنی عقل کو عقل کامل سمجھ کر اس کو معصوم عن الخطا مانے ہوئے ہیں۔ اور عقل سے فوق طاقت کام لیتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص چشم سر سے پس دیوار یا مسافت بعیدہ پر دیکھنے کا قصد کرے۔ پس یہ ہے منشا گمراہی کا، اور اسی سے کہا گیا کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَرُ۔ اب یہی حالہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کا ہے۔ ہم نے سوچ کر حرمت کی دو وجہیں پیدا کیں مَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ کے لئے مانعتِ شرک، اور باقی محرمات کے لئے ان کا از روئے طب انسان کی جسمانی و ذہنی اخلاقی صحت کے حق میں اور پر سو پر مضر ہونا۔ اس پر بھی اگر کسی خاص چیز کی حرمت کی وجہ شافی سمجھ میں آئے تو قصور فہم کا اعتراف کرکے ہم کو چاہئے کہ حکم شارع کو بے چون و چرا تسلیم کریں۔ ہاں ایسا بھی ہے کہ بعض چیزوں میں شارع نے بنظر مزید اہتمام و احتیاط تضییق بھی کی ہے، تو وہ بھی مبنی بر مصلحت ہے جیسے شراب کہ حدِ سُکر کو نہ بھی پہنچے تو بھی حرام ہے۔ [۵۱] تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ **حقہ** پان تماکو میں حقے کا تو کچھ قصور نہیں کہ وہ ایک آلہ ہے، اور نہ پان کا کہ وہ پتا ہے۔ قصور جو کچھ ہے تماکو کا ہے، تو مولویوں کے جھگڑے میں کون پڑے۔ کوئی اس کو حرام بتاتا ہے، کوئی مکروہ تحریمی، کوئی مکروہ تنزیہی اور بعض اس کی حلت کے بھی قائل ہیں۔ ہم تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ اپنے پیچھے ایک لت لگا لینے کی تو بات ہی اور ہے۔

---

۵۱ یہ اللہ کی (باندھی ہوئی) حدیں ہیں تو ان کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ (خلافِ حکم کرنے سے) بچیں۔ ۵۲

---

۱۵۲ الحقوق کے اس حاشیے میں جو ترجمہ درج ہے، اس میں اوپر کی دوسری آیت کا ترجمہ نہیں ہے۔ غلطی سے کسی اور آیت کا ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس آیت (ومن یتعد) کا ترجمہ یہ ہے:-

"اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔"

تماکو کھایا جاسے یا پیا جاسے یا سونگھا جائے۔ عادت سے پہلے لایعنی تو ضرور ہے۔
اور مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ کی رُو سے تماکو کا استعمال
کسی طرح بھی ہو پرہیزگاری کی شان سے بعید۔ جتنے کا تماکو ملک میں خرچ ہوتا
ہے، صوبے صوبے میں یونیورسٹی (دار العلوم) بنا دینے کا تو میں ٹھیکا لیتا ہوں
لیکن اگر خدا کسی قوم کی عقلیں گدّی میں لگا دے تو وہ کیا فلاح پا سکتی ہے۔
مولوی بیچارے حُرمت نہیں کفر و ارتداد کے فتوے بھی دیں تو تماکو کا رواج
رُک نہیں سکتا کہ اب شرطِ زندگی ہو گیا ہے۔

نذیر احمد صاحب نے من المتوجم میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کا طول کلام کا شوق ظاہر ہے۔ اسی طرح ہر جگہ بات کو بڑھا کر کہتے ہیں۔ لیکن کمال یہی ہے کہ ان کا "درازتر" کہنا بھی "لذیذ" ہوتا ہے۔

(۸) الاجتہاد، یہ ڈپٹی نذیر احمد کے آخری زمانے کی کتاب ہے۔ ۱۹۰۸ء (۱۳۲۴ھ) میں تصنیف کی ہے۔ اور ان کے اُسی خصوصی رنگ کی کتاب ہے۔ صرف وجہ تالیف کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے یہ خیال آیا کہ "میں کیوں مسلمان ہوں؟" یہ خیال کچھ ایسا پیچھے پڑا کہ ہر چند میں اس کو ٹالنا چاہتا تھا۔ ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ یہاں تک کہ کئی سال متواتر میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں رہا۔ خیال نے ایسی وسعت پکڑی کہ تھا تو میں ایک، مگر ایسا معلوم ہوا کہ ایک سے دو ہو گیا ہوں ایک حیثیت سے سائل اور دوسری حیثیت سے مجیب۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا خیال کبھی دوسرے مسلمانوں کو بھی آتا ہے یا نہیں، مگر آنا چاہئے۔ بلکہ مسلمانوں کی خصوصیت نہیں، میں تو کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کو جو مذہب کی ضرورت کو سمجھ کر کسی خاص مذہب کا معتقد ہو، کبھی نہ کبھی اپنے نفس سے یہ پوچھنا چاہئے کہ وہ کیوں مثلاً ہندو یا عیسائی یا یہودی یا پارسی یا کیا یا کیا ہے۔ ایسا خیال کرنے سے توی اُمید ہے کہ وہ حق کو دریافت کرلے گا۔"

چنانچہ الاجتہاد میں سوال و جواب کی صورت میں تمام عقائد مذہبی و اسلامی سے بحث کی ہے، اور اسلام کو عقل کے مطابق ثابت کیا ہے۔

(۹) مبادی الحکمۃ، علم منطق کا رسالہ ہے اور نذیر احمد صاحب کی قدیم تصانیف میں ہے۔ ۱۸۷۱ء (۱۲۸۸ھ) میں لکھا گیا۔ اس کا سبب تالیف یہ بیان کرتے ہیں:-

> اب وقت وہ پہنچا اور وہ زمانہ آگیا کہ مشکل سے مشکل مضمون اور پیچیدہ مطلب پر بھی ہم اپنی اپنی ہی زبان میں مباحثہ اور مناظرہ کرتے رہیں۔ پس کیا ایسی حالت میں زبان اردو منطق کی حاجت مند نہیں؟ بخت حاجت مند ہے۔ دعوے کا اثبات حق کا مطالبہ استحقاق کی حفاظت، دلیل کی استواری، مطلب کی تائید اعتراض کی تردید، الزام کا دفعیہ، فریب کی پردہ دری، مغالطے کا افشا حتیٰ کہ احقاق حق، و ابطال باطل، منطق نہیں تو کچھ نہیں۔ یہی حاجت دیکھ کر میں نے اس رسالہ اردو میں ضروری مسائل علم منطق جمع کئے۔ باتیں وہی قطبی اور اس سے فروتر کتابوں کی ہیں۔ طرز ادا میرا ہے اور ایک انگریزی رسالہ منطق جناب افضل الحکماء ایم کیسن صاحب بہادر دام اقبالہم نے عنایت فرمایا تھا۔ کچھ اس سے اخذ کر لیا ہے۔ یوں عربی اور انگریزی مل کر ایک شان خاص پیدا ہو گئی ہے۔

اردو میں اس سے پہلے بھی منطق کی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے بعض کے نمونے پہلے آچکے ہیں۔ مولوی عبدالحق منطقی خیرآبادی نے اپنا رسالہ منطق بالکل قدیم اصول و طرز پر لکھا ہے۔ اور لوگوں نے کوئی جدت پیدا کی تو اختصار مضمون اور قدامت زبان کے سبب سے اس میں لطف پیدا نہ ہوا۔ مولوی نذیر احمد نے اپنی جدت طرازی سے کام لیا۔ اور اردو میں بالکل نئی چیز پیدا کر دی۔ لیکن علماء و مدرسین کی قدامت پرستی نے نذیر احمد صاحب کی "مبادی الحکمۃ" سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی منطق کی

تعلیم جاری، لیکن وہ انگریزی زبان میں ہے۔ اس لئے ڈپٹی صاحب کی یہ کتاب آگے نہ چل سکی۔ ان کے بعد مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی مرحوم نے ایک منطق کی کتاب الاستدلال کے نام سے لکھی اور اچھی لکھی۔ اس میں عربی و انگریزی دونوں اصطلاحیں لکھی ہیں اور طرز بیان شگفتہ و دلچسپ ہے۔ مبادی الحکمۃ کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

حدِ اوسط۔ قیاس کے دو مقدموں میں حدِ اوسط کا مکرر ہونا انتاج (نتیجہ دینا) کے لئے شرطِ اعظم ہے۔ اس میں کبھی کبھی مغالطہ بھی واقع ہوتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بادی النظر میں تو حدِ اوسط مکرر معلوم ہوتی ہے جو لفظ صغریٰ میں ہے وہی کبریٰ میں ہے۔ مگر ایک میں اس لفظ کے حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں۔ دوسرے میں مجازی۔ یا ایک میں لغوی دوسرے میں منقول۔ یا یہ کہ وہ لفظ مشترک ہے۔ ایک میں کچھ دوسرے میں کچھ۔ مقولات شعرا تمام تر اسی طرح کے مغالطات سے بھرے ہوتے ہیں۔ مثلاً

مکن در خانہ سازی طول۔ اندک عرض من بشنو
کہ ایں را قصر می نامند۔ باید مختصر کردن

شاعر اپنے مخاطب کو قلیل عمارت کی رائے دیتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ یہ قصر ہے اور جتنے قصر ہیں ان کو اختصار لازم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس عمارت کو اختصار لازم ہے۔ یہاں لفظ قصر منشائے مغالطہ ہے کہ اس کے معنی لغوی بے شک کم کرنے کے ہیں، مسافر کا قصر، صلوٰۃ کا قصر، بالوں کا قصر، بلکہ قصور بمعنی خطا، سب اسی مادّے سے ہیں۔ لیکن قصر کے دوسرے معنی حویلی اور محل کے بھی ہیں۔ پس لفظ قصر مشترک ہوا۔ صغریٰ میں ایک معنی مراد لئے اور کبریٰ میں دوسرے مثلاً

گر اب کے پھرے شیخ جی کعبے کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

پھرنا مراجعت اور واپس آنا ایک معنی تو یہ ہیں، اور ایک چیز سے بدعقیدہ ہو جانا دوسرے معنی یہ ہیں۔ اور اللہ کے گھر سے پھرنا چھلکے سے بچات پاکر سلامت نکل آنا تیسرے معنی یہ ہیں۔ یا مثلاً

ہوس ہیں کعبہ کی کیوں شیخ بت خانہ سے گرہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے

"اللہ ہی اللہ ہے" اور معنوں میں مستعمل ہوتا ہے یا یہ کہ سوائے خدا کے اور کچھ نہیں، دوسرا یہ کہ کچھ بھی نہیں۔

(۱۰) **اُمہاتُ الاُمّہ** (یعنی اُمّت کی مائیں) اس کے دو ایک فقرے مولوی نذیر احمد صاحب کی بے اعتدالیوں کی مثال میں پہلے درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں اُمہات المومنین ازواج نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حالات اور تعدّدِ ازواج کے دواعی و اسباب بیان کئے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اس ضمن میں معترضین اسلام کو جواب دیا جائے۔ یہ مقصد صحیح و درست تھا۔ سرسید نے بھی کسی عیسائی کی کتاب "اُمہات المومنین" کا جواب لکھا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے نذیر احمد صاحب نے اپنی حسب عادت اس کتاب میں بھی وہی بے تکلّف زبان و اسلوب اختیار کیا، اور ازواجِ مطہرات و اہلِ بیت کے تذکرے میں "تریا چرتّر" "سوکنوں کی باہمی کٹا چھنی"، "کہیں یہاں پانی نہ مرتا ہو" وغیرہ عامیانہ و تبذل محاورے استعمال کئے، اس سے پہلے ڈپٹی صاحب کی تحریروں میں بے ادبی کی ایسی صریح مثالیں نہ تھیں۔ اُمہات الاُمّہ کے شائع ہوتے ہی عام پبلک کی طرف سے اور خاص کر علماء کی جانب سے اعتراض و احتجاج کا ہنگامہ برپا ہو گیا اور کفر و بیدینی کے فتوے صادر ہونے لگے۔ اول تو مولانا ہنس ہنس کر ٹالتے رہے، لیکن جب مولویوں نے حملہ کر دیا اور کتاب کی تمام جلدیں حوالے کرنے اور جلانے کا مطالبہ کیا، تو بہت حیلے بہانے تاویلیں کیں۔ سیکڑوں ہزاروں روپیہ کا نقصان ہوا جاتا تھا۔ مگر آخر کو مان لینے ہی میں رفع شر نظر آیا۔

گھر پر اور مطبع میں جتنی کتابیں تھیں سب علماء نے قبضہ میں کر لیں۔ اور کان پور کے جلسۂ علماء میں پیش کیں۔ اس کا حال نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمان خاں صاحب شیروانی نے لکھا ہے کہ ایک رات کو ۲ بجے تک اس کتاب پر مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر بکثرت رائے سوختنی قرار پائی۔ چنانچہ سب جلدیں ایک جگہ ڈھیر کی گئیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب خود اٹھ کر مٹی کے تیل کی بوتل لائے، کتابوں پر چھڑکا اور دیا سلائی لگا دی۔ یہ واقعہ ہندوستانی کی تاریخ ادب میں شاید پہلا ہے۔ اس سے پہلے کسی کتاب کا یہ حشر سننے میں نہیں آیا۔[۵]

بعد کو عرصے تک اس واقعہ پر موافق و مخالف رائے زنی اور داد فریاد ہوتی رہی۔ ان میں اکثر نئی تہذیب کے آزاد خیال نوجوان تھے، لیکن تعجب ہے کہ سب سے زیادہ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو برہم و برافروختہ ہوئے۔ ہم نے یہ کتاب شائع ہوتے ہی ہنگامہ آرائی سے پہلے دیکھ لی تھی۔ ۵۴ برس سے زیادہ ہو گئے۔ جب سے اب تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک مسلمان زبان و ادب کی محبت میں رسولؐ و آل رسولؐ کی محبت پر کیونکر مقدم رکھ سکتا ہے۔

ایک عرصے بعد ڈپٹی صاحب کے صاحبزادہ مولوی بشیر الدین صاحب نے امہات الامہ کو دوبارہ شائع کیا اور بعض قابل اعتراض الفاظ نکال دئے۔ مختصر نمونہ یہ ہے:-

"لوگ بی بیاں کرنے میں جو اعتراض مدِ نظر رکھتے ہوں، ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے، اور ہمارا دل کیا گواہی دیتا ہے، ہر ایک منصف کا دل گواہی دے گا

---

۵ اسکے بعد زمانہ حال میں تقریباً ۵۰ سال ہوئے ایک کتاب البتہ جلائی گئی چند نوجوان ترقی پسند ادیبوں نے افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع کیا تھا۔ ان میں تخریب اخلاق اور توہین مذہب اس حد تک تھی کہ حکومت نے کتاب کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا۔ اور لکھنؤ میں اسکے نسخے جلا دیے گئے۔

کہ پیغمبر صاحب نے جو بی بی کی، اسلام کا مفاد مدِ نظر رکھ کر۔ کیسی نفسانی خواہش اور کیسا حسن وجمال اور کیسی دولت۔ ان کو اسلام کے آگے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہم اس کی ضرورت تو سمجھتے نہیں کہ مناکحت کو خلاف شانِ پیغمبری سمجھ کر پیغمبر صاحب میں فقدانِ قوت کے قائل ہوں۔ ایسا سمجھنا ان کے کمال انسانیت کو بٹّا لگانا ہے بس سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب کی مناکحت میں اس قوت کو بھی دخل ضرور تھا۔ مگر اسلام کی دُھن کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں، بشری اغراض مغلوب تھیں۔ ہر نکاح میں اول اور اقدام اسلام، اور اسلام کی رو کھن میں دوسری اغراض۔ اور یہی وجہ تکثیر ازدواج کی بھی ہوئی کہ دامادی کے دباؤ سے سارے سسرال قبیلے کو جھکنا پڑتا ہے، اور اسی کی اسلام کی اشاعت کے لئے بڑی ضرورت تھی۔ یہاں تک کہ جب اسلام کو خدا نے غلبہ دیا اور اعوان و انصار کے بہم پہنچانے کی ضرورت نہ رہی تو لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ[۱] سے تکثیر کو روک دیا۔

(۱۱) **ڈپٹی نذیر احمد کے لکچر**، ان کی قوت تقریر اور کمال خطابت کا پہلے ذکر کیا گیا۔ لکچروں کا بڑا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر دو لکچروں میں سے اقتباس کیا جاتا ہے۔

(الف) آغاز اسلام کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں:۔

ان کے زمانے میں اور ان کی کوششوں سے اسلام کا ترقی پانا، یہ زبردست ثبوت ان کی نیتوں[۲] میں ہے کہ کسی احتمال مخالف کو جمنے ہی نہیں دیتا۔ جس طرح انسان اشرف المخلوقات ہے، اسی طرح مسلمان کامل افضل الناس ہے صرف دین کے اعتبار سے نہیں، بلکہ میرا نہایت مستحکم عقیدہ ہے کہ جن صفتوں کے مجموعے کا نام اسلام ہے نیچرلی[۳] اس بات کے مقتضی ہیں کہ دنیا میں بھی مسلمانوں

---

[۱] (اے پیغمبر اس وقت کے) بعد سے دوسری عورتیں تم کو درست نہیں۔
[۲] حمایت، طرفداری۔ [۳] قدرتی طور پر

ہی کو فضیلت اور برتری ہو، بلکہ میں تو دنیاوی ترقی و تنزل کو اسلام یعنی دین اسلام کے کامل و ناقص ہونے کا معیار قرار دیتا ہوں۔ وہ مسلمان بڑی غلطی پر ہیں، اور افسوس ہے کہ ایسے بہت ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کی رسالت کا مقصود یہ تھا کہ ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں یا عیسائی راہبوں کی قسم کا ایک گروہ تیار کیا جائے، نرے خدا پرست دنیا سے بے نصیب محض۔ اگر پیغمبر صاحب کا یہ مقصد رہا ہو، اور میں کہتا ہوں کہ نہیں رہا، وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ نہیں رہا، ہرگز نہیں رہا، تو معاذ اللہ پیغمبر صاحب کی رسالت کی نسبت فیلیور، ٹوٹل فیلیور[۵] کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ پیغمبر صاحب نہیں چھوڑ کر مرے خدا پرست جوگی، خدا پرست سنیاسی، خدا پرست راہب، خدا پرست آجکل کے سے ٹکڑ گدے، بھک منگے، علما اور مشائخ۔ بلکہ خدا پرست امپررز (شاہنشاہ)، خدا پرست کنگز (بادشاہ)، خدا پرست منسٹرز (وزیر) خدا پرست ایڈمنسٹریٹرز (مدبران ملک)، خدا پرست کمانڈرز (سپہ سالار)، خدا پرست ججز، خدا پرست آرٹسٹ (فصحا)، خدا پرست مرچنٹ (سوداگر)، خدا پرست دنیا دار آف اوری کالنگ اینڈ پروفیشن (ہر ایک پیشے اور ہر ایک مشغلے کے) اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَھُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَ مَغْفِرَۃٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ۔

(لکچر ایجوکیشنل کانگریس اجلاس چہارم منعقدہ دسمبر ۱۸۸۹ء بمقام علی گڈھ)

ان چند سطروں میں انگریزی الفاظ بولنے کا شوق قابل دید ہے۔ یہ تقریر نذیر احمد صاحب کے ابتدائی لکچروں میں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زمانہ آغاز کی تقریروں میں ہے جب کہ اس کے نام میں کانفرنس کی جگہ کانگریس کا لفظ ہندوؤں کی انڈین نیشنل کانگریس کی تقلید میں تھا۔ اسی لکچر کا دوسرا اقتباس یہ ہے:۔

(ب) ہم یہ کہنے کو تو موجود ہیں کہ "مسکین این ندارد آں ندارد"۔ مگر کرنے کے نام میرے دیکھتے میں تو اتنا ہوا ہے کہ سید احمد خاں کے غل شور مچانے سے قومی مرثیہ خوانوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ جب تک لکھنؤ میں نوابی رہی مرثیہ خوانی

---

۵ ناکامی، پوری ناکامی۔

کا بڑا زور و شور تھا۔ اور اسی طرز خاص کو **انیس** اور **دبیر** نے حقیقت میں معجز بیانی کی حد تک پونہچا دیا۔ نہ کسی نے ان جیسا کہا اور نہ کوئی ان جیسا کہہ سکے گا۔ اب جو نئی قسم کے مرثیہ خواں چلے تو اس کے مُوجد ہوے ہمارے **مولوی الطاف حسین صاحب حالی** انھوں نے ایک بڑی دھوم کا **مُسدّس** لکھ کر کچھ ایسا بگل پھونکا کہ جہاں جہاں موزوں طبع تھے سب لگے ان ہی کی لے میں گانے اور گنگنانے۔ گنگنانے والوں میں یہ آپ کا نیاز مند بھی ہے کہ شعر تو نہیں کہہ سکتا، مگر تک سے تک ملا لیا کرتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ **مولوی الطاف حسین** نے **مُسدّس** اس غرض سے کہا تھا کہ ایشیائی شاعری میں ایک طرز جدید داخل کریں، بلکہ ان کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوتی ہوئی قوم جاگے، اور دیکھے کہ تباہی کا سیلاب ان کے سروں پر آ پونہچا۔ مگر قوم نے جاگنا تو در کنار کروٹ تک بھی تو نہ لی۔ اور ان کے **مُسدّس** کا ایک کھیل بنا کھڑا کیا۔ کوئی اس کو اس لئے نہیں پڑھتا کہ سمجھے اور عمل کرے۔ نظر پڑتی ہے تو وہی محاسن شاعری پر۔ اور **سید احمد خاں صاحب** برا مانیں تو مانیں، قریب قریب یہی حال ہے اس **کانگرس** کا۔ اکثر تو تماشائی ہوں گے۔ بعض اس کو ایک طرح کی محفل مشاعرہ سمجھ کر شریک ہوے ہوں گے کہ سر سید لکچر دیں گے، **مولوی الطاف حسین، مولوی شبلی، منشی احمد علی شوق** اپنے اپنے افکار تازہ پڑھیں گے۔ دراصل کر سنیں تو سہی کیا کہتے ہیں۔ بعض صرف سر سید احمد خاں کے **لبّیکی** ہوں گے اور بعض شُہدا ہوں گے، لڑنے بھڑنے کے نہیں، لہو لگا لینے کے۔ جو چاہتے ہیں کہ محض کانفرنس میں شریک ہونے کی وجہ سے ان کا نام دردمندان قوم کی فہرست پر چڑھ جائے۔ جتنے صاحب شریک محفل ہیں سب سے بدتر میں ہوں۔ کہنے کو آندھی کرنے کو خاک جب آدمی خود ایک بات کا عامل نہیں دوسرے پر اس کا اثر کیا ہو۔ غرض کیا متمع

کیا لکچرار، ہیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے، بھلا پھر ایسے مجموں سے کیا فلاح ہونی ہے۔ دو نے آے مرتے کی خبر لیکر چلے۔ قوم کا تو یہ حال ہے کہ ایک ایک منٹ اور ایک ایک سکنڈ کی دیر میں، برسوں نہیں عمروں کا نقصان ہو رہا ہے اور یہاں ہنوز روز اوّل ہے۔"

(ج) یہ ڈپٹی صاحب کا اکتالیسواں لکچر ہے جو ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۰ء بمقام ریاست رامپور میں پڑھا گیا۔ یہ لکچر نذیر احمد صاحب کی زبان سے سننے کا شرف ہم کو بھی حاصل ہے۔ شروع میں ایک طویل نظم اور اس کی "بین الاشعار" تشریح ہے۔ نظم کا مطلع یہ ہے:-

الٰہی دے مسلمانوں کو توفیقِ مسلمانی　　کہ پھر آجاے کشتِ مُردۂ اسلام میں پانی

اور مقطع یہ ہے:-

تم اپنی نثر لو اور نظم کو چھوڑو نذیر احمد　　کہ اس کے واسطے موضوع ہیں حالی و نعمانی
یعنی شبلی

نظم کے بعد فرماتے ہیں:-

عِبَادَ اللّٰہ رَحِمَکُمُ اللّٰہ، میں نے نظم میں آپ کا بہت سا وقت لے لیا ہے کہ آڈینس[۵۱] قرآن سے اُوور ڈوسڈ ہوگیا ہے، یعنی عادت سے زیادہ قرآن سنایا گیا ہے۔ اس لئے کہ مجکو تمام آیتوں کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اب اس کی تلافی سوائے اس کے کچھ میرے اختیار میں نہیں کہ نثر میں کمی کروں۔ کہنا تو بہت ہے، مگر میں تعلیم کے متعلق صرف چند باتیں کہہ کر بس کروں گا۔ سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ تعلیم کی غرض وغایت کیا ہے...... پس تعلیم کے مفید ونامفید ہونے کا معیار ٹھہرا انسان کی آسایش، انسان کی عافیت۔ تو تعلیم کی دو شاخیں ہوگئیں۔ جو تعلیم انسان کے قواے عقلی کو ڈِولپ[۵۲] کرے اس کو ہم دنیاوی تعلیم کہیں گے، اور جو تعلیم انسان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرے۔ اس کو دینی۔ یہ امر داخل بداہت ہے کہ اہل یورپ کے قواے عقلی بڑے زوروں پر ہیں، اور دیل

[۵۱] مجمع حاضرین۔　　[۵۲] ترقی دے، بڑھاے

اور اسٹیمر اور تار برقی اور انواع و اقسام کی مشینیں ان ہی ذوروں[51] کے آثار ہیں۔
دو چار سیدھی سادھی کلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خدا علیم ہے کہ ان کا کانسٹرکشن
سمجھ میں نہیں آتا۔ کیسے ذہن ہوں گے جنھوں نے ان کو ایجاد کیا ہوگا۔ اچھا تو یہ
زور ان کے قوائے عقلی ہیں۔ یہ انتقال ان کے ذہنوں میں کہاں سے آیا۔ آب
ہوا تو وہی ہے جو پہلے تھی۔ لیکن تاریخ بتا رہی ہے کہ اب سے زیادہ چار ساڑھے
چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں اور بھیلوں کی طرح اہل یورپ بھی
وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے، یا اور بہت سے ملک ہیں جن کی آب و ہوا یورپ
کی آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے، اور وہاں کے باشندے کندۂ ناتراش ہیں۔
ہو نہ ہو یہ ترقی یہ عروج جو اہل یورپ کو ہے، سائنس کی تعلیم کا نتیجہ ہے، جو یورپ
میں تکمیل کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ اور گورنمنٹ نے کمال فیاضی سے اس کی بجد
نیٹوز[52] کو پڑھانی شروع کی ہے۔ فَمِنْهُمْ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ عَنْهُ[53]
صَدَّ عَنْہ میں کم نصیب بدقسمت بدبخت مسلمان ہیں، جو اب تک اس جدید تعلیم کی طرف
سے پس و پیش میں پڑے ہیں۔ پس اس کو تو خدا کی طرف سے فیصل شدہ سمجھو کہ
دنیاوی بہبود و فلاح تو بدوں سائنس کی تعلیم کے ہوتی نہیں ان شخصیاً شخصی و
ان تومیاً فقومی۔ مگر سائنس کے خزانے انگریزی کے صندوقوں میں بند ہیں۔
پہلے ان صندوقوں کا کھولنا سیکھو تب خزانے کو ہاتھ لگاؤ۔ اور نہیں سیکھتے تو
سلطنتیں کھو کر رعیت بنے ہو، آگے اپنے ابنائے جنس کی غلامی کرو، جھڑکیاں
سنو، جوتیاں کھاؤ، اگلوں کا ڈھکا سینتا ہو چکے تو بھیک مانگو۔ مگر میری
صلاح مانو تو سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیکر ڈوب مرو

قسمت میں قوم کے ہے لکھی صبح و شام موت
بے حرمتی کے جینے سے بہتر حرام موت

---

۵۱ ترکیب و ساخت ۵۲ دیسی ہندوستانی لوگ
۵۳ لوگوں میں کوئی اس (کتاب) پر ایمان لایا اور کوئی اس سے ٹھٹک رہا۔

نذیر احمد صاحب کی ایک صنف تحریر ان کے **خطوط** بھی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی خاص "مکتوباتی جدّت" نہیں ہے۔ ان کا ایک مجموعہ "موعظۂ حسنہ" ہے جو انھوں نے اپنے صاحبزادہ مولوی بشیرالدین کو ان کی تعلیم کے زمانے میں لکھے ہیں۔ ان خطوط میں تعلیمی ناصحانہ رنگ غالب ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

اردو میں مشاہیر و مصنفین کے خودنوشت حالات شاذونادر ملیں گے۔ سب سے زیادہ مرزا غالب نے اپنے رقعات میں اپنے حالات لکھے ہیں۔ مگر ایک جا نہیں جابجا منتشر ہیں۔ تاہم ایسے ہیں کہ جمع و مرتب کرنے سے غالب کی خودنوشت سوانحعمری بن سکتی ہے۔ ان کے بعد کسی کی ایسی تحریریں نہیں پائی جاتیں۔ اتفاق سے مولانا حالی کے حالات ان کے قلم کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی نے ۱۹۰۱ء میں خواجہ صاحب سے فرمائش کی تھی۔ اس کی تعمیل میں لکھے گئے تھے۔ ہم اس تحریر کو ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہان آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دلی پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ "پیر ہرات" کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے جن کا سلسلۂ نسب ۲۸ واسطہ سے حضرت ابوایوب انصاری تک اور ۱۸ واسطہ سے شیخ الاسلام تک

اور دس ہزار واسطہ سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو
غزنوی دور میں فارس اور کرمان و عراق عجم کا فرمانروا تھا پہنچتا ہے۔
چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم
اشراف خاندان کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد
علماء و شعراء و دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ قدر داں تھا۔
اس لئے اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان
سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی
کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔
چنانچہ سلطان غیاث الدین نے انھیں عمدہ اور سیر حاصل
دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ اراضی سواد قصبہ پانی پت
میں بطور مدد معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ
پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت
و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں
واقع ہیں اور خطابت عیدین ان سے متعلق کردی۔ پانی پت میں جو
اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں بزرگ کی اولاد
سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ
رکھتا ہوں۔ اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو
یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہے بیٹی تھیں۔
اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں سے بہت سے لوگوں نے
اول سلطنت مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہان اودھ کے دربار
میں نہایت درجہ کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی
ملک و مدد معاش پر قانع رہے۔ جو سلاطین اسلام کی طرف سے
وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوتی رہی۔ میرے آبا و اجداد نے جہاں تک

معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ؎ نے سرکار انگریزی کی نوکری سر رشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ اور میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہ ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے۔ بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے۔ اور فارسی لٹریچر اور تاریخ اور طب میں ید طولی رکھتے تھے۔ ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور انکی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہو گیا۔ انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لیکر آئے تھے۔ ان سے صرف و نحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلۂ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی۔ اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارا تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود تھے۔ سب کی خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا۔ اور بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا۔

؎ والد کا نام خواجہ ایزد بخش ہے۔ محکمہ نمک میں ملازم تھے۔

میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں مَیں نے نشو و نما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سُننے میں نہ آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے، بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما، مجہلے[1] کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھے روز و شب رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبا، کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرا تھا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں۔ اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرح سُلّم ملا حسین اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے آ کر ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔

---

[1] مدرسہ کے مقابلہ میں مجہلہ یعنی جہالت خانہ۔

۱۸۵۶ء میں مجھے حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذارے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور ان میں سے جب کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور خاص کر علم ادب کی کتابیں۔ شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم اور نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جسقدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوا تھا مرزا اسد اللہ غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اکثر ان کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانہ میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسنِ اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہو گئی۔ اور آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت ان کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے

انیس کے مرثیہ کا یہ پہلا مصرع پڑھا "آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے" اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجکو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادہ کو پورا کیا۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر، دوسری امید پر، تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔

نظم کے سوا نثر میں چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب تریاق مسموم نیٹو کرسچین کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا لکھی تھی۔ جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ

بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لئے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النسا، لکھی تھی۔ جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔ اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو پھر دلّی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیات سعدی ہے جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ پھر شاعری پر ایک مبسوط "ایسے" (مضمون) بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے۔ اور اب سر سید احمد خاں مرحوم کی لایف موسوم بہ حیات جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں۔ جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہیں۔ جو ہنوز شائع نہیں ہوتی۔ جب سے

ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سر سید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا اور اردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے۔ اور علی گڈھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۰۵ھ ہجری میں جبکہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا۔ نواب سر آسماں جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امداد مصنفین ایک وظیفہ پچھتر روپیہ ماہوار کا میرے لئے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جبکہ سر سید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ، حیدرآباد گیا تھا اس وظیفہ میں پچیس روپیہ ماہوار کا اضافہ کرکے سو روپیہ سکہ حالی کا وظیفہ میرے لئے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

مولانا حالی کے باقی حالات ہم اخلاق ہم ڈاکٹر مولوی عبد الحق دہلوی کے مضمون مطبوعہ "چند ہم عصر" سے مختصر کرکے نقل کرتے ہیں:—

ایک دفعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا، اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب کہ غفران مآب اعلیٰحضرت کی جوبلی بلدۂ حیدرآباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کئے گئے تھے اور نظام کلب

کے ایک حصّے میں ٹھہرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جاکر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہوگئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کردئے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کرکے رخصت ہوگئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلنے جاتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا۔" اُس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھاسکے۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے "یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔" اس کیفیت سے جو کرب و درد مولانا کو تھا۔ وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِ دل۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ اُنکی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے۔ جو کوئی اُن سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر اُن کے حُسنِ اخلاق کا

مدّاح رہتا تھا۔ اُن کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔

ہندی اُردو کا جھگڑا اُن کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا اور اُس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی، لیکن باوجود اس کے کہ انھوں نے عمر بھر اُردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اردو کا رتبہ بہت بلند کر دیا، وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے چنانچہ خمخانۂ جاوید کے تبصرے میں لکھتے ہیں:۔

"کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدّت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف شگفتہ اور فصاحت بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالانکہ اُردو اِن کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریمر کا دارو مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے۔ عربی فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسما اُس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں۔ باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی

نظم و نثر مفیدِ معنی نہیں ہوسکتی، برج بھاشا یا سنسکرت کی گرامر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بناتا ہے کہ "دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر"۔

یہ بات بعض لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور بعض اُردو اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی، لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گزرے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اُردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اُسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔

ایک بار جب اُردو لُغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ اُردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اس موقع کے لئے وضع ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اُردو ادب میں داخل کئے جو ہماری نظر سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اُردو ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے۔ دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

اُن کا ذوقِ شعر اعلیٰ درجے کا تھا جیسا کہ حیاتِ سعدیؔ یادگار

غالب، اور مقدمۂ شعر و شاعری سے ظاہر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح ذوق پیدا کرنے میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ اسکی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آپڑتی تو وہ کھل کر اُس کے نکات بیان کرتے تھے۔

سرسید تو خیر اُس زمانہ میں مورد لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس و ناکس اُن پر منہ آتا تھا۔ لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھار پڑی وہ حالی تھے۔ ایک تو وہ ہر شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اُس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جُدا تھی اور نشانہ ملامت بن گئی تھی۔ اور مقدمۂ شعر و شاعری نے تو خاصی آگ لگادی۔ اہلِ لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں، وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ یہ ساری کارروائی انھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی صدا آنے لگی۔ اودھ پنچ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین "مقدمہ" کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ جن مضامین کے عنوان ایسے ہوں جیسے :-

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اس سے سمجھ لیجئے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی۔ مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چُپ
سب کچھ کہا اُنھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے انکی تقلید کرنے لگے۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مولانا نے دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی جس حالت میں تھے اُس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھیں عربک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدر آباد میں اُن کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کئے جس کے تخمیناً پچھتر حالی ہوتے ہیں۔ ایک مدت تک پچھتر ہی ملتے رہے، بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست حیدر آباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا، مگر اُنھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا اس کے لئے وہ بہت شکر گزار تھے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی جس نے چاہا چھاپ لی۔ اُن کی تصانیف مال یغما تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے۔ خصوصاً ایسے شخص کے لئے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔ جس سال حیدر آباد تشریف لائے سر سید کی برسی کا جلسہ بھی انھیں کی موجودگی میں ہوا۔ اُن سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کے لئے سر سید کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عماد الملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اس موقع کے لئے بہت اچھا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا

طویل تھا، پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی، اس لئے آخری حصہ چھوڑ دیا۔ قیام گاہ پر واپس آکر فرمانے لگے کہ میرا گلا بالکل خشک ہوگیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اچھا ہوا نہ ہیرا ہوگیا۔ ورنہ اس سے آگے ایک لفظ نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا، اُسی وقت پانی یا شربت حاضر کردیا جاتا۔ کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی[۵] کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ پیسہ اخبار جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگزاریوں سے خوش ہوکر اُن کی تعریف میں نظم لکھی۔ ہمدرد اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی۔ اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابل اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو سُجھاتے۔ اُن کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر اس بات سے بہت ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف

۵ ۱۹۰۲ء میں جب شیخ عبدالقادر صاحب نے لاہور سے رسالہ مخزن جاری کرنے کا اعلان کیا تو مولانا حالی پہلے شخص تھے جنھوں نے خبر سُنتے ہی اپنا سالانہ چندہ دفتر مخزن کو بھیج دیا۔ شیخ صاحب نے لکھا تھا مولانا پر یہ شعر صادق آتا ہے:۔

اوّل آں کس کہ خریدار شدش من بودم
باعثِ گرمیِ بازار شدش من بودم (مولف)

کرنے میں بہت فیاضی برتتے ہیں جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم پیشوں کی رقابت پُرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کرید کرید کر دیکھا اور ان کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزادؔ مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم تو اُن کا نام تک سُننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملے میں اُن کی طبیعت کا رنگ بعینہٖ ایسا تھا جیسے کسی سَوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مُشاعرے ہوئے، ان میں دونوں نے طبع آزمائی کی۔ برکھارُت، حُبِّ وطن، نشاطِ امید اُسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبعِ نازک پر گراں گزرا۔ اُس وقت سے اُن کا رُخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثل نثار ہیں مگر شعر کے کوچے میں ان کا قدم نہیں اُٹھتا۔ لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجئے، کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں:۔

"۱۸۷۴ء میں جبکہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے

مکان میں منعقد ہوتا تھا۔"

بات میں بات نکل آتی ہے۔ جب حیات جاوید شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لئے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لئے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لئے جو اُس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لیجا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف دیکھتے ہی فرمایا کہ "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔" وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سُن دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کچھ کہنا سوء ادب تھا، لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا گیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بے کار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سُنئے۔ قیام حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ "دکن ریویو" نکالتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرایے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے، آنکھیں نیچی کئے چُپ چاپ سُنا کئے۔ مولانا

---

۵ اس پر اضافہ یہ ہے کہ مولانا حالی اپنے خط میں ایک صاحب کو جو رسالہ آفسر کے ایڈیٹر رہ چکے تھے، لکھتے ہیں:-

" جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کلام پر کرٹکل ایسے (تنقیدی مضامین) لکھے جائیں، ان میں ایک شخص کا نام ہونے سے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔ (جس شخص کا نام ہے اس کے متعلق اپنی رائے لکھنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں) اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فرد گذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔"

یہ مثال مولانا حالی کی انصاف پسندی کے علاوہ اُن کے حسن ظن کی بھی ہے۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ ایڈیٹر افسر انتخاب کے وقت مولانا شبلی کو بھول گئے ہوں۔ لیکن مولانا حالی گمان نیک سے کام لیکر بڑی خوبصورتی سے اپنے مکتوب الیہ کو مولانا شبلی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ مؤلف

نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہو گی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا نہ ہو سکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے اُس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا کلام اور اُن کی تصانیف اس کی شاہد ہیں۔ اور جو سمجھتے تھے وہ کر کے دکھا دیا۔ آج سینکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشر عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح وہ بالکل خیالی شخص تھے بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اُس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عملی بھی، ایسا شاذ ہوتا ہے۔

تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو انھوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا جو اب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے۔ اور ایک پبلک اور نیشنل لائبریری قائم کی جو پانی پت میں سب سے بلند اور پر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہونگے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اُٹھتا تھا، مگر ویسے وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے۔

خصوصاً ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ خود کوئی ڈراما لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور ہیں۔" (اقتباس از "چند ہم عصر")

مولانا حالی کو ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ جس کے وہ سالہا سال سے مستحق تھے۔ یہ تاخیر اس لئے ہوئی کہ وہ طبعاً جاہ پسندی اور نمود و نمایش سے بے نیاز تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء (مطابق ۱۳۳۳ھ) کو اپنے وطن پانی پت میں انتقال فرمایا۔ مؤلفِ احقر حامد حسن قادری نے یہ تاریخ وفات کہی:-

"تاریخ از کلامِ پاک"　　　فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ (سورہ یٰسین)

۱۳۳۳ھ　　　۱۹۱۴ء

دوسری تاریخ سنہ ہجری میں نکالی:- حُسْنُ الْعَاقِبَةِ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ

۵ ۱۳۳۳ھ

مولانا حالی کی تصانیفِ نثر مولانا حالی اردو کے عناصرِ خمسہ میں وہ ضروری عنصر تھے جس کے بغیر مزاجِ اُردو صحیح و معتدل نہیں رہتا بلکہ جو علم و ادب کے نفسِ حیات کا جزو لاینفک ہے۔ حالی اور ان کے ہم عصروں نے ۳۰، ۴۰ برس کے اندر وہ لٹریچر پیدا کر دیا جس کے بغیر کسی زبان کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اور

۵ سر سید۔ آزاد۔ نذیر احمد۔ حالی۔ شبلی۔

جس کا کوئی نمونہ پہلے سے موجود نہ تھا۔ حالی کی تصانیف سے پہلے سرسید مذہبی و اصلاحی مقالات، آزاد تذکرہ و تاریخ، نذیر احمد ناول شروع کر چکے تھے۔
سیرت و سوانح اب تک کسی نے نہ لکھے تھے۔ حالی پہلے سیرت نگار ہیں تنقید شعر و ادب بھی ابتک اردو میں نہ آئی تھی۔ حالی پہلے تنقیدی مصنف بھی ہیں۔ شبلی نے سیرت و تنقید دونوں میں بڑا کام کیا، لیکن حالی کے بعد شروع کیا۔ حیات سعدی پہلی با اصول سیرت ہے۔

مولانا حالی نے اپنے حالات میں بعض تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تصانیف نثر بہ ترتیب تصنیف یہ ہیں:۔

(۱) **تریاق مسموم**، حالی کی سب سے پہلی تصنیف، کسی عیسائی کے جواب میں (۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ) اب ناپید ہے۔

(۲) **طباق الارض**، فرنچ زبان کی تصنیف علم الارض (جیالوجی) کا عربی زبان سے اردو ترجمہ۔ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۶۸ء میں چھاپا۔ لیکن اب نہیں ملتا۔

(۳) **اصول فارسی**، فارسی زبان کے قواعد۔ (۱۸۶۸ء)

(۴) **مولود شریف**، طرز قدیم کی کتاب محفل میلاد میں پڑھنے کے لئے۔ غالباً ۱۸۷۰ء سے کچھ پہلے لکھی۔ اور بعد وفات شائع ہوئی۔

(۵) **تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے**، اسی عیسائی کی کتاب کی تنقید۔ (۱۸۷۲ء / ۱۲۸۹ھ) اب نایاب ہے۔

(۶) **شواہد الالہام**۔

(۷) **مجالس النساء**، (دو حصے)، لاہور میں ۱۸۷۴ء میں عورتوں کے لئے اخلاقی قصہ لکھا۔ گورنمنٹ سے چار سو روپیہ انعام ملا۔

(۸) **سوانحعمری حکیم ناصر خسرو**، (۱۸۸۲ء / ۱۲۹۹ھ)۔ اب نایاب ہے۔

(۹) **حیات سعدی**، (۱۸۸۴ء / ۱۳۰۱ھ)

(۱۰) **مقدمہ شعر و شاعری**، ۱۸۹۳ء / ۱۳۱۰ھ میں اپنے دیوان کے ساتھ یہ مقدمہ شامل کیا۔

لیکن یہ خود ایک مستقل تصنیف تھی۔ اس لئے ۱۹۲۰ء میں علٰحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

(۱۱) **یادگار غالب**، (۱۸۹۷ء ۱۳۱۵ھ)

(۱۲) **حیات جاوید**، سرسید کی مفصل سوانح عمری ۱۹۰۱ء ۱۳۱۸ھ میں شائع ہوئی۔

(۱۳) **سوانحعمری مولانا عبدالرحمن**، یہ مولانا حالی کے استاد تھے۔

(۱۴) **مضامین حالی**، ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ سے ۱۹۰۱ء ۱۳۱۸ھ تک کے مضامین تہذیب الاخلاق، علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، کانپور میگزین، معارف[۵]، روئداد ندوۃ العلماء وغیرہ سے جمع کرکے مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی نے مرتب کئے اور پنجاب نیشنل ایجنسی پانی پت نے ۱۹۰۲ء میں شائع کئے۔

(۱۵) **مقالات حالی**، مضامین حالی کے بعد[۲] حصوں میں انجمن ترقی اردو نے شائع کئے۔

(۱۶) **مکتوبات حالی**، خطوط حالی ہیں۔ مولانا کے صاحبزادے سجاد حسین صاحب نے ۱۹۲۵ء میں شائع کئے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ شامل ہے۔

تصانیف نظم مولانا حالی کی شاعری اس تاریخ نثر کے مبحث میں داخل نہیں ہے، لیکن مولانا کے تذکرہ کمالات کے سلسلے میں مختصر طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مولانا فن شاعری اور نقدِ شعر میں اعلیٰ پایہ کے صاحب نظر و کمال تھے۔ ان کے دیوان غزلیات میں مومن و غالب کی نزاکت و لطافت کا اثر بھی ہے، اور درد و مصحفی کی سادگی و جاذبیت بھی۔

جدید شاعری کا آغاز اگرچہ آزاد کی کوشش و کاوش سے ہوا، لیکن ان کے رفیق کار بلکہ شریک غالب حالی تھے۔ لاہور کے مشاعرے میں حالی نے چار نظمیں پڑھیں، اور غالباً اتنی ہی آزاد نے لیکن حالی کی صرف دو نظمیں برکھارت اور حبِ وطن، آزاد کی سب نظموں پر بھاری تھیں۔ اس کے بعد حالی نے جو نظمیں لکھیں انھوں نے شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا۔

مسدس حالی (مصنفہ ۱۸۷۹ء) کی عظمت، قبولیت، تاثیر اور اشاعت کو

---

۵ یہ "معارف" مولوی سید سلیمان ندوی کے رسالہ معارف اعظم گڈھ سے بہت پہلے کا ہے۔ مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی نے علی گڈھ سے جاری کیا تھا۔

انیسویں صدی کی کوئی دوسری نظم نہیں پہنچتی۔ مناجات بیوہ (۱۸۸۶ء) خاص کر ہندوستان کی معاشرت و مذاق کی چیز ہے۔ اور مولانا حالی کی عظمت شاعرانہ تسلیم کرانے کے لئے یہ نظم تنہا کافی ہے۔ نشاط امید (۱۸۷۴ء) رحم و انصاف (۱۸۷۵ء) شکوۂ ہند (۱۸۸۶ء) چپ کی داد (۱۹۰۵ء) بھی اپنے اپنے رنگ کی پہلی نظمیں ہیں۔ باقی چھوٹی بڑی نظمیں جو ایک ضخیم مجموعہ کی قدر ہیں اور چند بار علٰحدہ و یکجا شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔ رباعیات حالی اردو میں ایجاد جدید ہیں۔

مولانا حالی باوجود ماہر فن ہونے کے قواعد شاعری یا ضوابط استادی کے کچھ بہت پابند نہ تھے۔ شاعری کا سب سے مکروہ عیب تعقید لفظی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ آزاد و حالی دونوں اس کو قابل احتراز نہیں سمجھتے، اگر آزاد کے استاد (ذوق) اس عیب سے اجتناب نہ کرتے تھے، تو حالی کے استاد (غالب و شیفتہ) کے ہاں تو شاذ و نادر بھی نہ ملے گا۔

حالی کا شاعرانہ کمال زبان و محاورہ کی صحت، طرز بیان کی جدت و موزونیت، لب و لہجہ کا لوچ اور لطافت ہے۔ الفاظ کا انتخاب اس قدر صحیح و برمحل ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ شعر میں جان ڈال دیتا ہے۔

مولانا حالی کی قدردانی

اپنے ہم عصروں کی طرح مولانا حالی نے بھی اپنی تصانیف کی کامیابی و قدردانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ خاص کر ان کی نظموں اور نظموں میں بھی ایک مسدس کو جو قبول عام حاصل ہوا، وہ تمام اردو شاعری میں کسی دوسری نظم کو میسر نہیں آیا۔ لیکن اس خاص قدر شناسی میں مولانا واحد و منفرد ہیں کہ ان کا جشن صدسالہ عظیم الشان پیمانے پر منایا گیا۔ سنہ ہجری کے حساب سے ۱۳۵۳ھ میں مولانا کی ولادت کو پورے سو برس ہو گئے۔ ۲۷ رجب ۱۳۵۴ھ (۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو مولانا کے وطن پانی پت میں جشن ہوا۔ جسکی صدارت نواب صاحب بہادر بھوپال نے کی، اور حالی میموریل اسکول پانی پت کو بیس ہزار

روپیہ عطا فرمائے۔ دوسرے قدر شناس اصحاب کے علاوہ گورنمنٹ پنجاب نے بھی ایک ہزار روپیہ دئے۔

ڈاکٹر اقبال نے اس جشن کے موقع پر اس قطعہ میں خراج تحسین ادا کیا تھا۔

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد　　　بیند دگر او را نمے از اشک سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود　　　تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

نیاز مند مؤلف نے ایک قطعۂ فارسی میں چند تاریخیں مرتب کیں۔ ایک تاریخ عربی میں کہی:۔ وَاللّٰہِ ذَالِکَ فَوْزٌ عَظِیْمٌ۔ دوسری تاریخیں یہ ہیں:۔

۱۹۳۵ء

پیشکشِ اخلاص

۱۳۵۴ھ

سالِ میلادی[۵] جشنِ حالی ست　　　"منظرِ ملکِ عقیدت آئیں"

۱۹۳۵ء

سال ہجری چو بخواہند، بگو　　　کہ "از احباب خراجِ تحسیں"

۱۳۵۴ھ

اس جشن صد سالہ کی یادگار میں رسالہ زمانہ کانپور وغیرہ نے حالی نمبر شائع کئے۔

مولانا حالی کا طرز تحریر

مولانا کی سب سے پہلی تصانیف "تریاق مسموم" وغیرہ مفقود ہیں کہ ان کے اسلوب تحریر کا اندازہ ہو سکے۔ سب سے قدیم کتابیں مولود شریف اور مجالس النساء (۱۸۷۴ء) موجود ہیں۔ ان میں "مجالس النساء" خاص چیز ہے، یعنی عورتوں کے لئے اخلاقی و تعلیمی مسائل فسانہ کے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ اس سے پہلے مولانا نذیر احمد کی مرآۃ العروس (۱۸۶۹ء) وغیرہ شائع و عام ہو چکی تھی۔ اس لئے ان کو دیکھ کر مولانا حالی کو لکھنے کا خیال آیا ہوگا۔ چنانچہ وہی انداز بیان اور دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان لکھی ہے۔ لیکن نہ

[۵] فارسی جدید میں سنہ عیسوی کو سنہ میلادی کہتے ہیں۔

مولانا نذیر احمد کے مغلق الفاظ ہیں نہ عامیانہ محاورات و امثال۔

اس سے دس برس بعد حیات سعدی (۱۸۸۴ء) اور اس کے دس برس بعد مقدمہ شعر و شاعری لکھا۔ ان میں مولانا کی اصلی شان تحریر نظر آتی ہے۔ زبان و محاورہ کی صحت، طرز بیان کی بے تکلفی اور لب و لہجہ کی نرمی اور ربوتج نمایاں ہے۔ ان کے ہاں سرسید کا جوش، آزاد کی رنگینی، نذیر احمد کا زور و شور اور ظرافت نہیں ہے، لیکن قوت بیان اور فصاحت و روانی بہتر سے بہتر ہے حالی کا طرز سرسید سے زیادہ مشابہ ہے۔ حالی نے سرسید کے اسلوب و زبان کی قدامت کو زبان حال کے مطابق کر دیا ہے لیکن سرسید کے جوش بیان، تیزی طبع۔ ملکۂ ایجاد اور تنوع اسالیب کی حالی میں کمی ہے۔ مولانا حالی واقعی مولانا تھے، صاحبدل، درویش مزاج، خاموش، متین۔ ان کے علم و فضل میں وسعت اور ذہن و فکر میں روشنی تھی، لیکن دل اور مزاج میں گرمی اور تیزی نہ تھی۔ انھوں نے غور و فکر کے ساتھ اردو زبان و ادب کا جائزہ لیکر، اس کی خامیوں کو دیکھ کر، ضرورتوں کو سمجھ کر، دوسری زبانوں سے مقابلہ کرکے، جدید موضوعات کی کتابیں لکھ دیں، لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے لئے کوئی روش خاص پیدا نہ کر سکے۔

صاحب طرز بننے کے معنی ہیں۔ تقلید چھوڑ کر مُوجد بننا، موجودہ روش سے بغاوت کرنا، اور اپنی راہ الگ نکالنا۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اُپج ہو۔ اور اُس کی ایک دُھن، شوق، جوش ہو۔ انشاء اللہ خاں، مرزا غالب، سرسید، آزاد، نذیر احمد، شبلی کی ایجادیں اور اختراعیں اسی صفت کے مظاہر و آثار ہیں اور اسی صفت کے نہونے سے مولوی ذکاء اللہ اور مولانا حالی "صاحب طرز" نہیں ہیں۔ لیکن اس طرح کا "صاحب طرز" ہونا، ادیب کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ جیسا غالب، آزاد اور نذیر احمد کے طرز کے ساتھ ہوا۔ نہ ان طرزوں کی بعد کو تقلید ہوسکی نہ ضرورت تھی۔ مولانا حالی کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدت و بیان کی صداقت،

.بان کی صحت، اسلوب کی صفائی، دلائل کی قوت، تمثیلات کی برجستگی، سب کچھ ہے
ور اکثر بے عیب ہے، بلکہ بعض جگہ نادر و جدید بھی ہے، لیکن ان کی عبارت
ڑھنے سے ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی، انشا پردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا
یں ہوتا۔ تاہم ان کی جچی تلی تحریر کا اثر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کو
واج پانے کے لئے حالی اور شبلی ہی کا ملا جلا طرز تھا۔

اسلوبِ حالی کی ایک لطیف خصوصیت انتخاب الفاظ ہے خصوصاً ہندی
لفاظ کا استعمال اور ان کی بیساختگی و برجستگی۔ مثلاً

(۱) "جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا، اس باغ میں پت جھڑ شروع
ہوگئی تھی، کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے، اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے
تھے۔" (یادگار غالب)

یہاں لکھ سکتے تھے کہ "اس باغ میں خزاں شروع ہوگئی تھی۔" اور مفہوم وہی رہتا،
لیکن پت جھڑ کا لفظ اپنے لغطی مفہوم (پتوں کا جھڑ کر منتشر ہونا) کے اعتبار سے
ئندہ فقرے کے کس قدر مناسب ہے کہ "کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے۔
ور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔"

(۲) "قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں، ان کو بدستور قائم رکھا جائے۔"
(مقدمۂ شعر و شاعری)

(۳) "اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز نہ ٹوٹنے دے، ورنہ وہ بہت جلد
دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر میں وہی اچھر بھلا دئے ہیں جو دلوں کو تسخیر
کرتے تھے۔" (مقدمۂ شعر و شاعری)

یہ ہندی کے الفاظ اور محاورے حالی کی نظموں میں نثر سے بھی زیادہ تاثیر
پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ایک بے اعتدالی سے حالی بھی نہ بچ سکے۔ یعنی انگریزی الفاظ کا
غیر ضروری استعمال حالی بھی نذیر احمد سے کم نہیں کرتے، حالانکہ یہ انگریزی

زبان سے محض ناآشنا تھے۔ چند مثالیں یہ ہیں :۔

(۱) "اس کے ایک بند میں ایک پوائنٹ[۵۱] عمدگی سے بیان ہو سکتا ہے، لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی" (مقدمہ شعر و شاعری)

(۲) "ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل[۵۲] قابلیت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی" (حیات جاوید)

(۳) "جس کو پالیٹیکس[۵۳] کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور[۵۴] سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل[۵۵] جانا ہے" (حیات جاوید)

(۴) اپنی جنرل انفورمیشن[۵۶] کو وسعت دے۔ (مضامین حالی)

اسی طرح میٹیریل (مواد، مسالہ)، ایمجینیشن (تخیّل)، ورکس (تصانیف) ججمنٹ (فیصلہ) وغیرہ بکثرت و بے تکلف لکھتے ہیں۔ یہ روش سب سے پہلے سرسید نے نکالی تھی۔ پھر حالی و نذیر احمد زیادہ اور عبدالحلیم شرر[۵۷] لکھنوی کم، اسی راہ پر چل نکلے۔ ان بزرگوں میں سرسید تو انگریز و انگریزی پرستی کی دھن میں کسی بات کی اچھائی بُرائی پر نظر نہیں کرتے تھے۔ مذہب، معاشرت، زبان، تعلیم سب کو اُسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ نذیر احمد کوئی با اصول آدمی نہ تھے۔ انھوں نے مولوی ذکاء اللہ کے لئے لکھا ہے کہ "وہ سید احمد خاں کے پٹھو تھے"۔ لیکن یہی لقب خود ڈپٹی نذیر احمد پر بھی صادق آتا ہے۔ پھر نذیر احمد ظریف طبع بلکہ "مسخرے" تھے، اور انگریزی کی بھرمار بھی ان کے مسخراپن کی ایک ادا تھی۔ حالی جیسے متین و با اصول ادیب کے لئے اس طرز کو اختیار کرنے کا بجز تقلید سرسید

---

[۵۱] نکتہ۔ خاص بات [۵۲] جسمانی [۵۳] سیاست

[۵۴] زمانہ ساز [۵۵] آزاد خیال [۵۶] عام معلومات

[۵۷] شرر لکھنوی کے فقرے ہیں :۔

(۱) اس کے حالات فی الحال بالکل ایک اسی قسم کی میسٹری (راز) معلوم ہوتے ہیں (مضامین شاعرانہ صفحہ ۱۵۳)

(۲) فردوسی و نظامی نے بزم عالم کی غزل خوانی کا چارج (منصب) اپنے ذمہ لے لیا۔ (مضامین شاعرانہ صفحہ ۲۰)

کوئی سبب نہ تھا۔ لیکن اسی جذبے نے ان کو نہ سوچنے دیا کہ وہ اور ان کا زمانہ ادبیات جدید کے لئے پیشوا و رہنما ہیں۔ ان کو وہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو باقی و جاری رہنے کے قابل ہو۔

علامہ آزاد اور مولوی ذکاءاللہ تو قدامت پسند تھے ان کا انگریزی الفاظ استعمال نہ کرنا کسی غور و فکر اور پیش بینی کی بنا پر نہ تھا۔ البتہ علامہ شبلی کے ذوق صحیح اور نباضی ادب و انشا کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے اس کج روی کو سمجھ لیا اور اس سے بچ کر چلے۔

مولانا حالی پر اعتراضات

سرسید کے رفقا محض جرم رفاقت و ہمنوائی کے سبب سے مورد طعن و اعتراض گردانے گئے۔ ان میں مولانا حالی بھی تھے۔ اُن کے مُسدّس کو اسلام سے بغاوت اور مسلمانوں کی توہین سمجھا گیا۔ اور ان پر بھی کُفر و گمراہی کے فتوے لگائے گئے۔ ہم کو اس قسم کے اعتراضات سے بحث نہیں۔ یہ فوری جوش تھا۔ جس غُلغلے کے ساتھ اُٹھا تھا، ایسا ہی بیٹھتا چلا گیا۔ ۱۸۷۹ء میں مُسدّس لکھا گیا، ۱۸۸۰ء میں تمام ملک میں پھیل گیا۔ اور اس پر غدر برپا ہونے لگا۔ لیکن ۱۸۸۶ء میں جب مولانا نے مُسدّس پر دوسرا دیباچہ لکھا ہے تو اس میں لکھتے ہیں:-

"بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔"

ہمارا مبحث مولانا کے موضوعات تصنیف اور اسالیب نظم و نثر کی نکتہ چینیاں ہیں۔ ان کی حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی کے بڑے کارنامے دو ہیں۔ (۱) سیرت اور (۲) تنقید۔ ان دونوں موضوع پر اردو میں کوئی با اصول تصنیف موجود نہ تھی۔ سوانح سعدی و غالب و سرسید اور مقدمہ شعر و شاعری، اردو اور حالی دونوں کی اوّلیات ہیں۔ ان دونوں کی فنی خصوصیات اور مراتب تکمیل سے

"اردو نویس" اور "اردو خواں" دونوں ناآشنا تھے۔ انگریزی زبان میں یہ علوم، بالکل مکمل نہیں تو اعلیٰ پایہ پر موجود و مُدوّن تھے لیکن حالی انگریزی نہ جاننے کے سبب سے بلا واسطہ ان علوم کو حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ترجموں کے ذریعہ سے انھوں نے یورپ کے اصول تنقید دریافت کئے، اور ان کو اپنے موضوع "مقدمہ" اور ہندوستان و اردو زبان کے مناسب حال مرتب کیا۔ اس لئے حالی کی کوتاہیاں ان کے لئے عیب نہیں، بلکہ محض "مقدمہ" کا لکھ دینا ہی اُن کا ہنر ہے پھر کسی نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ کا یہ لکھ دینا:۔

"خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ دماغ و شخصیت اوسط، یہ ہے حالی کی کائنات۔ سارے خیالات جن پر یہاں بحث کی گئی ہے، وہ سب مغرب سے لئے گئے ہیں۔ دوسرے خیالات مشرقی ہیں، اور مقدمہ شعر و شاعری میں مغربی و مشرقی خیالات ایک جگہ مضحک طور پر جمع ہو گئے ہیں"

نقادیِ ادب اور ادب نقادی دونوں کے لئے زیبا نہ تھا۔ مقدمہ حالی تنقید کی فنی کتاب نہیں ہے، بلکہ تنقید کا نمونہ و مذاق پیدا کرنے کی پہلی کوشش ہے جس کی نظیر اُردو کیا، فارسی و عربی میں بھی نہ تھی۔ اس میں خامیاں ضرور ہیں، اور وہ بعد کی بہتر تنقیدوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اتنی وسعت و جامعیت کی بھی کوئی کتاب ان پچاس برس میں پیدا نہ ہو سکی۔

حالی کی تصنیفات سیرت (حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید) پر یہ اعتراض ہے کہ مولانا نے ان کی سیرت نہیں لکھی بلکہ ہیرو مانکر ان کے کارنامے بیان کئے ہیں۔ مولانا شبلی نے "حیات جاوید" کی صورت دیکھ کر، کھولنے اور پڑھنے سے پہلے تو فرما دیا تھا کہ "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے" اور پڑھ کر فرمایا کہ "سرسید کی مدلل مداحی کی ہے" پھر اور لوگوں نے کہا کہ

"یہ کتاب شروع سے اخیر تک ایک، اعتذار (اپالوجی) کا پہلو لئے ہوئے ہے"

یعنی مولانا حالی نے سر سید کی طرف سے گویا صفائی پیش کی ہے۔ مولانا نے کسی دعویٰ علم و فن کے ساتھ یہ کتابیں نہیں لکھیں۔ "یہ ناموران اسلام" یا "مشاہیر ہند و عجم" کے سلسلے میں شامل نہیں ہیں بلکہ ان تینوں ہستیوں کے جوشِ محبت میں لکھی گئی ہیں۔ سعدی کے حالات سعدی کی مقبولیت اور اُن کے عجیب و گوناگوں سوانح کے سبب سے لکھے، غالب کا تذکرہ صرف اپنے استاد کی یادگار قائم کرنے کے لئے لکھا، سر سید کی سیرت ان کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے مہتم بالشان کارناموں کو پیش کرنے کے لئے مرتب کی۔ لیکن یہ تینوں چیزیں ایسی لکھ دیں کہ ایران میں بھی ایسی سیرت سعدی موجود نہ تھی۔ وہاں حالی کی حیات سعدی کا فارسی جدید میں ترجمہ کیا گیا۔ غالب کے سوانح نگار آج بھی "یادگار غالب" کے استفاضہ سے بے نیاز نہیں ہیں" حیات جاوید" سر سید کے موافق و مخالف دونوں گروہوں کے لئے معلومات کا واحد ذریعہ ہے۔ ان تصانیف کی اہمیت اور مولانا کا کمال سب سے بڑھ کر یہی ہے۔

حیات سعدی پر ایک عجیب اعتراض یہ بھی ہے کہ مولانا نے شیخ سعدی کے لئے صیغہ واحد غائب لکھا ہے:۔ "شیخ کہتا تھا" "شیخ لکھتا ہے"۔ اور اس کو سوءِ ادب سمجھا گیا ہے۔ یہ اعتراض اوّل تو مُورّخ پر نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں تاریخی ہستیوں کے لئے یہ طرز جائز رکھا گیا ہے۔ دوسرے شیخ سعدی کے شیخ طریقت اور ولی اللہ ہونے کی حیثیت اس قدر مشہور نہیں ہے، جتنا ان کا مصنّف، شاعر، انشا پرداز اور ظریف ہونا، اور ان میں سے ہر حیثیت کو پیش نظر رکھ کر ان کو اس طرح لکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ آزاد نے بھی "سخندان فارس" میں شیخ سعدی کے لئے ضمیر واحد استعمال کی ہے:۔ "اُس کے ننھے ننھے فقرے"، "اس کی نثر"، "اس کی قدرتی فصاحت"۔ (اس داستان اردو کا صفحہ ۳۹ دیکھئے)۔ تیسرے شیخ سعدی اس امر میں خاص طور پر قابلِ استثنا ہیں۔ ان کی مقبولیت و شہرت نے ان کے اندر ایک شان محبوبیت پیدا کر دی ہے۔

اور وہ بے تکلفی کا سبب ہوسکتی ہے۔ یہ بات خسرو، حافظ، جامی کسی میں سعدی کے برابر نہیں ہے۔

علامہ شبلی کا کارنامہ سیرت و تنقید میں مولانا حالی سے افضل و وسیع تر ہے، لیکن ہیرو پرستی و رُجحان پسندی اور اپنے ناپسندیدہ شخص کی ہُنر پوشی و عیب کوشی بھی مولانا شبلی کی طبیعت میں ہے[۵]۔ جس کا ذکر ان کے حالات میں آئے گا۔ علامہ آزاد بھی اس سے بَری نہیں ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ پر بھی "انگریز پرستی" کا الزام ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر بھی جانب داری سے خالی نہیں ہیں۔ یعنی ہندوستان کے سیرت نگاروں کو تحقیق و تدقیق اور تجزیہ و تنقیح کا سلیقہ تو آگیا ہے، لیکن بے لاگ اظہار رائے کی اخلاقی جرأت پیدا نہیں ہوئی۔ مولانا حالی تو بالطبع نہایت با مُروّت، صلح پسند، "ہنر پاش و عیب پوش" تھے۔ انھوں نے اگر غالب و سرسید کی عیب جوئی نہیں کی تو علامہ آزاد اور علامہ شبلی کی کوتاہیوں پر بھی پردہ ڈالا ہے اور ان کی تاویلیں کی ہیں، جیسا کہ "مضامین حالی" کے ذکر میں آتا ہے۔

تصانیف حالی کے نمونے

(۱) **مجالس النساء**، یہ کتاب مولانا حالی کی تصانیف میں ایک ہی ہے، اور ان کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ صرف ان کی قدرت زبان اور لطف محاورہ کے نمونے کے لئے مختصر اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"آتو جی" ہے ہے لوگو، اشراف زادیوں نے کیسا لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا، کیسی ان گھروں پر جہالت چھاگئی۔ کیسا اُلٹا زمانہ آگیا۔ محمودبیگم ذرا سوچنے کی بات ہے۔ ہمارے ملک کے ہندو مسلمان جو اشراف کہلاتے ہیں، سب کے ہاں قدیم سے یہ دستور

---

۵ تنقیدات شعرالعجم جو مختلف نقادوں نے لکھی ہے، دیکھنی چاہئیں۔ ہم نے اپنی تالیف تاریخ مرثیہ گوئی (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) میں مفصل لکھ دیا ہے کہ مولانا شبلی نے میر انیس کو ہیرو مان کر ان کے مقابل پہلوان مرزا دبیر کی خوبیوں سے کس طرح چشم پوشی کی ہے۔ مؤلف

چلا آتا ہے کہ بیٹی کو کچھ پڑھائیں یا نہ پڑھائیں، پر بیٹے کو ضرور پڑھواتے ہیں کیا غریب اور کیا امیر، ہر شخص اپنی بساط کے موافق بیٹے کی تعلیم میں ضرور کوشش کرتا ہے۔ پر میں نہیں جانتی اس ملک کی برکت کہاں اڑ گئی۔ جب دیکھا یہی دیکھا کہ ننّاویں سے دو چار بچے جو ایسے ہی صاحب نصیب اور ہونہار ہوئے، وہ تو لکھ پڑھ کر کسی قابل ہو گئے، اور باقی وہی کودن کے کودن رہے۔ ہاں اب کر کے سرکاری مدرسوں میں پڑھا لکھا بے شک زیادہ ہو گیا ہے پر آدمیت سی چیز وہاں بھی کمی جم آتی ہے"۔ ....

"تم اپنے جی میں کہو گی تو سہی کہ بڑھاپے میں عورت کی عقل جاتی رہی ہے، پر مجھ سے جو پوچھو تو ہے یوں کہ خدا بیٹیوں کا بدلہ لیتا ہے۔ ماں باپ نے یہ سمجھا تھا کہ بیٹوں کی کمائی میں تو ہمارا ساجھا ہے اور بیٹیوں سے ہم کو کچھ لینا نہیں۔ آؤ جہاں تک ہو سکے بیٹوں کو پڑھائیں جو کل کو ہمارے بھی کام آئے۔ خدا کو یہ بات ناپسند آئی۔ اس نے بیٹوں کو بیٹیوں سے بھی بدتر کر دیا۔ وہ تو عورت ہو کے ان پڑھ رہی تھیں، یہ مرد ہو کے جاہل رہے"۔

(۲) **حیاتِ سعدی**، یہ سیرت تحقیق، جامعیت، حُسنِ ترتیب کے لحاظ سے اردو میں پہلی تصنیف ہے۔ مولانا حالی نے ہر ممکن ذریعہ سے حالات جمع کئے ہیں۔ سعدی کی تصانیف سے حالات لئے ہیں۔ ابتدا میں سعدی کے وطن شیراز کا مختصر ذکر کیا ہے۔ پھر سعدی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ ان کے لئے ہر جگہ صرف شیخ کا لفظ لکھتے ہیں۔ حالات کے بعد سعدی کی تصانیف پر نظر ڈالی ہے۔ دوسروں سے مقابلہ کیا ہے۔ گلستاں اور بوستاں کا ان کی جوابی تصانیف کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ چند مقامات سے مختصر انتخابات لکھے جاتے ہیں:—

(۱) شیراز کے حال میں لکھتے ہیں:—

"بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے انسان کے قُویٰ میں شگفتگی اور

بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں، جیسے یزد، یبند، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ۔ ان شہروں میں کثرت سے علماء و فضلا، اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ جن کی تصنیفات مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پایۂ تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قم کو "دارالمومنین" اور یزد کو "دارالعباد" کا خطاب دیا ہے، اسی طرح شیراز کو "دارالعلم" کے لقب سے ملقب کیا ہے ....

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارات کی لطافت و خوش اسلوبی، باشندوں کے خیالات اور قویٰ پر عجیب اثر رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعرا پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں۔ شیخ (یعنی شیخ سعدی) نے بھی بوستان کے دیباچہ میں اہلِ شیراز کو ان تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے، جن سے وہ حالت سفر میں ملا تھا۔ شیراز سے جس قدر علما و مشائخ و شعرا و مصنفین ابتدا سے آخر تک اُٹھے ہیں، اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا مذکور ہے۔ اُن کی تعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے، اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لئے کچھ کم باعث افتخار نہ تھا۔"

(ب) جس زمانے میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا۔ اگرچہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا اور اس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لئے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے۔ عیش و عشرت کے سامان حد سے

زیادہ ہر طرف ہیچ نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے امرا اور فرماں روا بارگاہِ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصر خلافت کے آستانہ پر ایک پتھر بمنزلہ حجرالاسود کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو امرا اور اعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی۔ وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالاخانے کرایہ داروں سے رک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور پھر اسی آنکھ سے اس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایہ اقتدار یورپ اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا۔ اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بیدریغ سے قتل ہونا اور رعب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لئے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اس کی آنکھوں کے روبرو گذرے تھے جو ہلاکو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کئے۔ ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لئے ایک عمدہ سبق تھا جس نے اس کے دل میں قوم کی دلسوزی، بادشاہوں کی اصلاح، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیراندیشی میں صرف کی۔ مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اس کا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ابیات	ترجمہ
(۱) آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنین	(۱) آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے۔
(۲) اے محمدؐ گر قیامت می برآری سر ز خاک سر برآور، دیں قیامت درمیانِ خلق بیں	(۲) اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجئے۔
(۳) نازنینانِ حرم را، خونِ حلقِ نازنیں زآستاں بگذشت و مارا خونِ دل زآستیں	(۳) محل کے نازپروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک گیا۔

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالایق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا۔ اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی، نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا، تکبر اور غرور نے اس کے دماغ کو مختل کردیا تھا غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اس کے بیٹے ابوبکر نے اہل سنت کی حمایت کی اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مگر اس نالایق خلیفہ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالایق اور قابل نفرین سمجھو۔ مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اُٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے ایکبارگی ان میں تزلزل آگیا

اور چند روز میں ان کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آب باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابت موجود ہوتے تو ان کو ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ **مستعصم** کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہل وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

(ج) یہ واقعہ بوستاں سے لیکر لکھا ہے۔ شیخ سعدی نے اپنے سفر ہندوستان کی ایک حکایت لکھی ہے۔ اس طرح شروع کرتے ہیں:-

بُتے دیدم از عاج در سومنات — مُرصّع چو در جاہلیت منات

مولانا حالی اس کا خلاصہ شیخ کی زبانی لکھتے ہیں:-

"جب میں سومنات پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لئے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لئے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اس کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بد اعتقادی سے نہیں کی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ نو وارد ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں اس لئے اس کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ بوجھ بوجھ کر

اس کی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات مندر میں رہ تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا۔ کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور بظاہر چند روز کے لئے برہمن بن گیا۔"

(۳) **مقدمۂ شعر و شاعری**، مولانا حالی نے ۱۸۹۳ء میں یہ "مقدمہ" اپنے دیوان میں شامل کرنے کے لئے لکھا تھا، اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں شاعری کی تعریف اور شعر و شاعر کے لوازم و خصائص سے بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری اور شاعروں پر تنقید کی ہے۔ نمونے یہ ہیں:۔

(۱) کمال شاعری کے لئے ضروری شرائط۔

سب سے مقدم اور ضروری چیز جو شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوت متخیلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں امیجینیشن کہتے ہیں۔ یہ قوت جس شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر اپنے ساتھ ماں کے پیٹ سے لیکر نکلتا ہے۔ اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمال شاعری کے لئے ضروری ہیں، کچھ کمی ہے تو اس کمی کا تدارک اس ملکے سے کر سکتا ہے لیکن اگر یہ ملکۂ فطرتی کسی میں موجود نہیں تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ ماضی و استقبال کو اس کے لئے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگذشت اور

حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہئے۔ اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری عنقا اور آب حیواں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کر سکتا ہے گو وہ منطق کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوتے لیکن جب اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہونے لگتے ہیں مثلاً فیضی کہتا ہے ؎

سخت است سیاہی شب من　　لختے زشب است کوکب من

اس پر منطقی قاعدے سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی سب کے لئے یکساں ہوتی ہے پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے زیادہ تاریک کیونکر ہو سکتی ہے۔ اور تمام کواکب ایسے اجرام ہیں جن کا وجود بغیر روشنی کے تصور میں نہیں آ سکتا پھر ایک خاص کوکب ایسا مظلم اور سیاہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ اس کو کالی رات کا ایک ٹکڑا کہا جا سکے ؟۔ مگر جس عالم میں شاعر اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے وہاں یہ سب ناممکن باتیں ممکن بلکہ موجود نظر آتی ہیں۔ یہی وہ ملکہ ہے جس سے بعض اوقات شاعر کا ایک لفظ جادو کی فوج سامنے کھڑی کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایسے خیال کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے ایک لفظ میں ادا کر دیتا ہے۔

(ب) **زبان کی درستی اور اس کا تحفظ**۔ جو لوگ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں۔ یعنی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ ان کو اس بات پر فخر نہیں کرنا چاہئے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں۔ اور ہماری روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لیں گے ان کے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائیں گے۔ اس کے الفاظ و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کریں گے۔ اور اس کی

نظم و نثر کو زمانے کے مذاق کے ساتھ ترقی نہ دیں گے تو ان کی زبان کا وہ حصہ، جس پر ان کو فخر ہے جو اُن کی اور تمام ہندوستان کی اُردو میں ما بہ الامتیاز ہے، وہ حرف غلط کی طرح صفحہ روزگار سے محو ہو جائے گا۔ اور یہی بری بھلی اردو، جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے ذریعہ ملک میں پھیل رہی ہے۔ اور جس کو وہ اب تک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نصف صدی میں یہی ملک کی ٹکسالی اور فصیح زبان قرار پا جائے گی۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ عرب میں جب سے انشا کی سرد بازاری ہوئی۔ اور عربی نظم و نثر کے مالک غیر ملکوں کے باشندے ہوگئے رفتہ رفتہ وہ کلیسکل[۵۱] عربی جس پر عربوں کو ناز تھا لٹریری دُنیا سے رخصت ہوگئی۔ اور وہی بگڑی زبان جس کو عرب[۵۲] عُربا حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تمام عربی لٹریچر پر غالب ہوگئی اور شام۔ روم۔ مصر و بربر اور سوڈان وغیرہ میں عموماً پھیل گئی۔ یہاں تک کہ آج وہی زبان ٹکسالی اور فصیح عربی سمجھی جاتی ہے۔ ایسا ہی انجام دلی اور لکھنؤ کی زبان کا، اگر اس کی خبر نہ لی گئی ہوتا نظر آتا ہے۔ دلی جس کو اردوے معلیٰ کا مسقط الراس اور جنم بھوم کہنا چاہئے، وہاں مصنف اور ناظم و ناثر پیدا ہونے موقوف ہوگئے ہیں۔ پُرانے لوگوں میں سے چند نفوس جس کو چراغ سحری سمجھنا چاہئے۔ باقی رہ گئے ہیں ان کے بعد بالکل سناٹا نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا وہاں شاعری[۵۳] کا چرچا دلی سے بہت زیادہ سُننے میں آتا ہے۔ وہاں سے ناول اور ڈراما برابر ملک میں شائع ہوتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا قدم زمانے کی رفتار کے متوازی نہیں اُٹھتا جس قدر وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اُسی قدر ترقی کے رستے سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔

۵۱۔ انگریزی کا لفظ ہے یعنی مستند عربی۔ ۵۲ خالص عرب

۵۳۔ یہ پنجاب کا تلفظ ہے یہاں "ناول" رائج ہے۔

اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی یا فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اس کا ہندی سے ماخوذ ہے۔ اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر، جو عربی شاعری سے مستفاد ہے، قایم ہوئی ہے۔ نیز اردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا مطلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کی تان پر گاڑی چلاتا ہے، وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا اور محض مادری زبان کے بھروسے اس کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔

اس اقتباس میں مولانا حالی کا آخری مشورہ آجکل اردو، ہندی کے قضیہ میں قابل توجہ ہے۔ مولانا اردو شاعری کے لئے عربی فارسی اور ہندی دونوں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور خود اسی پر عامل ہیں۔ ان کے کلام میں ہندی کے وہ الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں، جو دوسروں نے استعمال نہیں کئے، اور ان سے مولانا کے کلام میں عجیب لطف و اثر پیدا ہوگیا ہے۔

(۴) **یادگار غالب** مولانا حالی نے یہ کتاب یہ سوچ کر لکھی ہے کہ اس عجیب و بے نظیر ہستی کی یادگار باقی رہنی چاہیئے۔ غالب کے حالات اس سے پہلے "آب حیات" میں مختصر طور پر تھے۔ نواب شیفتہ کے "گلشن بیخار" میں اتنے بھی نہ تھے۔ رقعات غالب کے سوا اور کہیں ان کے حالات نہ مل سکتے، پھر مولانا حالی سے بہتر کون لکھ سکتا تھا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ غالب بہ حیثیت انسان، دوست، استاد، شاعر، انشا پرداز،

ظریف، کے عجیب و غریب شخص تھے۔ اس لئے کسی نوجوان نقاد کا یہ اعتراض:۔

"کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کی زندگی ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے کوئی سبق رکھتی ہے۔ یا مرزا کے خانگی حالات اور احباب کے خانگی حالات اور احباب سے تعلقات کا ذکر حیاتِ انسانی میں کسی نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں"...... "مرزا کے حالات زندگی، اخلاق و عادات، لطائف و امثال پر تصنیف کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے"

صرف جوشِ مخالفت کی تراوش ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی کوئی سبق رکھتی ہے، تو غالب کی زندگی بھی رکھتی ہے۔ بلکہ غالب کی زندگی وہ بابِ اخلاق وا کرتی ہے" جو ہندوستان کے نوجوانوں کی مادی اور "تجارت رنگ" زندگی پہ ہے۔ غالباً اسی وجہ سے معترض کو مرزا کی وضعداری، سیرچشمی اور زندہ دلی میں کوئی سبق نظر نہیں آیا۔ اسی معترض کی یہ خواہش بیشک درست ہے:۔

"یادگار غالب کے مصنف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دور، ان کے معاصرین میں ان کا درجہ، شاعری کے مختلف اصناف میں ان کے کمالات پیش کئے جاتے"

لیکن مولانا حالی کو مرزا غالب کی ذات سے بحث تھی، اور ان کے کمالاتِ سخن سے صرف اس قدر کہ ان کی عظمت فی الجملہ واضح ہو جائے۔ مولانا اس مسلک کے آدمی نہ تھے کہ مومن و ذوق اور رند و صبا پر یا فارسی میں قتیل و شہید اور شیفتہ و بیخبر پر ردّ و قدح کرتے۔ بہرحال ایسا نہ ہونے سے موجودہ یادگار غالب مولانا کے یا اردو کے لئے باعث ننگ و عار تو نہیں ٹھہرتی۔ لیکن معترض نے کچھ اسی رنگ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یادگار غالب کے مختصر نمونے یہ ہیں:۔

(۱) ناقدر دانی کی شکایت: وہ اس خیال سے کہ ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے چنانچہ اس بات کی انھوں نے

فارسی اور اردو نظم و نثر میں جا بجا شکایت کی ہے۔ ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارک باد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو" اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانہ کی ناقدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حسن اتفاق سے اُن کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آجاتا تھا تو اُس کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔

منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانہ میں کول میں سررشتہ دار تھے اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سُنی گئی ہے، کہیں وہ دلی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ ان کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ "خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا اُس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے؟ حالانکہ میں شعر کہنا جانتا ہوں۔ مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانہ کی دشمنی سے بے فکر ہوں، اور

نعمت پر دنیا سے قانع؛

اپنے عجز کا اقرار مرزا جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو اُن سے بآسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئے گا؛ بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔

ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سید الشہدا، کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا ان کی بہت تعظیم کرتے تھے اور ان کے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے اُن کے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا۔ اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جس کو اور لوگ حدّ کمال تک پہنچا چکے تھے اور قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا؛ مشکل سے مسدّس کے تین بند لکھے جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

بند

ہاں اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو اے دجلۂ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو اے ماتمیانِ شہِ مظلوم! کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھ کر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیے۔ اور صاف لکھ بھیجا کہ "یہ تین بند صرف امتثالِ امر کے لئے لکھے ہیں ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں؛ یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عُمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو اُن کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عُمر درکار ہے۔ پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے۔" ان کا قول تھا کہ "ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔"

(۳) مرزا نے بعض اردو خطوں میں اور خاص کر اردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلف بارد میں شمار کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اُردو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے نہایت محدود زبان ہے۔ وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے۔ اس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبانوں کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلہ میں دوسرا فقرہ بہ سبب لزوم مالایلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرہ میں۔ اور یہ بات اس شخص سے بن پڑتی ہے۔ جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجہ کا کمال رکھتا ہو۔ اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ مرزا کے اردو، رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاص کر ان خطوط میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادھی نثر عاری میں کرتے تھے۔ مثلاً سید یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"یوسف مرزا کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے، اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں

بتائی جاتی۔ دوا کا لگاؤ نہیں پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کسے کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوان مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ"۔

(۵) حیات جاوید (سر سید کی سوانحعمری) مطبوعہ ۱۹۰۱ء۔ اس کے دیباچے میں مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اسکی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بایوگرافی کریٹکل طریقہ سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اس سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن اول تو ایسی بایوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے۔ جنھوں نے اس موج خیز اور پر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے ان کو سب نے بھلا جانا۔ کیونکہ ان کو کسی کی بھلائی یا برائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں استہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ انھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے ادھر ادھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علماء و مفسرین کو للکارا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے۔ اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے،

تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے راستباز لبرل جانا ہے، ایسے شخص کی لائف چپ چاپ یوں کر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لئے ضرور ہے کہ ان کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ ہیں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے سرسید کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا ہوگا لیکن ان کی نکتہ چینی اس طرح کی ہے۔ (ایک مضمون کے درمیان سے کچھ حذف کر کے مولانا کے الفاظ میں مسلسل کر کے نقل کیا جاتا ہے):۔

سرسید کی ترقی کے اسباب:۔ اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرز حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی، اور اس کے تمام طاقتوں کو مضمحل کرنے والی ہے، اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی، اور اس نے ایشیا کی کسی قوم، بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی......

جان اسٹوارٹ مل لکھتے ہیں کہ اگر رعیت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لئے

کچھ نہ کر سکے، تو اس کو ملک کی کچھ پرواہ نہ رہے گی .... البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاصکر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے....... مگر یہ بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو، طرزِ حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اس میں جتنی باتیں طرزِ حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں، وہ رواج پاتی ہیں، اور باقی حصہ ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی، اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن سے نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے، یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا، جن سے بلاواسطہ تمام ملک یا بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے۔ پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں، آپ بھی آنکھیں بند کر کے اسی شاہراہ پر ہو لیتے ہیں۔ دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنا پڑتی ہے، اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے، اس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے۔ زمانہ کی ضرورتیں اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانیِ مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور خود مذہب اس میں استقلال پیدا کرتا ہے، جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے۔

یہیں سے اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس سے سر سید سے تمام

ملکی اور قومی خدمتیں سرانجام کرائی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک کہ ان کی لائف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ ان کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے ان کی تمام ترقیات کا منبع ان کے کُل مقاصدِ عالیہ کا محرّک، اور ان کی ہر منزل کا رہبر **مذہب** کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی۔

اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانیٔ اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی..... مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ ان پر غالب رہا، مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ انھیں سُنّت و بدعت و تقلید و عدمِ تقلید کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف انھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے، جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو، اور یا خاص شخص کو پہونچتا ہے۔ مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے ان کی آنکھیں کھولیں، اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت ان کی گھٹی میں پڑا تھا، ان کو اسلام کی حقیقت اور اس کے اصلی مقاصد تک پہونچا دیا۔ جو باتیں دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدّس کے خلاف معلوم ہوئیں، ان کو چھوڑا، اور جو اس کے مطابق پائیں، ان کو پکڑا۔ اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملے میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا، اس کو بلاواسطہ مذہب ہی سے پوچھا۔ اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا، اس کو سر پر رکھا۔

"حیاتِ جاوید" کے ایسے ہی مقامات ہیں، جن کو لوگوں نے "سرسید کی مدلّل مدّاحی" سے تعبیر کیا ہے۔ ہم نے یہ حصّہ اسی لئے انتخاب کیا ہے کہ تصنیف و مُصنّف اور سیرت و صاحبِ سیرت کا کمزور پہلو سامنے آ جائے۔ مولانا حالی نے جو کچھ لکھا ہے یہی اُن کا اعتقاد تھا۔ انھوں نے سرسید کا محرّکِ عمل متعین کرنے میں اپنے نزدیک بالکل صداقت سے کام لیا ہے۔

مولانا کی رائے میں "سر سید کی تمام ملکی و قومی خدمتوں کا محرک مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی" لیکن اصل میں سر سید کی ملکی و قومی خدمتوں کا محرک اسلام نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ بظاہر ان دو باتوں میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔ لیکن غور کیجئے تو بڑا فرق ہے۔ سر سید غدر کے بعد مسلمانوں کی تباہی سے نہایت متاثر تھے۔ ان کو زیادہ تباہ ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ گورنمنٹ کے دل سے مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی دور کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان و علوم، انگریزی تہذیب و معاشرت، انگریزی اخلاق و آداب سکھا کر ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ غرض مسلمانوں کی دنیا سر سید کے پیش نظر اور مقصود عمل تھی۔ لیکن ان اصلاحوں اور ترقیوں کی راہ میں مسلمانوں کے قدیم و راسخ عقائد و اعمال اور علمائے اسلام کا اثر حائل تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ ہر اصلاح، ہر تحریک، ہر ترقی کے لئے اسلام کا حکم یا اجازت ثابت کی جائے۔ سر سید نے یہی کیا۔ یہ کام صرف ایک حد تک بجا و درست تھا۔ لیکن سر سید حد کے اندر رہنے والے آدمی نہ تھے۔ ایک آندھی اور طوفان کی کیفیت تھی۔ اس لئے انھوں نے مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں مکمل انقلاب پیدا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ "اسلام و بانی اسلام کی محبت سر سید کی گھٹی میں پڑی تھی"۔ انھوں نے بہت سے کام خالص اسلام کی محبت سے کئے۔ سر ولیم میور کی "سیرت محمدی" کا جواب، "خطبات احمدیہ" کے اکثر مضامین، کسی پادری کی "امہات المومنین" کا رد، وغیرہ محض اسلام کے اعلان صداقت و احقاق حق کے لئے تھا۔ جس میں "دنیا" شامل نہ تھی۔ لیکن اور بہت سی باتوں میں ان کی لغزش کا سبب بقول مولانا حالی کے یہ تھا کہ "آخر عمر میں سر سید کی خودرائی یا وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا"۔

حیات جاوید کے پہلے حصہ میں سر سید کے حالات اور دوسرے میں

ان کے قومی و ملکی کارنامے ہیں۔ سرسید کی راستبازی اور اخلاقی جرات کے چند واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے کسی دیہاتی مدرسہ کا معائنہ کیا۔ وہاں گائے بندھی ہوئی دیکھی اور مدرس و طلباء کو غیر حاضر پایا۔ رپورٹ میں یہ واقعہ لکھ دیا اور نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدرسوں کی یہی حالت ہے۔ سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے سرسید کی رپورٹ پڑھ کر ان کی رائے سے اختلاف کیا۔ سرسید کو یہ بات ناگوار ہوئی اور مسٹر بریملی سشن جج علی گڈھ سے شکایت کی۔ جج صاحب نے لفٹنٹ گورنر کو لکھ بھیجا۔ انھوں نے جج صاحب کو جواب لکھا کہ ان کو سرسید کے معائنہ کی صداقت سے انکار نہیں، بلکہ ان کے نتیجہ نکالنے سے اختلاف ہے۔ اس کے بعد سرسید اپریل ۱۸۶۹ء میں ولایت چلے گئے اور چونکہ لفٹنٹ گورنر کی طرف سے دل صاف نہ تھا اس لئے ان سے مل کر نہ گئے۔ جب اکتوبر ۱۸۷۰ء میں لندن سے واپس آئے، اس وقت بھی سر ولیم سے جا کر نہ ملے۔ کچھ عرصے کے بعد انکے پرائیویٹ سکرٹری کا خط سرسید پاس آیا کہ "نواب لفٹنٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے، اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اور اب تک انتظار کر رہے ہیں۔" باقی حال مولانا حالی کی زبانی سنئے:-

> سرسید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی، اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۲ نومبر کی تھی۔ سر ولیم نے نویں نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا، جس کا ترجمہ یہ ہے:-
>
> مائی ڈیر سید احمد، آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقعہ بات کہنے کا الزام لگانے کا

خیال نہ کیا ہوگا۔ میں اُن نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں، اب بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا۔

مجھکو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھ کو براہ راست کیوں نہ لکھا، آپ کے ایسا کرنے سے مجھ کو اور بھی رنج ہوتا ہے، گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ نہ کیا جس کی میں آپ سے اُمید کرتا تھا اور شاید اُمید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔

مسٹر بریلی نے اردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لمحہ بھی کسی ایسے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ چونکہ اس معاملہ کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اُس کے شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

کیپٹن ملنگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجہ بالا خط و کتابت کے حوالہ سے آیندہ لکھیں گے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپکے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سُننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہوں گا۔"

سر سید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ "آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اُٹھ گیا۔"

کرنل گریہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "سر ولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اس کو پڑھ کر ڈال دیا اور مجھ کو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی۔"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر

مبنی ہے۔ بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سر سیّد تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہہ پر صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ اُن کی دلجوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لئے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا جیسی کہ سر ولیم کی تحریر سر سید کے نام تھی نہایت سُبک اور حقیر بلکہ کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گذرا جب سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو اس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لئے بُلایا گیا تھا۔ اُن کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علی گڈھ کی طرف سے ایام غدر کے متعلق شبہات تھے۔ اس لئے وہ افتتاح کی رسم میں ان کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اُنھوں نے سر سید سے کہا کہ "اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ شریک ہوے تو ہم نہیں آنے کے" سر سید نے کہا "یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اُس کا پریسیڈنٹ بھی ہے اُس کو شریک نہ کیا جائے" انھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ آخر مسٹر بریلی نے جو علی گڈھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سر سیّد کے دوست تھے۔ بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا اور اُن کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی۔ سر سیّد کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ اُن کے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک و صاف جانتے تھے"۔

(۶) **مضامین حالی**۔ مولانا کی مقالہ نگاری کا سلسلہ سر سید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" (۱۸۷۰ء) کے ساتھ جاری ہوا۔ غالباً ان کا پہلا مضمون وہ ہے جو

"مولوی سید احمد خاں بہادر، سی ایس آئی" کے عنوان سے "اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ" میں ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد سرسید کے رسالہ وا خبار میں اور ہندوستان کے مختلف پرچوں میں آخر عمر تک لکھتے رہے۔ مولانا کے مجموعہ مقالات میں ہر نوع کے خیالی، اخلاقی، اصلاحی، مذہبی، تنقیدی مضامین موجود ہیں۔ ان کی روشِ تحریر یہاں بھی "موجِ نرم خیز" کی طرح جاری ہے۔ ہر مسئلہ کی تحقیق اور ہر مطلب کی تشریح نہایت وسعت نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔ بہت سی کتابوں پر ریویو کئے ہیں۔ مولانا ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان"، مولانا آزاد کی "آب حیات" اور "نیرنگ خیال"، مولانا شبلی کی "سیرۃ النعمان" مولوی سید احمد کی "فرہنگ آصفیہ" وغیرہ سب کتابوں پر نہایت کشادہ دلی کے ساتھ تنقیدیں لکھتے ہیں۔ ان کے عیوب کو قابل گرفت اور اپنے خیالات کو لائق ذکر نہیں سمجھتے۔ مثلاً نیرنگِ خیال میں کچھ خامیاں دیکھتے ہیں، لیکن ۵ صفحے اس کی تعریف میں لکھ کر اتنا لکھ دیتے ہیں:۔

> "اگرچہ اس عام قاعدہ کے موافق کہ الصفو والکدر توأمان، انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبرّا نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً تصنیف و تالیف کا دشوار کام، جس کا بے عیب ہونا محال ہے، لیکن ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی حالت میں ہو، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کے برابر ہے ...... اس وقت ایسی کتابوں میں خوردہ گیری کی نظر سے غوض کرنا، کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار خیالات اہل وطن کے اور کیا باعتبار مصنفوں کی امیدوں کے، اور کیا باعتبار خوردہ گیروں کی نیت کے، ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔"

(ریویو نیرنگ خیال مطبوعہ اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۰ء)

معلوم ہوتا ہے **آب حیات** شائع ہونے کے بعد علامہ آزاد نے اس کی کوئی جلد مولانا حالی کو نہیں بھیجی، اور انھوں نے بطور خود کہیں سے لیکر اس کو پڑھا ریویو میں لکھتے ہیں:۔

"ہم کو اس بےمثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع اس وقت ملا جبکہ بہت سے اردو اخباروں میں اس پر ریویو لکھے جا چکے تھے۔"

اس کے بعد بہت طویل مضمون میں آب حیات اور اس کے مصنف کی بیحد مدح کرتے ہیں، اور اپنی فراخ حوصلگی سے علامہ آزاد کی ایک بہت بڑی فرو گذاشت کی اس طرح تاویل کرتے ہیں:—

"اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا، جیسے طبقہ پنجم میں مومن خاں مومن یا میر نظام الدین ممنون۔ لیکن اس کا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا کوئی مستند شاعر فرو گذاشت نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس نے ہر دورہ میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے انتخاب کرلئے ہیں، اور اس سے ان تغیرات کا دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دورہ میں زبان اردو پر واقع ہوئے ہیں۔ البتہ اگر مصنف تمام شعرائے اردو کا حال بالاستیعاب لکھتا تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محلِ اعتراض ہوتا۔"

(ریویو آب حیات مطبوعہ اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۱ء)

اسی طرح علامہ شبلی کی "سیرۃ النعمان" کی تعریف ایسے شرح صدر اور وسعت قلب کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی محل اعتراض پاتے ہیں تو یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں:—

"جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں، ہم کو یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ مصنف کی رائے جزئیات مسائل میں فی نفسہٖ کیسی ہے، کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے، نہ ریویو لکھنے والے کا، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کتاب کا عنوان بیان کیسا ہے؟ ترتیب کیسی ہے؟ طریقہ استدلال مذاق وقت کے موافق ہے یا نہیں؟ اور کتاب لکھنے کی جو غایت مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہئے، یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے، وہ اس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

یعنی مولانا حالی بعض مسائل میں علامہ شبلی کی رائے کو درست نہیں سمجھتے۔ لیکن اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی وغیرہ نے "سیرۃ النعمان" پر بڑے اعتراضات کئے۔ مولانا "سیرۃ النعمان" میں کچھ کمی بھی پاتے ہیں لیکن اس کی طرف صرف ایک اشارہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کردیتے ہیں :-

"بایں ہمہ جس طرح دریائے نیل کا اصل منبع ایک ہی سفر میں دریافت نہیں ہوا، اسی طرح ممکن ہے کہ اس باب (ترجیح فقہ حنفی) کی تکمیل کے لئے مصنف کو اپنی پوری توجہ سے ایک آدھ بار پھر ہمت مصروف کرنی پڑے۔"

مضامین حالی میں سے مختلف موضوعوں کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) یہ مضمون تمثیلی رنگ کا لکھا ہے، اور اس طرح کا یہ ایک ہی مضمون ہے :-

زبان گویا۔ اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیریں بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے۔ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک مزا ہے؟ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی تو وہی زبان ہے جو جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے دلوں کو فگار ....

اے زبان تو دیکھنے میں ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر

اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانہ کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا ورنہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط وہی ایک گوشت کا چھچھڑا رہ جائے گا کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے؟ نہیں ہرگز نہیں! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور اوروں کے دلوں میں جگہ پائے گی۔ ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی .... الٰہی اگر ہم کو زحمت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے۔ ورنہ اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔

(۲) ذیل کا مضمون بھی مولانا کے قدیم مقالات میں ہے، اور خوب لکھا ہے۔ اپنے موضوع کو مختلف تاریخی، مذہبی، معاشرتی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ہم مختلف مقامات کو مسلسل کر کے مختصر طور پر درج کرتے ہیں:-

"**جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ**" زمانہ کی نیرنگیاں مشہور اور اس کی تلوّن مزاجیاں ضرب المثل ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا،

وہ ہمیشہ ایک چال نہیں چلتا۔ وہ گرگٹ کی طرح برابر رنگ بدلتا رہتا ہے۔ وہ اس پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑکا یا جائے ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے۔ وہ جو روپ بھرتا ہے اس کے چہرہ پر کھل جاتا ہے۔ وہ جو ٹھاٹھ بدلتا ہے، اس کا رنگ ساری مجلس پر چھا جاتا ہے........ مبارک وہ ہیں جنھوں نے اس کے تیور پہچانے، اور اس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا۔ جدھر کو وہ چلا اس کے ساتھ ہو لئے۔ اور جدھر سے اس نے رُخ پھیرا، اس کے ساتھ پھر گئے۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا، اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا، اور رات کو رات کی طرح کاٹا۔ اور بدنصیب وہ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا، اور اس کی ہمراہی سے ناک چڑھائی۔ گرمی چمکی، پر انھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اتارے، اور ہلکے پھلکے نہ بنے۔ دن نکلا، پر انھوں نے کروٹ نہ بدلی، اور خواب شبینہ سے بیدار نہ ہوئے۔ اب وہ بہت جلد دیکھیں گے کہ پیچھے کون رہا، اور منزل تک کون پہنچا۔

جو لوگ زمانہ کی پیروی نہیں کرتے، وہ گویا زمانہ کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں، اور چند جھاڑیاں ہوا کا رُخ نہیں پھیر سکتیں۔ اسی لئے ایک نکتہ کار شاعر نے کہا ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"۔ اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے کہ دُرْ مَعَ الدَّهْرِ كَيْفَ مَا دَارَ، یعنی زمانہ جدھر کو پھرے اس کے ساتھ پھر جا۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ صِرْ هَيُولٰى لِكُلِّ صُوْرَةٍ، یعنی اپنی ذات میں ایسی قابلیت پیدا کر کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول کر لے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ زمانہ کبھی انقلاب سے خالی نہیں رہتا۔ اور اس کا مقابلہ انسان ضعیف البُنیان سے نہیں ہو سکتا۔ پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضرور ہے کہ جیسی ضرورت دیکھے ویسا بن جائے۔ تا کہ زمانہ کا کوئی انقلاب اس کو سخت نقصان نہ پہنچائے....

اے مسلمانو! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شے تم کو ابھرنے نہیں دیتی، وہ کیا ہے؟ اور جس کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے، وہ کون سی بندش ہے؟ یاد رکھو وہ تمہاری بیہودہ تقلید ہے......... تم صرف انہیں لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جن کے ساتھ تم کو حسنِ عقیدت ہے، بلکہ طب میں جالینوس کی، منطق میں ارسطو کی، ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید کو بھی اُسی قدر ضروری جانتے ہو، جس قدر مذہب میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید تمہارے نزدیک واجب و لازم ہے۔ اگر کسی کو اس بات میں تامل ہو تو نکاحِ بیوگان کے معاملہ میں غور کرے اور دیکھے کہ اس کا مجوّز کون ہے؟ اور مانع کون ہے؟ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں نے مجوّز کے حکم کی تعمیل کی ہے، یا مانع کا کہنا مانا ہے[۵]؟ اسی تقلید کی بدولت تم میں ایک اور مرض پیدا ہو گیا ہے جس نے تمہاری رہی سہی ہمت خاک میں ملا دی اور تم کو بالکل اپاہج کر دیا۔ پوچھو وہ کیا ہے؟ وہ خانہ خراب وضعداری ہے جس کی ہدایت سے تم ترقی کرنے والوں کو متلوّن المزاج سمجھتے ہو اور ڈھور ڈنگروں کی طرح سدا ایک حالت پر رہنے والوں کو کمالِ نفسِ انسانی قرار دیتے ہو۔

ہندوستان کے وضعداروں کی یہ رائے ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں جو طریقہ یا جو حالت اختیار کرے اس کو آخر عمر تک ترک کرنا نہیں چاہئے۔ جوانی میں اگر ڈاڑھی چڑھانے کی عادت ہو جائے تو سنِ شیخوخت تک اس وضع کو نباہنا ضروری ہے اور بچپن میں اگر کامدار ٹوپی پہننے کا لپکا پڑ جائے۔ تو بڑھاپے کے جھریائے چہرہ کو بھی اس سے محروم رکھنا نہیں چاہئے۔ چنانچہ معتبر راویوں سے سنا گیا ہے کہ دو بزرگوار رنجن خانی جن کا سن شریف ساٹھ پینسٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا۔ اور نہایت متقی اور متورّع آدمی تھے۔ جو ہر جمعہ کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ

---

۵ یعنی اسلام نے بیوہ عورتوں کے نکاح کی اجازت دی ہے، لیکن ہندوؤں کے مذہب میں جائز نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام کی اطاعت چھوڑ کر ہندوؤں کی پیروی کی۔

کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب بھی ان کی کمال تعظیم کرتے تھے۔ باایںہمہ تقدس دونوں حضرات ڈاڑھی گھٹواتے تھے۔ بعضے منہ پھٹ آدمیوں نے جو ان پر اعتراض کیا تو یہ فرمایا کہ ہم خود اس حرکت سے منفعل ہیں۔ مگر کیا کریں جو وضع قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اسی طرح ایک ایک شریفوں کی بستی میں ایک صاحب سن رسیدہ بڑے نمازی اور پرہیزگار تھے۔ مگر عشا کی نماز کبھی نہ پڑھتے تھے لوگوں نے سبب پوچھا تو یہ فرمایا کہ بچپن میں تو اس سبب سے نہ پڑھی کہ کھانا کھاتے ہی شام سے سو رہتے تھے جوانی میں لہو لعب میں مانع رہا۔ اب بڑھاپے میں نئی بات کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے ....

(مطبوعہ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۵ء / ۱۲۹۲ھ)

(۳) مولانا کی تحریر میں کہیں کہیں لطیف ظرافت بھی ہے۔ اوپر کا مضمون (زمانہ) بھی اس سے خالی نہیں۔ ایک اور مضمون **اخبار نویسی اور اس کے فرائض** میں لکھتے ہیں:-

ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جا کر کہا کہ "مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ زیادہ چھوٹے قد کا ہو نہ بہت بڑے قد کا۔ جب رستہ صاف ہو تو اچھلتا کودتا چلے، اور جب رستہ میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اٹھائے۔ نہ دیوار در سے اڑتا چلے، نہ گنجان درختوں میں سوار کو لیکر گھس جائے۔ اگر چارہ کم دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھر کر دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے، اور جب تھان پر باندھ دیں تو [illegible] سوداگر نے کہا [illegible] اگر خدا تعالیٰ نے مجھ کو قدرت دی اور حضرت قاضی صاحب کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کرسکوں گا۔"

اگر آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اس کو قاضی کی جگہ **اخبار نویس** کا نام لینا چاہیے۔ کیونکہ قاضی میں دو صفتیں ہونی ضرور ہیں، ایک قانون کی واقفیت جس کی رو سے وہ فیصلے کرتا ہے دوسرے

انصاف۔ بخلاف اخبار نویس کے کہ اس میں اپنے کام کے فرائض ادا کرنے کے لئے بیشمار لیاقتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک کسی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے، گویا اس بات کا تسلیم کرلینا ہے کہ اس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور فضیلت موجود ہے........

(مطبوعہ اخبار رفیق ہند ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۲ء)

مولانا نے چند **مذہبی مضامین** سرسید کی حمایت میں لکھے ہیں۔ چونکہ مولانا کی تحریر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اس لئے ہم نے بھی لکھدی، ورنہ حمایت سے قطع نظر کرکے بھی وہ مضامین خود نہایت ضروری مسائل پر بہترین اسلوب کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ان میں ایک مضمون اَلدِّینُ یُسرٌ (مذہب اسلام میں آسانی ہی آسانی ہے) کے عنوان سے بہت طویل لکھا ہے۔ اس کو الگ کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ ایک اور طویل مضمون کا عنوان ہے:۔ **"قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجایش باقی ہے یا نہیں"** یہ پہلے مضمون سے بھی زیادہ کاوش و تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ ان مضامین کے نمونے بخوف طوالت ترک کئے جاتے ہیں۔

(۴) ذیل کا مضمون ایک کتاب پر ریویو ہے۔ مولانا نے تنقید بھی خوب کی ہے اور اصل کتاب تو ایسی عجیب ہے کہ اردو لٹریچر میں ایک ہی ہوگی۔ اسی ندرت و جدت کے سبب سے اس کے مختلف اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:۔

کلیاتِ دلگیر پر ریویو۔ کلیاتِ دلگیر ایک نئی قسم کا دیوان ہے جس سے غالباً خاص خاص شخصوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ صاحب دیوان ایک بزرگ منوّر خاں نام دلگیر تخلص، رئیس میرٹھ ہیں۔ ۱۸۵۰ء میں انہوں نے کچھ نظمیں گنواری زبان میں جو درمیان دوآب و ہریانہ کے دہات میں عموماً بولی جاتی ہے، لکھ کر مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے حضور میں پیش کی تھیں۔ وہاں ان نظموں کی بہت داد ملی اور بادشاہ نے انعام اور خلعت عنایت کیا ... قدردانی نے دلگیر کے خیالات پر وہی اثر کیا، جو سلطان سنجر نے ملک الشعرا

کا تزک و احتشام دیکھ کر اوحدالدین انوری کے دل پر ہوا تھا۔ انھوں نے اسی گنواری زبان پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی، اور رفتہ رفتہ ایک نئی قسم کا دیوان مرتب کرلیا، جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔

جس زبان میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے، وہ درحقیقت ایک قسم کی بگڑی ہوئی اردو ہے۔ جیسا کہ ہر ملک میں دہاتیوں اور گنواروں کی زبان شہر والوں کی بگڑی ہوئی زبان ہوتی ہے۔ بس اس دیوان میں زیادہ تر وہی الفاظ، جو فصیح اردو میں صحیح طور پر مستعمل ہوتے ہیں، کسی قدر تغیر کے ساتھ گنواری بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے خالق اور کھالک۔ باپ اور باپو۔ ہمارے اور مھارے پیچھے پیچے اور چیاں چیاں، تونے اور تیں نے، کیا اور کینا، دیا اور دینا وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ ایک موزوں طبع آدمی کو جس کی مادری زبان شہری فصیح اردو ہو، بگڑی ہوئی اردو کا سیکھ لینا اور اس میں اشعار موزوں کرنا زیادہ دشوار نہیں۔ مگر جو بات دشوار اور سخت دشوار ہے، اور جس پر سوا اس شخص کے جو ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوا ہو، کوئی قادر نہیں ہوسکتا۔ وہ یہ، کہ جو مضمون ایک گنواری زبان میں بیان کیا جائے، اس کا پیرایۂ بیان بھی گنواروں کے محدود خیالات کی حد سے متجاوز نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ اس دیوان میں یہی وہ چیز ہے، جو دلگیر کے اصلی اور قدرتی شاعر ہونے پر بہ آواز بلند گواہی دیتی ہے۔ جس طرح اس کی زبان گنواری ہے، اسی طرح اس میں ہر ایک مضمون گنواروں کے خیالات کے موافق ادا کیا گیا ہے۔ وہ خدا کی تعریف اس طرح شروع کرتا ہے۔

ہے مرے کھالک ہے مرے مالک تو باپو، ہم تیرے بالک

(ہے حرف ندا یعنی اے کھالک = خالق۔ باپو = باپ) خدا کی عظمت کا بیان گنواروں کے خیالات کے موافق اس سے بہتر کسی پیرایہ میں نہیں ہوسکتا کہ اس کو باپ اور اپنے تئیں اس کے بچے قرار دیں۔

مھارے حاکم. مھارے سوائیں — چپّاں چپّاں تیری دُہائی
ہمارے سردار

تس پانی سوں مانس کینا — سوجھ بوجھ مت سدھ بدھ دینا
تونے سے آدمی بنایا — دیا

تیرے سانچے انیک نرالے — جن سانچوں لکھ کایا ڈھالے
بے شمار — لاکھ جسم

خدا تعالیٰ کی حکمت بالغہ کو. جو قرآن میں ان لفظوں سے بیان کی گئی ہے کہ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا اس طرح بیان کرتا ہے کہ تیرے سانچے بے شمار اور ان گنت ہیں کہ ایک سانچے کی ڈھلت دوسرے سانچے کی ڈھلت سے نہیں ملتی۔

انبر. دھرتی. سورج. چندر — دئی. دیوتا. پیر پگمبر
آسمان — اوتار — پیغمبر

سب تری ڈوڈھی سیس نِوادیں — تجھے نے پوجیں تجھے نے گاویں
ڈیوڑھی سر جھکائیں — تجھی کو — تیرا ہی نام لیں

جے توا پنا چھوہ دکھاوے — انبر دھرتی پھوٗ ہوجاوے
اگر غصہ

توں ہی مارے. توں ہی نواجے — تیرا دھونسا انبر باجے
نوازے — نقارہ آسمان پر بجتا ہے

چونکہ بادشاہوں اور امیروں کے نقار خانے بہت بلندی پر بنائے جاتے ہیں تاکہ نوبت کی آواز دور دور پہنچے اور سننے والوں کو ان کی زیادہ شان وشوکت معلوم ہو، اس لئے عوام کے خیال کے موافق عظمت و جلالت الٰہی کو اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے کہ تیرا نقارہ آسمان پر بجتا ہے......

(حمد و نعت کے بعد) اس مطلب کو کہ آپؐ چاروں یاروں نے دنیا میں

اسلام کو پھیلایا اس طرح بیان کرتا ہے۔

نبیؐ صاحب کے چار سپائی جنھاں نے ملکوں دھوس مچائی

سپاہی جنھوں نے دھوم مچائی

کر دیے لکھوں نیم کے بندے نرمل ہو گئے مانس گندے

ایمان پاک آدمی

پھر اس مطلب کو کہ جس نے آنحضرت صلعم کی پیروی نہ کی وہ تباہ ہوا، اس طرح ادا کرتا ہے۔

جو کوئی واکی گیل نہ چالا واہ کا دو جگ ہیرا کالا

اس کے ہمراہ دونوں جہاں میں منہ

ڈوب گیو وہ کرموں ہینا جن حجرت کا سنگ نہ دینا

وہ نصیبوں کا ہیٹا جس نے حضرت ساتھ

ایک شخص اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور جا پڑا ہے۔ گویا وہ خدا کی طرف مخاطب ہو کر اپنی مصیبت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے۔

ہے مرے صاحبؔ یو کے کینا مجھ نے دیس نکالا دینا

اے میرے مالک یہ کیا کیا مجھے دیس نکالا یعنی جلاوطنی دی

میں کے تیری بھوری کھیدیں جے مرے کالجے برچھی چھیدیں

میں نے کیا تیری بھوری بھینس نکال لی ہے کہ تو نے میرے کلیجے میں برچھی چبھو دی ہے

اپنے صاحب یعنی خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جو تو نے مجھ پر مصیبت ڈالی ہے، چونکہ گنوار لوگ بھوری بھینس کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اس لئے انھیں کے خیالات کے موافق خدا تعالیٰ سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جس کا تو نے مجھ سے یہ بدلا لیا ہے۔ (اس کے بعد) کہیں جنتی حقہ اور چوپاڑ کے ساتھیوں کو یاد کرتا ہے، کہیں بھابڑ کے بانوں سے بنی ہوئی کھاٹ کھٹولی، گوبر کی ڈھیریوں، سانی کی ناندوں، دودھ دہی کی

کی کوری مٹکیوں، سرسوں کے ساگ اور مکا کی روٹی اور اسی قسم کی اور چیزوں کا جو دہاتی زندگی کے مناسب ہیں، حسرت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل اس دیوان میں یہ بات ہے کہ ظاہرا **دلگیر** سے پہلے کسی نے گنواری زبان میں دیوان مُدوّن نہیں کیا، اور نہ اتنے مختلف مضامین جتنے کہ اس دیوان میں ہیں، کبھی اس زبان میں بیان کئے گئے۔ اس میں حمد۔ نعت۔ منقبت۔ اخلاق۔ ہزل۔ عشق۔ ہجر۔ وصل۔ رشک۔ غرضکہ وہ تمام بیانات جو اردو کے عام دیوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ موجود ہیں۔ پس اردوے معلیٰ کے شعرا جو کئی سو برس سے اسی ایک ہڈی کو چچوڑتے چلے آتے ہیں ان میں اور **دلگیر** میں وہی فرق ہے جو مقلد اور مُوجد میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ جب مضامین مذکورہ بالا میں سے کسی مضمون کو باندھنا چاہتے ہیں، تو اس کے ادا کرنے کے لئے سینکڑوں اسلوب بیان اور الفاظ و محاورات اور تراکیب اردو لٹریچر میں مُہیّا پاتے۔ ان کے سامنے مختلف مقدار کے بندھے ہوئے موتیوں کا انبار موجود ہے۔ جیسے موتی کی ضرورت ہوتی ہے، بے تکلّف لڑی میں پرو لیتے ہیں۔ برخلاف اس شخص کے جس کو اوّل غوطہ لگا کر دریا میں سے سیپیاں بہم پونہچانی، پھر اِن میں سے موتی نکالتے ہیں۔ پھر اِن کو جِلا کرنا ہے۔ پھر بیندھنا ہے۔ پھر لڑی میں پرونا ہے۔

اس سے زیادہ مشکل یہ بات ہے کہ گنواری زبان ایک جاہل قوم کی زبان ہے، جس کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے۔ باوجود اس کے **دلگیر** نے اس میں بہت سے ایسے مضامین بیان کئے ہیں، جن کا ایک گنواری زبان میں سمانا سخت مشکل ہے۔ مثلاً انگریزی عملداری کی تعریف میں نوایجاد توپوں اور بندوقوں کا بیان۔ ریل۔ تار برقی۔ سڑکوں اور نہروں کا بیان۔ برف کی کل۔ واٹر ورکس کا بیان۔ دیا سلائی۔ گیس اور برقی روشنی کا بیان وغیرہ وغیرہ مذکورہ بالا بیان میں سے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں۔

جُگ جُگ رہے پھرنگی راج یو راجے۔ راجوں سرتاج
ہمیشہ ہمیشہ فرنگی — یہ بادشاہ بادشاہوں کے سرتاج ہیں

راجا راجی سُکھی کسان یو راجا پرجا کی جان
راضی خوشی

بڈے بادچھا۔ بڈے نساپھ بڈے اَکل ور، بڈے سراپھ
بادشاہ انصاف — عقل ور اشراف

انگریجاں کا ملکوں راج راجا بڈے گریب نواج
غریب نواز

انگریجاں کی بانکی پھوج جابد چڈھے سمندر موج
جس طرح

پڑے سمندروں گھنے جہاج جا میں راکھیں بھر بھر ناج
جن میں

کھاوے پھوج۔ انگھاوے بھوج بیٹھی باجے بجاوے پھوج
سیر ہو

توپاں چلیں گھٹا گھنگھور کاسوں ہو سرکار کی ہور
کس سے برابری

تورا لگے نہ دارو موکھ آپو آپ چلیں بندوکھ
توڑا بارود — بندوق

ہند بندوکھاں لمبی نال داگی دگیں نہ دو دو سال
ہندوستانی بندوقیں — داغنے سے نہیں دغتیں

ہندراج کھوئی تردار گا جر کٹے نہ سو سو مار
تلوار

راج پھرنگی رہے آنند جد لگ انبر۔ سورج۔ چند
جب تک

ریل گاڑی۔ کاڈھے تار — دن میں چالے میل ہجار
نکالی

تار کھر سوں راتوں رات — لاکھ لوکس سوں کر لو بات
اچرج بڑی برپھ کی کل — واسے گھوما دے کونسا کل

اچنبھا — برف — اسکو — پہلوان
کاگج دام چلاوے کون؟ — ایسا ٹھاڈا آوے کون؟
کاغذکے دام یعنی نوٹ

سڑک بناویں۔ کھودیں نہر — کھیت کھیت پانی کی لہر
جاسے ہو نکھوں من ناج — کدھیں رہیں نا ٹھالی چھاج
جس سے — کبھی — بیکار

بمبے دیلے دھرتی ماں گال — تلے تلے پانی کی چال
پانی کے نل — زمیں میں گلائے

بگڑ بگڑ ماں لاوے نل — جایں آوے نرمل جل
گاؤں گاؤں میں

یا ہی بدسوں جلیں چراگ — نا باتی۔ نا تیل۔ نہ آگ
نا کوئی دیوا بالن واڑا — آپو آپو ہو اُجیارا
اجالا

آپو ترکے جاویں بجھ — اچرج مانیں مجھ اور تجھ
بڈے بڈے پر جانو سکھ — ناہیں رہے اب دھرتی دکھ
بڑے بڑے رعایا کو آرام ہیں

(مطبوعہ رسالہ معارف ۱۹۰۱ء)

مولانا حالی کے مضامین میں مسدس کا دیباچہ بھی ان کے ادب و انشا کا نادر نمونہ ہے۔ مولانا کتابوں کی طرح مضامین میں بھی انگریزی کے الفاظ

لکھنے لگے تھے مثلاً

"جو اسٹائل[51] انھوں نے ابتدا سے اختیار کیا ہے اس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ رائٹر[52] اور ریڈر[53] دونوں کے لئے روز بروز زیادہ صاف اور زیادہ مجلیٰ ہونا چاہئے۔"

(ریویو سیرۃ النعمان ۱۸۹۳ء)

حیات جاوید اور اس کے بعد کے مضامین میں مولانا حالی کا اسلوب تحریر اور پیرایہ بیان بہت رواں اور پختہ ہو گیا تھا۔

(۷) **مکتوبات حالی**۔ مولانا کے خطوط ۱۹۲۵ء میں دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جو مولوی عبدالحق صاحب نے مقدمۂ مکتوبات میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے، اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں، بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو، جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو، تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہو گی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔"

ایسے پاک دل کی تراوش کا ایک ذرا سا نمونہ یہ ہے:۔

۱۔ مولانا اپنی پوتی (اہلیہ خواجہ غلام الثقلین) کو خط لکھتے ہیں۔

---

[51] اسٹائل، طرز تحریر۔

[52] رائٹر، لکھنے والا یعنی مصنف

[53] ریڈر، پڑھنے والا یعنی کتاب کا مطالعہ کرنے والا۔

تمہارا خط ممن انتظار میں پونہچا۔ اس کو پڑھ کر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا اور تمہاری پُھپھی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے تم نے اتنی دُور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بہت بڑھا دی ہے۔ تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت و سلامتی کی دُعا کرتی رہتی ہیں مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمہاری صحت اچھی ہو جاے گی۔ کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے، اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی ۔۔۔۔۔۔۔ ہوں۔

ایک خط بھائی فیاض حسین کے مکان کے پتے سے دادی بہو کے نام بھی بھیجا اور اس میں یہ لکھا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہے۔ روانگی کے دن میرا ارادہ آپ کے پاس آنے کا تھا، مگر مجھے اتنی فرصت کسی نے نہ لینے دی۔

پہلے پیراگراف کا آخری جملہ محبت، لطافت، ظرافت کا عجیب دلکش و موثر نمونہ ہے دوسرے پیراگراف میں ازراہ شفقت تعلیم اخلاق فرماتے ہیں۔ پوتی ایک بزرگ خاندان سے مل کر نہیں آئیں۔ ان کو شکایت ہو سکتی ہے اور ممکن ہے اِن کو اس کا خیال بھی نہ آئے۔ مولانا رفع شکایت کی صورت بتاتے ہیں۔

ب۔ بعض خطوں میں علمی و ادبی مسائل بھی ہیں۔ ان کا نمونہ یہ مختصر خط ہے جو مولانا نے مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی (نواب صدر یار جنگ) کو لکھا ہے:۔

جناب من۔ لفظ "ہاتھ" میں بلاشبہ ہائے مخلوط ہے، لیکن رات اور بات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے۔ قافیے کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فروگذاشتوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالب کبھی اور کسی کی جگہ کبھو اور کسو کو غیر فصیح سمجھتے تھے، لیکن ان کے اُردو دیوان میں قافیے کی جگہ کسو اور کبھو بندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں، مگر قافیے میں ہات باندھنا جائز سمجھتا ہوں۔ زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت محلہ انصاریان
۶ر فروری سنہ ۱۸۹۰ء

ڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی

مولوی سیّد علی صاحب[۵۱] ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء کو بلگرام کے ایک شریف و معزز خاندان میں تولد ہوئے۔ ان کے بزرگ چھٹی صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) میں شہر واسطہ سے جو عراق عرب میں واقع ہے ہندوستان آئے۔ اور اودھ میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے جد امجد مولوی سید کرم حسین[۵۲] گورنر جنرل کے دربار میں شاہ اودھ کے سفیر تھے۔ والد اور چچا بھی انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے۔

ان کے والد سید زین الدین حسین خاں اور چچا سید اعظم الدین حسین خاں دونوں علوم مشرقی کے فاضل و ماہر تھے۔ اور یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے باقاعدہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی۔ دراصل یہ خاندان مسلمانوں کے ان چند خاندانوں میں سے ہے جنھوں نے سب سے پہلے زمانے کی بدلتی ہوئی فضا کو پہچانا اور ضرورت زمانہ پر عمل کرکے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا شوق پیدا کیا۔

مولوی سید علی صاحب اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ میجر سید حسن بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی ان کے بڑے بھائی تھے۔ مولوی صاحب بڑے ذہین اور ہونہار تھے۔ حافظہ نہایت عمدہ تھا جو بات ایک دفعہ پڑھتے یا سنتے پھر کبھی نہ بھولتے۔ پندرہ برس کی عمر تک علوم عربیہ و فارسی کی تعلیم مکمل کرلی۔ ۱۸۶۶ء میں انگریزی تعلیم شروع کی دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں پٹنہ کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔اے میں آپ کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ بعد ازاں تین سال تک وہ قانون ملکی کا مطالعہ کرتے رہے اور ایک سال بعد امتحان نیٹو سول سروس میں تمام صوبے میں اول آئے۔ اس کے بعد طامسن اسکالرشپ پاکر وہ رڑکی کے انجنیرنگ کالج میں داخل ہوئے لیکن چھ مہینہ بعد ہی حیدرآباد کے مشہور

---

[۵۱] یہ حالات ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مضمون مطبوعہ چند ہم عصر سے لئے گئے ہیں۔

[۵۲] سید کرم حسین صاحب غالب کے دوست تھے "چکنی ڈلی" والے قطعہ میں "صاحب" سے مراد یہی مولوی کرم حسین ہیں۔

وزیر نواب مختار الملک سرسالار جنگ بہادر اول نے وہاں سے بلاکر اپنے پرسنل اسٹاف میں شامل کرلیا اور جب ولایت گئے تو انھیں بھی ساتھ لیتے گئے۔ وہاں وہ شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل ہوئے اور دو ہی سال میں ایسوشی ایٹ کا امتحان پاس کیا اور علم طبقات الارض میں تمغہ حاصل کیا اس سے قبل وہ لندن یونیورسٹی کا امتحان میٹرکیولیشن بدرجہ اعلیٰ پاس کرچکے تھے اس امتحان میں ان کی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں۔

انگلینڈ سے واپسی پر انھوں نے فرانس۔ اسپین۔ جرمنی اور اٹلی کی سیاحت کی۔ اطالوی زبان اور علوم سیکھنے کے لئے کچھ عرصہ اٹلی میں قیام بھی کیا۔ حیدرآباد واپسی پر ریاست نے انھیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا۔ کچھ عرصہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور ہوم سکرٹری بھی رہے۔

مولوی سید علی عجیب قابلیت کے آدمی تھے۔ لاطینی۔ انگریزی۔ جرمنی۔ فرانسیسی۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ سنسکرت۔ بنگالی۔ ہندی۔ تلنگی۔ مرہٹی اور گجراتی زبانوں کے ماہر تھے۔ سنسکرت نہایت عمدہ اور فصیح بولتے تھے۔ مدراس یونیورسٹی کے ایم۔ اے سنسکرت کے امتحان کے ممتحن کئی سال تک رہے۔

مولوی صاحب آخر زمانہ تک معتمد تعمیرات و ریلوے و معدنیات رہے۔

۱۸۹۱ء میں سر آسماں جاہ بہادر کے زمانۂ وزارت میں بعض انقلابات سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے امتحان وکالت کی تیاری شروع کی اور باوجودیکہ امتحان میں صرف چار مہینہ باقی تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی۔ ایل میں اول نمبر پر پاس ہوئے۔ اس سے ان کی خداداد قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں سرکار نے آپ کو شمس العلما کا خطاب عنایت کیا۔

۱۹۰۱ء میں حیدرآباد سے پنشن لیکر انگلستان چلے گئے وہاں ۱۹۰۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر مقرر ہوئے۔ اسی سال انڈیا آفس کے عربی فارسی قلمی کتابوں کی فہرست مرتب کرنے پر مامور ہوئے۔

یہ نہایت مشکل کام خیال کیا جاتا تھا۔

مولوی سید علی صاحب مختلف علوم مشرقی و مغربی کے ماہر تھے۔ لیکن وہ طبعاً محنت کے کاموں سے جی چراتے تھے۔ چنانچہ علمی میدان میں ان کے کارنامے بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ تقریباً سب ترجمہ ہی تک محدود ہیں۔ گو اس زمانے میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنا ہی علم و ادب کی کافی خدمت تھی۔ ان کے تراجم کی فہرست حسب ذیل ہے :۔

(۱) میڈیکل جورس پروڈنس یعنی اصول قانون طب (ڈاکٹر ہیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) سرکار نے اس پر چھ ہزار روپیہ انعام دیا۔ اس میں انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

(۲) رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ اس میں مرحوم نے بڑی تحقیق سے اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب اصل میں کس نے اور کہاں لکھی اور پھر کہاں کہاں پہنچی اور ترجمے ہوئے۔ اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ رسالہ مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا۔

(۳) فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ۔

(۴) غارہائے الورا کا گائڈ۔

(۵) حیدرآباد کے اقتصادی و طبقات ارضی معدنیات۔

(۶) تمدن عرب۔ ڈاکٹر گستاولی بان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔

(۷) تمدن ہند۔ یہ کتاب بھی اسی مصنف موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۸) انھوں نے موسیو سدیو کی کتاب تمدن عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اردو میں کیا تھا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو گیا ہے تو اس کو طبع نہیں کرایا۔

مولوی سید علی صاحب نے الحقائق نامی ایک سہ ماہی رسالہ عربی میں نکالا۔ اس رسالہ میں ملک کے نامور عالموں اور ادیبوں نے اچھے اچھے مضمون لکھے۔ دوسرا قابل قدر کام جو مرحوم نے کیا وہ نواب سر وقار الامرا بہادر کے عہد میں ایک سررشتہ علوم و فنون کا قیام تھا۔ مرحوم خود اس کے نگراں مقرر ہوئے اس کا مقصد اُردو میں کتابیں تصنیف تالیف و ترجمہ کرنا تھا۔ مولانا شبلی اس سررشتہ کے ناظم مقرر ہوئے اس کا مقصد اردو میں کتابیں تصنیف و تالیف و ترجمہ کرنا تھا۔ مولانا شبلی اس سررشتہ کے ناظم مقرر ہوئے ان کی اور کئی کتابیں اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں لیکن بدقسمتی سے یہ سررشتہ قائم نہ رہ سکا گو ضرورت اس کی ہنوز باقی ہے۔

مرحوم کو کتابوں کا بہت شوق تھا تقریباً ہر علم و فن کی کتابیں آپ کے کتب خانہ میں تھیں لیکن اسلامی علوم و علمِ ادب سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق جتنا لٹریچر ولایت میں چھپا سب انھوں نے اپنے کتب خانہ کے لئے فراہم کیا۔ مولوی صاحب کو بیش قیمت اور نایاب کتابوں کے جمع کرنے کا نہایت شوق تھا۔ چنانچہ بعض نادر الوجود کتابیں بڑی کوشش سے حاصل کیں۔ الوصایا لابی حاتم السجستانی کا صرف ایک قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب و امام عبدالقادر بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے دستخط تھے، کیمبرج میں تھا۔ کتاب بوسیدہ تھی اس لیے اس کا فوٹو لیا گیا اور دس کاپیاں تیار کی گئی تھیں۔ اور سب تقسیم ہو گئی تھیں۔ مولوی سید علی نے یونیورسٹی کے پروفیسر سے جس نے اس کا عکس لیا تھا بڑی کوشش سے اس کی ذاتی لائبریری کا نسخہ حاصل کیا۔ انھوں نے جمہرۃ اللغہ لابن دُرید جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پانسو روپیہ میں خریدی۔ ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک معزز رئیس یہ کتاب ان سے مانگ کر لے گئے، اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ڈیڑھ ہزار روپیہ کو فروخت کر دی۔ سید علی صاحب اس بات کو بھول گئے تھے۔ کئی سال کے بعد ایک روز معلوم ہوا کہ اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ میں ہے۔ منگا کر دیکھا تو ان کا اپنا نسخہ تھا۔

جب اس کی فروخت کا حال سنا تو بہت رنج ہوا۔ آخر اس کی نقل اپنے لئے لے لی۔ اس کے بعد جب برلن (جرمنی) گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی۔ اس کو بہت پسند آئی۔ ان کو روپیہ کی ضرورت تھی۔ پندرہ ہزار روپیہ میں اس کے ہاتھ فروخت کر دی۔ تزک بابری کا ترکی زبان کا نسخہ انھوں نے سر سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں دیکھا اس کو اپنے ساتھ ولایت لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت پسند کیا اور گب میموریل فنڈ کی طرف سے اس کے عکسی نسخے شایع کئے گئے۔ انھوں نے اصل کتاب مع عکسی نسخے کے واپس کر دی۔

ان کو مطالعہ میں آسانی پیدا کرنے کی وجہ سے حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون کی ترتیب بدلنے کا خیال پیدا ہوا۔ کشف الظنون کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتابوں کو حروف تہجی پر تقسیم کیا ہے۔ یہ چاہتے تھے کہ مصنفوں کے ناموں کو حروف تہجی پر تقسیم کیا جائے اور ہر مصنف کے ذیل میں اس کی تمام تصنیفات درج کی جائیں۔ تاکہ جس مصنف کا مطالعہ مقصود ہو اس کا تمام کارنامہ سامنے آجائے۔ اس کام کے لئے انھوں نے ایک آدمی ملازم رکھا جسے تقریباً دس برس تک پندرہ روپیہ ماہوار دیتے رہے لیکن افسوس یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اسی طرح وہ آگسٹس فلوجل کے مرتبہ انڈکس قرآن میں ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ آگسٹس نے ہر سورت کے لئے ہندسوں کا نشان رکھا ہے۔ سید علی صاحب سورتوں کے نام لکھنا چاہتے تھے۔ یہ کام پورا ہو گیا تھا لیکن طبع کی نوبت نہیں آئی۔

مولوی سید علی صاحب عالموں کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان سے ملنے میں کبھی غدر نہ کرتے بلکہ اس کے درمیان میں کسی بڑے آدمی سے بھی ملنا پسند نہ کرتے۔ وہ اہل علم کے کاموں کی بھی بڑی وقعت کرتے اور کبھی تعریف و توصیف میں بخل نہ کرتے۔ مولانا حالی کی بڑی قدر کرتے تھے جب حیات جاوید چھپی تو فوراً منگائی اور ختم کر کے چھوڑی۔ تمدن ہند کا ترجمہ کرنے سے پہلے چند صفحہ

حیات جاوید کے پڑھ لیتے پھر ترجمہ شروع کرتے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ قرآن کو بہت پسند کرتے اور وہی ترجمہ اپنے حوالوں میں لکھتے۔

شملہ میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ نے اپنی کتاب ارمغان دہلی کے بعض حصے پیش کئے مرحوم نے بہت پسند کئے اور سفارش کر کے پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ مولوی سید احمد موصوف پر ایک دفعہ کئی ہزار روپیہ کی ڈگری ہوئی آپ نے فوراً روپیہ ان کے پاس بھجوا دیا۔

مولوی صاحب بڑے بامروّت آدمی تھے جب کبھی کسی دوست کا کام پڑتا مقدور بھر کوشش کرتے۔ اگر کوئی دوست کچھ مانگتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔ بڑے مہمان نواز تھے۔ عالموں کی مہمان نوازی سے ہمیشہ خوش ہوتے۔

مولوی صاحب اگرچہ شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور شیعہ تھے۔ لیکن تعصب سے بالکل بری تھے۔ وہ شیعہ سنّی جھگڑے کو پولیٹکل جھگڑا خیال کرتے تھے۔ ان کے نہایت وسیع کتب خانہ میں شیعہ مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔ شیعہ کتب کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ محض بیکار ہیں اور ہرگز قابل استدلال نہیں۔

ایک مرتبہ مولوی سید علی کی کیمبرج یونیورسٹی میں ایک شیعہ عالم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پوچھا کہ "تم حضرت عمرؓ سے کیوں عداوت رکھتے ہو" ایرانی نے کہا "ہم حضرت علی کی پیروی کرتے ہیں"۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ میں تو کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی تو اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کبھی نہ کرتے" ایرانی نے تعجب سے پوچھا کہ "اس واقعہ کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے"۔ مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے تاریخ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی جو شیعہ عالم تھا لاکر دکھائی۔ ایرانی عالم اس واقعہ کو دیکھ کر تائب ہوا اور کہا اب کبھی میں حضرت عمرؓ کو برا نہ کہوں گا اور تعجب کیا ہمارے عالم اس واقعہ کو کیوں

چھپاتے ہیں۔

جب آپ سے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت قبول کرنے کو کہا گیا تو آپ نے انکار فرمایا اور کہا کہ میں سنہ ۱ ہجری کا شیعہ ہوں اس قسم کی کانفرنس کو ہرگز پسند نہیں کرتا جبکہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔

مولوی صاحب صحیح بخاری اور ہدایہ کے بڑے مداح تھے اور کہتے تھے عربی سیکھنے کے لئے بہترین کتابیں ہیں۔

مولوی صاحب غیر متعصب اور وسیع المشرب تھے لیکن غیرت وحمیت قومی ان میں بہت تھی اور مولویوں کی جاہلانہ اور متعصب باتوں سے بڑے خفا ہوتے تھے۔ ہندوستان کے مروجہ پردہ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے اور تعدد زوجات کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مزاج میں مزاح بھی بہت تھا۔ ایک مرتبہ مولوی محمد سورتی نے جو عربی کے بڑے عالم اور قدیم کتابوں کے شوقین تھے، ان سے ایک کتاب نقل کرنے کے لئے مانگی۔ کتاب نادر تھی۔ دینا نہ چاہتے تھے مگر مروّت کے سبب سے انکار کرنا بھی مشکل تھا۔ کتاب نکال کر لائے اور مولوی سورتی صاحب کے ہاتھ میں دیدی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بیشک نہایت عمدہ ہے مگر اس کی جلد سُور کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ سُنتے ہی فوراً لاحول ولاقوۃ کہہ کر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔

مولوی سید علی صاحب نے انگلستان میں ایک مدت گزاری تھی لیکن انگریزی تہذیب واخلاق کو بُرا سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے متعلق ان کی رائے تھی کہ انھیں روپیہ کمانا اور صرف کرنا آتا ہے۔ ان کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔

اخیر زمانہ میں انھیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا جس کا انھیں بڑا قلق تھا۔ انھوں نے ہردوئی میں سکونت اختیار کی لیکن جب وہاں سے علی گڑھ آنے

جانے لگے اور مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں دلچسپیاں لینے لگے تو پھر ان کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ کام کا وقت اب آیا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کا انسٹیٹیوشن مرتب کرنے میں انھوں نے بڑا حصہ لیا۔ آخر ہردوئی میں دفعتہً قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ۳ مئی ۱۹۱۱ء (مطابق ۱۳۲۹ھ) کو انتقال کیا۔ نیازمند راقم نے قرآن مجید کی آیت سے تاریخ نکالی :-

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْیَوْمَ فِیْ شُغُلٍ فٰکِهُوْنَ [5]

(سورہ یٰسین)　　۱۹۱۱ء

ادبی خدمات | مولوی سید علی صاحب کی قلمی خدمت صرف ترجمہ کی صورت میں ہے۔ اور وہ بھی صرف دو کتابوں کا شائع و مشہور ہوا :- **تمدنِ عرب** اور **تمدنِ ہند**۔ لیکن صرف ایک تمدنِ عرب کے ترجمہ نے ان کو امتیازی جگہ دلوا دی۔ فرنچ مؤرخ و عالم **لی بان** کی کتاب اپنے زمانے میں بہترین مکمل و مستند تصنیف تھی۔ سید صاحب نے اس کا ترجمہ بھی بہت اچھا کیا، اور تمدنِ عرب کو جیسے حسنِ طباعت کے ساتھ باتصویر شائع کیا، وہ بھی "اردو چھپائی" میں شاید پہلی چیز تھی۔ پہلی بار ۱۸۹۸ء میں طبع ہوئی۔ پچاس روپیہ فی جلد قیمت تھی۔ مصنف کی زندگی ہی پہلی اشاعت ختم ہو گئی۔ اور پھر ۲۵ برس تک دوبارہ طبع نہ ہو سکی۔ اب چند سال ہوئے سلطان العلوم نظام دکن کے "جشن سیمیں" (۲۵ سالہ مسند نشینی) کے موقع پر شائع ہوئی ہے۔

سید صاحب کی جن کتابوں کا پہلے ذکر آ چکا ہے، ان کے علاوہ بعض رسالوں میں انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے **ویدک لٹریچر** اور **فن طب** وغیرہ کے متعلق سلسلہ مضامین جاری رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن طبیعت کے عدم استقلال کی وجہ سے ایک ایک دو دو مضمون لکھ کر رہ گئے۔

---

[5] اس آیۂ کریمہ میں قرآن کا املا صحیح فٰکِهُوْنَ ہے۔ میں نے دونوں جگہ الف لکھ کر اعداد نکالے ہیں۔

تصانیف مولوی سید علی کے نمونے

۱ تمدّنِ عرب کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

ہارون رشید کے عہد میں عربوں کا تمدّن

جس کے زمانہ کی تصویر ہمیں "الف لیلہ" میں نظر آتی ہے (۷۸۶ء و ۸۰۹ء) اور اس کے بیٹے مامون کا وہ زمانہ (۸۱۳ء و ۸۳۳ء) جس میں بغداد نے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقّی اور سرسبزی حاصل کی اور مشرق کے تمام شہروں میں سب سے نام آور بن گیا۔ اس وقت ہارون الرشید کا نام کُل رُبع مسکون میں مشہور ہو گیا تھا۔ چینؔ تاتار و ہندوستان سے سفیر اس کے پاس آئے تھے اور شارل مین شہنشاہ فرانس نے بھی جو حقیقت میں تمام یورپ کا مالک تھا اور جس کا ملک بحر اٹلانٹک سے دریاے ایلپ تک وسیع تھا لیکن فی الواقع جس کی حکومت وحشیوں کی سی حکومت تھی ہارون الرشید کے پاس سفیر بھیجے اور نہایت ادب سے خواہش کی کہ زائرینِ بیت المقدّس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ خلیفہ نے اس درخواست کو قبول کیا اور سفیروں کو بیش بہا تحائف دے کر رُخصت کیا۔ منجملہ ان تحائف کے ایک ہاتھی تھا جس کی جُھول بہت ہی بیش قیمت تھی اور یہ جانور اس سے پہلے کبھی یورپ میں نہیں آیا تھا۔ علاوہ اس کے موتی جواہرات۔ ہاتھی دانت لوبان اور ریشمی انواع اقسام کے کپڑے تھے اور ان سب پر مافوق ایک گھڑی تھی جو وقت بتاتی تھی اور گھنٹوں پر بجتی تھی۔ اس گھڑی نے شارل مین اور اس کے نیم وحشی مصاحبین کو جن کے ذریعہ سے وہ بے چارہ بے فائدہ تمدّنِ روم کی تجدید کی کوشش کر رہا تھا نہایت چکّر میں ڈالا۔ اس کے دربار میں کوئی شخص بھی اس لائق نہ تھا جو اس گھڑی کے کیل کانٹے کو سمجھ سکتا.........

ملک کا مالی انتظام نہایت ہی باقاعدہ تھا۔ آمدنی کے ذرائع حسب ذیل تھے۔

اوّل ذاتی اور شخصی محصول دوم خفیف سا محصول مقبوضہ زمینوں پر، سوم چُنگی کا محصول! چہارم غیر مزروعہ اراضی کا محصول پنجم معدنیات کا محصول

مؤرخین عرب نے لکھا ہے کہ خلافت کی مجموعی سالانہ آمدنی تقریباً دس کرور روپیہ تھی جو اس زمانہ کے لئے بہت ہی خطیر رقم ہے۔

اس مال گزاری کی نگرانی ایک مجلس وزرا کے سپرد تھی جسے دیوان کہتے تھے۔

ابن خلدون لکھتا ہے "کہ انتظام مال گزاری کا دیوان اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ آمدنی کی نگرانی اور بادشاہی حقوق کی حفاظت کرے اور داخل و مخارج میں تناسب قائم رکھے اور فوج کی تعداد اور اس کی تنخواہ مقرر کرے اس دیوان میں بہت ہی لائق محاسب رکھے جاتے ہیں اور انھیں نشیانِ دیوان کہتے ہیں دیوان کے لفظ کا اطلاق اس عمارت پر بھی ہے جس میں وزرا جمع ہوتے ہیں۔

مُلک کا انتظام چار صیغوں میں منقسم تھا جو فی الواقع ہمارے موجودہ وزرایوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اوّل صیغۂ حرب دوّم صیغۂ مال گزاری جس کا کام محصولات کا قرار دینا تھا۔ سوّم صیغۂ شخصی جو محصولات کے وصول کرنے والوں کو مقرر کیا کرتا تھا۔ چہارم صیغۂ انتظامی جس کا کام مداخل و مخارج کی نگرانی کرتا تھا۔ خلیفہ کے کُل احکام لکھے جاتے تھے اور اس غرض سے دفتر میں رکھے جاتے تھے کہ خلفائے مابعد اُن کی طرف بآسانی رجوع کر سکیں۔ اس ساری کَل کی کُنجی ایک وزیر کے ہاتھ میں رہتی تھی جو بطور مدارالمہام ہوا کرتا تھا اور اکثر خلفا کُل امورات مُلکی کو اُسی کے اختیار میں چھوڑ دیا کرتے تھے۔

شہروں کی کوتوالی کا انتظام ویسی ہی عمدگی کے ساتھ تھا جیسا ڈاک اور مداخل و مخارج کا۔ تاجروں کی مجلیس قائم کردی گئی تھیں۔ جن کا فرض یہ تھا کہ معاملاتِ تجارتی کی جانچ اور فریب و دغا بازی کا انسداد کریں۔

خلفائے عبّاسیہ کے مداخل و مخارج کے انتظام نے انھیں بہت بڑے بڑے رفاہِ عام کے کام کرنے کا موقع دیا تھا ملک میں سڑکیں بن گئیں

تھیں اور کاروان سرائیں۔ مساجد شفاخانے اور مدارس ہر طرف علی الخصوص بغداد و بصرہ و موصل میں بکثرت قائم ہوگئے تھے۔

کاشتکاری اور حرفت نے بھی بڑی ترقی کی تھی۔ شیراز اور اصفہان کی شرابوں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی اور دُور دُور جاتی تھیں باریک اور عمدہ کپڑوں کے کارخانے موصل اور حلب و دمشق میں قائم تھے۔ نمک۔ گندھک۔ سنگ مرمر لوہے اور سیسے کی کانیں بہت ہی باقاعدہ طور پر کھودی جاتی تھیں۔ اور ان کی پیداوار مصرف میں آتی تھی تعلیم عام کا صیغہ بھی ایک بہت وسیع اُصول پر قائم ہوا تھا۔ تمام حصّۂ عالم سے مشہور فضلا اور اساتذہ بُلائے گئے تھے۔ علم ہیئت کی اس درجہ ترقی ہوئی تھی کہ وہ کام جس کو یورپ کی اقوام نے بالکل زمانۂ حال میں کیا ہے۔ اس وقت ہو چکا تھا۔ یعنی دائرۂ نصف النّہار کے ایک قوس کی پیمائش کی جا چکی تھی۔ قدماے یونان و روم کا کلام علی الخصوص وہ کلام جو فلسفہ اور ریاضیات سے متعلق تھا ترجمہ ہو چکا تھا اور کُل مدارس میں پڑھایا جاتا تھا۔ زمانۂ قدیم کی تحقیقات بھی جو یورپ میں کئی صدی بعد شروع ہوتی۔ عربوں میں عام طور سے جاری تھی۔

(۴) تمدّنِ ہند :-

یونانیوں کے تعلقات ہند سے ہند کے تعلقات یونانیوں کے ساتھ بلخ کی یونانی حکومتوں کے ذریعہ سے مدّت تک باقی رہے جیسا کہ مگستھینز کی سفارت سے ثابت ہوتا ہے۔ اس یونانی سفیر کو سلوکس نیکوٹار شام کے حاکم نے تقریباً تین سو سال قبل مسیح پاٹلی پتر کو بھیجا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب کہ یورپیوں نے ہند کے اندرونی حصّے میں نفوذ کیا اس زمانے کی تاریخ کے لئے صرف ہمارے پاس اسی یونانی سفیر کے بیانات رہ گئے ہیں، ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مگستھینز کی سفارت سے سلوکس کی غرض یہ تھی کہ عربوں سے جو تجارت یورپ

سے قائم کی ہے اس کا راستہ بدل کر خلیج اور انطاکیہ سے ہو کر مصر کو کر دیا جائے یہ وہ تجارت تھی جس نے مصر کے خاندان بطلیموس کو دولت مند بنا دیا تھا اور آگے چل کر قاہرہ کے خلفائے اسلام نے بھی اسی تجارت کی بدولت بہت کچھ مال و دولت حاصل کیا۔ بلخ کی یونانی حکومت کے تعلقات ہندوستان کے ساتھ مدت تک قائم رہے جیسا کہ ہمیں شمال و مشرق ہند کی عمارات کے مطالعہ سے معلوم ہو گا۔

جہاز کا براہ راست ہندوستان کو پہنچنا ۳۰ء قبل مسیح میں جس وقت مصر حکومت روما کا ایک صوبہ دار ہو گیا شہنشاہ آگسٹس نے اس خیال سے کہ عرب جو مصالح وغیرہ لاتے ہیں اور جس کو فی الواقع وہ ہند سے لایا کرتے تھے۔ خود ان کے ملک کی پیداوار ہے ایک فوج کشی عربستان پر کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ شاہنشاہ کلاڈیس کے وقت میں حسب اتفاق مخالف ہواؤں نے ایک جہاز کو جزیرۂ سیلون کے کنارے جا پھینکا اور اس وقت یہ بات معلوم ہوئی کہ بعوض کنارے کنارے جانے کے جہاز بخوبی براہ راست ہند کو آ سکتے ہیں۔ اس کے بعد رومی تجار مصر سے براہ راست گوا یا کیلیکٹ یا منگلور کو آنے لگے اور پلینی لکھتا ہے کہ اس سفر میں صرف دو مہینے دس دن لگتے تھے۔ اس زمانے کے ایک تاجر نے اپنا سفرنامہ لکھا جس کا نام ایرتھرین سمندر کا پیریپلس تھا۔ یہ کتاب آرین کے پیریپلس کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اس میں بہت سی جغرافی اطلاعات پائی جاتی ہیں۔

بطلیموس کا جغرافیہ بطلیموس کے جغرافیہ سے ہمیں قدیم اقوام کی ان اطلاعات کا اندازہ ہو سکتا ہے جو انہوں نے ہند کے متعلق حاصل کی تھیں۔ یہ اطلاعات نہایت ہی ناقص اور زیادہ تر ساحل کے بیانات پر محدود ہیں۔

عرب اور چینی سیاح

سلطنت روما کے زمانۂ انحطاط میں ہندوستان سے تعلقات اور بھی کم ہو گئے ہیں اور بالآخر جس وقت عربوں کے خلفائے راشدین کے زمانہ میں سلطنت زنطیہ کو فتح کرلیا تو ان تعلقات کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک اقوام نصاریٰ کا راستہ ہندوستان کی طرف بند رکھا اور اس زمانہ کے حالات ہمیں صرف عرب سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتے ہیں۔ مسعودی دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا اور ابن بطوطہ تقریباً ۱۳۳۰ء میں لیکن ان عرب سیاحوں سے بہت پہلے بدھ مذہب کے چینی زوّار اس ملک میں آچکے تھے اور ہوئن تسانگ کا سفرنامہ ہمارے لیئے ایک بڑا ذخیرہ اس زمانے کی معلومات کا ہے۔

(۴) **تاریخ عرب**۔ اس کے ترجمہ کا پہلے ذکر آچکا ہے کہ جب سید صاحب کو علم ہوا کہ موسیو سدیو کی اس تاریخ کا ترجمہ عربی زبان میں ہو گیا ہے، تو انھوں نے اپنے اردو ترجمہ کو چھپوانے کا خیال چھوڑ دیا۔ لیکن شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر اڈیٹر مخزن لاہور کی فرمایش سے رسالہ میں شائع کرنے کے لئے اپنا ترجمہ لندن سے بھیجنا شروع کیا تھا۔ لیکن اس کی بھی تکمیل نہو سکی۔

اگست ۱۹۰۷ء کے "مخزن" سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

عربوں نے اپنے آبا و اجداد کی قدیم رسوم و رواج کو قائم رکھا ہے۔ ان میں اوصاف اضداد جمع ہیں۔ وہ خونخوار بھی ہیں اور غایت درجہ فرماں بردار بھی۔ وہمی ہیں اور مغرور بھی۔ اور انھیں پوچ اعتقادات اور کہانیوں سے بے انتہا شوق ہے۔ وہ گویا سدا جوان ہیں اور جب کوئی نیا خیال ان کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے، تو ان میں بڑے بڑے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو وہ آزاد اور فیاض ہیں، اور دوسری طرف مغلوب الغضب و ربیباکی سے بھرے ہوئے خاندان سیمیا طیقی کے کُل اوصاف اور کُل معائب اس

ایک عرب میں موجود ہیں۔ اپنی کل مایحتاج کو مہیا کرنے کی ضرورت نے اسے پھرتیلا اور چالاک بنایا۔ ہر قسم کی تکالیف کو برداشت کرنے کی مجبوری نے اسے صبر دیا، آزادی کا وہ اس وجہ سے عاشق ہے کہ یہی ایک نعمت ہے جو اس کے حصہ میں آئی ہے۔ اور چونکہ اسے ہر قسم کے تحکّم سے نفرت ہے، اس لئے لڑنا پڑنا اس کی فطرت کا جزو ہوگیا ہے۔ خود اپنے اوپر سختی کی عادت نے اسے دوسروں کے لئے بے رحم بنادیا ہے، اور اس میں انتقام کی خواہش پیدا کردی ہے۔

ملک اور خیالات کے متحد ہونے نے کل قوم میں ایک ہی معیار عزت و آبرو قائم کردیا ہے۔ اس کی ساری نام آوری تلوار اور مہمان نوازی اور فصاحت ہے تلوار تو اپنے حقوق حاصل کرنے کی ضمانت ہے اور مہمان نوازی ان کے لئے سارے قانونِ انسانیت کا لُبِّ لُباب۔ اور تحریر اور کتاب کی جگہ پر فصاحت ان تمام باہمی نااتفاقیوں کو ختم کرنے والی چیز ہے جس کا فیصلہ ہتھیار سے نہیں ہوسکتا ہے۔

(۴) ویدک لٹریچر۔ سید صاحب کی یہ یادگار بھی شیخ عبدالقادر صاحب کی وساطت سے باقی ہے۔ یہ مضمون مولوی سید علی صاحب نے اڈیٹر مخزن کی استدعا پر لکھا تھا اور کیمبرج سے "مخزن" کے لئے بھیجا تھا۔ ستمبر ۱۹۰۵ء کے پرچے سے تھوڑا سا نمونہ دیا جاتا ہے:۔

اگرچہ رگ وید کا بہت بڑا حصہ عبادت اور خدا کی ستائش سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن بعض بھجن ایسے ہیں کہ جن سے تاریخی واقعات اور قدیم آریاؤں کی تمدنی حالت کا استنباط ہوسکتا ہے۔ مثلاً ندیوں کا جو بھجن ہے۔ اس سے آریہ لوگوں کا وسط ایشیا سے بتدریج پنجاب میں آنا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح دسویں کتاب کے بھجن نمبر نوّے (۹۰) میں جس کا نام پرش سوکت ہے چاروں ذاتوں کا یعنی برہمن۔ کھتری۔ ویش۔ شودر کا علیحدہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح شادی

اور موت سے متعلق بھجن ہیں۔ غرض جدید تحقیقات سے نتیجہ یہی پیدا ہوتا ہے کہ رگ وید نہ صرف ہندوؤں کی بلکہ طبقہ آریہ کی۔ جس میں ایران اور یورپ کی بہت سی اقوام شامل ہیں۔ سب سے قدیم کتاب ہے۔

رگ وید کی زبان کی نسبت ایک امر اور بھی نہایت تعجب انگیز ہے۔ یعنی یہ زبان اس قدر درجے میں ژند وستا کی زبان سے مشابہ ہے۔ یہ اس درجے تک ہے۔ کہ محض چند حروف کے تغیر اور تبدل سے رگ وید کے بعض بھجنوں کو ژند وستا زبان میں اور ژند وستا کے بھجنوں کو قدیم سنسکرت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور اس وقت جرمنی کے مدارس میں جہاں وید کی تعلیم اعلیٰ درجہ پر ہے رگ وید اور ژند وستا کا سبق ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

(۵) طلسم اعضائے انسانی۔ مولوی سید علی صاحب کا یہ مضمون پہلی مرتبہ رسالہ حسن حیدرآباد میں ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۲۰ برس بعد ۱۹۰۷ء میں اڈیٹر مخزن نے سید صاحب کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ تالیف اور آزاد عبارت ہے۔ اس کا اسلوب اور زبان اس قدر خوبصورت اور دلکش ہے کہ "تمدن" اور "تاریخ" کی عبارتیں اس کو نہیں پہنچتیں۔ وہاں باوجود ترجمہ کی خوبی کے کہیں نہ کہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ "ترجمہ" ہے۔ لیکن یہاں ایسی اردو ہے کہ اس سے بہتر مشکل سے لکھی جا سکتی ہے۔ سید صاحب فزیالوجی (خواص الاعضا) کی پوری کتاب اسی انداز میں لکھ دیتے تو عجیب چیز نکلتی۔ نمونہ یہ ہے:-

اَلعِلمُ عِلمَانِ عِلمُ الْاَبدَانِ وَعِلمُ الْاَدْیَانِ۔[۵] اگر اس حدیث کے مضمون کو ایک لفظ میں بیان کیا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اَلعِلمُ عِلمُ الْاِنسَانِ کیونکہ جس طرح علم الابدان میں انسان کی صورتِ ظاہری اور محسوساتِ جسمانی سے بحث کی جاتی ہے اسی طرح علم الادیان میں انسان کے محسوسات و کیفیاتِ روحانی سے بحث ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اوّلیت اور اولویت دونوں میں

---

۵ علم دو ہیں، علم طب اور علم دین (ابدان، بدن کی جمع۔ ادیان، دین کی جمع)

علم ابدان کو علم الادیان پر فوقیت ہے۔ کیونکہ اول محسوسات جن کا ادراک انسان کو ہوا وہ محسوسات جسمانی ہی تھے، اور انھیں محسوسات کے ذریعہ سے انسان کو اس حکیم مطلق کا پتہ لگا۔ ہر ایک عضو اور ہر بُن ہمارا جس کی قدرت تامّہ کا نمونہ ہے۔ اس کے بعد علم الادیان کی نیو پڑی۔ غرض علم الانسان عجیب جامع علم ہے جس کے مطالعہ اور تحقیق میں تمام دنیوی و اُخروی فائدے مجتمع ہوگئے ہیں۔

علم الانسان کے بے انتہا شعبے ہیں۔ بلکہ ایسا کم کوئی علم ہوگا جس کو انسان سے تعلق نہ ہو۔ کیونکہ اکثر علوم کی بنا خود انسان کی ذاتی ضروریات کی وجہ سے پڑی ہے۔ اس تحریر میں صرف علم الحیات کے کچھ مسائل بیان کئے جائیں گے۔ جو علم الانسان کا ایک شعبہ ہے۔ علم الحیات وہ علم ہے جس میں اعضائے انسانی کے افعال سے بحث ہے اور چونکہ یہ افعال حد درجہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں۔ اس تحریر کا نام طلسم اعضائے انسانی رکھا گیا..........

جسم انسانی کی تشریح کرتے وقت پہلا جزو بدن جو چاقو کے نیچے آتا ہے جلد ہے۔ ظاہرا جلد ایک چیز ہے لیکن اس کی دو تہیں ہیں۔ اوپر والی تہ سانپ کی کینچلی کی طرح ہمیشہ خشک ہوکر گرتی رہتی ہے۔ اس کو عربی میں بشرہ کہتے ہیں۔ نیچے والی تہ جلد حقیقی ہے اور سارا حس اسی میں ہے اور اس میں سیکڑوں باریک عروق ہیں جن کو ادنیٰ سا صدمہ پہنچتے ہی خون نکل آتا ہے۔ جلد کی دونوں تہوں کی تفریق حجامت میں خوب معلوم ہوتی ہے۔ جب تک استرہ بشرہ کو چھیل رہا ہے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی لیکن جہاں ہات ذرا بھی بہکا نیچے کی تہ کو خبر ہو جاتی ہے۔ اور خون نکل آتا ہے۔ جب کبھی ہاتھ زور سے چھل جاتا ہے تو یہ دونوں تہیں الگ الگ دکھائی دینے لگتی ہیں اور حمام جانے والوں کے جسم سے جو بتیاں میل کی نکلتی ہیں وہ بھی اوپر کی کینچلی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی

"غدرِ ہندی"[۵] کے زمانہ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔

علامہ محمد شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڈھ میں وکیل تھے۔ خاندان عزت وجاہ اور علم و دینداری میں ممتاز تھا۔ علامہ نے ابتدائی تعلیم اعظم گڈھ میں مولوی شکر اللہ سے حاصل کی۔ پھر غازی پور جاکر مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی سے فیض تعلیم حاصل کیا۔ مولانا فاروق صاحب وہاں مدرسۂ چشمۂ رحمت میں صدر مدرس تھے، اور علوم عقلیہ و ادبیات عربی و فارسی کے فاضل اجل تھے۔ استاد کو اس شاگرد سے اس قدر انس ہوگیا کہ وہ اپنے آپ کو "عرینِ دانش کا شیر اور شاگرد کو بچۂ شیر" کہتے تھے اور سجع کہا تھا، [۶] اَنَا اَسَدٌ وَ اَنْتَ شِبْلِیْ۔

شوق تعلیم اور تبحر علمی مولانا فاروق کے چشمۂ علم سے سیراب ہوکر علامہ شبلی نے تکمیل علوم کے لئے دور و دراز سفر کرنے شروع کئے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "میں اس خصوصیت میں منفرد تھا کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کے لئے اُنہی علماء کے پاس سفر کرکے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے"۔ چنانچہ غازی پور و اعظم گڈھ میں مولانا فاروق سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کے بعد رامپور گئے۔ اور مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں، علم فقہ میں ان کے فضل و کمال کے بڑے مداح تھے۔ رامپور سے لاہور پہنچے۔ وہاں مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اورنٹیل کالج میں ادبیات عربی کے

---

[۵] یہ مادۂ تاریخ مرزا غالب نے نکالا تھا۔ غدر کا سنہ ہجری ۱۲۷۳ھ نکلتا ہے۔ سنہ عیسوی کی یہ تاریخ ہے:- "غدرِ ناگاہِ ہندوستاں" = ۱۸۵۷ء

[۶] "میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر ہے"۔ شِبل (بالکسر) بچۂ شیر کو کہتے ہیں۔ مولانا فاروق صاحب کے فقرہ میں شِبلی کے معنی ہیں "میرا بچہ"۔ اور حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے نام میں (جن کے نام پر مولانا شبلی کا نام رکھا گیا تھا) شبلی ان کے وطن آبائی موضع شبلہ سے منسوب ہے۔

پروفیسر تھے، اپنے زمانے کے بہترین فاضل و نقاد تھے اور عربی شاعری کے صحیح مذاق اور نکتہ سنجی میں یکتا تھے۔ علامہ شبلی نے چھ مہینے ان کی صحبت میں رہکر "حماسہ" پڑھا۔ مولانا کو فرصت نہ ہوتی تو کالج کے راستے میں آتے جاتے پڑھا دیتے۔ لاہور سے سہارنپور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی صاحب محدث سے حدیث پڑھی۔ انکے اخلاق و سادگی طبع اور اتباع سلف کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

علامہ شبلی نے عربی سے پہلے فارسی پڑھ لی تھی۔ اکثر فارسی میں خطوط لکھتے تھے۔ فکر رسا اور ذوق سلیم فطری رکھتے تھے۔ ابتدا سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ پھر مولانا محمد فاروق اور مولانا فیض الحسن جیسے ادیب و نقاد استاد ملے۔ ان کے اساتذہ میں یہ دونوں بزرگ شاعر بھی تھے۔ مولانا فیض الحسن بڑے صاحب ذوق، زندہ دل، بذلہ سنج، ظریف طبع تھے۔ سخن فہمی و نکتہ سنجی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ قصائد عربی شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں غزلوں اور نعتیہ قصائد[1] کے علاوہ ایک مثنوی "صبح عید"[2] اپنے زمانہ شباب میں لکھی تھی۔ "شرح حماسہ"، "تحفہ صدیقیہ"، "روضۃ الفیض" انکے علم و فضل کی یادگاریں ہیں۔ ١٨٨٦ء یا ٥ / ١٣٠٤ھ میں وفات پائی۔ لائق شاگرد شبلی نے مرثیہ کہا۔ جس کے دو تین شعر یہ ہیں:-

---

[1] مولانا فیض الحسن صاحب کے ایک قصیدۂ نعتیہ کے دو تین شعر مجھے زبانی یاد ہیں۔ وہی نمونہ کے لئے لکھتا ہوں پورا قصیدہ میرے پاس نہیں ہے۔ مولانا نے شہیدی کے مشہور قصیدہ کی زمین میں قافیہ بدل کر کہا ہے:-

تمنا ہے کہ ایک ایک بال کی سو سو بلائیں لوں　　جو نقشہ ہاتھ آ جائے تری زلف معنبر کا
تمنا ہے کہ کانٹوں پر ترے صحرا کے جا لوٹوں　　رگ مجنوں کو پھر سودا ہوا ہے نوک نشتر کا
یہ جوش بیقراری ہے کہ مرغ نیم بسمل بھی　　یہ کہتا ہے چلو دیکھیں تماشا فیض مضطر کا

[2] مثنوی "صبح عید" مولانا فیض الحسن صاحب کی وفات کے بعد ١٨٩٢ء میں لاہور میں چھپی ہے تقریباً ٦٠٠ شعر ہیں۔ ایک داستان عشق نظم کی ہے۔ قصہ کچھ نہیں، لیکن نظم کے اکثر حصے بہت لطیف ہیں۔ ایک بھولی ہوئی چیز کی یادباقی رکھنے کے لئے چند شعر درج کئے جاتے ہیں (باقی صفحہ ٦١٢ پر)

بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح، دمے بگذار، تا در ماتم فیض الحسن گریم
بمرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد ہنر بر خویشتن گرید چو من بے خویشتن گریم
دو تا غم دارم و ہر یک ز دیگر حسرت افزاتر بمرگش گریم و آنگاہ بر مرگ سخن گریم

اسی کم عمری و نوجوانی کے زمانے میں ان بزرگوں کی صحبت نے علامہ شبلی کے اندر وہ ذوق اور وہ نظر پیدا کر دی جس نے ان کو اپنے زمانے کا بہترین نقاد و سخن سنج بنا دیا۔

سفر حجاز علامہ شبلی کی ۱۹ برس کی عمر تھی کہ ۱۸۷۶ء میں انھوں نے اپنے بعض اعزہ کے ساتھ حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حج کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور بڑے سے

(بقیہ حاشیہ ۶۱۱) مثنوی کو "تعریف عشق" سے شروع کرتے ہیں:۔

عشق کیا اک بلا ہے آفت ہے | شور ہنگامہ قیامت ہے || ننگ و ناموس کو بیاہ کرے | زہد و سالوس کو تباہ کرے
یہ کسی جی کو جیتے جی نہ لگے | دوست کیا دشمنوں کو بھی نہ لگے || مختصر یہ ہے یہ وہ چوکھٹ | گھر کے گھر ہو گئے جہاں چوپٹ
عشق عاشق ہے اپنی جانوں کا | اسکو کیا درد پائمالوں کا || درد ہے پردا ہے دردوں کی | عشق ملت ہے شیر مردوں کی
دیکھ کر عشق کے نئے دھندے | جی چراتے ہیں چین کے بندے || عشق ہے اک بلائے شور انگیز | خانماں سوز و خانہ برہم ریز
اسکا مصداق ہے یہ افسانہ | جس کا سامع ہو سن کے دیوانہ || گرم ہوں شور شوق کے ہنگامے | چاک ہوں جیب کی طرح جامے
کیوں نہ ہو یہ مری زبانی ہے | گو یہ خود ہی غضب کہانی ہے || میں ہوں اک سینہ ریش تفتہ دروں | سر بسر جوش عشق و شور جنوں
دردیاں اوڑھنا بچھونا ہے | گریہ یاں قسمتوں کا رونا ہے || دل یہاں درد کا ٹھکانا ہے | سینہ یاں نشتروں کا خانہ ہے
یاں زباں ہے زبانۂ آتش | حرف رنگیں ہے شعلہ سرکش || ہیں یہ سب درد کی کراماتیں | ورنہ کس کو نصیب یہ باتیں

داستان کے چند شعر یہ ہیں:۔

یہی دو چار رہ گئے باقی | شیشہ و جام و مطرب و ساقی || کہ یکایک بتانِ گل رخسار | آگئے سامنے سے مثلِ بہار
ہو گیا حسن تازہ محوِ ظہور | بام و در سے لگا برسنے نور || روشنی سے ہوئی نظر خیرہ | نور سے ہو گیا مکان تیرہ
یاں تو بیٹھے نظارے دامن کھول | واں گلوں کی ہنسی مول نہ تول || گورے گورے وہ پھول سے چہرے | پھول کانوں کے پھولوں کے سہرے
ایک تو سب کے پھول سے بر و دوش | اس پہ پھولوں کی مار تا بنِ گوش || بسکہ اپنی بہار پاتے تھے | پھول پھولے نہیں سماتے تھے

ذوق وشوق کے ساتھ نعتیہ قصیدہ کہا۔ مدینہ منورہ میں کتب خانوں کی سیر کی۔ فرماتے تھے کہ فنون حدیث کا جو سامان وہاں نظر آیا کہیں پھر نہ دیکھا۔

شوق شعر و ادب اور شغف مذہبی

مولانا کی طالب علمی کا زمانہ سفر حجاز کے ساتھ ختم ہوگیا۔ وہاں سے آکر کتب بینی اور شعر وادب کا شغل شروع کر دیا۔ لکھنؤ کا مشہور ظریف اخبار "اودھ پنچ" اور طرحی غزلوں کا ماہوار گلدستہ "پیام یار" جاری تھا۔ مولانا بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتے اور خود بھی غزلیں کہتے تھے۔ مشاعرے منعقد کرتے تھے۔

مولانا کا دوسرا محبوب شغل غیر مقلدوں کی تردید تھی۔ حنفیت کا رنگ غالب تھا۔ ان کا قول تھا کہ "آدمی عیسائی ہو سکتا ہے، لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا"۔ اس موضوع کے چند رسالے لکھے، جن میں سے عربی کا رسالہ "اسکات المعتدی" ہندوستان سے باہر بھی مقبول ہوا۔ جب مولانا سفر شام وعراق کے لئے گئے تو وہاں کے ایک عالم نے اسکات المعتدی کے مصنف کی مولانا شبلی کے سامنے تعریف کی۔ اس کو خبر نہ تھی وہ مصنف یہی ہیں۔ مولانا کو اس "تحسین سخن شناس" سے بڑی مسرت ہوئی۔

اس زمانے میں علامہ شبلی مذہب کے نہایت پابند تھے۔ درس تدریس کا شغل بھی جاری تھا۔ شاگردوں کو نماز کی سخت تاکید کرتے تھے۔ بعض اوقات شاگردوں کو نماز نہ پڑھنے پر اور پابندی کا وعدہ لینے کے لئے دو دو گھنٹے مارا ہے۔

وکالت وملازمت

علامہ شبلی کے والد اور استاد مولانا فاروق صاحب وکیل تھے۔ والد نے ان سے بھی امتحان وکالت پاس کرنے کا اصرار کیا۔ علامہ بالطبع ادھر متوجہ نہ تھے، کہنے سننے سے امتحان پاس کیا اور وکالت شروع کی۔ لیکن ابتدا ہی میں اس پیشہ کے کذب وافترا سے بددل ہوگئے۔ اس زمانے کا ایک لطیفہ ہے کہ علامہ کے والد کے پاس کوئی ٹھاکر موکل آیا۔ اس نے اپنی

لڑکی کی شادی کمسنی میں کر دی تھی۔ داماد جوان ہو کر خسر کو پسند نہ آیا۔ اُدھر رخصتی کا تقاضا ہوا، اِدھر سے انکار کیا گیا۔ شوہر نے مقدمہ دائر کر دیا۔ ٹھاکر نے جوابدہی کے لئے علامہ شبلی کے والد کو وکیل کیا۔ انھوں نے ان سے کہا کہ اسکی جوابدہی لکھدو۔ مولانا ٹھاکر سے قصہ سن کر بولے کہ جب تم اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جا چکی ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے، جاؤ لڑکی کو رخصت کر دو۔ وہ ہنستا وکیل صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے صاحبزادے سے فرمایا کہ بس آپ وکیل بن چکے۔ آخر انھوں نے خود مقدمہ لڑایا اور جیتا۔

علامہ شبلی نے بالآخر وکالت ترک کر دی اور "امین دیوانی" کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ دورہ کا کام تھا۔ علامہ شدید گرمی میں روزہ کی حالت میں گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ آخر یہ کام بھی مزاج کے موافق نہ نکلا۔ چھوڑ کر گھر بیٹھ رہے، اور مضمون نگاری اور شاعری پھر شروع کر دی۔

علی گڈھ کالج کی پروفیسری

علامہ کے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم علی گڈھ میں پڑھتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں یہ بھی وہاں گئے۔ سر سید سے ملے۔ باہم مبادلۂ خیال ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ اتفاق سے وہاں پروفیسری خالی تھی۔ علامہ شبلی نے اپنے استاد مولانا فیض الحسن کی سفارش سے درخواست دی۔ سر سید نے فوراً للعہ ماہوار تنخواہ پر ان کو رکھ لیا۔ اس زمانے کا ذکر مولوی عبد الحلیم لکھنوی اپنے ایک مضمون[۵] میں لکھتے ہیں:۔

> علی گڈھ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ، بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا،

[۵] "سیر المصنفین" میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے علامہ شبلی کے حالات کے متعلق تین صاحبوں کی تحریریں نقل کی ہیں، مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی، خواجہ غلام الثقلین اور مولوی عبد الحلیم شرر کی۔ ہم سیرت مولانا کے مختلف عنوانوں میں ان تحریروں کے اقتباسات مختصر طور پر نقل کرتے ہیں۔ مولانا کے باقی حالات میں بھی "سیر المصنفین" سے مدد لی گئی ہے۔

اور ایک خاموش مقام تھا۔ ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے ان سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلاناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔ سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کیلئے انھیں اکثر حدیث و فقہ و تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولانا شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی و قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی تیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے، اُس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش اور جستجو اور طلب روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے۔

مولانا سرسید کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں۔ مولانا کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑے رہتے اور کبھی تھک کر انھیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتے تھے۔ کالج کے زمانۂ قیام میں مولانا نے ایک مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھا۔ یہ بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے قومی نظمیں لکھیں، اور "المامون"، "الجزیہ"، "سیرۃ النعمان" تالیف کیں۔ پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ ان کو فارسی پڑھائی۔

مولانا کا سفرِ روم و مصر و شام

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڈھ کالج کے ساتھ قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ جدید اسلامی ہندوستان کا یہ پہلا علمی سفر تھا۔ چنانچہ خود ایک قصیدہ فارسی میں لکھتے ہیں:۔

بہر تکمیل فن و ہم پےِ تحصیل عبر　　روزگاریست کہ میداشتم آہنگ سفر
فالغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدائے　　خواشتم تا بسوے ردم شوم راہ سپر

آرنلڈ آنکہ رفیق است وہم استاد مرا   ہم دریں عرصہ بہ انگلنڈ ہمی خواست سفر
گفتم ایں صحبت وایں واقعہ نادر اُفتد   پس بعزم سفر از جاے بجستم مضطر

چھ مہینے بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی۔ علماء و فضلاء سے ملے۔ کتب خانے دیکھے۔ اپنی زیر تجویز تالیف الفاروق کے لئے بھی مواد تلاش کیا، لیکن کچھ نہ ملا۔ واپس آکر سفر نامہ مرتب و شائع کیا۔

علی گڈھ کے بعد

سر سید کی وفات کے بعد علامہ شبلی نے استعفا دیدیا، اور ۱۸۹۸ء سے اعظم گڈھ میں قیام کیا۔ یہاں نیشنل اسکول قائم کیا۔ اس کی ترقی کی کوشش کی۔ الفاروق مرتب کر رہے تھے کہ کشمیر جانا ہوا۔ وہاں علیل ہوگئے اور کئی مہینے علالت کا سلسلہ رہا۔ سخت علالت کی حالت میں الفاروق کی آخری سطریں لکھیں۔ اسی زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کے بعد صحت ہوئی تو مولوی سید علی بلگرامی نے ان کو حیدرآباد بلا لیا اور "نظامت علوم وفنون" کا عہدہ دلوایا۔ اس زمانے میں الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام، الکلام اور موازنۂ انیس و دبیر تالیف کرکے شائع کیں۔ سید علی صاحب نے ایک محکمۂ تصنیف و تالیف قائم کیا تھا، اس کی کتابیں "سلسلۂ آصفیہ" کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ مولانا شبلی کی بعض کتابیں بھی اسی سلسلے میں چھپیں۔ حیدرآباد میں مولانا کا مشاہرہ ماہوار تین سو روپیہ تھا۔ چار سال وہاں رہے۔

ندوۃ العلماء سے تعلق

بعض اہل الرائے ذی علم بزرگوں نے ۱۸۹۴ء (۱۳۱۱ھ) میں علماء کی ایک انجمن "ندوۃ العلماء" کے نام سے قائم کی تھی۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے، عام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں، علماء ہند کے باہمی اختلاف و نزاع کو دفع کیا جائے، اور ایک ایسا دار العلوم قائم کیا جائے جس میں علوم قدیمہ کے علاوہ فنون جدیدہ اور صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جائے۔ سب سے پہلے مولوی عبد الغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر نے (جو بعد کو

مدار المہام ریاست رامپور ہو گئے تھے) یہ تجویز پیش کی۔ اکثر علماء نے تائید کی اور مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری (خلیفہ حضرت فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی۔ مختلف شہروں میں ہر سال اس کے جلسے ہوتے تھے۔ مولانا عبد الحق صاحب دہلوی مولف "تفسیر حقانی" اور مولانا شبلی نے اس کے قواعد مرتب کئے۔ ۱۸۹۸ء میں مولانا شبلی کی رائے کے مطابق ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ کتب خانہ بھی اس کے ساتھ قائم ہو گیا۔ اس کے ناظم اوّل مولوی سید محمد علی صاحب تھے۔

علامہ شبلی علی گڑھ سے قطع تعلق کرنے کے بعد ندوۃ العلماء سے خاص دلچسپی لینے اور اس کی خدمت کرنے لگے تھے۔ مولوی سید محمد علی صاحب کی وفات کے بعد حیدر آباد سے آکر اس کے ناظم ہو گئے۔ ندوہ کی حالت اس زمانے میں نہایت سقیم تھی۔ گورنمنٹ بدگمان تھی۔ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو چلا۔ مولانا نے ایسی سخت محنت اور ایسی اعلیٰ خدمت کی کہ ندوہ کو ازسرنو زندہ کر دیا۔ لیکن علماء مولانا کے مذہبی خیالات و عقائد سے مطمئن نہ تھے۔ ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ آخر ان کو بددل ہو کر ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے دستکش ہونا پڑا۔ مولانا شرر لکھنوی اسی مضمون میں لکھتے ہیں:۔

> "میں نے بارہا ان کو اس خیال سے روکا، اور اسی زمانے میں ان سے کہہ دیا تھا کہ علماء بس میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان مرحومین امت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے، اور جس زمانے میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں اس پر آیۂ کریمہ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا[۵] پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علی گڑھ کا ضح ہی ہے، مگر انھوں نے نہ مانا۔ اور نتیجہ یہ ہوا

۵ اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دو خدا ہوتے تو دنیا تباہ ہو جاتی۔

کہ گو انھوں نے ندوہ کو بیحد فائدہ پونہچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا۔ مگر آخر میں ندوہ والے مرعوبین اُمّت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے، جن کا ان کے دوستوں کو بیحد ملال ہوا۔ اور وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کفِ افسوس ملتے ہوئے مرے۔"

ایک المناک حادثہ

نظامت ندوہ کے زمانے میں اتفاقیہ بندوق چل جانے سے علامہ شبلی کا پاؤں زخمی ہوگیا۔ اور ڈاکٹروں کو ٹانگ کاٹنی پڑی۔ اس کے متعلق وہ خود شعر العجم حصہ اوّل کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا، اور فردوسی کے حال تک پونہچا یا، ارمئی ۱۹۰۷ء کو صدمہ پا کا واقعہ پیش آیا۔ یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع "دریدہ دبریدہ شکست وبہ بست" قلم کی زبان پر تھا۔

اس حادثہ پر تمام ملک میں افسوس کیا گیا۔ لیکن خود انھوں نے اس تکلیف کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ ۵ار جولائی کو مولانا اپنے خط میں شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر مخزن لاہور کو لکھتے ہیں :" اب تک ہاتھ پر قابو نہیں۔ خط سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک غزل[۵] حاضر ہے، لیکن اپریل ۱۹۰۷ء کی ہے ورنہ آجکل یہ خیالات کہاں" اس پر

۵ یہ علامہ شبلی کی طبعی زندہ دلی تھی کہ اس کرب و اذیت کی حالت میں جو غزل اشاعت کے لئے ارسال فرمائی وہ نہایت رنگین ہے۔ ۵ شعر کی غزل ہے۔ چار یہ ہیں :-

من کہ در سینہ ولے دارم و شیدا چکنم؟ میل بالا لہ رخاں گر نکنم تا چکنم؟
ہست چل[۲] سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش گر نہ بر سنگ زنم شیشہ تقویٰ چکنم؟
مایۂ تقویِ سی[۳] سالہ فراہم شدہ است ارمغانش بنگارے بدہم؟ یا چکنم؟
شاہد و بادہ و طرب چمن و جوشِ بہار شبلیا خود تو بفرما کہ باینہا چکنم؟
(از مخزن لاہور بابت جولائی ۱۹۰۷ء)

ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "ہم مولانا کی ہمت و استقلال کی داد دیتے ہیں کہ ایسے جراحی عمل کے بعد اتنی جلدی انھوں علمی مشاغل کی طرف رجوع کیا، اور تمام زمانہ علالت میں ماتھے پر بل نہیں آنے دیا۔"

علامہ شبلی نے اس حادثہ کے متعلق ایک شعر عجیب دلگداز کہا تھا ۵

شبلی نامہ سیہ را بجزاے عملش
پا بریدند و ندا خاست کہ سرمی بایست

مؤلف احقر نے مولانا روم کے مشہور شعر میں ترمیم و تعمیہ کے ساتھ اس واقعہ کی تاریخ کہی :-

یافتم در شعر رومی حال آں — از سر الہام گفتم سال آں
پائے استدلالیاں چوبیں بود — پائے چوبیں پائے بے تمکیں بود

۶۸۳ — ۶۴۱ = ۱۳۲۴+۱=۱۳۲۵ھ

دارالمصنفین

ترک "ندوۃ العلماء" کے بعد لکھنو سے اعظم گڈھ آگئے اور وہاں ایک ادارہ علمی دارالمصنفین کے نام سے قائم کیا۔ اور اسکے لئے اپنا باغ۔ مکان۔ کتب خانہ وقف کردیا۔ افسوس کہ مولانا شبلی اس کی تکمیل و ترقی نہ دیکھ سکے۔ ہندوستان میں تالیف و اشاعت کے بہت بڑے بڑے ادارے جاری ہیں، اور اپنی اپنی جگہ سب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر علم و ادب اور ملک و قوم کی خدمت کررہے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف "دارالمصنفین" کو حاصل ہے کہ وہ اسلام و اسلامیات کا علم بردار ہے۔ "اسلامی کلچر" کا اتنا عظیم الشان لٹریچر کوئی جماعت پیدا نہیں کرسکی۔ یہ بھی علامہ شبلی کی نیک نیتی کا ثمرہ ہے کہ ان کو علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقاء جیسے جانشین مل گئے۔ جن کے قالب میں علامہ شبلی کو ایک زندگی کھوکر کئی زندگیاں مل گئیں۔

---

۵ اصل مصرع یہ ہے :- "پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود"

آخری تصنیف اور وفات

شعر العجم کے بعد علامہ شبلی نے "سیرۃ النبی" کا عظیم الشان کام شروع کیا۔ یہ کام ہی اتنا بڑا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اسی میں زندگی ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ خود فرمایا تھا:—

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ایک جلد مکمل اور دوسری نامکمل چھوڑ کر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء (۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ) کو رہگرائے ملک بقا ہوئے۔ ۵۷ سال کی عمر پائی۔ راقم احقر نے قرآن مجید سے تاریخ نکالی:—

"تاریخ از کلام ایزد" لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا
۱۹۱۴ء ۱۳۳۲ھ
(سورہ نحل۔ رکوع ۴)

علامہ شبلی کے اخلاق و عادات

علامہ شبلی کے مزاج و عادات کے متعلق بہترین بیان مولوی حبیب الرحمان خانصاحب شروانی کا ہے۔ ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں:—

میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے۔ اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ انکے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی، مزاج میں استغناء، حوصلے میں عزم تھا، مزاج میں نفاست تھی۔ دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں۔ لیکن دوستوں کی مروّت کبھی ان کو رسمی تعلق و چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے روبرو نہیں رُکتے تھے مگر اُن کے پسِ پشت بیانِ اختلاف میں بھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے۔ جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے، اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے۔ باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا

۵ قرآن مجید کا الا جَنّٰت ہے۔ میں نے ۵ عدد لینے کے لئے "ة" لکھدی ہے۔

کہ مخالف کے ذاتی یا مصافی عیوب پیش کرکے اس کو ذلیل ورسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ وشگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجہ کا ہو ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے ان کے کمال کی خوبیاں نظر آتی تھیں۔ عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی ان کے بیان کی رفیق وہمدم تھی۔ جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی، بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے۔ فضول باتیں میں نے ان سے کبھی نہیں سُنیں۔

اعزا کے ساتھ بہت اُلفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں لگی رہی کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو ان کی جان ہی لے گئی۔ احساس بہت شدید تھا۔ اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانے میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مُردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہوگئی۔ اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا ہر ذوق میں شدّت چاہتے تھے۔ نمک تیز کھاتے تھے۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے۔ شیرینی بھی گلو سوز مرغوب تھی۔ یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھا ہوا ہے۔ باتیں کرتے جاتے ہیں اور قند کے دانے مُنہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیریں کام ہے۔

سخنہاے شیریں بہ از قند ہست

ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بریلی ان کا، میرا ساتھ ہوا اس زمانے میں تندرست تھے، قریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی بلکہ کھائی محض شیریں ہونا کافی تھا۔ اس کے حسن وقبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے۔ جاڑوں میں بھی یہی ہوتا۔ اسی کے ساتھ سردی اور گرمی بہت محسوس کرتے ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے متعدد رضائیاں اوڑھیں

تسلی نہ ہوئی۔ دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں بمبئی کے سفر شعر و سخن کے لئے یادگار رہیں گے۔ چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے۔ صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔ عادت میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ غذا بہت کم کھاتے تھے۔ آخر میں اس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی۔

(اقتباس مضمون مولانا شروانی منقول از سیر المصنفین)

مولوی عبدالحلیم شرر علامہ شبلی کے خصائص طبع کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ان میں باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے، خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت، علی گڈھ کالج کی مرجعیت، اور ان کی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداً اس حیثیت سے پبلک میں متعارف کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہو گئی، مگر خود مولانا شبلی کی خودداری (کو ٹھیس لگی) اس حیثیت کو اور اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا سکتے تھے، جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے، لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے، علی گڈھ کالج سے علٰحدگی اختیار کر کے، ندوۃ العلماء میں شرکت کی، اور سمجھے کہ اس ذریعہ سے علماء کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے، اس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔"

خود علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"جب راجہ کشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسب دستور نذر دینے گیا تو ان کے اے ڈی کانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا۔ میں نے کہا یہ اوروں کا پیشہ ہے۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر رد و بدل ہوئی۔ اور میں نے ناگواری

کے ساتھ جواب دیا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا۔"

(مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء از سیر المصنفین)

علامہ شبلی کے مذہبی خیالات

پہلے لکھا گیا ہے کہ علامہ شبلی بڑے سخت حنفی، مقلد اور پابندِ شرع تھے۔ ان خیالات میں جو انقلاب جس طرح ہوا اس کو ہم مولوی عبد الحلیم شرر لکھنوی کی زبانی بیان کرتے ہیں:-

"اس موقع پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ سر سید در اصل غیر مقلد اور اہلِ حدیث کے گروہ میں تھے۔ لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک بڑی حد تک انھیں معتزلی بنا دیا تھا، سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہونا غیر ممکن تھا، مگر اہلِ حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو کھٹک تھی، وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انھیں نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی۔ لہٰذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ بھی رنگ چڑھنے پائے، وہ بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں، اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے حنفیت کو اشعری کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں، انھوں نے اپنی حنفیت کو اشعریت کا سخت دشمن اور فقہ کے پردے میں چھپی ہوئی معتزلیت ثابت کرنا چاہا، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی طلبہ ان کی باتوں سے خوش ہو ہو کر دینداری و خوش اعتقادی کے دھوکے میں معتزلی ہونے لگے۔ اور موجودہ علمائے حنفیہ سے ان کو سخت عناد ہو گیا۔ .... اسی جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کی سوانح عمری انھوں نے سیرت النعمان لکھی تو امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل بخاری پر جا بجا حملے کیے، اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے۔ یہاں تک کہ امام ابو الحسن اشعری بھی محض اتباعِ حدیث کے باعث ان کے مورد سہام بن گئے۔"[۵]

---

۵ اصل مضمون میں یہ دونوں عبارتیں مقدم و موخر ہیں۔ یہ ترتیب ہم نے قائم کر دی ہے۔

خواجہ غلام الثقلین صاحب اپنے مضمون میں علامہ شبلی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

انسانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو مذہبی تخیلات رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مذہب سے بالکل بیگانہ وبے پروا رہتے ہیں، اور ایک آزاد دماغ رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جن کے دماغ میں مذہب و آزادی مرکب صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس گروہ کی دو شاخیں ہیں۔ اول جن میں مذہب غالب ہے دوم وہ جن میں آزادی، قومیت اور مدنیت کا خیال مذہب پر غالب ہے۔ میرے خیال میں مولانا شبلی کا شمار آخری گروہ ہے۔

سیاسی خیالات اور قومی خدمات

علامہ شبلی مذہب کی طرح سیاست میں بھی آزاد خیال اور دلیر طبع تھے۔ سر سید کے سیاسی خیالات کو دور اندیشی اور فلاحِ ملکی کے منافی سمجھتے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب مندرجہ بالا فقروں کے بعد لکھتے ہیں:۔

لیکن وہ آزاد خیالی مذہب ہی کے دائرے میں محدود نہ رکھتے تھے، بلکہ اس کو پالٹیکس تک پونہچاتے تھے۔ چنانچہ آخری عمر میں انھوں نے اپنے پولٹیکل خیالات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ سر سید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے، لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنسرویٹو واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کالج کی پروفیسری کے زمانے ہی میں مولانا شبلی کو سر سید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی۔

ان کے خیالاتِ سیاسی کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم لیگ سے بیزار تھے، اس کو بیکار سمجھتے تھے۔ اور کانگرس کے حامی تھے۔ اس نوع کے مقالات شبلی الگ شائع ہوگئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار نظموں میں بھی کیا ہے۔ ایک نظم کو اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانِ قدیم ۔۔۔ جرم یہ ہے، میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے ۔۔۔ کیوں نہ کی تقلید طرزِ رہنمایانِ زمن
کانگرس سے مجھ کو اظہارِ برارت کیوں نہیں ۔۔۔ کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

مسلم لیگ کے متعلق بڑی دلچسپ نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں لیگ کے مسلک پر طنز کرتے ہیں :-

جن مُہمّات میں درکار ہے ایثارِ نفوس — ان میں طرزِ عملِ بوسہ و پیغام بھی ہے

اسی نظم میں مسلم لیگ کے دفتر کا ساز و سامان بیان کر کے آخر میں صدرِ مسلم لیگ سے کہتے ہیں :-

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ — سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے؟

علامہ شبلی کی قومی خدمات بھی خواجہ صاحب موصوف بیان کرتے ہیں :-

مولانا شبلی نے تین اہم کام انجام دینے کی کوشش کی، اور ان میں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ ایک[۱] وقف علی الاولاد کا مسئلہ جس کو پہلے بھی لوگوں نے مختلف طریقے سے چھیڑا تھا، انھیں کی کوشش سے سرسبز ہوا۔

دوم[۲]، مولانا کی یہ کوشش تھی کہ حالاتِ زمانہ سے باخبر، روشن دماغ، اور مفید دینی عالم پیدا ہوں۔ اس کی بنیاد پڑ گئی ہے، اور کچھ لوگ جو مولانا کے نام لیوا ہیں، اور انھیں کے طرز کا تحریر میں اتباع کرتے ہیں، ان میں تاریخ نویسی اور قومی عصبیت کے ساتھ روحانیت کا بھی مساوی پہلو ملا، تو ہم کہیں گے کہ یہ دوسری کوشش بھی کامیاب ہوئی۔

سوم[۳]، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بادشاہوں پر سے تاریخی الزامات رفع کئے جائیں۔ مولانا کو اس معاملے میں بھی خاص کامیابی ہوئی۔ ایک شخص کی زندگی میں ایسے عظیم الشان کارنامے اس کو سیکڑوں برس تک زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

خطابات اور اعزازات علامہ شبلی ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تو سلطان عبدالحمید خاں شہنشاہ ترکی نے "تمغائے مجیدی" عطا کیا۔ ۱۸۹۴ء میں حکومتِ ہند سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمٰن خاں بادشاہ کابل نے "محکمۂ ترجمہ" قائم کیا۔ اس کے لئے علامہ کا انتخاب کیا، لیکن انھوں نے

جانے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ اورنٹیل کانفرنس شملہ میں شریک ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں اٹلی کی اورنٹیل کانفرنس کی شرکت کے لئے مدعو ہوئے، لیکن بوجہ علالت شریک نہ ہو سکے۔ ۱۹۱۳ء میں سلطنت ترکی کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی کا قیام تجویز ہوا تھا۔ (جو بوجہ جنگ عظیم عمل میں نہ آسکا) اس کا نصاب تعلیم مرتب کرنے کیلئے علامہ شبلی کا بھی انتخاب ہوا تھا۔

تمام بلاد اسلامیہ مصر و روم و شام وغیرہ اور ممالک یورپ سے ان کے پاس علمی سوالات آتے تھے۔ مسٹر آرنلڈ (انگلستان) موسیو ا (پیرس) ڈاکٹر محمود لبیب (برلن) بذریعہ مراسلت علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کا نصاب تعلیم تجویز کرنے کے لئے بھی علامہ شبلی منتخب ہوئے تھے۔

حمایت و ترقی اردو

علامہ شبلی کی یہ خدمات علیحدہ تذکرہ کے قابل ہیں کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تجویز کے مطابق انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو اس کے پہلے سکرٹری علامہ منتخب ہوئے۔ یہ اس وقت حیدر آباد میں تھے۔ وہیں انجمن کا دفتر کھولا گیا۔ ان کے زمانے میں بعض بے نظیر کتابیں۔ انگریزی و عربی سے ترجمہ کرا کے شائع کی گئیں۔ مثلاً ہربرٹ اسپنسر کی مشہور کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ "فلسفہ تعلیم" کے نام سے خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے کیا۔ اور یہ علامہ ابن مسکویہ کے رسالہ فلسفہ الٰہیات الفوز الاصغر کا مولانا الحکیم محمد محسن صاحب فاروقی چھرایونی نے "القول الاظہر" کے نام سے ترجمہ کیا۔

اردو کی ایک اہم خدمت علامہ شبلی کے ہاتھ سے یہ سرانجام ہوئی کہ ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ نے الہ آباد میں ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی اس غرض سے قائم کی کہ اسکولوں اور کالجوں کے لئے دیسی زبان کا نصاب تعلیم ایسی زبان میں مرتب کیا جائے کہ ایک ہی عبارت کے ساتھ اردو، ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جا سکے۔ اور اس کے علاوہ اردو پڑھنے والوں کے لئے ہندی پڑھنا بھی لازم قرار دیا جائے، اور راماین تلسی داس کو نصاب امتحان میں شامل کر دیا جائے۔

اس کمیٹی کے ممبر علامہ شبلی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بے نظیر دلائل سے یہ تمام تجویزیں مسترد کرادیں۔ کمیٹی کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کو یہ خط لکھا تھا:۔

مکرمی۔ تسلیم۔ میں اردو ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی شرکت کی غرض سے الٰہ آباد گیا تھا۔ مسٹر برن نے چند نہایت مُضر تجویزیں اُردو کے حق میں پیش کی تھیں۔ ایک بھی تھی کہ رامائن بھاشا انٹرنس کے امتحان میں لازمی کردی جائے اور اردو جو مدارس میں ہے وہ ایسی کردی جائے کہ ہندی بن جائے۔ عجیب منطقی دلائل گھڑے تھے۔ پنڈت سندر لال وغیرہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ تیسرے جلسے میں کامل فتح ہوئی۔ تمام تجویزیں اُڑ گئیں۔ اگرچہ افسوس ہے کہ مسلمان ممبروں نے کوئی مدد مجکو نہ دی، اور دیتے کیا، دینے کے قابل بھی نہ تھے۔ شبلی

اُردو زبان وادب کے جس بقاء و تحفظ کی بعد کو کوشش ہوئی، اس کا راستہ علامہ شبلی نے پہلے ہی کھول دیا تھا۔ ورنہ یہ دروازہ پہلے ہی بند ہوچکا ہوتا۔ ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی یہ تجویز نامناسب نہ تھی کہ اردو کے طالب علموں کو ہندی سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ چنانچہ بعد کو اس پر عمل کیا گیا، اور آٹھویں درجہ تک اردو والوں کے لئے ہندی، اور ہندی والوں کے لئے اردو پڑھنی ضروری ہوگئی۔ لیکن پہلی تجویز نہ جب قابلِ عمل تھی نہ اب ہے، جس کو علامہ شبلی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "اردو جو مدارس میں ہے وہ ایسی کردی جائے کہ ہندی بن جائے" اس قدر البتہ ممکن تھا اور کیا گیا کہ عام بول چال کی آسان زبان میں کتابیں تیار کی گئیں اور ان کو ایک ہی عبارت والفاظ کے ساتھ اردو، ہندی دونوں رسم خط میں چھاپا گیا۔ لیکن یہ اردو، ہندی والوں کو ہندی، اردو سکھانے کے لئے تھیں۔ اس سے آگے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں جو اردو کی تعلیم ہے، اس کو بجنسہ باقی و جاری رکھنا لازم ہے۔ ورنہ زبان، علم وادب، قومیت، کلچر کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

علامہ شبلی کی تصانیف

علامہ شبلی کے شغلِ تصنیف اور عادت تحریر کے متعلق خواجہ غلام الثقلین صاحب لکھتے ہیں:۔

باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے کے، اور کثیر التصانیف ہونے کے، وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ زیادہ وقت مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ لکھتے دیر میں اور سوچ کر، مگر اس میں کاٹ چھانس بہت کم ہوتی تھی۔ ہمیشہ ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے۔ خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا۔ آخر عمر تک خوشنویسی کی شان اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف حروف کی خوبصورتی کی اس قدر پروا کرتا ہو۔

علامہ شبلی کی تصانیف ضخامت میں ان کے بعض ہم عصروں سے کچھ بہت زیادہ نہیں، لیکن عظمت و اہمیت میں بہت گراں پایہ ہیں۔ انھوں نے پہلے یہ تجویز کی تھی جیسا کہ المامون کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ نامور فرماں روایانِ اسلام کی سوانح عمریاں مرتب کریں۔ اس سلسلے کا نام انھوں نے سر سید کے "شوقِ انگریزی" کی تقلید میں رائل ہیروز آف اسلام رکھا تھا۔ دس خاندانِ حکومت کے دس بہترین فرماں روا منتخب کر لئے تھے، مثلاً

(۱) خلافت راشدہ	میں	حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
(۲) خلافت بنی اُمیہ	میں	ولید بن عبد الملک
(۳) خلافت بنی عباس	میں	مامون الرشید
(۴) بنو اُمیہ اندلس	میں	عبد الرحمٰن ناصر
(۵) سلجوقیہ ایران	میں	ملک شاہ

اسی طرح سلاطین ایوبی و سلاطین روم وغیرہ میں سے پانچ اور تھے۔ سلسلۂ تصنیف کو نمبر اوّل سے شروع کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت کے لئے مسالہ جمع نہ ہوا، اس لئے پہلے خلیفہ مامون رشید عباسی بغداد کے حالات

المامون کے نام سے مرتب کئے۔ اس کے بعد الفاروق شروع کی، لیکن یورپ سے بعض کتابوں کے چھپ کر آنے کا انتظار تھا، اس لئے بقولِ خود "چند روز کے لئے فاتحانِ حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی، مختلف خاندان سامنے تھے۔ بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی، اور امام ابو حنیفہؒ کو جو فقہ کے بانی ہیں، اس کا ہیرو قرار دیا۔"[۵]

امام صاحب کے سوانح (سیرۃ النعمان) لکھنے میں علم کلام کی بحث اور امام ابوحنیفہ کا اس سے تعلق سامنے آگیا، جس کا خود علامہ شبلی کو بھی اس سے پہلے اندازہ نہ تھا۔ علامہ بالطبع عقلیات" (فلسفہ وکلام) کی طرف راغب تھے۔ علی گڑھ میں سرسید کی صحبت نے "آزاد خیالی" پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس کے لئے تقلید چھوڑنے کی ضرورت تھی۔ سرسید غیر مقلد تھے۔ شبلی کے لئے یہ مسلک اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ اب انھوں نے دیکھا کہ امام صاحب خود بڑے آزاد خیال اور تاویل پسند تھے۔ یہ بڑا سہارا مل گیا۔ علامہ شبلی نے "امام کلام" اور "کلامیوں" کو مطالعہ کرنا شروع کر دیا اس دلچسپی میں وہ سلسلۂ فرمانروایانِ اسلام ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ الفاروق بہت سی لکھ چکے تھے۔ وہ تو پوری کر دی۔ پھر اُس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ اور یہ بہت اچھا ہوا۔ "ملک شاہ سلجوقی" اور "نورالدین زنگی" وغیرہ کو بھی لکھ دیتے، تو بجز "تالیفِ شبلی" کے اور کوئی قدر و قیمت نہ رکھتے۔ یہ بات اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ علامہ کی تمام تصانیف میں المامون سب سے کم پڑھی جاتی ہے۔

علامہ شبلی کی تصانیف علوم و فنون کے لحاظ سے اس طرح مرتب ہو سکتی ہے:-

سیرت و سوانح — المامون، سیرۃ النعمانؒ، الفاروقؓ، سیرۃ النبیؐ ۲ جلد

فلسفہ و کلام — علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم

ادبیات — موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم ۵ حصہ

سفرنامہ — سفرنامہ مصر و روم و شام

---

[۵] دیباچۂ سیرت النعمان۔

تاریخ ——— تاریخ اسلام، مضامین عالمگیر

تعلیمات ——— مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

تقریرات ——— ندوۃ العلماء، اور ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریریں

خطوط ——— مکاتیب شبلی ۲ حصے

مقالات ——— مقالات شبلی ۸ حصے جن میں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی، سوانحی مضامین الگ الگ مرتب کئے گئے ہیں۔

نظم اردو ——— مثنوی صبح امید، قومی مسدس، مجموعۂ کلام اردو۔

عربی تصانیف۔ الانتقاد علی التمدن الاسلامی (مصر کے عیسائی مصنف جرجی زیدان کی کتاب "التمدن الاسلامی" کی تنقید) بدر الاسلام، اسکات المعتدی

فارسی نظم ——— دیوان شبلی (جس میں دستۂ گل، بوئے گل وغیرہ مختصر مجموعے شامل ہیں)

علامہ شبلی کا طرز تحریر علامہ شبلی اپنے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلوب تحریر کی اہمیت کو سمجھا۔ علامہ آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے طرز تحریر کی کوتاہیاں بیان ہو چکی ہیں۔ مولانا حالی اپنے اسلوب کی متانت اور ہمواری سے مختلف موضوعات کو نباہ لے گئے، لیکن علامہ شبلی کے مقابلے میں انکا طرز بھی بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ موقع و مقام اور موضوع بیان کے مطابق اسلوب اختیار کرنے کے لئے صرف وجدان و ذوق کی رہنمائی شرط ہے۔ قواعدِ صرف و نحو اور اصولِ معانی و بیان بھی بغیر ذوقِ سلیم اور ذہن متوازن کے کام نہیں دیتے۔ علامہ شبلی ایسا ہی مذاقِ صحیح اور طبع لطیف رکھتے تھے۔ ہر موقع و محل کے لئے اسی کے مناسب طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ لطیف و نازک استعارہ و تشبیہہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بغیر بھی الفاظ کے انتخاب مرکبات اور جملوں کی ساخت میں اس قدر حسن تناسب ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کی عبارت میں نہایت دلکشی و دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ لطافت خیال، دقت نظر، وسعتِ تحقیق، قوت

استدلال سے مضمون میں نُدرت و جدّت اور تاثیر و دلفریبی پیدا کر دیتے ہیں۔ عظمت و اہتمام کے موقع پر شاندار الفاظ اور موزوں ترکیبوں سے شان و شوکت دکھاتے ہیں۔ دلائل اور مثالوں کے انتخاب و ترتیب میں ان کا حسن نظر اور ذوق سلیم نمایاں ہے۔ جس موقع پر دوسرے مصنف معمولی سامنے کی مثالوں پر قناعت کرتے ہیں، وہاں علامہ شبلی نادر و عجیب مثالیں تلاش کرتے ہیں۔

ان کی تحریر کے متعلق سر سید "دیباچۂ المامون" میں لکھتے ہیں:-

"ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔"

علامہ شبلی کی اوّلیات اور ان کا مرتبہ

مولانا حالی کے حال میں لکھا گیا ہے کہ اردو میں سیرت اور تنقید دو چیزیں با اصول و مستند نہ لکھی گئی تھیں۔ حالی نے ان کا آغاز کیا۔ شبلی کی بھی اکثر تصانیف انہی دو موضوع کی ہیں۔ چھ سیرت و سوانح (مع غزالی و رومی کے) اور دو تنقیدیں (موازنہ و شعر العجم) "شعر العجم" کی پانچ جلدوں میں تذکرۂ شعرا بھی ہے اور تنقید شعر و سخن بھی۔

آزاد کی "دربار اکبری" اور حالی کی "حیات سعدی" شبلی کی "المامون" وغیرہ سیرتوں سے پہلی ہیں۔ اسی طرح آزاد کی "آب حیات" اور "سخندانِ پارس" اور حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" شبلی کے "موازنہ" و "شعر العجم" سے قدیم ہیں۔ اس لئے آزاد و حالی کی اوّلیت مسلّم ہے۔ با اصول تذکرۂ شعرا سب سے پہلے آزاد نے لکھا۔ جامع سیرت سب سے پہلے حالی نے مرتب کی، اصول تنقید و نمونۂ تنقید سب سے پہلے حالی نے پیش کئے لیکن جب شبلی نے ان چیزوں پر قلم اٹھایا تو اس زمین کو آسمان کر دیا۔ اُردو میں پہلی مرتبہ یہ بات نظر آئی کہ ذوق سلیم "سیرت" اس طرح مرتب کرتا ہے، اور تنقید اس طرح لکھتا ہے

اس عیارِ کامل کے لحاظ سے سیرت و تنقید بھی گویا علامہ شبلی کی اوّلیات میں شامل ہیں۔ آزاد، حالی، شبلی کی کتابیں مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو

معلوم ہوگا کہ شبلی کو پہلے نمونوں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ "سیرۃ النبی" اور "الفاروق" کے لئے "دربار اکبری" اور "حیات سعدی" نمونہ کا کام نہیں دے سکتیں۔ اسی طرح "شعر العجم" کے پہلے تین حصے (تذکرہ شعرا) "آب حیات" کی تقلید سے بے نیاز ہیں، اور "چوتھا، پانچواں حصہ (حقیقتِ شاعری اور اصناف شاعری کی تنقید)، "مقدمہ شعر و شاعری" کے اتباع سے بالاتر۔

علامہ شبلی کی "علم الکلام"، "الکلام" اور اس فن سے متعلق "الغزالی" اور "سوانح مولانا روم"، اردو زبان کی وہ اوّلیات ہیں کہ ان ۵۰ برس میں آخریات بھی یہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علم کلام کی طرف توجہ اور اس کا شوق علامہ شبلی کے اندر سرسید کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سرسید نے اور ان کی تقلید میں مولوی چراغ علی نے اسلام کے عقائد و اعمال اور احکام و شرائع کو عقل کے مطابق اور مصلحت زمانہ پر مبنی ثابت کرنے کے لئے علم کلام کے اصول برتے تھے۔ لیکن اس فن کی تاریخ و اصول، اور اہل فن کا طریقۂ عمل سب سے پہلے علامہ شبلی نے پیش کیا۔

مثنوی مولانا روم سے علم کلام کے مسائل مرتب کرنا علامہ شبلی کی بے نظیر جودتِ طبع اور فکر رسا کا ثبوت ہے۔ مثنوی کا یہ وصف بالاجمال شارحین و شائقین مثنوی کی نگاہوں سے مخفی نہ تھا۔ عقائد و الٰہیات کے مباحث میں "مثنوی مولوی" کے اشعار پہلے بھی پیش کئے گئے ہیں، لیکن مسائل کی یہ ترتیب جو سوانح مولانا روم میں ہے۔ علامہ شبلی کا کارنامہ ہے۔

تاریخ اسلام نے مختلف واقعات کی تحقیق اور ان کے متعلق غلط فہمیوں کی اصلاح جس کاوش و جامعیت کے ساتھ علامہ شبلی نے کی، اس کی نظیر پہلے موجود نہ تھی۔ "جزیہ"، "کتب خانۂ اسکندریہ"، "مضامین عالمگیر" وغیرہ متعدد رسالے اور مضامین اپنی نوعیت کی پہلی چیزیں ہیں۔

ان تمام تصانیف میں "بلاغتِ کلام" جس حد تک ہے، اس میں کوئی

ہمعصر علامہ شبلی کو نہیں پہنچا۔ اس لئے وہ ادیب و نقاد اور مورخ و سیرت نگار، ہر حیثیت سے رفعت و مرتبت میں بالکل منفرد ہیں۔

علامہ شبلی کی شاعری

علامہ فارسی و اردو کے شاعر تھے۔ فارسی سے طبعاً مناسبت تھی، کثرت سے مطالعہ کیا تھا، فارسی زبان اور شاعری کے نکتوں اور لطافتوں پر عبور حاصل تھا۔ اس لئے "فارسی گویان ہند" میں کم سے کم اپنے معاصرین میں وہ کسی سے کم نہیں۔ خود ایک خط میں اپنے متعلق لکھتے ہیں:۔ "فارسی شاعری میں زبان کو اصول پر برتنا" "یہ اصول پر برتنا" غیر زبان والوں کو مشکل سے میسر آتا ہے۔ اہلِ ہند چھ سو۔ سات سو برس سے فارسی میں شاعری کرتے ہیں۔ امیر خسرو سے فیضی کے زمانے تک ہندوستان کے فارسی شاعروں کی بول چال بھی فارسی میں تھی۔ تصنیف و تالیف بھی، خط و کتابت بھی، اور ایرانی شاعروں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ اس لئے اُس زمانے میں یہاں کا شعر و ادب بھی بڑی حد تک ایرانی اسلوب پر رہا۔ اس کے بعد جب سے اردو، بول چال، تصنیف اور شاعری میں داخل ہوئی، ہندوستانی طرز و ادا، اور فارسی الفاظ و محاورات کا ہندوستانی استعمال فارسی شاعری میں آگیا، جس کو اہلِ ایران "سبک ہندی" کہتے ہیں۔ پھر اہلِ ہند کے لئے اس طرز ہندی سے بچنا اور "سبک ایرانی" برتنا دشوار ہوگیا۔ اور اس کے لئے خاص ذوق سلیم اور نگاہ تنقید کی ضرورت ہونے لگی۔ اس "ذوق و نظر" کا متاخرین میں مرزا غالب پر خاتمہ ہوگیا۔ غالب کے بعد پھر کسی کو یہ بات کمال کے ساتھ نصیب نہ ہوئی۔ تاہم کثرت سے اور اچھا کہنے والوں نے بے عیب بھی کہا، اور "اسلوب ایرانی" میں بھی کہا۔ اسی وجہ سے اہلِ ذوق ایرانیوں نے پسند کیا۔

علامہ شبلی کا زمانۂ علی گڈھ تک فارسی کلام سبک ہندی سے خالی نہیں، پھر بھی ان کی لطافتِ طبع اور حسنِ مذاق کا شاہد ہے۔ آخری زمانے کا کلام بہت منجھا ہوا، اور معیار سے نہایت قریب ہے۔ الفاظ ترشے ہوئے،

اور مصرع ڈھلے ہوئے ہیں۔ خصوصاً بمبئی کی غزلوں میں بڑی دلآویزی ہے۔
اس زمانے میں ان سے زیادہ پُرگو اور بھی تھے، زیادہ شیریں کلام کوئی نہ تھا۔

فارسی شاعری سے مناسبت و شوق رکھنے کے علاوہ علامہ شبلی "دلِ زندہ" اور "شیوۂ اہلِ نظر" بھی رکھتے تھے۔ اور پہلے کی زندگی اور دوسرے کی "آبرو" کی خاطر فارسی غزل کہنے سے بہتر کوئی شغل نہ تھا۔[۵]

ان کا اردو کلام بہت مختصر ہے، "مثنوی صبح اُمید" اور "قومی مسدس" قیام علی گڈھ کی نظمیں ہیں۔ وقتی چیزیں تھیں۔ اس زمانے میں چند بار شائع ہوئیں۔ اب مجموعۂ کلام میں شامل ہیں۔ ان کے بعد سالہا کوئی اردو نظم نہیں لکھی۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی اور اس کے بعد جنگ بلقان کا ہیجان

۵ بقول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی "بمبئی کے سفر فارسی شاعری کے لئے یادگار ہیں"۔ اس یادگار کو باقی رکھنے کے لئے بمبئی کے متعلق علامہ شبلی کا کچھ کلام درج کیا جاتا ہے۔ یہ غزل بمبئی میں ستمبر ۱۹۰۶ء میں کہی تھی:-

غزل

نثارِ بمبئی کُن ہر متاعِ کہنہ و نو را
طرازِ مسندِ جمشید و فرِّ تاجِ خسرو را

ہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخِ بے پروا
گذشتن از سرِ رہ مشکل افتاد ست رہرو را

فغاں از گرمیِ ہنگامۂ خوبانِ زردشتی
بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را

"بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

بیا شبلی بہ یادِ پنجۂ گیرائے مژگانش
دگر رہ پارہ سازم ایں قبائے زہد صد نو را

تیسرے شعر کے (ظلمت و ضو) پر علامہ نے فارسی میں اس مضمون کا نوٹ لکھا ہے کہ پارسی لوگ دو خدا مانتے ہیں، یزداں و اہرمن، اور ان کو نور و ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ چوتھا شعر خواجہ حافظ شیرازی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:-

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلےٰ را

(بقیہ صفحہ ۶۳۵)

پیدا ہوا تو علامہ شبلی نے "پولٹیکل کروٹ" بدلی اور مضامین کے ساتھ سیاسی نظمیں بھی لکھیں۔ جن میں سے بعض ایسی تیز و سخت تھیں کہ "قابل ضبطی" سمجھی گئیں۔ ان کے علاوہ تاریخ اسلام کے چند واقعات نظم کئے ہیں۔ اکبر و جہانگیر کے واقعات کی نظمیں نہایت مشہور و مقبول ہوئیں۔ یہ سب کلام شاعری کے کانٹے میں تُلا ہوا، اور نہایت پُرلطف ہے۔ سیاسی نظموں میں تو وہ، تنہا نہیں تو ایک دو کے ساتھ، پیش رُو اور پیشوا کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس زمانے کے "سیاسی شعرا" میں مولوی ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار سے بہتر کوئی نہ تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲۴)

اسی ماہ ستمبر کی لکھی ہوئی چوتھی غزل تمام کلام میں سب سے زیادہ طویل ہے۔ چند شعر یہ ہیں:۔

گردم از رحمتِ شیرازدِ صفاہاں زدہ ام　　شرم بادم کہ نواہاے پریشاں زدہ ام

بمبئی بود مرا منزلِ مقصود و عبث　　پیش ازیں گام طلب در رہ حرماں زدہ ام

آں نگارِ عجمی چہرہ بدانساں افروخت　　کہ آتش آوردم و در خرمن ایماں زدہ ام

آں شدلے دوست کہ آراستہ پیکر فن　　نقش زیبا صنمے بر ورق جاں زدہ ام

آں شدلے دوست کہ درندہ دہ بہ بینی بازم　　کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام

ہاں دہاں دست بدارید زمن لے احباب　　کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام

جاے آنست کہ گلشن دمد از کنج لبم　　بوسہ ہا بسکہ برآں عارض خنداں زدہ ام

اس مضمون کے دو ایک شعر اور بھی ہیں۔ ایسے ہی مضامین کے متعلق میر ممنون دہلوی کہتے ہیں:۔

اس ذوق سے کہتے ہیں حدیث لب شیریں　　گویا ترے ہونٹوں ہی سے لیتے ہیں مزاہم

شبلی کی اس غزل کے دو شعر یہ بھی ہیں:۔

تا دگر آں بت خودکام زیادم نہ برد　　گرہے چند دراں زلف پریشاں زدہ ام

پے تواں برد کہ ایں زمزمہ بے چیزے نیست

شبلی ایں تازہ نواہا نہ چومستاں زدہ ام

(باقی حاشیہ صفحہ ۶۳۶ پر)

علامہ شبلی پر اعتراضات (۱) علامہ کے خیالات اور تالیفات پر ان کی زندگی میں اور بعد کو مختلف اعتراضات کئے گئے۔ تردید میں مضامین لکھے گئے، تصانیف کے جواب میں کتابیں چھاپی گئیں۔ تاریخی غلطیاں بتائی گئیں، تالیفی کمزوریاں دکھائی گئیں۔ لیکن باوجود اس کے ان کے مصنف اور انشا پرداز کے مرتبے سے کسی نے انکار نہیں کیا اعتراضات کی بڑی بنیاد ان کے مذہبی خیالات و اجتہادات تھے۔ جہاں ان کے کمال کا یہ اعتراف کیا گیا:-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۵)

بمبئی سے واپسی میں ۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو غزل کہی ہے۔ مطلع و مقطع یہ ہے، مقطع کیا خوب فرمایا ہے:-

دوش کاں دلدار با من ہم وثاق افتادہ بود — غلغلے در گنبد فیروزہ طاق افتادہ بود

از دل صد پارہ ات آگہ نیم شبلی، دلے — شیشہ دیدم کہ از بالائے طاق افتادہ بود

۱۳ اپریل ۱۹۰۷ء کو الہ آباد میں بیٹھے بمبئی کو یاد کر رہے ہیں:-

زہے جاں بخشی آب و ہوائے بمبئی شبلی — طراز دطبع و نوشاد و فرفارت پنداری

دو چار شعر اور بھی قابل دید ہیں:-

دامن عیش زدستم نرود، تا شبلی — دامن بمبئی از کف ندہم تا باشم

شبلی عناں گسستہ مروسوئے بمبئی — ما نیز با تو ہم سفریم، ایں شتاب چیست

ز ذوق طبع شبلی من دراول روز دانستم — کہ در آشوب گاہ بمبئی در بازو ایماں را

بیا اینجا کہ ہر سو کارواں در کارواں بینی — بتان آذری را، دلبران شام و ایراں را

یہ غزلیں شائع ہو جاتی تھیں، اور ان مضامین کے چرچے ہوتے تھے۔ اس لئے ایک غزل میں اپنے مخاطب غزل سے کہتے ہیں:-

(باقی حاشیہ صفحہ ۶۳۷ پر)

"آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت وعظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔" (مولوی ظفر الملک اڈیٹر الناظر از سیر المصنفین)

وہاں یہ بھی کہا گیا:-

"ہمارے مولانا پرستاران عقلیت کی رایوں کے مطابق اسلام کی تاریخ گذشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا منشا پورا نہو، لیکن متبعین یورپ کی تشفی ہو جائے۔"

"مولانا کی ایسی تمام تحریروں نے اگر ایک طرف حاملان شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر کیا، تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو ناقابل تلافی نقصان پونہچا دیا ہے۔" (وہی مضمون)

اس اعتبار سے ان کی حیثیت تقریباً سر سید کی سی تھی۔ فرق یہ تھا کہ سر سید باقاعدہ عالم، محدّث نہ تھے، اور علّامہ شبلی سب کچھ تھے۔ سر سید کی رایوں کو تو "دخل در معقولات" سمجھا گیا تھا، لیکن علّامہ شبلی کے "اجتہادِ نو" کی حمایت میں ان کے جُبّہ و دستار تھے، علمائے ملّت کی برہمی و برافروختگی کا یہی باعث تھا۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سیرۃ النعمان پر اعتراض

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۶)

چشم لطف از تو باندازۂ آں می دارم — کہ من از نام نکو بہر تو نقصاں کردم

اس غزل کا مقطع ہے:-

شبلی ایں فن نہ بہ ایں شیوۂ آئین بودہ است — ہیش ازیں کالبدے بود کہ من جاں کردم

فن شعر گوئی یا فن عشقبازی؟

اس مجموعۂ "بوئے گل" کی آخری غزل کا مقطع کیا خوب ہے:-

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی — حالیا شبلی، رند غزل خواں نیستم

کئے گئے۔ وجوہ اعتراض کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ معترضین میں مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب شیروانی رئیس بھیکن پور (نواب صدر یار جنگ بہادر) بھی تھے، اور علمائے معترضین میں شاید سب سے کم عمر، لیکن فہم و فراست اور مذہبی جوش و پاسداری میں کسی سے کم نہ تھے۔ علی گڈھ کالج سے قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ علامہ شبلی نے تمام مخالفانہ مضامین میں سے مولوی صاحب موصوف ہی کے اعتراضات کا جواب لکھا۔ اس میں یہ شعر بھی لکھا تھا:۔

رسی آنگہ بدردِ ما کہ چو ما خامہ گیری و حرف بنگاری

(۲) "سیرۃ النعمان" کے بعد الفاروق پر اعتراض ہوئے۔ یہ دوسری قسم کے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ "مصنف نے اسلام کی تاریخ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ الفاروق پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی شائستگی اور اُس زمانے کے تمدن میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ جو محکمے دفاتر موجودہ طرز حکومت کے لازمی عناصر ہیں، کم و بیش وہ سب دربار خلافت کے ارکان پائے جاتے ہیں، جن کو درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی" (ایڈیٹر الناظر)۔ اور اس پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے:۔

"جو درجہ حزم و احتیاط تاریخ کی کسی مستند کتاب کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے الفاروق اس سے محروم ہے" (ایڈیٹر الناظر)

علامہ شبلی کی رُجحان پسندی اور ہیرو پرستی سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن اس میں ان کا صرف مبالغہ یا اہتمام ہم کو تسلیم ہے۔ ورنہ

تا نباشد چیزکے شبلی نگوید چیزہا

علامہ نے "الفاروق" کی ترتیب میں اس قول پر عمل کیا ہے کہ اثباتِ فضائل میں حدیث کا بالکل صحیح ہونا شرط نہیں البتہ کسی صحیح قول کی تردید نہ ہو اور کسی دوسرے کی مضرت و منقصت نہ ہو۔ اس لئے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے انتظام حکومت کے متعلق جو بات جس تاریخ میں پائی لکھ دی۔

وہ تحقیق و تنقیح نہیں کی جو بعد کو سیرۃ النبیؐ کے لئے کی۔ لیکن الفاروق میں بھی کثرت سے واقعات صحیح بخاری و صحیح مسلم سے اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج سے اور اس طرح کی بعض اور مستند کتابوں سے لئے ہیں۔

معترضین نے کم سے کم یہ اعتراض سمجھ کر نہیں کیا کہ مصنف الفاروق نے موجودہ طرز حکومت اور دربار خلافت میں کچھ زیادہ فرق نہیں رکھا۔ جس چیز سے ان کو دھوکا ہوا، وہی علامہ شبلی کا کمال تالیف ہے۔ علامہ نے حصہ دوم میں جلی عنوانوں کی تفصیل کے لئے حاشیوں پر ذیلی سرخیاں قائم کرکے موجودہ طرز حکومت کے سب نہیں تو اکثر ضروری عناصر خلافت فاروقیؓ میں دکھائے ہیں۔ فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ عنوان نظر آتے ہیں:-

> صوبوں کی تقسیم، محکمہ بندوبست، قانون مالگذاری، محکمہ آب پاشی، مختلف قسم کے رجسٹر، مردم شماری، محکمہ جاسوسی، پولٹیکل تنخواہیں، پرچہ نویسی، فن جنگ، فوج کے خزانچی و محاسب، قلعہ شکن آلات، سفر مینا وغیرہ۔

لیکن ان کو پڑھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں بالکل ابتدائی حالت میں اور وقت و موقع کے مطابق تھیں۔ مثلاً فوجیں تھیں تو وہ کہیں رہتی بھی تھیں۔ اُن مکانوں کا نام فوجیں بارکیں لکھ دیا۔ معترض بے پڑھے یہ کیوں تصور کرلے کہ انگریزی فوجوں کے سے قطار در قطار باقاعدہ یکساں کمرے، ہال، کلب گھر، اصطبل تھے۔ مردم شماری کے متعلق لکھا ہے:-

> "زکوٰۃ اور جزیہ کی تشخیص کی ضرورت سے ہر مقام کی مردم شماری کرائی گئی تھی ...... خاص صنفوں کے لحاظ سے بھی نقشے تیار کرائے تھے مثلاً سعد وقاص کو حکم بھیجا تھا کہ جس قدر آدمی قرآن پڑھ سکتے ہیں، ان کی فہرست تیار کی جائے۔ شاعروں کی بھی فہرست طلب کی تھی۔" (الفاروق ص۱۱۸)

ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ابھی آغاز ۱۹۴۱ء میں جیسی مردم شماری ہوئی ہے، ایسی جب نہ تھی، نہ ایسی دکھائی گئی ہے۔

اس کے علاوہ معترضین نے یہ امر فراموش کردیا ہے کہ خلافت فاروقی عراق، شام، مصر، ایران، دور دور تک تھی۔ مصر و ایران وغیرہ پہلے سے متمدن و شائستہ ملک تھے۔ وہاں یہ تمام اصول حکومت اور طرزِ سلطنت رائج تھے۔ فتح اسلام کے بعد بھی جاری رہے اور اب عہد فاروقی کے کارنامے اور الفاروق میں لکھنے کے واقعات ہوگئے۔

(۳) موازنہ انیس و دبیر پر بھی اعتراض ہوئے اور اس کے جواب میں المیزان اور ردّ الموازنہ وغیرہ لکھی گئیں۔ اردو کتابوں میں اضافہ کے لحاظ سے تو بہت اچھا ہوا کہ یہ کتابیں لکھ دی گئیں۔ خصوصاً المیزان کہ وہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ "موازنہ" سے دُگنی اور مرزا دبیر کے حالات، خصوصیات کلام، انتخاب مراثی کے اعتبار سے نہایت کارآمد۔ لیکن اس میں جوابِ موازنہ کی سعی لاحاصل ہے۔ "موازنہ شبلی" لاجواب تھا۔ علامہ شبلی کی طبیعت میں بعض باتیں مورّخ و نقّاد کی شان کے خلاف تھیں۔ ان کا ظہور "موازنہ" میں بھی ہے۔ صرف ان چند باتوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لئے چند صفحے یا ایک دو جُز کافی تھے۔ ورنہ وہ شاعری میں اس قدر صحیح مذاق اور نظر انتقاد رکھتے تھے کہ ان کی تنقیدوں میں مشکل سے کلام ہو سکتا ہے۔ بعض قابل اعتراض باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) علامہ شبلی کی عادت تھی کہ جس مسئلے کو جتنا اہم سمجھتے تھے اتنی ہی اس کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ معمولی قرین قیاس باتوں میں صرف شہرت و سماعت کو کافی سمجھتے تھے۔ انھوں نے "موازنہ" میں مرزا دبیر کے بعض شعروں اور مصرعوں کو خلاف بلاغت بتایا ہے۔ ان میں یہ بھی ہیں:۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ و آلہ وسلم کی زبان سے مرزا دبیر نے یہ مضمون ادا کیا ہے:۔

محبوب ہوں خدائے ذوی الاحترام کا نانا ہوں میں حسین علیہ السلام کا

آنحضرتؐ کی زبان سے امام صاحب کے لئے "علیہ السلام" کا لفظ کس قدر ناموزوں

ایک اور مشہور مصرع ہے:-

"زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے" (دبیر)

مصنف المیزان کہتے ہیں کہ یہ دونوں مرزا دبیر کے نہیں ہیں۔ ان کے نام سے غلط مشہور کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں علامہ پر اعتراض صرف عدم تحقیق کا ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل مسئلہ مرزا دبیر کی عدم رعایت بلاغت ہے۔ وہ اور بہت سے مصرعوں سے ثابت ہے۔ جو علامہ نے پیش کئے ہیں۔

(۲) علامہ نے صنعت "تنسیق الصفات" کی یہ تعریف بیان کی ہے:-

"جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے درپے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔" (موازنہ صفحہ ۳۵)

اور اس کی مثالوں میں یہ شعر بھی لکھا ہے:-

کوفہ میں یہی مورکہ دن بھر نظر آیا　　شمر آیا۔ سنان آیا۔ حر آیا۔ عمر آیا

یہ تعریف اور مثال دونوں غلط ہیں۔ اس کے نام میں "صفات" کا لفظ ہے۔ اسی سے تعریف نکلتی ہے کہ کسی شے کی صفتیں پے درپے لائی جائیں۔ اسماء، افعال یا جملے پے درپے آنے سے "تنسیق الصفات" نہیں بنتی۔ "موازنہ" میں یہ مثال صحیح لکھی ہے:-

اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی، پانی بھی، ہوا بھی　　امرت بھی، ہلاہل بھی، مسیحا بھی، قضا بھی

(۳) علامہ شبلی پر سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کا نام تو "موازنہ انیس و دبیر" رکھا ہے۔ لیکن اس سے مقصد تحسینِ انیس اور تنقیص دبیر ہے۔ موازنہ میں طرفین کے محاسن و معائب دکھانے ضروری ہیں۔ علامہ ممدوح نے برائے نام میر انیس کی خامیاں بھی بتائی ہیں۔ لیکن اکثر جگہ ان کی یہ تاویل کی ہے کہ کاتب کی غلطی ہے اور مرزا دبیر کے اغلاط میں کہیں یہ احتمال ظاہر نہیں کیا۔ "المیزان" میں بتایا گیا ہے کہ یہاں یہاں کاتب کی غلطیاں، اس لئے علامہ شبلی کا اعتراض درست نہیں۔

علامہ موصوف میں یہ وصف بھی ہے کہ وہ ایک کو اعلیٰ اور ایک کو ادنیٰ سمجھ لیتے

ہیں تو پھر یہ تلاش نہیں کرتے کہ ان کے ناپسندیدہ شخص میں کتنی خوبیاں ہیں۔ خواہ وہ پسندیدہ شخص کے مقابلے میں کتنی ہی کم ہوں۔ ترجیح کے لئے یہ ضروری نہیں کہ غیر مُرجّح شخص میں کوئی خوبی نہو، یا اس کی خوبیوں سے چشم پوشی کی جائے۔ یا ان کو کم کرکے دکھایا جائے۔ انھوں نے مرزا دبیر کے متعلق لکھا ہے:۔

"فصاحت ان کے کلام کو چھو نہیں گئی، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا کسی واقعہ کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔"

اور اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

"ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں، لیکن گفتگو قلت اور کثرت میں ہے۔"

جب قلت و کثرت میں گفتگو تھی تو یہی بات کہنی چاہئے تھی۔ یہ الفاظ "چھو نہیں گئی، نام کو نہیں، بالکل عاجز ہیں" لکھنے ہی مناسب نہ تھے۔ اس لئے کہ خلاف واقع ہیں۔ علامہ شبلی نے صرف ایک واقعہ کے متعلق مرزا دبیر کے پانچ بند نقل کئے ہیں اور لکھا ہے:۔

"مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے، اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے۔ کسی سے آج تک نہ ہو سکا۔"

لیکن ہم نے اپنی تالیف "تاریخ مرثیہ گوئی" میں مرزا دبیر کے مختلف مرثیوں سے طویل و مسلسل اقتباسات لکھ دیے ہیں جن میں وہ "فصاحت و بلاغت" جس کو علامہ ممدوح کہتے ہیں کہ دبیر کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، ایسی اعلیٰ ہے کہ اگر ان بندوں کو میر انیس کے کلام میں ملا دیا جائے تو پہچان مشکل ہے موازنہ کا حق یہ تھا کہ علامہ مرزا صاحب کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرکے بجائے ایک دو واقعات یا چند اشعار کے وہ تمام یا اکثر حصے پیش کرتے، جہاں دبیر انیس سے بڑھ کر یا برابر کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہوتا تو پھر ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی اور "ترجیح انیس" کے متعلق ان کی رائے پھر بھی درست ہی رہتی۔

(۴) شعر العجم بھی مورد اعتراض رہا مختلف لوگوں نے مضامین اور رسالے لکھ کر اس کی تاریخی و تنقیدی غلطیاں دکھائیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی مورخ "سے زیادہ "نقاد" تھے[۱]۔ شعر العجم کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ فارسی شاعری کی وسعت و جامعیت ثابت کی جائے اور تنقید موازنہ کرکے شاعروں کے کمالات دکھائے جائیں۔ اس کام کے لئے فی الجملہ ملکی تاریخ اور شاعری کا ارتقا بھی بیان کرنے کی ضرورت تھی اور شاعروں کے حالات بھی۔ لیکن ذاتی حالات یا ملکی تاریخ مقصود بالذات نہ تھی۔ اور علامہ کی یہ عادت ہو چکی ہے کہ وہ صرف اپنے کام اور ضرورت کی قدر تحقیق کیا کرتے تھے۔ ان کی جن تصانیف اور مضامین کا موضوع تحقیق ضمنی چیز ہے، وہاں وہ ہر روایت اور ہر تحریر کو معتبر سمجھ لیتے ہیں۔ اس بنا پر شعر العجم میں شعراء کے سال ولادت و وفات، ان کا وطن، حسب نسب، کتابوں کا سال تصنیف، ان کا انتساب، تاریخ ایران کے سنہ اور اس قسم کے مختلف معلومات کہیں کہیں غلط لکھی گئی ہیں۔ اس لئے کہ ان کو شاعر اور اس کے گردوپیش سے اتنی بحث و تعلق نہیں جتنی شاعری اور اس کے ماحول سے ہے۔

شعر العجم میں ان باتوں کی تحقیق بھی جا بجا نظر آتی ہے، لیکن سرسری ہے۔ کسی بات کے متعلق چند کتابوں میں اختلاف نظر آیا۔ انھوں نے وہ اقوال نقل کر دئیے کبھی کسی قول کو ترجیح دیدی، کبھی بغیر فیصلہ کے چھوڑ دیا۔ اس لئے علامہ شبلی پر مورخ و تذکرہ نویس کی حیثیت سے یہ اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو یورپ کے طرز تحقیق کی عادت ہے، ان کی نظر میں علامہ کی یہ کمزوری زیادہ کھٹکتی ہے[۲]۔

---

[۱] آگرہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے (فارسی) کے امتحان میں ساتواں پرچہ "تنقید" کا ہے اس میں صرف شعر العجم کے پانچوں حصے شامل نصاب ہیں۔ ایک سال اس پرچے میں یہ سوال بھی تھا:" اس پر بحث کرو کہ شبلی مورخ سے زیادہ نقاد ہیں" مقصود یہ تھا کہ ان کی تاریخ نویسی کی خامیاں اور تنقید و تبصرہ کی خوبیاں دکھائی جائیں۔

[۲] پروفیسر محمود شیرانی کا مضمون مطبوعہ رسالہ اردو (۱۹۲۶ء) دیکھنا چاہئے۔

علامہ شبلی کی طبیعت میں یہ بات بھی عجیب تھی کہ وہ اپنے معاصرین کی تصانیف کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ خصوصاً جن لوگوں کو وہ اپنا حریف سمجھتے تھے اور جن کی کتابیں ان کی تالیفات کے ہم موضوع ہوتی تھیں ان کی کھلے دل سے داد نہ دیتے تھے۔

شعر العجم حصہ پنجم کے دیباچے میں علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

عجب اتفاق کہ اس وقت اسی عنوان پر ہندوستان اور یورپ کے دو اور اکابر مصنفین بھی قلم اُٹھا چکے تھے۔ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد لاہور میں اور پروفیسر براؤن انگلینڈ میں۔ ۱۹۰۷ء میں ادھر لاہور سے سخندان پارس نکلی، اور اُدھر انگلینڈ سے لٹریری ہسٹری آف پرشیا شائع ہوئی۔ لیکن شعر العجم کے مصنف کا معیار تخیل ان دونوں سے الگ رہا۔ ۶ مئی ۱۹۰۷ء کے خط میں مولانا لکھتے ہیں:۔

"آزاد کا سخندان پارس حصہ دوم نکلا، سبحان اللہ! لیکن الحمد للہ کہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

(مکاتیب شبلی حصہ اول صـ ۱۳۷)

اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں:۔

اپریل ۱۹۰۸ء میں مولانا کو ایک دوست کے خط سے براؤن کی تصنیف کا حال معلوم ہوا۔ چنانچہ انھیں کے ذریعہ سے کتاب منگوائی اور پڑھوا کر سُنی۔ اس کا جو اثر ہوا، وہ حسب ذیل ہے:۔

"بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔ برادر اسحاق سے پڑھوا کر سُنی، خود بھی اُلٹ پلٹ کر دیکھی۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں، جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مذاق اتنا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ "سبعہ معلقہ" کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارسی کے کلام کے برابر نہیں۔ میں مع سود در ہرجہ کے آپ سے دام واپس لوں گا۔"

پروفیسر براؤن کی "ادبی تاریخ ایران" کو "عامیانہ و سوقیانہ" کہنا، علامہ شبلی کی "سخن فہمی" کی عجیب و غریب مثال ہے۔ براؤن کی تاریخ اس درجے کی کتاب ہے کہ علامہ شبلی اگر کوشش کرتے تو ایسی نہ لکھ سکتے۔ المامون اور الفاروق میں تحقیق و تلاش کی نوعیت اور تھی۔ کسی ملک و قوم کی تہذیب و تمدن اور اسکی روشنی میں زبان و ادب کی تاریخ جن اصول پر یورپ میں لکھی جاتی ہے، وہ علامۂ موصوف کے فہم و دسترس سے بالاتر تھے۔ جس کا ایک ثبوت یہی ہے کہ وہ "برادر اسحاق سے پڑھوا کر" اور "خود الٹ پلٹ کر" یہ نہ دیکھ سکے کہ اس میں کیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا کہ کیا نہیں ہے۔ علامہ شعر فہمی و نکتہ سنجی کے مرد میدان تھے۔ اُس وقت فردوسی زیرِ مطالعہ تھا (جس پر ۵، صفحے لکھے ہیں)۔ اس لئے براؤن کے ہاں اسی کو دیکھا اور یہ دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ اس نے دو تین صفحے لکھے ہیں۔ ساری کتاب پر ریویو کرنے کے لئے گویا یہ نظر ہی کافی تھی۔ پروفیسر براؤن نے علامہ شبلی کی یہ رائے دیکھی ہوگی تو مزہ لیا ہوگا۔

اس کے مقابلے میں پروفیسر صاحب کی انصاف پسندی اور کشادہ دلی قابلِ دید ہے۔ تاریخ براؤن اور تذکرۂ شبلی کی پہلی جلدیں ساتھ نکلیں۔ اسکے بعد دونوں اپنی اپنی کتابیں آگے لکھ رہے تھے۔ علامہ نے اپنی تصنیف پہلے ختم کر دی۔ پروفیسر بعد تک لکھتے رہے۔ انھوں نے شعر العجم دیکھی، اور اپنی بعد کی جلدوں میں اس کی بڑی تعریف لکھی۔ اور علامہ کی سخن سنجی کی بہت داد دی۔ تیسری جلد میں جہاں فیضی، عرفی، نظیری، صائب وغیرہ کا پروفیسر صاحب نے تذکرہ لکھا ہے، ہر شاعر کے بیان میں سب سے پہلے علامہ شبلی اور شعر العجم کا حوالہ دیا ہے۔ ایک جگہ مقابلۂ شعرا کے موقع پر لکھا کہ یہ کام شبلی نے نہایت عمدہ کیا ہے۔ چنانچہ بعض شاعروں کا موازنہ جو علامہ نے کیا تھا، اسی کو اعتراف و حوالہ کے ساتھ بجنسہ اپنی کتاب میں درج کر دیا۔

علامہ شبلی نے جو کام کیا، یعنی شعرا کا موازنہ خصوصیات کلام کا احاطہ،

بہترین کلام کا اجواب اور تنقید، یہ پروفیسر براؤن کے بس کا نہ تھا۔ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" براؤن کیا، کوئی یورپین ہو فارسی شاعری کی لطافتوں اور نزاکتوں کو مشکل سے سمجھ سکتا۔ یہ لوگ صرف شاعری کے موضوع نظم کے مضمون، اسلوب کے ظاہری محاسن، صنائع و بدائع کو سمجھ سکتے اور ان پر بحث کر سکتے ہیں۔ علم معانی سے جو خوبیاں متعلق ہیں ان کا سمجھنا ان کے لئے بہت دشوار ہے، الفاظ کی موزونیت، لفظ و معنی کا تناسب روزمرہ کی نزاکت، محاورہ کی لطافت بلکہ خیال کی پاکیزگی اور طرز ادا کی ندرت کو بھی مستشرقین یورپ میں سب نہیں سمجھ سکے۔

اس لئے اگر پروفیسر براؤن "شاہنامہ" کی شاعرانہ خوبیوں کی داد نہ دے سکے، تو اس پر علامہ شبلی کو طعنہ دینے کا محل نہ تھا۔ باقی علامہ نے یہ بات غلط لکھی کہ براؤن نے فردوسی پر دو تین صفحے لکھے ہیں۔ ان کی ہسٹری کی پہلی جلد میں شاہنامہ کے تاریخی مضامین اور مآخذ ۱۰ صفحے میں لکھے ہیں، اور شاہنامہ کا منظوم انگریزی ترجمہ لکھا ہے اور پھر دوسری جلد میں فردوسی و شاہنامہ کا ذکر ۱۲ صفحوں میں کیا ہے۔ یہ ۲۲ صفحے وسعت میں شعر العجم کے ۴۰ صفحوں سے کم نہیں ہیں۔

تصانیف شبلی کے نمونے

(۱) **المامون**، علامہ کی مستقل تصانیف میں سب سے پہلی ہے۔ اس کا سبب تالیف پہلے بیان ہو چکا ہے رائیل ہیروز آف اسلام (نامور فرماں روایان اسلام) کا سلسلہ اس کتاب سے شروع ہوا۔ علی گڈھ کالج کے زمانہ ملازمت میں لکھی گئی اور ۱۸۸۹ء کے شروع میں کالج کی طرف سے چھاپ کر شائع کی گئی۔ اس قدر مقبول ہوئی کہ چند مہینے میں سب جلدیں فروخت ہو گئیں اور اسی سال اکتوبر میں دوبارہ چھاپی گئی۔ سرسید نے دوسرے اڈیشن کا دیباچہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو لکھا ہے۔ اس کی زبان

کے متعلق سرسید کی راے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ دیباچہ میں اس کے طرزِ بیان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے، مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان کا طرزِ بیان جُدا گانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کرتا ہے۔

ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے، اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت، خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے، بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے اور نہ بھونڈی کو زیادہ بھونڈا۔ اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔"

(سید احمد خاں سکرٹری مدرسۃ العلوم)

"المامون" کے دو حصّے یکجا ہیں۔ پہلے حصّہ میں خلافت عباسیہ کے قیام کا حال اور مامون الرشید خلیفہ ششم کے زمانہ تک کی خانہ جنگیاں بیان کی ہیں، اور وہ اسباب لکھے ہیں جن سے (بقولِ سرسید) "امین اس کا بھائی محروم اور مقتول اور خود مامون تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہٗ بن گیا۔" دوسرے حصّہ میں (بالفاظِ سرسید) "انتظامِ سلطنت اور اس کی جُزئیات کو جہاں جہاں سے ملیں، چُن چُن کر ایک جگہ جمع کیا ہے۔ اور المامون کی خصلت اور اس کی سوشیل حالت اور اس کی پرائیوٹ زندگی، اس کے مشغلوں اور اس کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے۔"

مولانا حالی کی "حیاتِ سعدی" اس سے پہلے شائع ہوئی ہے اور تاریخی تحقیق اور سیرت کی خوبیِ ترتیب کے لحاظ سے بلاشبہ وہ اردو میں پہلی تصنیف ہے۔ لیکن علّامہ شبلی کا یہ پہلا کارنامہ تحقیق و ترتیب دونوں میں کچھ کم دقیع نہیں ہے۔ سرسید "المامون" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

اس قدر جزئیات کو تلاش کرنا اور نظم اسلوب سے ایک جگہ جمع کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی، اور مصنف کو کتنے ہزاروں ورق تاریخوں کے اُلٹنے پڑے ہونگے۔ اور اسی کے ساتھ جب یہ خیال کیا جائے کہ مصنف نے ان جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کر کے نکالا ہے، جن کی نسبت خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ ان میں مامون کے حالات ہوں گے، تو اس محنت کی وقعت وقدر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

یہ کام حقیقت میں نہایت دشوار ہے، لیکن علامہ شبلی نے اپنے علم وفضل، وسعت مطالعہ سے اور اس سے زیادہ اپنے ذوقِ صحیح اور دقّت نظر سے ایسی خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اردو میں اس سے بہتر نمونہ موجود نہ تھا۔ یہ اقلیم تحقیق المامون سے شروع ہو کر پھر علامہ کے قلم سے نہ نکلی۔ اور اسی دشت کی سیاحی میں عمر گذر گئی۔ اس کے بعد جس کتاب کے لکھنے کو قلم اُٹھایا وہ تحقیق ہی کا ایک نیا میدان تھا۔ "سیرۃ النبیؐ" تک یہی جولانی جاری رہی۔

المامون کی زبان وبیان کے متعلق سرسید کی جو رائے لکھی گئی، وہ بالکل درست ہے لیکن خود علامہ کی بعد کی تصانیف کے مقابلے میں اس کتاب کا اسلوب زیادہ پختہ اور منجھا ہوا نہیں ہے۔ "الفاروق" اور اس کے بعد کی کتابوں میں خصوصاً موازنہ، شعرالعجم اور سیرۃ النبیؐ میں اور اس زمانے کے مضامین میں ایسا زور، صفائی اور الفاظ ومضمون کا باہمی تناسب (یعنی بلاغت) ہے کہ انکے اسلوب میں ایک تڑپ اور چمک پیدا ہوگئی ہے اور اسی وصف کے سبب سے وہ اپنے زمانے کے بہترین انشا پرداز ہیں۔

جس زمانے میں المامون لکھی گئی، علامہ شبلی پر سرسید کا اثر نیا نیا تھا۔ اس لیے اس کتاب میں انگریزی کے الفاظ کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ورنہ جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے، انھوں نے اس روش کی نازیبائی کو سمجھ لیا،

اور شروع کے مضامین و تصانیف کے بدلے ضرورت انگریزی الفاظ نہیں لکھے۔ المامون سے دو ایک مثالیں لکھی جاتی ہیں :۔

(۱) "یہی ایک چیز ہے جو قومی فیلنگ اور قومی خوشی کو زندہ رکھ سکتی ہے۔"

(دیباچہ مصنف)

(۲) "ماموں کی فیاض لاتف پر اگر کچھ نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔" (المامون ص ۱۱۳)

(۳) "تاہم ماموں نے وہی کیا جو سچے کانشنس کی رو سے اس کو کرنا چاہئے تھا۔"

(ص ۱۱۰)

المامون کے نمونے یہ ہیں :۔

(الف) طاہر ذوالیمینین خلیفہ مامون الرشید کا معتمد علیہ تھا۔ اسی نے مامون کے بھائی امین سے جنگ کرکے اس کو گرفتار کیا تھا اور پھر قید خانہ میں قتل کیا تھا۔ اس طرح اسی شخص کے ذریعہ سے مامون کو سلطنت ہاتھ آئی تھی۔ اس کا ایک واقعہ علامہ شبلی لکھتے ہیں :۔

طاہر کا خراساں کی حکومت پر مقرر ہونا ۲۰۵ھ

اس سال ایک عجیب تقریب سے طاہر کو اپنے کارہائے نمایاں کا مناسب صلہ ملا، یعنی وہ کل مشرقی حکومت پر جس کی دارالخلافہ بغداد سے شروع ہو کر سندھ تک منتہی ہوتی ہے، نائب السلطنت مقرر ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک رات طاہر ماموں کی بزم عیش میں حاضر ہوا۔ ماموں بادہ نوشی کے مزے لے رہا تھا۔ بے تکلفی سے اُس نے دو پیالے طاہر کو بھی مرحمت کئے، اور اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔ طاہر نے باادب عرض کیا کہ "میرا منصب اس عزت کا مستحق نہیں ہے۔" ماموں نے کہا "یہ قیدیں دربار عام کے لئے مخصوص ہیں۔ بے تکلفی کے جلسوں میں اس قسم کی قواعد کی پابندی ضروری نہیں۔" طاہر آداب بجالا کر بیٹھ گیا۔ ماموں نے اس کی طرف نگاہ کی تو آنکھوں میں آنسو

پھر آتے ہیں۔ طاہر نے عرض کی کہ "اب کیا آرزو باقی رہی ہے جس کا حضور رنج کر سکتے ہیں"۔ مامون نے کہا "کچھ ایسی بات ہے جس کے پوشیدہ رکھنے میں تکلیف اور ظاہر کرنے میں ذلت ہے"۔ طاہر اس وقت تو چپ ہو رہا مگر دل میں خلش پیدا ہوئی۔ کہ آخر کیا بات ہے۔ حسین جو مامون کا ساقی اور ندیم خاص تھا۔ طاہر نے اسے دو لاکھ درہم نذر بھیجے اور درخواست کی کہ اس دن کے واقعہ کا سبب دریافت کر دے۔ حسین نے موقع پاکر پوچھا۔ مامون نے کہا "اگر یہ بات آگے بڑھی تو سر اڑا دوں گا۔ سچ یہ ہے کہ جب طاہر میرے سامنے آتا ہے تو بھائی امین کا ذلت و بیکسی سے مارا جانا یاد آیا ہے۔ میرے ہاتھ سے ضرور کسی دن طاہر کو گزند پہنچے گا"۔ طاہر کو یہ بات معلوم ہوئی تو احمد بن ابی خالد الاحول کے پاس گیا (حسن بن سہل کے بعد وزیر مقرر ہوا تھا۔) اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں اور میرے ساتھ بھلائی کرنی فائدے سے خالی نہیں۔ بس تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مامون کی آنکھ سے دور رہوں۔ احمد بن ابی خالد نے اس کا ذمہ لیا۔ اور دوسرے دن صبح کے وقت مامون کے پاس حاضر ہوا۔ چونکہ چہرے سے تردد اور پریشانی نمایاں تھی۔ مامون نے پوچھا:۔ کیوں کوئی نئی بات ہے۔

احمد۔ حضور مجھے تو ساری رات نیند نہیں آئی۔

مامون۔ آخر کیوں۔

احمد۔ میں نے سنا ہے کہ حضور نے خراساں کی حکومت غسان کو دی جس کے ساتھ مٹھی بھر سے زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اگر ترکوں نے سرحد پر حملہ کیا تو کیا غسان ان کو روک سکے گا۔

مامون۔ یہ خیال تو مجھ کو بھی تھا۔ اچھا تم کس کو تجویز کرتے ہو۔

احمد۔ طاہر ذوالیمینین سے بہتر کون شخص انتخاب ہو سکتا ہے۔

مامون۔ مگر اس کے خیالات تو باغیانہ ہیں۔ اور وہ نقض بیعت پر آمادہ ہے۔

احمد۔ اس کا ذمہ دار میں ہوں

مامون۔ اچھا تم اپنی ذمہ داری پر مقرر کرو۔

طاہر طلب ہوا اور سند حکومت کے ساتھ ایک کروڑ درہم بھی جو عموماً خراسان کے گورنروں کو ملتے تھے۔ عطا ہوئے۔ طاہر نے ایک مہینے میں ساز و سامان سفر درست کیا اور ۲۹ ذی قعدہ ۲۰۵ھ کو خراسان روانہ ہوا۔ طاہر کا بیٹا اس کے بعد صاحب الشرطہ مقرر ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کی ذاتی لیاقت نے مصر کی گورنری تک پہنچا دیا۔ تقرر کے وقت مامون نے اس کو اپنے سامنے بلایا اور کہا "یوں تو ہر شخص اپنی اولاد کی نسبت حسن ظن رکھتا ہے، لیکن طاہر نے جو کچھ تمہاری تعریف میں کہا اس سے کم کہا جس کے تم در اصل مستحق تھے"۔ طاہر نے جب یہ فردہ سنایا تو بیٹے کو ایک نہایت مفصل خط لکھا۔ جو آئین حکومت، انتظام ملکی، رفاہ رعایا کے متعلق ایک نہایت مدبرانہ دستور العمل تھا۔ یہ خط اس قدر مقبول ہوا کہ تمام لوگوں نے اس کی نقلیں لیں۔ خود مامون نے اس کی باضابطہ نقلیں عموماً حکام سلطنت کے پاس بھجوائیں۔ اور کہا کہ طاہر نے دنیا و دین و تدبیر ورائے و سیاست و اصلاح ملک و حفاظت سلطنت و قیام خلافت کے متعلق کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔

(ب) مامون کے عیش و طرب کے جلسوں میں گو عیاشانہ رنگینی پائی جاتی ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ یہ جلسے علمی مذاق سے بالکل خالی بھی نہ تھے۔ اس قسم کے جلسے جو شاعرانہ جذبات کو پورے جوش کے ساتھ ابھار دیتے ہیں۔ اگر متانت اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو لٹریچر پر نہایت وسیع اور عمدہ اثر پیدا کرتے ہیں۔ مامون خود سخن سنج اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ یاران مجلس بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس تھے۔ بات بات پر شاعرانہ لطیفے ایجاد ہوتے۔ کبھی موسیقی کی بحث چھڑ جاتی۔ کسی وقت مامون کے فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعرا کی طبع آزمائیوں کا امتحان ہوتا۔ ایک دن بزم عیش

آراستہ تھی۔ بادہ و جام کا دَور تھا۔ بیس عیسائی کنیزیں دیباے رومی کے لباس پہنے، گردنوں میں سونے کی صلیبیں، کمر میں زرّیں زنّار، ہاتھوں میں گلدستے لیے ہوئے، بزم میں جلوہ آرا تھیں۔ یہ سماں ایسا نہ تھا کہ مامون دل پر قابو رکھ سکتا۔ بیساختہ چند اشعار زبان سے نکلے۔ اور احمد بن صدقہ ایک مُغنّی کو بُلا کر شعروں کے گانے کی فرمائش کی۔ احمد کی نغمہ سرائی کے ساتھ کنیزیں ناچنے کھڑی ہو گئیں۔ ان کی مخمور آنکھیں اور جام شراب مامون کو بدمست کرنے میں یکساں کام دے رہے تھے۔ وہ بالکل سرشار ہو گیا اور حکم دیا کہ ان نازنینوں کے قدم پر تین اشرفیاں نثار کی جاویں۔ مامون کا چچا ابراہیم جس کے ادعاے خلافت کا حال پہلے حصہ میں گذر چکا ہے۔ اور جو موسیقی کا بڑا استاد اور اس فن میں اسحٰق موصلی کی ہمسری کا دعویٰ رکھتا تھا، ایک دن بزم عیش میں حاضر تھا۔ مامون کے دائیں بائیں حور وش کنیزیں ایک سُر میں عود چھیڑ رہی تھیں۔ اسحٰق بھی حاضر ہوا اور آنے کے ساتھ ٹھٹک سا گیا۔

مامون: "کیوں اسحٰق! کوئی بے اصول آواز کان میں آرہی ہے؟"

اسحٰق: "حضور ہاں"

مامون۔ (ابراہیم کی طرف مخاطب ہو کر) "تم اس سوال کا جواب کیا دیتے ہو؟"

ابراہیم: "نہیں"

مامون نے اسحٰق کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا "اب میں بہ تعین بتا دیتا ہوں کہ اس صف میں کس تار پر غلط مضراب پڑ رہی ہے۔" ابراہیم نے اس طرف کان لگا کر سُنا، مگر پھر تمیز نہ ہوئی۔ اسحٰق نے ایک خاص کنیز کی طرف اشارہ کیا کہ وہ تنہا بجائے۔ اور سب ہاتھ روک لیں۔ اب ابراہیم سمجھ گیا اور اپنی ناواقفیت پر نادم ہوا۔

مامون نے کہا "ابراہیم، اسّی تاروں کی یکساں اور مشتبہ گونج میں ایک غلط صدا جس کے کان میں کھٹک جائے اور اس کو بہ تعین بتا دے تم اس کی

ہمسری کا کیونکر دعویٰ کر سکتے ہو۔"

شاید یہ پہلا دن تھا کہ ابراہیم نے صریح لفظوں میں اسحٰق کی فضیلت کو تسلیم کر لیا۔

(۲) **سیرۃ النعمان**، امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہے۔ ۱۵ دسمبر ۱۸۹۳ء کو علامہ شبلی نے علی گڈھ میں اس کو ختم کیا۔ تقریب تصنیف پہلے بیان ہوئی ہے۔ اس کے بھی دو حصّے یکجا ہیں۔ پہلے میں امام صاحب کے ذاتی حالات و فضائل ہیں۔ اور دوسرے میں ان کے اصول فقہ اور علم کلام سے بحث کی ہے۔ یہی حصہ علامہ کا اصلی کارنامہ ہے۔ یہ مسائل اس ترتیب سے اردو کیا فارسی و عربی میں بھی نہ تھے۔ ترتیب و تالیف میں علامہ کی جدت اور مسائل کے فیصلہ و محاکمہ میں ان کا اجتہاد شامل ہے۔ یہی اجتہاد علامہ اور علمار کے درمیان اختلاف کا باعث ہوا تھا۔

دونوں حصّوں سے ایک ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

(الف) **ذہانت و طبّاعی**۔ امام صاحب کی ذہانت اور طبّاعی عموماً ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ ان کا اجمالی ذکر بھی کہیں آجاتا ہے، تو ساتھ ہی یہ صفت بھی ضرور بیان کی جاتی ہے۔ علامہ ذہبی نے عبرفی اخبار من غبر میں ان کا ترجمہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ تاہم اس فقرے کو نہ چھوڑ سکے کہ "کَانَ مِنْ اَذْکِیَاءِ بنی آدم" یعنی اولاد آدم میں جو نہایت ذکی گذرے ہیں، امام ابو حنیفہ ان میں شمار کئے جاتے ہیں۔" مشکل سے مشکل مسئلوں میں ان کا ذہن اس تیزی سے لڑتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اکثر موقعوں پر ان کے ہم عصر جو معلومات کے لحاظ سے ان کے ہم سر تھے موجود ہوتے تھے۔ ان کو اصل مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جو واقعہ درپیش ہوتا تھا اس سے مطابق کر کے فوراً جواب بتا دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا، اور قسم کھا کر کہا "جب تک

تو مجھ سے نہ بولنے گی میں بھی تجھ سے کبھی نہ بولوں گا۔" عورت تند مزاج تھی اس نے بھی قسم کھالی اور وہی الفاظ دھرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ اس وقت تو غصّہ میں کچھ نہ سوجھا۔ مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو بہت افسوس ہوا۔ شوہر امام سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت واقعہ بیان کی۔ سفیان نے کہا "قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ اس میں کوئی چارہ نہیں۔" مایوس ہوکر لوٹا اور امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ للّٰہ آپ کوئی تدبیر بتائیے۔ امام صاحب نے فرمایا۔ جاؤ شوق سے باتیں کرو۔ کسی پر کفارہ نہیں۔ امام سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو نہایت برہم ہوئے اور امام ابوحنیفہ سے جاکر کہا کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتادیا کرتے ہیں۔ امام صاحب نے اس شخص کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم دوبارہ واقعہ کی صورت بیان کر جاؤ۔ اس نے اعادہ کیا۔ امام صاحب سفیان کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ میں نے جو پہلے کہا تھا اب بھی کہتا ہوں۔ سفیان نے کہا کیوں؟ فرمایا "جب عورت نے شوہر کو مخاطب کرکے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہوچکی، پھر قسم کہاں باقی رہی" سفیان نے کہا حقیقت میں آپ کو جو بات وقت پر سوجھ جاتی ہے۔ ہم لوگوں کا وہاں خیال تک نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ اپنے دو بیٹوں کی شادی کی۔ ولیمہ کی دعوت میں تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا۔ مسعر بن کدام حسن بن صالح، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ شریک دعوت تھے۔ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دفعۃً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا اور کہا غضب ہوگیا! لوگوں نے کہا "خیر ہے؟" بولا کہ زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں۔ جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اس کا شوہر نہ تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ سفیان نے کہا امیر معاویہ کے زمانہ میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا۔ البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہوگا۔ مسعر بن کدام حضرت امام ابوحنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے۔

کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ شوہر خود میرے سامنے آئیں تو جواب دوں۔ لوگ جاکر بلا لائے۔ امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات کو جو عورت تمھارے ساتھ رہی، وہی تمھارے نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے۔ دونوں نے کہا ہاں۔ امام صاحب نے کہا تو تم اپنی بی بیوں کو جن سے تمھارا نکاح بندھا تھا طلاق دیدو اور ہر شخص اس عورت سے نکاح پڑھالے جو اس کے ساتھ ہم بستر رہ چکی۔ سفیان نے جو جواب دیا اگرچہ فقہ کی رو سے وہ بھی صحیح تھا۔ کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہ کی ہے جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیش نظر رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح کا قائم رکھنا غیرت وحمیت کے خلاف ہوگا۔ کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کرلیا تو دونوں میں وہ خلوص واتحاد نہ پیدا ہوگا۔ جو تزویج کا مقصود اصلی ہے۔ اس کے مہر کی بھی تخفیف ہے۔ کیونکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں ابوحنیفہ کا ذکر اکثر سنا کرتا تھا اور ان کے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا۔ اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا۔ دیکھا تو بڑا ہجوم ہے۔ ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے اور لوگ اس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں۔ ایک شخص نے بڑھ کر کہا "یا ابا حنیفہ (یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے ان کو پہچانا) امام ابوحنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا "میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے اس کی شادی کردیتا ہوں تو بیوی کو طلاق دیدیتا ہے۔ لونڈی خرید دیتا ہوں تو آزاد کر دیتا ہے۔ فرمایئے کیا تدبیر کروں"۔ امام ابوحنیفہ نے برجستہ کہا کہ "تم اس کو ساتھ لیکر بازار میں جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ۔ جو لونڈی پسند آئے خرید کر اس کا نکاح پڑھادو۔ اب اگر وہ اسے آزاد کرے گا

تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ لونڈی اس کی ملک نہیں۔ طلاق دیگا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ تمہاری لونڈی کہیں گئی نہیں۔ سعد کہتے ہیں کہ مجھ کو جواب پر تو کم مگر حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا۔ امام ابو حنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے۔ ربیع بھی حاضر تھا۔ منصور سے کہا کہ حضور! یہ شخص امیرالمومنین کے جد بزرگوار (عبداللہ بن عباس) کی مخالفت کرتا ہے۔ اُن کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور دو ایک روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا اور قسم کا پورا کرنا کچھ ضرور نہ ہوگا۔ ابو حنیفہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزوِ قسم سمجھا جائے گا۔ ورنہ لغو اور بے اثر ہے۔ امام صاحب نے کہا امیرالمومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں۔ منصور نے کہا کیوں کر؟ امام صاحب نے کہا "ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں گھر پر جا کر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں۔ جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے اور ان پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا۔ منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا کہ تم ابو حنیفہ کو نہ چھیڑا کرو، ان پر تمہارا داؤ نہیں چل سکتا۔" امام صاحب دربار سے نکلے تو ربیع نے کہا "آج تو آپ میری جان ہی لے چکے تھے۔" فرمایا "یہ تو تمہارا ارادہ تھا میں نے صرف مدافعت کی۔"

(ب) ان عام مباحث کے بعد اب ہم ان خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔

ا۔ سب سے مقدم اور قابل قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے۔ وہ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہوتا ہے۔ احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قایم ہو گئے۔ ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام

تعبدی احکام ہیں، یعنی ان میں کوئی سِر اور مصلحت نہیں مثلاً شراب خوری یا فسق و فجور صرف اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور خیرات و زکوٰۃ صرف اس لئے مستحسن ہیں کہ شارع نے ان کی تاکید کی ہے ورنہ فی نفسہ یہ افعال بُرے یا بھلے نہیں ہیں۔ امام شافعی کا اسی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ اور شاید اسی کا اثر تھا کہ ابوالحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں۔ علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں۔ یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اس کے دونوں پہلو بڑے بڑے علماء نے اختیار کئے ہیں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اس قدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا۔ تمام مہات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔ کفار کے مقابلہ میں قرآن کا طرز استدلال عموماً اسی اصول کے مطابق ہے نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی کہ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَر۔ روزہ کی فرضیت کے ساتھ ارشاد ہوا لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ جہاد کی نسبت فرمایا حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ۔ اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جا بجا تصریحیں اور اشارے موجود ہیں کہ ان کی غرض و غایت کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول ان کے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جس قدر اصول عقلی کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں۔ امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے۔ اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو "شرح معانی الآثار" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص و طریق نظر سے ثابت کیا جائے محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے۔ اور اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں

امام ابو حنیفہ کی مخالفت کی ہے لیکن مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال سے ثابت کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب احادیث اور طرقِ نظر دونوں کے موافق ہے۔ امام محمد نے بھی "کتاب الحج" میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں جس کو تفصیل مقصود ہو ان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔ اس دعوی سے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں۔ اور وہ انکار کیوں کرتے ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات بھی جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے۔

امام رازی نے زکوٰۃ کی بحث میں لکھا ہے کہ امام شافعی کا مذہب امام ابو حنیفہ سے زیادہ صحیح ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی کا مذہب عقل و قیاس سے بعید ہے اور یہی اس کی صحت کی دلیل ہے کیونکہ زکوٰۃ کے مسائل زیادہ تر تعبدی احکام ہیں جن میں عقل درا سے کو دخل نہیں۔

بخلاف اور ہم عصروں کے امام ابو حنیفہ کا اس اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب تھا۔ دوسرے ائمہ جنھوں نے فقہ کی تدوین و ترتیب کی ان کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے ہوئی تھی بخلاف اس کے امام ابو حنیفہ کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی۔ جس کی ممارست نے ان کی قوت فکر اور حدت نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا۔ معتزلہ وغیرہ جن سے ان کے معرکے رہتے تھے عقلی اصول کے پابند تھے۔ اس لئے امام صاحب کو بھی ان کے مقابلہ میں انہیں اصول سے کام لینا پڑتا تھا۔ اور متنازع فیہ مسئلوں میں مصالح و اسرار کی خصوصیتیں دکھانی پڑتی تھیں، اس غور اور تدقیق، مشق و مہارت سے ان کو ثابت ہو گیا تھا کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصول عقل کے مطابق ہے۔

علم الکلام کے بعد وہ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان مسائل میں بھی یہی جستجو رہی۔ حنفی فقہ کے مسائل کا دوسری فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے

تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات عبادات میں بھی جس کی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں۔ امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کے موافق معلوم ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کئے گئے ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا چاہئے، تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی اصل غرض کیا ہے؟ (یعنی خضوع، اظہار تعبُّد، اقرار عظمت الٰہی، دُعا) اور اس کے حاصل ہونے میں افعال کو کس نسبت سے دخل ہے۔ ان افعال کے مراتب مختلف ہیں بعض لازمی اور ضروری ہیں کیونکہ ان کے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کو شریعت کی زبان میں فرض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو طریقہ ادا میں ایک حسن و خوبی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت نہیں ہوتی۔ ان افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے۔ اور ان کو سنت و مستحب سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرض و واجب و سنت کی تصریح نہیں فرمائی۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے اس لئے تمام مجتہدین نے ان کے امتیاز پر توجہ کی اور استنباط اجتہاد کی رو سے ان افعال کے مختلف مدارج قائم کئے۔ اور ان کے جدا جدا نام رکھے۔ امام ابو حنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن اس باب میں ان کو اور ائمہ پر جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے جن افعال کو جس رتبہ پر رکھا در حقیقت ان کا وہی رتبہ تھا۔ مثلاً سب سے ضروری امر یہ ہے کہ نماز کے ارکان یعنی وہ افعال جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی، کیا ہیں؟ چونکہ نماز اصل میں اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا نام ہے۔ اس لئے

اس قدر تو سب مجتہدوں کے نزدیک مسلم رہا کہ نیت، تکبیر، قرأت، رکوع، سجود وغیرہ جن سے بڑھ کر اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ فرض اور لازمی ہیں اور خود شارع نے ان کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارے کئے بلکہ بعض جگہ تشریح بھی کی۔ لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی کہ ان ارکان کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دیدیا۔ حالانکہ وہ خصوصیتیں لازمی نہ تھیں۔ اس لئے امام ابو حنیفہ ان کی فرضیت کے قائل نہیں۔ مثلاً امام ابو حنیفہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے سوا اور الفاظ میں بھی ادا ہو سکتی ہے۔ جو اس کے ہم معنی ہیں (مثلاً اللہ اعظم۔ اللہ اجل)۔ امام شافعی کے نزدیک نہیں ہو سکتی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان میں کہی جائے تب بھی جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک قرآن مجید کی کسی آیت کے پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بغیر سورہ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک جو شخص عربی زبان میں قرآن پڑھنے سے معذور ہے وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے[۵]۔ امام شافعی کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز نہیں ہو سکتی۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ امام ابو حنیفہ یا کسی مجتہد نے صرف قیاس سے نماز کے ارکان متعین کئے ہیں۔ ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لئے

---

۵ امام محمد نے "جامع صغیر" میں جو روایت کی ہے اس میں مجبوری کی قید نہیں ہے اور اسی بنا پر مخالفین نے امام صاحب پر یہ سخت اعتراض کیا ہے کہ وہ قرآن کی حقیقت و مفہوم میں الفاظ کو دخل نہیں سمجھتے یعنی ان کے نزدیک صرف قرآن کے معانی پر قرآن کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بے شبہ امام صاحب کی اس غلطی کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن فقہائے حنفیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ امام صاحب نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا۔

عموماً احادیث کی تصریحات واشارات سے استدلال کیا ہے۔ چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔ ہمارا یہ مطلب ہے کہ امام ابو حنیفہ کے دعووں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور اشارے موجود ہیں۔ اسی طرح عقلی وجوہ بھی ان کی صحت کے شاہد ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب شریعت کے اسرار اور مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

(۳) الفاروقؓ، فاروق اعظم حضرت عمر بن خطاب خلیفۂ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت ہے۔ "نامور فرمانروایانِ اسلام" کے سلسلے کی پہلی کتاب تھی، لیکن المامون کے بعد لکھی گئی۔ ۱۸ اگست ۱۸۹۴ء کو علامہ نے مستقل طور پر الفاروق کی تالیف شروع کی اور کشمیر میں ۱۵ جولائی ۱۸۹۸ء کو (بقول علامہ) "پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لئے آرام لیا۔" اس زمانے میں مصنف سخت علیل تھے۔ بیماری اور ضعف کی حالت میں اس کی آخری سطریں لکھیں۔ علامہ کی تمام سیرت کی کتابوں کے دو دو حصے ہیں۔ ایک عام حالات کا دوسرا کمالاتِ خصوصی کا۔ اس میں بھی ایسا ہی ہے۔ پہلے حصّے میں حضرت عمرؓ کی زندگی کے واقعات اور فتوحات ملکی کے حالات، دوسرے میں ملکی انتظامات اور ذاتی کمالات، علامہ لکھتے ہیں کہ "یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی و محنت کا تماشا گاہ ہے۔" اور حقیقت یہ ہے کہ باوجود اعتراضات کے، جن کا ذکر کیا گیا، **الفاروق** ایسی جامع و مکمل کتاب تالیف ہوئی ہے کہ کسی زبان میں اس کا جواب موجود نہ تھا۔ اس کے بعد اردو میں حضرت عمرؓ فاروق کی تین چار ضخیم اور متعدد مختصر سوانحعمریاں لکھی گئیں اور وہ سب علامہ شبلی کی خوشہ چینیاں ہیں۔ ایک دو کتابیں عُلماء نے لکھیں، اور اچھی لکھیں، لیکن تحقیق کا گُر علامہ شبلی ہی کا سکھایا ہوا تھا۔ اسلوب بیان کی خوبی میں کسی کی تصنیف اس کو نہیں پہنچتی۔ خود علامہ

کی ادبیت "الفاروق" میں پہلی سب کتابوں سے بہتر ہے۔

"الفاروق" علی گڈھ کی ملازمت کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی، اور حیدرآباد کی ملازمت میں ختم ہوئی۔ اور "سلسلہ آصفیہ" (قائم کردہ مولوی سید علی بلگرامی بسرپرستی سر وقار الامراء مدار المہام دولت آصفیہ) کی ایک کڑی قرار پائی۔ دونوں حصوں کے نمونے یہ ہیں:۔

(الف) یہ حصہ خاصکر بیانِ رزم میں علامہ کا زورِ قلم دکھانے کے لئے انتخاب کیا گیا ہے۔ عراق عرب کے مشہور شہر قادسیہ پر مسلمانوں نے ایرانیوں سے چند بار جنگ کی اس کا ایک معرکہ یہ تھا:۔

تیسرا معرکہ یوم العماس کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قعقاع نے یہ تدبیر کی کہ رات کے وقت چند رسالوں اور پیدل فوجوں کو حکم دیا کہ پڑاؤ سے دور شام کی طرف نکل جائیں۔ پو پھٹے تو تو سوار میدانِ جنگ کی طرف گھوڑے اُڑاتے ہوئے آئیں اور رسالے اسی طرح برابر آتے جائیں چنانچہ صبح ہوتے ہوتے پہلا رسالہ پہنچا۔ تمام فوج نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور غل پڑ گیا کہ نئی امدادی فوجیں آگئیں۔ ساتھ ہی حملہ ہوا۔ حُسن اتفاق یہ کہ ہشام جن کو ابوعبیدہ نے شام سے مدد کے لئے بھیجا تھا۔ عین موقع پر سات سو سواروں کے ساتھ پہنچ گئے۔ **یزدجرد** کو دم دم کی خبریں پہنچتی تھیں اور برابر فوجیں بھیجتا تھا۔ ہشام نے فوج کی طرف خطاب کیا اور کہا "تمہارے بھائیوں نے شام کو فتح کرلیا۔ فارس کی فتح کا جو خدا کی طرف سے وعدہ ہوا ہے وہ تمہارے ہاتھ سے پورا ہوگا"۔ معمول کے موافق جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ ایرانیوں کی فوج سے ایک پہلوان شیر کی طرح ڈکارتا ہوا میدان میں آیا۔ اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر لوگ اس کے مقابلہ سے جی چراتے تھے لیکن عجیب اتفاق سے وہ ایک کمزور سپاہی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ایرانیوں نے تجربہ اٹھا کر ہاتھیوں کے دائیں بائیں پیدل فوجیں قائم کردی تھیں۔ عمرو معدیکرب نے رفیقوں سے

کہا کہ میں مقابل کے ہاتھی پر حملہ کرتا ہوں تم ساتھ رہنا۔ ورنہ عمرو معدی کرب مارا گیا تو پھر معدی کرب پیدا نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر تلوار میان سے گھسیٹ لی اور ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ لیکن پیدل فوجیں جو دائیں بائیں تھیں دفعتہً ان پر ٹوٹ پڑیں اور اس قدر گرد اٹھی کہ یہ نظر سے چھپ گئے۔ یہ دیکھ کر ان کی رکاب کی فوج حملہ آور ہوئی اور بڑے معرکے کے بعد دشمن پیچھے ہٹے۔ عمرو معدی کرب کا یہ حال تھا کہ تمام جسم خاک سے اٹا ہوا تھا۔ بدن پر جا بجا برچھیوں کے زخم تھے۔ تاہم تلوار قبضے میں تھی اور چلتا جاتا تھا۔ اسی حالت میں ایک ایرانی سوار برابر سے نکلا۔ انھوں نے اس کے گھوڑے کی دُم پکڑ لی۔ ایرانی نے بار بار مہمیز کیا لیکن گھوڑا جگہ سے نہ ہل سکا آخر سوار اُتر کر بھاگ نکلا اور یہ اچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھے۔

سعد نے یہ دیکھ کر ہاتھی جس طرف رُخ کرتے ہیں دَل کا دَل پھٹ جاتا ہے، ضخم و سلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے بلا کر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعد نے قعقاع۔ عاصم۔ حمال۔ ربیل کو بلا کر کہا کہ یہ مہم تمھارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیج دیئے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کر لیں۔ پھر خود برچھا ہاتھ میں لیکر پیل سفید کی طرف بڑھے۔ عاصم بھی ساتھ تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ ہاتھی جھُرجھُری لیکر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔ اِدھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا وہ زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہو لئے اور دم کی دم میں یہ سیاہ بادل بالکل پھٹ گیا۔

اب بہادروں کو حوصلہ آزمائی کا موقع ملا اور اس زور کا رَن پڑا کہ

نعروں کی گرج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اس معرکے کو لیلۃ الہریر کہتے ہیں۔ ایرانیوں نے فوج نئے سرے ترتیب دی۔ قلب میں اور دائیں بائیں تیرہ تیرہ[۱۳] صفیں قائم کیں۔ مسلمانوں نے بھی تمام فوج کو سمیٹ کر یک جا کیا اور آگے پیچھے تین پرے جمائے۔ سب سے آگے سواروں کا رسالہ۔ ان کے بعد پیدل فوجیں اور سب سے پیچھے تیر انداز۔ سعد نے حکم دیا تھا کہ تیسری تکبیر پر حملہ کیا جائے لیکن ایرانیوں نے جب تیر برسانے شروع کئے تو قعقاع سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور اپنے رکاب کی فوج لیکر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ فوجی اصول کے لحاظ سے یہ حرکت نافرمانی میں داخل تھی۔ تاہم لڑائی کا ڈھنگ اور قعقاع کا جوش دیکھ کر سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَانْصُرْہُ یعنی اے خدا قعقاع کو معاف کرنا اور اس کا مددگار رہنا۔ قعقاع کو دیکھکر بنو اسد اور بنو اسد کی دیکھا دیکھی۔ نخع۔ بجیلہ۔ کندہ سب ٹوٹ پڑے۔ سعد ہر قبیلے کے حملے پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اس کو معاف کرنا اور یار و رہنا اول اول سواروں کے رسالے نے حملہ کیا۔ لیکن ایرانی فوجیں جو دیوار کی طرح جمی کھڑی تھیں۔ اس ثابت قدمی سے لڑیں کہ گھوڑے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ دیکھ کر سب گھوڑوں پر سے کود پڑے اور پیادہ حملہ آور ہوئے۔

ایرانیوں کا ایک رسالہ سرتاپا لوہے میں غرق تھا۔ قبیلہ حمیر نے اس پر حملہ کیا۔ لیکن تلواریں زرہوں پر اچٹ اچٹ کر رہ گئیں۔ سردار قبیلہ نے للکارا۔ سب نے کہا زرہوں پر تلواریں کام نہیں دیتیں۔ اس نے غصے میں آ کر ایک ایرانی پر برچھے کا وار کیا کہ کمر کو توڑ کر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر اوروں کو بھی ہمت ہوئی اور اس بہادری سے لڑے کہ رسالہ کا رسالہ برباد ہو گیا۔

تمام رات ہنگامہ کارزار گرم رہا۔ لوگ لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو گئے تھے اور نیند کے خمار میں ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے جاتے تھے۔ اس پر بھی جب فتح

اور شکست کا فیصلہ نہ ہوا تو قعقاع نے سرداران قبائل میں سے چند نامور بہادر انتخاب کئے اور سپہ سالار فوج (رستم) کی طرف رُخ کیا۔ ساتھ ہی قیس اشعث عمرو معدی کرب۔ ابن ذی البردین نے جو اپنے اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ ساتھیوں کو للکارا کہ دیکھو! "یہ لوگ خدا کی راہ میں تم سے آگے نکلنے نہ پائیں"

اور اور سرداروں نے بھی جو بہادری کے ساتھ زبان آور بھی تھے اپنے قبیلوں کے سامنے کھڑے ہو کر اس جوش سے تقریریں کیں کہ تمام لشکر میں اک آگ لگ گئی۔ سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے اور تیر و کمان پھینک کر تلواریں گھسیٹ لیں۔ اس جوش کے ساتھ تمام فوج سیلاب کی طرح بڑھی اور فیرزان و ہرمزان کو دباتے ہوئے رستم کے قریب پہنچ گئی۔ رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چُور ہو گیا تو بھاگ چلا، ہلال نام ایک سپاہی نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آ گئی۔ رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے۔ ساتھ ہی ہلال بھی کود پڑے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔ ہلال نے لاش خچروں کے پاؤں میں ڈال دی اور تخت پر چڑھ کر پکارے کہ "رستم کا میں نے خاتمہ کر دیا" ایرانیوں نے دیکھا کہ سپہ سالار تخت پر نہیں ہے تو تمام فوج میں بھاگڑ مچ گئی۔ مسلمانوں نے دُور تک تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں۔

افسوس کہ اس واقعہ کو ہمارے ملک الشعرا نے قومی جوش کے اثر سے بالکل غلط لکھا ہے۔

برآمد خروشے بکردار رعد ۔۔۔ ز یک سوے رستم ز یک سوے سعد

چو دیدار رستم بخوں تیرہ گشت ۔۔۔ جواں مرد تازی بر و چیرہ گشت

ہمارے شاعر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ سعد اس واقعہ میں سرے سے شریک ہی نہ تھے۔

"ہمارے ملک الشعرا" یعنی فردوسی پر قومی جوش کا نشہ کچھ یہیں نہیں چڑھا، بلکہ ہر ایسے موقع پر چڑھ جاتا ہے جہاں ایرانیوں اور عربوں کا مقابلہ ہو۔ شاہنامہ لکھنے میں فردوسی کو صرف یہ یاد رہتا ہے کہ وہ ایرانی الاصل ہے، یہ بھول جاتا ہے کہ مسلمان ہے۔

علامہ شبلی کے اس بیانِ معرکہ کے ساتھ علامہ آزاد کا وہ بیانِ جنگ پھر پڑھ کر دیکھا جائے جو صفحات ۴۲۹ تا ۴۳۲ پر "دربار اکبری" سے اقتباس کیا گیا ہے۔ آزاد نے بھی اپنے رنگ میں خوب لکھا ہے۔ ان کے استعارے ایک لطف پیدا کر رہے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آزاد "داستان" بیان کر رہے ہیں، اور شبلی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

(ب) حضرت عمرؓ کی حیثیتِ اجتہاد اور محدث و فقیہ ہونا

حدیث و فقہ کا فن درحقیقت تمام تر حضرت عمرؓ کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ صحابہ میں اور لوگ بھی محدث و فقیہ تھے، چنانچہ ان کی تعداد ۲۰ سے متجاوز بیان کی گئی ہے۔ لیکن فن کی ابتدا حضرت عمرؓ سے ہوئی اور فن کے اصول و قواعد اول انہی نے قائم کئے۔

حدیث کے متعلق پہلا کام جو حضرت عمرؓ نے کیا یہ تھا کہ روایتوں کی تفحص و تلاش پر توجہ کی۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں احادیث کے استفسار کا خیال نہیں کیا گیا تھا۔ جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا تھا، خود آنحضرتؐ سے دریافت کر لیتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کسی ایک صحابی کو فقہ کے تمام ابواب کے متعلق حدیثیں محفوظ نہ تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں زیادہ ضرورتیں پیش آئیں۔ اس لئے مختلف صحابہ سے استفسار کرنے کی ضرورت پیش آئی، اور احادیث کے استقرار کا راستہ نکلا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں چونکہ زیادہ کثرت سے واقعات پیش آئے کیونکہ فتوحات کی وسعت اور نومسلموں کی کثرت نے سیکڑوں نئے

مسائل پیدا کر دئے تھے۔ اس لحاظ سے انھوں نے احادیث کی زیادہ تفتیش کی تاکہ یہ مسائل آنحضرتؐ کے اقوال کے موافق طے کئے جائیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی نئی صورت پیش آتی تو حضرت عمرؓ مجمع عام میں جس میں اکثر صحابہ موجود ہوتے تھے، پکار کر کہتے کہ اس مسئلے کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے؟ تکبیر جنازہ، غسل جنابت، جزیہ مجوس، اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں، جن کی نسبت کتب احادیث میں نہایت تفصیل سے مذکور ہے کہ حضرت عمر نے مجمع صحابہ سے استفسار کر کے حدیث نبوی کا پتہ لگا لیا.......

یہ تمام بحث تدوین مسائل کی حیثیت سے تھی۔ لیکن فن فقہ کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصلی کارنامہ اور چیز ہے۔ انھوں نے صرف یہ نہیں کیا کہ جزئیات کی تدوین کی بلکہ مسائل کی تفریع و استنباط کے اصول اور ضوابط قرار دئے جس کو آجکل اصول فقہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ آنحضرت سے جو اقوال و افعال منقول ہیں، وہ کلیۃً مسائل کا ماخذ ہو سکتے ہیں یا ان میں کوئی تفریق ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس بحث پر "حجۃ اللہ البالغہ" میں ایک نہایت مفید مضمون لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔ جو منصب نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی نسبت خدا کا ارشاد ہے کہ مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا، یعنی پیغمبر جو چیز تم کو دے وہ لو، اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو۔ دوسری وہ جن کو منصب رسالت سے تعلق نہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُم بِشَيْءٍ مِن دِينِكُم فَخُذُوا بِهِ وَاِذَا اَمَرْتُكُم بِشَيْءٍ مِن رَأْيِي فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ	یعنی میں آدمی ہوں، اس لئے جب میں دین کی بابت کچھ حکم دوں تو اس کو لو، اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے طب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا جو افعال، آنحضرت سے عادتہً صادر ہوئے نہ عبادۃً یا اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً جو باتیں آنحضرتؐ نے مزعومات عرب کے موافق بیان کیں۔ مثلاً اُمِ زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث، جو باتیں کسی جزئی مصلحت کے موافق اختیار کیں۔ مثلاً لشکر کشی اور اس قسم کے اور بہت سے احکام، یہ سب دوسری قسم میں داخل ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے احادیث کے مراتب میں جو فرق بتایا اور جس سے کوئی صاحب نظر انکار نہیں کر سکتا، اس تفریق مراتب کے موجد دراصل حضرت عمرؓ ہیں۔ کتب سیر اور احادیث میں تم نے اکثر پڑھا ہوگا کہ بہت سے ایسے موقعے پیش آئے کہ جناب رسول اللہ صلعم نے کوئی کام کرنا چاہا کوئی بات ارشاد فرمائی تو حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی، مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرتؐ نے عبداللہ بن اُبی کے جنازے کی نماز پڑھنی چاہی تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ منافق کے جنازے پر نماز پڑھتے ہیں۔ قیدیانِ بدر کے معاملے میں ان کی رائے بالکل آنحضرتؐ کی تجویز سے الگ تھی۔ صلح حدیبیہ میں انھوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس طرح دب کر کیوں صلح کی جائے۔ ان تمام مثالوں سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت عمرؓ ان باتوں کو منصبِ نبوّت سے الگ سمجھتے تھے، ورنہ اگر باوجود اس امر کے علم کے کہ وہ باتیں منصب رسالت سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں دخل دیتے تو بندگی ماننا درکنار، ہم ان کو، اسلام کے دائرے سے بھی باہر سمجھتے۔

اسی فرق مراتب کے اصول پر بہت سی باتوں میں جو مذہب سے تعلق نہیں رکھتی تھیں اپنی رایوں پر عمل کیا مثلاً حضرت ابوبکرؓ کے زمانے تک اُمّہاتِ اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد پیدا ہو جائے برابر خریدی اور بیچی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس کو بالکل روک دیا۔ آنحضرتؐ نے جنگ تبوک میں جزیہ کی تعداد فی کس ایک دینار مقرر کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے مختلف ملکوں میں

مختلف شرحیں مقرر کیں۔ آنحضرتؐ کے عہد میں شراب کی کوئی خاص حد مقرر نہ تھی۔ حضرت عمر نے اسّی کوڑے مقرر کئے۔

یہ ظاہر ہے کہ ان معاملات میں آنحضرت کے اقوال و افعال، اگر شرعی حیثیت سے ہوتے تو حضرت عمر کی کیا مجال تھی کہ ان میں کمی بیشی کر سکتے۔ اور خدانخواستہ وہ کرنا چاہتے تو صحابہ کا گروہ ایک لحظہ کے لئے بھی مسندِ خلافت پر ان کا بیٹھنا کب گوارا کر سکتا تھا۔

حضرت عمر کو اس امتیاز مراتب کی جرأت اس وجہ سے ہوئی کہ آنحضرتؐ کے متعدد احکام میں انھوں نے دخل دیا تو آنحضرت نے اس پر ناپسندیدگی نہیں ظاہر کی، بلکہ متعدد معاملات میں حضرت عمر کی رائے کو اختیار فرمایا اور بعض موقعوں پر تو خود، وحی الٰہی نے حضرت عمر کی رائے کی تائید کی۔ قیدیانِ بدر، حجاب ازواجِ مطہرات، نماز بر جنازہ منافق، ان تمام معاملات میں وحی جو آئی وہ حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق آئی۔

اس تفریق اور امتیاز کی وجہ سے فقہ کے مسائل پر بہت اثر پڑا۔ کیونکہ جن چیزوں میں آنحضرتؐ کے ارشادات، منصبِ رسالت کی حیثیت سے نہ تھے ان میں اس بات کا موقع باقی رہا کہ زمانے اور حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے نئے قوانین وضع کئے جائیں۔ چنانچہ معاملات میں حضرت عمر نے زمانے اور حالات کی ضرورتوں سے بہت بہت نئے نئے قاعدے وضع کئے جو آج حنفی فقہ میں بکثرت موجود ہیں، برخلاف اس کے امام شافعی کو یہاں تک کد ہے کہ ترتیبِ فوج، تعیین شعار، محاصل وغیرہ کے متعلق بھی وہ آنحضرتؐ کے اقوال کو تشریعی قرار دیتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے افعال کی نسبت لکھتے ہیں کہ رسول اللہ کے سامنے کسی کے قول و فعل کی کچھ اصل نہیں۔

(۴) **سفرنامۂ روم و مصر و شام** "الفاروق" کے بعد شائع ہوا۔ یہ کوئی علم و فن کی کتاب نہیں، اس لئے علامہ کی تصانیف میں خاص طور پر قابل ذکر

نہیں ہے۔ لیکن اس حیثیت سے کہ (بقولِ مصنف) "ایک طالب العلمانہ سفر تھا" اور اس نوع کا شاید پہلے ہندوستانی کا سفر تھا، یادگار چیز ہے۔ مصنف دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"علاوہ اُن جزئی دلچسپ واقعات کے جو سلسلۂ بیان میں آگئے ہیں۔ قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس، قاہرہ وغیرہ کے متعلق واقعات ذیل یعنی شہر کی عام اجمالی حالت، قابلِ دید مقامات، مشہور عمارات، سررشتۂ تعلیم، دارالعلوم اور مدارس بورڈنگ اور طلبار کی تربیت، تعلیم نسواں، مصنفین اور تصنیفات، کتب خانے اخبارات اور رسالے، مشہور پاشاؤں اور ارباب کمال کی ملاقات، ترکوں اور عربوں کے اخلاق وعادات کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔"

علامہ شبلی نے رمضان ۱۳۰۹ھ میں ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کو سفر شروع کیا تھا۔ ۶ مہینے میں واپس آئے۔ راستہ میں کچھ دُور تک علی گڈھ کالج کے پروفیسر آرنلڈ رفیق سفر رہے۔ ہم نمونے کے طور پر بجائے کسی عمارت یا دارالعلوم یا کتب خانہ کی سیر کے، تمام کتاب میں جگہ جگہ سے ڈھونڈھ کر صرف وہ باتیں لکھتے ہیں جن کو مصنف نے "جزئی دلچسپ واقعات" قرار دیا ہے، اور جو "سلسلہ بیان میں آگئے ہیں۔"

"چونکہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر پرندجانور ذبح نہیں کئے جاتے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامہ میں تجربہ سے اس کی تصدیق بھی کی ہے۔ میں نے دو تین روز تک پرندے کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا۔ مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے۔ بولے کہ اس جہاز پر پرند جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے۔ چونکہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی، میں خود گیا اور اس کی تصدیق کی۔ ذبح کرنے والا عیسائی تھا۔ وہ ذبح کرنے کے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا۔ صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا۔ اگرچہ حنفیوں کے

یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلہ میں چند دنوں کے لئے میں شافعی بن گیا۔ جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔"

"عدن سے چونکہ دلچسپی کے نئے سامان پیدا ہوگئے تھے، اس لئے ہم بڑے لطف سے سفر کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ کو سخت پریشان رکھا۔ ۱۰ رمئی کی صبح کو میں سوتے سے اُٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے، اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بیکار ہوگیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے! بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے، اور ایسے قابل قدر وقت کو رائیگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔ ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا۔"

پورٹ سعید پر سفر کی حالت میں جو تجدّد ہوا وہ یہ تھا کہ بمبئی سے پورٹ سعید تک جہاز پر کوئی مسلمان نہ تھا۔ یہاں پہنچ کر دو ایک مسلمان نظر آئے اور بیروت میں تو سارا جہاز شامی عربوں سے بھر گیا...... میں بڑے شوق سے ان کے پاس گیا لیکن وہ مطلقاً متوجہ نہوئے۔ جس شخص کے پاس کھڑا ہوا اس نے ایک بار آنکھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن نیچی کر لی۔ مجھکو اس بداخلاقی پر سخت تعجب ہوا۔ دل میں کہتا تھا کہ عربوں کی مہمان نوازی کی یہ کچھ

تعریفیں سنی تھیں! ان کو تو بات چیت میں بھی مضائقہ ہے۔ ان میں مدرسہ حربیہ کے چند طلبا تھے جو رخصت لیکر وطن میں آئے تھے اور اب قسطنطنیہ جا رہے تھے۔ وہ کبھی دل بہلانے کے لئے عربی دیوان پڑھا کرتے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ ہم فنی کے ذریعہ سے تعارف پیدا کروں۔ چنانچہ ان کے پاس گیا اور دخل در معقولات کے طور پر اپنی مولویت اور علمیت جتانی شروع کی۔ وہ اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے۔ میں اپنا سا منہ لیکر چلا آیا لیکن مجھ کو یقین تھا کہ اس واقعہ کا ضرور کوئی سبب ہے۔ اتفاقاً ایک موقع پر ایک شخص نے میرا مذہب پوچھا۔ میں نے کہا "اسلام" بولا لا واللہ اھٰذا طربوش المسلم، یعنی ہرگز نہیں، کہیں مسلمان بھی ایسی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ بدقسمتی سے میرے سر پر ایرانی ٹوپی تھی، اور اس وجہ سے تمام عرب مجکو مجوسی سمجھتے تھے۔ یہ معما جب حل ہوا تو میں نے ان لوگوں کے دل سے اس بدگمانی کو رفع کر دیا۔ اور پھر وہ ایسے شیر و شکر ہوئے کہ ایک دم کو مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔"

"(قسطنطنیہ کا ذکر ہے) ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں۔ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا، اور اتفاق سے رسالہ **اسکات المعتدی**، جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ آہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا' اور انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا شَکَرَ اللّٰہُ مَسَاعِیَہٗ، شیخ علی ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اُٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے۔ مجکو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہِ قبول سے دیکھا، نہایت مسرت ہوئی، اور سفر کی کس مپرسی میں اتنا ذریعۂ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔"

" (قسطنطنیہ کے احباب کا ذکر کرتے ہیں) شام کو ہم تین چار آدمی ایک قہوہ خانے میں جو عین لب دریا ہے، ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور عجب لطف و مزہ کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی کبھی مغرب کے بعد کشتی کرایہ کرتے اور سمندر کی سیر کرتے پھرتے۔ فواد کو گانا آتا ہے۔ مزے میں آکر عربی گیت گایا کرتے۔ ایک دن مجھ سے فرمایش کی کہ کوئی ہندی چیز سناؤ۔ میں نے بہتیرا کہا کہ بھائی میں مونوی آدمی ہوں۔ مجکو گانے سے کیا واسطہ۔ لیکن وہ کب مانتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر میں نے اردو کے دو تین شعر آواز کو گھٹا بڑھا کر پڑھے اور کہا کہ ہندی میں یوں ہی گاتے ہیں۔"

غازی عثمان پاشا کی ملاقات اور تمغۂ[a] مجیدی کا عطا ہونا

یہ وہی نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں چوبیس ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہ تیغ کئے تھے، جس کے مقابلے میں شہنشاہ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کردی تھی، اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا، جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے، روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا، اور میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی، اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں ایک مترجم کو ساتھ لیکر ان کے مکان پر گیا۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلا۔ دربان نے اندر جانے کی اجازت دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھوڑی دیر کے بعد پاشائے موصوف تشریف لائے۔ جن صاحب کو میں نے مترجمی کے لئے ساتھ لیا تھا، سررشتہ تعلیم کے ایک افسر تھے۔ انھوں نے حسب قاعدہ آگے بڑھ کر پاشاے موصوف کے دامن کا کنارہ چوما، اور مودبانہ طور سے پیچھے ہٹے۔ میں نے طریقۂ سنت کے موافق سلام کیا۔ پاشاے موصوف نے سلام کا جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مزاج پرسی

---

[a] اس لفظ کا صحیح املا تمغا ہے۔ علامہ شبلی نے شاید سہواً تمغہ لکھدیا ہے۔ ہم نے اسی طرح رہنے دیا ہے

کے بعد نام اور مقام پوچھا۔ مترجم نے کہا کہ ہندوستان کے علماء میں سے ہیں اور تحقیقات علمی کی غرض سے آئے ہیں۔ یہ سن کر نہایت مہربانی اور توجہ ظاہر کی اور دیر تک مسلمانوں کے حالات پوچھتے رہے۔ رخصت ہوکر میں اٹھا تو خود بھی اٹھے اور کہا آپ دوبارہ تشریف لائیں تو مجکو خوشی ہوگی......

دوسری دفعہ ملاقات کو گیا تو پہلے سے کمرے میں آبیٹھے۔ میں اندر داخل ہوا تو کرسی سے اٹھ کر دو ایک قدم بڑھے اور پہلے دن کی طرح ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد میں جب ان سے ملا تو اسی طریقے سے ملے۔ پاشا ے موصوف مجھ پر نہایت مہربان ہوگئے تھے۔ جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور میں نے ان سے کہا کہ اب میں یہاں دو چار روز کا مہمان ہوں، تو فرمایا کہ ایک دو دن جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ اسی اثنا میں انھوں نے **سلطان** سے میرے لئے **تمغہ مجیدی** عطا ہونے کی درخواست کی اور منظور ہوگئی، لیکن مجکو اس کی کچھ اطلاع نہ تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے مکان میں سو رہا تھا کہ میرے ایک دوست دوڑے ہوئے آئے اور جگاکر کہا کہ یا شبلی واللہ لقد طلع لك النيشان۔ مجکو ایک گونہ تعجب ہوا، اور میں نے کہا یوں ہی کہتے ہو۔ آخر تم کو معلوم کیونکر ہوا؟ بولے کہ تمام اخبارات میں چھپ گیا ہے۔ میں اسی وقت اٹھا اور ایک قرأت خانہ میں جاکر اخبار دیکھے تو واقعی وہ خبر صحیح تھی۔ اسی وقت مجکو خیال پیدا ہوا کہ میں انگریزی رعیت ہوں۔ اس لحاظ سے انگلش سفیر کو اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ دوسرے دن میں سفیر کے پاس گیا۔ اتفاق سے وہ مکان پر نہ تھے۔ میں اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ دوسرے دن تمام احباب مبارکباد کو آئے۔ میں نے ایک مختصر جلسہ دعوت ترتیب دیا۔ شیخ علی ظلیان، عبدالسلام آفندی، فواد، سامی، شریف اور دیگر احباب شریک جلسہ تھے۔ دعوت کی صبح کو عثمان پاشا کی وداعی ملاقات کو گیا۔ تمغہ کی خبر ایسی عام ہوگئی تھی کہ پاشا ے موصوف کے مکان پر پہونچا تو سب سے پہلے دربان نے کہا، "تمغہ مجیدی مبارک" مجکو تعجب ہوا کہ اس کو کیونکر خبر ہوئی معلوم ہو

کہ یہاں اُمرا اور پاشاؤں کے نوکر چاکر عموماً پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اور فرصت کے اوقات میں اخبارات پڑھا کرتے ہیں۔ پاشائے موصوف نے ملاقات کے ساتھ تمغہ کی مبارکباد دی۔ تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ بکس سے نکال کر پہلے انھوں نے آنکھوں سے لگایا، پھر مجکو حوالے کیا۔ میں سروقد کھڑا ہو گیا اور سلطان کو دعا دی۔

تمغائے مجیدی



تمغا کے ساتھ ایک فرمان سلطانی بھی عطا ہوا تھا۔ "شیر پلونا" عثمان پاشا
ا فوٹو بھی اپنے قلم سے تہدیہ لکھکر علامہ کو دیا تھا۔ علامہ شبلی تمغائے مجیدی
استعمال نہ کرسکے اس لئے کہ انگریزی قانون کی رُو سے کسی غیر سلطنت کا
ول یا استعمال کرنا ممنوع تھا۔ سفرنامہ میں بعض دلچسپ واقعات اور بھی ہیں۔

(۵) الغزالی۔ دسمبر ۱۹۰۱ء میں بمقام حیدر آباد لکھ کر ختم کی۔ اور "سلسلۂ آصفیہ" میں چھپی۔ اس کے بھی حسب معمول دو حصے ہیں۔ اس کی وجہ تالیف خود علامہ بیان کرتے ہیں:—

علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایۂ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت بسوط تاریخ لکھ رہا ہوں، اور اس کے چار حصے قرار دئیے ہیں:— (۱) علم کلام کی ابتدا، اس کی مختلف شاخیں، عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔ (۲) علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا، اور کس حد تک کامیابی حاصل کی۔ (۳) ائمہ کلام کی سوانح عمریاں (۴) جدید علم کلام۔

پہلا حصہ بقدر معتدبہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ رک گیا، اور تیسرا حصہ شروع ہو گیا۔ اس حصے میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی۔ چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار باقی یہ حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔ امام صاحب کے حالات میں ان کے اصول عقائد اور طرز استدلال کی تفصیل بھی ہے، اس طرح علم کلام کے اکثر مہتم بالشان مسائل بھی اس کتاب میں آ گئے ہیں۔

امام غزالی کی ۷۸ تصنیفات اور ان کے موضوع اور عظمت شان بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:—

امام صاحب نے یوں تو بہت سے علوم و فنون میں کتابیں لکھیں، لیکن تخصیص کے ساتھ جن علوم کو ترقی دی، وہ فقہ، اصول فقہ، کلام اور اخلاق ہیں۔۔۔۔

اس لحاظ سے اگرچہ ہمارا فرض تھا کہ ہم امام صاحب کی اُن ایجادات اور استنباطات کو بہ تفصیل لکھتے جو ان علوم میں ان سے یادگار ہیں۔ لیکن ہمارے ناظرین کو شافعی فقہ اور اصول فقہ سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہم امام صاحب کے ان علمی کارناموں کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو علم کلام اور علم اخلاق کے متعلق ان سے

ظہور میں آئے۔ ملک کا مذاق اور ملک کی حالت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ فلسفہ آمیز علوم کے مسائل قوم کے سامنے پیش کئے جائیں۔

چنانچہ حصہ دوم میں سے اخلاق اور کلام کے متعلق دو اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:۔

(الف) احیاء العلوم کو جن خصوصیتوں نے تمام قدیم و جدید تصنیفات سے ممتاز کردیا ہے۔ ہم ان کو بترتیب لکھتے ہیں۔

(۱) بڑی خصوصیت جس نے عام و خاص، عارف و جاہل، سب میں اسے مقبول بنادیا ہے۔ یہ ہے کہ حکمت و موعظت دونوں کو ساتھ ساتھ بنا ہا ہے۔ تحریر و تقریر کا سب سے مشکل پہلو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں مختلف طبیعتوں کے آدمیوں سے خطاب کرنا پڑتا ہے۔ واعظ اپنی جادو بیانی سے ایک جم غفیر کو وجد میں لا سکتا ہے۔ لیکن حکیمانہ طبیعت کا آدمی اس سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے ایک حکیم جب معارف و حقائق پر تقریر کرتا ہے تو عوام پر اس کا جادو نہیں چلتا۔ احیاء العلوم میں یہ خاص کرامت ہے کہ جس مضمون کو ادا کیا ہے باوجود سہل پسندی، عام فہمی اور دلاویزی سے فلسفہ و حکمت کے معیار سے کہیں اترنے نہیں پایا۔ یہی بات ہے کہ امام رازی سے لیکر ہمارے زمانہ کے سطحی واعظ تک اس سے یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔

(۲) امام صاحب کے زمانہ تک یہ دستور تھا کہ فلسفہ اور متعلقات فلسفہ پر جس قدر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ عموماً پیچیدہ اور دقیق عبارت میں لکھی جاتی تھیں، اور بوعلی سینا نے تو فلسفہ کو گویا طلسم بنا دیا تھا اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ فلسفہ کے مسائل خود دقیق ہوتے تھے۔ کچھ یہ کہ یونانیوں کے زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ فلسفہ کو عام فہم نہ کرنا چاہئے، کچھ یہ کہ اکثر لوگ یہ قابلیت ہی نہ رکھتے تھے کہ پیچیدہ مطالب کو آسان عبارت میں ادا کر سکیں۔ فلسفہ کے اور اقسام کی بہ نسبت فلسفۂ اخلاق آسان اور سریع الفہم ہے۔ تاہم اخلاق پر جو بھی کتابیں لکھی گئی تھیں مثلاً کتاب الطہارت لابن مسکویہ اشکال سے

خالی نہ تھیں۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفۂ اخلاق کے مسائل اس طرح ادا کئے کہ دقیق سے دقیق نکتے افسانہ اور لطائف بن گئے۔ ایک ہی مضمون کو کتاب الطہارت اور احیاء العلوم دونوں میں دیکھو کتاب الطہارۃ میں غور وفکر اور خوض سے کام لینا پڑے گا اور باوجود اس کے زیادہ سے زیادہ ہوگا کہ کتاب کا مطلب تمھاری سمجھ میں آجائے۔ احیاء العلوم میں یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ تم کوئی علمی کتاب پڑھ رہے ہو۔ تم قصہ کی طرح پڑھتے چلے جاؤ گے اور مضمون کی نسبت صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اس کو سمجھ جاؤ، بلکہ دل پر اس کی کیفیت طاری ہوگی اور تم سراپا اثر میں ڈوب جاؤ گے۔

(۳) اخلاق کی تعلیم میں ایک بہت بڑی غلطی ہمیشہ یہ ہوتی آئی ہے کہ اختلاف طبائع و امزجہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ کسی بانی مذہب کے نزدیک اگر تجرد اور ترکِ اختلاط پسندیدہ ہے تو وہ چاہے گا کہ تمام عالم تارک الدنیا ہو جائے۔ دوسرے کے نزدیک اگر حسن معاشرت اور فیض رسانی عام زیادہ مفید ہے تو اس کی خواہش ہوگی کہ سب اسی قالب میں ڈھل جائیں۔ لیکن چونکہ انسانی طبیعتیں مختلف ہیں اس لئے اس قسم کی یک طرفہ تعلیم کا اثر خاص طبائع تک محدود رہ کر باقی ہزاروں آدمیوں کے حق میں بیکار ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کو سب سے پہلے امام صاحب نے سمجھا۔ ان کے اصول کے مطابق اخلاق کی تعلیم، اختلاف طبائع کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ جس شخص کا مزاج قدرتی طور سے معاشرت پسند واقع ہوا ہے۔ اس کو ہرگز تجرد اور ترک تعلقات کی تعلیم نہیں کرنی چاہئے، بلکہ معاشرت کے وہ اصول اور قواعد بتانے چاہئیں جس کے ذریعہ سے اس سے وہ نیکیاں ظہور میں آئیں جو معاشرت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً صلۂ رحم، حاجت روائی خلق، ہدایت عام۔ اسی طرح جس کا مزاج تجرد پسند ہے اس کو ہرگز معاشرت کی ہدایت نہیں کرنی چاہئے، بلکہ گوشہ گیری اور ترک تعلقات کے ایسے اصول سکھلانے

چاہئیں جن سے وہ اعتدال سے تجاوز نہونے پائے۔

(۴) امام صاحب نے معاشرت اور اخلاق کی بنیاد اگرچہ تمام تر مذہب پر رکھی ہے اور اسی وجہ سے ہر عنوان کی ابتدا میں روایات شرعیہ سے استنباط کرتے ہیں۔ لیکن اس نکتہ کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے کہ شارع کے کون سے افعال رسالت کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کون سے معاشرت اور عادت کی حیثیت سے۔ آداب طعام پر جو مستقل مضمون لکھا ہے اس میں جہاں کھانا کھانے کے قاعدے لکھے ہیں۔ ایک قاعدہ یہ لکھا ہے کہ کھانا دسترخوان پر چن کر کھانا چاہئے، میز یا صندلی پر رکھ کر کھانا نہ چاہئے۔ اس کی سند میں حضرت انسؓ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی صندلی پر رکھ کر نہیں کھایا۔ پھر قدمائے سلف کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ دو چار چیزیں بدعت ہیں جو آنحضرتؐ کے بعد ایجاد ہوئیں۔ کھانے کی میز یا صندلیاں۔ اشنان۔ پیٹ بھر کھانا۔ ان اقوال کے بعد لکھتے ہیں کہ دسترخوان پر کھانا اچھا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میز یا صندلی پر کھانا مکروہ یا حرام ہے۔ کیونکہ اس قسم کا کوئی حکم شریعت میں وارد نہیں۔ باقی یہ امر کہ یہ چیزیں آنحضرتؐ کے بعد ایجاد ہوئیں۔ تو یہ کوئی کلیہ نہیں کہ ہر ایجاد بدعت ہے۔ بدعت ناجائز صرف وہ ہے جو کسی سنت کے مخالف ہو۔ یا جس سے شریعت کا کوئی حکم باوجود بقائے علت کے باطل ہو جائے۔ ورنہ حالات کے اقتضا کے موافق بعض ایجادات مستحب اور پسندیدہ ہیں۔ صندلی پر کھانے میں صرف یہ بات ہے کہ کھانا زمین سے ذرا اونچا ہو جاتا ہے اور کھانے میں آسانی ہوتی ہے اور یہ کوئی ممنوع امر نہیں۔ جن چار چیزوں کو بدعت کہا گیا ہے، سب یکساں نہیں ہیں۔ اشنان (ایک گھانس کا نام ہے) سے جو صابن کے بجائے ہاتھ دھونے کے وقت استعمال کی جاتی تھی۔ ہاتھ دھونا تو اور اچھی بات ہے۔ کیونکہ اس میں صفائی اور نفاست ہے۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں تو اور صفائی ہے۔ اگلے زمانے میں اگر اس کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس زمانہ میں

اس کا رواج نہ تھا۔ یا دو میسر نہ آتی ہوگی۔ یا وہ لوگ ایسی مہمات میں مشغول تھے جو صفائی پر مقدم تھے۔ یہاں تک کہ وہ ہاتھ بھی نہیں دھوتے تھے اور تلوؤں میں ہاتھ پونچھ لیا کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہاتھ دھونا مستحب نہیں۔

یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ امام صاحب نے معاشرت کے جو آداب لکھے ہیں وہ ایشیائی طریقہ کی بہ نسبت زیادہ تر مہذب ممالک کے طریقہ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کھانے کے آداب میں لکھتے ہیں۔ کھانا کسی اونچی چیز پر (عربی میں اس کو خوان کہتے ہیں) کھانا چاہئے۔ کھانے باری باری سے آنے چاہئیں۔ کھانے کے بعد میوے یا کوئی شیرینی آنی چاہئے۔ اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ تمام کھانوں کے نام پرچہ پر لکھ کر مہمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کارڈ آف ٹیبل کا طریقہ یورپ نے یہیں سے سیکھا ہے۔

(ب) امام صاحب کا خاص علم کلام (الٰہیات)

خدا کے اثبات پر امام صاحب نے کوئی نئی دلیل نہیں قائم کی۔ ان کے نزدیک یہ مسئلہ نہایت واضح و صاف ہے۔ متکلمین جو استدلال کرتے آتے تھے کہ عالم حادث ہے اور حادث خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی کچھ علت ہوگی اور وہی خدا ہے۔ امام صاحب اسی استدلال کو کافی سمجھتے ہیں۔

صفات باری تنزیہ و تشبیہ

اس بحث کے متعلق جو نزاعیں تھیں اگرچہ درحقیقت لفظی تھیں۔ یعنی جو لوگ تشبیہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً خدا عرش پر ہے۔ آسمان پر اُتر کر آتا ہے۔ وہ بھی حقیقت میں تنزیہ کے قائل تھے۔ تاہم دونوں فرقے ایک دوسرے کے ہم وزن نہ ہوتے تھے۔ اور اختلاف کا پردہ درمیان سے نہ اُٹھتا تھا۔ امام صاحب نے اس بحث پر ایک مستقل رسالہ الجام العوام کے نام سے لکھا ہے جس نے بہت کچھ

اس اختلاف کو کم کر دیا اور تقریباً دونوں ڈانڈے ملا دیئے۔ اس کے بعض نکتے یہاں درج کرنے کے قابل ہیں۔ تنزیہ کے متعلق بڑی کھٹک یہ تھی کہ اگر اسلام کا مقصد محض تنزیہ اور تجرید تھا، تو قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے تشبیہ کے الفاظ کیوں آئے، قیامت کے دن خدا فرشتوں کے جھرمٹ آئے گا۔ آٹھ فرشتے اس کا تخت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دوزخ کی تسکین کے لئے خدا اپنی ران دوزخ میں ڈالدے گا۔ اس قسم کی بیسیوں باتیں ہیں۔ جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں وارد ہیں۔ جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ انسان نے اپنے خیال کے پیمانے کے موافق خدا کی ذات و صفات ٹھہرالئے ہیں۔ امام صاحب نے اس عقدے کو اس طرح حل کیا کہ بے شبہ قرآن و حدیث میں اس قسم کے الفاظ موجود ہیں لیکن یکجا نہیں ہیں بلکہ جستہ جستہ متفرق مقامات پر ہیں، اور چونکہ تنزیہ کے مسئلے کو شارع نے نہایت کثرت سے بار بار بیان کر کے دلوں میں جانشین کر دیا تھا۔ اس لئے تشبیہ کے الفاظ سے حقیقی تشبیہ کا خیال نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ کعبہ خدا کا گھر ہے۔ اس سے کسی شخص کو یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ خدا درحقیقت کعبہ میں سکونت رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن کی آیتوں سے بھی جن میں عرش کو خدا کا مستقر کہا ہے خدا کے استقرا، علی العرش کا خیال نہیں آ سکتا۔ کسی کو آئے تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ اس نے تنزیہ کی آیتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کو جب استعمال فرماتے تھے تو انہی لوگوں کے سامنے فرماتے تھے جن کے ذہن میں تنزیہ تقدیس خوب جاگزیں ہو چکی تھی۔

اس جواب پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شارع نے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا کہ خدا نہ متصل ہے نہ منفصل۔ نہ جوہر ہے نہ عرض، نہ عالم میں ہے نہ عالم سے باہر۔ اس قسم کی تصریحات موجود ہوتیں۔ تو کسی کو سرے سے تشبیہ کا خیال ہی نہ آ سکتا۔ امام صاحب نے اس شبہ کو یوں رفع کیا کہ

اس قسم کی تقدیس عام لوگوں کے خیال میں نہیں آسکتی تھی۔ عام لوگوں کے نزدیک کسی چیز کی نسبت یہ کہنا کہ وہ عالم میں ہے نہ عالم سے باہر، گویا یہ کہنا ہے کہ وہ شے سرے سے موجود ہی نہیں۔ بے شبہ خواص کے ذہن میں یہ تقدیس آسکتی ہے۔ لیکن شارع کو تمام عالم کی اصلاح مقصود تھی، جن میں بڑا حصہ عوام ہی کا تھا۔

لطیفہ | علامہ ابن تیمیہ بظاہر تشبیہ کے قائل تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اس عقیدہ کی رو سے خدا کا ممکن الوجود ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ خدا واجب الوجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے عقیدہ کے موافق خدا موجود تو ہوگا گو ممکن الوجود سہی تمہارے اعتقاد کے موافق تو وہ ممکن بھی نہیں رہتا۔ بلکہ ناممکن اور محال بن جاتا ہے۔ کیونکہ ایسی شے جو ہر جگہ ہو اور کہیں نہ ہو، عالم سے خارج بھی ہو اور عالم میں بھی نہ ہو، نہ متصل ہو نہ منفصل، نہ ذو مکاں ہو نہ ذو جہۃ، سرے سے ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ ارتفاع النقیضین ہے اور ارتفاع النقیضین محال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اور جس قدر مذاہب ہیں، سب میں خدا کو بالکل انسانی اوصاف کے ساتھ مانا گیا ہے۔ توراۃ میں یہاں تک ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک رات ایک پہلوان سے کشتی لڑے اور اس کو زیر کیا، چنانچہ پہلوان کی ران کو صدمہ بھی پہنچا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ وہ پہلوان خود خدا تھا۔ اسلام چونکہ دنیا کے تمام مذاہب سے اعلیٰ و اکمل ہے اس کا خدا انسانی اوصاف سے بالکل بری ہے۔ قرآن مجید میں ہے لیس کمثلہ شیئٌ۔ لَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا۔ جہاں کہیں اس کے خلاف تشبیہ کے الفاظ پائے جاتے ہیں وہ حقیقت میں مجازات اور استعارات ہیں۔

(۶) **علم الکلام**، جس ضخیم کتاب زیر تالیف کا اوپر ذکر آیا ہے اس کا یہ "علم کلام" پہلا حصہ ہے۔ اس میں علامہ شبلی نے مختصر طور پر "علم کلام" کی تاریخ بیان کی ہے کہ یہ علم کیوں ایجاد ہوا، اس کا بانی اوّل کون تھا، پھر کیا کیا ایجادیں ہوئیں، علمائے کلام کون کون تھے، انھوں نے کیا کیا، اس علم سے کیا فائدہ ہوا۔

علامہ کی یہ کتاب بھی اردو میں اپنی نوعیت کی "نئی اور پہلی" ہے۔ لیکن اب اردو داں طبقے کو اس علم کے ساتھ کم سے کم دلچسپی ہے۔ اس لئے مختصر اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

علم کلام کا یہ احسان ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس کی بدولت یونانیوں کی غلامی سے آزادی ملی۔ یونانی فلسفہ نے دنیا میں اس قدر رواج و قبول حاصل کیا تھا کہ ان کے مسائل وحی کی طرح تسلیم کئے جاتے تھے، مسلمانوں نے بھی ان کے فلسفہ کو اسی نگاہ سے دیکھا۔ اور ارسطو و افلاطون کو علم کا دیوتا سمجھے۔ فارابی سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو ارسطو سے کیا نسبت ہے، اس نے جواب دیا کہ میں اگر ارسطو کے زمانہ میں ہوتا تو اس کا ایک لائق شاگرد ہوتا۔ بوعلی سینا نے "شفا" میں ایک ضمنی موقع پر لکھا ہے کہ اتنا مدید زمانہ گذر چکا لیکن ارسطو کی تحقیقات پر ایک ذرہ بھر اضافہ نہ ہو سکا۔

یونانیوں کی یہ حلقہ بگوشی اس وقت تک قائم رہی جب تک علمائے کلام نے فلسفہ کو نکتہ چینی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ سب سے پہلے نظام نے ارسطو کی "کتاب الطبائع" کا رد لکھا۔ پھر جبائی نے ارسطو کی کتاب "کون و فساد" کے رد میں ایک کتاب لکھی۔ اس مذاق کو برابر ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ امام غزالی نے "تہافۃ الفلاسفہ" لکھی۔ اور ابوالبرکات نے کتاب "المعتبر" میں فلسفہ کے بہت مسائل کی غلطی ثابت کی۔ امام رازی نے اس پر ایک دفتر کا دفتر تیار کر دیا۔ علامہ ابن تیمیہ نے خاص فلسفہ کی رد میں چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ یہ تصنیفات اگرچہ جس غرض کے لئے لکھی گئی تھیں (یعنی علم کلام) اس سے تو ان کو کچھ علاقہ نہ تھا لیکن اس کی بدولت فلسفہ کا رعب دلوں سے اٹھ گیا۔ اہل نظر فلسفہ کی تنقید پر آمادہ ہو گئے اور سیکڑوں مسائل کی غلطیاں کھل گئیں۔

اکثر یورپین مصنفوں نے لکھا ہے کہ مسلمان عموماً ارسطو کی کورانہ تقلید کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک زبان دراز نے لکھا ہے کہ مسلمان، ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے

ان کوتاہ نظروں کو چاہئے کہ وہ فارابی اور ابن سینا کے بجائے ابوالبرکات، امام غزالی، امام رازی، آمدی اور ابن تیمیہ کی تصنیفات پڑھیں، فلسفہ تو فلسفہ مسلمانوں نے تو یونانی، منطق کی بھی غلطیاں ثابت کیں جن کی غلطی کا احتمال بھی کبھی کسی کو پیدا نہیں ہو سکتا تھا........

علم کلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب وغریب چیز، دولت عباسیہ کی آزادی اور آزاد پسندی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہی چیز ہے جس نے علم کلام کو اس رتبہ پر پہونچایا۔ ورنہ اگر ان بزرگوں کی ہدایت پر عمل کیا جاتا، جو ہر موقع پر السّوال بِدْعَتہٌ سے کام لیتے تھے تو آج علم کلام کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا۔ یہ اسی آزادی کا اثر تھا کہ ایک ہی صدی کے اندر، گوناگوں خیالات کا سیلاب سا آگیا، جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا، اور جس کی بدولت بیسیوں نئے نئے فرقے قائم ہوتے جاتے تھے۔ یہ فرقے اگرچہ اعتقادات میں باہم مختلف تھے۔ تاہم ہر فرقہ کو عام آزادی حاصل تھی۔ ہر فرقہ جس طرح اور جس تدبیر سے اپنے اعتقادات اور خیالات کو پھیلانا چاہتا تھا، پھیلا سکتا تھا......

عباسیہ کے دربار میں پارسی، مانوی، یہودی، عیسائی، ہر فرقہ اور ہر ملت کے علما موجود تھے۔ دربار ہی میں مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ اکثر اوقات خلیفۂ وقت خود مناظرہ کا ایک فریق ہوتا تھا۔ باوجود اس کے، لوگ نہایت آزادی بیباکی اور دلیری سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے، اور اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے کہ خلیفہ کا کیا مذہب اور کیا اعتقادات ہیں۔

علم کلام نے اگرچہ بارہ سو[12] برس کی عمر پائی، لیکن کمال کے رتبہ تک نہ پہنچ سکا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کو سخت مخالفت سے سامنا ہوا، تمام مُحدّثین بلکہ ائمۂ مجتہدین (بجز امام ابوحنیفہ کے) اس کے دشمن بن گئے۔ دولت عباسیہ کی حمایت کی بدولت وہ برباد ہونے سے بچ گیا، لیکن مقبول عام نہ ہو سکا۔ جو محدود فرقہ اس کا طرف دار تھا، اور اس کو ترقی دینا چاہتا تھا، وہ اعتزال کے نام سے

بدنام تھا۔ اہل سنت و جماعت، مدت کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن وہ فلسفہ و عقلیات سے آشنا نہ تھے۔ کیونکہ اس گروہ میں اب تک فلسفہ تو فلسفہ، منطق کا سیکھنا بھی ناجائز تھا۔ امام غزالی نے جرأت کر کے منطق کو مذہبی گروہ میں روشناس کیا۔ اتنے تعلق سے فلسفہ کو بھی اس بزم میں باریابی ہوئی۔ فلسفہ اور عقلیات کی آمیزش سے علم کلام نے ایک دوسرا قالب اختیار کرنا شروع کیا تھا اور امام رازی و آمدی جیسے لوگ پیدا ہونے شروع ہوئے تھے کہ دفعۃً تاتار کی طرف سے اس زور کی آندھی اُٹھی کہ اسلام کا تمام دفتر پراگندہ ہوگیا۔ مشرق نے تو سنبھالا ہی نہیں لیا، شام و روم میں ملکی طاقت سنبھل گئی۔ لیکن وہاں کی خاکِ مشرق کے سے دل و دماغ کہاں پیدا کرسکتی تھی۔ اشاعرہ کی فرسودہ عمارت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ متاخرین اسی پر ردّے رکھتے گئے۔ وہی عمارت آج پرستش گاہ عالم بن گئی ہے۔ امام غزالی اور ابن رشد نے جو میناکاریاں اور جواہر نگاریاں کی تھیں اس کی کسی کو خبر بھی نہیں۔

(۷) الکلام، یہ اُس مجوزہ کتاب کا چوتھا حصہ تھا، لیکن چونکہ وہ تصنیف تجویز کے مطابق مکمل نہ ہوسکی، اس لئے علم الکلام حصہ اول رہا، یہ الکلام حصہ دوم ہوا۔ اس میں "جدید علم کلام" بیان کیا گیا ہے۔

اب سے بارہ[۱۲۰۰] سو برس پہلے اس فن کی ایجاد کا سبب یہ تھا کہ مسلمان فلسفۂ یونانی پڑھ کر عقائدِ اسلامی سے برگشتہ ہوتے جاتے تھے۔ ان کی حقیقت بیان کرنے اور حقائیت ثابت کرنے کے لئے یہ علم نکالا گیا۔ یہ ضرورت ہمارے زمانے میں پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ آج کل گمراہی کے دوگونہ اسباب پیدا ہوگئے ہیں۔ ایک یہ کہ بددینی وراثت بنتی جاتی ہے۔ اس زمانے کے اکثر نوجوان سائنس داں اور ماہر فلسفہ اس لئے مذہب سے بے تعلق ہیں کہ خود ان کے بزرگ، جن کی مثالیں ان کے سامنے ہیں، اسلامی عقائد میں راسخ اور اعمال کے پابند نہیں ہیں۔ آگے اپنی اولاد کے سامنے یہ خود نمونہ ہوں گے۔

دوسرے اپنے ملک اور بیرونِ ملک سے مادّیت اور انکارِ خدا اور بے سودیِ مذہب کی صدائیں ان کے کان میں آ رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں کہ (بالفاظِ علامہ شبلی) "روح[۵] مادّہ ہی کی ایک قوت کا نام ہے، جو اعصاب سے پیدا ہوتی ہے" (ڈاکٹر شفلر) "روح ایک قسم کی میکانکل حرکت ہے" (ویرشو) "انسان صرف مادّہ کا ایک نتیجہ ہے" (بوشنر) "زندگی فطرت کا کوئی اصلی قاعدہ نہیں، بلکہ ایک اتفاقی استثنا ہے جو مادّہ کے عام اصولوں کے مخالف ہے" (دوزنشیہ)۔ ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا کا وجود ہی نہیں، دوسرا کہتا ہے کہ ہے تو سہی، لیکن ظالم ہے۔

یورپ و امریکہ کا تو یہ حال ہے۔ جاپان ان سے کچھ کم نہیں ہے۔ سر راس مسعود مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) نے اپنی تالیف "نظم و نسق جاپان" میں لکھا ہے کہ انھوں نے جاپان کے وزیر اعظم سے جاپان کے مذہبی رجحانات کے متعلق سوال کیا۔ وزیر اعظم نے جواب دیا کہ "ہم خدا کو اپنے ملک میں نہیں گھسنے دیتے"۔ ہندوستان میں پنڈت جواہر لال نہرو فرماتے ہیں کہ سارا فساد خدا کا ہے، اس کا نکال دو۔ منشی پریم چند معاد اور حیاتِ ثانی کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے کہ مجھے مرنے کے بعد کچھ فکر نہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک عرصہ ہوا کسی مسلمان پروفیسر کے متعلق لکھا تھا (مجھے نام یاد نہیں رہا) کہ وہ عمر بھر خدا کے منکر اور مذہب سے بے نیاز رہے۔ خواجہ صاحب سے خاص تعلق تھا۔ جب شملہ پر مرنے لگے تو خدا یاد آیا اور تار دیکر خواجہ صاحب کو دہلی سے بلایا (بقول اکبر الہ آبادی) "خدائی بزورِ موت" ماننی پڑی۔

قلب و روح کی یہ تباہیاں اور مذہب کی یہ بربادیاں دیکھ کر علامہ شبلی نے چاہا تھا کہ "الکلام" لکھ کر نوجوانوں کے لئے موافقت فلسفہ و مذہب کی راہ نکالیں۔ کتاب کے شروع میں انھوں نے اس "جنگ زرگری" کی صلح کے اصول بتائے ہیں، اسی کے مختلف حصّے نقل کئے جاتے ہیں:۔

---

۵ یہ سب اقتباسات "الکلام" سے لئے گئے ہیں۔

علوم جدیدہ اور مذہب

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا، جس میں طبیعات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد الطبیعات، سب کچھ شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصّے کر دئے، جو مسائل مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے، ان کو سائنس کا لقب دیا۔ جو مسائل تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے، ان کا نام فلسفہ رکھا

مسائل جدیدہ کی نسبت یہ عام خیال جو پھیلا ہوا ہے کہ وہ قطعی اور یقینی ہیں اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں وہ صرف سائنس کے مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ان کی نسبت طبقۂ علماء میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ لیکن فلسفہ کی یہ حالت نہیں ہے۔ یورپ میں آج فلسفہ کے بیسیوں اسکول ہیں، اور ان میں شدّت سے اختلاف ہے اگر ان سب کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک ہی چیز سفید بھی ہو سکتی ہے اور سیاہ بھی۔

اب دیکھنا چاہئے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہے سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے، مذہب کو ان سے مطلق سروکار نہیں۔ عناصر کس قدر ہیں؟ پانی کن چیزوں سے مرکب ہے؟ ہوا کا کیا وزن ہے؟ نُور کی کیا رفتار ہے؟ زمین کے کس قدر طبقات ہیں؟ یہ اور اس قسم کے مسائل، سائنس کے مسائل ہیں، مذہب کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔

مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے وہ یہ ہیں۔ خدا موجود ہے یا نہیں؟ مرنے کے بعد اور کسی قسم زندگی ہے یا نہیں؟ خیر و شر یا نیکی و بدی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ ثواب و عقاب ہے یا نہیں؟ ان میں سے کون سی چیز ہے جس کو سائنس ہاتھ لگا سکتا ہے؟ سائنس کے اساتذہ نے جب

کہا ہے تو یہ کہا ہے کہ ہم کو ان چیزوں کا علم نہیں یا یہ کہ یہ چیزیں مشاہدہ اور تجربہ کے احاطہ سے باہر ہیں، یا یہ کہ ہم ان باتوں کا یقین نہیں کرتے کیونکہ ہم صرف ان باتوں کا یقین کرتے ہیں جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو سکتی ہیں، کوتاہ نظر عدم علم سے علم عدم سمجھ جاتے ہیں۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ ہم کو یہ چیزیں معلوم نہیں کوتاہ بین اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ہم کو ان چیزوں کا نہ ہونا معلوم ہے۔ حالانکہ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔.......

خلط مبحث اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سائنس اور مذہب دونوں میں کوئی اپنی حد سے بڑھ کر دوسرے کی حد میں قدم رکھتا ہے اور یہی خلط مبحث تھا جس نے ملاحدہ اور منکرین مذہب کے خیال کو قوت دی بلکہ درحقیقت اسی خلطِ مبحث نے الحاد اور بیدینی کے خیالات پیدا کر دئے۔ یورپ میں پہلے مذہب کو اس قدر وسیع کر دیا گیا تھا کہ کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب کی دست اندازی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ خاص اس مقصد کی غرض سے اسپین میں مجلسِ انکویزیشن (محکمۂ احتساب عقائد) قائم ہوئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جو لوگ مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہوں ان کی تحقیقات کرے اور ان پر کفر اور ارتداد کا الزام لگائے۔ چنانچہ اٹھارہ برس میں یعنی ۱۴۸۱ء سے لیکر ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس آدمی، ارتداد کے الزام میں زندہ آگ میں جلا دئے گئے۔ اس مجلس نے ابتدائے قیام سے اخیر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر و ملحد قرار دیا جن میں سے کئی لاکھ آگ میں جلا دئے گئے۔

جس قسم کی باتوں پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا کوپرنیکس نے نظام بطلیموس سے انکار کرکے یہ ثابت کیا کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔ اس پر مجلس انکویزیشن نے فتوے نافذ کئے کہ یہ رائے کتاب مقدس کی مخالف ہے اور اس بنا پر کوپرنیکس

مرتد اور کافر ہے۔

گلیلو نے جو دوربین کا موجد گزرا ہے، ایک کتاب کوپرنیکس کی حمایت میں لکھی جس میں ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اس پر مجلس انکویزیشن نے فتویٰ دیا کہ وہ مستوجب سزا ہے چنانچہ اس کو گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا اور یہ حکم دیا گیا کہ وہ اس مسئلہ سے انکار کرے۔ لیکن جب وہ اپنے عقیدہ پر ثابت قدم رہا تو قیدخانہ بھیج دیا گیا۔ اور دس سال محبوس رہا۔

کولمبس نے جب کسی نئے جزیرہ کے دریافت کرنے کی امید پر سفر کرنا چاہا تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب کے خلاف ہے۔

زمین کے کُروی ہونے کا خیال جب اول ظاہر کیا گیا تو پادریوں نے سخت مخالفت کی کہ یہ اعتقاد، کتابِ مقدس کے خلاف ہے۔

غرض ہر قسم کے علمی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے تاہم چونکہ علمی ترقی کا اٹھان تھا ان کی کوششیں بیکار گئیں۔ اور علوم و فنون تکفیر ہی کے سایہ میں پھولے اور پھلے۔

پادریوں کے تعصبات اور وہم پرستی اگرچہ علم کو دبا نہ سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں ہی کے خیالات اور اوہام کو مذہب سمجھا اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے ان کی رائے قائم ہوگئی کہ مذہب جس چیز کا نام ہے وہ علم اور حقیقت کے خلاف ہے یہی ابتدائی خیال ہے جس کی آواز بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے۔

بے شبہ اگر مذہب اسی چیز کا نام ہے تو سائنس کے مقابلہ میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن اسلام نے پہلے دن کہہ دیا تھا کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سائنس اور تمام علوم جدیدہ اسی دنیا سے متعلق ہیں معاد اور آخرت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں۔

اس موقع پر یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ اسلام میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے اور ان میں اس قدر اختلاف رہا کہ ایک نے دوسرے کی تکفیر کی۔ یہ تکفیر بڑے بڑے مسائل پر محدود نہ تھی بلکہ نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتا تھا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن علمی تحقیقات اور اکتشافات کی بنا پر کبھی کسی شخص کی تکفیر نہیں کی گئی۔

قدمائے مفسرین کا خیال تھا کہ پانی آسمان سے آتا ہے یعنی آسمان پر ایک دریا ہے، بادل اس سے پانی لیتے ہیں اور برساتے ہیں، آفتاب، پانی کے ایک چشمہ میں غروب ہوتا ہے۔ زمین مسطح ہے کروی نہیں ہے۔ ستارے جو ٹوٹتے ہیں شیاطین کے شعلہ ہائے آتشیں ہیں۔ مفسرین ان تمام باتوں کو قرآن کے نصوص سے ثابت سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام رازی نے مفسرین قدیم کے یہ تمام اقوال تفسیر کبیر میں نقل کئے ہیں۔

لیکن جب عباسیوں کا علمی دور آیا اور فلسفہ اور طبیعیات نے ترقی کی تو لوگوں نے ان خیالات کی مخالفت کی۔ باوجود اس کے خود مفسرین کے گروہ میں سے ایک شخص نے بھی ان لوگوں کو کافر اور منکر قرآن نہیں کہا۔ معتزلہ کو محدثین اس بنا پر کافر کہتے ہیں کہ وہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں لیکن اس بنا پر کوئی ان کو کافر نہیں کہتا کہ وہ جادو کی حقیقت سے منکر ہیں۔ غرض جس حد تک تحقیق و تفتیش کی جاتی ہے عموماً یہ ثابت ہوگا کہ مسلمانوں نے علمی تحقیقات اور ایجادات کو کبھی مذہب کا حریف مقابل نہیں سمجھا۔ بلکہ محققین نے صاف تشریح کردی کہ اسباب کائنات اور مسائل ہیئت وغیرہ نبوت کی سرحد سے بالکل الگ ہیں اور انبیاء کو تہذیب اخلاق کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں۔

(۸) **سوانح مولانا روم**، علامہ شبلی اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں:-

سلسلہ کلامیہ کا یہ چوتھا نمبر ہے۔ تین حصے (علم الکلام، الکلام، الغزالی) پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ

فقر و تصوّف ہے، اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں ان کو داخل کرنا، اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا، لوگوں کو موجب تعجب ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دلنشیں ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔

یہ علامہ کی بڑی نادر جدت ہے اور وسعت فکر و نظر کا نتیجہ کہ مولانا روم کو "اہل کلام" اور "مثنوی مولوی معنوی کو "تصانیف علم کلام" میں شامل کیا ہے۔ "مثنوی کے علم کلام" سے بحث کرتے وقت علمائے علم کلام کی تصانیف کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ان تمام تصنیفات کے پڑھنے سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غلط کو صحیح، دن کو رات، زمین کو آسمان ثابت کر سکتے ہیں، لیکن ایک مسئلہ میں بھی یقین اور تشفّی کی کیفیت نہیں پیدا کر سکتے، بخلاف اس کے مولانا روم جس طریقہ سے استدلال کرتے ہیں، وہ دل میں اتر کر جاتا ہے، اور گو وہ شک و شبہات کے تیر باراں کو کلیۃً نہیں روک سکتا، تاہم طالب حق کو اطمینان کا حصار ہاتھ آ جاتا ہے، جس کی پناہ میں وہ اعتراضات کے تیر باراں کی پروا نہیں کرتا۔ نمونے کے طور پر ایک ایسا ہی مختصر سا مقام پیش کیا جاتا ہے:۔

معجزہ دلیل نبوّت ہے یا نہیں | اوپر گذر چکا کہ مولانا کے نزدیک نبوت کی تصدیق کے لئے معجزہ شرط نہیں۔

جس کے دل میں ایمان کا مزہ ہوتا ہے، پیغمبر کی صورت اور اس کی باتیں اس کے حق میں معجزہ کا کام دیتی ہیں۔

در دلِ ہر کس کہ از دانش مزہ است　　روے و آوازِ پیمبر معجزہ است

لیکن مولانا نے اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ صاف صاف تصریح کی کہ معجزہ

ایمان کا سبب نہیں ہوتا۔ اور اس سے ایمان پیدا بھی ہوتا ہے تو جبری ایمان پیدا ہوتا ہے، نہ ذوقی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

موجب ایماں نباشد معجزات بوے جنسیت کند جذب صفات	معجزات ایمان کا سبب نہیں ہوتے جنسیت کی بو صفات کو جذب کرتی ہے
معجزات از بہر قہر دشمن است بوے جنسیت سوے دل بردن است	معجزات اس لئے ہوتے ہیں کہ دشمن دب جائیں لیکن جنسیت کی بو اس غرض کے لئے ہے کہ دل تک پہنچ جائے۔
قہر گردد دشمن اما دوست نے دوست کے گردد بہ بستہ گردنے	دشمن دب جاتا ہے، لیکن دوست نہیں ہوتا وہ شخص بھلا کیا دوست ہوگا جو گردن پکڑ کر لایا گیا ہے۔

مولانا نے اس بحث میں ایک اور دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

معجزہ سے نبوت پر جو استدلال کیا جاتا ہے اس کی منطقی ترتیب یہ ہوتی ہے:۔

اس شخص سے یہ فعل (معجزہ) صادر ہوا ہے،
اور جس شخص سے یہ فعل صادر ہو وہ پیغمبر ہے،
اس لئے یہ شخص پیغمبر ہے؛

اس صورت میں پیغمبر کا اثر بالذات خارجی چیز پر ہوتا ہے، مثلاً دریا کا پھٹ جانا، سنگریزوں کا بولنا وغیرہ وغیرہ۔ اس اثر سے پھر بواسطہ قلب پر اثر پڑتا ہے۔ یعنی آدمی اس بنا پر ایمان لاتا ہے کہ جب اس شخص نے دریا کو شق کر دیا تو ضرور پیغمبر ہے۔

لیکن بجائے اس کے کہ معجزہ کسی پتھر یا دریا، یا جمادات پر اثر کرے

یہ زیادہ آسان ہے کہ پہلے ہیل دل ہی پر اثر کرے۔ غداجب یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر پر لوگ ایمان لائیں تو یہ زیادہ آسان اور زیادہ دل نشیں طریقہ ہے کہ بجائے جمادات کے خود لوگوں کے دلوں کو متاثر کر دے کہ وہ ایمان قبول کریں اور یہی اصلی معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:۔

معجزہ کاں بر جمادے کرد اثر　　یا عصایا بحر یا شق القمر
گر اثر بر جاں زند بے واسطہ　　متصل گردد بہ پنہاں رابطہ
بر جمادات آں اثر عاریہ است　　آں پئے روحِ خوش متواریہ است
تا ازاں جامد اثر گیرد ضمیر　　حبذا ناں بے ہیولائے خمیر
بر زند از جانِ کامل معجزات　　بر ضمیرِ جانِ طالب چوں حیات

اخیر شعر میں معجزہ کی اصلی حقیقت بتائی ہے، یعنی پیغمبر کا روحانی اثر خود طالب کی روح پر پڑتا ہے۔ کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اصل میں مولانا کی مثنوی علم کلام کی نہیں، بلکہ تصوّف کی کتاب ہے۔ مولانا صوفی تھے اور صوفی بھی زاہد و مجاہد، مجذوب و مستغرق۔ انھوں نے "علمِ ظاہر" کی کتابوں کو آگ لگانے کے بعد مثنوی لکھی ہے۔ اس نے ان کو مثنوی میں "کلام" کیا، قرآن و حدیث کی تعلیم سے بھی بحث نہیں۔ صرف تصوّف سے تعلق ہے۔ اسی کے مسائل، مسائل کی طرح نہیں، بلکہ واردات قلبی کے طور پر بیان کئے ہیں۔ اسی لئے مثنوی میں شاعری نہیں، بلکہ الہام ہے۔ اور اسی لئے نظامی نے یہ کہا ہے:۔

مثنویِ مولویِ معنوی　　ہست قرآں در زبانِ پہلوی
من چہ گویم وصفِ آں عالیجناب　　نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

لیکن اس میں شک نہیں کہ مثنوی شریف کے اندر "علم کلام" بھی ہے۔ "متکلمین" کے بیان میں نہیں، "کتبِ کلامیہ" کی زبان میں نہیں، بلکہ عارفِ حقائق کے طرز میں، کاشفِ اسرار کے اسلوب میں، صاحبِ وجد و حال کے طور پر، قطبِ ارشاد کے انداز سے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مثنوی فتنۂ تاتار کے زہر کا

تریاق بن کر وجود میں آئی تھی۔ ۶۵۶ھ ہجری میں چنگیز کے پوتے ہلاکو نے خلیفہ مستعصم باللہ کو ہلاک، خلافت عباسیہ کو تباہ، بغداد کو برباد کیا۔ اور ۶۷۲ھ میں مولانا روم نے وفات پائی۔ ان درمیانی سولہ سال میں مثنوی تصنیف ہوئی۔ تاتاریوں کے مظالم مولانا روم نے دیکھے تھے۔ ان کے نتائج و عواقب مولانا کے سامنے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال، فکر و نظر، قلب و روح کی جڑیں ہل گئی تھیں۔ اضطراب طاری تھا، اضطرار کی کیفیت تھی۔ دنیا نظروں میں تاریک تھی، سکون و قرار مفقود تھا۔ ایسے طوفان میں اگر کوئی کشتی وقار اور اطمینان کے ساتھ تیرتی ہے تو وہ اولیاء اللہ کا قلب ہے۔ اگر کہیں روحانی تسکین ملتی ہے تو اولیاء اللہ کی صحبت میں۔

اسکے ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس فتنہ تاتار سے پہلے فتنہ اعتزال ظہور میں آچکا تھا۔ متکلمین کا گروہ پیدا ہو چکا تھا اور اسلامی عقائد و اعمال کی عقلی توجیہات میں نزاع و جدال کا ہنگامہ برپا رہ چکا تھا۔ مولانا روم اس مرحلے سے بھی گذر چکے تھے۔ ان کے دل پر ان تمام حالات کا اثر تھا۔ اب جو انھوں نے مثنوی لکھنی شروع کی تو اس میں زخم تاتار کا بھی مرہم تھا، امراض روحانی کی بھی تشفی تھی اور اضطراب یقین و ایمان کی بھی تسلی۔ چنانچہ مثنوی کا یہ اثر فوراً ظاہر ہونے لگا۔ تصنیف ہوتے ہی مقبول ہو گئی۔ اور دلچسپ بات ہے کہ جب جب کوئی فتنہ پیدا ہوا مثنوی کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔ اور اسکی نئی نئی شرحیں وجود میں آگئیں۔ تیمور کے حملے، اکبر و جہانگیر کی بے دینی، نادر شاہ کی غارت گری نے مسلمانوں کے قلب و روح کو مضطر و مضطرب کیا اور مثنوی نے اپنے پیام سے تسکین بخشی۔

اسی وجہ سے مثنوی کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں لیکن سب میں طریقت حقیقت، معرفت کے نکات کی توضیح تھی۔ اسلئے کہ شارحین کے عہد میں

اسی کی ضرورت تھی لیکن علامہ شبلی نے جس زمانہ میں "سوانح مولانا روم" لکھے، سرسید نے علم کلام کے مسائل چھیڑ رکھے تھے اور اسلامی عقائد کی عقلی و کلامی توجیہ و تاویل شروع کردی تھی۔ شبلی سرسید کی صحبت میں رہ چکے تھے اور انکے ساتھ کام کر چکے تھے۔ وہیں سے علم کلام کا ذوق لیکر آئے تھے اسلئے "الغزالی" کے بعد جب نظر دوڑائی تو ایک متکلم صوفی بھی نظر آئے۔ چنانچہ مثنوی میں سے علم کلام کے مسائل اخذ کرکے دکھانے کی غرض سے ہی شبلی نے یہ کتاب لکھی۔ اسی لئے مثنوی کے تصوف سے زیادہ مثنوی کے کلام پر ہمت صرف کی بہر حال یہ "دریافت" علامہ کی فضیلت پر دال ہے۔

(۹) موازنہ انیس و دبیر۔ یہ بھی حیدر آباد میں لکھی گئی اور "سلسلہ آصفیہ" میں شائع ہوئی۔ علامہ شبلی نے جتنی کتابیں لکھیں، عرب و ایران کی تاریخ، مشاہیر، اور علم و ادب کے متعلق لکھیں۔ صرف یہ "موازنہ" ہندوستان اور اردو زبان سے متعلق ہے۔ بظاہر "علمائے کلام" اور "شعرائے عجم" کے درمیان میں "انیس و دبیر" کے آجانے کا کوئی قرینہ نہ تھا۔ لیکن حسن اتفاق سے اس زمانے میں علامہ شبلی حیدر آباد میں مقیم تھے۔ وہاں تعزیہ داری اور مرثیہ خوانی کا ہمیشہ سے بڑا اہتمام ہے۔ علامہ کے دوران قیام میں لکھنؤ کے مشاہیر مرثیہ، مرزا اوج (خلف مرزا دبیر)، میر نفیس، عارف، رشید حیدر آباد آئے، بڑی دھوم کی مجلسیں ہوئیں، بڑے زور کے مرثیے پڑھے گئے۔ ان کو دیکھ کر اور سُن کر علامہ شبلی کو بھی "موازنہ انیس و دبیر" کا خیال آیا۔ لیکن اس طرح کی تصنیف کی تجویز بہت پہلے سے ان کے ذہن میں تھی۔

"موازنہ" کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب لکھی گئی ہے جو بعد کو شائع ہوئی۔ یعنی مولوی امجد علی اشہری کی "حیات انیس" اشہری صاحب اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں جس سال مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے مشہور بانی سرسید احمد خاں بہادر کا انتقال ہوا، راقم کو نواب محسن الملک بہادر کی خدمت

میں علی گڈھ جانے کا اتفاق ہوا۔ جو سر سید کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ اس کوٹھی کے عالی شان کمرے میں سرسید کا کتب خانہ علامہ شبلی صاحب نعمانی کے سپرد تھا۔ میں اکثر جی بہلانے کو وہاں جا بیٹھتا۔ ایک روز علامہ شبلی نے مجھ سے کہا کہ اردو میں میر انیس کا درجہ ایسا ہے جیسے فارسی میں فردوسی کا درجہ ...... مگر تعجب ہے کہ ان کے حالات زندگی پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اگر تم سے ہو سکے تو یہ کام کرنے کا ہے۔ میں بھی کچھ مدد دوں گا۔"

(دیباچہ حیات انیس صہ ۲۔۱)

اثری صاحب نے اپنی تالیف کے متعلق ایک طویل نظم لکھ کر رسالہ مخزن لاہور میں چھپوائی تھی جس میں میر انیس کے جاننے والوں سے کتاب کے لئے مواد مہیا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس نظم میں بھی علامہ شبلی کی فرمائش کا حوالہ دیا ہے:-

کہا یہ مجھ سے مکرر جناب شبلی نے کہ میں انیس کی لائف لکھوں برسم کبار

اس کے بعد اثری صاحب لکھتے ہیں:-

اس پر بھی بجز وعدۂ فرصت کسی صاحب نے کچھ نہ لکھا..... مولانا شبلی صاحب نے کچھ مدد دینے کا وعدہ کیا تھا وہ خود "موازنہ انیس و دبیر" لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ شبلی علی گڈھ سے مستعفی ہو کر حیدرآباد آ گئے تھے۔ یہاں انھوں نے بجائے اثری صاحب کو مدد دینے کے خود "موازنہ" لکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اردو اور مرثیہ دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ علامہ کو اس طرف توجہ ہوئی۔ ان کے ذہن رسا اور دقت نظر نے کلام انیس کا جیسا تجزیہ و تبصرہ کیا ہے جو نکتے نکالے ہیں، جو موازنے کئے ہیں، وہ دوسرے سے مشکل تھے۔ اثری صاحب نے اپنی "حیات انیس" پہلے لکھنی شروع کر دی اور "موازنہ" کے شائع ہونے سے پہلے تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ لیکن "حیات" سے پہلے "موازنہ" چھپ گیا تو اثری صاحب نے جہاں مولانا حالی، علامہ آزاد، مولوی امداد امام اثر کی رائیں

کلام انیس کے متعلق لکھیں، علامہ شبلی کی رائے پیش کرنے کے لئے "موازنہ" سے بھی ۱۲ صفحے نقل کئے۔ ان صفحات میں علامہ شبلی کے وہ فقرے بھی ہیں جن میں مرزا دبیر کے متعلق لکھا ہے کہ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بلاغت نام کو نہیں۔ اس پر اثہری صاحب نے یہ نوٹ لکھا ہے:۔

"میر انیس اور مرزا دبیر کے مقابلے کی بحث ان چند سطروں پر تمام نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے دونوں صاحبوں کے مجامع تصنیفات پر نظر کرنا اور بات بات کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھنا اور دکھلانا ہوگا۔"

یہ بحث اعتراضات کے سلسلے میں آچکی ہے۔ "موازنہ" کی خوبیوں کے مقابلے میں ان چند اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں۔ علامہ شبلی کی یہ تصنیف بھی اردو میں اپنی نوعیت کی **پہلی** اور **بہترین** ہے۔ دو ایک نمونے یہ ہیں:۔

(الف) **فصاحت** کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر الاستعمال ہو، اس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں سپید و سیاہ کا فرق ہے۔ میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔

مثلاً جہاں حضرت شہر بانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے، شہر بانو کی زبان سے فرماتے ہیں، "ہے ہے کدھر گئے دیور، مرے دیور، مرے دیور" ایک اور جگہ فرماتے، "ناڑہ تو ان کی سالگرہ کا نکال لا۔"

ابتذال کی صاف اور بیّن مثال **نظیر** اکبرآبادی کا کلام ہے۔ اگر یہ ممیّز نہ ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص

الفاظ ہیں، لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ان کی انتہا درجہ کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبّہ نہیں آنے پاتا۔

کلام کی فصاحت ۔ یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی۔ لیکن کلام کی فصاحت میں صرف الفاظ کا فصیح ہونا کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے انکی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ قرآن مجید میں ہے، مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ۔ فواد اور قلب دو ہم معنی الفاظ ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ لیکن اگر اس آیت میں فواد کی جگہ قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجائے خود فصیح ہے، لیکن ما قبل اور ما بعد کے جو الفاظ ہیں، ان کی آواز کا تناسب، قلب کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔

میر انیس کا مصرع ہے "فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور"۔ صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں، اور دونوں فصیح ہیں۔ میر انیس نے جا بجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے، اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرع میں **صحرا** کے بجائے **جنگل** کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ میر صاحب کا ایک شعر ہے،

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں ۔۔۔ جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرع پھس پھسا ہو جاتا ہے۔

شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح ہیں، لیکن میر صاحب کے اس شعر میں

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا　　تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائیگی۔

لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے، اس مصرعہ میں ع

"شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے"

شبنم کے بجائے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

---

۵ علامہ شبلی کا یہ نکتہ اصولاً صحیح ہے کہ تناسب آواز اور ے کے الفاظ کو ترتیب دینے سے لطافت اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن میر انیس کا یہ شعر اسکی درست مثال نہیں ہے۔ بلاشبہ (اوس) اور (اور) کی آواز میں تناسب ہیں، اس لئے اوس کا لفظ شبنم سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اصل میں اوس کا لفظ اس تناسب کی خاطر نہیں لایا گیا۔ بلکہ محاورے کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ "اوس کھانا" محاورہ ہے۔ "شبنم کھانا" نہیں ہے۔ "کھا کھا کے" لکھنا تھا تو لامحالہ "اوس" ہی لکھا جاتا۔ "شبنم" نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ البتہ میر انیس کا کمال ہے کہ الفاظ کو اس طرح مرتب کیا کہ محاورے کی صحت کے ساتھ آواز کا تناسب بھی پیدا ہو گیا اور مصرع میں لطافت اور شیرینی اور روانی آگئی۔

دوسری مثال میں شبنم کی جگہ اوس کا لفظ وزن میں نہیں سماتا۔ اس لئے اس کے لانے نہ لانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آ سکتا تب بھی کوئی عدم تناسب پیدا نہ ہوتا، اس مصرع کے الفاظ کو "شبنم" یا "اوس" کسی سے کوئی خاص تناسب نہیں ہے۔ مثلاً اگر کہیں:-

"رکھ دے گی اوس بھر کے کٹورے گلاب کے"

تو اوس کا لفظ مطلقاً غیر تناسب نہیں معلوم ہوتا، ہاں اگر اس طرح کہیں:-

"بھر دے گی اوس آج کٹورے گلاب کے"

تو اگرچہ (شبنم) اور (اوس) دونوں اس مصرع میں موزوں رہتے ہیں، لیکن (اوس) فصیح تر معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اسکی آواز (آج) کی آواز سے تناسب رکھتی ہے۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے، اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے، ان آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو، ورنہ گویا دو مخالف سروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُروں کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود دلکش اور دلاویز ہے، لیکن اگر دو مخالف سُروں کو باہم ترکیب دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔ راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا گر یہی ہے کہ جن سُروں سے اس کی ترکیب ہو ان میں نہایت تناسب اور توازن ہو۔

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صَوت اور سُر ہیں، اس لئے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب گرد و پیش کے الفاظ بھی لَے میں ان کے مناسب ہوں۔

کتاب کے آخر میں انیس و دبیر کے متحد المضمون اشعار کا موازنہ کیا ہے، اس کی مثال یہ ہے:۔

(ب) دبیر:۔

دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کے مانند تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کے مانند

انیس:۔ چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر

میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہے۔ ان الفاظ سے "کانپتے تھے"، جو تصویر خیال میں کھچ جاتی ہے، وہ رعشہ کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک چلنے کی قید نہ مذکور ہو، پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی میں کانپتے ہیں۔ اس کے ساتھ چونکہ "چلنے" کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے، اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہے، اس لئے اس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا نہایت لطیف

حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اس کے، مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا، اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

دبیر۔ چلاّئے ہات مل کے جلاجل کہ الاماں

انیس۔ ہوگیا جوڑ کے ہاتوں کو جلاجل خاموش

جلاجل کے دونوں حصے جو بجانے میں مل جاتے ہیں اس کی تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلاجل چلاّ کر الاماں کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلاّنے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے گو تشبیہ صحیح ہے، لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اس قدر غالب ہوا کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چُپ ہوگیا۔ رُعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے، اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصے جب مل جاتے ہیں تو پھر جب تک جُدا نہوں، آواز نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چُپ ہوگیا۔

(۱۰) **شعر العجم**۔ فارسی شاعری اور شاعروں کا ضخیم تذکرہ ہے۔ ۵ جلدیں ہیں اور گیارہ سو سے زیادہ صفحے۔ آغاز تصنیف کا مادۂ تاریخ "**تاریخ عجم**" (۱۳۲۴ھ) ہے، اور اختتامِ تصنیف کی تاریخ "**تذکرہ**" (۱۳۲۵) ہے۔ یعنی ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا۔ علاّمہ سید سلیمان ندوی حصۂ پنجم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"شعر العجم کا تخیّل مولانا کے دل میں ایک مدت سے موجود تھا، ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں ان کو اس موضوع کا خیال آیا۔"

لیکن علاّمہ شبلی نے حصۂ اول کا جو دیباچہ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال اس سے بھی بہت پہلے کا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"شعرا کے تذکرے بہت ہیں۔ لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں، جن میں شعرا کے عمدہ اشعار انتخاب کرکے لکھ دئے ہیں۔ شعراء کے حالات اور واقعات کم

اور نہایت کم ہیں۔ اور شاعری کے عہد بعہد کے انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں۔ میں اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا۔ مئی ۱۸۹۲ء میں میرے معزز دوست اور استاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمنی کے ایک پروفیسر جیمس ڈار مسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں اس زمانے میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق سے کتاب منگوائی۔ لیکن وہ ۸۰ صفحوں کا ایک رسالہ تھا، جس میں شعرا کے نہایت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی، جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی۔ لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے، جس میں ژند، پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے، اور اسلام کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے۔ شاعری کی تاریخ سے اس کو لگاؤ نہیں۔"

علامہ اس کے آگے "شعر العجم" کے آغاز تصنیف کا ذکر کرتے ہیں:-

۷ مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا، لیکن بیچ بیچ میں "موازنۂ انیس" اور "الندوہ" سدراہ ہوتے رہے...... یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دورِ اول کا پہلا حصّہ انجام پذیر ہوا۔

باقی حصّوں کی تالیف و اشاعت کے متعلق سید سلیمان ندوی صاحب حصّہ پنجم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"۱۹۰۸ء میں شعر العجم کی پہلی جلد زیر طبع تھی، دوسری اور تیسری زیر تصنیف۔ ۱۹۰۹ء کے آخر میں دوسری، اور ۱۹۱۰ء میں تیسری جلد شائع ہوئی۔"

علامہ نے جنوری ۱۹۱۲ء کے "الندوہ" میں یہ نوٹ لکھا تھا:-

"شعر العجم کا چوتھا حصّہ زیر تالیف ہے، لیکن وہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کے دو حصے کر دینے پڑے۔ ایک حصّہ مطبع میں جا چکا ہے اور چھپ رہا ہے، لیکن دوسرے کو میں نے روک لیا کہ اب مجکو سب سے مقدم اور مہتم بالشان

کام یعنی **سیرۃ نبوی** کی تالیف میں مصروف ہونا چاہئے۔ اگر یہ کام انجام پا گیا تو شعر العجم ہوتی رہے گی، اس کی کیا جلدی ہے"؟

سید سلیمان صاحب اس نوٹ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:۔

اب یہی" اوراق منوعہ" چھ برس کے بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہو رہے ہیں۔ اور اس طرح سمجھنا چاہئے کہ شریعت حسن و عشق کے یہ پانچوں صحیفے تقریباً ۱۳ برس کے عرصے میں بتدریج تکمیل کو پہونچے .... پانچویں حصہ کی تصنیف سے درحقیقت مولانا مرحوم بتمامہ فارغ نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے مسودات ان کی نظر ثانی کے محتاج تھے .... تاہم یہی مناسب سمجھا گیا کہ ان موتیوں کی لڑی میں پوت نہ ملایا جائے۔ چنانچہ فصول و ابواب کی ترتیب کے علاوہ اصل متن میں کسی قسم کی مداخلت جائز نہیں رکھی گئی ہے۔ مولانا اپنی ہر تصنیف بار بار کی حک و اصلاح، تکرار نظر اور کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے۔ اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ بے ساختگی کے ساتھ اول دہلہ میں ان کے دماغ سے کیا خیالات اور ان کے قلم سے کیا الفاظ نکلتے تھے۔

اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اختتام تصنیف کی تاریخ، **تذکرہ** (جس میں ۱۳۲۵ھ ہجری نکلتے ہیں) بطور تفاول و پیشین گوئی پہلے سے نکال لی ہوگی، ورنہ ۱۳۳۱ھ تک مرتب ہوتی رہی۔ اس لئے اختتام کا مادہ **"تاریخ ادب عجم"** (۱۳۳۱ھ) ہو سکتا ہے۔

شعر العجم حصہ اوّل کے آغاز میں علامہ نے فارسی شاعری کے آغاز کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور سب سے قدیم اشعار لکھے ہیں۔ علامہ اس حصہ تاریخ کو کچھ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کا اصل مقصود تنقید شاعری تھا اور ضمناً تاریخ شاعری۔ اس لئے انھوں نے آغاز شاعری کے متعلق ذاتی تحقیق نہیں کی۔ بلکہ مجمع الفصحاء، تذکرۂ دولت شاہ وغیرہ کی مفروضہ "سفینہ بہ سفینہ" روایات کو سرسری طور پر بیان کر دیا۔ لیکن اس میں علامہ شبلی تنہا قابل الزام نہیں ہیں۔

ان کا تو یہ مقصود اصلی ہی نہ تھا۔ پروفیسر براؤن وغیرہ مستشرقین یورپ جن کا کام ہی کرید اور چھان بین ہے، ان کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہو سکی۔

ایران والوں نے "کتاب الوزراء"، "تاریخ سیستان" وغیرہ کے حوالے سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ رضازادہ شفق نے "تاریخ ادبیات ایران" میں ثابت کیا ہے کہ عہد اسلام میں فارسی شاعری کی بنیاد حکومت بنی امیّہ کے ابتدائی زمانے میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ یزید بن معاویہؓ کے عہد حکومت (۶۰ھ تا ۶۴ھ / ۶۷۹ء تا ۶۸۳ء) میں یزید بن مفرّغ نے زیاد کی ماں سُمیّہ پر ان موزوں فقروں میں طعن کیا تھا:۔

آبست نبیذ است عصارات زبیب است سُمیّہ روسپیذ است

اس کے بعد دوسری صدی ہجری کے آغاز (یعنی ۱۰۸ھ / ۷۲۶ء میں جب اسد بن عبداللہ القصاری الختلانی نے خاقان کے ہاتھ سے شکست کھائی تو خراسان کے بچوں نے ان موزوں الفاظ میں اس کا مذاق اڑایا:۔

از ختلان آمدیہ برو تباہ آمدیہ
آبار باز آمدیہ خشک نزار آمدیہ

پھر ابوالینبغی عباس بن ترخان جو جعفر برمکی اور فضل برمکی (وزرائے خلیفہ ہارون رشید) کا درباری شاعر (۱۸۷ھ / ۸۰۲ء میں) تھا، اس نے شہر سمرقند سے متعلق یہ شعر کہے تھے:۔

سمرقند کند مند بزینت کے افگند
از شاش نہ بہی خشک نزار آمدیہ

"شعر العجم" کی پہلی تین جلدوں میں فارسی شاعری کی ابتدا یعنی شعرائے طاہریہ (تیسری صدی ہجری اور نویں صدی عیسوی) سے شعرائے شاہجہانی (گیارھویں صدی ہجری اور سترھویں صدی عیسوی) تک کا تذکرہ ہے۔ لیکن دوسرے تذکروں کی طرح تمام شاعروں کا احاطہ نہیں کیا، بلکہ صرف ۴۲ شاعر چن کر ان کے تذکرہ و تبصرہ کو تین جلدوں کے ۷۴۸ صفحوں پر پھیلایا ہے۔ لبعض ممتاز شعراء پر ساٹھ ساٹھ،

ستر ستر صفحے لکھے ہیں۔ فردوسی پر پہلی جلد میں ۵۰ صفحے لکھے ہیں، اور پھر شاہنامہ پر چوتھی جلد میں ۷۰ صفحے۔ گویا پانچ جلدوں میں سے تقریباً ایک جلد اکیلے فردوسی پر ہے۔ حقیقت میں تذکرہ لکھنے کا یہی حق تھا۔ اور یہ تذکرے اس کے مقابلے میں (بقول علامہ) "بیاض اشعار" ہیں۔ علامہ کے حُسنِ انتخاب اور خوبی نقد و نظر کو قدیم و جدید کوئی تذکرہ نہیں پہنچتا۔ چوتھی جلد میں شاعری کی حقیقت اور فارسی شاعری کے محاسن و معائب سے بحث کی ہے آخری جلد میں جن میں مضامین شاعری کے مختلف اصناف عشق و حُسن، اخلاق، فلسفہ، تصوّف، مدح و ثنا پر ریویو کیا ہے، فنِ تنقید میں ایجاد نو ہے۔ اس کی نظیر فارسی لٹریچر میں موجود نہ تھی۔ چنانچہ طہران میں آقائے محمد تقی فخر داعی گیلانی نے "فارسی جدید" میں ان کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

شعرالعجم کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ جن شاعروں کا اس میں تذکرہ لکھا گیا ہے ان سے بہتر کوئی شاعر باقی نہیں رہا۔ یہی جواب ہے اس اعتراض کا کہ علامہ شبلی نے خاقانی، ظہیر فاریابی اور جامی کو مستقل تذکرہ کے قابل نہیں سمجھا۔ قصیدہ میں خاقانی و ظہیر کی عظمت علامہ کو تسلیم ہے، جیسا کہ انھوں نے پانچویں جلد میں ریویو کیا ہے۔ لیکن خاقانی کا ذہن قصیدہ کے لئے صحیح طور پر متوازن نہ تھا۔ اس کے قصائد میں "بھاری بھرکم" ہونے کے سوا کوئی وصف نہیں۔ ظہیر نے قصیدوں میں جو محاسن پیدا کئے، ان کو سلمان ساوجی نے بہت بڑھا دیا تھا۔ جب انتخاب ٹھہرا تو ظہیر و سلمان میں سے سلمان بہتر تھا۔ نظامی و خسرو کی مثنویوں کے سامنے جامی کی مثنویوں کا یقیناً تیسرا درجہ ہے۔ اور غزل میں خسرو، حافظ، نظیری وغیرہ کے مقابلے میں جامی کا تیسرا درجہ بھی نہیں ہے۔

شعرالعجم کے چند نمونے یہ ہیں:-

(الف) حضرت امیر خسرو دہلوی کا تذکرہ و تبصرہ ۴۲ صفحوں میں لکھا ہے۔ ان کی جامعیت اور کمالات بیان کرتے ہیں:-

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔

اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدّت میں دو ہی چار پیدا کئے ہونگے۔ صرف ایک شاعری کو لو، تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہہ اقلیم سخن کے "جم دکے" ہیں۔ لیکن ان کی حدود حکومت ایک ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہات نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خط ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد، اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے۔ لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے۔ اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے، اور قدماء کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جابجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرہ "عرفات" میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے۔ عربی میں اُدبائے عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی "نہ سپہر" میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے ؏

من قدرے بر سر اس کار شدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی، اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا، لیکن ان کی طبّاعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا.........

ان مختلف الحیثیات شغلوں کے ساتھ فقر و تصوّف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا......

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کو ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے۔ اور درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی۔ کام جو سپرد تھا وہ شاعری نہ تھی، بلکہ اور اور اشغال تھے......

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا۔

امیر خسرو کی غزل پر تبصرہ کرتے ہیں:-

جدّت اسلوب

غزل کی ترقی کا نور و ز لطفِ ادا، اور جدّتِ اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں۔ لیکن پھر وہ نقش اوّلیں تھا۔ امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدّتِ اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرایے پیدا کر دیئے جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں۔

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز　　دردہا دادی و درمانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایے میں ادا کرتے ہیں،

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے ہیں۔ اسی مضمون کو دیکھو، امیر نے کس انداز سے کہا ہے،

مے حاجت نیست مستیم را در چشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بے خبر ہونا، عام مضمون ہے۔ اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے،

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ اس کو یوں باندھتے ہیں،

ہنوز ایمانِ دل بسیار غارت کردنی دارد مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق،

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی؟ از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نکرد

سعدی کا شعر ہے،

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن **امیر** نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا،

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے،

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

جاں ز نظارہ خراب و نازِ او ز اندازہ بیش
ما بہوسے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا،

شراب لطف پُر در جام می ریزی و می ترسم کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

(شعرالعجم حصہ دوم)

شعرالعجم حصہ چہارم کے آغاز میں علامہ شبلی لکھتے ہیں :-

"شعرالعجم کا یہ چوتھا یعنی آخری حصہ ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اگلے تینوں حصے اسی حصے کے دیباچے اور تمہید تھے۔ اس حصہ میں ایران کی عام شاعری پر تنقید ہے"

چونکہ وہی مضامین جو تین حصوں میں تبصرۂ شعرا کے ذیل میں لکھے تھے، اب اصناف سخن در خصائص شاعری کے تحت میں لکھے ہیں، اس لئے اس مضمون کے مناسب و برمحل اپنا یہ شعر عنوان پر درج کیا ہے :-

حدیثے دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلف پریشاں را

اس چوتھے حصے کے طویل ہو جانے کے سبب سے، دو حصے کر دیئے تھے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ پانچواں حصہ اسی کا سلسلہ ہے۔ چوتھے میں مثنوی پر ریویو ہے، پانچویں میں قصیدہ، غزل وغیرہ پر۔ چوتھے حصہ میں پہلے "نفس شاعری کی حقیقت" سے بحث کی ہے، پھر ایران کی شاعری کی تدریجی رفتار دکھائی ہے۔ پھر صنف وار تنقید کی ہے۔

شاعری کے یہ مباحث اور اس طرح کے تبصرے عربی، فارسی، اردو کسی زبان میں علامہ شبلی سے پہلے نہیں لکھے گئے۔

(ب) بطور نمونہ ایک مضمون محاکات کو درمیان میں سے کچھ حصے حذف کر کے نقل کیا جاتا ہے :-

محاکات محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی اشیا کے علاوہ، حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصوّر، انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی، تفکر،

حیرت، استعجاب پریشانی اور بیتابی ظاہر ہو۔ جہانگیر کے سامنے ایک مصوّر نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں تلووں کے سہلاتے وقت چہرہ پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرہ سے نمایاں تھا تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ سیکڑوں گوناگوں واقعات، حالات، اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں خیالات، جذبات، اور کیفیات، کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے، تصویر اس سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتی ہے مثلاً اس شعر میں

نسب نامۂ دولت کے قباد ورق بر ورق، ہر سوے بُرد باد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہو گیا یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوّری اور شاعرانہ مصوّری میں یہ ہے، کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی، بخلاف اس کے شاعرانہ مصوّری میں یہ التزام ضروری نہیں، شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے، فرض کرو ایک پھول کی تصویر کھینچنی ہو تو مصوّر کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ ریشہ دکھائے، لیکن شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں، ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کر دے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا،

ایک اور بڑا فرق، مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصوّر کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس کے

چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کرکے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے۔ جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے، سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے،

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے، لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی، نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی، اس موقع پر اس کو تخیّل سے کام لینا پڑتا ہے، وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حُسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخیّل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے، لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حسن پیدا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

شاعر کے سامنے (قوت تخیّل کی بدولت) تمام بے حس اشیاء جاندار چیزیں بن جاتی ہیں، اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں، زمین آسمان، ستارے، بلکہ ذرہ ذرہ اس سے باتیں کرتا ہے،

قوت تخیّل کے ذریعہ سے اکثر شاعر ایک نیا دعویٰ کرتا ہے، اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ ایک منطقی اس کی دلیل نہ تسلیم کرے لیکن جن لوگوں کو وہ قوت تخیّل کے ذریعہ سے معمول کر لیتا ہے وہ اس کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں کر سکتے مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

دوش از برم چو رفتی آگہ نگشتم آرے عمری در رفتن عمر آواز پا ندارد

یعنی معشوق جو گودی سے نکل کر چلا گیا تو مجھکو خبر نہیں ہوئی، کیونکہ معشوق عاشق کی زندگی ہے اور زندگی کے جانے کے وقت جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی، اس دلیل کے دو مقدمے ہیں "معشوق عاشق کی زندگی ہے۔ زندگی کے جانے کی آہٹ معلوم ہوتی" ان دونوں میں سے تم کس کا انکار کر سکتے ہو۔

محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو۔ یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آجائے، شاعری کا اصلی مقصد طبیعت کا انبساط ہے، کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے (وہ شے اچھی یا بری ہے اس سے بحث نہیں) مثلاً چھپکلی ایک بدصورت جانور ہے جس کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ایک استاد مصور چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو تو اس دیکھنے سے خواہ مخواہ لطف آئے گا، اس کی یہی وجہ ہے کہ نقل کا اصل سے مطابق ہونا خود ایک مؤثر چیز ہے، اب اگر وہ چیزیں جن کی محاکات مقصود ہے، خود بھی دلآویز اور لطف انگیز ہوں تو محاکات کا اثر بہت بڑھ جائے گا۔

اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو ان خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں۔ سادوی نے ایک نظم لکھی تھی جس کا شان نزول یہ ہے کہ اس سے اس کے کم سن بچے نے پوچھا کہ "سیلاب کیونکر آتا ہے؟" سادوی نے اس کے جواب میں یہ نظم لکھی اور دکھایا کہ سیلاب کس طرح آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے، اور کس طرح بڑھتا جاتا ہے، اس نظم میں تمام الفاظ اس قسم کے آئے ہیں کہ پانی کے گرنے، بہنے، پھیلنے، بڑھنے، (وغیرہ وغیرہ) کے وقت جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ الفاظ کے لہجہ سے ان کا اظہار ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص خوش ادائی سے اس نظم کو پڑھے تو سننے والے کو معلوم ہوگا کہ زور شور سے سیلاب بڑھتا ہوا چلا آتا ہے۔

میرا طالب العلمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا،

سر بہ بستاں چو دہد جلوۂ یغمائی را
اوّل از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے، میں نے کہا کپڑا اُتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں۔ اس لئے شاعر اگر کند کے بجائے "کشد" کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہوگئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ "نہیں یہی لفظ (کند) شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارتگری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اُتار لیتا ہے، لباس اُتارنے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اُتار کر رکھدے یا اس کا نوکر اُتار لے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لیے جائیں یا نچوا لیے جائیں فارسی میں اُن کے لئے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن، چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق، ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے"، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی۔

علی قلی کا شعر ہے،

بگذشت زپیش من و غیرش بہ حکایت پیچید کہ ہرگز نتواند بہ قفا دید

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق سامنے سے جا رہا تھا، رقیب بھی ساتھ تھا اس نے اس طرح اس کو باتوں میں لگا لیا کہ معشوق مڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکا (ورنہ شاید میری طرف بھی اس کی نگاہ پڑتی) پیچید کے لفظ سے واقعہ کی صورت جس طرح ذہن میں آجاتی ہے اور کسی لفظ سے نہیں آسکتی۔

(ج) **شاعری کی تدریجی رفتار**۔ اس قدر ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ فارسی شاعری کے مختلف دَور ہیں، اور ہر دَور کا جُدا انداز ہے۔ اب ایک

نکتہ سنج کا یہ فرض ہے کہ ہر دور کی تمام خصوصیتوں کا پتہ لگائے، نہ صرف ان کا جو سطح پر نظر آتی ہیں، بلکہ ان کا بھی جو تہ میں ہیں، اور جن پر عام نگاہیں نہیں پڑ سکتیں۔ اس کے ساتھ ان خصوصیتوں کے وجود اور اسباب بتائے' یعنی کیونکر پیدا ہوئیں، اور کس طرح ایک رنگ دوسرے رنگ سے بدلتا گیا۔

شاعری اگرچہ غیر مادی چیز ہے، لیکن وہ مادیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم ترقی کرتی ہے، تو ابتدا میں تمام چیزیں' خوراک، پوشاک، مکان، اسباب، آرائش، وضع قطع، بے تکلف اور سادہ ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ نفاست، لطافت، اور تکلف پیدا ہوتا ہے' اور روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ حد سے بڑھ جاتا ہے، اور اس وقت ترقی رُک کر قوم برباد ہو جاتی ہے۔

شاعری کی یہی حالت ہے۔ ابتدا میں سیدھے سادے، صاف صاف اور بے تکلف خیالات ہوتے ہیں۔ تشبیہات اور استعارے کہیں کہیں آجاتے ہیں، الفاظ میں تراش خراش نہیں ہوتی۔ جس مضمون کو بیان کرنا چاہتے ہیں' بغیر کسی اینچ پیچ کے بے تکلف ادا کرتے ہیں۔ اس سے آگے قدم بڑھتا ہے تو خیالات میں بلندی شروع ہوتی ہے، استعارے رنگین ہو جاتے ہیں۔ تشبیہوں میں نزاکت آجاتی ہے۔ مبالغوں میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ میں تراش خراش شروع ہوتی ہے جس مضمون کو ادا کرتے ہیں استعاروں کے رنگ میں ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد دقت آفرینی اور باریک بینی شروع ہوتی ہے، مبالغے آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ استعارہ میں استعارہ پیدا کرتے ہیں۔ محسوسات سے گذر کر صرف خیالی چیزوں پر مدار رہ جاتا ہے۔ یہ ترقی کی آخری منزل ہے۔ جو تنزل سے ہمدوش اور ہم آغوش ہے۔

اس اصول پر فارسی شاعری کے دورِ اول کی سب سے پہلی خصوصیت

سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ایران میں جب شاعری شروع ہوئی تو تمدن اور معاشرت کا اوجِ شباب تھا۔ شاعری کا جو نمونہ سامنے تھا، وہ متنبیؔ، ابونواس، ابن المعتز، بحتری، ابوتمام کی رنگینیِ بیان اور طلسم کاریاں تھیں۔ باوجود اس کے فارسی شاعری میں ابتداءً ایسے سادے بے تکلف اور سرسری خیالات نظر آتے ہیں کہ گویا قوم میں کسی طرح کا تمدن پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ ہر چیز ابتدا میں نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔

ہماری زبان کو دیکھو۔ **ولی دکنی** نے اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔ وہ ناصر علی اور بیدل کا معاصر تھا، جو مضمون بندی اور خیال آفرینی میں بال کی کھال نکالتے تھے۔ **ولی** ان لوگوں سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ فارسی شاعری کا ماہر تھا۔ تاہم اردو میں شاعری شروع کی تو اس کا یہ انداز ہے،

جسے عشق کا زخم کاری لگے ہے تو پھر زندگی اس کو بھاری لگے ہے

سادگی کا یہ وصف قدما کے اخیر دور تک قائم رہا، لیکن مدارج میں فرق آتا گیا۔ کیونکہ جس قدر زمانہ گذرتا تھا۔ سادگی کے بجائے آورد اور تکلف آتا جاتا تھا۔

اس مضمون کو کہ کمینہ آدمی تربیت سے شریف نہیں ہو سکتا، **ابو شکور بلخی** نے اس طرح ادا کیا تھا:۔

درختے کہ تلخش بود گوہرا	جس درخت کی اصل تلخ ہے
اگر چرب و شیریں دہی مرورا	اگر اس کو چرب اور شیریں غذا دو
ہماں میوۂ تلخت آرد پدید	تب بھی وہی کڑوا پھل پیدا کرے گا
ازو چرب و شیریں نخواہی مزید	اس سے شیریں پھل نہیں پیدا ہو سکتا

اسی مضمون کو **فردوسی** یوں ادا کرتا ہے:۔

درختے کہ تلخست ویرا سرشت گرش بر نشانی بہ باغ بہشت

درازجوے فلدشں بہ ہنگام آب | بہ بخشش شکر ریزی و شہد ناب
سرانجام، گوہر بہ کار آورد | ہماں میوۂ تلخ بار آورد

بات وہی ہے، لیکن بندش کی چستی اور نشست الفاظ نے مضمون کو کہاں سے کہاں پونہچا دیا ہے۔

شعرا "دل" کو "آگ" سے مشابہت دیتے ہیں، اور یہ عام مضمون ہے۔ لیکن اول جب یہ خیال ادا کیا گیا تو اس کی یہ صورت تھی،

احوال دلم مپرس کاں بیچارہ	میرے دل کا حال نہ پوچھو،
چوب است درو فتادہ آتش دل نیست	وہ ایک لکڑی ہے جس میں آگ لگ گئی ہے۔

اسی خیال کو متاخرین نے یوں ادا کیا۔ ع

یک پارہ آتشے ست، دلش نام کردہ اند

ایک ذرا سے تغیر سے مصرعہ چست ہو گیا۔ چوب کا لفظ جدا تھا، وہ نکل گیا۔ اس کے بجائے "پارہ آتش" نے لطافت پیدا کر دی۔ "نام کردہ اند" نے لطافت کو اور بڑھا دیا۔

یہ مضمون کہ "معشوق گو نامہرباں اور دشمن ہو، تاہم اس کی محبت دل سے نہیں جاتی"، اوّل اوّل فرخی نے اس کو یوں ادا کیا تھا،

ہمہ دشمنی از تو دیدم ولیکن	میں نے تجھ سے ہمیشہ دشمنی کا برتاؤ
نگویم کہ تو دوستی را نشائی	دیکھا، تاہم میں نہیں کہتا کہ تو دوستی کے ناقابل ہے۔

اسی خیال کو سعدی ادا کرتے ہیں،

بلطف و خوبی او در جہاں ندیدم کس	میں نے معشوق کی لطافت اور خوبی
کہ دشمنی کند و دوستی بیفزاید	کے برابر دنیا میں کسی کو نہیں دیکھا کہ دشمنی کرتا ہے اور باوجود اس کے محبت

اور بڑھتی ہے۔

شعرا معشوق کی کمر اور عاشق کے جسم کو لاغر کہتے ہیں۔ اسی طرح معشوق کے دہن اور عاشق کے دل کو تنگ باندھتے ہیں۔ یہ مضمون قدما کے ہاں ابتدائی حالت سے ادا ہوا تھا۔ متاخرین نے اس کو صرف بندش سے نہایت خوبصورت کر دیا۔ **فرخی** کا شعر ہے ؎

گفتم بتا، تن و دل من چیست مر ترا
گفتا، یکے میانِ من است و یکے دہن

یعنی میں نے پوچھا کہ میرا جسم اور میرا دل کیا چیز ہے؟ معشوق نے کہا، جس کو تم اپنا جسم سمجھتے ہو وہ میری کمر ہے اور جس کو اپنا دل کہتے ہو، وہ میرا دہن ہے۔

اسی بات کو **سعدی** یوں کہتے ہیں،

دہانِ تنگِ تو آموخت تنگی از دلِ من
وجودِ من ز میانِ تو لاغری آموخت

---

(۱۱) **سیرۃ النبیؐ** (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) علّامہ شبلی کی یہ آخری تصنیف ہے، اور "قامت" و "قیمت" دونوں میں بہتر ہے۔ صاحبِ سیرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ پاک میں کسی نے کہا ہے :-

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدہ　　ہر چند کہ آخر بظہور آمدہ

"سیرۃ النبیؐ" کے متعلق میں کہتا ہوں :-

پیش از ہمہ جلوہ ہاے نو آمدہ است　　ہر چند کہ آخر بظہور آمدہ است

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ؎ نامِ پاک **محمدؐ** (ستودہ، سراہا ہوا، تعریف کیا گیا)

؎ دوسرا اسم مبارک **احمدؐ** بھی ایسا ہی صادق آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں:" بہت حمد و ثنا کرنے والا"

(بقیہ صفحہ ۷۱۸ پر ملاحظہ ہو)

جس قدر صادق اور موزوں ثابت ہوا ہے، کسی دوسرے انسان کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہے۔ قیام عالم اور وجود آدمؑ سے تا ایں دم، کسی زمانے، کسی ملک، کسی قوم، کسی مذہب کے کسی پیغمبر یا بڑے سے بڑے شخص کی اتنی کثرت سے اور ایسی اعلیٰ مدح و ثنا نہیں کی گئی۔ اور چیزوں کو چھوڑ کر صرف اردو اور فارسی کی نعتیہ شاعری پر نظر ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس قدر کثیر و عظیم سرمایۂ مدح و ستایش دُنیا کے کسی دوسرے انسان کے لئے موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام عالم کے کروڑوں مسلمان دن رات اُٹھتے بیٹھتے اور اوقات نماز و عبادت میں جس کثرت سے صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں، وہ بجائے خود تاریخِ عالم کا عظیم الشان واقعہ ہے۔

یہی حال سیرت پاک کی کتابوں کا ہے۔ قرآن مجید، تفاسیر، احادیث، سِیَر، مغازی، فضائل، شمائل کی کثرت تعداد اور عظمت ضخامت، کاوش تالیف اور کوشش تحقیق کو تمام عالم کے کسی دوسرے انسان کی لائف نہیں پہونچتی۔

اردو میں با اصول، مُحقّق اور مکمّل "سیرۃ النبیؐ" لکھنے کی سعادت علّامہ شبلی کے حصّے میں آئی۔ اور سچ یہ ہے کہ ایسی جامع سیرت دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں۔ علّامہ سید سلیمان ندوی نے حصّہ اول میں جو دیباچہ

بقیہ صفحہ ۸۱۷ :-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے بذات خود جس قدر عبادتِ الٰہی کی وہ عالم کے ہر فردِ بشر سے زیادہ تھی۔ پھر اس کے ساتھ اُن کی امت کی عبادت کو شامل کرنا چاہیئے جو گویا خود اسی ذات[۲] اقدس کی عبادت ہے۔ تمام پیروانِ مذاہب میں مسلمانوں کی کثرت عبادت مُسَلَّم ہے۔ دنیا میں اہلِ اسلام کی تعداد دوسرے مذاہب والوں سے زیادہ نہیں ہے۔ باوجود اس کے مسلمانوں کے اوقات و اشغال عبادت کی تعداد و مقدار سب سے زیادہ ہے۔ پابندی عبادت میں مسلمان تمام اہل مذاہب سے بڑھ کر ہیں۔

لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف مرحوم کو ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۶ء) میں سیرۃ نبویؐ لکھنے کا خیال پیدا ہوگیا تھا اور "غزوۂ احد" تک لکھ بھی لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں "اس بارِ امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کرلیا" اس کام کے لئے مالی سرمایہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال نے "سوانح نگارِ نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کرکے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کرلیا"۔

علامہ شبلی نے اس کے ۵ حصے تجویز کئے تھے:- (۱) عرب و کعبہ کی تاریخ، اور آنحضرتؐ کے حالات، غزوات، اخلاق، اولاد اطہار اور ازواج مطہرات۔ (۲) منصب نبوت، فرائض و احکام۔ (۳) قرآن مجید کی تاریخ اور حقائق و اسرار۔ (۴) معجزات کی حقیقت و تحقیق۔ (۵) یورپین تصانیف سیرت پر تنقید۔

علامہ اپنی تجویز کا صرف پہلا حصہ لکھ سکے، جس کو اعتدال ضخامت کے خیال سے دو حصوں میں شائع کیا گیا۔ پہلے میں غزوات و فتح مکہ تک اور دوسرے[۲] میں حجۃ الوداع، وفات، اخلاق، ازواج مطہرات، تاسیس خلافت ۱۱ھ تک۔ باقی تین حصے علامہ سید سلیمان ندوی نے معجزات[۳]، منصب[۴] نبوت، مفہوم عبادت[۵] کے متعلق لکھے۔

پہلا حصہ مصنف کی وفات کے بعد ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ "سرنامہ" کس قدر موثر و دلکش لکھا ہے:-

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا، شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی
نذر لیکر آیا ہے

ز چشمِ آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

شبلی، شوال ۱۳۳۰ھ

"سیرت" کے چند نمونے یہ ہیں:-

(۱) ولادت باسعادت کا حال جس اسلوب کے ساتھ لکھا ہے، اس کا جواب نہیں۔

ظہور قدسی

چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔
لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰؑ، جاں نوازی مسیحؑ، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز، شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریاے ساوہ خشک ہو گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں، بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت

کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اُٹھا۔

(۲) غزوہ اُحد ۳ھ کے بیان میں سے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں :۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی۔ مُصعب بن عمیر کو علم عنایت ہوا، زبیر بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت حمزہ کو اس حصّہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن اُدھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ متعیّن فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے، تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں۔ عبداللہ بن جبیر ان تیراندازوں کے افسر مقرر ہوئے ....

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونان قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے۔ ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں۔

اشعار یہ تھے :۔

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِق	ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نَمْشِیْ عَلَے النَّمَارِق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
اِنْ تُقْبِلُوْا نُعَانِق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے
اَوْ تُدْبِرُوْا نُفَارِق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبول عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکّہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا۔ اسلام سے پہلے زُہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزّت کرتا تھا۔ چونکہ اس کو یہ خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آکر پکارا، "مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں!"

انصار نے کہا "ہاں او بدکار ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو بر نہ لائے"۔

قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا "کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے کہ مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے؟"[۵] علی مرتضیٰ نے صف سے نکل کر کہا "میں ہوں"، یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بیٹے عثمان نے، جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا،

اِنَّ عَلٰی اَھْلِ اللِّوَاءِ حَقًّا — نیزہ بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون
اَنْ تَخْضِبَ الصَّعْدَۃَ اَوْ تَنْدَقَّا — میں رنگ دے یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔

حضرت حمزہ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی۔ ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا "میں ساقیِ حجاج کا بیٹا ہوں"۔

اب عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت حمزہ، حضرت علی، ابودجانہ فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ ابودجانہ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دست مبارک میں تلوار لیکر فرمایا ہے، "کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟" اس سعادت کے لئے دفعۃً بہت سے ہاتھ بڑھے۔ لیکن یہ فخر ابودجانہ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے ان کو مغرور کر دیا۔ سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے، لیکن اس وقت پسند ہے"۔ ابودجانہ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے، بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی۔ اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے، اور جس طرف بڑھتے تھے،

---

۵ یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں (حاشیۂ سیرۃ النبی)

صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباع غبشانی سامنے آگیا۔ پکارے، "او ختانۃ النساء کے بچے! کہاں جاتا ہے؟" یہ کہکر تلوار ماری۔ وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا، اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ حضرت حمزہ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو "حربہ" کہتے ہیں، اور جو حبشیوں کا خاص ہتیار ہے پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہ نے اس پر حملہ کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی ......

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا، لیکن اس کے صاحبزادے حضرت حنظلہ اسلام لاچکے تھے۔ انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی۔ لیکن رحمت عالم نے گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے۔ حنظلہ نے کفار کے سپہ سالار (ابو سفیان) پر حملہ کیا، اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابو سفیان کا فیصلہ کر دے۔ دفعۃً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو قتل کر دیا۔ تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف بھاری تھا۔ علم برداروں کے قتل اور حضرت علی اور ابو دجانہ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں، بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں، اور مطلع صاف ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کیے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

عبد اللہ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رک نہ سکے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا۔ عبد اللہ بن جبیر چند جانبازوں کے

ساتھ جھگڑے، لیکن سب کے سب شہید ہوئے۔ اب راستہ صاف تھا۔ خالد نے سواروں کے دستے کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔

مصعب بن عمیر جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صورت میں مشابہ اور علمبردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا، اندر غل مچ گیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی۔ بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں، اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں، اور حضرت حذیفہ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں، لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے، اور حضرت حذیفہ نے ایثار کے لہجہ میں کہا، "مسلمانو، خدا تم کو بخش دے"۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جاں نثار پہلو میں ہیں۔ جناب علی مرتضیٰ، حضرت ابوبکر، حضرت سعد وقاص، زبیر بن العوام، ابودجانہ، طلحہ کا نام بتخصیص معلوم ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صرف طلحہ اور سعد رہ گئے تھے.......

جاں نثار اِن خاص برابر کٹتے جاتے تھے، لیکن نگاہیں **سرورِ عالم** (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ڈھونڈھتی تھیں۔ سب سے پہلے کعب بن مالک کی نظر آپ پر پڑی۔ چہرہ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ کعب نے پہچان کر پکارا، "مسلمانو، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں"! یہ سن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے ہر طرف سے ہٹ کر اسی

رُخ پر زور دیا۔ دَل کا دَل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" زیاد بن سکن پانچ انصاری لیکراس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے۔ اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑکر جانیں فدا کر دیں۔ **زیاد** کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ۔ لوگ اُٹھا کر لائے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر مُنہ رکھدیا اور اسی حالت میں جان دی ۵

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

علامہ نے "سیرۃ" میں واقعات کی تحقیق و تصحیح بھی کی ہے۔ جہاں بیانات میں اختلاف ہے یا غلط فہمی پیدا ہوئی ہے یا مخالفانِ اسلام کی حاشیہ آرائی ہے، وہاں علامہ نے روایت و درایت (نقل و عقل) سے جانچ کر فیصلہ کر دیا ہے۔

(۱۲) **رسائل و مقالات**، علامہ نے سب سے پہلا مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھا تھا۔ اس کے بعد تصانیف کے ساتھ چھوٹے بڑے مقالات بھی مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ پھر ندوۃ العلماء کی طرف سے ماہوار رسالہ "الندوہ" جاری کیا۔ اس میں کثرت سے ہر قسم کے مضامین لکھے۔ طویل مضامین "رسائل شبلی" کہلاتے ہیں۔ اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔ اب دار المصنفین نے **مقالات شبلی** ۸ جلدوں میں اس ترتیب سے شائع کر دیے ہیں:-

جلد اول، مذہبی مضامین، جلد دوم ادبی مضامین، جلد سوم تعلیمی مضامین، جلد چہارم تنقیدی مضامین، جلد پنجم سوانحی مضامین، جلد ششم تاریخی مضامین، جلد ہفتم فلسفیانہ مضامین، جلد ہشتم قومی مضامین۔

یہ تمام مضامین علامہ شبلی کے زورِ قلم، قوت استدلال، وسعت تحقیق اور دقت نظر کے شاہد ہیں۔ بعض جگہ ان کی رائے و نظریہ سے اختلاف ہو سکتا ہے، کہیں تحقیق میں جانبداری بھی پائی جاتی ہے، لیکن یہ جزئی باتیں ہیں، اس لئے لائق اعتنا نہیں۔ علامہ نے بعض ایسے مضامین (مثلاً تاریخی) پر قلم اُٹھایا ہے، جن کی طرف ان سے پہلے کسی کی توجہ نہوئی تھی، اور جن کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔ علامہ کے معاصرین میں سب سے بڑے "مقالہ نگار" مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ہیں۔ انکے مضامین کے مجموعے علامہ شبلی کے مقابلے میں نہایت کثیر و ضخیم ہیں۔ "مقالات شبلی" کے موضوعات میں سے چھ سات موضوع "مضامین شرر" میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے "تاریخ" میں دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر اپنے مضمون کو نادر و دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تحقیق کی کدو کاوش زیادہ نہیں کرتے، اور شبلی تاریخ و تحقیق کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین علامہ کے تاریخی مضامین کے متعلق لکھتے ہیں:—

"یہ عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی کی حُریتِ خیال جہاں مذہب اور اپنے زمانے کے پالیٹکس میں حادی تھی، وہاں تاریخی معاملات میں خاص کر مطلق العنان اور جابر بادشاہوں کی تائید میں وہ مفقود ہو جاتی تھی۔ انسانی دماغ اس قسم کے متبائن رُجحانات سے معمور ہے۔ ان کے اس میلان کی زیادہ تر یہ بھی وجہ تھی کہ یورپین اور عیسائی مورخوں اور آریہ مناظروں نے طریقۂ اعتدال کو چھوڑ کر ہر مسلمان حکمراں پر اعتراضات کی ناواجب سختی روا رکھی تھی، اور اس بات کو عمداً نظر انداز کر دیا تھا کہ قرن کے افعال کو بدنیتی کی طرف محمول کرنا ایک غیر عاقلانہ اور غیر فلسفیانہ فعل ہے۔ اس بے اعتدالی کے جواب میں مولانا شبلی بعض تاریخی مضامین و تصانیف میں اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ عموماً مسلمان بادشاہ (لہٰذا ان کے عام درباری اور اہل زمانہ) نہایت مفید

اور اچھے کام کرتے تھے۔ حالانکہ اگر کل تک یہ حالت تھی تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت آج اس قدر خراب نظر آتی ہے۔ لیکن یہ رائے کا اختلاف ہے۔ مولانا شبلی کا خیال تھا کہ عالمگیر، جہانگیر یا عبدالحمید خاں کی تائید سے اصل اسلام پر الزام تک کی نوبت نہیں پہنچے گی، ہمارا خیال اس کے خلاف ہے۔ ع ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔"

(مضمون مطبوعہ سیر المصنفین)

اس مضمون کا مرکزی خیال بالکل درست ہے کہ علامہ کبھی جانب داری میں اعتدال کو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ شاہانِ جابر کے جن افعال سے انکار نہیں ہو سکتا، ان کی تاویل کیوں کرتے ہیں۔ ان کو ظالم و خاطی ہی کیوں نہیں رہنے دیتے۔ ورنہ علامہ ایسا کبھی نہیں کرتے کہ بادشاہوں ان کے درباریوں یا اہلِ زمانہ کے ایسے کاموں کو جو منافیِ اسلام و مخالفِ شرع ہوں، جائز و مستحسن قرار دیں۔ اس لئے ان کے افعال کی ذمہ داری خود انھیں بزرگوں پر رہتی ہے۔ اصل اسلام پر الزام کی نوبت نہیں آتی۔ علامہ کی تاویل صرف اس بات کے کہنے کی گنجائش نکال دیتی ہے کہ "ناکردہ گناہ در جہاں کیست، بگو"

لیکن جہاں علامہ شبلی نے بے بنیاد الزامات کی تردید کی ہے۔ مشہور تاریخی مزخرفات کی بیخ کنی کی ہے۔ اور مخالفانِ اسلام کا تعصب ثابت کیا ہے وہ ان کا غیر فانی کارنامہ ہے۔

ہر مصنف کی تصانیف میں مقالات و مضامین کا خاص مرتبہ ہوتا ہے۔ بعض مصنف اپنے مضامین ہی کی بدولت زندہ ہیں اور رہیں گے۔ علامہ شبلی کے مقالات بھی ان کی اکثر تصنیفات سے مقبول و دیرپا ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اب سے ۳۰ برس پہلے لکھا تھا کہ "مولانا شبلی کی تصانیف

کو ابھی سے لُونی لگنی شروع ہوگئی ہے۔" (مقدمۂ خطوط شبلی" مطبوعہ ۱۹۲۶ء) یہ زمانہ کا "عمل جراحی" ہے، اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ اس حساب سے سر سید اور مولوی ذکاء اللہ کی دیواریں تو اس لُونی سے ڈھے چکیں، باقی "عناصر اربعہ" کے آب و گل میں ابھی جان باقی ہے۔ ان میں علامہ شبلی ابھی ایک مدت زمانہ کا ساتھ دیں گے۔ لیکن **مضامین و مقالات** ان سب مصنفوں کے بڑے جاندار ہیں۔ ان میں "بقاے اصلح" کا قانون جاری رہے گا، مگر فنا نہ ہوں گے۔

مقالات شبلی کی جلدوں میں سَو سے زیادہ چھوٹے بڑے مضامین ہیں۔ بعض مضمون ۴۰، ۵۰ صفحوں کے ہیں۔ بعض مضامین عام دلچسپی کے نہیں ہیں، لیکن نہایت نادر و جدید ہیں۔ ہم ایک دو مقالوں کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ ہر مقالے میں سے کچھ عبارتیں چھوڑ دی ہیں۔

(الف) **زیب النسا کی ولادت** زیب النساء اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی۔ اس کی ماں جس کا نام دلرس بانو بیگم تھا، شاہ نواز خاں صفوی کی بیٹی تھی، شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزماں ہے، جہانگیر کے زمانے میں معزز عہدوں پر ممتاز ہو کر شاہ نواز خاں کے خطاب سے ملقب ہوا، شاہ جہاں کے زمانے میں بھی کارہاے نمایاں کئے، چونکہ لیاقتِ ذاتی کے ساتھ عالی خاندان بھی تھا، شاہ جہاں نے ۱۰۴۷ھ میں کہ اس کی سلطنت کا دسواں سال تھا، اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی سے کر دی، چار لاکھ کا مہر باندھا گیا، طالب کلیم نے مادۂ تاریخ کہا، ع

دو گوہر بیک عقد دوراں کشیدہ

زیب النساء شادی کے دوسرے سال شوال ۱۰۴۸ھ پیدا ہوئی، عالمگیری امرا میں عنایت اللہ خاں نہایت معزز عہدہ دار تھا، اس کی ماں حافظہ مریم قابل اور تعلیم یافتہ تھی، زیب النساء جب پڑھنے کے قابل ہوئی، تو اورنگ زیب نے

اس کی تعلیم کے لئے حافظہ مریم کو مقرر کیا جس نے حسب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی، زیب النساء نے قرآن مجید حفظ یاد کیا، جس کے صلے میں اورنگ زیب نے تیس ہزار اشرفی انعام میں دی۔

تمام تاریخیں اور تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی، اور بڑے بڑے علماء و فضلا اس کی خدمت میں رہتے تھے، لیکن اس کے اساتذہ میں سے زیادہ مقرب اور بار یاب ملا سعید اشرف ماژندرانی تھے، ملا سعید تقی مجلسی کے نواسے تھے، عالمگیر کے آغاز جلوس میں ایران سے آئے اور عالمگیر نے ان کو زیب النساء کی تعلیم کے لئے مقرر کیا، اس وقت زیب النساء کی عمر تقریباً اکیس برس کی تھی، اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ تیموریوں میں مستورات کی تعلیم کا سلسلہ کس قدر ممتد ہوتا تھا، زیب النساء نظم و نثر میں ملا سعید ہی سے اصلاح لیتی تھی۔

ملا اشرف شاعر بھی تھے، اور شاعری ہی کے وصف سے مشہور ہیں۔

تقریباً ۱۳-۱۴ برس وہ تعلیم کے تعلق سے زیب النساء کی خدمت میں رہے، سنہ ۱۰۸۳ھ میں وطن جانا چاہا، زیب النساء کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس میں رخصت کی درخواست کو اس طرح ادا کیا تھا،

یک بار از وطن نتواں برگرفت دل　　در غربتم اگرچہ فزون ست اعتبار

پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند　　گو خدمت حضور نباشد مرا شعار

نسبت چو باطنی است چہ ہلی چہ اصفہان　　دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ قندہار

زیب النساء نے جس قسم کی تعلیم پائی تھی اور خود اس کا مذاق طبیعت جس قسم کا واقع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے وہ پالیٹکس سے بالکل ناآشنا تھی، تاہم عالمگیر کے پُر پیچ عہد حکومت میں وہ بھی اس بدنامی سے نہ بچ سکی، سنہ ۱۰۹۱ھ میں راجپوتوں نے جب عام بغاوت کی، اور عالمگیر نے ان کے دبانے

کے لئے شہزادہ اکبر کو فوجِ گراں دے کر جودھ پور کی طرف روانہ کیا، تو راجپوتوں کے بہکانے سے شہزادہ خود باغی ہوگیا، اور عالمگیر کے مقابلہ کو بڑھا، زیب النسار اور شہزادہ اکبر حقیقی بھائی بہن تھے، دونوں میں خط وکتابت بھی تھی، یہ خطوط پکڑے گئے اور عالمگیر نے اس کے انتقام میں زیب النسار کی تنخواہ جو چار لاکھ سالانہ تھی بند کردی، اس کے ساتھ تمام مال ومتاع ضبط کرلیا گیا، اور قلعہ سلیم گڈھ میں رہنے کا حکم ہوا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد اس کی بے گناہی ثابت ہوئی، اور عفو قصور کر دیا گیا۔

زیب النسار نے شادی نہیں کی، عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطین تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے، اس غلط روایت کو یورپین مصنفوں نے بہت شہرت دی ہے، اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے، لیکن یہ قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے، خود عالمگیر کی دو بیٹیاں، زبدۃ النسا، اور مہر النسا بیگم، سپہر شکوہ اور ایزد بخش (پسر شہزادہ مراد) سے بیاہی گئیں، چنانچہ مآثر عالمگیری میں دونوں شادیوں کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں اور خاتمۂ کتاب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

عالمگیر زیب النسا کی نہایت عزت کیا کرتا تھا، جب وہ کہیں باہر سے آتی تھی تو اس کے استقبال کے لئے شہزادوں کو بھیجتا تھا، سفر وحضر میں اس کو ساتھ رکھتا تھا، کشمیر کے دشوار سفر میں بھی وہ ساتھ تھی، لیکن جب عالمگیر دکن گیا تو اس نے غالباً اپنی علمی زندگی کی وجہ سے پائے تخت کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا، اس کی چھوٹی بہن زینت النسار، عالمگیر کے ساتھ گئی، چنانچہ اس کا نام بار بار واقعات میں آتا ہے[۱۵]، زیب النسار نے دلی میں قیام کیا، اور وہیں پیوند زمین ہوگئی، زیب النسار نے ۱۱۱۳ھ میں جو عالمگیر کی حکومت

۱۵ اس فقرے میں یہ غلطیاں ہیں کہ (۱) ۱۱۱۳ھ عالمگیر کا اڑتالیسواں سالِ جلوس نہیں ہے (بقیہ صفحہ ۷۳۱ پر)

کا اڑتالیسواں سال تھا، دلّی میں انتقال کیا، "دُخلی جنّتی" مادۂ تاریخ ہے۔

عالمگیر اس زمانے میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا۔ یہ خبر سُن کر سخت غمزدہ ہوا بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلے، اور باوجود انتہا درجہ کے استقلالِ مزاج کے صبر کی تاب نہ لا سکا، سید امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ خاں کے نام حکم صادر ہوا کہ اس کے ایصالِ ثواب کے لئے زکوٰۃ و خیرات دیں، اور مرحومہ کا مقبرہ تیار کرائیں۔

خافی خاں نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں زیب النسا کا نام اور اس کے واقعات ۱۱۲۲ھ تک آتے ہیں لیکن یہ صریحی غلطی ہے کاتبوں نے غلطی سے زینت النسا کو زیب النسا سے بدل دیا ہے۔

بقیہ صفحہ ۷۳۰، صفحہ:- (۲) مادۂ تاریخ "ادخلی جنّتی" میں ۱۱۱۳ھ نہیں نکلتا۔

تاریخوں کے بیانات اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ سنین واقعات کا تعین و مطابق کرنا دشوار ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں تاریخی مادّے بڑے کار آمد ثابت ہوتے ہیں اگرچہ علامہ شبلی جیسے بے پروا مورخ تاریخی مادّے بھی غلط نقل کرکے دھوکے میں ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً "مقالاتِ شبلی" جلد سوم (تعلیمی) کے صفحہ ۹۶ پر مُلّا نظام الدین بانی درس نظامیہ کا سال وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے اور تاریخ وفات کا یہ مصرع لکھا ہے "ملِک بود و بیک حرکت مَلک گشت" لیکن اس میں سنہ وفات سے کئی سو زائد نکلتے ہیں۔ اب اگر کسی کو مُلّا صاحب کا سنہ وفات یاد نہ ہو اور علامہ کا لکھا ہوا مصرع یاد ہو، اور وہ سنہ دریافت کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ مزید لطف یہ کہ اس مضمون سے دس برس بعد علامہ نے ایک اور مضمون "درس نظامیہ" لکھا ہے۔ اس میں مُلّا صاحب کی اُسی تاریخ وفات کا پورا قطعہ درج کیا ہے۔ اس میں مصرع تاریخ یہ لکھا ہے "ملک بود و بیک حرکت ملک شد۔" یہ صحیح ہے لیکن اس میں ذرا سا تغیّر ہو گیا ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہئے "ملک بودہ بیک حرکت ملک شد۔" اب ۱۱۶۱ھ پورے ہو جائیں گے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۷۳۲ پر)

کمالاتِ علمی اور عام اخلاق و عادات

تمام مورخین نے بہ تصریح لکھا ہے کہ زیب النسار علوم عربیہ اور فارسی زباندانی میں کمال رکھتی تھی، نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی، لیکن اس کی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں، عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی، لیکن یہ صحیح نہیں، کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کے تخلص یا دیوان کا ذکر نہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعر تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا، اسی تذکرہ میں ملا سعید اشرف کے حال میں لکھا ہے کہ زیب النسار کی بیاضِ خاص ایک خواص کے ہاتھ سے جس کا نام ارادت فہم تھا، حوض میں گر پڑی، چنانچہ سعید اشرف نے اس پر ایک قطعہ لکھا جو آگے آئے گا، غالباً یہ اشعار کی بیاض ہو گی، تذکروں میں یہ دو شعر زیب النسار کے نام سے منقول ہیں۔

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد ‌ ‌ ‌ ‌ کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت ‌ ‌ ‌ ‌ غنچۂ باغِ دلِ ما زیبِ دستارے نشد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۳۱)

بہر حال ہم سنینِ "زیب النسا" میں تاریخ گوئی کی سند اختیار کرتے ہیں۔ کسی قدیم تاریخ گو نے عالمگیر کے متعلق یہ تاریخیں نکالی ہیں:۔ تاریخ ولادت: **آفتاب عالم تاب** (۱۰۲۸ھ) تاریخ جلوس:۔ **آفتابِ عالم تابم** (۱۰۶۸ھ)۔ تاریخ وفات **آفتابِ عالم تاب من** (۱۱۱۸ھ)۔ اس حساب سے سال جلوس ۱۰۶۸ھ ہوتا ہے، تو اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوا۔ تاریخوں سے بھی یہی ثابت ہے اور خود علامہ شبلی کی ایک اور تحریر سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی ملا نظام الدین صاحب مذکور الصدر کے حالات میں ص ۹۳ پر ملا صاحب کے بھائیوں کے نام عالمگیر کا فرمان نقل کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں: "۳۷ جلوس الاموافق ۱۱۰۵ھ" اس کے مطابق بھی اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوتا ہے (باقی حاشیہ صفحہ ۷۳۳ پر)

زیب النساء کی تصنیفات وتالیفات سے زیب المنشآت کا ذکر البتہ تذکروں میں آیا ہے، تذکرۃ الغرائب کے مصنف نے لکھا ہے کہ "میں نے اسکو دیکھا ہے" یہ زیب النسا کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔

علم پروری زیب النساء نے خود کوئی تصنیف کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن اس نے اپنی نگرانی میں اہلِ فن سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کرائیں۔

زیب النساء کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈیمی (بیت العلم) تھی۔ ہر فن کے علماء اور فضلاء نوکر تھے۔ جو ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے تھے یہ کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں، یعنی اُن کتابوں کے نام کا پہلا جز زیب کا لفظ ہوتا تھا، اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے وہ کتابیں زیب النساء کی تصنیفات میں شمار کیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

زیب النساء کا انتقال ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۱۳ھ کو ہوا ہے۔ لیکن مادۂ تاریخ "دخلی جنتی" میں ۱۱۱۰ھ نکلتا ہے۔ اگر یہ تاریخ اسی زمانے میں نکالی گئی ہے تو اتنا بڑا فرق نہیں ہوسکتا۔ اس کی ایک ہی تاویل و تطبیق ہمارے ذہن میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ ۲۹ ذی الحجہ کو انتقال ہوا ہے۔ ۱۱۱۳ھ کے ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ ایسی صورت میں تاریخ گو سال آئندہ کا مادۂ تاریخ کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس تاریخ گو نے بھی ۱۱۱۴ھ کا مادہ نکالا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اس آیت کے شروع میں (و) بھی ہے۔ اس نے واو سمیت تاریخ نکالی ہے "وادخلی جنتی" میں ۱۱۱۴ھ نکلتے ہیں۔ تاریخوں میں نقل ہوتے ہوتے واو عطف چھوٹ گیا، ویسے ہی علامہ شبلی نے نقل کردیا۔ ان کو اعداد نکالنے سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اپنی یہ عادت عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھ چکے ہیں۔ ان کی والدہ کی تاریخ وفات نکالنے سے معذرت کی تھی۔ مرثیہ کہہ دیا تھا۔

حامد حسن قادری ۲۵ ۸/۴۱ء

زیب النساء نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں زیادہ قابلِ ذکر، تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے، یہ مسلّم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں، اس لئے زیب النساء نے ملا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے، حکم دیا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے غلط لکھ دیا ہے کہ وہ زیب النساء کی مستقل تصنیف ہے۔

زیب النساء نے تصنیف و تالیف کا جو محکمہ قائم کیا تھا، اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ کا ہونا بھی ضرور تھا، جس سے مصنفین فائدہ اٹھا سکیں، چنانچہ بیگم موصوفہ نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا، مصنف مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ اس کتب خانہ کی نظیر کسی کی نظر سے نہ گذری ہوگی، مصنفِ مذکور کے اصلی الفاظ یہ ہیں :-

"درسرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بہ نظرِ ہیچ یکے در نیامدہ باشد" (صفحہ ۵۳۹)

زیب النساء کے حسن مذاق سے بڑا نفع یہ ہوا کہ عالمگیر کی خشک مزاجی نے جو نقصان پہنچایا تھا، اس کی تلافی ہوگئی، یاد ہوگا کہ دربار میں ملک الشعرائی کا خاص عہدہ ابتدائے سلطنت سے چلا آتا تھا، جس پر فیضی، طالب آملی، قدسی، کلیم مامور رہ چکے تھے، عالمگیر نے اس عہدہ کو موقوف کر دیا، اور دفعۃً شعرا گویا بے خان و مان ہوگئے، لیکن زیب النساء کی قدردانی نے پھر وہ دربار قائم کر دیا، مختلف تقریبوں پر شعرا قصیدے اور نظمیں لکھ کر پیش کرتے تھے، اور گراں بہا انعام پاتے تھے، زیب النساء کی شعر دوستی کا یہ اثر ہوا کہ اہلِ سخن معمولی عرض و معروض بھی شعر ہی میں کرتے تھے۔

نعمت خاں عالی اس زمانے کا مشہور شاعر تھا، ایک دفعہ اس نے ایک

مرصع کلغی جو دستار پر لگاتے تھے زیب النساء کی خدمت میں فروخت کے لئے پیش کی، زیب النساء نے رکھ لی، لیکن جیسا کہ درباروں کا معمول ہے، قیمت کے ملنے میں دیر ہوئی، نعمت خاں نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی :-

اے بندگیت سعادت اخترِ من
در خدمتِ تو عیاں شدہ جوہرِ من

گر جیغہ خریدنی ست پس کو زرِ من　　ور نیست خریدنی، بزن بر سرِ من
اگر خریدنا ہے تو دام دلوائیے　　اور نہ خریدنا ہو تو میرے سر مارئیے

بیگم نے پانچ ہزار روپے دلوائے، اور کلغی واپس کردی۔

جہاں آرا بیگم (زیب النساء کی پھوپھی) ایک دفعہ باغ کی سیر کو نکلی، ہر طرف پردہ کرادیا گیا، میر صیدی طہرانی ایک مشہور شاعر تھا، وہ کسی حجرہ میں چھپ کر سواری کا تماشہ دیکھ رہا تھا، بیگم کا ہاتھی پاس سے گذرا تو بے ساختہ صیدی نے یہ مطلع پڑھا ؎

برقع برخ افگندہ برد ناز بہ باغش　　تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش
باغ میں برقع پہن کر اس لئے جاتی ہے　　کہ پھول کی خوشبو چھنکر دماغ میں آئے،

بیگم نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں، بیگم نے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے دلوادئے لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ شہر سے نکال دیا جائے (یعنی یہ گستاخی کیوں کی) اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے، کہ بیگمات کے لئے کس قسم کے آداب مقرر تھے۔

اخلاق و عادات زیب النساء اگرچہ درویشانہ اور مصنفانہ مذاق رکھتی تھی، تاہم شاہجہاں کی پوتی تھی، اس لئے نفاست پسندی اور امارت کے سرو سامان بھی لازمی تھے، عنایت اللہ خاں جو امرائے عالمگیری میں مقرب خاص تھا، زیب النساء کا میر خانساماں تھا، کشمیر میں جابجا جو خوشگوار اور خوش منظر چشمے ہیں، ان میں سے ایک

چشمہ جس کا نام اچھول تھا، زیب النساء کی جاگیر میں تھا، زیب النساء نے اس کے متصل ایک نہایت پر تکلف باغ اور شاہانہ عمارتیں تیار کرائی تھیں، چنانچہ عالمگیر جب ۱۰۷۳ھ میں کشمیر کے سفر کو گیا ہے، تو اس مقام پر ایک دن قیام کیا، اور زیب النساء نے قاعدہ کے موافق نذر پیش کی اور روپیے نچھاور کیئے۔

۱۰۹۰ھ میں ابرک کا ایک بڑا خیمہ تیار کرایا تھا، جو تمام تر شیشہ معلوم ہوتا تھا، نعمت خان عالی نے اس کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی۔

بھائیوں سے نہایت محبت رکھتی تھی، ۱۱۰۵ھ میں جب اعظم شاہ مرض استسقا میں سخت بیمار رہا تو زیب النساء نے اس کی تیمارداری اس محبت سے کی کہ تمام ایامِ مرض تک اس پرہیزی غذا کے سوا جو خود شہزادہ کھاتا تھا، کوئی اور غذا نہیں کھائی، محمد اکبر جس زمانے میں عالمگیر سے باغی ہوکر راجپوتوں سے مل گیا ہے، اُس زمانے میں بھی زیب النساء نے اس سے برادرانہ راہ و رسم اور خط و کتابت ترک نہ کی، جس کے صلے میں اس کی تنخواہ اور جاگیر ضبط ہو گئی۔

زیب النساء کے متعلق چھوٹے قصے

زیب النساء کے متعلق متعدد چھوٹے قصے مشہور ہو گئے ہیں، جن کو یورپین مصنفوں نے اور زیادہ آب و رنگ دیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیب النساء اور عاقل خاں سے عاشقی اور معشوقی کا تعلق تھا، اور زیب النساء اس کو چوری چھپے سے محل میں بلایا کرتی تھی، ایک دن عالمگیر محل میں موجود تھا کہ اس کو پتہ لگا کہ عاقل خاں محل میں ہے اور حمام کی دیگ میں چھپا دیا گیا ہے، عالمگیر نے انجان بن کر اسی

دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا، عاقل خاں نے اخفائے راز کے لحاظ سے دم نہ مارا اور جل کر رہ گیا، مرنے کے وقت یہ مطلع کہا تھا:۔

بعد مردن ز جفائے تو اگر یاد کنم　　از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

عاقل خاں کا مفصل تذکرہ مآثر الامرا میں موجود ہے، اور چونکہ شاعر تھا، تمام تذکروں میں اس کے حالات مذکور ہیں، لیکن اس واقعہ کا کہیں نام و نشان نہیں، جن کتابوں میں اس کا حال مل سکتا تھا اور جو مستند اور معتبر خیال کی جاتی ہیں حسب ذیل ہیں:۔

عالمگیر نامہ، مآثر الامرا، مآثر عالمگیری، مآثر الامرا، تذکرۂ سرخوش خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، ید بیضا، ان کتابوں میں ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق نہیں، حالانکہ اس کی وفات کا تذکرہ سب نے لکھا ہے جو ۱۱۰۸ھ میں واقع ہوئی۔

دوسرا واقعہ یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ زیب النساء نے یہ مصرع کہا

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم

چاہتی تھی کہ مطلع ہو جائے، لیکن دوسرا مصرع اس کی جوڑ کا موزوں نہیں ہوتا تھا، ناصر علی کے پاس مصرع لکھ کر بھیجا، اس نے برجستہ کہا:۔

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم
شاید رسید بر لب زیب النسا لبم

لیکن جو شخص تیموریوں کے جاہ و جلال اور آداب و آئین سے واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ بیچارے ناصر علی کو خواب میں بھی اس گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

(الندوہ جلد ۶ نمبر ۹، اکتوبر ۱۹۰۹ء)

(ب) تحفۃ الہند

مسلمانوں کی توجہ برج بھاشا پر۔ برج بھاشا کا فن معانی و بیان

تحفۃ الہند جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، ایک کتاب کا نام ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی، مصنف کا نام میرزا خان بن فخرالدین محمد ہے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں شہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تصنیف کی۔ کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے، اس میں ۷ باب ہیں۔

۱۔ پنگل یعنی علم عروض ۲۔ تک، یعنی قافیہ

۳۔ النکار یعنی علم بدیع ۴۔ سرنگار رس یعنی عشق و محبت

۵۔ سامدرک یعنی علم قیافہ ۶۔ کوک، یعنی علم النساء

۷۔ لغات ہندی۔ اس میں برج بھاشا کے ضروری کثیر الاستعمال الفاظ لکھے ہیں اور ان کے معنی بتائے ہیں۔

یہ کتاب عالمگیر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی ہے، اور اس کے سب سے چہیتے اور منظور نظر فرزند کے مطالعہ کے لئے تصنیف ہوئی ہے، عالمگیر کی نسبت اس کے مخالفوں کا دعویٰ ہے کہ وہ تعصب کا دیوتا تھا، اور اس نے ہندوؤں کی نہ صرف عمارات بلکہ ان کے لٹریچر کو بھی مٹا دینا چاہا تھا، اور اس لئے ان کی تمام درسگاہیں اور پاٹ شالے بند کرا دیے تھے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تاریخ کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ عالمگیر ملک کے ایک ایک جزئی واقعہ سے اس قدر واقفیت رکھتا تھا کہ کسی حصہ ملک کا ادنیٰ سا واقعہ بھی اس کی نگاہ تجسس سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، باوجود اس کے

برج بھاشا کو جس قدر اس کے زمانہ میں ترقی ہوئی، مسلمانوں نے جس قدر اس کے زمانہ میں ہندی کتابوں کے ترجمے کئے، اور خود جس قدر برج بھاشا میں نظم و نثر لکھی کسی زمانہ میں اس قدر ہندی کی طرف التفات نہیں ظاہر کیا گیا تھا، چنانچہ اس کی تفصیل ہم ایک مستقل مضمون میں لکھ چکے ہیں، یہ کتاب (تحفۃ الہند) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ عالمگیر جو اپنے بیٹوں کی ایک ایک حرکت سے خبر رکھتا تھا، اس کی نظر سے ایک ایسی کتاب جو اس کے محبوب ترین شہزادہ کے لئے لکھی جائے مخفی رہ جائے۔ نعمت خاں عالی نے وقائع لکھی اور عالمگیر سے چھپانے کی بے انتہا کوشش کی، لیکن چھپ نہ سکی۔

اس کتاب میں سے ہم صرف صنائع و بدائع کے حصہ کا اقتباس درج کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہندی زبان کے فن بدیع کو عربی سے کیا نسبت ہے؟ اس موقع پر یہ بات بھی اظہار کے قابل ہے کہ مصنف نے ہندی صنائع و بدائع کی تفصیل لکھ کر، چند صنعتیں خود اضافہ کی ہیں، ان کے خود نام رکھے ہیں، اور ان صنعتوں میں خود ہندی اشعار کہہ کر درج کتاب کئے ہیں، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کو خود اس زبان میں کہاں تک قدرت تھی، یہ صنائع اکثر بلکہ قریباً کل عربی سے لئے ہیں، اور عربی ناموں کا ترجمہ بھاشا میں کر دیا ہے۔

بھاشا میں علم بدیع کو النکار کہتے ہیں، چونکہ بلاغت کا اصلی کام جذبات اور احساسات پر اثر ڈالنا ہے، اس لئے النکار کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

۱۔ **نورس**، اس میں تمام احساسات کا استقصار کیا ہے اور ان کی نو قسمیں قرار دی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سنگار رس، اس کی دو قسمیں ہیں، سنجوگ، بیوگ سنجوک، یعنی وصال و فراق۔

ہاسیہ رس۔ مسرت و خوشی کرُنا رس۔ رحم و ہمدردی

وِیر رس۔ شجاعت و بہادری رَودر رس۔ غیظ و غضب

بھے رس۔ خوف و بیم بی بھتس[۱] رس۔ نفرت و کراہت

شانت رس۔ سکون و اطمینان اوبھت رس۔ استعجاب

عربی اور فارسی زبان میں اس قسم کی سائنٹفک تقسیم نہیں ہے اور اس لحاظ سے ہندی کو فارسی اور عربی پر ترجیح ہے۔

۲۔ **وِ ے نیگ**[۲]۔ کسی مضمون کو لطیف، نازک، اور شوخ پیرایہ میں ادا کرنے کو کہتے ہیں، مثلاً عورت اپنے محبوب شوہر سے جو کسی اور عورت پر عاشق ہے کہتی ہے کہ پیارے! تیری پیشانی پر جو سُرخی ہے، یہ تیری سُرخ ٹوپی کا عکس ہے، یا رقیبہ کی حنا کا اثر ہے،

سوال سے بظاہر صرف اس قدر مفہوم ہوتا ہے کہ عورت کو اپنے شوہر سے رقیبہ کے پاس جانے، اور اس سے ملنے کی شکایت ہے، لیکن در پردہ وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہے کہ شوہر نے رقیبہ کے پاؤں پر پیشانی رگڑی ہے، جس سے پیشانی میں سرخی آگئی ہے، یہ وہ صنعت ہے، جس کو عربی میں تعریض کہتے ہیں۔

سنسکرت کا انشا پرداز اس صنعت کو اس قدر وسعت دیتا ہے کہ الفاظ اور عبارت کی ضرورت نہیں، صرف حالت کا دکھا دینا بھی اس صنعت میں داخل ہے، مثلاً محبوب رات بھر کا جاگا ہوا کسی صحبت سے آیا ہے جس کی

[۱] یہ لفظ علاّمہ کے مضمون میں "بی بھبس" لکھا ہے، لیکن اصل میں "بی بھتس" ہے۔
[۲] اس کو علاّمہ نے "مے نیگ" لکھا ہے۔ لیکن "وِے نیگ" درست ہے۔

وجہ سے بال پریشان ہیں، آنکھیں مخمور ہیں، انگڑائیوں پر انگڑائیاں آ رہی ہیں، عاشق زبان سے کچھ نہیں کہتا، صرف آئینہ لاکر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ سب کچھ کہہ دے گا۔ یہ بھی اسی صنعت میں داخل ہے۔

۳۔ **اُپمان**، اس کے معنی **تشبیہ** کے ہیں، تشبیہ ایک نہایت لطیف صنعت ہے، عربی میں اس کو نہایت وسعت دی ہے، اور اس کی بہت سی قسمیں کی ہیں، بھاشا میں بعض باتیں تو مشترک ہیں مثلاً **مکہ اُپمان** یعنی جب تشبیہ کے الفاظ مذکور ہوں، مثل چوں، مثل وغیرہ۔

لپت اُپمان، حرف تشبیہ مذکور نہیں لیکن مقدر ہے جیسے "قندِ لب" یعنی لب چوں قند، اس کو عربی میں استعارہ[۵] کہتے ہیں۔

ورودّھا بھاس النکار، یعنی عبارت کے معنی واقع میں صحیح ہوں، لیکن بظاہر غلط معلوم ہوں جب ایک لفظ کے معنی مختلف ہوتے ہیں، تو اس صنعت سے کام لیتے ہیں، مثلاً بھاشا میں سیام، سیاہ کو بھی کہتے ہیں، اور معشوق کو بھی، اسی طرح لال، سُرخ کو بھی کہتے ہیں اور محبوب کو بھی، اب اگر یہ کہا جائے کہ "سیام زرد ہے" تو بظاہر غلط ہوگا، کیونکہ سیاہ چیز زرد نہیں ہو سکتی، لیکن اگر سام کے معنی محبوب کے لئے جائیں تو یہ جملہ صحیح ہو سکتا ہے۔

عربی میں اس صنعت کو نہایت وسعت دی ہے، مقامات حریری

---

۵ "قندِ لب" کو استعارہ نہیں کہتے ہیں، بلکہ تشبیہ ہے بغیر حرف تشبیہ کے۔ جیسے لُجَینُ الْمَاءِ (سیم آب، پانی کی چاندی) یعنی مَاءٌ کَاللُّجَیْن (آب چوں سیم، چاندی جیسا پانی)۔ یا مثلاً "گلِ رخسار" تشبیہ ہے، اور "رخسارِ گل" استعارہ۔ استعارہ میں مشبّہ اور مشبّہ بہ میں سے صرف ایک مذکور ہوتا ہے۔ اور تشبیہ میں دونوں ہوتے ہیں۔ "قندِ لب" میں دونوں ہیں، لب مشبہ۔ قند مشبہ بہ۔

میں سو فقہی سوال اور جواب ہیں، جواب تمام تر غلط معلوم ہوتے ہیں، لیکن واقع میں صحیح ہیں، مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کے بعد نعل کو چھوئے تو کیا حکم ہے، جواب دیا ہے کہ "وضو ٹوٹ جائے گا" نعل عربی میں جوتی کو کہتے ہیں اور یہ معنی زیادہ متداول ہیں، لیکن نعل عورت کو بھی کہتے ہیں اور شافعیوں کے نزدیک عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

سکارن اُت پریکھیا، حسن تعلیل کو کہتے ہیں، یہ صنعت عربی اور فارسی میں بہت مستعمل ہے، بھاشا میں اس کے نہایت لطیف نئے نئے پیرایے ملتے ہیں، مثلاً چاند معشوق کا حسن چرا کر آسمان پر بھاگ گیا، اسی وجہ سے ہمیشہ چوروں کی طرح رات کو نکلتا ہے، فارسی کا شاعر کہتا ہے ؎

از شرمِ ابروانِ بلندِ تو ماہِ نو — خود را چناں نمود کہ کس دید و کس ندید

یعنی معشوق کے ابرو کی شرم سے ماہِ نو اس طرح چھپ کر نکلا کہ کسی نے دیکھا کسی نے نہیں دیکھا۔

اس موقع پر یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ہمارے انشا پردازوں نے سنسکرت اور برج بھاشا کے علم ادب کے نکتہ نکتہ کو سمجھا، اور اس سے بہت فائدہ اُٹھایا، لیکن اس کے فیض سے وہی محروم رہ گیا، جو سب سے زیادہ حقدار تھا، یہ ظاہر ہے کہ اردو بھاشا سے نکلی اور اسکے دامن میں پلی لیکن بھاشا سے جو سرمایہ اس کو ملا، صرف الفاظ تھے۔ مضامین اور خیالات سے اس کا دامن خالی رہا، بخلاف اس کے عربی زبان، جس کو بھاشا سے کسی قسم کا تعارف نہ تھا، وہ سنسکرت اور بھاشا دونوں سے مستفید ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آج سے ۰ ۵ برس پہلے مسلمان، اردو کو کوئی

علمی زبان نہیں سمجھتے تھے، خط کتابت تک فارسی میں تھی، اردو شعرا جس قدر گذرے ان میں سے ایک بھی عربی کا فاضل نہ تھا، یا یوں کہو کہ کوئی عالم اردو کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں انشا پردازی یا شاعری کا کمال دکھائے علمی زبان اس وقت صرف عربی تھی، اس لئے جہاں سے جو سرمایہ ملتا تھا اسی کے خزانہ میں جمع کیا جاتا تھا، بہر حال ہندی شاعری کے مضامین عربی زبان میں بعینہ نقل ہوئے، یعنی علمائے ادب نے سنسکرت اور بھاشا کی نظموں کا بعینہ عربی میں ترجمہ کیا، ہم چند مثالیں ذیل میں لکھتے ہیں۔ یہ مثالیں سبحۃ المرجان سے لی گئی ہیں، مولوی غلام علی آزاد نے ہر جگہ تصریح کر دی ہے کہ وہ ہندی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

لَقَدْ نَحِلَتْ فِیْ یَوْمِ رَاحَ حَبِیْبُھَا ۔۔۔ اِلٰی اَنْ ھَوٰی مِنْ سَاعِدَیْھَا نُضَارُھَا
وَلَمَّا اَتَاھَا مُخْبِرٌ عَنْ قُدُوْمِھَا ۔۔۔ عَلٰی سَاعِدِ الْمَلاٰنِ ضَاقَ سِوَارُھَا

(یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندی میں عاشق عورت ہے، اور مرد معشوق ہے)

یعنی جس دن معشوق نے سفر کیا، میں اس قدر دبلی ہو گئی کہ ہاتھ کے کڑے ڈھیلے ہو کر گر پڑے، لیکن جس دن قاصد نے آکر معشوق کے آنے کی خبر دی، اور میں نے کڑوں کو پہننا چاہا تو اب وہ تنگ ہو گئے اور چڑھتے نہ تھے۔

مَا لَاحَ فِیْ شَفَتَیْکَ کُحْلٌ رَائِقٌ ۔۔۔ اِنِّیْ اُبَیِّنُہٗ بِحُسْنِ بَیَانٍ
خَتَمَتْ عَلٰی شَفَتَیْکَ ذَاتُ تَدَلُّلٍ ۔۔۔ کَیْلَا تُکَلِّمَنِیْ عَلَی الْاَحْیَانِ

واقعہ یہ ہے کہ شوہر کسی اور محبوبہ سے مل کر آیا، اور چونکہ اس نے اس کی سرمگیں آنکھوں کو چوما، اس لئے اس کے ہونٹوں پر سیاہی لگ گئی ہے اب عورت شوہر سے کہنے آئی ہے کہ تیرے ہونٹوں پر جو سیاہی ہے میں بتاؤں کیوں ہے، اور کہاں سے آئی ہے، کسی کافر ادا نے تیرے

ہونٹوں پر مہر کر دی ہے، کہ تو کبھی مجھ سے بات نہ کرے۔

(الندوہ فروری ۱۹۱۱ء)

(۱۳) **مکاتیب و خطوط**۔ علامہ کے خطوں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ دو حصّے "مکاتیب شبلی" کے نام سے دار المصنفین نے شائع کئے ہیں۔ ایک[1] میں علامہ کے عام مکتوبات ہیں۔ دوسرے[2] میں خاص ان کے تلامذہ کے نام۔ یہ خطوط ایسے ہی ہیں جیسے دوسرے مشاہیر علم و ادب کے ہیں۔ لیکن ایک تیسرا[3] نادر مجموعہ خطوط شبلی کے نام سے مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی نے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا ہے۔ یہ دو مشہور خاتونوں کے نام لکھے گئے ہیں، یعنی عطیہ فیضی بیگم اور زہرا فیضی بیگم کے نام۔ یہ دونوں نواب بیگم نازلی فیضی اہلیہ محترمہ ہز ہائی نس نواب صاحب جنجیرہ (بمبئی) کی بہنیں ہیں۔ بمبئی کے مشہور خاندان فیضی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بمبئی میں علامہ شبلی کا اس خاندان سے تعارف ہوا۔ زبیری صاحب "خطوط" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> جس وقت بمبئی کے ممتاز خاندان فیضی سے ان کا تعارف ہوا، اس وقت عطیہ بیگم اپنی تعلیم کے لحاظ سے بہت کچھ شہرت رکھتی تھیں۔ انھوں نے آزادانہ تعلیم پائی تھی، اور پہلی مسلمان خاتون تھیں جو یورپ کو تعلیم کے لئے گئی تھیں۔ بمبئی کے تعلیم یافتہ مسلمان خاندانوں کی طرح آزادانہ معاشرت تھی۔ یہ خاندان عرصہ تک استنبول میں بھی مقیم رہا تھا۔ ان کے والد تاجر تھے اور بسلسلۂ تجارت وہاں قیام تھا۔
>
> عطیہ بیگم صاحب کی دوسری بہنوں زہرا بیگم صاحب اور نازلی رفیعہ بیگم صاحب نے اگرچہ عطیہ بیگم صاحب کی طرح باقاعدہ تعلیم نہیں پائی، با ایں ہمہ نہایت قابل ہیں، اردو سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔ صاحب تصنیف و تالیف ہیں۔ اہل کمال کی قدر شناس ہیں۔ ان کی مجلس میں علمی تذکرے رہتے

ہیں۔ زہرا بیگم صاحب کو واقعہ نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ عطیہ بیگم صاحب سب سے چھوٹی ہیں، لیکن سب سے زیادہ تیز اور ذہین ہیں۔ مولانا نے ان میں وہ سب جوہر دیکھے جن سے ایک خاتون قابلِ رشک مرتبہ حاصل کر سکتی ہے۔ ان کے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ ان جوہروں کو جلا دیں اور عطیہ بیگم کو ایک نمونہ بنا دیں۔ رفتہ رفتہ اس خاندان سے ان کے عزیزانہ تعلقات ہو گئے۔ پھر ندوہ کی امداد اور اتحادِ خیال نے ان میں اور مضبوطی پیدا کر دی۔ راقم کو بارہا ان بیگمات سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ مولانا کی نسبت محبت و احترام کا جوش جو ان میں نظر آیا، وہ قریب ترین احباب اور تلامذہ میں بھی بہت کم پایا گیا۔

عطیہ بیگم کے متعلق ایک نوٹ میں لکھتے ہیں:۔

عطیہ بیگم صاحب کی شادی مسٹر رحمٰن سے ہوئی جو یہودی مذہب رکھتے تھے۔ انھوں نے شادی سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ نہایت ممتاز و مشہور اور کامل الفن آرٹسٹ (مصوّر) ہیں، جن کے آرٹ کی یورپ میں خاص شہرت ہے۔ انھوں نے مولانا مرحوم کی بھی ایک تصویر بنائی تھی جو گویا ان کے کمالِ مصوری کی تصویر ہے۔ فرانس کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۲ء میں وہ رکھی گئی تھی، اور اس کی بے انتہا قدر ہوئی۔ نہایت معقول قیمت لگی، لیکن عطیہ بیگم صاحب نے اس کو فروخت کرنا گوارا نہ کیا، اور ایوانِ رفعت (محل جناب نازلی بیگم صاحب واقع بمبئی) کی زینت ہے۔

عطیہ بیگم کی شادی کے متعلق علّامہ شبلی نے ایک شعر اور ایک قطعہ کہا تھا، جو عطیہ بیگم کی بیاض سے زبیری صاحب نے دیباچۂ خطوط میں نقل کئے ہیں، وہ یہ ہیں:۔

شعر

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو　　عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

قطعہ

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف　　اس لئے مجھ کو قرابت سے بہت دوری تھی
آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں　　آپ نے کھینچ لیا مجھ کو تو مجبوری تھی

علامہ نے یہ قطعہ عطیہ بیگم کو بھیجنے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی سنایا ہوگا۔ اسی زمانے میں مشہور ہوگیا تھا۔ جب علی گڈھ کالج میں پونہچا تو ایک ذہین و ظریف طالب علم، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل[۵] نے اس کے جواب میں یہ قطعہ کہا:۔

قطعہ

کب مہودی سے عطیہ عقد زیبا تھا تمھیں بنت فیضی تم ہو، یہ رشتہ نہ کرنا تھا تمھیں
میں نے یہ مانا۔ وہ مانی ہے تو تم تصویرِ حسن تم کو کھنچنا تھا۔ مصوّر نے جو کھینچا تھا تمھیں

اور شوہر عطیہ کی زبانی یہ شعر کہا:۔

صفحۂ دل پر جو کھنچی آپ کی تصویر حسن مستحق تھا جس "عطیہ" کا وہ میں نے پا لیا

یہ شبلی اور سہیل کے قطعات اسی زمانے میں شاہ دلگیر اکبر آبادی مرحوم کے رسالہ نقاد آگرہ میں شائع ہوئے تھے۔

"خطوط شبلی" چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ ۹۰ صفحوں میں ۸۲ خط ہیں، ۵۵ عطیہ بیگم کے نام اور ۲۷ زہرا بیگم کے نام۔ سب خطوط ساڑھے تین سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں پہلا خط ۷ فروری ۱۹۰۸ء کا ہے اور آخری ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کا۔ اس مجموعہ کے ساتھ مولوی محمد امین صاحب زبیری جامع خطوط کا مختصر دیباچہ اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کا مفصل مقدمہ شامل ہے۔

ان مکتوبات کی خصوصیت نہیں، جن جن بزرگوں کے خطوط شائع ہوئے ہیں، سرسید، آزاد، حالی وغیرہ، کسی کو لکھتے وقت یہ تصوّر بھی نہ آیا ہوگا کہ ان پرائیوٹ

---

[۵] سہیل صاحب علی گڈھ سے ایم۔ اے، ایل ایل بی کرکے اعظم گڈھ میں وکالت کرتے تھے۔ ۸ نومبر ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا۔ فارسی و اردو کے نہایت پُرگو، زود گو، خوش گو شاعر تھے۔ ان کا یہ لطیفہ یادگار ہے کہ جب یو۔ پی اسمبلی کے ممبر تھے تو ایک مرتبہ ان کو ایک ریزولیشن پیش کرنا تھا۔ کچھ خیال آیا تو وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے مضمون کو اردو میں نظم کرلیا اور بجائے تقریر کے وہ نظم اسمبلی میں پڑھ دی۔

اور خانگی خطوں کو ان کے مرنے کے بعد شائع کیا جائے گا۔ یہ بعد کے لوگوں کی "ستم ظریفی" ہے کہ مرے ہوؤں کے گھر کے بھید اور دل کی باتیں سربازار تشہیر کردیتے ہیں۔ اور "ستم ظریفی" کا لفظ اگر کہیں صادق آسکتا ہے تو اس کا بہترین محل یہ "خطوط شبلی" ہیں۔

"خطوط شبلی" کے دیباچہ اشاعت ثانی (۱۹۲۵ء) میں زبیری صاحب لکھتے ہیں:۔

"بعض لوگوں نے مؤلف سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان خطوط کی نسبت کو ناپسند کیا، بعض نے ان کی اشاعت کو اس عقیدت و نیازمندی کے خلاف جانا جو راقم کو مولانا مرحوم کی ذات گرامی کے ساتھ ہے، بعض نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی جو خود ان کے اپنے خیالات نے پیدا کردی۔"

ہمارے نزدیک ان تینوں قسم کے لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کے اظہار میں عجلت سے کام لیا، اور (بقول زبیری صاحب کے) "یہ سب توہمات اور اپنے نفوس کے قیاسات تھے اور اپنی طبیعت کا رنگ۔" اس لئے کہ عطیہ بیگم اور زہرا بیگم نے خوشی کے ساتھ ان کی اشاعت کی اجازت دیدی۔ اور علامہ شبلی خود ان جذبات و تعلقات میں کوئی بات ناقابل اشاعت نہ سمجھتے تھے۔ ان کے جواب میں اُن بہنوں کے جو خطوط آتے تھے اُن کو علامہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سُناتے تھے، اپنی بیٹی کو دکھاتے تھے، ان کے اقتباسات الہ آباد و حیدرآباد بھیجتے تھے۔ ان بہنوں کے لئے خاص خاص موقعوں پر جو فارسی و اردو کی غزلیں اور قطعے کہتے تھے، وہ خطوط میں لکھنے کے بعد سُنایا بھی کرتے تھے اور مجموعہ کلام فارسی میں چھپوایا بھی کرتے تھے۔ علامہ کے یہ خطوط، بمبئی و جنجیرہ کے سفر، فارسی کی غزلیں "معلومِ عوام" تھیں۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا حالی مرحوم نے

فارسی غزلوں کا ایک مجموعہ "دستۂ گل" دیکھ کر تحریر کیا تھا:۔

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے، جس نے "سیرۃ النعمان" "الفاروق" اور "سوانح مولانا روم" جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے۔ جس کے نشہ میں خمارِ چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

اس لئے درحقیقت "خطوط شبلی" کے چھاپنے میں "ستم" کچھ نہیں ہے، "ظریفی" سہی۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ ان کے نوادرِ مقدمات میں ہے۔ ان خطوط کی اشاعت کی ضرورت بتاتے ہیں:۔

"ایک تو ان کا طرز بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے، جو ان کی دوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا، دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے، اور نہ شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انھوں نے فرمایا ...... تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بو آتی ہے، جو ان کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے، اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ان کی دلچسپی اور قدر کی ہے۔"

بعض لوگوں نے "مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی"، لیکن "شوخی" ہم کو بھی نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

مولانا کے ارشدِ تلامذہ[۵] نے حال ہی میں شعرالعجم کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کی داستان ہے۔ گویا واقعات'

---

۵ علامہ سید سلیمان ندوی۔

شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری پر کچھ اثر ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے "شعر العجم" واقعات کی کھتونی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی۔ لیکن اگر وہ ان خطوط کو دیکھتے (تو معلوم ہوتا)[۵۱] (اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصوّر ان کے ذہن میں تھا، وہ شعر العجم میں نہیں، ان خطوط میں ہے۔ اُس کتاب میں مولانا نے دوسروں کے جذبات سے ایک دستہ گل تیار کیا ہے، اور یہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ نقل ہے اور یہ اصل ہے، وہ جگ بیتی ہے یہ آپ بیتی۔ اور ظاہر ہے کہ آپ بیتی میں جو مزہ ہے، وہ جگ بیتی میں کہاں۔

ہم ان خطوط میں سے علامہ شبلی کے چند جذبات و خیالات کا اقتباس کرتے ہیں۔

محبّت و خلوص۔

"اب تو تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سُناتا ہوں، اور لوگ سَر دُھنتے ہیں۔ پالٹیکس کے متعلق تمھارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے الہ آباد و حیدر آباد بھیجے۔ ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں وَاَنَا اَوَّلُ الْعَابِدِیْن۔[۵۲]" (عطیہ بیگم کے نام)

"میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی ایک تصویر جو تیس[۳۰] برس کی عمر کی ہے، اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے، بھیجتا ہوں۔ وہ میری قائم مقامی کرے گی۔"

(عطیہ بیگم کے نام)

"تمھارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بیساختہ میں نے آنکھوں سے لگالیا، اور

[۵۱] یہ بریکٹ ہم نے جملہ کو مربوط کرنے کے لئے بڑھا دیا ہے۔ دوسرا بریکٹ مولوی صاحب کی تحریر میں ہے۔

[۵۲] اور میں پہلا پوجنے والا ہوں گا۔

دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"عطیہ، لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمھاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔"

"خاتونوں کے نام سے بورڈنگ[۵۱] کے کمرے بنیں گے، اور بیگم صاحب سے کہدیجئے کہ کم ازکم ایک ان کے نام کا بھی ہوگا۔ تمھارے نام کا کمرہ ہوسکا تو خود اپنے صرف سے بنواؤنگا لیکن اس سے کتبہ پر اشارہ نہ ہوگا۔ صرف تمھارا نام ہوگا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"اگر آپ لکھنؤ آکر کسی اور کی مہمان ہوئیں تو میں اس زمانہ میں لکھنؤ چھوڑکر چلا جاؤں گا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"میں چاہتا تھا کہ میرے کسی کام میں تمھارے نام کی شرکت ہو۔ اس کا اصلی طریقہ تو یہ تھا کہ کوئی تصنیف تمھارے نام ڈیڈیکیٹ کرتا، لیکن افسوس نہیں کرسکتا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

میں آپ کی طرح آزاد ہوتا تو سال بھر جزیرہ[۵۲] ہی میں رہتا۔ لیکن "ندوہ" کی زنجیر غضب کی ہے۔ اب بھی تو "زنجیرہ" میں ہوں۔ (زہرا بیگم کے نام)

فارسی پڑھانے کا شوق :-

"بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کو اس طرح فارسی پڑھاؤں کہ فارسی شاعری اور فارسی زبان کا ایک ایک نکتہ ذہن میں آجائے .... لیکن یہ کیونکر ممکن ہے۔ میں عرش (جزیرہ) تک نہیں پہنچ سکتا۔ تم عرش سے اتر نہیں سکتیں۔ تاہم ناامیدی نہیں، کبھی تو ندوہ کے جھگڑوں سے فرصت ملے گی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

---

۵۱ یعنی ندوۃ العلما کے بورڈنگ ہاؤس کے۔

۵۲ اصل میں یہی نام ہے۔ لیکن لوگوں نے بگاڑ کر "جنجیرہ" کرلیا ہے۔ علامہ یہ دونوں نام لکھتے ہیں۔ اور ایک جگہ شاعرانہ اسلوب میں "زنجیرہ" بھی کرلیا ہے۔ یہ بھی اس کا ایک نام یا نام کی ایک صورت ہے۔

" اگر یہ موقع پھر ملا تو میں چاہوں گا کہ میں تمہاری کچھ علمی خدمت کر سکوں۔ تم کو فارسی پڑھاؤں اور اردو کی انشا پردازی سکھاؤں۔ معلوم نہیں تم اس کو اپنی تحقیر تو نہ خیال کرو گی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

" ولایت سے آ جاؤ اور موقع ہو تو تم کو فارسی کا پورا استاد بنادوں گو خود شاگردی کے قابل نہیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

" افسوس یہ ہے کہ اتنا موقع نہیں ملتا کہ میں دو چار جزو کسی دیوان یا اپنے ہی کلام کے آپ کو پڑھا سکتا۔ اس سے یہ ہوتا کہ تمام ضروری فارسی اصطلاحات اور محاورات پر آپ کی نظر پڑ جاتی، اور فارسی شاعری کی خوبیاں ذہن نشیں ہو جاتیں۔ پھر آپ خود پڑھ لیتیں اور لطف اٹھاتیں۔" (زہرا بیگم کے نام)

موسیقی سکھانے کا شوق:-

" گانے کے ذکر پر ایک بات یاد آتی جو مدتوں سے دل میں تھی، لیکن کہنے کی جرأت نہ تھی۔ میں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سنے تم کو خدا نے خوش آوازی عطا کی ہے۔ اور نہایت موثر آواز ہے۔ لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں۔ اس لئے تم بالکل بے سرا گا رہی تھیں۔ موسیقی کی معمولی معلومات ضرور ہیں، ورنہ بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ بارہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا، لیکن رک گیا کہ تمہاری گٹکری اور تانیں بے قاعدہ تھیں۔ بمبئی میں اس فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے، یہاں تک کہ جن کا پیشہ ہے وہ بھی محض جاہل ہیں۔"
(عطیہ بیگم کے نام)

" گانا میں خود نہیں جانتا، لیکن سمجھ سکتا ہوں۔ یعنی جو گانا خلاف فن ہوگا، میں بتا سکوں گا کہ خلاف قاعدہ ہے۔ گراموفون میں پیارے صاحب کے جو گانے بند ہیں، ان کو سنو۔ پلیٹ پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً دادرا جھنجوٹی وغیرہ۔ ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ گانے میں کس قسم کے سُر اور

تان اور گٹکری ہیں۔ یوں بے فائدہ گانے میں کتنی ہی عمدہ آواز ہو، بیکار ہو جاتی ہے۔ البتہ میں رواں طور پر مثنوی یا اور اشعار کے پڑھنے کا طرز بتا سکوں گا جو عام صحبتوں کے قابل ہے" (عطیہ بیگم کے نام)

"اگر بالفرض تم کبھی لکھنؤ آؤ تو موسیقی ایسے لوگوں سے سیکھ سکتی ہو جن سے سیکھنا عیب میں داخل نہ ہو۔ بے شک پیارے صاحب وغیرہ سے سیکھنا شرم کی بات ہے۔ وہ لوگ سوسائٹی سے خارج ہیں۔ (عطیہ بیگم کے نام)

عورتوں کے اوصاف علامہ کی نظر میں :-

"میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں، لیکن اردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے۔ صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ تو اس میدان میں آچکیں۔ اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لئے الگ نصاب ہو۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے جس میں یورپ بھی مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہیئے کہ ان دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ بڑھتا جائے، اور بات چیت رفتار گفتار نشست برخاست مذاق زبان سب الگ ہو جائیں۔ یوں ہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں دو مختلف نوع ہو جائیں گے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں، اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔ لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ

عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیوپیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو۔ لیکن یہ تو پُرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے۔ جمال اور حسن، نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی، دلیری، دیوپیکری اور شجاعت میں بھی حُسن وجمال قائم رہ سکتا ہے۔ مردنا عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہوسکتی ہے۔ ہاں، یہ اعتراض صحیح ہے کہ موجودہ طرز تعلیم سے بچّے خاندان سے اجنبی ہوجاتے ہیں، لیکن خاندان سے زیادہ تر چسپیدگی بھی کوئی مفید چیز نہیں۔ مہمات امور رُک جاتے ہیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"عورتوں کی دیوپیکری پر تم نے اس قدر طولانی تقریر لکھی، لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو مسلّم ہے کہ صحت کے لئے، تندرستی کے لئے، جسم کی موزونی کے لئے، جامہ زیبی کے لئے مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔ جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حُسن میں فرق آتا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہوجاتا ہے۔ یہ صرف میری رائے نہیں، بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"مردانہ تعلیم میں مَیں ہارا اور تم جیتیں، لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے، اور عطیہ، میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو۔"

اپنی تصانیف اور شاعری کے متعلق:۔

"میرا چھوٹا سا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں، اور میں نے "برعکس نہند نام زنگی کافور" ان کانوٹوں کا نام "دستہ گل" رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں۔ لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں۔ اس لئے ان کا پردہ ہی میں رہنا مناسب ہے۔" (زہرا بیگم کے نام)

"بوئے گل" بھی اگر تم سمجھ کر پڑھ لو تو فارسی لٹریچر کی ادائیں معلوم

ہو جائیں۔ (عطیہ بیگم کے نام)

"بوئے گل" کہئے تو بھیجدوں۔ "دستہ گل" کی نسبت مہذب ہے۔

(عطیہ بیگم کے نام)

"چند غزلوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ تیاری پر بھیج دوں گا۔ افسوس کہ فارسی لٹریچر کسی قدر غیر معتدل واقع ہوا ہے، اور میں بھی اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ بہرحال مضامین کچھ ہوں، لیکن زبان ایران کی ہو گی۔"
(عطیہ بیگم کے نام)۔

"موازنہ انیس و دبیر" اگر دیکھ سکو تو دیکھا کرو۔ اس سے اردو میں بصیرت ہو سکتی ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)۔

"شعر العجم کا دوسرا حصہ جو زیر تحریر ہے، تمھارے دیکھنے کے قابل ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی ہے کہ تم نے میری تشریح کو اور خود اشعار کو پسند کیا، ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کا حق ہو سکتا ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)۔

اس طویل تجزیہ اور کثیر اقتباسات کے بعد اور کسی نمونہ کی ضرورت نہ تھی تاہم ایک پورا خط عطیہ بیگم کے نام کا درج کیا جاتا ہے۔ اس میں وہ اشعار اور ان کی تشریح ہے جس کا ذکر اوپر کے آخری اقتباس میں ہے۔

عزیزی!

آج جی چاہتا ہے کہ "بوئے گل" کے بعض اشعار لکھوں، اور تم کو اس کا مطلب سمجھاؤں، تاکہ رفتہ رفتہ فارسی اشعار کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

ذوقِ نظر بہ لذتِ کاوش نمی رسد
داغم ازیں کہ دل نہ تواں کرد دیدہ را

ذوقِ نظر، دیدار کا لطف۔ کاوش، محبوب کے دیکھنے سے جو دل کو بیتابی اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ واغم، یعنی مجھکو رنج ہے یا افسوس ہے۔ نہ می رسد، یعنی برابر نہیں یا اس کو نہیں پہنچتا۔

اب یہ مطلب ہوا کہ دیدار میں بھی ایک لطف ہے اور دل کی بیتابی اور تڑپ میں بھی ایک لطف ہے۔ لیکن دیدار کا لطف دل کی تڑپ کے لطف کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھ کو افسوس ہے کہ آنکھوں کو دل نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی کاش اگر آنکھیں دل بن جائیں تو دونوں لطف ساتھ حاصل ہو سکتے۔

چشمش بہ سوے ما نگہ ناتمام کرد
ساقی بجام ریخت مے نارسیدہ را

نارسیدہ شراب، خوب پختہ اور نشہ آور نہ ہو اس کو نارسیدہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھوں نے میری طرف دیکھا لیکن خوب آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔ بلکہ یوں ہی سی اچٹتی نظر ڈالدی تو گویا ساقی نے جام میں شراب ڈالی لیکن شراب خام تھی۔ خوب تیار نہیں ہونے پائی تھی۔

با ما بہر معاملہ بدگماں نبود
خوش بود آنکہ راز محبت عیاں نبود

صاف ہے۔

از لذت اداے ستم می تواں شناخت
کیں جور از تو بود، واز آسماں نبود

آسماں بھی ظلم کرتا ہے اور محبوب بھی کرتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ آسمان کے ظلم میں لطف نہیں آتا، اور محبوب کے ظلم میں لذت اور مزا ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ جب ہم پر ظلم ہوتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس نے ظلم کیا تو ہم یوں پہچان لیتے ہیں کہ اگر ظلم میں لذت ملی تو محبوب کا ظلم ہے۔

صد حرف راز بود نہاں در نگاہ من
شادم کہ کار با صنمے نکتہ داں نبود

شادم، میں خوش ہوں۔ کار، یعنی معاملہ۔ صنم، یعنی محبوب۔ نکتہ داں، جو بات کی تہ کو پہنچ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ میری نگاہ میں سینکڑوں راز چھپے ہوئے ہیں۔ یعنی محبت، شوق، حسرت، آرزو، شکایت، گلہ وغیرہ۔ لیکن غنیمت یہ ہوا کہ محبوب نکتہ داں نہ تھا کہ میری نگاہ ہی سے سمجھ جاتا کہ اسکے دل میں کیا کیا خیالات ہیں؟"

شبلی ۲۲ جون ۱۹۰۹ء لکھنو

مولوی سید احمد دہلوی

مؤلف فرہنگِ آصفیہ

۸ جنوری ۱۸۴۶ء (مطابق ۱۲۶۲ھ) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ سید عبدالرحمن ہے۔ رسمی تعلیم مختلف مشہور اساتذہ سے اور پھر نارمل اسکول دہلی میں حاصل کی۔ ابتدا سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک طویل فارسی نظم "طفل نامہ" لکھی تھی۔ پھر خط و کتابت کی تعلیم کے لئے **انشائے تقویۃ الصبیان** لکھی، جس میں اردو تلازمہ و ضلع قائم رکھا گیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں ان کو اپنی عظیم الشان لغت **فرہنگ آصفیہ** کی تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کی تیاری شروع کی۔ ۱۸۶۹ء میں انھوں نے **مناظرۂ تقدیر و تدبیر** "کنز الفوائد" کے نام سے شائع کی۔ اس پر سرکار نے ڈیڑھ سو روپیہ انعام دیا۔

اس زمانے میں مسٹر فیلن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) اپنی مشہور "اردو لغت" مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے اس تالیف کی اعانت کے لئے مولوی سید احمد کو بلا لیا۔ یہ سات برس دانا پور رہے، اور ان کی کتاب کو مکمل کیا۔ اسکے ساتھ ہی

اپنا کام بھی کرتے رہے۔ یعنی وہاں سے "انشاے ہادی النسا" شائع کی، اور فرہنگِ آصفیہ کا کام بھی جاری رکھا۔ ۱۸۸۰ء میں فیلن صاحب کا کام تکمیل کو پونہچا، تو اسی وقت مہاراجہ الور نے اپنا "سفرنامہ" مرتب کرنے کے لئے طلب کرلیا۔ ۶ مہینے میں وہ کام پورا کیا اور معقول تنخواہ اور انعام لیکر واپس آے۔ اس کے بعد گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں نائب مترجم ہوکر چلے گئے۔

مولوی سید احمد نے دہلی اور شملہ کے اسکولوں میں سرکاری ملازمت کی اور پنشن پائی۔ گورنمنٹ نے خاں صاحب کا خطاب دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن بھی رہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب پرنس آف ویلز دہلی تشریف لاے تو مولوی صاحب نے ایک نظم خیر مقدم اور اپنی ایک تالیف "رسوم دہلی" پیش کی۔ ۱۹۱۱ء کے دربار تاجپوشی کے زمانے میں مولوی صاحب کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، تو انھوں نے اس کا نام دربار احمد رکھا۔ ایک بار ان کے مکان میں آگ لگی اور تمام کتب خانہ اور "فرہنگ آصفیہ" کی جلدیں نذرِ آتش ہوگئیں۔ دولت آصفیہ نے اس موقع پر دستِ فیض بڑھایا اور اسی شاہانہ امداد سے دوبارہ کتاب شائع ہوئی۔ مولوی صاحب نے ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔ قرآن مجید سے تاریخ وفات نکلی:- اِنَّ رَبَّکَ لَذُو فَضْلٍ = ۱۹۱۹ء (نمل رکوع ۶ پارہ ۲۰)

مولوی سید احمد کی تصانیف

مولوی صاحب نے بڑی کثرت سے کتابیں تصنیف کیں۔ اگرچہ ضخیم کتابیں کم ہیں۔ لیکن بعض تالیفات موضوع کے لحاظ سے مفید و جدید ہیں۔ فہرست یہ ہے:-

(۱) تقویۃ الصبیان، (۲) کنز الفوائد (مناظرۂ تقدیر و تدبیر)۔ (۳) وقائعُ دُرّانیہ (تاریخ)؛ (۴) انشاء ہادی النسا۔ (۵) قصہ راحت زمانی (عورتوں کے لئے اخلاقی فسانہ) (۶) تحریر النسا (لڑکیوں کی درسی کتاب)۔ (۷) اخلاق النسا (۸) لغات النسا (عورتوں کے خاص الفاظ و محاورات)۔ (۹) طبعی تعلیم۔ (۱۰) قواعد اردو۔ (۱۱) علم اللسان

(اردو زبان دانی اور اس کی ترقی)۔ (۱۲) رسوم دہلی، (۱۳) تکمیل الکلام (پیشہ وروں کی اصطلاحات)۔ (۱۴) تحقیق الکلام (اردو زبان کی خوبیاں)۔ (۱۵) محاکمہ مرکز (دہلی کو مرکز ار قرار دینے کے دلائل)۔ (۱۶) رس کھان (ہندی زبان کے دوہے، گیت، پہیلیاں)۔ (۱۷ ریت بکھان (ہندوؤں کے رسم و رواج)۔ (۱۸) ناری کتھا (ہندو عورتوں کے محاورات (۱۹) سیر شملہ (مع تاریخ شملہ)۔ (۲۰) روزمرّہ دہلی۔ (۲۱) رسوم اعلیٰ ہندان دہلی (۲۲) اردو ضرب الامثال۔

(۲۳) **فرہنگ آصفیہ**۔ اس کا نام سب سے آخر میں لیا گیا ہے لیکن اہتمام و عظمت میں سب پر مقدم ہے۔ مولوی صاحب اپنے نام سے زیاد اس کتاب کے نام سے "مولف فرہنگ آصفیہ" مشہور ہیں۔ آغاز تالیف میں بھ بہت قدیم ہے۔ ۱۸۶۸ء سے اس کی ترتیب شروع کی۔ ۱۸۷۸ء میں "ارمغان د کے نام سے بطور نمونہ شائع کی، لیکن تکمیل جاری رہی۔ ۲۴ سال کی محنت کے ب ۱۸۹۲ء میں تکمیل کو پہنچائی۔ مولوی صاحب کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اس ق ضخیم کتاب کو شائع کر سکیں۔ اتفاق سے ۱۸۸۸ء میں جب وہ شملہ کے اسکول مدرس تھے، سر آسمان جاہ وزیر اعظم حیدر آباد شملہ آئے۔ مولوی صاحب نے حاضر ہو کر اپنی تالیف کا مسودہ پیش کیا۔ وہ اس کو ساتھ لے گئے۔ مولوی سید علی بلگرامی کو دکھایا۔ انھوں نے بہت پسند کیا اور منظوری کی سفارش کی۔ چنانچہ در دکن سے انعام کا وعدہ کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں بعد تکمیل فرہنگ آصفیہ نام رکھا دولتِ آصفیہ سے پانچ ہزار روپیہ انعام ملا اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ گورنمنٹ پنجاب نے پانچ سو روپیہ انعام دئے اور ایک ہزار روپیہ کی کتابیں خریدیں۔

اردو لغات کی مختصر تاریخ اس "داستان اردو" میں صفحہ ۳۴۱ تا ۳۴۳ کے حاشیوں پر لکھی گئی ہے۔ لغات اردو کے آغازِ تالیف سے تقری

دو سو برس بعد فرہنگ آصفیہ مرتب ہوئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس سے زیادہ ضخیم، مکمل اور مستند فرہنگِ اردو موجود نہ تھی۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے چار جلدوں میں ۵۵ ہزار الفاظ و محاورات تحقیق و تشریح اور سند و حوالہ کے ساتھ درج کئے ہیں۔ اب اگر اس میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی واقع ہوگئیں تو ایسی فرو گذاشتوں سے اور کوئی لغت بھی خالی نہیں ہے۔ نور اللغات" فرہنگ" سے ۲۵ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی صرفی و لسانی، تحقیقی و استنادی غلطیاں بہت ہیں۔ بہر حال تقدیم تکمیل کی فضیلت مولوی سید احمد صاحب کو حاصل ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ صرف پہلی اور دوسری جلد ملتی ہے۔

فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات کا مقابلہ

مولوی سید احمد صاحب نے فرہنگ آصفیہ کے دیباچے میں لکھا ہے:-

> جس طرح جامع امیر اللغات نے "ارمغان دہلی" مطبوعہ ۱۸۷۸ء میں سے لفظ (آنکھ) لیکر اس کے مشتقات اور معانی کی ہو بہو نقل بطور نمونہ چھاپی تھی، اسی طرح مولف نور اللغات نے بھی ان کی پیروی کر کے سنہ اشاعت سے پورے تین قرن بعد فرہنگ آصفیہ میں سے لفظ (بات) اور اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطور نمونہ شائع فرمائی ہے۔

یہ بڑا سخت اعتراض ہے۔ حضرت امیر مینائیؔ اور مولوی نور الحسن نیرؔ کاکوروی ایسے آدمی نہ تھے کہ کسی کی کتاب ہو بہو نقل کر کے اپنے نام سے چھپوا دیں۔ ہمارے سامنے فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات تینوں موجود ہیں، اور ہم نے لفظ (آنکھ) اور لفظ (بات) کو ان میں پڑھا ہے۔ بات یہ ہے کہ الفاظ اور محاورات کسی خاص مصنف کی ملکیت نہیں ہوتے، ہر شخص ان کو تلاش کر سکتا ہے۔ البتہ پہلی مرتبہ جمع کر کے مرتب کر دینا، مولف کا کارنامہ ہوتا ہے۔ لیکن لغات کی تشریح

اور سند کے اشعار بلاشبہہ جامع و مولف کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان کی ہو بہو نقل بیشک سرقہ اور قابل الزام ہے۔

مولوی سید احمد کی اس فضیلت میں شک نہیں کہ انھوں نے اردو کی سب سے بڑی اور مکمل لغت سب سے پہلے مرتب کی اور ۱۸۷۸ء میں "ارمغان دہلی" شائع کی۔ منشی امیر احمد مینائی کو "امیر اللغات" کا خیال بعد کو آیا اور انھوں نے ۱۸۸۴ء میں لفظ (آنکھ) کا نمونہ مرتب کیا۔ امیر مینائی کے سامنے فرہنگ کا نمونہ موجود تھا۔ یقیناً اس سے استفاضہ کیا، لیکن اس کی ہو بہو نقل نہیں کی۔ بلکہ سید صاحب کے لغات کو خود جانچا، غیر ضروری اندراجات کو ترک کیا، ضروری محاورے جو رہ گئے تھے، ان کا اضافہ کیا، سند کے اشعار الگ تلاش کر کے لکھے۔ چند مثالیں یہ ہیں:-

آنکھوں کی سوئیاں۔ اس کی مثال فرہنگ میں نہیں ہے۔ امیر نے سند میں داغ کا شعر لکھا ہے۔

آنکھوں میں پھرنا۔ فرہنگ میں سند کے ۱۶ شعر ہیں، جن میں سے دو چار بھی کافی تھے۔ اس لئے کہ اس محاورے کے صرف ایک معنی ہیں۔ امیر مینائی نے ۴ شعر لکھے ہیں۔ جن میں سے صرف ناسخ کا شعر مشترک ہے۔ ظفر، آتش رشک کے اشعار امیر نے الگ لکھے ہیں۔

آنکھوں میں تنکے چبھونا۔ اس کی سند فرہنگ میں نہیں ہے۔ امیر نے داغ کا شعر لکھا ہے۔

آنکھوں میں تلنا، تولنا۔ یہ محاورے فرہنگ میں بالکل نہیں ہیں۔ امیر نے مع اسناد لکھے ہیں۔

آنکھوں میں جہان اندھیر ہونا، تاریک ہونا، سیاہ ہونا۔ ان سب کی مثالیں امیر نے بالکل الگ لکھی ہیں۔

آنکھوں میں باتیں ہونا، آنکھوں میں بہار پھولنا، آنکھوں میں خاک لگانا، فرہنگ میں نہیں ہیں۔ امیر نے مع مثال لکھے ہیں۔

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں میں ٹھہرنا، آنکھوں میں چڑھنا۔ امیراللغات میں نہیں ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ہیں۔ یہ سب محاورے ہیں۔ ان کو شامل نہ کرنا امیراللغات کی خامی ہے۔

آنکھوں میں آنسو بھر آنا، فرہنگ میں بطور محاورہ درج ہے، اور اس کی یہ مثال لکھی ہے: "آنسو شہ مظلوم کی آنکھوں میں بھر آئے" (انیس) اصل میں یہ کوئی محاورہ نہیں ہے، سیدھی سی بات ہے۔ حقیقی معنی مراد ہیں۔ اسکو محاورہ گردانناغلطی ہے۔

آنکھوں میں آنا۔ اس محاورے کے دو پہلو ہیں۔ دونوں لغت والوں کو دونوں مفہوم لکھنے ضروری تھے۔ لیکن سید صاحب اور امیر صاحب نے ایک ایک پہلو لیا ہے۔ امیراللغات میں اس کے معنی ہیں: نظروں میں سمانا، اور مثال یہ ہے:۔

مری آنکھوں میں تم آؤ، اگر شمشاد قامت ہو
شجر رہتا ہے اکثر سبز دریا کی ترائی میں (امیر لکھنوی)

یہاں انسان کا مجسم آنکھوں میں آنا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ صرف شاعرانہ تخیل ہے۔ اسی لئے امیر مینائی نے اس خصوصیت کی تصریح کر دی ہے۔

فرہنگ آصفیہ میں اس محاورہ (آنکھوں میں آنا) کے یہ مفہوم بتائے ہیں: جچنا، سمانا، نظر پر چڑھنا، نگاہ پر چڑھنا، خیال میں آنا، دھیان میں آنا۔ اور سند میں یہ شعر لکھا ہے:۔

نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں   ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے (میر)

یہاں نگاہ میں جچنا مراد ہے۔

اسی طرح نور اللغات پر بھی یہ اعتراض غلط ہے۔ مولوی نور الحسن صاحب نیر کے سامنے بھی فرہنگ تھی، اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، لیکن ہو بہو نقل نہیں کی۔

فرہنگ میں **بات** کے ۴۶ معنی ہیں۔ نور اللغات میں ۶۸ ہیں۔ ان کی اسناد کے چند شعر نیر صاحب نے سید صاحب سے لئے ہیں، باقی بطورِ خود تلاش کئے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ میں یہ کمی ہے کہ **بات** کے نو سو سے زیادہ محاورے لکھے ہیں لیکن سند کے اشعار خال خال کہیں لکھے ہیں۔ کالم کے کالم اشعار سے خالی ہیں۔ فقروں کی مثالیں بھی کم ہیں۔ لفظ **بات** کے دس دس معنی نمبروار یکجا لکھ دئے ہیں اور مثال کہیں نہیں لکھی۔ نور اللغات میں اکثر سندیں اشعار میں ہیں۔ کہیں فقرے لکھ دئیے دونوں پر مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے:۔

فرہنگ آصفیہ میں لفظ (بات) کے معنی بتانے کے بعد اس کے مشتقات و محاورات لکھے ہیں۔ ان میں (الف) سے شروع ہونے والے محاورات صرف تین ہیں، یعنی بات اُٹھانا، بات الٹنا، بات آنا۔ ان کے بعد کا محاورہ (بآ بات میں) لکھا ہے۔ لیکن نور اللغات میں ان تین محاوروں کے علاوہ ۷، ۲ محاورے اور لکھے ہیں۔ مثلاً بات آن پڑنا، بات آگے آنا، بات آئی گئی ہونا، بات اٹکا رکھنا، بات اٹکنا۔ بات اُڑنا، بات اُڑانا وغیرہ یہ سب محاورے ہیں۔ فرہنگ میں ان کا نہ ہونا ضعفِ تالیف ہے۔

نور اللغات میں بھی تالیف کی خامیاں بہت ہیں۔ لغات کی تحقیق و تشریح میں غلطیاں کی ہیں۔ مفہوم اور مثالوں میں سہو ہوا ہے۔ مثلاً **بات** سے متعلق ایک محاورہ لکھا ہے، بات آنکھوں سے سنا۔ اس محاورے کو **بات** سے کچھ تعلق نہیں، بلکہ **آنکھوں** کا محاورہ ہے۔ اس میں "بات سنا" اصلی معنوں میں ہے (آنکھوں سے) کا مفہوم ہے، خوشی سے یا ادب سے۔ اسی طرح ایک محاورہ بتایا ہے، "بات کا اعادہ۔ بات کو دُہرانا، بات کو پھر کہنا"۔ یہ بھی

محاورہ نہ ہوا. معمولی بات ہوئی۔

ک کے متعلق لکھا ہے کہ "آخرِ کلمات میں معنیِ مصدری کا فائدہ دیتا ہے، جیسے بیٹھک، روک، ٹوک"۔ حالانکہ ان الفاظ میں ک یکساں نہیں ہے بیٹھک میں معنیِ مصدری کے لئے بڑھایا گیا ہے۔ لیکن روک اور ٹوک میں اصلی ہے، اضافہ نہیں ہے۔ **پرداز اُڑانا** (طرز سیکھنا) اس کی مثال میں قلق کا یہ شعر لکھا ہے:۔

سیکھ لے نالۂ جانکاہ سے طرزِ نالہ　　رنگِ رُخ سے مرے پرداز اُڑالے بلبل

حالانکہ یہاں پرداز (دال سے) نہیں ہے، بلکہ پرواز، اُڑنے کے معنی میں ہے، یعنی میرے رنگِ رُخ سے اُڑنا سیکھے۔ اگر پرداز (بمعنی طرز) ہو تو مضمون ناتمام رہتا ہے۔ کس چیز کی طرز؟

غرض، امیر اللغات اور نور اللغات دونوں پر سید احمد صاحب کا یہ الزام غلط ہے کہ فرہنگ آصفیہ کی ہو بہو نقل کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب نے سالہا سال کی محنت سے فرہنگ تیار کی تھی، اور چاہتے تھے کہ

اقلیمِ لغت میری قلمرو سے نہ جائے[۵]

اس لئے انھوں نے حضرت امیر و نیر کے لغات کو اپنی مِلک پر دست درازی تصوّر کیا۔ شکر ہے سید صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے ریاض کو سرسبز دیکھ لیا اور اپنی ریاضت کا پھل پا لیا۔ اب یہ زمانے کی "کارستانی" رہی کہ امیر اللغات تمام نہ ہو سکی، فرہنگ آصفیہ باوجود مکمل و شائع ہونے کے، اب نایاب ہے، اور نور اللغات بازار میں سب کی ملکیتوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔

مولوی سید احمد کا طرزِ تحریر

مولوی صاحب نے دو درجن کتابیں مختلف عنوانوں اور موضوعوں پر لکھی ہیں۔ ان میں دو چیزیں نہایت نمایاں ہیں۔ ایک عورتوں کی تعلیم و تربیت، دوسرے زبان اردو اور محاورۂ دہلی

۵ میر انیس کا مصرع ہے :۔ "اقلیمِ سخن میری قلمرو سے نہ جائے"۔

کی اشاعت۔ اہلِ دہلی کو ایک تو اپنی زبان و محاورہ سے فطری گرویدگی تھی، دوسرے، ہر تصنیف میں اس کی اشاعت کا شوق۔ تیسرے اس کے تحفظ و حمایت کی ضرورت۔ لکھنؤ اور پنجاب کی طرف سے دہلی کی مرکزیت پر حملے ہو رہے تھے، اور دہلی والے لکھنؤ کی بولی کو بھی ٹکسال باہر سمجھتے تھے۔ اس لئے دہلی کے ادبی مصنفین نے اپنی کتابوں اور مقالوں میں مقامی بول چال اور محاورے کثرت سے استعمال کئے۔ جن لوگوں نے علوم و فنون کی کتابیں لکھیں، انھوں نے موضوع و مضمون کے مطابق زبان اختیار کی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی زبان و اسلوب کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں میر ناصر علی خاں نے کم، اور مولوی سید احمد اور میر ناصر نذیر فراق نے زیادہ دہلی کا روزمرّہ لکھا۔ پھر آغا شاعر اور راشد الخیری نے اسی پر اپنی تحریر کی بنیاد رکھی، راشد الخیری نے ایک اسلوب خاص ایجاد کرکے اپنا انفرادی رنگ پیدا کرلیا۔ اب عصر حاضر کے "قدیم دہلوی" آغا حیدر حسن اور مرزا فرحت اللہ بیگ، اور "جدید دہلوی" خواجہ محمد شفیع وغیرہ اسی طرز میں لکھتے ہیں۔

یہ وصف اہل دہلی کے ساتھ خاص نہیں، اہل لکھنؤ بھی ان کے ہم پلہ ہیں۔ مولوی عبدالحلیم شرر، پنڈت سرشار، مرزا ہادی رسوا، منشی سجاد حسین مضمون نگارانِ "اودھ اخبار" و "اودھ پنچ"، خواجہ عبدالرؤف عشرت وغیرہ نے لکھنؤ کا روزمرّہ و محاورہ برتا۔

یہ اسلوب، بلاشبہہ، نہایت دلکش و دلآویز اور ضروری و ناگزیر ہے۔ زبان و محاورہ کی رفتار، ترقی، اشاعت اور استناد کے لئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں۔ لیکن موجودہ "لامرکزیت" کے دور میں یہ نکتہ پیش نظر رکھنے کے لائق ہے کہ زبان و محاورہ تحریر و طباعت میں آکر جمہوری حیثیت اور انفرادی شان پیدا کرلیتا ہے۔ صرف "مقامی" نہیں رہتا، بلکہ "بین الاقوامی" بن جاتا ہے، اور اب

اس کا مقصد حفظِ نفس سے زیادہ نشاطِ عام ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ الفاظ، محاورات اور امثال جو مقامی طور پر بھی کم استعمال ہوتے ہیں، باہر بالکل نہیں سمجھے جاتے، اور پنجاب و دکن کے لوگ ان سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان میں باوجود صحت و فصاحت کے، ایک قسم کی "غرابت" پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی کثرت پسندیدہ نہیں رہتی۔

مولوی سید احمد دہلوی نے بھی دہلی کی زبان بہتر سے بہتر لکھی ہے۔ محاورے برمحل، فقرے برجستہ، عبارت سلجھی ہوئی، مضمون واضح و مدلّل لکھتے ہیں ان کی تحریروں کے دو ایک نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱- **فرہنگ آصفیہ** کے مندرجہ لغات کے متعلق کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:—

"تذکیر و تانیث کی تمیز اہل دہلی و لکھنؤ کے موافق اس میں موجود ہے، زبانوں کا فرق اور ان کی اصلیت کا پتا اس سے لگتا ہے، عام محاورے اس میں درج ہیں، خاص خاص محاورے اس میں داخل ہیں، فقیروں کی صدائیں اس میں سن لو، سودے والے کی آوازیں اس میں دیکھ لو، دل لگی اس میں ہے، ظرافت اس میں ہے، بعض بعض موقعوں پر جُواریوں، ٹھگوں، دلالوں، چابک سواروں، بدمعاشوں، مختلف پیشہ وروں کے وہ ملتے جلتے روزمرّے جن کے نہ جاننے سے اکثر انسان دھوکا کھا جاتا ہے، بہ ترتیب حروف اس کتاب میں شامل ہیں، جو الفاظ جس درجے کے آدمیوں میں مروّج ہے، وہ اُنھیں کے نام سے لکھا گیا ہے۔ عورتوں کی بولی اس میں نہیں چھوڑی جاہلوں کی باتوں سے اس میں پرہیز نہیں کیا۔ ہاں، اگر چھوڑا ہے تو مغلّظات اور فحش چھوڑا ہے......

قصہ مختصر، ہم نے نہ عیب چینوں کا خوف کیا، نہ خردہ بینوں کی پروا،

جیسی بُری یا بھلی اپنی پیاری مادری زبان کی خدمت بن پڑی، وہ کر دی۔ آیندہ جو اس کام کے اہل اور سچے ہوا خواہ ہوں گے وہ ترقی دے لیں گے۔

قطعہ

اے اہلِ خیر کچھ تو ادھر بھی کہ بیٹھے ہیں ۔۔۔ کب سے دعائے خیر کے امیدوار ہم
جو کچھ بنا کسی سے وہی چھوڑا ہے یادگار ۔۔۔ اپنی نجات چھوڑ چلے یادگار ہم

۲۔ محاکمۂ مرکزِ اُردو۔ مولوی سید احمد صاحب نے یہ طویل مضمون ۱۲ر فروری ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا۔ جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ وجہ تحریر یہ تھی کہ منشی وجاہت حسین جھنجانوی ایڈیٹر رسالہ اصلاح سخن نے دہلی کے بعض محاوروں پر اعتراض کرکے اس کو مرکزِ تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے یہ "محاکمہ" لکھا تھا۔ نہایت دلچسپ تحریر ہے۔ دہلی کی مرکزیت کے سلسلے میں دہلی و لکھنؤ کے محاوروں کا فرق، اس کی مثالیں اور لطیفے، اردو زبان کی مختصر تاریخ، دہلی، لکھنؤ، لاہور کے مصنفوں اور ان کی تصانیف کا ذکر، بہت سی دلچسپ باتیں دورانِ کلام میں آگئی ہیں۔ اگرچہ طولِ کلام اور تکرارِ بیان سے ذرا الجھن پیدا ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر جوابِ اعتراض کا ایک حصہ درمیانی تفصیلات کو حذف کرکے درج کیا جاتا ہے:۔

"انھوں نے لکھا ہے کہ اہلِ دہلی زیادہ محبت کے واسطے "جان چھڑکنا" بولتے ہیں، اور آگ لگ جانے کے واسطے "پھول پڑا" استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اصل عبارت یہ ہے کہ "وہ زمانہ دور نہیں کہ دہلی و لکھنؤ کے ایجاد کردہ الفاظ لوکل بولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھیں گے۔ مثال کے طور پر دہلی کے ایک آدھ محاورے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے زیادہ محبت ہو تو دہلی والے کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی اس آدمی پر جان چھڑکتا ہے۔ جان کیا ہوئی گویا گلاب یا کیوڑے کا عرق ہے۔ اب علمی دنیا کی کوئی ضرورت

نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے بے حد محبت کرنے کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اس آدمی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں........

اس محاورے کا لطف اور اُس کی عدم واقفیت تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن پہلے انھیں کی عبارت میں سے دو ایک فقرے پیش کر کے الزامی جواب دیتے اور ان کی طرف سے یہ مصرعہ پڑھتے ہیں۔ ع

میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

"کانوں کا مزا نہیں دیتے" کان نہ ہوئے کوئی زبان ہوئی جو ذائقہ سے تعلق رکھے" صورتیں فسانہ ہوگئیں" صورتیں نہ ہوئیں کوئی ذکر اذکار ہوئے جو فسانہ سے نسبت دی گئی" دنیا کی ہر چیز انقلاب پسند ہے" لفظِ پسند کو ملاحظہ فرمائیے اور ہر چیز کو جو ذی روح بن کر انقلاب پسند فرماتی ہے۔

خیر اِن باتوں کو جانے دیجئے۔ **جان چھڑکنا** اول تو یہ فرمائیے کہ آپ نے اپنے کانوں سے سُنا ہے؟ کہاں سُنا ہے؟ اور کس سے سُنا ہے؟ مردوں سے یا عورتوں سے یا صرف کُتبِ **لُغات** میں دیکھا ہے یا کسی اُستاد کے کلام میں نظر پڑا ہے۔ بیشک جان چھڑکنا بولا جاتا ہے۔ مگر عورتوں میں اور وہ بھی اولاد یا مثلِ اولاد کسی نہایت قریبی رشتہ دار کی محبّت میں۔ نہ کہ عام محاورہ ہے اور ہر جگہ فرطِ محبّت کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ عورتیں اس کی اصلیت سے واقف نہیں مگر اس موقع کے واسطے اس سے بہتر اور پُر اثر لفظ ملنا مشکل ہے۔ جان کے لُغوی معنی روح ہیں اور اَطِبّا کی اصطلاح میں جوہرِ لطیف یا بخارِ لطیف۔ ان دونوں صورتوں میں جان کا سیّال ہونا پایا جاتا ہے اور سیّال چیز کا چھڑکنا

ممکنات سے ہے اور اس جگہ فرطِ محبت سے جان نثار کرنے کے معنی ہیں۔
اب ایک اور طرح سے سنئے۔ اردو محاورے میں جان بمعنی خون بھی آجاتا ہے۔ جیسے خوف کے موقع پر جہاں دم خشک ہونا بولتے ہیں وہاں جان سوکھنا بھی استعمال کرتے ہیں اور دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ آپ نے کام سے جان چرانا بھی سنا ہوگا۔ بھلا اس جگہ جان نہ ہوئی کوئی گٹھڑی یا جوکھوں ہوئی کہ کوئی چرا کر لے جائے گا۔

حالانکہ صرف اسی کی ذات کے متعلق بولتے ہیں۔ جو جان بوجھ کر کام سے بچتا ہے۔ اب دیکھئے یہ گلاب کا عرق ہے یا کیوڑا۔ اور لیجئے جانفشانی فارسی کا محاورہ ہے اور اسی کا یہ ترجمہ ہے۔ اہل فارس پر آپ کا اس موقع کے لئے فرمائیے کیا اعتراض ہے اسی جگہ آپ فرماتے ہیں" کہ اب علمی دنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے بے حد محبت کرنے کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اس آدمی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں" اگر آپ بے انتہا محبت یا صرف کسی کے ساتھ محبت کرنے کے دوسرے معنی پر توجہ فرماتے تو ہرگز ہرگز یہ لفظ زبان پر نہ لاتے۔ ایسی ہی باتیں آدمی کو پابندئی زبان سے آزادی حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ہمارے نزدیک علمی دنیا کو سب سے زیادہ زباندانی کی ضرورت ہے ورنہ مفہوم کچھ ہوگا اور سمجھا کچھ جائے گا۔

اب دوسرے محاورے اور لفظ کو بھی ملاحظہ فرمائیے!۔ آپ ارشاد کرتے ہیں کہ" اسی طرح کسی کے گھر میں آگ لگ جانے کا مفہوم اہلِ دہلی یوں ادا کرتے ہیں۔ کہ فلاں شخص کے گھر میں پھول پڑا کہ سارا گھر جل کر خاک ہوگیا اور یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے

ہیں۔ صاف بات کیوں نہ کہی جائے کہ فلاں آدمی کا گھر جل گیا۔" مہربانی فرماکر اول تو یہ ارشاد کیجئے کہ آپ کبھی دہلی میں آئے بھی ہیں یا نہیں؟ اگر آئے ہیں تو آپ کو بگوش دل اس محاورے کے سُننے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کسی کتاب یا کبھی کسی شعر میں دیکھ لیا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس محاورے کو عورتیں بولتی ہوں گی یا مرد۔ اگرچہ آپ کا یہ نقرہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اس کو وہ لوگ بدشگونی سمجھتے ہیں یعنی یہ محاورہ خاص عورتوں کا ہے کیونکہ یہی فرقہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالتا جس سے بدشگونی ہو۔ مثلاً "خیر سے" آپ نے ہی کئی جگہ برتا ہے "خدا نہ کرے" "بجائے خدا کی مار" آپ نے سُنا ہی ہوگا "تمہیں خدا کی نیکی" بگوش زد فرمایا ہوگا "دہ جمی جم گھر میں ہیں" یہ بھی کبھی نہ کبھی ضرور گوش آشنا ہوا ہوگا۔ اسی طرح **پھول پڑنا** بھی ظاہر کر رہا ہے کہ اس کو عورتیں ہی بولتی ہونگی۔ مگر آپ نے اپنے ثبوت میں مرد و زن سب کو لے لیا۔ اور بہت بڑی ناواقفیت ظاہر فرمائی۔ اب ہم سے سُنئے دہلی میں کوئی بھی اس محاورے کو اب نہیں بولتا اور نہ پہلے یہ محاورہ شہر کے اندر بکثرت بولا جاتا تھا۔ البتہ قلعہ معلی میں بیگماتوں نے اس کا کسی قدر استعمال کر رکھا تھا۔ لیکن عام آگ لگنے کے واسطے نہ تھا۔ اگرچہ رنگین کے ایک شعر میں یہ محاورہ موجود ہے۔ مگر اس میں جو لفظ **گوئیاں** آگیا ہے۔ یہ اس امر میں شبہ ڈالتا ہے۔ کیونکہ گوئیاں خاص پوربی محاورہ ہے جو آج تک دہلی کیا اطراف دہلی میں بھی نہیں بولا جاتا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بھول کر بھی جو کسی اور کے گھر بھول پڑے
تو الٰہی کرے گوئیاں مرے گھر پھول پڑے

عجب نہیں جو یہ شعر انشاء اللہ خاں کا ہو اور اگر بالفرض رنگین کا مانا جائے تو اُس زمانہ کا ہوگا جس زمانہ میں سعادت یار خاں رنگین لکھنؤ میں جاکر اپنے

بیگمی بول بھائی انشاء اللہ خاں کے ہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ اور باہم دونوں کی ریختیوں کا موازنہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن رشک لکھنوی نے اس کو صاف کردیا ہے چنانچہ اس کا شعر ہے ؎

اہلِ جنّت کو ہو جنت پر جہنّم کا خیال
پھول اگر پڑ جائے میری آہِ آتش بار کا

اس سے ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ کسی شاعر نے بھی نہیں باندھا۔ جن لوگوں نے مردانہ زبان کا نام ریختہ اور بیگماتی بول چال کا نام ریختی رکھ چھوڑا تھا۔ انھوں نے اس زمانہ میں شاذ ونادر باندھا ہے۔ اہلِ لکھنؤ میں سے بحر اور انشا نے صرف ایک ایک شعر میں استعمال کیا ہے۔ اور اہلِ دہلی میں سے بسمت اور رنگین نے۔ ان کو سوا ذوق۔ ظفر۔ مومن۔ درد۔ غالب وغیرہ کسی نے بھی اس کا استعمال نہیں فرمایا۔ اگر یہ محاورہ مروّجِ خاص وعام ہوتا۔ تو کوئی بھی اسے نہ چھوڑتا۔ اہلِ لغت کو چونکہ ہر زمانہ کا محاورہ دکھانا منظور تھا انھوں نے بیشک داخلِ لغات کردیا۔ محاورہ کی خوبی میں شُبہ نہیں لیکن آپ نے بے وقت مثال دی۔

پھول کے لفظ پر آپ نے طعنہ مارا تھا یہاں وہ طعنہ بیکار ہوا بلکہ آپ نے جو لکھا ہے "یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں"۔ سبحان اللہ کیا اچھا خیال ہے۔ انگارے کی تعریف بھی جناب کو معلوم نہیں۔ کیا انگارا اُڑ کر جا سکتا ہے؟ یا انگارا اُڑ سکتا ہے؟ اگر آپ ان الفاظ کے محل موقع سے واقف ہوتے تو اس جگہ چنگاری شرارہ۔ یا آگ کا پتنگا تحریر فرماتے۔ دیکھئے اہلِ زبان اور مقلدِ زبان میں کس قدر فرق ثابت ہوا۔ اب دوسری طرح سے اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ جب کوئلے جلتے وقت چٹختے ہیں تو اُن کو آپ کیا فرمائیں گے۔ کیا اُن کے روشن

ذروں کو پھول یا چنگاریاں یا پتنگے سے تعبیر نہیں کریں گے۔ تم نے جلتے
چراغ کو بھڑکتے ہوئے دیکھا ہوگا تو اس وقت جو روشنی پیدا ہوتی ہے یا اس کی
جلتی ہوئی بتی نیچے گرتی ہے تو اُسے بھی پھول کہتے ہیں یا نہیں؟ کیا تو اُس
وقت جھلمل جگمگ کرتا ہے تو اُسے تو ا ہنسنا کسی وجہ سے کہتے ہیں یا نہیں۔
آتش بازی کے پھول تو آپ نے ضرور سنے ہوں گے۔ ان کو انکاراکیوں نہیں
کہا۔ پھلجھڑی۔ ہتھ پھول۔ مہتابی۔ انار۔ جائی جوئی۔ بتاسے وغیرہ آتشبازی
میں نظر اقدس سے گذرے ہوں گے۔ ان میں سے انگارے اُچھلتے ہیں
یا پھول نکلتے ہیں۔ تیسری مثال اور لیجئے۔ مُنہ سے پھول جھڑنا کیوں بولتے
ہیں۔ مُنہ نہ ہوا کسی باغ کا بوٹا یا گلِ گلزار وجاہت ہوا۔

میر ناصر علی خاں دہلوی

۱۸۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا ریاست بھوپال کی
ریزیڈنسی میں میر منشی رہے۔ نانا فوج میں صوبہ دار تھے۔ والد مولوی سید
ناصر الدین ابوالمنصور اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ بڑے بھائی میر نصرت علی
"نصرت الاخبار" کے مالک اور اڈیٹر تھے۔ میر ناصر علی نے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔
اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں نانپارہ ضلع بہرائچ میں مدرس ہوگئے۔ وہاں سے
آپ محکمہ نمک میں لیلئے گئے۔ اس محکمہ میں ۴۰ سال نیک نامی کے ساتھ خدمت
کرکے پنشن لی۔ خدمت سرکاری سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست پاٹودی
ضلع گڑگاؤں میں دیوان ہوگئے۔ گورنمنٹ نے "خان بہادر" کا خطاب دیا۔
۱۹۱۱ء میں دربار تاجپوشی کے موقع پر جب دہلی کے قلعہ معلّٰی میں عجائب خانہ
مرتب کیا گیا تو اس کے اہتمام میں میر ناصر علی خاں بھی شریک تھے۔ پھر ملک معظم
جارج پنجم کی خدمت میں بھی باریاب ہوئے۔ طویل عمر پاکر ۱۹۳۳ء ۱۳۵۲ھ میں رحلت فرمائی۔

اتفاق سے اُن کا نام ہی ان کی تاریخ وفات ہے :-

"میر ناصر علی خاں" (۱۳۵۲)

ادبی خدمات | میر ناصر علی خاں اُن ادیبوں میں ہیں جو صرف ایڈیٹری اور مضمون نگاری کے سبب سے نامور ہوئے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ لیکن زبان و ادب کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ آغاز شباب سے مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔ اردو اخبارات و رسائل میں مقالہ نگاری کا صحیح مذاق سر سید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" (جاری شدہ ۱۸۷۰ء) سے پہلے پیدا نہ ہوا تھا۔ سر سید کی تحریروں نے انشا پردازی میں نئی روح پھونکی میر ناصر علی خاں نے اپنے لئے اخبار و رسائل کی ادارت کو اردو کی خدمت کا ذریعہ تجویز کیا۔ چنانچہ "تیرھویں صدی" "زمانہ" وغیرہ پرچے نکالے۔ اور ان کے ذریعہ سے صحیح زبان، دلکش اسلوب اور پاکیزہ خیالات کے نمونے پیش کئے۔ آخر میں "صلائے عام" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا، جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ اسی پرچے سے اس کے مالک و مدیر کی ساری شہرت ہے۔ "صلائے عام" اور میر ناصر علی خاں کے مقالات کی تمام ادبی دنیا میں دھوم تھی۔

میر ناصر علی خاں لکھنؤ میں بھی رہے تھے، اور وہاں کی زبان کا اپنی زبان سے مقابلہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں کا فرق ایک مضمون میں بتاتے ہیں :-

"دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں آیا، یہ ہے کہ دہلی میں سقہ جو نل پر مشک بھر رہا ہے، دوسرے سقہ سے جس زبان میں باتیں کر رہا ہے، اسی زبان میں لال قلعہ تک باتیں سنتے چلے جایئے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلفی ہے۔ لکھنؤ میں خاص کی زبان اور ہے عوام کی زبان اور"۔

میر صاحب شاعر نہ تھے، لیکن نثر میں، شاعری کرتے تھے۔ "یہ نثر کی شاعری"

مولوی عبدالحلیم شرر نے ایسی کی کہ کمال کی حد ختم کر دی، لیکن اس کی ایجاد و ابتدا کرنے والوں میں میر ناصر علی خاں بھی تھے۔ شرر کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نئے خیالات اور خیال آفرینی کے اسلوب، انگریزی انشا پردازوں سے لئے، اور ان کو اردو زبان کے طرز ادا کے ساتھ، اور شعرائے ہند کے مذاق ادب کے مطابق مرتب کر کے پیش کیا۔ یہی کام ناصر علی خاں اور عبدالحلیم شرر سے پہلے علامہ محمد حسین آزاد نے "نیرنگ خیال" میں کیا تھا۔ لیکن وہ "تمثیلی رنگ" ہونے کے سبب سے ایک صنف خاص تھا۔ شرر اور میر صاحب صرف تمثیل کے پابند نہ تھے۔ نئی بات نئے انداز سے لکھنی چاہتے تھے۔ پاکیزہ خیالات پیدا کرنے چاہتے تھے۔ میر ناصر علی خاں "صلائے عام" میں لکھتے ہیں:-

"صلائے عام میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خیال کی تلاش زیادہ ہوتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے لوگ بھی ہیں جو لیاقت علمی سے خالی ہوں، مگر خیال کی داد دینے کے لئے علم و لیاقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے اہل علم و کمال میں خیال کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان ہے۔ مضمون پیدا کرنے میں جو خون جگر کھانا پڑتا ہے، اس کے سمجھنے کے لئے دل و دماغ چاہئے اور دل و دماغ بخت عرفی[۵] کی طرح ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔"

میر صاحب کا طرز تحریر بھی یہی ہے کہ زبان شستہ و صاف، سادہ سلیس لکھتے ہیں۔ لفظوں اور ترکیبوں میں استعارے پیدا نہیں کرتے، بلکہ پوری بات یا سارے مضمون کو خیالی و مجازی بنا دیتے ہیں۔ دو چار نمونے یہ ہیں۔

---

۵ اس فقرے کے حوالے میں میر صاحب نے حاشیہ پر عرفی کے قصیدہ کا یہ مطلع درج کیا ہے:-

جہاں بگشتم و دردا، بہیچ شہر و دیار
نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

۱۔ "عرس و سالگرہ"۔ صلائے عام کا مضمون ہے۔ شروع میں تقریب تحریر بیان کردی ہے مختلف حصّے نقل کئے جاتے ہیں۔

اخبار والے، جن کو سخن گستری کا شوق ہے، سال کے انجام و آغاز کے دو مضمون ذرا زور سے لکھتے ہیں۔ اتفاق سے مجھے ان دونوں دو مضمون علیحدہ علیحدہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ ایک مضمون کی بچت نکال کر سال کے انجام و آغاز کو میں عرس و سال گرہ سے تشبیہ دیتا ہوں۔ ۳۱ دسمبر کو تو گویا پیر گردوں کا عُرس سمجھئے۔ اور یکم جنوری کو گردش روزگار کی سال گرہ ......

ہر سال کا اخیر میری نگاہ میں زمانہ کا عرس ہے کہ جس طرح اولیاء اللہ کو کہتے ہیں کہ فنا نہیں۔ اُن کا ہماری نظر سے غائب ہونا "وصال" سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سال کا غائب ہونا جزو کل میں مل جانا ہے۔ اسے وصال نہیں تو اور کیا کہئے؟ ورنہ زمانہ وہی ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ گئے ہوئے زمانہ کو آپ فاتحہ خیر سے یاد کریں کہ حاصل عُرس بزرگان یہی ہے اور گردشِ روزگار کی سال گرہ منائیں کہ دنیا کا مدار اسی پر ہے ؎

لو ابتدا سے ہم کہیں اب داستانِ عشق
آخر شبِ فراق کو تو انتہا نہیں

اتفاقاتِ زمانہ سے پیر گردوں کی سال گرہ کا دن یہی تھا جو گردشِ روزگار کی سال گرہ کا دن ہے کہ آغاز عالم میں تمام کائنات ایک ہی وقت کُن فیکُون سے پیدا ہوئی۔ پیر گردوں کی سال گرہ کی یادگار کہکشاں آسمان پر موجود ہے ؎

دوستانِ رفتہ کی روداد کس سے پوچھئے
بات کے لائق کوئی شہرِ خموشاں میں نہ تھا

سال گرہ دراصل کوئی عقدۂ لاینحل نہیں۔ حسین وعدہ کی گرہیں خضر کے رشتۂ عمر سے زیادہ لگاتے ہیں۔ گو قطرہ اشک کی شکل گرہ سے زیادہ تشابہ ہے ؎

غفلت شریک حال تھی پہلے بھی حسن کے
یوسف کنوئیں میں دیدۂ یوسف میں خواب تھا

پھر بے ثباتی عالم کی مثالیں بیان کر کے مضمون کو ان فقروں پر ختم کرتے ہیں۔

انگریزی میں کسی شاعر کا مضمون ہے کہ حسن اس لئے دلفریب ہے کہ ہماری ہستی کی طرح بے ثبات ہے۔ اور علم کی قدر ہماری نگاہ میں اس لئے ہے کہ اس میں کمال مشکل ہے۔ مرنے کے بعد کسی چیز کو کمال حاصل ہو تو عالمِ اسباب میں کمال کی قدر نقص سے ہے اور ہنر کی قدر عیب سے۔ بیداری کی قدر غفلت سے اور زندگی کی قدر موت سے بچے جن کھلونوں پر جان دیتے ہیں جوان اُنھیں پھینک دیتے ہیں۔ اور جوانوں کو جو باتیں عزیز ہیں بوڑھے اُنھیں فضول سمجھتے ہیں۔

لیکن مجھ سے پوچھئے تو اس عالم کی مختصر سے مختصر زندگی مرنے کے بعد قیامت تک زندہ رہنے سے کہیں اچھی ہے اور اس دار فانی کی اُلجھن عالمِ بقا کے وعدوں سے جن کے پورا ہونے کا حال معلوم نہیں (آگے کیا عرض کروں) ؎

چھوٹی سے چھوٹی رات بھی اچھی ہے وصل کی
چھوٹے سے چھوٹا دن بھی ہے اچھا بہار کا

میر صاحب کے آخری خیال سے آجکل کے انقلاب پسندوں اور مادّہ پرست نوجوانوں کو سند ہاتھ آتی ہے۔

۲۔ "خیال بمقابلۂ زبان"۔ اس مضمون کے بعض فقرے زبان و خیال کے متعلق اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد میر ناصر علی خاں انگریزی انشا پردازوں کے چند خیالات پیش کرتے ہیں:۔

اُدھر ملکوں کی زبانوں میں خیال کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ ہر بات میں نیا مضمون پیدا ہو۔ آئینہ کو ہم حیراں باندھنے سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ یونان کے کسی

شاعر نے اس میں ایک نئی بات پیدا کی کہ کوئی حسین جس کی جوانی کا انحطاط قریب ہے زہرہ کے مندر پر آئینہ چڑھانے گئی۔ چڑھاتے وقت کہتی ہے کہ آئینہ کی اب مجھے ضرورت نہیں۔ جیسی میں تھی وہ صورت تو اب آئینہ میں کاہیکو نظر آئے گی۔ جو شکل ہونے والی ہے اس کو دیکھ کر کیا کروں گی؟ جوانی کے بعد جو میری صورت ہوگی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی۔ اب آئینہ کو رکھ کر کیا ہوگا؟ یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہو جائے گی۔

ایک کم سن لڑکی جو اب تک گڑیوں سے کھیلتی رہی صغیر سنی کی شادی میں از روے رسم مندر میں پوجا کے لئے گئی۔ اور لوگ جہاں چڑھاوے کی چیزیں لے گئے تو یہ اپنی گڑیاں ساتھ لیتی گئی کہ اب ان سے کھیل چکی ان کو چڑھانے کے لئے لائی ہوں۔ دیبی جی جن کو گھر کے جھگڑوں سے فرصت ہے گڑیوں سے کھیلیں گی۔ شادی کے بعد کھیلنا معلوم۔

عقل نے عشق سے کہا کہ اکیلے تو میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں کہ ایک کی لڑائی ایک سے برابر کی لڑائی ہے مگر تیرے ساتھ اگر دختر رز ہو گئی تو پھر تیرا مقابلہ مشکل ہے۔

شکاری بھاگتے ہوئے شکار کے پیچھے پیچھے کوہ و بیاباں میں دوڑتے ہیں مگر مارا ہوا جانور مل جائے تو اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ یہ حال عشق ہرجائی کا ہے جو گھر کی پارسا عورت کو چھوڑ کر بازار میں پھرتا ہے۔

ایک خونی کسی دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگ۔ اس کی آنکھ کھل گئی :۔ وہاں سے اٹھ کر بھاگا اس کے بھاگتے ہی دیوار گری۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ خدا نے مجھ پر بڑا رحم کیا کہ گرتی دیوار سے بچا لیا۔ ورنہ دب کر مرجاتا۔ آواز آئی کہ

ہم نے اس موت سے اس وقت تجھے بچا لیا کہ یہ آسان تھی تجھے اس تکلیف کی موت سے سب کے سامنے مارنا منظور ہے جسے پھانسی کہتے ہیں۔ دیوار سے دب کر مرنا مرگِ ناگہاں میں سمجھا جاتا تیرے اعمال کی سزا میں مارنے کے لئے تجھ کو چھوڑا ہے تاکہ جلّاد کے ہاتھ سے مارا جائے۔

ایک بچّے کی قبر پر کندہ ہے کہ میرے ماں باپ میرے لئے نہ روئیں کہ اگر میں نے زندگی کا لطف نہیں دیکھا تو اس کی مصیبتیں بھی نہیں اُٹھائیں۔ اِدھر کی کسر اُدھر نکل گئی۔

کسی کے غم میں موت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی کر گئی۔ بھلا میرے ساتھ تو کر۔ کہ مرنے والے کی یاد چھین تو لے؟

یہ چند خیال میں نے اہلِ علم و کمال کی طبع آزمائی کے لئے جمع کر دئے کہ ان پر مضمون لکھیں۔ یہ خیال نظم کی خوبیاں مانگتے ہیں جن سے میں عاری ہوں۔ شعراء اُردو ان کو نظم میں ادا کریں تو ان کا لطف دوبالا ہو جائے۔ میں نے بُری بھلی اُردو میں ان کا مطلب ادا کر دیا اب آپ جانیں اور آپ کی نازک خیالیاں ۵

کیوں خاک میں ملاتے ہو رفتارِ ناز سے
مٹّی میں لوٹتا ہے ڈوپٹہ اُٹھائیے

خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی

حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ہیں۔ اگست ۱۸۶۵ء (ربیع الاول ۱۲۸۲ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود ایک رباعی میں اپنا نسب بیان کرتے ہیں:۔

حمدِ حق لکھوں گا یا نعتِ نبیؐ لکھوں گا
وصفِ سبطین کا، تعریفِ علیؓ لکھوں گا
زیدی النسل ہوں، سیّد ہوں، مجھے بھانہ جان
مدح غیروں کی نہ لکھی، نہ کبھی لکھوں گا

۵ ان حالات میں دوسری کتابوں کے علاوہ حضرت فراق کے فرزند ارجمند حکیم سید ناصر خلیق فگار دہلوی کے مضمون مطبوعہ یادگار لاہور (بابت اپریل ۱۹۳۳ء) سے بھی مدد لی گئی ہے۔

ان کے دادا منصب دار تھے۔ والد میر محسن علی بڑے عالم، درویش صفت بزرگ تھے۔ والدہ بھی علوم ظاہر و باطن میں کامل تھیں۔ میر ناصر نذیر نے خواجہ میر درد کی سوانح عمری "میخانۂ درد" کے نام سے لکھی ہے اس میں اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے اپنے والدین ماجدین کی صحبت چوالیس سال اٹھائی، اور ان دونوں حضرات نے مجھے ان کمالات ظاہری و باطنی سے، جو وراثتہً خواجہ میر درد صاحب سے پونہچے تھے، مالا مال کر دیا۔"

اس فیضان کے علاوہ میر فراق نے فارسی و عربی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور درس نظامیہ ختم کر کے سند لی۔ پھر فن طب کی طرف توجہ کی۔ پہلے حکیم بدرالدین خاں دہلوی سے اس فن کو حاصل کیا۔ پھر حکیم محمود خاں دہلوی اور ان کے فرزند اکبر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔

غدر کے بعد میر فراق کے والد اور دادا کو رئیس دھرم پور (ضلع بلند شہر) نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ پھر فراق صاحب کو رئیس نے اپنا طبیب خاص اور اپنے صاحبزادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ ایک عرصہ تک ان سے وابستگی رہی۔ اور علاج معالجہ میں خوب شہرت پائی۔ رئیس کے انتقال کے بعد فراق صاحب علی گڈھ کالج کی طرف سے سفیر بن کر بمبئی، بڑودہ، احمد آباد تشریف لے گئے۔ اس تعلق کے ختم ہونے کے بعد اپنے وطن دہلی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اور کوچۂ چیلان بارہ دری خواجہ میر درد میں باقی عمر گذار دی۔

میر فراق صاحب شاعری میں مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ علامہ آزاد لاہور سے دہلی آئے اور خان بہادر مولوی ذکاءاللہ کے مکان پر قیام فرمایا۔ میر فراق کی جوانی کا آغاز تھا اور شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنے والد سے درخواست کی اور وہ ان کو ساتھ لیکر علامہ آزاد کی خدمت میں

گئے۔ یہ غزل لے گئے تھے۔ آزاد کے ارشاد پر غزل سنائی۔ انھوں نے سُن کر فرمایا، "ماشاء اللہ

این سعادت بزورِ بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بھئی کیوں نہ ہو، آپ حضرت دردؔ کے خاندان سے ہیں، اور کلام میں پورا پورا رنگ حضرت دردؔ کا ہے۔ بھلا میں کیا اصلاح دے سکتا ہوں۔"

جب فراقؔ صاحب کے والد نے اصرار کیا تو علامہ آزاد نے فرمایا، "اچھا میر صاحب میں بھی دلّی میں ایک دوسرا آزاد بنا دیتا ہوں، جاؤ میاں مٹھائی لے آؤ۔" چنانچہ فوراً مٹھائی آئی اور آزادؔ نے ان کی غزل میں اصلاح دی۔ پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔

میر ناصر نذیر فراق کے خاندان میں قدیم سے سلسلۂ نقشبندیہ جاری تھا۔ خواجہ میر درد اسی سلسلے کے درویش کامل تھے۔ لیکن میر فراقؔ نے چشتیہ طریقہ میں حضرت شاہ سلیمان تونسوی قدس سرہٗ کے پوتے حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت حاصل کی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میرا سلوک پورا ہو گیا اور میں اپنے مقصد کو پہنچ گیا۔ مرض الموت میں بھی اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ "تم کو معلوم نہیں ہے میرا پاس انفاس ہر وقت جاری رہتا ہے۔" بعض رباعیوں میں اپنا مسلک بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

سب ہیچ ہے نمود اِلَّا اللہ　　کچھ بھی نہیں یہ تار و پود۔ اِلَّا اللہ

کہتے ہیں فراقؔ، جن کے دل روشن ہیں　　لَا فَاعِلَ فِی الْوُجُوْد اِلَّا اللہ

وفات سے ایک مہینہ قبل جنوری ۱۹۳۳ء میں فرما دیا تھا کہ "ہمارا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا ہے، اور وہ فقیر کیا جو اپنی مرگ سے آگاہی نہ رکھتا ہو۔" انہی دنوں میں ان کے ایک دوست مزاج پرسی کے لئے آئے، تو ان سے فرمایا، "بھائی اب رواداری ہے۔ میں نے یہ شعر اپنے حسبِ حال کہا ہے۔"

منائے گی بکرے کی ماں خیر کب تک　　کرے گا اس عالم کی تو سیر کب تک

چنانچہ دوشنبہ شب میں ۱۸ر فروری ۱۹۳۳ء (شوال ۱۳۵۱ھ) کو رحلت فرمائی۔ قرآن مجید سے تاریخ وفات ہے:۔

اَلْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ = ۱۹۳۳ (سورہ قمر آخری آیت، پارہ ۲۷)

تصانیف اور طرز تحریر

میر ناصر نذیر فراق کی فہرست تصانیف یہ ہے:۔

۱۔ میخانۂ درد۔ حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات۔

۲۔ دلّی کا آخری دیدار۔ دہلی و بادشاہ دہلی، اہل شہر و اہل قلعہ کی معاشرت رسم و رواج، اشغال، میلے، تہوار، سب کچھ بیان کئے ہیں۔

۳۔ لال قلعہ کی ایک جھلک۔ دہلی کے آخری تاجدار ابو ظفر بہادر شاہ کے زمانے کا لال قلعہ پورا اس کتاب میں منعکس ہے۔

۴۔ دلّی کا اُجڑا ہوا لال قلعہ۔ مختصر کتاب ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے فرزند شاہرخ میرزا کے نیسکار کجلی بن کے حالات ہیں۔

۵۔ بیگموں کی چھیڑ چھاڑ۔ ایک شادی کی محفل کا نقشہ ایک بیگم کی زبانی پیش کیا ہے۔

۶۔ سات طلاقنوں کی کہانیاں۔ سات عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی کہانی کہتی ہیں کہ ان کو کس وجہ سے طلاق ملی۔

۷۔ دکن کی پری۔ ایک طویل افسانہ۔

۸۔ مضامینِ فراق۔ مصنف کے افسانوں کا مجموعہ۔

۹۔ چار چاند۔ مصنف کے چند مضامین کا مجموعہ۔

میر ناصر نذیر فراق جس دلّی کی خود یادگار تھے۔ اسی دلّی کی یادگار انکی زبان اور ان کی کتابیں ہیں۔ انھوں نے کوئی علم و فن کی کتاب نہیں لکھی۔ ان کا قلمی کارنامہ لطف زبان اور حسن بیان کے ساتھ دہلی کی تہذیب و تمدن کا

آخری نمونہ پیش کرتا ہے۔ ان کے طرز تحریر کی داد ان کے ایک ہم پایہ اور ان سے بزرگ ادیب دیتے ہیں۔ فراق صاحب کے صاحبزادے نے ان کے حالات میں لکھا ہے:-

"منشی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ آپ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے اور فرمایا، بھائی صاحب، کمال کیا ہے، اتنے چھوٹے سے افسانہ "اختر محل" میں اتنے دلّی کے ٹھیٹھ محاورے آپ نے بھر دیئے کہ مجھ کو حیرت ہے۔ میں تو آپ کو سلطان زبانِ اردو کہتا ہوں۔ چنانچہ خطوط میں ان کو "سلطان زبان اردو" لکھا کرتے تھے۔"

دو ایک نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ۔ اس مضمون میں سید ناصر نذیر فراق نے دلّی میں بیاہ کی ایک محفل جمائی ہے۔

(۱) ایک بیوی کالے محل سے مہمان آئی تھیں، ان کا نام تھا حضرت بیگم وہ بڑی اکھل کھری اور مزاج کی بڑی کڑوی تھیں حسن جہاں کی باتیں سُن سُن کر بہت گھٹتی تھیں اور بیٹھی کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کرتی تھیں۔ بی دولتی اپنے تیہے میں آپ ہی آپ کھولتی، کھانا پینا پان چھالیہ، زردہ، الائچی، چٹنی، اچار، مربہ، مٹھائی، ناشتہ، سب کچھ حسن جہاں کے تحت میں تھا۔ سچ مچ خالہ جان نے انھیں کُل کُلاں کا مالک کردیا تھا۔ اس مارے بعض بیو قوفیں اُن سے اور کھسیانی تھیں۔ ایک دن حضرت بیگم اور حسن جہاں کا مُچیلہ ہوگیا۔ حضرت بیگم کے دل میں حسن جہاں بیگم کی طرف سے ناحق کا غبار تو بھرا ہی ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایک بیوی سے کہنے لگیں اے بوا رضیہ سلطان سنتی بھی ہو قلعہ کی بیگمیں بلی کو نکٹی کہا کرتی تھیں۔ یہ چھوٹی ناک بھی کیا بُری معلوم ہوتی ہے۔ کمبخت پیّا پھرا ہوا اور بہن مجھے تو زیادہ گوری رنگت سے بھی نفرت ہے جیسے پھیکا شلجم۔"

حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی اُن کا ٹپکا پڑتا تھا سمجھ گئیں کہ پھبتی مجھ پر ہی ڈھالی گئی ہے۔ وہ بھلا کب چوکنے والی تھیں۔ کہنے لگیں "پھیکا شلجم

تمباکو کے پنڈے سے تو یہ طرح اچھا ہوتا ہے اور مجھے بڑی ناک دیکھ کر گھن آتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے رسل کا بٹہ کسی نے چہرے پر دھر دیا ہے۔ اونچی ناک کولا ڈھُر" یہ مثل تو تم نے سنی ہوگی"۔ حضرت بیگم کی رنگت بھی کالی بھٹ تھی اور ناک بھی ان کی بیڈول اونچی تھی۔ حسن جہاں کے اس کہنے پر سب بیویاں بیگمیں ہنس پڑیں۔ اور بی حضرت بیگم بگڑ گئیں۔ ہنسی میں کھسی ہوگئی اور بی حسن جہاں کی اور ان کی خوب ذنگو دنگ ہوئی۔

(۲) رات کے بارہ بجے برات آئی۔ سمدھنیں بڑے جلوسے کے ساتھ اُتریں جھڑاں جال کے جوڑے، کمخواب، زرّی۔ بوٹی پوتھ کی نہ پوشیاں نیچے نیچے کرتے، ہمارے بچپن میں کوئی بیوی کُرتہ پہنے آجایا کرتی تھی تو اُس پر تیلن گھوسن کی پھبتیاں اُڑا کرتی تھیں یا اب ساری بیگموں نے یہی وضع طرح لے لی ہے۔ سچ ہے "کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات"۔ سمدھنیں بڑے ٹھسے کے ساتھ مسند پر گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھیں، شربت پلانے کے لئے بھی ہماری بجلی بسنت بی حسن جہاں اور ننکا مُبارک نسار کھڑی ہوئیں۔ مبارک نسار کے ہاتھ میں چاندی کی کشتی اور اس میں شربت کا شیشہ بلّوری پیالی اور بی حسن جہاں کے ہاتھ میں ریشم کا رومال مُنہ پوچھنے کے لئے اللہ کی بندی رومال کا گھسا اس زور سے دیتی تھی کہ شربت پینے والی پھڑک جاتی تھی، مُنہ اور باچھیں چھل کر لال ہوجاتی تھیں بعض جلاتن کہدیتی تھیں" اسے پھٹکار یہ منہ پوچھتی ہو یا کبھی کا بیر نکالتی ہو؟"

آغائی بیگم۔ دولہ کی بہن کا جو مُنہ پونچھا تو رگڑے کے ساتھ اُن کی ناک کی کیل اُلجھ کر ناک میں سے نکل گئی اور وہ بیچاری مُنہ پکڑ کر کہنے لگیں" شاباش بُوا شاباش دیکھت کی تو تم کامنی سی ہو مگر ہاتھ تو ماشاء اللہ لوہے کی میخیں ہیں دیکھو میری ناک کی کیل تمہارے رومال میں اُلجھ کر چلی گئی ہے"۔

حسن جہاں "بوا دکھلی میں سر دیا تو دھکوں سے کیوں ڈرتی ہو۔ خدا رکھے بھائی کو بیاہنے آئی ہو نیگ جوگ کے روپے ڈھیر سارے تمہارے تکڑ میں جائیں گے۔ سمدھن بنا ٹھٹھہ ہے ابھی تو منہ ہی منہ چونچلے ہیں بڑا لاگیں جب ڈومنیوں کی موٹی موٹی گالیاں کھاؤ گی اس وقت معلوم ہوگا کہ کیسے بیسی کا ساٹھ ہوتا ہے اور بوا ناک کی کیل تو ہم نے دیکھی بھی نہیں۔ سچ کہنا بہن گھر سے بھی کچھ آئی تھیں یا مفت خدا میں مجھے لئے مرتی ہو۔"

رومال جھاڑا تو اس میں سے کیل نہ نکلی۔

آغائی بیگم۔ بھئی اللہ جانتا ہے ہماری کیل ڈھونڈو اس میں ترنی جڑی ہوئی ہے۔"

حسن جہاں "بہن آغائی بیگم تم کیل کے مارے کیوں ہلکی جاتی ہو۔ مانگے کی تو پہن کر نہیں آئی تھیں۔ تمہاری نہ ملے گی تو میں اپنی ہیرے کی کیل تمہیں دیدونگی۔ مگر تم ذرا چھری تلے دم تو لو۔

اتفاق کی بات کیل آغائی بیگم کی گود میں جا پڑی تھی۔ جب مل گئی تو حسن جہاں کی چڑھ بنی کہنے لگیں "واہ بوا بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا کیل تو آپ چرائے بیٹھی ہیں اور لوگوں کو اوپر ڈر سے پکڑتی ہیں۔"

یہ دو نمونے زبان و محاورات دہلی کے تھے۔ اب ایک نمونہ سید ناصر نذیر کی تاریخی خیال آرائی کا دیکھئے۔ ایک مضمون "قوت مجاز" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اسکا اقتباس یہ ہے:۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار
صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

بعض مورخوں نے قیس عامری (مجنوں) اور لیلیٰ کے حالات کو اتنا کریدا کہ حسن و عشق کی داستان کو بے نمک کر دیا۔ کیونکہ وہ خشک دماغ ہیں اور تصوّف

سے بے نصیب خدا نے نہ انھیں ایسی آنکھیں دی ہیں جو کسی محبوب کے بناؤ سنگار کو دیکھکر مائل ہو جائیں۔ نہ ان کے سینہ میں ایسا گرم دل ہے جو کسی کی باریک مانگ اور چنے ہوئے دوپٹے کی بہار دیکھکر لوٹ ہو جائے اس لئے وہ ایک باؤلے مرد اور ایک سانولے رنگ کی عورت کی کیا وقعت کرتے، اگر ہم مورخوں کے مسلک کو اختیار کرنا نہیں جانتے۔ بلکہ اپنے مشائخ کی لکیر کے فقیر بنتے ہیں۔ اور اہل دل کو حضرت قیس اور بی لیلیٰ کی شیریں داستان سناتے ہیں۔ یعنی جب قیس لیلیٰ کے عشق میں سڑی ہو گئے۔ تو ان کے باوا جان انھیں جدہ سے لیکر مکہ معظمہ پہنچے۔ ہاتھ پکڑ کر حرم محترم میں لائے اور کعبہ کو دکھا کر کہا "بیٹا یہ اللہ کا گھر ہے۔ یہاں دعا قبول ہوتی ہے۔ اور جو مانگو وہ ملتا ہے۔ تم اس کے گرد سات دفعہ پھرو اور غلاف پکڑ کر عرض کرو الٰہی تو میرے دل سے وحشت دور کر دے، میرے دل سے وحشت دور کر دے، میرے دل کو ٹھہرا دے، میرے سر میں جو لیلیٰ کا سودا سما گیا ہے اُسے دور کر دے۔" قیس نے باپ کے آگے سر جھکا دیا۔ اور طواف میں مشغول ہو گیا۔ باپ نے سات بار گرد پھرنے کو کہا تھا۔ قیس نے تو سیہ سے چکر کاٹنا شروع کیا تو گنتوں گذار دیئے۔ پھرکی کی طرح پھرے جاتا تھا۔ باپ نے کہا بیٹا بس کرو۔ سر چکرا جائے گا۔"

قیس۔ باوا جان مدّت کے بعد تو یہ دن نصیب ہوا کہ لیلیٰ کا گھر ملا ہے۔ اب تو جب تک میرا جی نہ بھرے گا میں صدقہ واری ہوتے ہی جاؤنگا۔"

باپ۔ میری جان کیا باؤلی باتیں کرتا ہے۔ یہ لیلیٰ کا گھر نہیں ہے۔ خدا کا گھر ہے۔"

قیس۔ باوا جان لیلیٰ اور خدا ایک ہے۔ کوئی اسے خدا کہتا ہے کوئی لیلیٰ کہتا ہے۔"

باپ۔ میں نے تم سے کہا تھا۔ تم اپنے لئے دعا کرو مگر تم بھول گئے۔"

قیس۔ نہیں حضرت میں بھولا نہیں ہوں اچھا میں دعا کرتا ہوں یہ کہکر قیس نے کعبہ کا غلاف پکڑ لیا اور بہت ادب کے ساتھ عرض شروع کی "اے لیلیٰ تجھے اپنے اس سیاہ دامن کی قسم مجھے تو بھولنا نہیں میرے سینے میں تیری یاد آگ بنکر بھڑکتی رہے"۔ قیس کی یہ باتیں سُن کر مہربان باپ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ ادہر اس کے رونے پر کعبۃ اللہ کے سب حاضرین کے دل بھر آئے اور وہ بھی رونے لگے۔ کسی نے کہا اسے حضرت رسول اللہ کی خدمت میں لے جاؤ۔ آپ کی نظر توجہ اس پر پڑ جائیگی تو یہ اچھا ہو جائے گا۔ لگی بُری ہوتی ہے۔ باپ قیس کو لے کر حضور میں حاضر ہُوا۔ اور آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا "بیٹا یہ پیغمبر آخرالزماں ہیں۔ سارا عرب آپ پر ایمان لایا ہے! تو بھی آداب بجالا"۔ قیس نے حضور کے چہرۂ نورانی کو غور سے دیکھا۔ اور ایک آہ بھر کر کہا۔ "ان کی شان نبوت کی پہچان تو عاقل کر سکتے ہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے ان کی آنکھیں بالکل لیلیٰ جیسی ہیں"۔

"سنا ہے یہ بادۂ محبت کے متوالے امیر معاویہ کے دور حکومت تک زندہ رہے اس وقت میں خلافت کا مسئلہ ہر ایک کی زبان پر رہتا تھا۔ ان چرچوں کو سن کر قیس بولے بھائی خلافت کے مستحق نہ ابوبکرؓ نہ عمرؓ نہ عثمانؓ نہ علیؓ نہ معاویہ نہ یزید۔ حق لیلیٰ کا تھا۔

ایک بار انہیں خبر لگی کہ آج کل لیلیٰ کو ریچھ کے ناچ دیکھنے کا بڑا شوق ہے اور روز ایک ریچھ والا جاتا ہے۔ اور ریچھ کا ناچ دکھا کر انعام لے آتا ہے۔ انہیں کہاں تاب تھی ریچھ والے کے پاس پہنچے اسے روپے دئیے اور کہا مجھے ریچھ کی کھال اوڑھا کر اور ریچھ بنا کر لیلیٰ کے پاس لے چل میں اس بہانے سے اپنے یار کا جمال دیکھ لوں گا۔ قلندر لالچ میں آگیا۔ اور قیس کو ریچھ بنا کر لے گیا۔ لیلیٰ ڈگڈگی کی آواز سن کر اپنے جھروکہ میں آ بیٹھی

اور جھومرا ناچنے لگا؛ حضرت قیس نے اپنے محبوب کے خوش کرنے کے لئے وہ وہ نرت کئے وہ وہ اُچھلے کودے کہ لیلیٰ پھڑک پھڑک گئی اور سمجھ گئی کہ میرا سچا طالب ریچھ کے بھیس میں آیا ہے۔ دل کا مالک تو اللہ ہی تھا مگر قوم قبیلہ کے دکھانے کے لئے ریچھ والے سے کہا کیوں رے نامراد خدا تجھے سمجھے یہ آج بے نکیل کا ریچھ کیوں لایا ہے۔ تجھے خوف نہیں تو ہمیں تو خوف ہے۔ یہ بپھر پڑا تو دو چار کی جان لے لیگا کل اسے لائے تو اسکی ناک میں ڈوری ڈال کر لانا۔ قیس نے اس ناچنے کودنے میں ریچھ والے سے بہت آہستگی کے ساتھ کہا بھائی تو خدا کے واسطے میری ناک ابھی چھید دے تاکہ سرکار خوش ہو جائیں؛

ریچھ والا۔ (لیلیٰ کی طرف مخاطب ہو) حضور میں ابھی اسکی ناک چھید سے ڈالتا ہوں؛

لیلیٰ۔ نہیں نہیں ہم سے یہ ظلم نہیں دیکھا جائیگا، اپنے گھر لے جاکر چھیدنا یہ کہہ کر لیلیٰ نے ریچھ والے کو رخصت کر دیا؛ بس اب ہمارے دروازے پر نہ آنا ہمارا دل ریچھ کے ناچ سے آج بھر گیا ہے؛

اس دور کی نثر پر تبصرہ

۱- یہاں تک جن مصنفوں کا ذکر کیا گیا یہ سب وہ ہیں جن کی کم سے کم نصف عمر انیسویں صدی میں گذری اور جو ختم صدی سے پہلے مستقل مصنف اور انشاپرداز کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ ان میں چند ایسے ہی ممتاز مصنفوں کی کمی بیک نظر معلوم ہوتی ہے مثلاً

(۱) پنڈت رتن ناتھ سرشار
(۲) مولوی عبدالحلیم شرر
(۳) مرزا محمد ہادی رسوا
(۴) منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ

لیکن ان کو بالقصد اس تاریخ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کی سب سے پہلی اور بڑی حیثیت ناول نگار کی ہے۔ اگرچہ ناول نویسی کی بنیاد ان سے پہلے پڑ گئی تھی، اور ان کے بھی اکثر ناول انیسویں صدی ہی کے ہیں۔ لیکن اس فن کا ارتقا بیسویں صدی میں ہوا ہے، اسی طرح ظرافت نگاری عصر حاضر میں کمال کو پونہچی ہے۔ شرر و رسوا، اور سرشار و سجاد حسین ناول اور ظرافت کے پیش رَو ہیں۔ اس حیثیت سے جدید ناول نویسوں اور مزاحیہ نگاروں سے پہلے ان بزرگوں کا تذکرہ ہونا چاہئے۔ اور اس کے لئے علحدہ تالیف کی ضرورت ہے۔

۲- جس زمانے تک اس تالیف کو ختم کیا گیا ہے، اس میں تصانیف کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ مصنفوں کے صرف ناموں کا شمار و احاطہ بھی محال ہے

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جن مصنفوں کا ہم نے تذکرہ لکھا ہے، ان سے بہتر اور مشہور تر کوئی مصنف نہ تھا (بجز مذکورۂ بالا ناول نگاروں کے)

۳۔ اُنیسویں صدی کے آخری ۳۰ سال کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ یہ "دورِ مشرقیت" اور "زمانہ تصنیف و تالیف" ہے۔ اور بیسویں صدی کا آغاز "عصر مغربیت" اور "عہدِ ترجمہ"۔ سر سید سے پہلے تو اس تفریق کا محل ہی نہ تھا۔ سر سید سے شبلی تک اکثر مصنفوں نے یا کتابیں تصنیف کی ہیں، یا عربی و فارسی سے تالیف۔ انگریزی سے ترجمے بہت کم ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے قانونی ترجموں کو چھوڑ کر، سب سے مشہور مولوی سید علی بلگرامی کے ترجمے ہیں۔ ان کے علاوہ جو ترجمے ہوئے ان کو شہرت اور قبول عام حاصل نہ ہوا۔

۴۔ اُنیسویں صدی کی تصانیف میں مغربی علوم و فنون کا اثر کم، اور انگریزی کے طرزِ ادا، اور جدّتِ اسلوب کا اثر بہت کم ہے۔ سر سید اور ان کے رُفقاء نے شبلی تک یورپ کے خیالات سے فائدہ حاصل کیا لیکن بالواسطہ۔ اسی لئے ان کے ہاں یہ رنگ ہلکا ہے۔ ان کے دوسرے معاصرین، مولوی چراغ علی مولوی سید علی بلگرامی، جسٹس کرامت حسین، مرزا ہادی رسوا، مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ نے براہ راست یورپ کی زبانوں سے فیض پایا، اس لئے ان کی تصانیف کے موضوع، اسلوب، ترتیب سب میں یہ اثر زیادہ نمایاں ہے۔

(مرزا ہادی رسوا کی خدمات دارالترجمہ اس وقت زیرِ بحث نہیں ہیں، وہ خاص بیسویں صدی کی چیزیں ہیں۔ ان کا تذکرہ الگ ہوگا)۔

۵۔ پُرانی تعلیم کے زیر سایہ اور "نئی روشنی" کی صبح صادق میں جتنے بہتر سے بہتر اسالیب بیان پیدا ہوسکتے تھے، وہ سر سید سے شبلی و شرر تک پیدا ہوگئے۔ اس امر میں سر سید کی جامعیت حیرت انگیز ہے۔ اکیلے سر

کی تحریریں، عالمانہ و فلسفیانہ، متین و مزاحی، نرم و گرم، ہر طرح کا اسلوب موجود ہے۔ شبلی اپنے اسلوب کے توازن و تناسب، صحت و پختگی میں سب معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں، لیکن سرسید کے جوش کی ان میں کمی ہے۔ حالی ان دونوں کے درمیان میں ہیں، اگرچہ جوش ان میں بھی نہیں ہے۔ حالی نے سرسید کی صحت و صفائی کو آگے بڑھایا، لیکن حُسن و موزونیت میں شبلی سے پیچھے رہے۔ نذیر احمد اور آزاد اپنے اپنے رنگ کے مُوجد و خاتم ہوئے۔ سرشار و سجاد حسین "پنچ" طرز ظرافت کے خداوند تھے۔

بیسویں صدی میں اقسام کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اسالیب بیان ایجاد ہوئے، اور تقریباً سب انگریزی زبان و علوم سے متاثر ہیں۔ عصرِ حاضر میں مغربی تعلیم سے اردو کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا، اور زبان و ادب کی اصلی خدمت ہوئی، وہ یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس، تاریخ و سیرت، ادب و انشا، تبصرہ و تنقید، ناول و افسانہ، وغیرہ مختلف موضوعات کے لئے الگ الگ مناسب و موزوں اسالیب مخصوص ہوگئے۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی یا خال خال تھی جیسا کہ ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں لیکن ان دو زمانوں (انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں کا ابتدائی زمانہ) کے مصنفوں میں عجیب و دلچسپ فرق یہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء و معاصرین کو جو اسلوب پسند تھا، وہ انھوں نے ابتدائے تحریر سے اختیار کرلیا، اور آخر تک اس پر قائم رہے۔ آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی کا انداز و طرز ان کی پہلی تصانیف سے موجود ہے۔ اس کی تکمیل و پختگی میں البتہ کچھ دیر لگی، لیکن اتنی ہی جتنی کسی اسلوب کے ہموار ہونے اور منجھنے میں لگتی ہے۔ برخلاف عصرِ حاضر کے، کہ اس زمانے کے سب نہیں تو بہت سے مشہور اہلِ قلم اسلوبوں اور اندازوں کے پیچھے دوڑتے پھرے۔ پھر کہیں مدت کے بعد کوئی روش اختیار کرسکے۔ ابوالکلام آزاد کی "عالمانہ و شاندار نثر" الہلال سے شروع ہوکر "تفسیر قرآن" تک رہی، پھر ہلکی پڑگئی۔ نیاز فتحپوری کی "نثر میں شاعری"

اور "ٹیگوریت" کچھ عرصہ جاری رہ کر ختم ہو گئی، اور "نثر میں نثر" لکھنے لگے۔ خواجہ حسن نظامی نے زبان میں چٹکلوں کا مزہ پیدا کیا، اور "چٹکیاں لیں، گدگدیاں کیں، لیکن ان کی بھی حد ہو لی۔ مُلا رموزی نے اردو کو گلابی رنگ دیا، یعنی "گلابی اردو" کے نام سے مُلّایانہ لفظی ترجمہ کا طرز لکھا' لیکن یہ رنگ پختہ نہ تھا، دُھل گیا۔ پھر مرزا جیسے شوخ رنگ اختیار کیا۔ اب وہ بھی "بادامی" رہ گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے طنزیات میں انفرادی طرز نکالا، شوخی میں ادبیت پیدا کی، لفظوں کے معنی اور معنوں کے لفظ ایجاد کئے۔ لیکن یہ اسلوب تھکا دینے والا تھا، چنانچہ تھک کر بیٹھ رہے۔ اس طرح کے تغیرات اور اُلٹ پھیر اور اسالیب و اہل قلم میں بھی ہوے۔ یہ چند نام مثال کے طور پر لکھے گئے ہیں۔

ان میں یک رنگی قائم نہ رہنے کا سبب یہ تھا کہ یہ سب روشیں اصل میں تحریر کی "جوانیاں" تھیں۔ لکھنے والوں کے شباب تک رہیں۔

۶۔ علوم و فنون، اور مضمون و موضوع کے اعتبار سے بھی انیسویں صدی کا آخری دَور کامیاب ہے۔ تعداد میں سب سے زیادہ مذہبی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے بعد داستانیں اور ناول، پھر تاریخ و سیرت کا نمبر ہے۔ تذکرہ زبان وادب دو چار سے زیادہ نہیں۔ تنقید کا صرف آغاز ہوا۔ فلسفہ، سائنس، معاشیات وغیرہ بہت کم ہیں۔ سیاسی تصانیف برائے نام۔ لغات کی کتابیں متعدد لکھی گئیں "فرہنگ آصفیہ" سب سے پہلی جامع تالیف ہے۔

یہ سرمایہ بعد کی تصانیف سے زیادہ وسیع و متنوّع نہیں ہے۔ لیکن اُس زمانے میں بڑی بات یہ تھی کہ مصنف عالم ہوتے تھے۔ فضل و کمال حاصل کرنے سے پہلے مصنف بننا اور شہرت حاصل کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس لئے جس موضوع پر قلم اُٹھاتے تھے کمال و تبحّر کے ساتھ لکھتے تھے اور تصنیف کا حق ادا کر دیتے تھے۔ نام و نمود پیش نظر نہ تھا۔ علم و ہنر مقصود تھا۔ اس معیار و مسلک کی اہمیت عام طور پر

دل نشیں تھی۔ اس لئے کم استعداد مصنفوں اور فرومایہ تصانیف کو قبول حاصل نہ ہوتا تھا۔

بیسویں صدی میں یہ بات بدل گئی، لیکن بدریج بدلی۔ اس زمانے کے دو دَور ہیں۔ یعنی موجودہ صدی کے پہلے ۲۰ سال، اور بعد کے ۳۵ سال۔ پہلے دَور کے مصنّف وہ ہیں جن کا شباب انیسویں صدی میں شروع ہوا، اسی صدی میں یا بیسویں کے آغاز میں تعلیم ختم کی، اور پھر میدان تصنیف و تالیف میں قدم رکھا۔ ان اہلِ قلم میں قدیم وضع، اخلاق، تعلیم، مذاق کا بہت کچھ اثر تھا اس لئے ان کی تصانیف کا معیار بھی صحیح ہے۔ دوسرے دَور کے مصنف وہ ہیں جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئے یا انیسویں صدی میں صرف پیدا ہوئے تھے۔ باقی ہر نشو و نما بیسویں صدی میں پایا۔ یہ زمانہ انقلاب در انقلاب اور پوری کایا پلٹ کا دَور ہے۔ معاشرت، اخلاق، تعلیم، مذاق سب بدل گئے، اور بدل رہے ہیں۔ آجکل دُنیا چل نہیں رہی، بلکہ دوڑ رہی ہے۔ ہر کام میں عجلت بہت ہے، ذمّہ داری کا احساس کم ہے اور پروا بالکل نہیں۔ "کسب کمال" سے پہلے "عزیز جہاں" بننے کی دُھن ہے۔ پھر شہرت کے ذرائع آسان اور بے شمار ہیں۔ اِنہی اسباب کا نتیجہ آجکل کا اکثر لٹریچر ہے۔

عصرِ حاضر کے مصنفوں میں جو لوگ فطری صلاحیت اور ذوقِ سلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم، ذہنی تربیت اور با اصول علمی تحقیق سے فیض یاب ہیں، وہی ٹھوس اور اصلی کام کر رہے ہیں۔ باقی، جہاں علم و ادب کے "حشرات الارض" ہیں، اور ہر زمانے سے زیادہ ہمارے زمانے میں ہیں۔

یہ غنیمت ہے کہ (بقولِ اکبر الہ آبادی) "جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے"۔ ان بزرگ عالموں اور ادیبوں کی تصانیف عصرِ حاضر کی غیر فانی دولت ہے، اور ان کی رہنمائی میں قابلِ فخر مصنّف و انشا پرداز پیدا ہو رہے ہیں۔

۷ - انیسویں صدی کا یہ زمانہ زیرِ تبصرہ اخبارات و رسائل کے لحاظ

سے بھی گراں مایہ ہے۔ اودھ اخبار لکھنؤ، اخبار عام لاہور، پیسہ اخبار لاہور، اودھ پنچ لکھنؤ، آگرہ اخبار، ریاض الاخبار گورکھپور، دبدبہ سکندری رامپور، وکیل امرتسر، وطن لاہور، البشیر اٹاوہ، نیر اعظم مراد آباد، ہندوستانی لکھنؤ، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ رہبر دکن وغیرہ اپنے اور اپنے زمانے کے رنگ میں نہایت پختہ تھے۔ ان سب نے زبان کی خدمت اور ملک کی قیادت زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے بہتر سے بہتر کی۔ اگلے زمانے میں "سیاسی رائے" آزاد و بیباک نہ تھی، پھر بھی ان اخباروں کا لہجہ حسب موقع نرم و گرم رہا۔ اخبارات مذکورہ میں سے بجز وکیل اور وطن اور ہندوستانی کے سب اب تک جاری ہیں۔ اودھ اخبار کی عمر ۸۳ سال کی ہے۔ بعض کی ۷۰ سے زیادہ۔ ۴۰ سال سے کم کسی کی نہیں۔ ماہوار رسائل بھی اس دور میں اعلیٰ پایہ کے تھے۔ تہذیب الاخلاق (بادارت سرسید) سب کا پیشرو اور سب سے بہتر تھا۔ دلگداز لکھنؤ (بادارت شرر لکھنوی) ادب و تاریخ میں اپنے رنگ کا موجد تھا۔ ان دو رسالوں نے فن مقالہ نگاری کے ارتقا میں سب سے زیادہ مدد دی۔ ادب و انشا اور فکر و تخیل کو تھوڑے دنوں میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ پیام یار لکھنؤ (بادارت منشی نثار حسین) نے شعر و غزل کا جو صحیح معیار اور اعلیٰ نمونہ پیش کیا، وہ اپنی نوع میں منفرد تھا۔ مرقع عالم ہردوئی (بادارت حکیم محمد علی) حسن حیدر آباد، معارف علی گڈھ (بادارت مولوی وحید الدین سلیم) اپنی علمی و ادبی خدمات میں نہایت وقیع و ممتاز تھے۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز میں مخزن لاہور (بادارت شیخ عبدالقادر بیرسٹر) زمانہ کانپور (بادارت منشی دیا نرائن نگم) اردوے معلی (بادارت حسرت موہانی) اور ان کے کچھ بعد دکن ریویو (بادارت ظفر علی خاں) الناظر لکھنؤ (بادارت ظفر الملک علوی) اور نقاد آگرہ (بادارت شاہ دلگیر) نے اگلوں کی جگہ لے لی، ان کے نقش قدم پر چلے، اور ان کی "موج خرام ناز عجب گل کتر گئی"۔ جن کی خوشبو سے آج تک مشام ادب معطر ہے۔ ان میں سے صرف ایک زمانہ کانپور سب سے

بعد تک زندہ رہا اور ۴۰ برس زبان، ادب اور ملک کی خدمت نہایت سلامت روی اور وضعداری کے ساتھ کر کے ۱۹۴۲ء میں بند ہوا۔ الہلال کلکتہ (بادارت ابوالکلام آزاد) اخبار و رسالہ کی درمیانی جنس یعنی ہفتہ وار مجلّہ تھا، جس کی وضع، معیار، ادبیت، صحافت، سب کی تعریف میں ایک لفظ "شاندار" کافی ہے۔ یہ چند نام لئے گئے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی قابل قدر رسالے جاری اور بند ہوتے رہے۔

بیسویں صدی کا موجودہ دور اخبار و رسائل میں دور سابق سے کم رتبہ نہیں ہے۔ لیکن اس اعتبار سے بھی ان دونوں زمانوں میں وہی فرق ہے جو تصانیف کے سلسلے میں بیان کیا گیا۔ اگلے زمانے کے رسالوں کا معیار اور مذاق صحیح، پختہ اور ہموار تھا۔ جن رسائل کا نام لیا گیا، ان میں جو مضمون شائع ہوتا تھا، اعلیٰ یا اوسط درجہ کا ہوتا تھا۔ ادنیٰ درجہ کا کوئی نہ تھا۔ اب یہ امتیاز اُٹھ گیا ہے۔ اکثر رسائل کی اکثر اشاعتوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ مضامین پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں۔ آج کل (بقول ایک ایڈیٹر کے) "سب کو خوش رکھنا پڑتا ہے"۔ سب میں بازاری و عوام بھی ہیں، نوجوان طالب علم بھی، آزاد خیال و انقلاب پسند بھی، پرانے استاد بھی، بوڑھے فلسفی بھی، عالم و ادیب بھی۔ گویا "از شمار افزوں خداوندان او"، اس کا نتیجہ ہے کہ "شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا"۔ صرف گنتی کے چند رسائل صحیح اصول اور اعلیٰ معیار رکھتے ہیں، اور انھیں سے "مجلّہ نگاری" کی لاج قائم ہے۔

آجکل کے اخبارات کا بھی یہی حال ہے۔ اس صدی کے پہلے پندرہ بیس سال میں بعض روزانہ اخبار ایسے جاری ہوئے جن کو زبان و ادب کا معیار بھی ملحوظ تھا۔ ان میں اول و افضل "زمیندار" تھا۔ مولوی ظفر علی خاں نے زمیندار میں ادارت و صحافت کی جو خوبیاں اور جدّتیں پیدا کیں، وہ اُنھیں کی "اوّلیات"

تھیں۔ بعد کے سب روزنامچے ان کے ناقل و متبع ہوئے۔ ادبیت اور صحیح ادارت میں سید جالب دہلوی (اڈیٹر روزانہ ہمدم لکھنؤ) قاضی عبدالغفار مراد آبادی (اڈیٹر روزانہ جمہور وصباح کلکتہ) مولانا محمد علی (اڈیٹر روزانہ ہمدرد دہلی) کی خدمات بھی ممتاز ہیں۔ سید جالب ان سب سے کُہن سال و کہنہ مشق اڈیٹر تھے۔ ادارت سے دستکش ہیں۔

ان کے بعد حال کے پچیس تیس برس میں جو اخبار جاری ہوئے، ان کی نظر میں سیاسی جدوجہد تمام لوازم صحافت پر مقدم ہے۔ پھر بھی اچھے اخبارات سے زمانہ خالی نہیں ہے۔

۸۔ مطابع کے حق میں پوری انیسویں صدی گویا "اجارہ دار" تھی۔ دہلی، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، لاہور میں جس کثرت سے اور جیسے بڑے اور اچھے چھاپہ خانے قائم ہوئے، ان کا نظیر بیسویں صدی ابتک پیدا نہیں کر سکی۔ بلکہ انھیں میں سے بہت سے مطابع بیسویں صدی کی طباعت میں بھی معقول حصہ دار ہیں۔ ان میں مطبع نولکشور سب سے ممتاز ہے۔ منشی نولکشور سی، آئی، ای کے حسنِ نیت، خلوص ارادت، ذوقِ علم، شوقِ خدمت نے جو احسان کیا ہے اس سے ملک و زبان اور علم و فن کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ مطابع مجتبائی، مصطفائی، مجیدی، انتظامی، نامی، مفید عام، آگرہ اخبار وغیرہ کی خدمات و احسانات بھی کچھ کم گراں قدر نہیں ہیں۔

بیسویں صدی نے طباعت میں جو حُسن و خوبی پیدا کی ہے وہ بلاشبہہ نہایت دلکش و شاندار ہے۔ اس زمانے کے نئے مطابع شمار و حصار سے زیادہ ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہ امتیاز کارفرما ہے کہ اگلے زمانے والے نفع سے زیادہ خدمتِ علم و فن مدِنظر رکھتے تھے؛ اور اب تجارت پہلے ہے، باقی سب کچھ پیچھے۔

۹۔ انیسویں صدی کی علمی انجمنوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ صدی کے آخر میں ان کے علاوہ ایک اَور ممتاز انجمن یا ادارہ تصنیف و تالیف قائم ہوا، یعنی حیدرآباد

میں مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں، جس کی مطبوعات "سلسلۂ آصفیہ" کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان میں علامہ شبلی کی بھی بعض تصانیف شامل تھیں۔ ان کے حالات میں چند بار اس سلسلے کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں انجمن ترقی اردو قائم ہوئی۔ پہلے اورنگ آباد (دکن) میں دفتر تھا، پھر دہلی آگیا۔ تقسیم ملک کے بعد سے کراچی میں دفتر ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی نگرانی میں، اردو علم و ادب کی خدمت کر رہی ہے۔ تالیفات و تراجم کے علاوہ دو بلند پایہ سہ ماہی رسالے "اردو" اور "سائنس" اور ایک پندرہ روزہ پرچہ "قومی زبان" اس کے اہتمام میں جاری ہیں۔ یہ انجمن اپنے معتمد و سکرٹری کی طرح حرف مشدد کا خواص رکھتی ہے کہ ہماری تقسیم اَدوار کے لحاظ سے اس کا آغاز ہمارے اس دائرہ تبصرہ کے اندر ہے، اور اس کی ترقیاں زمانہ بعد سے متعلق ہیں۔ اس لئے اس کا باقی تبصرہ "داستان تاریخ اردو" کے دوسرے حصے کے لئے رکھا جاتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد جب مولوی عبدالحق صاحب کراچی چلے گئے اور وہاں انجمن ترقی اُردو کا دفتر قائم کر لیا تو ہندوستان میں الگ انجمن قائم رہی اسکا دفتر دہلی سے علی گڈھ منتقل ہوگیا اور قاضی عبدالغفار صاحب مرادآبادی اسکے سکرٹری مقرر ہوئے۔ انجمن کے پندرہ روزہ پرچے کا پہلا نام (ہماری زبان) ہندوستان میں رہا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے پرچے کا نام قومی زبان رکھ لیا۔ لیکن سہ ماہی رسالہ کا نام — اردو، پاکستان میں رہا۔ قاضی صاحب نے سہ ماہی رسالہ کا نام اردو ادب رکھا۔ علی گڑھ کی انجمن کو حکومت ہند کی امداد حاصل ہے اور ترقی اُردو کا کام جاری ہے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کے انتقال (۱۹۵۵ء) کے بعد اردو کے مشہور ادیب نقاد آل احمد سرور انجمن ترقی اردو کے علمی و عملی کام کی قیادت کر رہے ہیں۔ سہ ماہی رسالہ (اردو ادب) پہلے ہی سے سرور صاحب کی ادارت میں تھا۔ سرور صاحب کی

محنت و محبت سے انجمن اور اردو کی ترقی کی بہت کچھ امیدیں ہیں۔ سرور صاحب کی نگرانی میں ہماری زبان ہفتہ وار ہو گیا ہے۔ اور مضامین کے اعتبار سے بھی اب پہلے سے زیادہ وسیع ہے۔

بیسویں صدی کی ایک بڑی خصوصیت جس میں "حیاتِ اردو" کا کوئی زمانہ مقابلہ نہیں کر سکتا، اس کے عظیم الشان ادارے، مکتبے اور انجمنیں ہیں۔ (۱) دار الاشاعت پنجاب (۲) انجمن ترقی اردو (۳) دار المصنفین اعظم گڈھ۔ (۴) مکتبۂ جامعہ ملّیہ دہلی، (۵) دار الترجمہ دولت آصفیہ دکن، (۶) ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، تقسیم ہند سے پہلے سب ممتاز اور وسیع تھے۔ ان کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، لاہور، حیدر آباد وغیرہ مقامات پر چھوٹے ادارے بھی بڑے کام کر رہے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں خصوصاً کراچی و لاہور میں اعلیٰ ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ جو نہایت وسعت و جامعیت کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

"یہ تصنیفی" حیثیت کا ذکر تھا، اسی کا لاحقہ ان سب اداروں کی "تجارتی" حیثیت و خدمت ہے۔ اس خصوصیت میں ان کے علاوہ اور بہت سی بک ایجنسیاں، بک ڈپو، مکتبے، کتاب گھر اور کتابستان شامل ہیں۔ یہ بجائے خود اس قدر اہم اور ضروری ہیں کہ ان کے بغیر اشاعت دشوار تھی اور تصنیف و تالیف بیکار۔

اُنیسویں صدی میں یہ شعبے بہت کم تھے، اور ایسے وسیع و جامع نہ تھے۔ اُس زمانے کے مطابع اپنی اپنی مطبوعات فروخت کرتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے علی گڈھ کالج میں بک ڈپو قائم ہوا جس نے مطبوعات غیر کی فروخت کا بھی انتظام کیا۔

۱۰۔ اس تبصرے میں داستان تاریخ اردو کے آخری دور کا تذکرہ مقصود اصلی تھا مگر موازنہ کی غرض سے زمانۂ حال کا مختصر حوالہ آگیا ہے کہ "اول با آخر نسبتے دارد"۔

تمام شد

داستان تاریخ اردو" کے انگریزی الفاظ اور نام انگریزی حروف میں

Alpha Betam Brahmanicum	۷۱	صفحہ	الفابیٹم برهمانکم
Headley	۷۱	„	هیڈلے
Grammatica Indostana	۷۱	„	گریمے ٹیکا اندوستانا
Deff	۷۱	„	ڈف
John Gilchrist	۷۱	„	جان گل کرائسٹ
Oriental linguist	۷۱	„	اورنٹل لنگوئسٹ
Edinburgh	۷۲	„	ایڈنبرا
Capt. Joseph Taylor	۷۳	„	کپتان جوزف ٹیلر
Dr. William Hunter	۷۳	„	ڈاکٹر ولیم هنٹر
W. Carmichael S.	۷۳	„	ولیم کارمیکائل اسمتھ
C. Thomas Roe Beck	۷۴	„	کپتان ٹامس روبک
J. Shakespeare	۷۴	„	جان شیکسپیر
W. Tate	۷۴	„	ولیم ٹیٹ
S. W. Britton	۷۴	„	ایس ڈبلو بریٹن
Stamford Arnot	۷۴	„	اسٹیمفورڈ ارنات
Duncan Forbes	۷۵	„	ڈنکن فوربس
James R. Ballentine	۷۵	„	جیمس آربالن ٹائن
F. Fallon	۷۵	„	ایف فیلن
Bertrand	۷۵	„	برٹرینڈ
Reverend G. Small	۷۵	„	ریورنڈجی اسمال
Mr. Wattling	۷۵	„	مسٹر واٹلنگ
W. Macpherson	۷۷	„	ولیم میکفرسن
Acotti	۷۷	„	ماسٹر ایکوٹی
G. Smollet Faggan	۷۷	„	جارج اسمولٹ فیگن
J. W. Peal	۷۷	„	جان ولیم پیل
Physics	۷۸	„	فزکس
Chemistry	۷۸	„	کیمسٹری
J. Thomson	۷۸	„	جیمس طامسن
J. Parks Laddly	۷۸	„	جان پارکس لیڈلی

Economics	۷۸	صفحہ	اکنامکس
Orphan School	۷۸	"	آرفن اسکول
Dr. Mather	۷۸	"	ڈاکٹر میتھر
Graham Bailey	۷۹	"	گراھم بیلی
Lord Wellesly	۸۱	"	لارڈ ویلزلی
Litho	۸۲	"	لیتھو
Mr. Archer	۸۲	"	مسٹر آرچر
Dr. Hunter	۸۳	"	ڈاکٹر هنٹر
Resident	۹۹	"	رزیڈنٹ
Colonel Scott	۹۹	"	کرنل اسکاٹ
J.H. Morington	۱۰۲	"	جے ایچ مارنگٹن
Major Henry Court	۱۰۲	"	میجر هنری کورٹ
Pope Gregory	۱۱۲	"	پوپ گریگری
Clivius	۱۱۲	"	کلیویس
Catholic	۱۱۲	"	کیتھولک
Protestant	۱۱۲	"	پروٹسٹنٹ
Julius Caesar	۱۱۲	"	جولیس سیزر
British Museum	۱۱۳	"	برٹش میوزیم
J. Mont	۱۱۳	"	جیمس مونٹ
Native College	۱۲۰	"	نیٹو کالج
C. William Taylor	۱۲۳	"	کپتان ولیم ٹیلر
C. Willort	۱۲۹	"	کپتان ولورٹ
Supreme Govt.	۱۷۹	"	سپریم گورنمنٹ
G. Auckland	۱۸۱	"	جارج آکلینڈ
M. Felex Botrus	۱۸۵	"	ایم فلیکس بوترو
Vernacular Translation	۱۸۵	"	ورنیکیولر ٹرانسلیشن
Sir W. McNoughton	۱۸۵		سر ولیم میکناٹن
Dr. Sprenger	۱۸۹	"	ڈاکٹر اسپرنگر
Francis Taylor	۱۸۹	"	فرانسس ٹیلر
Henry Carter	۱۹۳	"	هنری کارٹر
Charles Funk	۱۹۳	"	چارلس فنک
Major Fuller	۱۹۳	"	میجر فلر

نوٹ—اس فہرست اسماء والفاظ میں بہت سے نام اور الفاظ آسان یا عام و مشہور سمجھکر چھوڑ دئیے گئے ہیں- لیکن بعض جرمن اطالوی وغیرہ الفاظ کا املا تحقیق کرنے کا موقع نہ ملا-